علی جعفر زیدی
باہر جنگل اندر آگ
پاکستان کی سیاسی کشمکش کا سفر

باہر جنگل، اندر آگ

پاکستان کی سیاسی کشمکش کا سفر

علی جعفر زیدی

ادارہ مطالعہ تاریخ

ایڈیشن دوم

ISBN 978-969-9806-34-6

ناشر: ادارہ مطالعہ تاریخ: 66-H/2، واپڈا ٹاؤن، لاہور

Ph: +92(0)42-3522 4247 **Fax:** +92(0)42 35183166

E-mails: hjzaidi@gmail.com

ali@zaidi.org.uk

khalidmehboob@tehqeeq.org

Website: www.tehqeeq.org

سرورق: ریاظ

مطبع: شرکت پرنٹنگ پریس، نسبت روڈ، لاہور

ایڈیشن اول **2014ء**

ایڈیشن دوم: **2018ء**

قیمت: **1200/-** روپے

قیمت بیرونِ ملک: **$30/-**

فہرست

مفصلاتِ فکر

دیباچہ ایڈیشن دوم

کتاب کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ مجھے خوشی ہے اور ایک طرح کا اطمینان بھی کہ ایک ایسی فضا میں جہاں حکمران طبقات کے تحفظ اور ضرورتوں کے تحت الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعے تاریخ کو نہ صرف مسخ کیا جا رہا ہے بلکہ نئی نسل اور سٹاک ہوم سنڈروم کی شکار قوم کو شعوری طور پر جہالت کے اندھیروں میں دھکیلا جا رہا ہے، وہاں عوامی نقطۂ نظر سے لکھی گئی عوام کی یہ اپنی تاریخ، جس کو میں نے اپنی سوانح عمری کے ذریعے اس کتاب میں محفوظ کیا ہے، اس کو نہ صرف خریدا گیا بلکہ اس کو، اس کی وسعت و گہرائی کے ساتھ پڑھا گیا۔ اب تو اس کتاب کے گرد بالخصوص چھوٹے شہروں میں سٹڈی سرکلز قائم ہو رہے ہیں۔

ضیاء الحق اور اس کے بعد حکمران طبقات کی جانب سے شعوری طور پر پھیلائی گئی جہالت اور گمراہی کی اندھیری رات میں، ظلم واستحصال کے ظالمانہ سیاسی، معاشی ومعاشرتی نظام اور کارپوریٹ کیپٹیل ازم کی سامراجی اور مذہبی دہشت گردی کے خلاف جدوجہد کرنے کا جذبہ اور حوصلہ رکھنے والے سیاسی کارکن اور افراد جو بہت سی الجھنوں کا شکار ہو چکے ہیں اور سچائی کی تلاش میں سرگرداں ہیں، ان کے لئے ماضی اور حال کو عوامی نقطۂ نظر سے سمجھنے اور مستقبل کی راہوں کا تعین کرنے میں یہ کتاب وہ قطبی ستارہ ہے جو نہ صرف راستہ دکھاتا ہے بلکہ منزل کا پتہ بھی دیتا ہے۔

پچھلے چند سالوں میں پاکستان میں تو کچھ نہیں بدلا۔ عوام اور ملک کے حالات پہلے سے زیادہ ابتری کا شکار ہیں۔ حکمران طبقات کے درمیان مفادات واختیارات کی تقسیم کی رسہ کشی نے ایک محاذ آرائی کی شکل اختیار کر لی ہے مگر عالمی سیاست اور بین الاقوامی حالات میں بہت بڑی تبدیلی آئی ہے۔ افغانستان، عراق، لیبیا، شام اور یمن پر مسلط کی گئی

کارپوریٹ کیپٹیل ازم کی سامراجی جنگوں کا منصوبہ نیوورلڈ آرڈر ناکام ہوگیا ہے۔ بالخصوص شام میں، تباہی تو بہت ہوئی، مگر امریکہ اور اس کے اتحادی مغربی ممالک بشمول سعودی عرب، اسرائیل، ترکی اور خلیجی ریاستوں کے شیوخ کی بہت بڑی شکست ہوئی ہے۔ اس کے نتیجے میں جہاں عالمی طاقتوں کے درمیان نئی صف بندیاں ہورہی ہیں۔ وہاں سامراجی جنگیں مسلط کرنے کے لئے ان کے اپنے پیدا کردہ ''اسلامی دہشت گرد'' اور ''اسلامی دہشت گرد تنظیموں'' کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ جن کی دہشت گردی کو بنیاد بنا کر امریکہ اور اس کے اتحادی اپنی اور نیٹو کی افواج ان ممالک میں کبھی ''انسانی حقوق کا تحفظ کرنے'' کبھی ''دہشت گردی کا خاتمہ'' کرنے اور کبھی ''جمہوریت کو نافذ کرنے'' کے بہانے سے اتارتے تھے۔ چنانچہ پاکستان جیسے ممالک کے وہ سربراہانِ مملکت جنہوں نے مدرسوں کے نام پر دہشت گرد پیدا کرنے والی فیکٹریاں قائم کی تھیں، سرپرستی کی تھی، اربوں ڈالرز کا یہ کاروبار کیا تھا اور ''دہشت گرد مجاہدین'' کو ایکسپورٹ کیا تھا ان کی بھی اب ضرورت نہیں رہی۔ اور نہ ہی امریکی سعودی برانڈ کے اسلام کی۔ اپنے اس برانڈ کو نرم کرنے کے لئے سعودی ولی عہد محمد بن سلیمان نے اصلاحات شروع کردی ہیں۔ مسلمانوں کو روضہ رسولﷺ پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کی ''خاموش'' اجازت ہے۔ اب ان پر ڈنڈے نہیں برسائے جاتے۔ عورتوں کو ڈرائیونگ اور ڈانس کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ سیاحت کے مقامات پر جوئے خانے، شراب خانے اور کلبز تعمیر ہورہے ہیں۔ جبکہ آلِ سعود پریشان ہیں کہ سلفیت بھی خطرے میں ہے اور بادشاہت بھی۔ ادھر پاکستان میں عوام اور پاکستان پر بھارتی بالادستی کا منصوبہ کارپوریٹ کیپٹیل ازم مسلط کرنے کا حربہ اور ذریعہ ناکام ہوتا نظر آرہا ہے۔ ''لبرل'' کہلانے والے وہ افراد اور این جی اوز جو پاکستان دشمنی کے منافع بخش کاروبار میں ملوث تھے، اور ہیں، کچھ پریشان سے نظر آتے ہیں۔ ان حالات میں پاکستان کے عوام کو سنبھلنے، حکمران طبقات کی چالاکیوں اور اس خطے میں ہونے والے سامراجی عزائم کے کھیل کو سمجھنے اور مذہبی جنونیت کے چنگل سے نکلنے کا ایک موقع ہے۔ بشرطیکہ عوام خود اس کے لئے تیار ہوں۔

''باہر جنگ اور اندر آگ'' ہے لہٰذا اس کتاب کو آج کے تناظر میں پڑھنا اور سمجھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کل تھا۔

پیش لفظ

میں اپنی فکر کی دہلیز پر چپ چاپ کھڑا تھا۔ وہ فکر جس کا تعلق پاکستان اور پاکستان کے مظلوم ومحکوم عوام اور ان کی ماضی میں کی جانے والی جدوجہد کے ساتھ ہے کہ بہت سے دوستوں اور ساتھیوں نے ماضی کی کتاب کھولنے پر اصرار کیا تا کہ ہم سب مل کر ایک بار پھر جدوجہد کی اس تاریخ کی روشنی میں جس کا ہم حصہ رہے ہیں موجودہ حالات کا منطقی اور سائنسی بنیادوں پر از سر نو جائزہ لے سکیں، موجودہ نسل اور آنے والی نسلوں کے مستقبل کی راہوں کا تعین کرنے میں ان کی مدد کر سکیں اور اگر ممکن ہو سکے تو مظلوم ومحکوم عوام کے ساتھ مل کر ایک بار پھر اس طرح کی صف بندی کر سکیں جو 69-1968ء کی عوامی تحریک کے دوران ہوئی تھی۔

دوستوں کا اصرار تھا اور میں ابھی تیار نہیں تھا کہ میرے ایک بہت پرانے مہربان صحافی دوست جو خود بھی ان اصرار کرنے والوں میں شامل تھے۔ امریکہ اپنے بیٹے سے ملنے جاتے ہوئے حسب معمول راستے میں لندن رکے اور ارادہ باندھا کہ سوال وجواب کی شکل میں وہ میرے ساتھ گفتگو کو قلم بند کریں گے اور اس کو کتابی شکل پاکستان میں دی جائے گی۔ بات آسان ہوگئی۔ ہماری یہ گفتگو ابھی ایک تہائی سفر ہی طے کر پائی تھی کہ معاملہ رک گیا۔ اب مجھے اس گفتگو کو اپنے بیانیہ انداز میں تبدیل کر کے تکمیل کے مرحلے تک پہنچانے کے فرض اور قرض کو خود ادا کرنا تھا جو کہ میں کر رہا ہوں۔

ایک ایسے وقت میں جبکہ پاکستان کے عوام مایوسی، غربت وافلاس کے اندھیرے جنگلوں میں بھٹک رہے ہیں، کئی دہائیوں سے بے چراغ راستوں میں جدوجہد کرنے

والے بچے کھچے دیانت دار سیاسی کارکنوں کی کھنڈر آنکھوں میں غم آباد ہیں اور بقول محسن نقوی ایسا لگتا ہے کہ ؎

اس شب کے مقدر میں سحر ہی نہیں محسنؔ
دیکھا ہے کئی بار چراغوں کو جلا کر

ایک بار پھر سحر کو مقدر بنانے کے لئے چراغ جلانے کی ضرورت ہے۔

ہم نے یہ کوشش 1968-69ء میں کی تھی، ایک کامیاب کوشش !! اور ایک صبح امید نمودار ہوئی تھی۔ اس صبح کے سورج نے جس شب کا گریبان چاک کیا تھا ضیا الحق نے اس کو اندھیری شب کا لباس پھر سے پہنا دیا۔

ضیا الحق وہ سانپ تھا جس کو پاکستان نے دودھ پلا کر اپنی آستین میں پالا تھا۔ اس نے ذوالفقار علی بھٹو کے سیاسی قتل کے بعد عوام کے اس قومی اور طبقاتی شعور کو جو حکمران طبقات اور عالمی سامراج کے لئے کبھی بھی خطرہ بن سکتا تھا مذہبی اور لسانی تعصبات کی اونچی اونچی دیواریں کھڑی کر کے قید کر دیا۔ انگارے اگلتے ہوئے کارکنوں سے زندان بھر گئے۔ ملک پر خوف کی فضا چھا گئی۔ ''نفاذِ نظام اسلام'' کے نام پر پھانسیاں، کوڑے اور جلاوطنی روزمرہ کا معمول بن گئے۔ عوام کو سر اٹھا کر چلنے کی سزا دی جانے لگی۔ ملک کو غیر سیاسی بنانے اور جہالت کے اندھیروں میں دھکیلنے کا عمل شروع ہو گیا۔ مذہبی دہشت گردوں، کلاشنکوف اور انسانی بموں کے ذریعے پاکستان کو لہولہان کر دیا گیا اور یہ عمل آج تک جاری ہے۔ باشعور سیاسی کارکن یا تو مر گئے یا تھک گئے یا پھر بک گئے۔

اپنے زمانے سے پچاس برس آگے سوچنے والے لوگ اس ہجوم میں اب بہت کم تھے اور جو تھے بھی وہ اب بالکل تنہا تھے۔ ایک نئی طرح کے معاشرے نے جنم لے لیا۔ ڈرگ، کلاشنکوف اور ''امریکی جہاد'' کا معاشرہ اور ان کے ذریعے حاصل شدہ دولت کی ریل پیل کا معاشرہ، ایک جعلی معاشرہ۔

پھر کیا ہوا کہ ہوا کے رخ پر چلنے والی بے شمار کشتیاں نمودار ہو گئیں۔ طوفان سے لڑنے والے بادبان نظر آنا بند ہو گئے۔ ملک ''نظریاتی مملکت'' ''اسلامی مملکت'' کا ڈھول

بجانے والے اسلام فروشوں اور پھر وطن فروشوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ اسلام کے نام پر امریکہ کے مفادات کی جنگ میں پاکستان کو دھکیل دیا گیا جو آج تک اس دلدل میں پھنسا ہوا ہے۔ دینی مدرسے انسانی بم ساز فیکٹریاں بن گئے ہیں، راہزن راہبر ہیں، سیاسی جماعتیں جرائم پیشہ افراد کی آماجگاہیں ہیں، عوام، بجلی اور گیس کے بل اور روٹی روزگار کے فقدان کے سبب مر رہے ہیں۔ جو معاشرہ جنم لے چکا ہے اس کے حکمران عوام سے اجنبی ہیں۔ پاکستان کے عوام ان کے لئے ایسے ہی ہیں جیسے ان کی پوشاک اوران کی کاریں جن کو وہ جب چاہیں اور جس طرح چاہیں استعمال کرلیں۔ مزدور، کسان اور محنت کش ان کی ذاتی ملکیت ہیں۔ یہ ان کا حق ہے کہ وہ ان کے ووٹ سے اقتدار میں آئیں، ''جمہوریت کی خوبصورتی'' کے نعرے لگائیں اوران کی بھوک اور ننگ میں اضافہ کریں۔

ذوالفقار علی بھٹو جو عدالتی قتل کے بعد ایک بار پھر اپنی لحد پر روشن چراغ کی طرح جلنے لگے تھے، امریکہ نواز اور عوام دشمن افراد، سول اور ملٹری بیورو کریسی کے نمائندے ان کے مجاور بن کر اُن کی اور ہماری بنائی ہوئی پاکستان پیپلز پارٹی کو کئی بار اغوا کر چکے ہیں۔ وہ معصوم عوام جو اس احساسِ جرم میں مبتلا رہے کہ وہ بروقت جدوجہد کر کے بھٹو کو پھانسی کے پھندے سے نہ بچا سکے بار بار ووٹ دے کر ان کے نام پر ان افراد کو بھی اقتدار میں لاتے رہے ہیں جو ان کے قاتلوں کی صف میں کھڑے تھے اوران کے قتل پر مٹھائیاں تقسیم کر رہے تھے۔ جو ضیاالحق کی مجلس شوریٰ میں بھی شامل تھے اوراس کی حکومت میں بھی۔ اب تو بے نظیر کا خون ناحق بھی نہ جانے کب تک کیش کروایا جائے گا۔

ضیاالحق نے جن شعبدہ بازوں کو سیاست دانوں کی شکل دی تھی ان کے سروں پر بال تو اگ آئے ہیں مگر ان کی بنجر زمین میں عقل و دانش، عوام دوستی، وطن پرستی کی کھیتی کا اُگنا ویسے ہی ناممکن ہے۔ اب تو ان کے اور بھٹو اور بے نظیر کے مجاوروں کے درمیان پاکستان اور عوام کے خلاف مفاداتی اشتراکِ عمل بھی قائم ہے۔

معاشرے میں منطقی اندازِ فکر اور معروضی حالات کو سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت مرگئی ہے۔ نہایت اعلیٰ قسم کی بکواس نے منطق کی جگہ لے لی ہے۔ تحقیق، مطالعہ، ذہنی اور

سماجی تہذیب، متوازن رائے اور انکسار سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ اختلاف رائے کا مطلب ذاتی دشمنی ہے۔ قوت برداشت مٹ چکی ہے۔ چنانچہ آج ہر طرف ایک گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے اور ہر شاخ پر الو بیٹھا ہے۔

باہر جنگل ہے اور اندر آگ۔ اس اندھیرے جنگل میں اگر روشنی پیدا نہ کی گئی تو اندر کی آگ اس جنگل کو جلا کر بھسم کر سکتی ہے جس میں سب کچھ جل سکتا ہے۔ ہم نے اپنی زندگی میں ہی اقوام و ممالک کو پھیلتے، سکڑتے اور ختم ہوتے دیکھا ہے۔ یہ اندھیرا جنگل جو ہمارا مسکن ہے، اندھیرا ہی سہی مگر ہے تو ہمارا۔ اگر اس کو اندر کی آگ سے بچانا ہے تو ہم میں سے ہر ایک کو تاریخ کے دروازے سے گزر کر جدلیاتی علم کے شہر سے ہو کر اپنا اپنا چراغ روشن کرنا ہو گا ورنہ ظلمت کی رات کا چھٹنا اور ایک ایسی صبح امید کا نمودار ہونا جو عوام کو سیاسی و معاشی طاقت حاصل کرنے اور عزت نفس کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنے کا مقدر بن سکے، مشکل ہے۔

ایک بار ڈوبتے سورج نے کہا ''کوئی ہے جو میری جگہ لے سکے؟'' مٹی کے ننھے منے دیئے نے جواب دیا ''میں کوشش کروں گا۔'' (رابندر ناتھ ٹیگور)۔ یہ ننھے منے دیئے جلا کر، ان کو جوڑ کر فکری آزادی کا سورج بنانا ہو گا تاکہ سیاسی و معاشی آزادی حاصل کی جا سکے اور باہر کے جنگل کو اندر کی آگ سے بچایا جا سکے۔

1967ء میں ایک آواز سنائی دی تھی ''کوئی چراغ جلاؤ کہ روشنی کم ہے۔'' اس وقت روشنی کم تھی مگر تھی ضرور۔ ہم نے پاکستان پیپلز پارٹی کے نظریاتی جریدے ہفت روزہ نصرت کا ننھا دیا جلا کر فکر و عمل کی روشنی کو پورے ملک میں پھیلایا تھا اور عوام نے یہ روشنی حاصل کر کے فوجی آمریت، جاگیرداری، سرمایہ داری کے بتوں کو پاش پاش کیا تھا، اسلام فروش ملاؤں کے کفر کے فتووں اور برادری سسٹم اور رشتے ناتوں سے بلند ہو کر یہ ثابت کیا تھا کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔

اب جبکہ ایک سنسان اندھیرا ہے۔ پاکستان اور عوام مخالف ہوائیں سائیں سائیں کرتی ہوئی امن و سکون اور قومی بقا کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں، ان تیز ہواؤں میں

روشنی کا چراغ جلانا بہت مشکل ہے اور اگر یہ جل بھی جائے تو اس کو جلائے رکھنا اور بھی مشکل، مگر یہ چراغ جلانا ہوگا۔ بلکہ چراغ سے چراغ جلانا ہوگا۔ کیونکہ غریبوں کی امیدوں کے چراغ جب جلنے لگتے ہیں تو عوام دشمن طبقات اور عالمی سامراج کے چہرے بجھنے لگتے ہیں۔ اگر انفرادی اور اجتماعی خودکشی سے بچنا ہے تو یہ روشنی پیدا کرنی ہوگی۔ ماضی کو سمجھ کر حال کا جائزہ لیتے ہوئے اور مستقبل کا تعین کر کے۔ روشنی کا حصول اس لئے بھی ضروری ہے کہ حالات کی قبروں پر لکھے کتبوں کو پڑھا جا سکے۔

ساغر صدیقی نے کہا تھا ؎

معبدوں کے چراغ گل کر دو
قلب انسان میں اندھیرا ہے

کیا آج کے پاکستان میں بسنے والے انسانوں کے دلوں میں واقعتاً اندھیرا ہے یا کہیں ایسا تو نہیں کہ پاکستان کے غریب و مظلوم و محکوم عوام نے روشن خواب دیکھنا بند کر دیئے ہیں اور ظلم کے ساتھ دوستی کر لی ہے۔ یا سٹاک ہوم سنڈرم کے مطابق وہ اپنے ظالم کو ہی اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے ہیں اور ان ظالموں میں سے ہی اپنا مسیحا تلاش کر رہے ہیں۔

ایک ایسے وقت میں جبکہ بقول فیض صاحب ''کوئی مسیحا نہ ایفائے عہد کو پہنچا'' ایک بار پھر عوام کو 69-1968ء کے عہد کی تجدید کرنا ہوگی کہ وہ پاکستان کو عالمی سامراج کا اڈہ نہیں بننے دیں گے۔ وہ پاکستان کو اسلام فروشوں کی منڈی نہیں بننے دیں گے۔ وہ پاکستان کو چوروں، ڈاکوؤں اور دہشت گردوں سے آزاد کروائیں گے اور ایک ایسا پاکستان تعمیر کریں گے جس میں حاکمیت ان کی اپنی ہوگی۔ جس میں حکمرانوں کا کام ربوبیت ہوگا نہ کہ ظلم واستحصال۔

اب کی بار انہیں کسی مسیحا کے انتظار کے بجائے اپنے اندر سے مسیحا پیدا کرنے ہوں گے۔ انہیں ایک بار پھر ثابت کرنا ہوگا کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔ ملک کی حاکمیت پر صرف اور صرف ان کا حق ہے نہ کہ ان کی طاقت کے زور پر ایوان اقتدار میں پہنچنے والے جاگیرداروں، اٹھائی گیروں، اسلام فروشوں یا بھتہ خوروں کا۔

ان کی جلائی ہوئی روشنی اب کی باران کے اپنے لئے ہونی چاہیے!!

اس کتاب کا مقصد داستان سرائی نہیں بلکہ راہ عمل کی ایک موثر دعوت ہے جس کی اس گزرتے ہوئے آج میں اشد ضرورت ہے۔ اس تحریر میں ایک چھپی ہوئی خواہش بھی ہے اور وہ یہ کہ پڑھنے والوں میں شاید ایک اضطراب پیدا ہو اور ان کے خوابیدہ احساسات جاگ اٹھیں جو مظلوم و محکوم عوام اور شکستہ حال پاکستان کے لئے ایک نئی قیادت کی بنیاد بن سکیں۔ اس حوالے سے مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں پاکستان پرست ہوں اور عوام کو ہی طاقت کا سرچشمہ سمجھتا ہوں۔

میں تاریخ دان نہیں اور نہ ہی کسی بورژوا Academia کا حصہ۔ لیکن وہ تاریخ جس کا میں خود حصہ ہوں اور جس کا حصہ نہیں بھی ہوں اور جو میں نے سمجھا ہے وہ حکمران طبقات کے حوالے سے نہیں بلکہ عوام اور ان کی جدوجہد کے حوالے سے سمجھا ہے اور اسی نکتہ نظر سے تحریر کیا ہے۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ 69-1968ء کی عظیم عوامی تحریک پر تمام رجعت پسند تاریخ نویس آج تک خاموش ہیں جبکہ بھٹو صاحب کے خلاف پی۔ این۔ اے کی تحریک جو سی آئی اے اور امریکی ڈالر کی قوت پر چلائی گئی تھی ان کی تحریر و بیان کا جزو ہے۔ اس لئے وہ تاریخ دان جو حکمران طبقات کے نکتہ نظر سے تاریخ لکھتے ہیں اور تاریخ نویسی پر اپنی اجارہ داری سمجھتے ہیں انہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ یہ عوام کی تاریخ ہے اور عوام کے لئے ہے۔ میرے پاس امانت تھی دیانت داری کے ساتھ لوٹا رہا ہوں۔ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے مندرجات سے اتفاق و اختلاف کرنے کا ہر باشعور کو حق حاصل ہے۔

کتاب کا پہلا حصہ میری پولیٹیکل آٹو بایوگرافی ہے اور دوسرا حصہ مفصلاتِ فکر کے نام سے تاریخ کے وہ ابواب ہیں جو مسخ کر دیئے گئے یا بھلا دیئے گئے۔ تاریخ کے دیوانے کھیل میں ہمیں بھول جانے کی عادت ہے۔ ضیاالحق کے دور کے منوں وزنی لہولہان لمحات کی شدت کو ہم بھول چکے ہیں۔ 1857ء کی جنگ آزادی، جھانسی کی رانی، سراج الدولہ، حیدر علی، ٹیپو سلطان، منگل پانڈے، رائے احمد خان کھرل، غدر پارٹی، جلیانوالہ

باغ، کمیونسٹوں کے خلاف سازش کیسوں کی بھرمار، بھگت سنگھ، میرٹھ سازش کیس، انجمن ترقی پسند مصنفین کی جدوجہد، آزاد ہندفوج، رائل نیوی کی ہڑتال جیسے عوامی جدوجہد کے خون آشام اہم سنگ میل یاد رکھنا تو اور بھی مشکل ہے۔ مگر صدیوں پرانے وہ اندھیرے باب جن میں ہمارا ''درخشاں ماضی'' محض تشریحی نوٹس کے ساتھ یا بے ایمان تاریخ دانوں کے لکھے گئے تعلیمی سلیبس کے ذریعے محفوظ ہے، ہمیں یاد ہے۔

پاکستان کا معاشرہ ایک بہت بڑی لال مسجد یا رائے ونڈ کا جلسۂ مسلسل بن چکا ہے۔ پاکستان کے اندر اسلامی پاکستان بن رہا ہے۔ اس میں غوری، غزنوی، ایوبی، طارق بن زیاد، محمد بن قاسم، اورنگ زیب کوئی بھی تو ایسا نہیں جو پاکستان کے ''شاہین بچوں'' کا آئیڈیل نہ بنایا جا رہا ہو۔ اس فضا میں پاکستان کو ''الباکستان'' بنانے سے روکنے کی یہ ایک کوشش ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر شاید ہم اپنی زمین کی سانسوں کو سن سکیں۔ اگر آپ کے پاس وقت، ہمت وحوصلہ اور کتاب پڑھنے کا جذبہ ہے تو پوری کتاب پڑھ کر اپنی آراء سے ضرور آگاہ کیجئے گا۔ منتظر رہوں گا۔

علی جعفر زیدی

لندن،

14 راگست، 2014ء

اظہارِ تشکر

میں ان تمام دوستوں کا مشکور ہوں جنہوں نے برس ہا برس کی رفاقت اور محبت کو آندھی کے پتوں کی طرح بکھرنے نہیں دیا۔ جنہوں نے قیدی قوم کا فرد ہوتے ہوئے بھی رہائی کی باتیں کرنا بند نہیں کیں۔ جن کے الفاظ بے معنی نہیں اور جن کی تحریروں میں آج بھی اثر ہے۔ ان کا شمار ان میں بھی نہیں ہے جو اپنے آپ کو بھی نہیں جانتے اور بے شمار انسانوں کو جانے بغیر مر جاتے ہیں۔ بے مقصدیت کا شکار ہو کر۔

میں شکر گزار ہوں:۔

معراج محمد خان کا جنہوں نے اپنی علالت اور بینائی کے نہ ہونے کے باوجود مسودے کو باریکی سے سنا اور اپنے تاثرات لکھوائے۔ **شکیل جعفری** کا شکریہ کہ انہوں نے معراج محمد خان کے الفاظ کو قلمبند کیا۔

امین مغل کا جنہوں نے مسافت، آندھی و بارش کی پرواہ کئے بغیر باقاعدگی سے میرے گھر آکر کتاب کے مسودے پر نظر ثانی کی، اہم مشورے دیئے اور اپنے تاثرات تحریر کر کے بھجوائے۔

حسین نقی کا کہ جنہوں نے ساٹھ کی دہائی سے آج تک مشترکہ خیالات و نظریات کی روشنی میں قلمی اور علمی جدوجہد میں ہمیشہ اہم مشورے دیئے، کتاب کو بغور پڑھا، ضرورت کے مطابق تدوین کی اور اپنے تاثرات لکھے۔

ہمراز احسن کا کہ وہ ہمیشہ مثبت فکری توانائی کا ذریعہ رہے۔ انہوں نے مسودہ پڑھنے کے بعد اس کتاب کی ترتیب کے بارے میں اہم مشورے دیئے۔

کتاب کا عنوان طے کرنے میں مدد کی اور اپنے تاثرات تحریر کئے۔
اثر چوہان کا کہ جنہوں نے اپنے کالموں اور محفلوں میں بہت محبت و شفقت کے ساتھ ہمیشہ ذکر کیا، یاد رکھا، کتاب لکھنے کا محرک بنے۔ اُن کا مضمون ''علی جعفر زیدی کا خواب'' میری سیاسی جدوجہد کی تاریخ کا ایک اہم ورق ہے جو انہوں نے رقم کیا۔
ڈاکٹر سعید شفقت کا جنہوں نے مسودے کو مختلف زاویوں سے پڑھا اور پاکستان کے معروضی حالات کے حوالے سے اہم مشورے دیئے۔
ڈاکٹر طاہر واسطی کا جنہوں نے مسودے کو پڑھنے کے بعد اس کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی راہ دکھائی۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے مسودے کے قانونی پہلوؤں پر نظر ڈالی بلکہ تاریخی ابواب کی بُنتر میں بھی مدد کی۔
خالد محبوب لڈو کا جنہوں نے ینگ پیپلز فرنٹ اور عزیز الحق مرحوم کے حوالے سے واقعاتی درستگیاں کیں۔ مسودے کو بغور پڑھا اور تاثرات لکھے۔
طارق خورشید کا جنہوں نے لیبیا سازش کیس کی تفصیلات پڑھ کر کچھ نام اور واقعات یاد کروائے۔ یونیورسٹی کے زمانے کے بہت سے اہم طالب علموں کے نام یاد رکھنا مشکل تھا **حفیظ اللہ خان نیازی** کا شکریہ جنہوں نے اس ضمن میں مدد کی۔ **طارق** اور **حفیظ اللہ** نے پرانے دوستوں کو ابھی تک اپنی لڑی میں پرو رکھا ہے۔
حسن جعفر زیدی کا جن کے بغیر اس کتاب کا منظر عام پر آنا ناممکن تھا۔ حسن جعفر جو بھائی بھی ہیں اور دوست بھی اور **سرمد جعفر** جو دوست بھی ہیں اور بیٹے بھی، یہ دونوں اگر مجھ پر اپنے اصرارِ مسلسل کا دباؤ نہ رکھتے تو کتاب کا لکھا جانا مشکل تھا۔ میری سُست رفتاری کو دیکھتے ہوئے ہمارے دوست **غوث علی شاہ** نے ایک دن کہا کہ ''حسن اب تم نے یہ کتاب مکمل کروانی ہے'' جو کہ حسن نے کروائی۔ حسن جعفر زیدی جن کے ہاتھ میں قلم بھی ہے اور ذہن میں اجالا بھی، انہوں نے باریک بینی اور تاریخ بینی کے ساتھ مسودے کو پڑھا، اس کو کمپوز

کروانے سے لے کر چھپوانے اور کتاب کو منظر عام پر لانے تک کے تمام مراحل کو قوت علم وصبر کے ساتھ طے کیا اور اپنے تاثرات لکھے۔ **در نجف زیبیؔ** کا شکریہ کہ انہوں نے حسب معمول لذیذ کھانوں اور خاطر و مدارات کا سلسلہ جاری رکھا۔ **عامر شاہ** اور **شاہد خان** نے اس کی کمپوزنگ کی اور **سعید قریشی** نے اس کی پروف ریڈنگ۔ ان کا شکریہ کہ انہوں نے پاکستان میں میرے مختصر سے قیام کے دوران دن رات کی محنت سے اس کتاب کو تیار کیا۔

بیگم اور **بچوں** کا جنہیں یہ اعتماد تھا کہ اگر میں نے ماضی میں مڑ کر پیچھے دیکھا تو پتھر کا نہیں بن جاؤں گا۔ انہوں نے نہ صرف ہمت بندھائے رکھی بلکہ لکھنے کا ماحول بھی مہیا کئے رکھا۔ میری **بیگم** میری تحریروں کے لئے ایک ایسے بیرومیٹر کی حیثیت رکھتی ہیں جو پڑھنے والوں کے مزاج اور توقعات کے اتار چڑھاؤ کا تعین کرتا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح یہ کردار نبھایا اور ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔

بے حد شکریہ اپنے ان تمام دوستوں کا جنہوں نے نہایت اطمینان کے ساتھ انتظار کیا اور اپنے اس انتظار کی یاددہانی کرواتے رہے، اس یقین کے ساتھ کہ یہ وہ بانجھ زمین نہیں جس میں حکمت کی کھیتی نہ اُگ سکے۔

تاثرات

نشانِ منزل

معراج محمد خان
مئی، 2014ء
کراچی

علی جعفر کی یہ کتاب ایک ایسے تاریخی سفر کی داستان ہے جس کا ہم سب حصہ رہے ہیں۔ یہ ان کی سوانح عمری نہیں اور نہ ہی ایک عہد کی تاریخ ہے بلکہ کئی زمانوں پر محیط وہ تاریخ ہے جس میں سامراجیت اور استحصالی نظام کے خلاف ہر دور میں کی گئی عوامی جدوجہد ہے۔ علی جعفر کی کہانی لمحوں کی مسافت میں خیمہ زن عوام کی وہ تاریخ ہے جس کے باہر جنگل ہے اور اندر آگ، باہر کا جنگل خوفناک بھی ہے اور اندھیرا بھی اور اندر کی آگ ہے جو باہر آنے کو بے چین ہے۔ یہ آگ ایک بار 69-1968ء کی تحریک کی شکل میں باہر آئی تھی اور آمریت، سرمایہ داری، جاگیرداری، ملائیت اور عالمی سامراج کے بت جھلتے چلے گئے تھے۔ ہم اس تحریک کا حصہ تھے۔

ہماری جوانی کے اپنے خواب تھے، ولولے اور جنوں خیزیاں تھیں، پھر پختہ سالی کا جذباتی توازن آیا۔ ہم دیانت داری کے ساتھ تاریخی جدلیاتی مادیت کی کشمکش کو سمجھ کر پاکستان کے معروضی حالات کی روشنی میں عوامی انقلاب کا راستہ ہموار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی ظلم ہوا ہم نے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ پہلے این۔ ایس۔ ایف اور پھر 1967ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں قائم ہونے والی پیپلز پارٹی اور ہفت روزہ نصرت، جس کے علی جعفر مدیر تھے، کے ذریعے عوام کو ذہنی غلامی سے

نکال کر فکری آزادی کی راہ پر ڈالا۔ لاٹھی گولی کا مقابلہ کیا۔ جیلیں کاٹیں اور اس دبی ہوئی مخلوق کو سر اٹھانے کا حوصلہ دیا۔ یہی وہ شعور اور حوصلہ تھا کہ جب بھی عوام کو موقع ملا انہوں نے سیاست دانوں پر بھروسہ کیا اور انہیں ایوانِ اقتدار تک پہنچایا۔ میرا اور علی جعفر کا ساتھ بہت پرانا ہے اور دوستی بھی۔

ہم چاہتے تھے کہ پاکستان کے مزدور، کسان، طالب علم، کلرک، چھابڑی والے، ریڑھی والے، رکشہ والے، درمیانہ طبقے کے محنت کش مظلوم عوام اس معاشی و سیاسی استحصال سے آزاد ہوں جو صدیوں سے ان پر مسلط ہے۔ تمام قومیتوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوں، پاکستان سامراجی تسلط سے آزاد ہوا اور سب مل کر عزتِ نفس کے ساتھ، اپنے اپنے عقیدے اور ایمان کے ساتھ، برابری کی بنیاد پر، سکون کی زندگی بسر کرسکیں۔ آنے والی نسلوں کا مستقبل روشن ہو۔ ہم ایک ایسا مستحکم، مضبوط اور ترقی پسند پاکستان چاہتے تھے جس میں واقعتاً طاقت کا سرچشمہ عوام ہوں۔ جس کے وسائلِ پیداوار پر چند افراد یا خاندانوں کا قبضہ نہ ہو بلکہ کروڑوں عوام کی اس میں شراکت ہو۔ ذرائع پیداوار بھی مشترک ہوں اور محنت و تقسیم پیداوار بھی مشترک۔ ایک ایسا معاشی نظام ہماری منزل تھا جس میں صلاحیت کے مطابق کام اور ضرورت کے مطابق روٹی، کپڑا اور مکان کی ہر شہری کو ضمانت ہو۔ ہم ایک غیر طبقاتی معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ ہماری جدوجہد کے اس سفر میں الجھنیں بھی تھیں اور مشکلیں بھی۔ مگر ہم نے ہمت نہیں ہاری۔ میری بینائی ریاستی تشدد کی وجہ سے جاتی رہی اور علی جعفر زیدی جلاوطنی میں پہنچا دیئے گئے۔ مگر ہمارے حوصلے ہمیشہ بلند رہے۔

پاکستان چونکہ شروع سے ہی سامراجی دائرۂ اثر میں چلا گیا تھا اس لئے ہمیشہ ہی عوامی ابھار کو سختی کے ساتھ کچلنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ استحصالی طبقات اور اسلام فروش پاکستان میں امریکی سامراج کی بنیادیں مضبوط کرتے رہے۔ کمیونسٹ پارٹی پر پابندی رہی۔ ایوب خان نے حسن ناصر کو لاہور قلعہ میں تشدد کر کے مار ڈالا۔ ترقی پسند سیاسی کارکن، شاعر، ادیب، صحافی، تخلیق کار سب ہی زیرِ عتاب رہے۔ خصوصاً فیض احمد فیض، حبیب جالب، گل خان نصیر اور منہاج برنا مسلسل ان آزمائشوں سے گزرتے رہے۔

روس اور چین کے سوشلسٹ عوامی انقلاب کے پھیلاؤ کو رکوانے کے لئے لیاقت علی خان نے ہمیں امریکہ کی گود میں ڈال دیا۔ پھر 1950ء کی دہائی میں امریکہ نے ہماری افواج کی دو ڈویژن فوج کے اخراجات اٹھائے اور ہزاروں افسروں کو تربیت دی۔ معاہدہ بغداد، سینٹو (CENTO) اور سیٹو (SEATO) جیسے سامراجی معاہدوں میں ہمیں جکڑا گیا۔ 1959ء میں ایوب خان نے ایک فوجی معاہدے کے تحت پشاور کے نزدیک بڈہ بیر کا فضائی اڈہ امریکہ کے حوالے کیا جہاں سے سوویت یونین کی جاسوسی کے لئے طیارے اڑتے تھے۔ پھر ذوالفقار علی بھٹو کو فوجی ڈکٹیٹر کے ہاتھوں قتل کروا کر کارٹر کے مشیر برزنسکی نے اعلان کیا کہ ''صرف فوج ہی پاکستان میں حکمرانی کر سکتی ہے اور جب تک جنرل ضیا کو فوج کا اعتماد اور حمایت حاصل ہے اس وقت تک پاکستان میں جنرل ضیا ہی ایک ایسا گھوڑا ہے جس پر امریکہ کو سواری کرنی ہوگی۔ پاکستان کی فوج ایک عرصے سے خلیج فارس کی ریاستوں کو سلامتی اور تحفظ کی امداد دے رہی ہے۔ خصوصاً سعودی عرب اور اومان کو۔ چنانچہ اس علاقے میں پاکستان کے سپہ سالار کے کردار کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔'' پاکستان میں فوجی سپہ سالار ہمیشہ سے امریکی کیمپ میں رہے ہیں اور قوم پرست قوتوں سے برسرپیکار رہے ہیں۔

پاکستان میں عطاء اللہ مینگل، خیر بخش مری اور چند دیگر کے علاوہ جو حقیقی معنوں میں قوم پرست لیڈر تھے، زیادہ تر جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں کا راج رہا ہے اور ان ہی کے ذریعے اس خطے میں امریکی سامراج کا تسلط ہوا ہے۔ ان طبقات نے اپنے اقتدار کی بقا اور حصول کے لئے فوج کی مدد حاصل کی۔ فوج نے کبھی پیچھے بیٹھ کر اور کبھی سامنے آ کر ان طبقات کی حفاظت کی۔ چونکہ ملک میں سرمایہ دار اور پرولتاریہ کا وجود نہیں تھا اس لئے مغربی طرز جمہوریت جو سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہے، نہیں آ سکی۔ مغربی ممالک کی طرز پر جمہوریت کا پرچار ضرور ہوا مگر جاگیردارانہ پارلیمانی ڈکٹیٹر شپ کو جمہوریت کا نام دے دیا گیا۔ جبکہ چین جیسے وہ تمام ممالک جو قبائلی جاگیردارانہ معاشروں سے نکل کر سرمایہ داری نظام میں جائے بغیر اشتراکی نظام میں گئے انہوں نے عوامی جمہوریت کو اپنایا۔ ہمیں بھی

اس وقت عوامی جمہوریت کی ضرورت تھی۔

آج پاکستان میں عوامی جمہوریت کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔ امریکہ کے چنگل سے نکلنا ہو یا مذہبی دہشت گردی کا خاتمہ ہو، عوام کی طاقت پر بھروسہ کر کے اور اس کو فعال بنا کر ہی ان مقاصد کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مجھے یقین ہے ایک غیر طبقاتی معاشرے کے قیام اور عوامی جمہوریت کے نظام کے حصول کی جدوجہد میں علی جعفر کی یہ کتاب ایک نشانِ منزل ثابت ہوسکتی ہے۔ پاکستان کے عوام اس منزل تک ایک نہ ایک دن ضرور پہنچیں گے۔

ایک دور، ایک شخص، ایک کہانی

امین مغل

مئی، 2014ء

لندن

عالمگیر ابلاغی انقلاب اور انٹرنیٹ کی کرہ ارضی ہمہ گیری کے اس دور میں، علم جمہوریت پذیری کے ایک بے مثال عمل سے گزر رہا ہے۔ اس میں ایک طرف علم پر عوام کی دسترس میں اضافہ ہو رہا ہے، تو دوسری طرف معاملات کو صیغۂ راز میں رکھنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو رہا ہے۔ علم کی ملکیت کا براہمنی تصور تقریباً تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ اب فرد کی پیدا کردہ ذہنی ملکیت کو محفوظ کرنے کے لئے قوانین بنانے یا استعمال کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ سرمایہ دار ممالک ان قوانین کا استعمال ترقی پذیر ممالک کی ذہنی مصنوعات کو اپنے تصرف میں لانے کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

بے پناہ معلوماتی آزادی کے اس تناظر میں، فردی یا اجتماعی سنسر شپ کو بروئے کار لانا مشکل ہو رہا ہے۔ اس کا براہ راست فائدہ مظلوم افراد اور گروہوں کو پہنچ رہا ہے۔ ان میں بائیں بازو کے نظریات رکھنے والے نمایاں اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک زمانے میں ان کے لئے ریاستی جبر کے پیش نظر کسی قسم کی یادداشتیں، اجلاس کی کارروائیاں قلم بند کرنا یا ان کا رکھنا ناممکن تھا، اور ریاست کی طرف سے چھاپوں کے خطرے کے تحت ان کا تلف کرنا ایک

دستور بن چکا تھا۔ سرکاری، خاص طور پر جاسوسی کے ادارے، جنہیں آج کل پیار سے حساس ادارے کہہ کر ان کے ڈنک کو زائل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، بائیں بازو کے کارکنوں کو فائل بند رکھتے تھے۔ سوویت یونین اور سوشلسٹ بلاک کے سقوط اور ان کے اور سوشلسٹ چین کے مشرف بہ سرمایہ داری ہونے کے بعد ہوسکتا ہے یہ فائلیں بند کر دی گئی ہوں، لیکن ہماری طرح کے ممالک میں ان حساس اداروں نے ان فائلوں کو تلف کر دیا ہو، عقل نہیں مانتی۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ اب فائلیں سیاسی کارکنوں کی نئی کھیپ کی تیار ہو رہی ہیں۔

اظہار تقریر و تحریر کی قید کے اس چلن کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ آزادی کے بعد سے ہی صرف غالبین کا بیانیہ مرتب ہونا اور رائج ہونا شروع ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ مغلوبین تاریخ سے غیر حاضر ہیں۔

بائیں بازو کے پرانے کارکنوں نے اپنی یادوں کے بند کواڑ کھولنے شروع کر دیئے ہیں۔ ان کے لئے اب یہ ممکن ہو رہا ہے کہ وہ عوامی جدوجہد کے اس عظیم رزمئے میں اپنے اپنے حصے کی حکایت خوں چکاں قلم بند کریں جو ابھی تک بے وجود ہے۔ اور اس طرح ایک متبادل بیانیہ سامنے لائیں، جس میں لوگوں کی امیدیں، ان کے حوصلے، ان کے پسینے اور ان کے خون کی مہک ہو۔ اس کے باوجود یہ کہنا پڑے گا کہ یہ متبادل عوامی رزمیہ کی تشکیل کبھی بھی اس طرح مکمل نہیں کی جاسکے گی جس طرح غالب طبقوں کا بیانیہ ہے۔

اس سلسلے میں اگر ایک طرف بائیں بازو کے کارکن اپنی یادداشتیں قلم بند کر رہے ہیں، تو ان میں سے کچھ لوگ سوشلزم کے بحران کے تناظر میں اپنے نظریاتی موقف کا تازہ ترین بیان پیش کر رہے ہیں۔ اس کی ایک مثال محمد جمال الدین نقوی کی سیاسی سرنوشت ہے جس میں انہوں نے برملا اپنی مارکسی سوچ سے مکمل ابا کا اعلان کیا ہے۔ اس کے برعکس وہ لوگ، خاص طور پر وہ نوکر شاہ، جو اظہار تقریر و تحریر پر پابندی لگاتے تھے آج یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ خود بھی مقید تھے اور دھڑا دھڑ اپنی بریت کے افسانے گھڑ رہے ہیں۔

علی جعفر زیدی کی زیر نظر کتاب بھی یادداشتوں کی قلم بندی کے سلسلے کی کڑی ہے۔ یہ ایک راسخ العقیدہ مارکسی کا سیاسی اعمالنامہ ہے، لیکن انحراف کے بجائے اس میں

مارکسی ۔لیننی بلکہ ماؤزے تنگ کی فکر سے غیر متزلزل وفاداری کا اعلان ہے اوراسی کی روشنی میں کائنات اور سماج، عالمی تاریخ اور برصغیر جنوبی ایشیا، بالخصوص مسلمانان جنوبی ایشیا اور پاکستان کو دیکھا گیا ہے۔

یہ بہت وسیع کینوس ہے۔اس کا تجزیاتی مطالعہ کرنا بذاتہ ایک کتاب کی ضخامت کا تقاضا کرتا ہے۔اس کے علاوہ مجھے اعتراف ہے کہ روس پسند فکر کے سائے میں اتنا عرصہ گزارنے کے بعد، اور خود احتسابی کے ابھی تک جاری صبر طلب عمل کے دوران جس کی ایک جہت مسلسل تشکیکی اندازِ فکر ہے، میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ محاکمے کا حق کما حقہ پورا کر سکوں۔لیکن غیر حتمی تجزیئے کے مطابق، میرے لئے زیدی کی تمام آراء سے اتفاق کرنا ممکن نہیں۔مثال کے طور پر، سوویت یونین کے سقوط اور وہاں اور سوشلسٹ بلاک میں سوشلسٹ تجربے کی ناکامی اور سوویت یونین اور چین میں سرمایہ داری کی طرف رجعت کو مارکسی نظریے سے انحراف سے تعبیر کرنا۔میرے خیال میں۔اور میں اپنی رائے میں تبدیلی کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ہمیں بہت سے ان نظری مباحث پر غور کرنا ہوگا جو مارکس کے زمانے سے ہی پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے: مثلاً کیا مارکس کے زمانے ہی میں مزدور طبقے نے سرمایہ داروں کا تختہ الٹنے کے بجائے سرمایہ داری سے پیمان وفاداری نہیں باندھ لیا تھا؟ کیا لیننی انقلاب ایک بے صبری کا اظہار تھا، یا کیا وہ مزدوروں کے اوپر اس وقت کے حالات نے تھونپ دیا تھا، یا کیا وہ سرمایہ داری کی نمو کے تمام امکانات کے ختم ہونے سے پہلے سوشلزم قائم کرنے کی کوشش تھی؟ کیا سوویت یونین اور سوشلسٹ بلاک میں سوشلسٹ تجربے کی ناکامی اور وہاں اور چین میں سرمایہ داری کے احیا سے پتا نہیں چلتا کہ ابھی تماشا دکھا کر مداری نہیں گیا؟

زیدی نے کمیونسٹوں کے بورژوا پارٹیوں میں کام کرنے پر نکتہ چینی کی ہے۔ میرے خیال میں، ملکی سیاست میں سوشلسٹ انقلاب ابھی تک ایجنڈے پر نہیں آیا۔اس لئے، کمیونسٹوں کی کامیابی اور ناکامی کو ان حوالوں سے دیکھنا ہوگا جو سماج کے سامنے تاریخ نے پیش کئے تھے۔ان میں جمہوریت کا قیام، قومیتوں کے حقوق، دوسرے ممالک کے ساتھ

تعلقات کی نوعیت اور سماجی انصاف کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان اہداف کے لئے اگر کام کیا ہے تو وہ کمیونسٹوں اور بائیں بازو کے لوگوں اور نیشنلسٹوں نے کیا ہے۔ معروضی طور پر کمیونزم کے آدرش کی روشنی میں کام کرنے والے دراصل سوشل ڈیموکریٹ کا کردار ادا کر رہے تھے۔ اور اس میں صرف وہی سرخرو ہوئے ہیں۔

بہر حال، زیدی کی کتاب نظری مسائل پر بحث کے لئے نقطہ آغاز بن سکتی ہے، جو بذاتہ ایک اچھی چیز ہے۔

ہم جانتے ہیں، نظریاتی مسائل اتنی آسانی سے حل نہیں ہوتے۔ انہیں معلق رکھتے ہوئے، ہم آگے بڑھتے ہیں۔

زیدی کی کتاب ان کی آپ بیتی بھی ہے اور ان کے دور اور اس دور کو مرتب کرنے میں کارفرما عوامل کا حیات نامہ بھی۔

انہوں نے اپنے بیان کے لئے ایک اچھوتا— کم از کم میری دانست میں، اور خاص طور پر اردو میں، اچھوتا— انداز استعمال کیا ہے۔ وہ اپنے خاندانی پس منظر اور پھر خاندانی ماحول کے بیان سے شروع کرتے ہیں اور اس سے چلتے چلتے ایسے مقام پر لے جاتے ہیں جہاں ان کا شعور سماج کی صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ایک قسم کا نوڈل پوائنٹ (عقدی نقطہ) ہے جہاں پر ذاتی احوال اور سماجی احوال کا اتصال ہوتا ہے۔ دوسرے لکھنے والوں کے برعکس، وہ جلدی سے آگے نہیں چلے جاتے۔ وہ روایتی گیت کے مطابق، یار کا نظارہ کرنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور اس وقت تک رکے رہتے ہیں جب تک وہ سماجی صورت حال کا بیان اور اس کا تجزیہ مکمل نہیں کر لیتے۔ جب وہ سیر حاصل بحث کر لیتے ہیں تو اس کے اختتام پر ان کی اپنی ذاتی زندگی کا نیا موڑ آ جاتا ہے اور وہ آپ کو اپنی جلوت وخلوت کا محرم بنا لیتے ہیں۔ اس کے بعد پھر ایک نیا موڑ آتا ہے۔ اور وہ اس نئے نوڈل پوائنٹ پر ہمیں اس وقت کے سماجی حالات اور انہیں سمجھنے کے لئے ضروری نظری اوزار مہیا کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو ان کی کتاب لہروں کی ایک جدول ہے جس میں عمودی لہروں اور افقی لہروں کا ایک پیٹرن تیار ہو جاتا

ہے۔ اس سارے عمل میں، قاری ایک سیر حاصل عمرانی مطالعہ کر لیتا ہے اور ان سے بھی آشنائی حاصل کر لیتا ہے۔ ایک سطح پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسے بائیں بازو کے ہدایت نامہ کے طور پر بھی پڑھا جا سکتا ہے جس میں مصنف کی ذاتی زندگی اس کے مختلف موضوعات کے سمجھنے کے لئے مثالیں مہیا کر سکتی ہے۔

برطانوی دور میں نوآبادیاتی نظام کے مصالح میں مقید، جاگیرداری نظام میں پیوست نوکرشاہی کے ماحول میں پروان چڑھنے والے سیدزادے کا خاندان سرگودھا میں آ کے آباد ہوتا ہے۔ زیدی ہمیں ایک سیکولر لیکن مجموعی طور پر روایت پسند، تن آسان، سست رفتار ماحول سے آشنا کراتا ہے جس میں اس کے گھر کے افراد، اور سرگودھا کے لوگ شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر اس کی کردار سازی میں کردار ادا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ کالج کے باغ عدن میں سیاست کا سانپ اسے ڈس لیتا ہے۔ اور اب چل سو چل۔

زیدی کراچی پہنچتا ہے۔ وہاں کی طالب علم سیاست میں حصہ لیتا ہے اور فلمی ہیرو کے طور پر نام بھی پیدا کرتا ہے۔ افسوس ہے کہ فلم کے ساتھ شغف کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مظاہر کے ذکر میں تشنگی کا اظہار ہوتا ہے۔ شاید اس کی وجہ مصنف کا سیاسی ذمہ داری کا احساس ہے۔ کراچی میں طالب علموں کی اس دور کی سیاست نے ملکی سیاست پر دوررس نتائج برآمد کئے تھے۔ اس لئے اس پر لکھنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں سید احتشام کی کتاب قابل ذکر ہے۔ زیدی نے اپنے پیشروؤں کے بعد کے زمانے پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

لیکن اس کتاب کا سب سے زیادہ جاندار حصہ وہ ہے جب ذوالفقار علی بھٹو کا مظہر نمودار ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی گویا زیدی کے لئے سیاست کی بساط بچھ جاتی ہے۔ اس کی سرگرمی ایک واضح سمت میں بڑھنا شروع ہو جاتی ہے۔ وہ پیپلز پارٹی کے نظریاتی رسالے نصرت کی بنیاد رکھتا ہے، اور مارکسی سوچ کی روشنی میں کارکنوں کی تربیت کرنے کا بیڑا اٹھاتا ہے۔ 1962ء کے بعد سے ملکی سیاست کا جمود ٹوٹنا شروع ہو گیا تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب زیدی کی جوانی سیاست کے میدان میں جولانی دکھانا شروع کرتی ہے۔ ملکی

حرکیت کے اس ماحول میں بھٹو کا ظہور سیاست میں طوفانی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ خاص طور پر مغربی پاکستان میں۔ زیدی کے قلم کا کمال یہ ہے کہ قاری اس زمانے کے شب و روز میں ایک بار پھر سانس لینے لگتا ہے۔

مصنف بھٹو پسندی کے طلسم سے نکلتا ہے۔ اسے نکلنا ہی تھا۔ قائداعظم یونیورسٹی، بھٹو کی شہادت، دو بار ہجرت اور پھر انگلستان میں پناہ گزینی۔ کمال یہ ہے کہ صرف مصنف کی زندگی ہی نہیں، ملک کی سیاست بھی چلتی پھرتی نظر آتی ہے اور قاری اس میں گم ہو جاتا ہے۔

زیدی کے قلم کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ صرف خیالات اور تصورات اور واقعات کا لکھاری نہیں بلکہ وہ احساسات کو بھی بڑی مہارت سے گرفت میں لیتا ہے۔ اس وقت قاری جذبات کے شیش محل میں پہنچ جاتا ہے۔

زیدی آپ کو جگہ جگہ اچانک سیاستدانوں کے خلوت کدوں میں لے جاتا ہے اور ان کی زندگیوں کے ایسے گوشوں سے آشنا کراتا ہے جو ابھی تک عام لوگوں کی نظر سے اوجھل تھے۔ انفرادی زندگی کے اس طرح کے چھوٹے چھوٹے واقعات نہ صرف یہ کہ مل کر تاریخ کا مواد بنتے ہیں بلکہ تاریخ کے کرداروں اور تاریخ کے رجحانات کو سمجھنے کے لئے زاویوں کا کام کرتے ہیں۔ اسی لئے، مؤرخ اورل (Oral) ہسٹری اور سوانح عمریوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ زیدی کی کتاب نہ صرف ملکی تاریخ میں ایک حساس فرد کے کردار کا خاکہ پیش کرتی ہے، بلکہ اس کی طرح کے کارکنوں کی خودنوشتوں کے ساتھ مل کر تاریخ کی صورت گری کے لئے بھی مفید ثابت ہوگی۔

کسی خودنوشت کے لئے اس سے بڑی کامیابی کیا ہوگی؟

باہر جنگل میں بگھیاڑ دندنا رہے ہیں

حسین نقی

جون، 2014ء
لاہور

ساٹھ کی دہائی پاکستانی معاشرے اور ملکی سیاست میں انتہائی اہمیت کی حامل اور دوررس تبدیلیوں کی دہائی ہے۔ اس دہائی میں پیش آنے والے واقعات کو جانے، سمجھے بغیر ملک کے حال اور مستقبل کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ علی جعفر زیدی کی تصنیف ''باہر جنگل، اندر آگ'' پاکستان کی سیاسی تاریخ کے سنجیدہ طالبعلموں اور محققین کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے میری دانست میں پہلی جامع دستاویز ہے۔ 60ء کی دہائی میں نوجوان ہونے والے علی جعفر زیدی وہ خوش بخت فرد ہیں جو اس میں پیش آنے والے واقعات کے محض باشعور عینی شاہد ہی نہیں بلکہ اس میں اپنا حصہ ڈالنے والی انتہائی فعال شخصیات میں بھی نمایاں حیثیت کے حامل فرد ہیں۔

ایثار وقربانی تو ویسے بھی ان کی میراث ہے لیکن جس دور میں انہوں نے اپنے لئے بعض فرائض اور ذمہ داریوں کا انتخاب کیا اس کے باعث پاکستان کی سیاسی تاریخ پر ان کی خدمات ہمیشہ نقش رہیں گی۔ ایک تخلیقی فنکار، خوبرو اداکار، اور خوش پوش نوجوان جس نے اپنی صلاحیتوں کا اظہار سرگودھا جیسے سوئے ہوئے شیر کو سراج الدولہ جیسے مردِ حُر کی زندگی پر مبنی تخلیق سے جگایا۔ اس نے جب تعلیم اور طالبعلموں کی سیاست سے آگے بڑھ کر ملکی سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو سب سے کٹھن کام اپنے ذمہ لینے کی ٹھانی۔ یہ کام تھا عوام

کی ذہنی تربیت کا، ان کو ملک کے حالات و واقعات سے آگاہ کرنے اور ان حالات، واقعات کے پس پردہ کام کرنے والی قوتوں کے بارے میں درست معلومات کی فراہمی کا۔ کہ فوجی آمریت کے نفاذ کے ساتھ ساتھ آزاد پریس پر قبضہ کرکے آزاد، ترقی پسند روزنامے اور رسائل پریس ٹرسٹ کے سپرد کئے جا چکے تھے۔

علی جعفر زیدی کے کالج کا زمانہ وہ تھا جب ملک میں فوجی آمریت کا آغاز ہو چکا تھا۔ پاکستان پر غاصبانہ قبضہ کرنے والوں نے اس آئین کو بھی منسوخ کردیا تھا جس کے لئے موجودہ پاکستان میں صوبوں کو زبردستی ون یونٹ میں شامل کیا گیا تھا اور اس وقت کے مشرقی پاکستان کو اس کی عددی برتری سے محروم کیا گیا تھا۔ اس کی منظوری جیسی تیسی دستور ساز اسمبلی سے ہی ہوئی تھی۔ ساٹھ کی دہائی کے آغاز کے بعد فوجی آمر نے اپنے دستخط سے جاری آئین، نافذ کردیا تھا، 1947ء میں آئینی اور جمہوری جدوجہد کے ذریعہ آزادی حاصل کرنے والی قوم کو جمہوریت کے لئے 'نالائق' ہونے کا فرمان جاری ہوا تھا، بالواسطہ انتخابات کا نفاذ عمل میں آیا تھا۔ میونسپل اختیارات کا استعمال کرنے والی بنیادی جمہوریتوں کا قیام عمل میں لایا گیا تھا اور ان کے لئے منتخب ہونے والوں نے ہی صوبائی اور قومی اسمبلی کے علاوہ صدر مملکت وحکومت کا انتخاب کرنا تھا۔ پارلیمانی جمہوریت کی جگہ آمرانہ صدارتی نظام کو رائج کرنا مقصود تھا۔ دوسری بڑی کارروائی وفاق کے مرکز کا کراچی سے جی۔ ایچ۔ کیو کے مضافات میں منتقلی تھا یعنی وفاقی مرکز اکثریتی آبادی کے بازو سے مزید سات آٹھ سو میل دور اور ہمیشہ کے لئے جی۔ ایچ۔ کیو کے زیر نگرانی رکھا جائے۔

تیسری بڑی تبدیلی تعلیم کے شعبہ میں لانے کی ابتداء سے ہوئی تھی، فوجی آمر کے قائم کردہ تعلیمی کمیشن کی پیش کردہ اور آمر کی منظور کردہ رپورٹ کے نتیجہ میں دوسالہ ڈگری کورس ختم کرکے تین سالہ ڈگری کورس کا نفاذ، اعلیٰ تعلیمی اداروں کی نشستوں میں کمی اور فیسوں میں زیادتی، ان میں سامراجی ہدایت کے مطابق مذہبی رجحان رکھنے والے اساتذہ کی بھرتی، غیر نصابی سرگرمیوں پر انتظامی کنٹرول، طالب علموں اور اساتذہ کی سراغ رساں ایجنسیوں کے ذریعہ نگرانی وغیرہ کا نفاذ۔

چوتھا بڑا اقدام 1963ء میں پریس، کتابوں اور دیگر اشاعتوں کے لئے منظوری کے واسطے سخت ترین پابندیوں کے حامل پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈیننس کا اجراء تھا جس کے تحت اخبارات پر سرکاری پریس نوٹوں کو من وعن شائع کرنے کی پابندی وغیرہ شامل تھی اور جس کے خلاف پاکستان کی تاریخ میں پہلی اور تا حال آخری بار مالکان، ایڈیٹران اور کارکن صحافیوں کی انجمن کی مشترکہ تحریک شروع کی گئی جس کے نتیجہ میں اس کی بعض شقوں کا اطلاق کیا گیا۔

پانچواں کام محدود کردہ عوامی نمائندگی کے 1960 میں نافذ کردہ آئینی ضابطوں کے تحت بنیادی جمہوریتوں اور ان کے ذریعہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے علاوہ پہلا صدارتی انتخاب۔ یہ تمام کارروائی 1964ء کے آخری اور 1965ء کے ابتدائی مہینوں میں مکمل کی گئی اور آمر کی دھاندلی زدہ جیت کی خوشی میں کراچی کے لالوکھیت میں لاشوں کی کاشت کی گئی۔ باہر فوجی آمریت کے لگائے اور کاسہ لیسوں کی آبیاری سے تناور ہونے والے اس جنگل کے مشاہدہ نے علی جعفر زیدی کے اندر آگ روشن کی جس آگ کو الاؤ میں تبدیل کرنے اور پہلی آمریت کے تابوت میں آخری کیل ٹھکنے کا کام 1965ء کی جنگ میں فیلڈ مارشل کا لقب حاصل کرنے والے ایوب خاں کی بزدلانہ پسپائی نے کیا۔ اس سب کے بارے میں معتبر معلومات کا مطالعہ آپ زیدی صاحب کی زیر نظر کتاب میں بھی کریں گے اور اگر آپ کو اس کتاب کی پیشرو تحریروں کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو تو پھر آپ کو چند لائبریریوں اور ذاتی کتب خانوں میں موجود ہفت روزہ ''نصرت'' کی فائلوں کا مطالعہ کرنا ہوگا۔

حنیف رامے کے رسالہ ''نصرت'' کی ابتدائی شہرت تو اس کے ''اسلامی سوشلزم'' نمبر سے ہوئی تھی لیکن جب 1965ء کی 17 روزہ پاک۔ بھارت جنگ کے بعد ایوب حکومت مخالف عوامی تحریک کا آغاز ہوا تو ''نصرت'' کو ایک سیاسی ہفت روزہ کے طور پر شائع کرنے کا ڈول ڈالا گیا اور علی جعفر زیدی نے اس کی ادارت اور اشاعت کی تمام ترذمہ داری کے لئے اپنے مضبوط کاندھوں اور انسان دوست ترقی پسند اور سامراج مخالف ذہن وشعور پر ڈال لی۔ حنیف رامے کو اور کیا چاہئے تھا وہ اقتدار کی راہداریوں میں اپنا مستقبل محفوظ بنانے میں منہمک ہو گئے۔ مشیر بنے، وزیر بنے، پنجاب کے وزیر اعلیٰ بھی بنے۔

پیپلز پارٹی کے قیام کے بعد اس کے سیاسی اور معاشی پروگرام کو پڑھنے لکھنے والوں تک پہنچانے اوران کے ذریعہ عوام میں سیاسی اور معاشی تبدیلی کے لئے جوش و ولولہ پیدا کرنے میں ہفت روزہ ''نصرت'' کا کردار سب سے نمایاں تھا۔اس سادہ لیکن پرکار پرچے نے ملک کے طول وعرض میں نہ صرف جمہوریت اور سوشلزم کے بنیادی خیالات کو عام فہم اور سادہ زبان میں متعارف کروایا بلکہ عوامی مزاحمت کو گلی کوچوں کے تھڑوں، چائے خانوں سے لے کر دیہاتوں، پہاڑوں، ریگستانوں، کھیتوں، کارخانوں تک پہنچایا۔ ''نصرت'' نے ہی میدان سیاست کے نووارد وں میں اس شعور کی آبیاری کی کہ طاقت کا سرچشمہ افواج، ٹینک، توپیں، جنگی جہاز نہیں بلکہ عوام ہیں، عام انسان، عام لوگ، عام پاکستانی ہیں۔ان نووار دان سیاست نے اس آگہی کو اپنے مفاد میں تو خوب خوب استعمال کیا لیکن پیپلز پارٹی کے بنیادی نعرہ ''تمام تر طاقت (اختیار) عوام کو'' (All power to the people) پہنچانے میں ان کا کردار محدود ہی رہا۔

یہ سب نادانستہ نہیں ہوا، طاقت کے سرچشمہ، عوام سے طاقت حاصل کرنے کا کام تو ان نووار دان سیاست نے خوب لیا اور عوام کے مفادات کے خلاف اپنے جاگیردارانہ طبقات کے مفادات کو تو نہ صرف محفوظ کیا بلکہ دوام بخشا۔علی جعفر زیدی نے ''باہر جنگل، اندر آگ'' میں یہ سارا حال احوال اکٹھا کرکے نہایت دیانتداری اور بڑی حد تک غیر جانبداری سے موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر کے اپنی اور ہماری بھی بخشش کا سامان تو کرلیا لیکن ساٹھ کی دہائی میں ابھرنے والی سیاسی قیادت اور اس کے نتیجہ میں 70 کی دہائی اور اس کے بعد کی دہائیوں میں شرکت اقتدار کی حامل سیاسی قیادت کی اس تاریخی موقع پرستی جس میں کلیدی فروگذاشت تمام طاقت عوام کو منتقل نہ کرنا ہے، نے جو سیاسی نتائج مرتب کئے اور جس کے باعث عام پاکستانی تعلیم، صحت، روزگار، سر پر چھت سے محروم، حق تلفی، اقرباء پروری، دہشت گردی، فرقہ واریت، عدم تحفظ کا شکار ہے اس کا محاسبہ کیسے اور کب ممکن ہوگا۔ ہو سکے گا بھی یا نہیں۔ ''باہر جنگل، اندر آگ'' میں پڑھنے والے اس کا جواب حاصل کرنا ضرور چاہیں گے۔خاص طور پر اب جب کہ جنگل میں بھیڑیئے (بگھیاڑ) دندنا رہے ہیں۔

جمع متکلم!

ہمراز احسن

اپریل، 2014ء

لندن

اُردو اخبارات و رسائل کے ادبی وغیر ادبی صفحات اور اب فیس بک پر ایسی تصاویر اکثر دیکھنے کو ملتی ہیں جن کے نیچے درج ہوتا ہے کہ فلاں فلاں صاحب یا صاحبہ، کتاب کے مصنف کے ہمراہ کھڑے ہیں۔ یہ تصاویر عام طور پر کسی تقریب کے موقع پر اُتاری جاتی ہیں لیکن "باہر جنگل، اندر آگ" کے مصنف علی جعفر زیدی سے ہماری قربت چار دہائیوں سے بھی آگے تک پھیلی ہوئی ہے اور اُن سے ملاقات کسی تقریب کی مرہون منت نہیں۔ ہم 1968ء سے ساتھ کھڑے ہیں۔ ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ اس طویل سفر میں سخت مرحلے بھی آئے، جیلوں، مقدمات اور جلاوطنی کے عذاب بھی بھگتے۔ کبھی کھڑے کھڑے پاؤں سُوج جاتے، کبھی چلتے چلتے تھک کر چور ہو جاتے لیکن کبھی ڈھیر نہ ہوئے بلکہ خود کو ہر حال میں ایستادہ رکھنے پر ہی مصر رہے حالانکہ کسی کیمرے کی آنکھ ہم پر مرکوز نہ رہی۔ وہ تو ہم سے کوسوں دور کچھ اور ہی دیکھ اور دکھا رہی ہے۔ اور ہم اپنے اندر کی آگ کو پھونکوں سے جلائے رکھنے کی سرتوڑ کوششوں میں مبتلا جب باہر دیکھتے ہیں تو ہمارے اردگرد کے جنگل میں آدم خور درخت اور زہر بھری جھاڑیاں اتنی پھیل چکی ہیں، اتنی تنومند ہو چکی ہیں کہ اُس جنگل میں سے کسی انسان کا گزر مشکل ہوتا جا رہا ہے اور افتاد یہ ہے کہ جب بھی بتایا جاتا ہے تو بس یہی کہ رانجھن کا ڈیرہ جنگل کے اُس پار ہے۔ ہمیں پل صراط کے

لئے اگلی دنیا میں دیکھنے کی کیا ضرورت کہ ہمارے اپنے جنگل کی ہر پگڈنڈی ہر قدم پر ہمارا امتحان لے رہی ہے۔ ژاں پال سارتر نے کہا تھا کہ ''پیمان یعنی Commitment ایک عمل ہے، محض لفظ نہیں۔'' لکھنا ایک عمل ہے اور اسی عمل کے نتیجہ میں یہ کتاب مصنف کی زندگی بھر کی کمٹمنٹ کی گواہ ہے۔ ایک ایسا گواہ جو کبھی منحرف نہیں ہوتا۔ اپنے پیمان و بیان پر زندگی کی آخری سانس تک قائم رہتا ہے۔

علی جعفر زیدی کو ہم ہمیشہ زیدی بھائی کہتے ہیں، کہتے ہی نہیں، سمجھتے بھی ہیں۔ لیکن یار لوگ ظالم ہیں کہ قصائیوں کے طریق پر بال کی کھال اُتارتے ہیں پوچھا جائے گا کہ ''او پنجابی ڈھگے، یہ تم اپنے لئے ہم کا صیغہ کیسے استعمال کر رہے ہو؟'' فیض احمد فیض میرے بزرگ تھے اور میں اُن سے ایک خاص عقیدت رکھتا ہوں۔ وہ واحد پنجابی تھے جنہیں میں نے اپنے لئے 'ہم' استعمال کرتے ہوئے پایا لیکن انہیں استثنیٰ حاصل تھا اور جانے کن وقتوں تک رہے گا؟ ہماری مائیں لوریاں دیتی تھیں لیکن وہ انقلابی شاعر، لارے، دیتا تھا۔ ہم لوریاں بھول گئے لیکن لارے ہمارا ایسا یقین بن گئے جیسے ان لاروں پر جیے جانے کی قسم اٹھا رکھی ہو کہ ''ہم دیکھیں گے، لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے۔'' سو میری کیا مجال کہ میں اپنے لئے ہم کا صیغہ استعمال کروں۔ میں تو صیغہ واحد غائب بنتا جا رہا ہوں۔ شاید بن چکا ہوں۔ ہم سے میری مراد میں اور میری اکلوتی منکوحہ فرح احسن ہے۔ آپ شاید اکلوتی میں چھپی حسرت کا اندازہ نہ کر سکیں۔ زیدی بھائی نے اپنی کتاب کے ابتدائی باب میں اپنے سید بزرگوں کا کافی تفصیل سے تذکرہ کیا ہے اور انگریزوں کے خلاف اُن کی جدوجہد کو بھی بیان کیا ہے لیکن ازواج کا معاملہ گول کر گئے ہیں اور یہ ذمہ داری اپنے اس منہ پھٹ چھوٹے بھائی کے ذمہ ڈال دی ہے۔ ہم سیدوں میں نکاح ثانی کا رواج ہے اور میرے علاقے میں کوئی اگر سید کی پہلی شادی میں شرکت نہ کر سکے تو کہتا ہے کہ کوئی بات نہیں، سید نے دوسری شادی تو کرنی ہی ہے۔ اُس میں شریک ہو جائیں گے۔ میں اور زیدی بھائی نے سید ہوتے ہوئے بھی اس روایت سے بغاوت کی۔ لیکن روایت سے انحراف کی قیمت تو چکانی پڑتی ہے، سو چکائی۔ اعلیٰ تعلیم کے دوران جب زیدی بھائی پولینڈ میں تھے تو

کلب میں حسیناؤں کے حسن کو بیان کرتے کرتے دل سے اچانک ایک آہ نکلی اور کتاب کے صفحہ پر بکھر گئی "میں شادی شدہ نہ ہوتا تو ان سے شادی کر لیتا۔" خیر میں تو شادی سے پہلے بھی انہیں زیدی بھائی ہی کہتا تھا۔ وجہ اُس کی محمد حنیف رامے کی تقلید نہیں تھی بلکہ میں اُن کے بردارِ خورد حسن جعفر زیدی کا دوست تھا اور تب حسن چینی ادیب لوہسون کے افسانوں کا ترجمہ کرتا تھا اور جدید نفسیات دانوں کے طریق سے ہم عشق اور انقلاب کے مارے بے علموں کو آشنا کراتا تھا۔ وہ انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں پڑھ رہا تھا کہ میری اُس سے یاری ہو گئی۔ حسن میں بہت سی خوبیاں ہیں لیکن سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آج اتنی کتابیں لکھنے اور پاکستان اور مسلمانوں کی تاریخ کو کھنگالنے کے باوجود بھی وہ ویسے کا ویسا ہے۔ نہ کوئی شوشا، نہ کوئی انا، نہ بڑھک بازی، نہ بحث مباحثہ میں جھگڑا۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ وہ ہم میں سے نہیں۔ ہم میں سے ہوتا تو کب کا آپے سے باہر ہو چکا ہوتا۔ 1960ء کے آخر اور 70ء کی دہائی کے آغاز میں مجھے کیا معلوم تھا کہ حسن گھوڑے کے ریسیوں کی زبان میں "آؤٹ سائیڈر" ہے اور اپنی معصومانہ شکل وصورت کے ساتھ بیچ میں سے تاریخ دان نکل آئے گا۔ ممتاز ترقی پسند صحافی، مؤرخ اور دانشور زاہد چوہدری صاحب کو مجھ سمیت بہت سے پیرو مرشد مانتے تھے لیکن اُن کا خرقہ حسن جعفر زیدی کے نصیب میں تھا کہ استاد سے زیادہ شاگرد کی صلاحیتوں اور ہمت کو کون پہچانتا ہے؟ پیارے حسن، تم نے خرقہ کا حق ادا کر دیا۔ چوہدری صاحب کی زیرِ نگرانی تم نے برسوں سے علم و تحقیق میں خود کو غرق رکھا اور اُن کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی اپنا تحقیقی کام اُسی شد و مد سے جاری رکھا جو آج کئی کتابوں کی صورت میں ہم سب کی پہنچ میں ہے۔ فیض عام ہے!

میری نسل کو جب ہوش آیا یعنی جب ناک صاف کرنے اور پسینہ پونچھنے کے لئے اُس نے جیب میں سفید رومال رکھنا شروع کیا تو مادام نور جہاں کا قومی نغمہ "کرنیل نی جرنیل نی" ہر گلی اور ہر سڑک سے گزرتے کانوں میں پڑتا تھا۔ 1965ء کی پاکستان بھارت جنگ جونہی معاہدہ تاشقند پر منتج ہوئی تو دو برسوں کے بعد انہی گلیوں اور سڑکوں پر جنرل ایوب خان کے خلاف نعرے لگنے لگے۔ وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو ایوب حکومت سے

الگ ہو گئے اور انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی بنا کر ایوب خان کے خلاف تحریک میں نیا جوش و جذبہ بھر دیا۔ یہ وہ دور تھا کہ دنیا بھر میں سرمایہ داری نظام اور سامراج کے خلاف طلبہ اور نوجوانوں میں غم و غصہ کا اظہار احتجاج میں بدل چکا تھا اور کیا مغرب کیا مشرق، ہر سمت سے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ اُن دنوں اپنا معمول یہ تھا کہ دن کو جلوس نکالا، گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگائے، پولیس کی لاٹھیاں کھائیں، آنسو گیس اُن آنکھوں میں سہی جو ہم عمر اور ہم نظر صنف مخالف کے نزدیک بہت خوبصورت تھیں۔ لیکن تب آنکھوں کو زہریلی گیس سے بچانے کا خیال بھی دل و دماغ سے نہ گزرتا تھا۔ اندھے جوش و جذبہ کے انہی دنوں میں کسی ایک دن میں طالب علم تحریک پر اپنے ایک مضمون کے ساتھ ہفت روزہ ''نصرت'' کے دفتر گیا۔ ''نصرت'' اُس وقت انقلابی تبدیلی کے آرزومند عوام اور جدوجہد کرنے والے سیاسی کارکنوں کا ایک مورچہ تھا جس سے سرکاری اور رجعت پسند میڈیا کے خلاف صحافتی اور نظریاتی جنگ میں اول صف پر دفاعی اور جارحانہ لڑائی لڑی جارہی تھی۔ ''نصرت'' کا دفتر بھی کسی مورچہ کی مانند ہی تھا۔ بس لوہاری دروازہ کے باہر مسجد کے سائے میں ایک چھوٹی سی دکان تھی جس پر البیان کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ آگے کتابوں کے شیلف تھے اور ایک بھاری بھرکم شخص کی میز اور کرسی اور اُس کے بعد کاتب اور زیدی بھائی کا دفتر اور اُس کے بعد محمد حنیف رامے کی کرسی اور میز۔ اُس روز مجھے مکاں کا راز سمجھ آگیا کہ شاعروں نے تو محض دل کی وسعتوں کی نشاندہی کی ہے وہاں تو حنیف رامے صاحب نے ایک چھوٹی سی دوکان میں اتنا کچھ سمو دیا کہ آرائیں، شیخ پر بازی لے گیا۔ تب خیال بابا بلھے شاہ کی طرف گیا کہ سیدزادہ ہوتے ہوئے وہ بلاوجہ ہی تو آرائیں شاہ عنایت قادری پر فریفتہ نہیں ہوا تھا۔ حنیف رامے ''نصرت'' کے چیف ایڈیٹر تھے اور زیدی بھائی ایڈیٹر۔ وہ محبت سے ملے اور مضمون بھی اگلی اشاعت میں چھاپ دیا۔ پھر گاہے گاہے میں ''نصرت'' کے لئے طالب علم سیاست پر کالم لکھتا رہا۔ پھر جب رامے صاحب نے روزنامہ مساوات کا اجرکیا جس کی پوری داستان زیدی بھائی کی کتاب میں موجود ہے تو میں اُن لوگوں میں شامل تھا جن کی تقرری اخبار نکلنے سے کئی روز پہلے ہوئی اور میں نے اخبار کی ڈمی کے لئے بھی کئی دن تک خبریں فائل کیں۔

تب اگلی گلی میں مساوات کا دفتر تھا اور پچھواڑے میں نصرت کا۔ لیکن تب زیدی بھائی نصرت کے سولو ایڈیٹر تھے اور دفتر بھی دکان نہیں لگتا تھا۔ میں تب بھی کبھی کبھی نصرت کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا اور زیدی بھائی چھاپتے رہتے۔

منہاج برنا صاحب مجھے کہتے کہتے اس دنیا سے چلے گئے کہ صحافیوں کی جدوجہد کی تاریخ لکھو۔ کاش میں حسن جعفر زیدی ہوتا کہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے جسم و جان پر سہا، سب کچھ لکھ سکتا۔ اعجاز رضوی مرحوم، احفاظ الرحمن اور کچھ دوسرے صحافی دوستوں نے دو چار مضامین ضرور لکھے لیکن نصف حق بھی ادا نہ ہو سکا۔ ہماری عادت ہے کہ ہم خود جو نہیں کر سکتے، دوسروں کو وہ کرنے کا مشورہ دیتے رہتے ہیں۔ میں نے بھی زیدی بھائی سے زندگی میں جانے کتنی بار کہا ہوگا کہ اپنی خودنوشت لکھیں۔ زیدی بھائی نے دھیمے سروں کی طبع پائی ہے۔ اُن کی استائی تو کان پڑتی ہے لیکن یہ سمجھنا کارِمحال ہے کہ اُس میں دادرا کے کتنے سُر ہیں اور ٹھمری کے کتنے؟ بولتے کم ہیں اور سنتے زیادہ۔ میرا مطلب ہے، ہم جیسے فرفر بولنے والوں کے مقابلے میں وہ چپ چاپ اپنا کام کئے چلے جاتے ہیں۔ ایک روز اُن کی طرف سے خبر آئی کہ خودنوشت تیار ہے۔ سو جب دیکھنے پہنچے تو استادِ محترم امین مغل اُس پر نظرِثانی کر چکے تھے۔ اب جو کتاب کے نسخہ کی ورق گردانی شروع کی تو منہ لٹکتا چلا گیا۔ میں تو واحد متکلم کی آس لگائے تھا یہاں تو قصہ ہی اور نکلا۔ واحد متکلم بیچ میں کہیں کہیں اور وہ بھی انتہائی ضرورت کے تحت، کتاب پر تو جمع متکلم نے ایسا قبضہ جما رکھا تھا کہ مغلوں کی تاریخ سے شروع ہو کر، انگریزوں کے دور کی مسلح تحریکوں سے ہوتے ہواتے پاکستان کی پوری تاریخ کو نہ صرف بیان کیا بلکہ ہر باب میں یہ بھی یقینی بنایا کہ کوئی واقعہ، تجزیے کے بنا قاری تک نہ پہنچ پائے۔ امین مغل صاحب کی خوشی بھی سمجھ میں آ گئی اور اپنی ناسمجھی بھی۔ سو صاحبو! کسی دھوکہ میں نہ رہنا یہ روایتی خودنوشت نہیں بلکہ ایک تاریخی اور تجزیاتی کتاب ہے۔ بس اس جگ بیتی کی آپ بیتی سے کچھ ایسی جڑت ضرور ہے جو شاید بظاہر اتنی عیاں نہ ہو لیکن اندر اندر کہیں ایسی جڑی ہوئی ہے کہ آپ واحد متکلم کو جمع متکلم سے الگ کر ہی نہیں سکتے۔

انقلابی اور غیر انقلابی دانشوروں کے میزان اور ناپ تول کا اعشاری نظام الگ الگ ہوتا ہے لیکن دونوں اپنی اپنی استطاعت کے مطابق تاریخ بنانے یا تاریخ بگاڑنے میں فردِ واحد کے کردار کو تسلیم کرتے ہیں گو اُس کے دام بھی اپنے ناپ تول کے پیمانوں سے الگ الگ رکھتے ہیں۔ ہم خطہ پاکستان میں جنم لینے والوں کا معاملہ یہ ہے کہ فردِ واحد سے فوری طور پر ہمارا تصور اُن فوجی آمروں کی طرف چلا جاتا ہے جنہوں نے طویل عرصہ تک ہمارے ملک پر بلاشرکت غیرے حکمرانی کی اور پھر یہ تصور انہی کے ادوار میں ایسا کھو جاتا ہے کہ واپس آنے کا نام نہیں لیتا۔ میری اور کسی حد تک مجھ سے چند سال پہلے یعنی زیدی بھائی کی نسل نے فوجی آمریتوں اور جعلی جمہوریت کے ادوار ہی بھگتے ہیں۔ کتاب میں اِن ادوار کے بیان میں واحد اور جمع متکلم سب ایک ہو جاتے ہیں۔ تب تاریخی پس منظر میں ذاتی مشاہدہ وتجربہ اپنا خوب رنگ دکھاتا ہے۔ جنرل ضیا کا دور ایسا تھا کہ کوئی مانے نہ مانے، پاکستان کی تاریخ قبل اور بعد از جنرل ضیا میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔ عمودی اور افقی تقسیم کے بارے میں بھٹو نے جیل کی کال کوٹھڑی سے جو پیش گوئی کی تھی وہ حقیقت بن گئی اور اب فاٹا سے لے کر کراچی تک عوام اس عمودی اور افقی تقسیم میں کچلے چلے جا رہے ہیں۔ مذہب کے نام پر پاکستان میں جو خونی کھیل کھیلا جا رہا ہے اُس کے تھمنے کا دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ ہم ان حالات تک کیسے پہنچے؟ زیدی بھائی کی کتاب میں اس کا تاریخی اور سماجی تناظر میں معروضی جواب تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

میں اور شاہد محمود ندیم 1979ء میں پاکستان سے بھاگ کر لندن پہنچے۔ تب لندن میں کوئی بیس تیس کے قریب پاکستانی جلاوطن تھے۔ ایک دوسرے کے اتنے قریب کہ ایک سانس لے تو دوسرا اُس کی سانس کی گرمائش یا ٹھنڈک کو اپنے وجود پر محسوس کر لے۔ جوں جوں پاکستان میں جبر و تشدد بڑھتا گیا، برطانیہ میں جلاوطنوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی اور لندن پاکستانی جلاوطنوں سے بھر گیا۔ یہاں بھی وہی جلسے، جلوس اور مظاہرے۔ 1983ء میں زیدی بھائی بھی لیبیا سازش کیس بھگتنے کے بعد بھابھی اور بچوں سمیت لندن آنے میں کامیاب ہو گئے۔ تب سے اب تک، برس گزرے، دہائیاں بیتیں، ہم ساتھ ساتھ ہیں۔

پہلے ہمارے پیروں تلے پلیٹ فارم تھا اور یہ واہمہ کہ پاکستان آج لوٹے کہ کل! لیکن اب ہم منہ چڑاتے زمینی حقائق کا سامنا کرنے کا گر سیکھ چکے ہیں۔ باہر واقعی جنگل بن چکا ہے بلکہ جنگل کے قانون بھی پامال کئے جا رہے ہیں اور اندر کی آگ اب ''قہر درویش بر جان درویش'' کی مثل خود کو ہی روز جلاتی اور بھسم کرتی رہتی ہے۔ اب مجھ جیسا اس سنجیدہ کتاب پر اور کیا لکھے گا!! بس ع

آج اک درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے!

علی جعفر زیدی کا خواب

اثر چوھان
مئی، 2005ء
اسلام آباد

(میرے برطانوی الیکشن 2005ء کے بارے میں بہت پرانے مہربان دوست، نامور کالم نویس اور صحافی اثر چوہان نے 31رمئی 2005ء کو پاکستان کے ایک روزنامے میں ''سیدعلی جعفر زیدی کا خواب'' کے عنوان سے ایک کالم لکھا جس کو بعد میں انہوں نے اپنی کتاب ''سیاست نامے'' کا حصہ بھی بنایا۔ وہ کالم حسب ذیل ہے۔)

ممتاز دانشور، ترقی پسند سیاست دان اور ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی کے سرکاری ترجمان، ہفت روزہ ''نصرت'' لاہور کے سابق ایڈیٹر سید علی جعفر زیدی لندن (انتخابی حلقہ ٹوٹنگ) سے MP کا انتخاب ہار گئے۔ وہ برطانیہ کے بائیں بازو کے معروف سیاست دان جارج گیلوے کی Respect Party کے نامزد امیدوار تھے۔ زیدی صاحب کو لیبر پارٹی کے امیدوار پاکستانی نژاد صادق خان نے ہرادیا۔

سید علی جعفر زیدی 1983ء سے لندن میں ہیں۔ بین الاقوامی مسائل پر مختلف اخبارات ورسائل میں ان کے مضامین اور کالم چھپتے ہیں۔ جنگ کے خلاف اور امن کے حامی ہیں۔ انسانی حقوق کے علمبردار ہیں اور ہر دور کے سامراج کو چیلنج کرنا ان کی عادت ہے۔ ایسا شخص انتخاب نہیں ہارے گا تو کیا کرے گا؟

میں زیدی صاحب کو 1963ء سے جانتا ہوں۔ وہ گورنمنٹ کالج سرگودھا میں

سال چہارم کے طالب علم تھے اور ڈرامیٹک سوسائٹی کے روح رواں۔ 1963ء میں گورنر مغربی پاکستان ملک امیر محمد خان نے بدنام زمانہ یونیورسٹی آرڈی نینس اور کالا قانون پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈی نینس جاری کیا۔ میں ان دنوں سرگودھا یونین آف جرنلسٹس کا صدر تھا۔ سرگودھا میں یونیورسٹی آرڈی نینس کے خلاف طلبہ کا جلوس سید علی جعفر زیدی کی سرکردگی میں نکلا اور پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈی نینس کے خلاف صحافیوں کے جلوس کی قیادت میں نے کی تھی۔

میں نے 1960ء ہی میں مذہب عشق (شعبہ صحافت) اختیار کرلیا تھا جب میں بی اے فائنل میں تھا۔ زیدی صاحب کراچی اور لاہور میں طالب علم لیڈر کی حیثیت سے وقت گزار کر مارچ 1969ء میں حنیف رامے مرحوم کے ہفت روزہ ''نصرت'' لاہور کے ایسوسی ایٹ ایڈیٹر بنے، پھر ایڈیٹر۔ رامے صاحب چیف ایڈیٹر تھے۔ میں نے دسمبر 1969ء میں نصرت میں کالم نگاری اور مضمون نویسی شروع کی۔ 7ر جولائی 1970ء کو پیپلز پارٹی کے سرکاری ترجمان روزنامہ مساوات کے اجرا سے قبل چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کی امیج بلڈنگ اور پیپلز پارٹی کے پروگرام کی تشہیر و اشاعت میں ''نصرت'' نے جو جرأت مند اور بے مثال کردار ادا کیا وہ ناقابل فراموش ہے۔

حنیف رامے پیپلز پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے ساتھ ساتھ پارٹی کے سب سے بڑے ادارے ''اصولی کمیٹی'' کے رکن بھی تھے۔ اصولی کمیٹی کے صرف تین ارکان تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو، ڈاکٹر مبشر حسن اور حنیف رامے۔ رامے صاحب کو بھٹو صاحب کی مشاورت، پارٹی کے اجلاسوں میں شرکت اور عام جلسوں میں تقریروں کے لیے لاہور سے باہر بھی وقت دینا پڑتا تھا۔ ''نصرت'' کی پالیسی کے نگران تو رامے صاحب تھے لیکن سارا بوجھ زیدی صاحب کے جوان کندھوں پر تھا۔ انہیں کھانے پینے کی بھی ہوش نہیں رہتی تھی۔ بھابھی شمیم زیدی گھر سے کچھ بھجوا دیتیں۔ کبھی میں انہیں زبردستی اٹھا کر گوالمنڈی کی مچھلی کی کسی دکان پر لے جاتا تھا یا دفتر ہی میں تن و روح کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے ہلکی پھلکی موسیقی کا انتظام کرلیا جاتا۔ فلمی ہیرو سے بھی زیادہ خوبصورت سید علی جعفر زیدی نے بھٹو اور پارٹی کے عشق میں دن رات کام کیا اور ان کی گھنی زلفوں میں وقت سے پہلے ہی

چاندی کے تار دمکنے لگے۔

کراچی میں ترقی پسند نوجوان لیڈروں معراج محمد خان، حسین نقی، سید سعید حسن اور فتح یاب علی خان کی رفاقت اور راولپنڈی میں ڈاکٹر مس کنیز فاطمہ یوسف کی تربیت میں زیدی صاحب نے طریقت ترقی پسندی میں سلوک کی کئی منزلیں طے کیں۔ ڈاکٹر صاحبہ گورنمنٹ کالج راولپنڈی کی پرنسپل تھی اور زیدی صاحب وہاں کی پوسٹ گریجوایٹ جیوگرافیکل سٹوڈنٹ یونین کے صدر تھے۔ یہ 1967ء کا دور تھا۔

بھٹو صاحب اور پیپلز پارٹی کی مقبولیت بڑھ رہی تھی۔ زیدی صاحب نے یونین کی تقاریب میں خورشید حسن میر، حنیف رامے اور پاکستان کے دیگر لیڈروں کو باری باری مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا۔ اس سے پہلے بھٹو صاحب سے زیدی صاحب کی کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں اور وہ بھی ملک کے دوسرے نوجوانوں کی طرح بھٹو کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو گئے تھے۔

''نصرت'' کی ایسوسی ایٹ ایڈیٹر شپ کے لیے ڈاکٹر کنیز یوسف نے اپنے شاگرد رشید کو رامے کی خدمت میں پیش کیا تھا اور اس طرح سے موصوف ''فنا فی النصرت'' ہوئے۔ روزنامہ مساوات جاری ہوا تو میں اس میں گم ہو گیا۔ ''نصرت'' اور ''مساوات'' کے دفاتر ایک ہی بلڈنگ میں تھے ۔

''دل کے آئینے میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی''

والا معاملہ تھا۔ علی جعفر زیدی 1973ء تک نصرت کے ایڈیٹر رہے...... ڈاکٹر مس کنیز یوسف، ان کے بھائی بریگیڈئر محمد عثمان اور دوسروں کے خلاف لیبیا سازش کیس بنا تو علی جعفر زیدی بھی مشکوک قرار دیئے گئے۔ بیگم شمیم زیدی بھی ڈاکٹر مس کنیز یوسف کی شاگردہ رہ چکی تھیں اور خواتین کے حقوق کے لیے سرگرم، یعنی نصف بہتر اور ایک کہتر، دونوں سرکار کی نظروں میں ناپسندیدہ۔ میاں بیوی نے عافیت اسی میں سمجھی کہ بچوں سمیت وطن عزیز کو خیر باد کہہ دیں۔ عزیز و اقارب اور دوستوں کے دلوں پر آتی جاتی سانس کی

صورت میں دہری دھار کے خنجر چل رہے تھے۔ قیامِ پاکستان کے لیے قربانیاں دینے والے خاندان کے بزرگ خوش دلی سے سادات بارہہ کے اس لائق ترین اور ذہین ترین فرزند کے بازو پر امام ضامن باندھ کر اس کے خیر و عافیت سے لندن پہنچنے کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔

لندن میں بے نظیر بھٹو، غلام مصطفی جتوئی، غلام مصطفی کھر اور پارٹی کے دوسرے لیڈروں کے ساتھ مل کر علی جعفر زیدی نے پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کی جدوجہد جاری رکھی اور جب محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپریل 1986ء میں لاہور آنے کا پروگرام فائنل کر دیا اور علی جعفر زیدی سے ساتھ چلنے کو کہا تو انہوں نے معذرت کر لی اور کہا کہ ''میں امام حسینؑ کی اولاد ہوں اور یزید وقت سے مصالحت نہیں کر سکتا۔'' پھر راستے جدا ہو گئے۔ غلام مصطفی جتوئی اور غلام مصطفی کھر نے نیشنل پیپلز پارٹی میں اہم مقام دینا چاہا تو بولے ''میں دورِ حاضر کی سیاست کے لیے ''Misfit'' ہوں۔ لیکن سامراج اور اس کے گماشتوں کے خلاف جنگ کرتا رہوں گا۔''

بیگم و سید علی جعفر زیدی اور بچے مستقل طور پر لندن کے ہو رہے۔ زین جعفر کا اپنا کاروبار ہے۔ قراۃ العین بائیوکیمسٹری میں ڈاکٹریٹ کر کے ایک باعزت جاب کر رہی ہیں۔ سرمد جعفر میڈیکل ڈاکٹر ہیں اور نرجس ایم بی اے ہیں اور ایک معقول منصب پر فائز ہیں۔ زیدی صاحب کا اپنا الگ بزنس ہے۔ شمیم زیدی ان کی معاونت کرتی ہیں۔ تبھی تو وہ سیاست کے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔ زیدی صاحب کی والدہ اور والد صاحب مملکت خدا داد پاکستان کی ترقی کی خواہش لے کر خدا کے پاس چلے گئے۔ زیدی صاحب نے خواب دیکھنا بند نہیں کیے۔ ان کا یقین ہے کہ پاکستان صحیح معنوں میں فلاحی مملکت بن کر رہے گا۔ یہی خواب میں بھی دیکھتا ہوں۔ لیکن یہ خواب شرمندہ تعبیر کون کرے گا؟ کیا خونِ صد ہزار انجم سے پہلے سحر پیدا نہیں ہوگی؟

تیز ہوا میں ایک چراغ

خالد محبوب
جون، 2014ء
لاہور

ہم یعنی میں اور حسن جب دوست ہوئے تو میں از خود برادر خورد اور علی جعفر ہمارے بھائی صاحب ہوئے۔ ان کی شفقت شامل حال رہی۔ تاہم تحریر کے دوران یہ آواز ضرور سنائی دیتی رہی۔ ''حد ادب!''

بھائی صاحب ہمیشہ سے صاحب علم تو تھے ہی اب صاحب کتاب بھی ہو گئے۔ ''باہر جنگل اندر آگ'' ان کی پہلی کتاب ہے اور یہ بات تو طے ہے کہ یہ اُن کی آخری کتاب نہیں ہو گی کیونکہ ہم سب مل کر اُنہیں ایسا کرنے نہیں دیں گے۔

''باہر جنگل اندر آگ'' ہر لحاظ سے ایک منفرد کتاب ہے۔ یہ عمومی آپ بیتی بھی نہیں ہے جس میں بیشتر مصنف حقیقی واقعات میں جگہ جگہ مصلحت آمیز جھوٹ کی پیوندکاری کر دیتے ہیں تاکہ ذکر عاشقی بھی ہو جائے اور عزت سادات بھی بچی رہے۔ دوست یار بھی خوش اور بیگانے بھی مطمئن۔ یہ ہمارے یہاں لکھی جانے والی تاریخ کی بیشتر کتابوں سے بھی علیحدہ نظر آتی ہے۔ ایسی کتابیں جن میں لکھنے والے، جھوٹ اور غلط بیانیوں کے آمیزے میں کہیں کہیں سچ کا چھینٹا دے کر اپنا کام چلاتے ہیں۔ علی جعفر کی یہ کتاب اس لحاظ سے منفرد ہے کیونکہ اُنہوں نے اپنی زندگی کے سفر کو اپنی عصری تاریخ کے سفر کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی قابل تحسین کوشش کی ہے۔ اس وجہ سے ان کی مشکلات میں خاصا اضافہ ہوا ہو گا کیونکہ ان کے لئے سچ کہے بغیر گزارہ ممکن نہیں اور یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ سچ کہا جائے تو ''بھانبڑ مچتا'' ہے۔

فرد اور تاریخ کا تعلق بہت گہرا ہے۔ ہارورڈ ژن لکھتا ہے ''تاریخ کی (بہت) اہمیت ہے۔ اگر آپ تاریخ سے لاعلم ہیں تو پھر یہ ایسا ہی ہے کہ آپ کل پیدا ہوئے تھے۔ اور اگر آپ گزشتہ دن جنمے تھے تو پھر بالا دست شخص آپ کو کچھ بھی سکھا سکتا ہے۔'' ہمارے ہاں تو یہ کوشش شعوری ہے۔ تاریخ سے ہم بے بہرہ رہے۔ اور رکھا گیا۔ علی جعفر لکھتے ہیں: پہلی جماعت کے اردو قاعدے میں جو سبق پڑھنے کو ملا تھا وہ تھا ''صبر کر۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ یعنی ظلم کے خلاف جدوجہد نہ کر بلکہ صبر کر'' ایک اور سبق جو اس قاعدے میں پڑھنے کو ملا وہ تھا ''غریب کی مدد کر۔ یعنی ایک ایسا طبقاتی معاشرہ جس میں لوگ غریب ہوں مگر آپ دولت مند ہوں...... رہی سہی کسر مولوی نے پوری کر دی، غربت کے بدلے ثواب کا لالچ دے کر۔'' اور پھر علی جعفر نے انتہائی محنت اور حوالوں کے ساتھ اس کے تانے بانے ضیاالحق کی ظلمت باطل کے ساتھ جوڑ دیئے ہیں۔ آج ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے، تاریخ سے لاعلمی کے بنا پر ہو رہا ہے۔ اور ہم واقعتاً ایسے نوزائیدہ بچے ہیں جن کو کوئی کچھ بھی کہہ دے ہم مان لیتے ہیں اور اُس کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ یہاں کے Pie the Piper کو بانسری کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ ہم بس چل پڑتے ہیں...... کچھ تو ختم ہو جاتے ہیں۔ جو بچ جاتے ہیں وہ روتے رہتے ہیں۔ علی جعفر زیدی کوئی کوئی ہوتا ہے جو باہر جنگل اندر آگ کا تجربہ سہتا ہے اور لکھتا ہے تاکہ ہم بڑے ہو جائیں۔ یہ اپنے عہد کی ایک مستند تاریخ بھی ہے۔

تمام دریا اپنے آغاز میں ننھی منی ندیاں ہی ہوتے ہیں۔ علی جعفر کی زندگی بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ ابتدا پرسکون، بے فکر اور بے نیاز اور پھر اچانک تیز رو (Rapids) اور پھر تھوڑا پرسکون بہاؤ اور اچانک پھر تیز رو۔ دریا جب بہتا ہے تو خواہ کتنے ہی موڑ کاٹے، کتنی ہی دشوار گھاٹیوں سے گزرے، جہاں سے گزرتا ہے وہاں زندگی کی لہر دوڑا دیتا ہے اور اپنے نشان چھوڑ جاتا ہے۔ علی جعفر جہاں سے گزرا زندگی کی لہر دوڑاتا ہوا اور اپنے نشان چھوڑتا ہوا گزرا ہے اور اُس نے کہیں بھی اپنے معاونین کو نہیں بھلایا۔ باہر جنگل اندر آگ کو اسی سلسلہ کی کڑی سمجھا جائے گا۔ کیونکہ یہ اب بہت سے لوگوں میں زندگی کی لہر دوڑائے گی اور اپنے نقوش چھوڑے گی۔ Keep it Up بھائی صاحب! زندگی ابھی باقی ہے۔

ایک محب وطن کا شہرِ آشوب

حسن جعفر زیدی

جون، 2014ء
لاہور

علی جعفر زیدی، جو میرے اور باقی بھائیوں کے ''بھائی صاحب'' ہیں، اپنے بچوں اور خاندان وغیر خاندان کے سب لڑکے لڑکیوں کے ''بابا'' ہیں اور اپنے تمام دوست واحباب کے لئے ''زیدی صاحب'' ہیں، مجھ سے ساڑھے چار سال بڑے ہیں۔ ساٹھ کے عشرے کے اواخر میں پاکستان میں ایک ایسی فقید المثال عوامی انقلابی تحریک چلی کہ عمروں کے فرق مٹ گئے۔ بچے، جوان، بوڑھے، مرد وعورت سب ایک بھرپور سیاسی عمل میں شریک ہوگئے۔ تبدیلی اور انقلاب کا سیاسی عمل، دنیا کے بڑے بڑے انقلابوں کی طرح کا انقلاب پاکستان میں لانے کی تمناؤں اور امنگوں سے لبریز بھرپور جدوجہد کا عمل۔ اور اس جدوجہد کے عمل میں جب بھائی صاحب طلبہ تحریک میں پیش پیش ہوئے اور پھر اس عہد کی عوامی تحریک کے سب سے بڑے ترجمان ہفت روزہ نصرت کی ادارت کے ذمہ دار ہوئے تو ان کی ولولہ انگیزی سے مہمیز لے کر میرے سیاسی شعور نے بھی زقند لگائی اور یوں میں نوعمری میں ہی نصرت کے لکھنے والوں میں شامل ہوگیا۔ میں 1970ء میں انجینئرنگ یونیورسٹی کے فرسٹ ائیر میں تھا جب بھائی صاحب کی زیرتربیت پہلی مرتبہ سیاسی مضمون نگاری کا سلسلہ شروع کیا۔ اس اعتبار سے وہ میرے سب سے پہلے سیاسی گرُو (Mentor) بھی ہیں۔

60ء کے عشرے میں پاکستان کی تاریخ کی سب سے بھرپور عوامی بیداری، فکری آزادی اور انقلابی شعور کی لہر اٹھی تھی۔ یہ بپھری ہوئی عوامی لہر بہت وسیع اور بہت بلند تھی۔ یہ اتنی ہمہ گیر اور ہمہ جہت تھی کہ ہر شعبۂ زندگی میں ولولہ انگیز انقلابی تبدیلیوں کے امکانات نظر آنے شروع ہو گئے تھے۔ رجعت پسند قوتیں، حکمران طبقات اور ان کے سامراجی آقا اس سے خائف نظر آنے لگے۔ بھائی صاحب اسی بپھری ہوئی عوامی لہر کے دوش پر سوار عوامی امنگوں اور خواہشات کے خوابوں کا شہر تعمیر کرنے میں لگ گئے۔ اور پھر یہ شہر آباد ہوتا نظر بھی آنے لگا۔ 70ء کے انتخابات میں ملک کے کروڑوں عوام نے ایک ایسے نظام کے لئے ووٹ دیئے تھے جس میں عوام کی حاکمیت ہو، پیداوار کرنے والے کو پیداوار کی ملکیت حاصل ہو، کارخانے اور اس سے پیدا ہونے والے سرمائے کا مالک مزدور ہو۔ کھیت اور اس کی پیداوار کا مالک کسان ہو۔ وطن کا دفاع عوام خود ایک عوامی فوج کے ذریعہ انجام دیں اور سامراج کا غلبہ دور دور بھی پر نہ مار سکے۔ فوجی اور سول اسٹیبلشمنٹ کی پروردہ دین فروش رجعت پسند قوتوں، مُلّائیت اور دقیانوسیت کے علمبرداروں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور سامراج کے گماشتوں کو بھرپور عوامی طاقت کے سیلاب نے انتخابات میں خس و خاشاک کی طرح بہا دیا۔ لیکن نظام کی تبدیلی محض ووٹ کے ذریعہ نہ آ سکی۔ فوجی قوت نے انتخابی نتائج رد کر دیئے، ملک توڑ دیا مگر عوام کا فیصلہ منظور نہ کیا۔

سانحۂ 71ء کے بعد بچے کھچے پاکستان کا اقتدار بظاہر عوامی نمائندوں کے سپرد کیا گیا۔ لیکن یہ اقتدار جعلی ثابت ہوا۔ جاگیرداروں اور رجعت پسند قوتوں نے ''قائدعوام'' کی سرپرستی میں اقتدار پر قبضہ حاصل کر لیا، عوام اقتدار تک نہ پہنچ سکے۔ بقول ڈاکٹر مبشر حسن عوام کے لئے یہ محض اقتدار کا سراب تھا جو بہت جلد مایوسی میں تبدیل ہو گیا۔ 70ء میں عوام نے جو بویا تھا، 77ء تک اس کی فصل کاٹ کر کوئی اور لے گیا تھا۔

اسٹیبلشمنٹ، حکمران طبقات اور ان کے سامراجی آقاؤں کے لئے اصل مسئلہ وہ عوامی شعور تھا جو بیدار ہونے کے بعد اپنے لئے نئی راہوں کا متلاشی تھا۔ اسے بوتل میں بند کرنے اور کچل کر ریزہ ریزہ کرنے کے لئے آہنی شکنجہ کی ضرورت تھی جو 1977ء

میں ضیا الحق کے مارشل لاء کی بھیانک صورت میں پورے ملک پر آسیب کی طرح چھا گیا۔ کوڑے، پھانسیاں، قید، جرمانے، جلا وطنیاں، موقع پرستیاں۔ 11 سال بعد یہ ایک مختلف ملک تھا۔

70ء کے عوامی شعور نے اپنی امنگوں، تمناؤں اور خواہشات کا جو شہر آباد کیا تھا، زیرِ نظر کتاب اسی شہر کا شہرِ آشوب ہے۔ ادب کی روایت میں کسی شہر کی بربادی کو نظم کرنے کا نام شہرِ آشوب کہلاتا ہے۔ بھائی صاحب کی یہ کتاب نثر کے بیان میں ایک محب وطن کا شہرِ آشوب ہے۔ ایک ایسا محب وطن جسے اپنی دھرتی کے چپہ چپہ سے پیار ہے۔ وہ اس وطن کے اکثریتی طبقے یعنی محنت کش عوام سے جڑا ہوا ہے۔ وہ وطن، اس کے کھیت کھلیان، کارخانے، نہریں، دریا، معدنی ذخائر، پہاڑ، وادیاں، جھیلیں، پھل، پھول، فصلیں اور پیداوار، سب سے پیار کرتا ہے اور ان سب کے تحفظ کے لئے بیرونی حملہ آوروں کے خلاف دفاع کے علاوہ اندرونی لٹیروں یعنی سیاسی شعبدہ بازوں، مذہبی دہشت گردوں، جاگیرداروں، گماشتہ سرمایہ داروں، تاجروں اور عوام دشمن ریاستی اداروں کی لوٹ مار سے محفوظ کرنے کا عزم رکھتا ہے۔ یہ اس اکیلے کا عزم نہیں ہے بلکہ ملک کے 18 کروڑ عوام کا بھی یہی عزم ہے۔

یہ کتاب ایک شہرِ آشوب ضرور ہے، اس کے بعض حصے پڑھتے ہوئے کئی مقام ایسے آتے ہیں جب انسان اشک بار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن مصنف کے نزدیک یہ پاکستان کی سیاسی کشمکش کا سفرِ مسلسل ہے۔ وہ آپ کو جدوجہد اور امید کی شاہراہ پر گامزن رہنے کا پیغام دیتا ہے اور دنیا میں ہونے والی انقلابی تبدیلیوں سے مربوط کرتے ہوئے آپ کو نشانِ منزل کا پتہ بھی دیتا ہے۔ کشمکش کے طویل اور صبر آزما سفر کی منزل کے بارے میں اس کا نظریہ بھی بقول فیض یہی ہے کہ ع

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

باہر جنگل، اندر آگ

خاندانی پس منظر

ہمارے ددھیال کا تعلق سادات بارہہ سے ہے اور ننھیال کا تعلق سادات برست سے۔ برست تحصیل پانی پت ضلع کرنال اور سادات بارہہ یوپی میں ہے۔ دونوں زیدی خاندان ہیں جن کا نسلی تعلق حضرت زیدؓ شہید سے ہے۔ حضرت زیدؓ شہید حضرت زین العابدین کے بڑے فرزند تھے۔ زین العابدینؓ امام حسینؑ کے فرزند۔ امام حسینؑ حضرت علیؑ کے فرزند اور حضرت علیؓ رسول پاکؐ کے داماد، چچا زاد بھائی اور حضرت ابوطالبؑ کے فرزند۔ واقعہ کربلا کے بعد جب یزید نے خانہ کعبہ اور مدینہ منورہ کو مسمار کیا اور مسلمانوں میں یورش پیدا ہوئی تو اس وقت تک اہل بیت کو اہل عجم کی حمایت حاصل ہو چکی تھی۔ زیدؓ شہید خراسان میں مقیم ہو گئے۔ حضرت زیدؓ نے اور بعد میں ان کے بیٹے یحیٰی نے اموی حکومت کے خلاف بغاوت کی۔ ان کے تسلط کو تسلیم نہیں کیا اور یکے بعد دیگرے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ ان کی اولاد وسطِ ایشیاء سے آنے والے حملہ آوروں بالخصوص مغلوں کے ساتھ ہندوستان آتی رہی اور وہیں آباد ہوتی رہی۔ ہمارے بزرگ بھی اسی دوران ہندوستان آئے۔ ان کو بارہ گاؤں پر مشتمل جاگیر عطا کی گئی۔ یہ بارہ گاؤں انہیں اس لیے دیئے گئے تھے کہ جب کبھی بادشاہ ہند کو فوج کی ضرورت ہو گی تو یہ کچھ ہزار فوجی مہیا کریں گے جن میں پیادہ فوجیوں سے لے کر گھڑ سوار تک سب ہی شامل ہوں گے۔ بارہ گاؤں کی مناسبت سے انہیں سادات بارہہ کہا جاتا تھا۔ سادات بارہہ کو دربار میں اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ تاریخ میں انہیں بادشاہ گر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

1857ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کو سادات بارہہ کی طرف سے بہت

بڑی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ میں اس جنگ کو ایک عظیم انقلاب سمجھتا ہوں۔ یہ ایک عہد آفریں جنگ ہے جو ایک تاریخی دور کے اختتام اور جدوجہد کے نئے عہد کے آغاز کی علامت ہے۔ اس عوامی انقلاب کو غدر قرار دے کر انگریزوں نے بڑی بے رحمی سے کچلا۔ ہمارے بزرگوں کی لاشوں کو سادات بارہہ کے علاقے میں درختوں کے ساتھ لٹکایا گیا تاکہ آئندہ مزاحمت کرنے والوں کو عبرت حاصل ہو۔ مگر بغاوت کی یہ آگ بجھ نہ سکی۔ تحریکِ آزادی کی شمع روشن رہی۔ انگریز کے خلاف نفرت کا لاوا ابلتا رہا اور بالآخر ہندوستان کی آزادی، عوام کا نصب العین بن گیا۔ اسی روشنی سے سبھاش چندر بوس کی آزاد ہند فوج اور دوسری باغیانہ اور آزادانہ تحریکوں نے جنم لیا۔

جلیانوالہ باغ ہو یا آزاد ہند فوج کا مقدمہ، بحریہ کے ہندوستانی عملے کی ہڑتال ہو یا برطانوی مصنوعات کا بائیکاٹ، ہر جگہ، ہر مقام پر ہمیں یکجہتی نظر آتی ہے۔ برطانوی سامراج سے آزادی کے لیے ایک مشترکہ جدوجہد۔ تمام لوگ اس گھناؤنی سیاہ رات کے مخالف تھے اور ہر کوئی چراغ جلانے اور روشنی پھیلانے کے لیے میدان عمل میں تھا۔

سراج الدولہ، ٹیپو سلطان، بہادر شاہ ظفر، بیگم حضرت محل، جھانسی کی رانی جو انگریزوں کے ساتھ لڑتے ہوئے ماری گئی، نانا صاحب، مولانا احمد شاہ، بھگت سنگھ، منگل پانڈے، پنجاب کی کھرل برادری اور سندھ کے کئی خاندان، سب نے جانی و مالی قربانیاں دے کر ہندوستان کے سب طبقوں اور مذاہب کے لوگوں کو ایک لازوال رشتے میں جوڑ کر ایک مرکز پر لا کر کھڑا کر دیا۔ یہ حصول آزادی کا مرکز تھا۔

ظالم کے خلاف جدوجہد اور اپنی آزادی کی جنگ لڑنا ہمارے خون میں ہے۔ آج بھی سب نے دیکھا کہ عراق میں امریکی صدر بُش کو جوتا مارنے والا بھی زیدی تھا اور بش اور بلیئر کی عراق پر مسلط کی جانے والی غیر قانونی اور غیر اخلاقی جنگ کے خلاف 2005ء کا برطانوی پارلیمنٹ کا لندن سے الیکشن لڑنے والا بھی علی جعفر زیدی۔

عراق پر جھوٹ کی بنیاد پر جنگ مسلط کئے جانے کے خلاف 2003ء میں لندن کی سڑکوں پر تقریباً 20 لاکھ برطانوی عوام، جن میں پاکستانی خال خال تھے، جب نکلے تو

Respect پارٹی نے اس تحریک سے جنم لیا۔ جن کے رہنما جارج گیلوے تھے۔ میں نے اس پارٹی کے ٹکٹ پر لندن کے علاقے ٹوٹنگ سے 2005ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے انتخابات میں یہ الیکشن ایک سوشلسٹ اور جنگ مخالف امیدوار کے طور پر ٹونی بلیئر کی اندرونی اور بالخصوص خارجہ پالیسی (جس نے برطانیہ کو امریکہ کا دم چھلا بنا دیا) کے خلاف لڑا۔ مقصد الیکشن میں ہار جیت کا نہیں تھا بلکہ اس ایک لاکھ ووٹروں کے حلقۂ انتخاب میں عوام تک اس صداقت کو پہنچانا تھا کہ عراق کے عوام پر یہ جنگ بے بنیاد مفروضوں پر مسلط کی گئی ہے اور اس کی حیثیت غیر قانونی اور غیر اخلاقی ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ کہ صدام حسین نے اپنے عوام پر بے پناہ مظالم کئے تھے اور ایک عرصے تک وہ مغربی سامراج کا حاشیہ بردار رہا تھا مگر اب مغربی استعمار بالخصوص امریکی سامراج صدام سے جان چھڑا کر اس علاقے میں اپنی فوجیں اتار کر براہ راست اپنی بالادستی قائم کرنا چاہتا تھا۔ بالخصوص ایران اور وہ تمام عرب ممالک جو امریکی سامراجیت کے خلاف تھے اور جہاں جہاں استعماریت اور صیہونیت کے خلاف تحریکیں مضبوط تھیں وہ انہیں ختم کرنا چاہتا تھا۔

گو کہ میں پارلیمنٹ کے ہاؤس آف کامنز میں تو نہیں پہنچ پایا مگر نظریاتی سطح پر میری جیت ہوئی۔ کیونکہ آج ساری دنیا اس بات کو تسلیم کر چکی ہے کہ یہ جنگ غیر قانونی اور غیر اخلاقی تھی۔ ہالینڈ کے انکوائری کمیشن نے تو حال ہی میں اس جنگ کو غیر قانونی قرار دے دیا ہے۔ برطانیہ میں ابھی انکوائری کمیشن کی کارروائی جاری ہے۔ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی اس جنگ کے نتیجے میں کئی لاکھ معصوم انسان قتل کئے گئے اور آج تک ہو رہے ہیں۔ میرے نزدیک بش اور بلیئر جنگی مجرم ہیں۔

بچپن

پیدائش تو میری ننھیال میں ہوئی تھی کہ اس وقت کا رواج ہی یہی تھا۔ جب میں نے آنکھ کھولی تو میرے ارد گرد میرے ننھیال یعنی برست تحصیل پانی پت ضلع کرنال کی وہ اشرافیہ نہیں تھی جو ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں انگریز کے خلاف اور قائداعظم کے ساتھ تھی۔ اور نہ ہی سادات بارہہ کے 1857ء کی جنگ آزادی کے عظیم کھنڈرات تھے بلکہ سرگودھا میں انگریزوں کے پروردہ نواب اور جاگیردار ملک خضر حیات ٹوانہ، نواب محمد حیات قریشی اور ملک فیروز خان نون جیسے جاگیرداروں کے خاندان تھے جن کی وفاداری کے بدلے میں انگریز انہیں بڑی بڑی جاگیریں عطا کر گیا تھا۔

ملک فیروز خان نون جو پاکستان کے وزیراعظم بھی بنے، مٹھا ٹوانہ کے حاکم خان کے پوتے تھے جنہوں نے 1857ء کی جدوجہد آزادی میں روہتک اور حصار کے ان مسلمان سپاہیوں کا جو کہ انگریز کے خلاف لڑ رہے تھے، قتل عام کیا تھا۔

سرگودھا اور خوشاب میں آباد ٹوانوں کے بزرگ ملک فتح شیر خان، ملک شیر خان، ملک صاحب خان، ملک جہاں خان سے لے کر عمر حیات خان (نواب خان بہادر سر عمر حیات خان) تک جو کہ خضر حیات کے والد تھے ان سب نے انگریزوں کی زبردست مدد کی تھی۔ جدوجہد آزادی کے متوالوں کا انگریز کے ساتھ مل کر قتل عام کیا تھا۔ حریت پسندوں کے خون سے ہولی کھیلنے والے اپنے ان وفاداروں کو نوازنے میں انگریز نے بھی بخل سے کام نہیں لیا۔ دل کھول کر جاگیریں اور خطابات ان پر نچھاور کئے گئے۔ جارج پنجم کی سلور جوبلی ہو یا ملکہ وکٹوریہ کی گولڈن جوبلی ان کو خاص طور پر برطانیہ مدعو کیا جاتا۔

تقسیم ہند کے وقت پنجاب میں خضر حیات ٹوانہ کی حکمرانی تھی۔ مسلم لیگ نے اس کے خلاف تحریک چلائی ہوئی تھی اور خضر حیات کے خلاف ''خضری ٹٹو ہائے ہائے'' اور ''تازہ خبر آئی اے حیاتے ماں............اے'' جیسے نعرے لگ رہے تھے۔ یہ وہ یونینسٹ تھے جو آخری وقت تک انگریز کے ساتھ اور قائداعظم اور آل انڈیا مسلم لیگ کے خلاف تھے۔ جب انہیں یہ یقین ہوگیا کہ اب پاکستان بننے والا ہے اور مسلم لیگ کے پروگرام میں جاگیرداری کا خاتمہ بھی نہیں ہے تو 2 رمارچ 1947ء کو خضر حیات ٹوانہ نے استعفیٰ دے دیا اور پنجاب کے تمام یونینسٹ جاگیردار مسلم لیگ میں جوق در جوق شامل ہوگئے۔ جس طرح آپ کو یاد ہوگا یہ طبقہ 1971ء میں پیپلز پارٹی کے اقتدار میں آنے کے بعد ہر روز ''لاکھوں ساتھیوں سمیت'' پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر رہا تھا۔ اس طرح طبقاتی اعتبار سے وہ مسلم لیگ جو ابتدائی طور پر نوابوں، راجاؤں اور مہاراجاؤں کی جماعت رہی تھی اور 1940ء کی قرارداد پاکستان کے بعد ایک عوامی پارٹی بن گئی تھی، اس پر جاگیرداروں کا قبضہ ہوتا چلا گیا اور مسلم لیگ بحیثیت جماعت جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں کی نمائندہ جماعت بن گئی۔

میرے والد سید اکبر حسین زیدی انڈین پوسٹل سروسز میں تھے اور اگست 1947ء کی تقسیم سے پہلے ہی یہاں آچکے تھے۔ مشرقی پنجاب سے لاکھوں مسلمان بڑے بڑے قافلوں کی شکل میں واہگہ کے راستے پاکستان پہنچ رہے تھے۔ ان قافلوں اور ریل گاڑیوں پر اکالی دل اور راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے مسلح جتھے حملے کر رہے تھے۔ کٹی ہوئی لاشوں اور خون سے بھری ہوئی ریل گاڑیاں قصور اور لاہور پہنچ رہی تھیں۔ جو قافلے بھی مغربی پنجاب میں پہنچتے ان کی اپنی اپنی خون ریز داستان تھی۔ ادھر سے بھی لاتعداد تباہ حال ہندو اور سکھ ہندوستان جا رہے تھے۔ ہر جگہ قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ چاروں طرف قیامت برپا تھی۔ ایک اندازے کے مطابق اس نقل مکانی میں مشرقی پنجاب میں تقریباً 10 لاکھ مسلمان قتل ہوئے۔ 70 لاکھ کے قریب افراد بے گھر ہوئے اور 50 ہزار مسلمان عورتوں کو اغوا کیا گیا اور ان کی عصمت دری کی گئی۔ اس موضوع پر مشہور ناول نگار رئیس احمد جعفری نے ''پچاس ہزار عورتیں'' کے عنوان سے ایک ناول بھی لکھا۔

والد صاحب کا تبادلہ دہلی سے سرگودھا ہوا تھا۔ ساداتِ برست کی اکثریت سرگودھا کے قریب چنیوٹ (ضلع جھنگ) میں آ کر آباد ہونے لگی۔ یہ بھی قافلوں کی شکل میں یہاں تک پہنچ رہے تھے۔ ہمارے خاندان کے قریبی افراد ہمارے یہاں سرگودھا میں آ کر ٹھہرنے لگے اور ہمارا گھر ننھیال کے رشتے داروں سے بھرنے لگا۔ یہ ان کا پہلا پڑاؤ تھا۔ یہ آنا جانا چلتا رہا۔ گھر میں خوب چہل پہل رہنے لگی۔ اسی دوران آگ اور خون کا دریا پار کر کے میری نانی اماں اور خالہ جان بھی سرگودھا پہنچ گئیں۔ میرا کوئی سگا ماموں نہیں تھا اور نہ ہی کوئی چچا۔ ایک تایا تھے جو پولیس سروس میں تھے اور بورے والا میں تعینات تھے۔ ددھیال کی جانب سے ہجرت کرنے والے رشتے داروں نے اندرون سندھ پناہ ڈھونڈ لی اور سندھ دھرتی سے رشتہ جوڑ لیا۔ اس سرزمینِ پاکستان نے مہاجروں کو بازو کھول کر اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔

میں نے سرگودھا میں ہوش سنبھالا۔ کئی ایکڑوں پر محیط خوبصورت پھولوں کی کیاریاں، جامن، شہتوت، انجیر اور میٹھے کے بے شمار درخت، تتلیاں اور جگنو، برسات میں مینڈک، گرمی کی چلچلاتی دھوپ، ٹھٹھرتا جاڑا، سول لائنز میں ڈاک خانے کے ہیڈ آفس کی بڑی سی عمارت اور اس کے عقب میں ہمارا گھر۔ گھر کے قریب ہی کلرکس، پوسٹ مین، جمعدار، چوکیدار وغیرہ کے کوارٹرز۔ محلہ تھا ہی نہیں۔ رات کو کہیں کہیں دور مدھم سی روشنیاں جھلملاتیں اور بس!! بھنگیوں کو جمعدار کہا جانے لگا تھا۔ مگر معاشرے میں ان کا مقام وہی تھا جو ہندوستان میں اچھوتوں کا۔ طبقاتی اعتبار سے ان سب کو ''کمیں'' کے نام سے پکارا جاتا۔ میں اپنے بچپن میں تنہا تھا جب تک کہ حسن جعفر پیدا نہیں ہوئے جو کہ مجھ سے تقریباً ساڑھے چار سال چھوٹے ہیں۔

سرگودھا میں شدید گرمی ہوتی، دوپہر کا وقت، چلچلاتی دھوپ اور لو کے تھپیڑے، سب لوگ جب دوپہر کو سو جاتے تو مجھے ان ''کمیوں'' کے بچوں کے ساتھ کھیلنے میں بہت مزہ آتا۔ واپسی پر ڈانٹ پڑتی۔ شاید مجھ میں روایت شکنی کے جراثیم انہی دنوں سے پیدا ہونے لگے تھے۔

مجھے سینٹ جوزف کا نونٹ سکول میں داخل کرایا گیا۔ اس میں مسلمان اور عیسائی بچے، لڑکے لڑکیاں مساوی درجہ رکھتے تھے۔ جب بریک ہوتی اور سکول کے گرجا گھر میں عبادت کے لیے عیسائی بچے جاتے تو میں بھی ان کے ساتھ ہو لیتا۔ گرجا گھر کے اندر رنگ برنگے شیشوں کی اونچی اونچی کھڑکیاں اور سفید لباس میں ملبوس ولائتی Nuns جنہیں ہم سسٹرز کہا کرتے تھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ گوری استانیوں کے درمیان تیکھے نقوش والی ایک پیاری سی سانولے رنگ کی دیسی استانی بھی تھی جو سرخ و سفید گال پر کالے تل کی طرح چمکا کرتی۔ نانی اماں نے اس کے ساتھ دوستی کر لی۔ وہ وقتاً فوقتاً گھر کی پلی مرغیاں، انڈے اور دیسی گھی اس کو بھجوا دیتیں تا کہ وہ میرا خیال رکھے۔

گرجا گھر میں صلیب پر چڑھے ہوئے حضرت مسیح کی تصویر دیکھ کر مجھے ان پر کافی رحم آتا، لیکن جب مجھے پتہ چلا کہ اس دور کے مذہبی اجارہ داران کو صلیب پر اس لیے لے گئے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ نے محکوموں اور مظلوموں کے حق میں انقلاب لانے کی کوشش کی تھی تو مجھے ان سے محبت ہو گئی۔ ایک دن میں نے گھر آ کر والدہ کو بتایا کہ کس طرح گھٹنے ٹیک کر صلیب کا نشان بنا کر ہم سکول میں عبادت کرتے ہیں۔ آپا۔ ہم اپنی والدہ کو آپا کہا کرتے تھے، نے ہنس ہنس کر یہ واقعہ والد صاحب کو سنایا۔ اگلے روز وہ ہیڈ مسٹرس سے جا کر ملے اور سید صاحب کے نجیب الطرفین صاحب زادے کا گرجا گھر جانا بند ہو گیا۔

ذہن میں بچپن کے جہاں اور نقوش ہیں ان میں ایک کردار ٹارزن کا بھی ہے۔ میں سوچا کرتا تھا کہ یہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اس کا رنگ گورا ہے اور انگریزی بولتا ہے۔ افریقہ کے جنگل کے سب جانور اس کی بات کو سمجھتے اور مانتے ہیں اور افریقہ کے لوگ بھی اس کے کہنے پر عمل کرتے ہیں اور اس کے منصوبے کے مطابق اپنے ہی جانوروں کو مارتے ہیں۔ گویا انگریز جنگلی جانوروں کو بھی قابو میں رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس علاقے کے انسان بھی اس کے کنٹرول میں ہیں۔ یعنی وہ علاقے کا سب سے اچھا اور سمجھدار اور بہادر حاکم اور منتظم ہے۔ سامراج بچپن سے ہی لاشعور میں اپنے حق میں بیج بوتا ہے۔ پاکستان میں اب بھی ٹارزن کا نام استعمال ہوتا ہے مگر کسی اور طرح۔ میں تفنن طبع

کے لیے کبھی کبھی پاکستانی چینل لگا لیتا ہوں۔ ایک روز میں نے ایک چینل کھولا۔ اینکر پرسن حسب معمول دو سیاسی مرغوں کو سامنے بٹھا کر لڑوا رہے تھے۔ کہنے لگے کہ ہمیں ٹارزن بننے کی ضرورت نہیں۔ امریکہ ہمیں جو کچھ دیتا ہے ہمیں اس پر قناعت کرنی چاہیے۔ میں سوچتا رہا کہ کیا انگریز کی غلامی سے آزادی کی جدوجہد اور برصغیر میں ایک آزاد وطن کا خواب، جس کے لیے لاکھوں انسانوں نے جانیں دیں، بے معنی تھا؟ امریکہ کی غلامی میں جانے کے لیے تھا؟

اسی طرح پہلی جماعت کے اردو قاعدے میں جو سبق پڑھنے کو ملا وہ تھا۔ ''صبر کر صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔'' یعنی ظلم کے خلاف جدوجہد نہ کر بلکہ صبر کر۔ ایک اور سبق جو اس قاعدے میں پڑھنے کو ملا وہ تھا۔ ''غریب کی مدد کر'' یعنی ایک ایسا طبقاتی معاشرہ جس میں لوگ غریب ہوں مگر آپ دولت مند ہوں، دولت حاصل کریں تا کہ غریب کی مدد کر سکیں۔ حکمران طبقات اور طبقاتی واستحصالی نظام کی حفاظت کا بندوبست اس طرح کے سلیبس کے ذریعے تعلیم کے پہلے مرحلے میں ہی کر دیا گیا تا کہ غیر طبقاتی معاشرہ نہ پیدا ہو سکے۔ رہی سہی کسر مولوی نے پوری کر دی، غربت کے بدلے میں ثواب اور جنت کا لالچ دے کر۔

گھر میں رشتے کے ماموں اور خالائیں رہتی تھیں۔ شام کو کھانے کے بعد سب مرد حقے کے لمبے لمبے کش لیتے اور حالات حاضرہ پر گفتگو ہوتی۔ خواتین الگ اپنی محفل جما لیتیں مگر اماں یعنی نانی اماں کبھی کبھی حقے کا ایک چسکی نما کش لگانے اور سیاسی تجزیہ پیش کرنے مردوں میں آ بیٹھتیں۔ ان سب کی باتیں میری سمجھ میں نہ آتیں۔ خالہ جان مجھے چندا ماموں کی لوری سناتیں اور میں سو جاتا۔ اس لوری میں چاند ہمیشہ ہی ماموں ہوتا۔ ہو سکتا ہے اگر والد یہ کام کیا کرتے تو اردو لوک کہانیوں میں چاند چچا یا تایا ہوا کرتا۔ اپنے ننھیال سے مجھے بے حد محبت اور شفقت ملی۔ کبھی کبھی گھر میں کسی بات پر والد صاحب کا سنگین بت انگڑائی لے کر جاگ اٹھتا اور پھر ایسا لگتا کہ قہر و غضب کا پر جلال دیوتا گھن گرج کے ساتھ کائنات کو ہلا کر رکھ دے گا۔ ہم سب ان سے خوفزدہ رہتے۔

وہ رشتے دار جو 1947ء میں برٹش اوورسیز کارپوریشن کے چارٹرڈ ہوائی جہازوں کے ذریعے دہلی سے کراچی منتقل ہوئے تھے، جب کبھی سرگودھا آتے تو وہاں کی

دھول اور گرمی سے بے زار رہتے۔ سندھ کے ہاری اور پنجاب کے کسان ان کو چوپائے نظر آتے۔ وہ یوپی میں ہاتھیوں پر سوار ہو کر اژدہوں اور ببر شیروں کا شکار کھیلنے، سونے چاندی کی رکابیوں میں پلاؤ اور کباب کھانے اور کوٹھڑیوں میں بھرے ہوئے ہیرے جواہرات کے قصے سناتے جو میرے لیے دیو مالائی کہانیاں ہوتیں۔ البتہ چنیوٹ کے رشتے دار جنہوں نے زمین الاٹ ہونے کے بعد زمینداری شروع کر دی تھی کہ ساری عمر وہ یہی کرتے آئے تھے، ان کے گھروں میں سادگی اور سچائی تھی۔ موسم گرما کی چھٹیاں ان کے ساتھ گزرتیں۔ محمد رضا، جعفر، انور اور سرور کزن بھی تھے اور دوست بھی۔

1955ء میں ابھی میں نے پرائمری سکول ختم کیا ہی تھا کہ والد صاحب کا تبادلہ بہاولپور ہو گیا اور ہم سرگودھا سے بہاولپور چلے گئے جو کہ اس وقت ایک ریاست تھی۔ مرد ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ اس سے پہلے میں نے صرف اپنے رشتے کے ایک ماموں کو جو چنیوٹ میں رہتے تھے پھندنے والی ترکی ٹوپی پہنے دیکھا تھا۔ بہاولپور میں تعلیم مفت اور عام تھی۔ صحت کی سہولتیں بھی عام شہری کو مفت دستیاب تھیں۔ ایک ٹیکنیکل سکول بھی تھا اور کالج بھی۔ پہلی بار میں نے وہاں سائیکل رکشہ دیکھا۔ پہیے کی ایجاد نے کتنی سہولت پیدا کر دی تھی کہ محنت کشوں کو اپنا اقتصادی بوجھ کم کرنے کے لیے دوسرے انسانوں کا جسمانی بوجھ اٹھا کر اسے گھسیٹنا آسان بن گیا تھا۔ عام شہری نواب کی عزت کرتے تھے۔

14 اکتوبر 1955ء کو جب ون یونٹ قائم کیا گیا تو بہاولپور کو بھی دیگر صوبوں کے ساتھ مغربی پاکستان کا حصہ بنایا گیا۔ مگر 1969ء میں جب ون یونٹ یکم جولائی کو توڑا گیا اور تمام صوبے اپنی پرانی حیثیت پر آ گئے تو پتہ چلا کہ بہاولپور کو پنجاب کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پنجاب نے کبھی اس کا مطالبہ بھی نہیں کیا تھا کہ بہاولپور کو پنجاب کا حصہ بنایا جائے۔ پھر 1970ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کے امیدوار نہیں، بلکہ بہاولپور متحدہ محاذ کے نمائندے منتخب ہوئے اور ان دونوں ممبران قومی اسمبلی نے 1973ء کے آئین پر اس لیے دستخط نہیں کئے کہ بہاولپور کو اس کی اپنی حیثیت نہیں دی گئی تھی۔ بہاولپور کے ساتھ کی جانے والی زیادتی آج تک جاری ہے۔

بہاولپور کی صحرائی گرمی کی دوپہر میں جب سب سو جاتے تو میں حسب عادت حسن کو لے کر باہر نکلتا۔ حسن میرا دوست بھی تھا اور ساتھی بھی۔ جب تک سب اٹھتے ہم باغ سے توڑے ہوئے کچے آم، جامن اور گلاب کی پتیوں کی بنائی ہوئی خود ساختہ گل قند، تخم ملنگاں اور سکنجبین کا کورس مکمل کر چکے ہوتے۔ چند دنوں میں ہی ہم دونوں کو سخت بخار نے آگھیرا جو ٹائیفائیڈ کی شکل اختیار کر گیا۔ لینے کے دینے پڑ گئے۔ اماں ہم دونوں کو لے کر کراچی چلی گئیں۔ حرکتیں میری تھیں مگر سمجھا جانے لگا کہ بہاولپور ہمیں راس نہیں آیا۔ کراچی میں چند ماہ گزارنے کے بعد ہم واپس سرگودھا آ گئے اور سیٹلائٹ ٹاؤن میں اس پلاٹ پر جو کہ خرید کر ڈال دیا گیا تھا، گھر کی تعمیر ہونے لگی۔

مجھے انبالہ مسلم ہائی سکول میں جو کہ شہر کے وسط میں تھا، چھٹی جماعت میں داخل کرا دیا گیا۔ پہلی بار مجھ پر محلے اور گلیوں کے راز کھلنے لگے اور میری دوستیاں بننے لگیں۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر مولوی فتح الدین نے سرسید احمد خان کا روپ دھار رکھا تھا۔ چوڑی دار پاجامہ اچکن اور سرسید کی سی سفید داڑھی۔ ہاتھ میں لمبی بید اور سکول میں مہاجروں کے بہت سارے بچے۔ سکول کی عمارت ایک گوردوارے میں تھی جو اب انبالہ کے مہاجرین کی انجمن اسلامیہ کے قبضے میں تھی۔ اس عمارت میں قدم قدم پر ان سکھوں کے نام کندہ تھے جنہوں نے اس کی تعمیر میں چندہ دیا تھا۔ صحن کے وسط میں اس تین منزلہ عمارت سے اونچا سونے کے پانی سے مزین ایک خوبصورت سنہری ستون نصب تھا جس پر سکھوں کا مذہبی نشان تھا۔ اس کے نیچے ہر روز "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" گا کر ہمارے سکول کے دن کا آغاز ہوتا اور شام کو دفتر سے آ کر کھانے کے بعد والد صاحب انگریزی، حساب، الجبرا اور جیومیٹری پڑھاتے۔ ڈانٹ پڑتی، کان کھینچے جاتے اور دن اپنے اختتام کو پہنچتا۔ قرآن پاک آپا اور اماں نے مل کر بہت پہلے ہی ختم کروا دیا تھا۔

سرگودھا اس وقت تک شاہ پور کی ایک تحصیل تھا جہاں ہندو مہاجنوں اور ساہو کاروں کے اونچے اونچے، اندر سے کھلے کھلے مکانات اور حویلیاں تھیں۔ ان میں کھلا اور چوڑا صحن درمیان میں ہوتا اور صحن کے وسط میں عام طور پر برکت کے لیے لگایا گیا تلسی کا پودا۔ ارد

گرد برآمدے اور پھر کمرے اور اوپر کی منزلوں میں بالکنیاں، روشن اور ہوا دار کمرے۔
سرگودھا کے لیے جو سپیشل ٹرین مہاجروں کو لے کر ہندوستان سے آئی تھی ان میں زیادہ تر لوگوں کا تعلق مشرقی پنجاب کے انبالہ ڈویژن سے تھا، انبالہ ان دنوں بھارت کے صوبہ ''ہریانہ'' میں ہے۔ ان حویلیوں اور گھروں کو مہاجروں نے اپنے کلیم، جعلی کلیم یا خریدے ہوئے کلیموں کے عوض الاٹ کروانا شروع کیا اور الاٹمنٹوں اور کلیموں کا کاروبار کئی سالوں تک پورے ملک میں جاری رہا۔ چالاک مہاجر امیر ہوگئے شریف مہاجر غریب رہ گئے۔

سول لائنز میں مقامی جاگیرداروں کی کئی کئی ایکڑوں پر محیط بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ یہ لوگ ''کلکتہ ہاؤس'' سے خریداری کرتے۔ یہاں پر وہ مال دستیاب ہوتا تھا جو برطانیہ اور جرمنی میں وہاں کے رؤسا کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ ان کی لمبی لمبی کاروں میں ان کے لیے حقہ بردار ملازم اور شکاری کتے انتظار کرتے۔ ان کی اولاد بالی کے جوتوں اور ہیلڈ کے سوٹ کے کپڑوں پر بحث کیا کرتی۔

ان کے گھروں میں گراموفون بھی ہوتے اور بھاری بھرکم ریڈیو بھی۔ ٹیپ ریکارڈر پر ایک بہت بڑی سی ٹیپ چلتی۔ ان کے ڈرائنگ روم میں انگریز وائسرائے یا کسی بڑے انگریز اہل کار کو علاقے میں شکار کرانے کے بعد کھینچی گئی تصویر لٹکی ہوتی جس میں ان کے بزرگ یا تو انگریز کے سامنے زمین پر بیٹھے ہوتے یا پھر بندوق پکڑ کر ان کی کرسی کی پشت پر کھڑے ہوتے۔ ڈرائینگ روم میں دیوار پر ہرن اور چیتے کے سر لٹکتے۔ ان کے بزرگ سلطنت برطانیہ کے آفتاب کو چمکانے میں مصروف رہے تھے اور انکی اس نسل کو اپنے بزرگوں کے قوم دشمن کردار پر کوئی شرم نہیں تھی اور شاید آج بھی نہیں ہے۔ اپنے علاقے میں یہ چھ گز کا کلف لگا تہہ بند جو چلتے ہوئے کھڑ کھڑ کرتا ہوا چلتا، باندھتے اور سر پر پگڑی پہنتے۔ مگر ڈپٹی کمشنر کے پاس یہ اچکن، شلوار اور ٹوپی میں ملبوس ہو کر جاتے۔ قیام پاکستان سے پہلے اس علاقے کے چھوٹے کسان اور کاشتکاروں کی معاشی حالت کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے ہندو مہاجنوں کے پاس نہ صرف اپنی زمین بلکہ کاغذوں میں اپنی گھر کی عورتیں بھی گروی رکھی ہوئی تھیں۔

سرگودھا ایئر فورس کا جدید اڈہ بننے کے ساتھ ضلع بن کر ڈویژن بننے کی جانب

ترقی کررہا تھا اور سیٹلائٹ ٹاؤن کی شکل میں ایک جدید مضافاتی شہر آباد ہو رہا تھا۔

ایک بار پھر والد صاحب کا تبادلہ ملتان ہو گیا۔ اس وقت میں آٹھویں جماعت میں تھا۔ وہ جو ایک عرصے تک پورے ہندوستان کا دارالخلافہ تھا، ملتان، اپنے اندر ہزاروں سال کی تاریخ، تہذیب اور صوفیوں کے مقبروں کو اپنی آغوش میں سمیٹے ہوئے قدیم اور عظیم شہر، شاہ شمس تبریز، شاہ رکن عالم، ملتان کا قلعہ، حرم گیٹ، استاد شاگرد کا تعزیہ، خاکِ شفا کی تسبیح، نوگزے کی قبر، گجر کھڈہ، نواں شہر۔ اس شہر میں بھی سرگودھا کے جاگیرداروں کی طرح انگریز کے وفادار اور خدمت گزار خاندان موجود تھے۔

1857ء میں ملتان کے ایک گدی نشین سید نور شاہ نے جدوجہد آزادی کے حریت پسندوں کے خلاف انگریزوں کی بھرپور مدد کی تھی۔ انگریز نے نور شاہ کو اس کی خدمت کے صلے میں بہت بڑی جاگیر سے نوازا تھا اور اپنے ساتھ وفاداری کی سند بھی عطا کی تھی۔ یہ یوسف رضا گیلانی کے بزرگوں میں سے تھے۔

اسی طرح ملتان کے ہی ایک اور گدی نشین جن کا نام شاہ محمود قریشی تھا انہوں نے جدوجہد آزادی کو کچلنے کے لیے 1857ء میں انگریز کو 2500 گھڑ سوار فراہم کئے تھے۔ جب انگریز نے اپنے خلاف اس جدوجہد کو ان غداروں کی مدد سے کچلا تو شاہ محمود قریشی کو ہزاروں ایکڑ زمین اور اسناد سے نوازا گیا۔ یہ شاہ محمود قریشی پاکستان کے موجودہ شاہ محمود قریشی کے جدامجد اور بزرگوں میں سے تھے۔

ابھی شہر سے مکمل واقفیت بھی نہیں ہوئی تھی کہ پھر واپس سرگودھا پہنچ گئے۔ مگر اس بار ہماری ماں نے یہ طے کرلیا کہ اب ان تبادلوں کے چکر میں وہ بچوں کی تعلیم کو برباد نہیں ہونے دیں گی۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ ہم سب سرگودھا میں رہیں گے اور تبادلوں کے سلسلے میں والد صاحب اکیلے ہی صحرانوردی کریں گے۔

میں پھر انبالہ مسلم ہائی سکول میں پہنچ گیا۔ وہی کلاس فیلوز، اسد اللہ، رمضان، ہمارے استاد صوفی عبدالکریم کے بیٹے شفیق جو اپنے کانوں تک جناح کیپ پہنے رہتے، طلعت، سلیم، پرویز، مقصود، اکرام، ممتاز اور دوسرے۔ کلاس روم بدل گیا تھا اور ہیڈ ماسٹر

علیل رہنے لگے تھے۔ البتہ استاد وہی تھے۔ سکول کا بینڈ بھی وہی تھا اور مدثر جو ہمیشہ ہی سکول کی ہاکی ٹیم کو جتواتا تھا، ابھی تک کھیل رہا تھا۔ ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' اسی طرح گائی جاتی۔ میں یہاں اجنبی نہیں تھا۔

گھر میں ایک بار پھر رونقیں لوٹ آئیں۔ ماموں اور خالائیں ہفتے یا اتوار کی شام کو سب کا اکٹھے مل بیٹھنا۔ اماں کے اسی طرح کے سیاسی تبصرے اور ماضی کے قصے۔ اب میں بھی اس محفل کا خاموش سامع تھا۔ چاندی سے بالوں والی سب کی وضعدار اماں کبھی لارڈ ویول اور کبھی ماؤنٹ بیٹن کی چالاکیاں، کبھی ہٹلر کی غلطیاں، کبھی انگریزوں کے خلاف 1857ء کی جدوجہد آزادی کی گفتگو کرتے کرتے ہندوستان کے بٹوارے پر آتیں اور بات ان کی ہجرت کے سفر کی طویل اور خون آشام داستان پر ختم ہوتی۔

اماں کے والد اپنے وقت میں محکمہ انہار کے ایس۔ڈی۔او۔ رہے تھے اور زیادہ تر وقت کرنال اور پانی پت میں گزارا تھا۔ لیاقت علی خان آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل اور پاکستان کے پہلے وزیراعظم کے بزرگوں کا اور ان کے بزرگوں کا آپس میں اٹھنا بیٹھنا تھا اور ان کا شمار پانی پت کی اشرافیہ میں ہوتا تھا۔ اماں کا خیال تھا کہ جب مغرب ٹینکوں اور توپوں کی گرج سے گونج رہا تھا، اس وقت ہندوستان میں ''عدم تشدد'' کا ڈرامہ رچایا گیا، ورنہ ان کا خیال تھا کہ جب جرمنی نے لندن پر بم برسانا شروع کئے تو ہندوستان میں ایک بار پھر 1857ء کی جدوجہد آزادی کی طرح جدوجہد ہونی چاہیے تھی۔ وہ گاندھی کو انگریزوں کا خاص آدمی سمجھتی تھیں۔ پھر انہیں یہ بات بھی سمجھ نہیں آتی تھی کہ گاندھی جسے چرچل ''ننگا فقیر'' کہا کرتا تھا، کس طرح چرخے کی طاقت پر سلطنت برطانیہ کو شکست دے سکتا تھا۔ ہفتے میں ایک بار اس طرح کی محفل سجتی اور رات گئے تک جاری رہتی۔ ہمارے ایک رشتے کے ماموں جو لاہور میں رہتے تھے۔ سوٹ، پینٹ، ہیٹ پہننے والے، وہ آئے ہوئے تھے۔ اسی طرح کی شام تھی اور روس میں نظام کی تبدیلی پر بات ہو رہی تھی کہ انہوں نے کہا کہ میں روس جانا چاہتا ہوں کیونکہ روس میں کمیونزم میں، جہاں سب کچھ مفت ملے گا وہاں کئی کئی عورتیں بھی ملیں گی۔ اماں سے رہا نہ گیا اور وہ روس کے حق میں بولیں کہ پھر کیا ہوا جنت میں بھی تو ملیں گی۔

کمیونزم اور روس سیاسی سمجھ بوجھ رکھنے والے گھروں میں گھستا جا رہا تھا۔ گھر میں بہت سے رسالے اور کتابیں آتیں اور آپا کے پاس جو وقت بھی انہیں میسر آتا، وہ ان کو پڑھنے میں گزارتیں۔ پڑھائی کا شوق ان کی زندگی میں ان کے آخری دن تک ان کے ساتھ رہا۔

مذہبی اور ثقافتی منظر نامہ۔ لوگ سیکولر تھے

اس وقت سرگودھا کیا، پورے ملک کا مذہبی منظر بہت مختلف تھا۔ ابھی تک گستاخِ رسول ﷺ و اہل بیت منظر عام پر نہیں آئے تھے۔ مسجدوں پر انتہا پسندوں کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔ آپ کسی بھی مسجد میں ہاتھ کھول کر یا ہاتھ باندھ کر نماز پڑھ سکتے تھے اور مسجد پاک ہی رہتی تھی۔ سب مل کر تمام تہوار مناتے۔ عید الفطر، عید الاضحیٰ، محرم، خوشیاں اور غم ابھی تک سانجھے تھے۔ محرم کے دس دنوں میں شیعہ سنی سبھی کے لیے فضا غم کا لبادہ اوڑھ لیتی اور اپنے اپنے طریقے سے سبھی اس غم کو مناتے۔

شیعہ مہاجروں نے سرگودھا کے 19 بلاک میں ہندوؤں کے ایک بہت بڑے غیر آباد مندر کو امام بارگاہ اور دارالعلوم میں تبدیل کر لیا۔ اس مندر میں موجود بتوں کو اسی جذبۂ ایمانی کے ساتھ توڑا گیا جس طرح کہ فتح مکہ کے بعد خانہ کعبہ سے بت ہٹائے گئے تھے۔ نئی نئی مسجدیں بننے لگیں۔ 7 بلاک کا امام باڑہ مقامی شیعہ حضرات کا تھا جس میں ذاکر صاحبان سرائیکی اور مقامی پنجابی زبان میں دوہڑے پڑھتے اور مہاجروں کے امام باڑے میں سوز و سلام پوری راگ داری کے ساتھ مالکونس اور بہاگ میں پڑھا جاتا۔ 7 بلاک والوں کو انیس و دبیر کا کچھ پتہ نہیں تھا اور 19 بلاک والوں کے لیے سرائیکی اجنبی زبان تھی۔ پھر رفتہ رفتہ سرائیکی ذاکر 19 بلاک میں سمجھے جانے لگے اور مرثیہ خوان اور اردو ذاکر 7 بلاک میں مقبول ہو گئے۔

مقامی حضرات مہاجروں کو ''شہدے پناہ گیر'' اور مہاجر اُن کو جنگلی کہتے، ایک دوسرے کے طرز رہن سہن کا مذاق بھی اڑاتے مگر مہاجروں اور مقامی لوگوں میں دوستیاں ہونے لگیں۔ دونوں زبانوں اور تہذیبوں نے ایک دوسرے میں راہیں بنانا شروع کر دیں

اور مہاجروں نے زمین سے رشتہ جوڑ لیا۔ ہم گھر میں اردو بولتے اور باہر سرائیکی یا پنجابی۔

بھارت سے ہجرت کر کے آنے والے ہمارے وہ بزرگ جو پنجاب اور اندرون سندھ آباد ہوئے گو کہ وہ اپنے پرانے گھروں اور علاقوں کو یاد کر کے آہیں ضرور بھرتے رہے مگر عملاً انہوں نے اپنی اس نئی زمین کے ساتھ رشتہ جوڑا اور ان کی وہ نسل جو پاکستان کے ساتھ پروان چڑھی، وہ خالصتاً پاکستانی بن گئی۔ اس نسل میں متضاد وفاداریوں کا مسئلہ نہیں رہا۔ البتہ کراچی کے محنت کشوں میں نہیں بلکہ مراعات یافتہ طبقے میں پاکستان اور سندھ کی دھرتی سے وفاداری ایک مسئلہ بنی رہی۔ انہوں نے ثقافتی اعتبار سے اس زمین سے اپنا رشتہ نہیں جوڑا۔ وہ اپنی اودھ اور یو پی کی تہذیب کی برتری کے خول سے باہر نہیں نکل سکے۔ دل اٹکا رہا یو۔ پی میں اور مراعات حاصل کرتے رہے پاکستان میں۔ ان میں وہ بھی تھے جو پاکستان محض اس لیے آئے کہ ایک آدھ سال کراچی میں گزار کر پاسپورٹ حاصل کر کے برطانیہ جا سکیں۔

اس وقت بھارت میں مسلمانوں کے لیے پاسپورٹ کا حصول تقریباً ناممکن تھا۔ پاکستانی پاسپورٹ حاصل کرنے کا یہ سلسلہ بھی کئی سال تک چلتا رہا۔ لندن آئے تو پاکستان کے پاسپورٹ پر مگر آج تک پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کر سکے۔ وہ اپنی اس چالاکی کو اپنی ذہانت سے تعبیر کرتے ہیں۔ پاکستان مخالف جماعتیں ہوں یا افراد، خواہ وہ پاکستان سے لندن آئیں یا بھارت سے، ان سب کے ساتھ ان کی گاڑھی چھنتی ہے۔ ان کی شامیں پاکستان اور قائداعظم کو برا بھلا کہنے میں گزرتی ہیں۔ بھارت میں ہمالیہ پہاڑ جتنی اونچی کرپشن، بے پناہ غربت، کھرب پتی امرا، امیر اور غریب کے درمیان بحر ہند سے بھی بڑا طبقاتی فرق، اقلیتوں پر مظالم، بظاہر سیکولر مگر اندر سے مذہبی انتہا پسند کانگرس، نہرو اور ماؤنٹ بیٹن کی ملی بھگت سے پیدا کیا ہوا مسئلہ کشمیر اور کشمیریوں پر ریاستی غنڈہ گردی اور قتل عام ان کی بحث کا موضوع نہیں ہوتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نہ تو یہ پاکستان کے شہری ہیں اور نہ ہی انہوں نے کبھی پاکستان جانا ہے مگر پاکستان کے وجود کا ایک درد ہے جو انہیں کھائے جاتا ہے۔

یہ اپنے آپ کو ترقی پسند بھی کہلاتے ہیں اور اپنے پاکستان کے چند سالہ پڑاؤ کے زمانے میں این ایس ایف کے رہنماؤں میں بھی اٹھتے بیٹھتے رہے ہیں، آج بھی ہم سے ملتے ہیں تو مارکسزم اور سامراج مخالف گفتگو کرتے ہیں مگر عملاً اس شاونسٹ اور فاشسٹ جماعت کا ساتھ دیتے ہیں جو مہاجروں کی نمائندہ بن کر پاکستان توڑنے کے ایجنڈے پر کاربند ہے۔

اردو بولنے والوں کی اکثریت نے نہیں بلکہ کراچی کے اس طرح کے افراد نے ثقافتی اعتبار سے پاکستان، بالخصوص سندھ کی دھرتی سے اور سندھ کے ہاری سے اپنا رشتہ نہیں جوڑا۔ ان کے اس رویے نے نفرتوں کا بیج بویا جس کو حکمران طبقات نے پروان چڑھایا۔ بالخصوص ضیاالحق کے زمانے میں اس کی آبیاری کی گئی۔ ضیاالحق اور اس کے بعد میں آنے والے حکمرانوں نے اس کا پھل کھایا مگر غریب اور معصوم شہریوں کا خون بہتا رہا اور آج بھی بہہ رہا ہے۔

سرگودھا میں ہمارے یہاں ہونے والی عزاداری اور جلوس میں نوحہ خوانی میں میرے شیعہ سنی دوستوں کے علاوہ میرے ساتھ ایک عیسائی دوست بھی ہوتا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ بڑی سریلی آواز میں نوحہ پڑھا کرتا تھا۔ اس کا نام ایوب مسیح تھا۔ اکثر اوقات وہ ہمارے ساتھ ہوتا۔ نانی اماں کمرے کے پردے کی اوٹ سے جھانک کر ہمیشہ اس پلیٹ پر نظر رکھتیں جس میں وہ ہمارے ساتھ کھانا کھاتا۔ پھر وہ پلیٹ بار بار پاک کرائی جاتی۔ میں نے اماں سے کئی بار پوچھا کہ اسی زبان سے پڑھا گیا نوحہ تو ناپاک نہیں ہوتا اور آپ کو اس پر اعتراض بھی نہیں ہوتا مگر اس کی پلیٹ جس میں وہ کھانا کھاتا ہے وہ کیونکر ناپاک ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی باتوں کا وہ جواب نہ دیتیں اور شاید ان کے پاس جواب تھا بھی نہیں۔

عاشورے کے جلوس کے ذوالجناح کی باگ موہن لعل ساہنی وکیل پکڑ کر ننگے پاؤں چلتا۔ ساہنی وکیل ہندو تھا اور یہ گھوڑا اس نے پال کر امام بارگاہ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ذوالجناح بھی پاک رہتا اور جلوس بھی۔

سید حامد علی شاہ سنی العقیدہ عالم تھے جو حضرت علیؑ کی شان اور مصائب کربلا کے بیان میں کئی شیعہ ذاکروں سے بھی آگے تھے۔ میرے دوست اسلام الحق جو سنی العقیدہ تھے اور مشہور شاعر محمد حسین شوق کے فرزند۔ (لاہور میں ان کے نام پر شوق چوک رکھا گیا ہے) ان کی والدہ عاشورہ کے جلوس کے بعد ہم سب دوستوں کی فاقہ شکنی کرواتیں۔

غرضیکہ ابھی تک سرگودھا اور غالباً سارا پاکستان ہی اپنی روزمرہ زندگی میں سیکولر تھا۔ ہر انسان کو اپنے عقیدے اور ایمان کے ساتھ، برابری کے ساتھ، عزت نفس کے ساتھ، زندگی گزارنے کا پورا حق تھا۔ ریاست اور مذہب الگ الگ تھے۔ پاکستان کو تھیوکریسی میں تبدیل کرنے کا عمل شروع نہیں ہوا تھا۔ ابھی تک معاشرہ پرسکون تھا اور زندگی ایک حد تک پرامن۔

قائداعظم پاکستان کو ایک سیکولر ریاست کے طور پر چلانا چاہتے تھے

ایک بار قائداعظم سے 13رجولائی 1947ء کی پریس کانفرنس منعقدہ دہلی میں پوچھا گیا کہ پاکستان کی ریاست تھیوکریٹک ہوگی؟ تو ان کا جواب تھا کہ ''یہ سوال احمقانہ ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تھیوکریٹک ریاست سے آپ کی مراد کیا ہے''؟ تو اس نامہ نگار نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ پاکستان میں مسلمان پورے شہری ہوں گے اور غیر مسلم پورے شہری نہیں ہوں گے؟ تو انہوں نے کہا کہ ''پھر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اب تک جو کچھ کیا وہ سب رائیگاں گیا ہے۔ خدا کے لیے ان بے ہودہ خیالات کو اپنے ذہن سے نکال دیں۔'' یہ رپورٹ پاکستان ٹائمز لاہور کے 15رجولائی 1947ء کے شمارے میں چھپی تھی۔

اس سے پہلے 1946ء میں اپنے خطبہ مسلم لیگ ممبران کنونشن دہلی میں انہوں نے فرمایا تھا کہ ''ہم کس چیز کے لیے جدوجہد کررہے ہیں؟ ہمارا نصب العین کیا ہے؟ ہم کسی تھیوکریسی، کسی مذہبی ادارے کی حکومت کے لیے نہیں لڑ رہے اور نہ ہی ہمارا نصب العین تھیوکریٹک ریاست قائم کرنا ہے۔''

پھر ہم نے دیکھا کہ اسی شہر سرگودھا اور اسی ملک پاکستان میں جب ضیاالحق کا نفاذ نظام اسلام کا ڈھونگ شروع ہوا تو شیعہ سنی اور دوسرے فرقے اور مذاہب کے انسانوں کا منوں خون بہنے لگا۔ انسانوں کو مذہب، عقیدہ، زبان اور علاقے کے چھوٹے چھوٹے تنگ جزیروں میں قید کر دیا گیا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ 10 راگست 1947ء کو جب پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کا افتتاحی اجلاس ہوا تو اس کی صدارت مشرقی بنگال کے رکن اور اچھوت رہنما جوگندر ناتھ منڈل نے کی تھی۔ انہیں اسمبلی کا عارضی صدر چنا گیا تھا اور جب قائداعظم نے پاکستان کی پہلی کابینہ وضع کی تو اس میں جوگندر ناتھ منڈل وزیر قانون تھے۔

11 راگست 1947ء کو قائداعظم کو قانون ساز اسمبلی کا باقاعدہ صدر چنا گیا تو انہوں نے اپنی پہلی تقریر میں اعلان کیا۔

''خواہ آپ کا تعلق کسی مذہب، ذات، عقیدے سے ہو اس کا امور مملکت سے کوئی تعلق نہیں ہوگا..........ہم اپنی حکومت کا آغاز کسی امتیاز سے نہیں کر رہے۔ کسی فرقے، عقیدے یا ذات کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا جائے گا۔ ہم اس اصول کو ایک نصب العین کے طور پر ہمیشہ اپنے سامنے رکھیں گے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندو ہندو نہیں رہے گا اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے۔ مذہبی اعتبار سے نہیں۔ کیونکہ مذہب ہر فرد کا ذاتی عقیدہ ہے بلکہ سیاسی اعتبار سے کہ وہ ایک قوم کے شہری ہیں۔'' یہ تقریر Official Report 1947 Constituent Assembly of Pakistan Debates Vol. 1 No. 1 میں موجود ہے۔

قائداعظم نے اپنی پہلی تقریر میں ہی واضح طور پر امور مملکت کو مذہب سے جدا کر دیا تھا اور پھر اگر ملک میں شریعت کا قانون نافذ ہونا ہوتا تو قائداعظم ملک کا پہلا وزیر قانون ایک اچھوت ہندو کو نہ بناتے۔

جب قائداعظم کی یہ تقریر چھپنے کے لیے اخبارات کو چلی گئی تو چوہدری محمد علی، جو بعد میں وزیراعظم بنے اور اس وقت سیکرٹری تھے، انہوں نے ایڈیٹرز کو فون کر کے تقریر

کے اس حصے کو چھپنے سے رکوانا چاہا۔ جس پر الطاف حسین نے، جو اس وقت ڈان کے ایڈیٹر تھے، چوہدری صاحب کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ چوہدری محمد علی کا کہنا یہ تھا کہ قائداعظم کی تقریر کا یہ حصہ قومی نظریئے کے خلاف ہے۔ الطاف حسین نے انہیں جواب دیا کہ جس نے ملک قائم کیا ہے، جدوجہد کی ہے، اس کو نظریہ زیادہ معلوم ہے یا تمہیں۔ اور پھر الطاف حسین نے یہ تقریر مکمل چھاپ دی۔

قائداعظم کی وفات کے بعد وہ حکمران جو ان کے سیکولر خیالات کے خلاف تھے اور اپنی مرضی کے مطابق پاکستان کو چلانا چاہتے تھے انہوں نے قائداعظم کے پالیسی ساز فیصلے، فائلیں اور کاغذات غائب کر دیئے۔ اب تو بعض مصنفین، صحافی اور ٹی وی اینکرز نے فکری بددیانتی کرتے ہوئے خودساختہ تحریریں قائداعظم کے نام سے منسوب کر دی ہیں۔ کچھ بعید نہیں کہ وہ انہیں طالبان کی صفوں میں لا کر کھڑا کر دیں۔ ضیاالحق کے سیاسی فرزند اور طالبان کے سرپرست نواز شریف نے تو اپنے آپ کو ''قائداعظم ثانی'' قرار دے کر اسی عنوان سے ہمارے مانچسٹر کے دوست اقبال حسین کے بھائی شاکر حسین نامی شخص سے ایک کتاب بھی لکھوائی تھی۔

پاکستان اور عوام کے خلاف ''نظریۂ پاکستان'' گھڑنے کی سازش قیام پاکستان سے ہی شروع ہو چکی تھی۔ امریکہ، جس نے دوسری عالمی جنگ کے بعد برطانوی سامراج کی جگہ لے لی تھی اور روس کے کمیونزم کے بڑھتے ہوئے اثر سے خوفزدہ تھا، وہ مذہب اور جمہوریت کے نام پر کمیونزم کے پھیلاؤ کو روکنا چاہتا تھا۔ وہ ہر قیمت پر پاکستان کو نظریاتی مملکت بنانے پر تلا ہوا تھا۔

کیا پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا؟

وہ جو کہا جاتا ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا، یہ سب جھوٹ ہے اور قائداعظم کی وفات کے بہت بعد میں گھڑا گیا ہے۔ پاکستان کسی اسلامی طرز حکومت کی تجربہ گاہ کے طور پر وجود میں نہیں آیا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو جماعت اسلامی، جمعیت علماء ہند،

مجلس احرار، خاکسار تحریک، آل انڈیا شیعہ کانفرنس، آل انڈیا مومن کانفرنس، تحریک پاکستان اور حصول پاکستان کی جدوجہد میں شامل ہوتیں۔ مسلم لیگ اور قائداعظم کا ساتھ دے رہی ہوتیں۔ یہ تمام مذہبی جماعتیں پاکستان کو کافرستان اور قائداعظم کو کافراعظم کہتے ہوئے پاکستان اور قائداعظم کی مخالفت کرتی رہی تھیں۔

مگر جب ملک بن گیا تو یہ سب جماعتیں پاکستان اور یہاں پر بسنے والے مسلمان عوام پر اپنی مرضی کے اسلام کی کاٹھی ڈال کر سوار ہونے اور اپنی حکمرانی کا خواب دیکھنے لگیں اور یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے بعد میں مسلم لیگ کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قرار داد مقاصد منظور کی اور پھر اسے پاکستان کے آئین میں شامل کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ جبکہ میرے خیال میں قائداعظم کی 11 راگست 1947ء کی تقریر کو ہمارے آئین کا پیش لفظ ہونا چاہیے تھا نہ کہ لیاقت علی خان کی پیش کردہ قرارداد مقاصد کو۔

ہمارا ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان کہلایا جانے لگا۔ وزیراعظم چوہدری محمد علی نے 23 رمارچ 1956ء کو جب پاکستان کا آئین دیا تو اس میں پہلی بار اسلامی جمہوریہ کا اضافہ کیا گیا۔ یہ وہی چودھری محمد علی تھا جس نے قائداعظم کی تقریر کو اخبارات میں چھپنے سے روکا تھا۔ آئین کا یہ مسودہ جب آئین ساز اسمبلی میں پیش ہوا تو اس کی 245 دفعات کے لیے 670 ترامیم پیش ہوئیں جن میں سے اکثر مشرقی پاکستان کے ممبران نے پیش کی تھیں۔ مشرقی پاکستان کو اپنی آبادی کے تناسب سے سیاسی و معاشی حقوق چاہئیں تھے کیونکہ پنجابی اور مہاجر شاونسٹ حکمران طبقہ انہیں ان کے یہ حقوق دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ یہ حکمران اسلام کے نام پر ان کا استحصال جاری رکھنا چاہتے تھے۔ جب کبھی مشرقی پاکستان یا دیگر چھوٹے صوبے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے ''اسلام خطرے میں ہے'' کی گھنٹیاں بجنے لگتیں۔ اسی اسمبلی کے اجلاس میں مشرقی پاکستان کے عوامی لیگ کے لیڈر ممبر اسمبلی ابومنصور نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں مذہب ضرور ایک ہے مگر دونوں حصے الگ الگ ملک اور الگ الگ قومیں ہیں۔

بعد میں جب ایوب خان نے آئین سے لفظ اسلامی کو نکالنا چاہا تو ایوان صدر کے

سیکرٹری قدرت اللہ شہاب اوران جیسے لوگوں نے چرب زبانی سے صدر ایوب کو باور کرایا کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ ان لوگوں نے نہایت چالاکی سے عوامی تحریک پاکستان کوتحریک نفاذ اسلام کی جانب موڑنا شروع کیا اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

اس کا ذکر قدرت اللہ شہاب نے اپنے شہاب نامے میں ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے ''اپنے وطن کی سلامتی کے لیے ہمیں اسلام کا ڈھول اپنے گلے میں ڈال کر برسرعام ڈنکے کی چوٹ پر بجانا ہی پڑے گا خواہ اس کی دھمک ہمارے حسن سماعت پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے۔ جمہوریہ پاکستان کے ساتھ اسلامک کا لفظ لگانے سے اگر کسی کا ذہن قرون وسطیٰ کی طرف جاتا ہے تو جانے دیں۔'' پھر وہ کہتے ہیں کہ ''وہ یہ نوٹ اپنی جیب میں رکھ کر اپنے استعفیٰ کے ساتھ لے گئے کہ اگر ایوب خان نے ان کا مشورہ نہ مانا تو وہ استعفیٰ دے دیں گے۔ یہ دونوں چیزیں جب میں نے اپنی بیوی کو دکھائیں تو اس نے مجھے خوب شاباش دی۔'' یہ وہی قدرت اللہ شہاب ہیں جنہیں 1967ء میں عرب اسرائیل جنگ کے دوران اسرائیل کا خفیہ دورہ کرایا گیا تھا جو ان سے پہلے اور بعد میں پاکستان کے کسی بھی افسر شاہی کے کارندے کو نصیب نہیں ہوا۔ اسی ضمن میں انہوں نے واپس آ کر ہمیں ایک لیکچر بھی دیا جس کا اہتمام ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف نے کیا تھا۔ قدرت اللہ شہاب اور وہ ایوب خان، جن کا خیال تھا اور جس کا اظہار انہوں نے میڈیا کے ذریعے کیا تھا کہ جمہوریت صرف سرد ملکوں کے لیے موزوں ہے۔ گرم ملکوں میں جمہوریت نہیں چل سکتی۔ انہوں نے اس لفظ کو پاکستان کے ساتھ جوڑے رکھا۔

اب پاکستان کو ایک اسلامی نظریاتی مملکت کے طور پر میڈیا اور رجعت پسند جماعتوں کے ذریعے عوام کے دلوں اور ذہنوں میں داخل کیا جانے لگا۔ جمہوریت اور مذہب کو ایک ساتھ جوڑنے کی یعنی پاکستان کو ایک تھیوکریٹک ریاست بنانے کی کوشش میں یہ پہلا قدم تھا۔ ان تمام حضرات کو معلوم تھا اور معلوم ہے کہ مسلمان حکمرانوں کی تاریخ، جس کو اسلامی تاریخ کہا جاتا ہے، ہمیشہ ملک گیری اور ذاتی اقتدار کی ہوس سے بھری پڑی ہے۔ بنوامیہ، بنوعباس، ایران کی حکومتیں، عثمانی ترک، ہندوستانی مغل، افغان، عرب، مصری، سب نے

اسلام کے نام پر کس قدر خونریز جنگیں کی ہیں، ملوکیت، خلافت یا بادشاہت قائم کرنے کے لیے!! ڈکٹیٹر شپ میں بھی چونکہ تمام طاقت کا مرکز فردِ واحد ہوتا ہے اس لیے ایوب خان کو قائل کرنا قدرت اللہ شہاب جیسے لوگوں کے لیے مشکل نہیں رہا ہوگا۔

یہ ڈھول گلے میں ڈال کر اس طرح بجایا گیا کہ آج معصوم نوجوانوں کے ہاتھوں میں کتابوں کی جگہ بندوقیں تھما دی گئی ہیں۔ دینی درس گاہیں بم باندھ کر خودکش حملہ آوروں کی فیکٹریاں بن گئی ہیں۔ ''مجاہد''، ''مردِ مومن'' اور ''شاہین'' پیدا کئے جا رہے ہیں۔ جو کبھی گلگت، کبھی سوات اور کبھی وزیرستان کی پہاڑیوں پر بیٹھے ہیں اور اسلام کے نام پر یہ ''غازی'' یہ ''پراسرار بندے'' ہر روز سینکڑوں معصوم مسلمانوں کا خون بہا رہے ہیں۔ انسانوں کے شہر جل رہے ہیں مگر اسلام کے ان بیوپاریوں کو نہ تو شعلے نظر آتے ہیں اور نہ ہی دھواں۔

سرسید احمد خان کی تحریک بھی کسی نفاذِ اسلام کے لئے نہیں تھی

اسی طرح سرسید احمد خان کی تحریک بھی کسی اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے نہیں تھی بلکہ مسلمانوں کے لیے تھی۔ سرسید احمد خان نے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کا اس وقت علم اٹھایا جب زمین مسلمانوں پر تنگ کر دی گئی تھی۔ انگریز ان کے خون کا پیاسا تھا۔ وہ توپوں سے اُڑائے جا رہے تھے۔ سولی پر لٹکائے جا رہے تھے۔ ان کے گھروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تھی۔ ان کی جائیدادیں ضبط کر لی گئی تھیں۔ فارسی زبان کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان بنا دیئے جانے کی وجہ سے نوکریوں کے دروازے ان پر بند ہو گئے تھے اور روٹی روزگار کے راستے تاریک ہو گئے تھے۔ ایسے وقت میں سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو روشنی دکھائی۔ انہوں نے ایم۔اے۔او کالج کی بنیاد رکھی جو ترقی کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنی اور جس کی وجہ سے ہزاروں لاکھوں مسلمان انگریزی سیکھ پائے اور نوکریاں حاصل کر کے فاقہ کشی کی دنیا سے باہر نکلے۔

سرسید نے انگریزی زبان اور مغربی علوم کی جس شدت سے حمایت کی اسی شدت سے مذہبی استحصال کی مخالفت کی۔ اور نواب محسن الملک، مولانا شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد اور

مولانا حالی سرسید کے روشن چراغ تھے۔سرسید نے قرآنی آیات کی تاویل عقلی اور سائنسی بنیادوں پر کی۔سرسید کی سوچ سیکولر تھی۔ وہ دینی امور کو دنیوی امور سے الگ کر کے دیکھتے تھے۔ان کے نزدیک دنیوی معاملات کو دینی معاملات سے ملالینا جنون ہے۔

سرسید کی انگریزی تعلیم کی حمایت کی وجہ سے مسلمانان ہند جدید علم سیاست سے آشنا ہو سکے اور انہیں پتہ چلا کہ ری پبلک کیا ہے، پارلیمنٹ کا انتخاب کیسے ہوتا ہے، حق رائے دہی یعنی ووٹ کیا شے ہے، نمائندہ حکومت کیسے بنتی ہے،صوبائی اور مرکزی حکوت کیا ہوتی ہے،صوبائی خودمختاری کی تعریف کیا ہے، بنیادی حقوق کیا ہیں،اور سیاسی پارٹیاں کیوں اور کیسے بنائی جاتی ہیں۔

اسی علم کی روشنی میں مسلمانانِ ہند نے تحریک پاکستان کا راستہ تلاش کیا،جدوجہد کی اور قائداعظم کی قیادت میں اپنے سیاسی حقوق اور معاشی حقوق کی جنگ لڑی۔ یہ جدید علم مختلف مذاہب کے تقلیدی علما کے ذریعے حاصل نہیں ہوا۔

ہر وہ شخص جو اصلاح یا تبدیلی یا جدید فکر سے عوام کو روشناس کرانے کی کوشش کرتا ہے اسلام فروشوں کے نزدیک دین دشمن ملحد یا دہریہ قرار پاتا ہے۔ چنانچہ نہ صرف سرسید بلکہ علامہ اقبال، قائداعظم اور ذوالفقارعلی بھٹوسب کے خلاف کفر کے فتوے دیئے گئے۔

1878ء میں جمال الدین افغانی نے اپنے ہندوستان کے قیام کے دوران سرسید کے خلاف فارسی میں ایک کتاب ''رد نیچریت'' لکھی اور پیرس سے نکلنے والے اپنے جریدے عروۃ الوثقیٰ میں ''الدہریون فی الہند'' کے نام سے مضمون میں سرسید اور ان کے رفقاء کو دہریہ کہا۔اس کتاب میں ایٹمی فلاسفروں سے لے کر ڈارون تک، مزدک سے لے کر روسو تک، لبرل سیاست دانوں سے لے کر سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں تک، ہر فکر، ہر تحریک کو نیچری قرار دے کر فتویٰ صادر کیا گیا کہ ''اس ملعون گروہ نے ہمیشہ مذہب اور معاشرے سے غداری کی ہے، خدا سے انکار کیا ہے اور قانون اور اخلاق کو برباد کیا ہے۔''

انگریز اس کو زار روس کا ایجنٹ سمجھتے تھے۔ وہ پان اسلام ازم کا علمبردار تھا۔ 1838ء میں ایران کے شیعہ گھرانے میں پیدا ہونے والے جمال الدین نے لڑکپن

افغانستان میں گزارا۔ عبدالوہاب کی تعلیمات سے متاثر ہو کر وہابی بن گیا۔ کبھی افغانستان، کبھی ترکی، کبھی ایران، کبھی مصر، کبھی فرانس اور کبھی ہندوستان۔ اکثر جگہ سے اسے دیس نکالا ملا۔ بالآخر سلطنت عثمانیہ کے خلیفہ عبدالحمید دوئم نے اسے اپنے پاس رکھا اور قسطنطنیہ میں ہی اس کا انتقال ہوا۔

ان ''علما'' کی اپنی علمیت کا عالم یہ رہا ہے کہ جب 1440ء میں جرمنی میں چھاپہ خانہ ایجاد ہوا اور یورپ میں اس کا بھرپور استعمال ہونے لگا تو سلطنت عثمانیہ کے شیخ الاسلام نے فتویٰ دیا کہ مسلمانوں کی مقدس کتابیں ان مشینوں پر نہیں چھپیں گی۔ اس ایجاد کے تقریباً ڈھائی سو سال بعد تک مسلمانوں نے اس سے پرہیز کئے رکھا۔ اب مولوی کی اپنی کتاب ہو یا قرآن پاک کی اشاعت، پرنٹنگ پریس کے بغیر اس کا گزارہ نہیں۔ اسی طرح 1665ء میں پہلے انسانی بلڈ ٹرانسفیوژن کا کامیاب تجربہ ہوا۔ ان ''علما'' نے فوراً فتویٰ دے دیا کہ ایک انسان کا خون دوسرے انسان پر حرام ہے جس کی وجہ سے کئی سو سال تک مسلمان اس سے فیض یاب نہیں ہو سکے۔ اب ہر مُلّا کو اپنے بلڈ کا گروپ ازبر یاد ہے تاکہ بوقت ضرورت وہ دوسروں کا خون لگوا سکے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں رائٹ برادران نے امریکہ میں ہوائی پرواز کا کامیاب تجربہ کیا۔ ان ''علما'' نے فتویٰ دیا کہ جو لوگ یہ مانتے ہیں کہ لوہا بھی ہوا میں اڑ سکتا ہے تو ان کا ایمان چلا گیا اور وہ کافر ہو گئے۔ وہ ایک مدت تک یہ یقین کرنے پر تیار نہیں تھے کہ انسان نے چاند پر قدم رکھا ہے۔ میں نے خود ایک مولوی کو یہ کہتے سنا کہ ''اول تو چاند پر انسان گیا ہی نہیں اور اگر وہ گیا بھی ہے تو اس دن گیا ہوگا جب چاند چودھویں کا تھا، چاند پر جانے والے کافروں کو اس وقت خدا کی طاقت سمجھ میں آئے گی جب چاند گھٹ کر گم ہو جائے گا اور وہ دھڑام سے زمین پر آن گریں گے۔ خدائی نظام میں دخل دینے والے ان کافروں کو خدا کبھی معاف نہیں کرے گا اور وہ سیدھے جہنم میں جائیں گے۔''

بچپن میں پڑھایا گیا تھا کہ اسلام سے پہلے کا دور جہالت کا دور تھا۔ جب میرے مطالعہ کا زمانہ آیا تو پتہ چلا کہ ایسا تو نہیں ہے۔ دنیا کا پہلا قانون ساز حمارابی

1772 قبل مسیح میں پیدا ہوا جبکہ اسلام ساتویں صدی عیسوی میں آیا۔ یعنی اسلام سے تقریباً 2500 سال پہلے۔ دنیا کا پہلا عظیم طبیعیات دان ارشمیدس 227 قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ دنیا کا عظیم ریاضی دان فیثاغورث 570 قبل از مسیح میں پیدا ہوا۔ افلاطون اور ارسطو اسلام سے تقریباً ایک ہزار سال قبل پیدا ہوئے۔ لہٰذا اسکول میں پڑھا ہوا سبق کہ اسلام سے پہلے کا دور جہالت کا دور تھا، جھوٹ نکلا۔ چین علم کا گہوارہ تھا جس کے لئے رسول پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ علم حاصل کرنے کے لیے اگر چین جانا پڑے تو جاؤ۔ دراصل عرب دور جہالت میں تھے اور آج تک ہیں۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھی اس خطے میں بھیجے گئے اور ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔

علامہ اقبال مُلاّؤں کے خلاف تھے، دنیا پر اسلام کا غلبہ چاہتے تھے

علامہ اقبال بھی مُلاّؤں کے سخت مخالف تھے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم جو ان کے انتہائی عقیدت منداحباب میں سے تھے، اپنے مضمون ''اقبال اور ملا'' میں لکھتے ہیں کہ ''اقبال ایسے فتویٰ فروش مولویوں کے سخت خلاف تھے۔ مولوی تو ہر فروعی اختلاف پر مخالف کو کافر قرار دیتا ہے۔ لیکن اقبال غیر مسلم موحد کو بھی کافر نہیں سمجھتے تھے اور اکثر اکابر صوفیا کی طرح سماع کو روح پرور جانتے تھے.......... اقبال نے دیکھا کہ مدعیان دین اور داعیان شرع متین میں نہ افکار کی بلندی ہے، نہ حوصلہ مندی، نہ دل بے تاب ہے اور نہ مشرب ناب، نہ دل گرم ہے نہ نگاہ پاک، تو اس نے اس طبقہ کو دین کے لیے ایک خطرہ سمجھا۔ ایسے لوگوں کو جب سوجھے گی کوئی ادنیٰ بات ہی سوجھے گی۔ کسی بلند مقصد کے لیے قربانی تو درکنار وہ مقصد ہی ان کو سمجھ میں نہیں آئے گا۔ چنانچہ تاسیس پاکستان کی جدوجہد میں اس کا خیال صحیح ثابت ہوا۔ بڑے بڑے خرقہ اور عمامہ والے ملا، محدث، مفسر، فقیہہ اس تحریک کے مخالف ہو کر متعصب اور مسلمان کش لوگوں کے ساتھ ہو کر ملت اسلامیہ سے آمادہ پیکار ہو گئے.......... تحریک خلافت میں جب بہت سے مولوی صاحبان سیاست کے میدان میں کودے تو پھر ان کی یہ کیفیت تھی کہ ان سیاسی علماء نے لاہور میں ایک بہت بڑا

اجتماع کیا تا کہ اس مسئلے کا فیصلہ کیا جا سکے کہ خدائے تعالٰی جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں۔ امکان کذب باری تعالٰی پر بہت گرما گرم بحثیں ہوئیں۔اسی پر ایمان و کفر کا مدار ٹھہرا......''

''امام ہند بننے کا خواب دیکھنے والے ہندوؤں کے وظیفہ خوار اور دین سے ہٹی ہوئی وطن پرستی میں ان کے ہم کلام ہی نہیں بلکہ ابوالکلام ہیں۔یعنی کلام کے باپ ہو گئے۔ جس کے علم وتقویٰ پر مدینہ کی مہر ثبت تھی اس کی بابت جواہر لال نہرو کا ایک خط شائع ہو گیا کہ حسین احمد کو اتنے روپے دے چکا ہوں کہ اب وہ مانگتے نہیں۔نہرو نے ان کے ساتھ نہ مولانا لکھا نہ جناب اور نہ صاحب۔''

علامہ اقبال نے حسین احمد مدنی پر ہجو بھی لکھی تھی۔ان کے نزدیک دین مُلّا فی سبیل اللہ فساد تھا جس کا عملی مظاہرہ ہمیں ہمیشہ دیکھنے کو ملا اور آج کل تو یہ اپنے عروج پر ہے۔

مرزا ابوالحسن اصفہانی نے اپنی کتاب Quaid-e-Azam Jinnah, as I know him میں لکھا ہے کہ مولانا کفایت اللہ اور حسین احمد مدنی نے مسلم لیگ کو یہ پیش کش کی تھی کہ مدرسہ دیوبند کی پروپیگنڈا مشینری مسلم لیگ کے لیے کام کرے گی بشرطیکہ لیگ ان کو پانچ ہزار روپے کی رقم پیشگی عنایت کر دے۔قائداعظم اس طرح کا کاروبار نہیں کرتے تھے۔لہٰذا ان کے انکار کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ مولانا حسین احمد مدنی اور علمائے دیوبند کا قائداعظم اور پاکستان کی مخالفت کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔

علامہ اقبال مارکسسٹ بھی نہیں تھے۔مگر مُلّا نے انہیں کافر قرار دے دیا تھا۔ علامہ کی تحریروں پر نظر ڈالی جائے تو یہ تاثر ملتا ہے کہ انہوں نے مارکسزم کا کوئی باقاعدہ اور گہرا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ان کے 29-1928ء کے لیکچرز میں یورپ کے بورژوا فلسفیوں اور مفکروں کے حوالے ضرور ہیں لیکن ان کے کسی بھی لیکچر میں جدلیاتی مادیت (Dialectical Materialism) پر کوئی بحث نہیں اور نہ ہی کارل مارکس، لینن اور دوسرے کمیونسٹ مفکروں کے فلسفیانہ نظریات کا کوئی ذکر ہے۔

وہ روس کے 1917ء کے انقلاب سے متاثر تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر اشتراکیت یعنی بالشوزم میں خدا کے تصور کو شامل کر لیا جائے تو یہ اصل اسلام ہے۔

بالشوزم + خدا = اسلام۔ گراں خواب چینی بھی جب سنبھلنے لگے تو ان کو ہمالہ سے سوشلزم کے چشمے پھوٹتے نظر آئے۔

ایک ایسے وقت میں جبکہ مغربی استعمار کو سوشلزم سے خطرہ لاحق تھا اور وہ اس فکری سیلاب کے سامنے مذہب کا بند باندھ رہا تھا برصغیر میں علامہ کے خیالات خطرناک تھے۔ چنانچہ عمامے والوں کی صفیں تیار کر کے ان پر کفر کے فتوؤں کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ حالانکہ ان کا مردمومن ''شہادت اور جذبہ جہاد'' مسلم کا وطن سارا جہاں، جہاں پر اسلامی نظام کو نافذ کیا جائے، ایسے تصورات تھے جو کسی بھی طرح آج کے جہادی مُلّا بلکہ طالبان سے کم نہیں تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اسلام کل عالم پر چھا جائے اور مسلمان دنیا کی سب سے بڑی قوم بن جائیں۔ پان اسلام ازم ان کا خواب تھا اور اسلامی نشاۃ ثانیہ ان کی منزل مگر اس وقت علامہ کے اشتراکیت کے حق میں جو تصورات تھے وہ مُلّا کو قابل قبول نہیں تھے۔

علامہ بادشاہت اور ملوکیت کے بھی خلاف تھے جبکہ آل سعود کی بادشاہت اور شیخ محمد عبدالوہاب کی تخلیق کردہ سلفی فقہ کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ سلفی مُلّا بھی علامہ کے خلاف تھا۔ اس کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ علامہ نطشے اور مولانا رومی سے بہت متاثر تھے اور رسول پاک ﷺ کے مدح خواں تھے۔ وہ صوفیان کرام میں انسانی عظمت کے پیغام کو دیکھتے تھے۔

علامہ کی ذاتی دوستیاں پنجاب کے رجعت پسند جاگیرداروں اور برطانوی سامراج کے پشتینی پٹھوؤں کے ساتھ بھی تھیں۔ علامہ کو 1933ء میں سر کا خطاب بھی نواب ذوالفقار علی خان کی سفارش پر ملا تھا۔ ملتان کا احمد یار خان دولتانہ علامہ کے ساتھ اپنی عقیدت میں اچھی دودھ دینے والی گائے، بھینس وغیرہ کا تحفہ بھیجتا تھا مگر علامہ کا پیغام تھا کہ جس کھیت سے دہقان کو روزی میسر نہ ہو، اس کھیت کے ہر گوشہ گندم کو جلا دو۔ وہ اورنگ زیب کی مدح سرائی بھی کرتے تھے اور سرمد کی بھی۔ قاتل اور مقتول دونوں ہی بلند کردار کے حامل!!

پاکستان بننے کے بعد یہاں کے حکمرانوں اور مُلّاؤں نے علامہ اقبال کا ''خودی کا سرنہاں لا الہ اللہ'' خوب جھوم جھوم کر گایا۔ ان کے فلسفۂ اجتہاد پر لمبی سی داڑھی لگا کر اور ان کے کندھے پر چارخانوں والا پٹکا ڈال کر انہیں اپنی صفوں میں کھڑا کر لیا۔ آج وہ مُلّا سب

سے زیادہ پڑھا لکھا سمجھا جاتا ہے جو علامہ اقبال کے شعر، بالخصوص ان کے فارسی کے شعر اپنی تقاریر میں زیادہ استعمال کرتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ علامہ اقبال عوام الناس کے لئے اور نئی نسل کے لئے اجنبی ہوتے چلے گئے۔ نوجوان نسل کو علامہ کے ان خیالات میں جو سلیبس کی کتابوں میں ریڈیو یا ٹیلی ویژن کے ذریعے پیش کئے گئے اپنے مسائل کا حل نظر نہیں آیا البتہ ''محبت مجھے ان جوانوں سے ہے ستاروں پر جو ڈالتے ہیں کمند'' کے مطابق استحصالی طبقات کے نوجوان سیاست دانوں نے ملکی سیاست و معیشت کے ستاروں پر کمندیں ڈالنا شروع کر دیں۔ قوم کی تقدیر اپنے ہاتھوں میں لے کر مقدر کا ستارہ بن کر چمکنے لگے۔

دہشت گردوں اور اسلام فروشوں نے علامہ اقبال کے ''مرد مومن''، ''شہادت''، ''جذبہ جہاد'' اور ''مسلم کا وطن سارا جہاں'' جیسے تصورات کو مشرف بہ دہشت گردی کیا اور اب افغانستان اور پاکستان کی چٹانوں پر شاہینوں کا بسیرا ہے۔ یہ ''غازی'' یہ ''پراسرار بندے''، ''قہاری و جباری و قدوسی و جبروت'' کے چاروں عناصر پر مشتمل یہ مسلمان ''جذبہ شہادت'' سے سرشار ہو کر دنیا بھر کے معصوم عوام کا قتل عام کرتے پھر رہے ہیں۔ نہ مسجدیں محفوظ ہیں، نہ امام بارگاہیں، نہ ہی اسلاف کی قبریں اور نہ ہی اولیا اور صوفیاء کرام کے مزار، نہ ہی مندر اور نہ ہی چرچ۔

علامہ اقبال کے وہ تصورات جو ملوکیت کے خلاف تھے اور غریبوں کے حق میں تھے حکمران طبقات اور اسلام پسندوں نے قیام پاکستان کے فوراً بعد ان پر چار خانوں والا اسلامی پرنہ ڈال دیا۔ علامہ اقبال پر ''رحمتہ اللہ علیہ'' لکھ کر احترام کی الماری کے سب سے اونچے شیلف پر سجا کر عوامی شعور کی پہنچ سے باہر کر دیا۔ پہلی بار پاکستان میں علامہ کا انسانی عظمت اور معاشی مساوات کا پیغام 1968ء کی عوامی تحریک میں ابھر کر سامنے آیا، صفدر میر جیسے نڈر اور بے باک صحافیوں اور پروفیسر وارث میر، پروفیسر عثمان، ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف، محمد حنیف رامے اور خورشید عالم جیسے دانشوروں نے انہیں مُلا اور اسلام پسندوں کی قید سے آزاد کروایا۔ اب تو علامہ اقبال مُلاؤں، دہشت گردوں، ٹی۔ وی چینلز کے ''دانشور'' اینکروں کے قبضے میں ہیں۔

یہ تھیوکریسی کیا ہے؟

پاکستان کو ایک تھیوکریٹک ریاست بنانے کی جو کوششیں شروع ہوئی تھیں وہ ابھی تک جاری ہیں۔ یہ تھیوکریسی ہے کیا؟ تھیوکریسی ریاست کی وہ قسم ہے جس میں حکومت کے قوانین، احکام خداوندی سے منسوب کئے جاتے ہیں اور حاکم اعلیٰ خدا یا خدا کے پیغمبر کا نمائندہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، خلیفہ، بادشاہ یا امیر المومنین کی شکل میں۔ یعنی تھیوکریسی میں اقتدار اعلیٰ کے مالک اس ملک کے عوام نہیں بلکہ فرد واحد خدا کی ترجمانی کرتے ہوئے خدا کے نام پر اپنی مرضی کی شریعت نافذ کرتے ہوئے حکومت پر قابض رہتا ہے۔ پادری یا مُلّا اس سربراہ مملکت کی شریعت کی تشریح کرتے ہوئے عوام کو یقین دلاتا ہے کہ پوری کائنات اور اس کا انتظام خدا اور اس کے حکم سے قائم ہوا ہے۔ بادشاہ، خلیفہ، امیر المومنین، جاگیردار، امرا، غریب، یہ سب خدا کی مرضی کے مطابق ہیں اور اس نظام کے خلاف جدوجہد کرنا گویا خدا کی مرضی کے خلاف جدوجہد کرنا ہے جو کہ بہت بڑا گناہ ہے۔

اس طرح کے نظام میں سیاسی مخالفین کے ہاتھ کاٹے جاتے ہیں، سر قلم کئے جاتے ہیں، زندہ سنگسار کیا جاتا ہے، پھانسیاں دی جاتی ہیں، کوڑے مارے جاتے ہیں اور حاکم وقت ان افراد کو جن سے اس کے اقتدار یا حاکمیت کو خطرہ ہوتا ہے، یہ کہہ کر کہ ان افراد سے مذہب کو خطرہ ہے، اپنے ظلم و تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو مذہبی اجارہ داروں اور اس طرح کے حکمرانوں کا عوام کے خلاف ہمیشہ گٹھ جوڑ رہا ہے۔

سیکولرزم کا کیا مطلب ہے؟

اسی طرح سیکولرازم کے بارے میں بھی جاننا بہت ضروری ہے۔ سیکولر کا مطلب یہ ہے کہ مذہب کی امور سلطنت میں مداخلت نہ ہو اور ہر شخص کو اپنے عقیدے کی پوری آزادی ہو۔ گویا ریاست اور مذہب الگ الگ ہوں۔ سیکولر ہونے کا مطلب ہرگز لادین ہونا نہیں، جو کہ کم علم مولوی یا رجعت پسند سیاست دان اور بکاؤ ٹی وی اینکر بیان کرتا ہے۔

بالکل اسی طرح کہ جیسے سوشلسٹ ہونے کا مطلب قطعاً لادین ہونا نہیں۔

میرے نزدیک میثاق مدینہ مسلمانوں، یہودیوں اور دیگر غیر مسلموں کے مابین ایک ایسا معاہدہ تھا جس میں ان سب کے لئے اُمہ کا لفظ استعمال کیا گیا تھا۔ اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنہوں نے ہم تک اور اسلام کے ان اجارہ داروں تک دین کو پہنچایا، انہوں نے عیسائیوں اور یہودیوں کے فیصلے ان کی شریعت کے مطابق کئے اور کرائے۔ انہوں نے اسلامی شریعت کو ریاستی نظام کا حصہ بنا کر غیر مسلموں پر مسلط نہیں کیا۔ یہ پاکستان اور قائداعظم کے خلاف سازش ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر اسلام کے لیے حاصل کیا گیا تھا اور یہ کہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے۔

پاکستان اس خطے میں بسنے والے اپنے سیاسی اور معاشی حقوق سے محروم مسلمانوں کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔ وہ لوگ جنہوں نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا اور زندہ ہیں وہ میری اس بات کی گواہی دیں گے کہ حصول پاکستان کی اس پوری جدوجہد میں ماسوائے ایک جلسے کے جس میں ایک شاعر نے یہ نظم پڑھی تھی، کبھی بھی پاکستان کا مطلب کیا ''لا الہ الا اللہ'' کا نعرہ نہیں لگا اور نہ ہی اس کے بینر یا پوسٹر نظر آئے۔ یہ جماعت اسلامی اور اس قبیل کی دوسری مذہبی سیاسی جماعتوں کی قیام پاکستان کے بعد کی اختراع ہے۔

استحصالی طبقات اور حکمران، معصوم انسانوں کے مذہبی جذبات سے کھیل کر اپنے سیاسی مقاصد، جن میں مادی مفادات چھپے ہوتے ہیں، حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے کہ دنیا بھر کے سادہ اور معصوم انسانوں کی اکثریت کے دلوں کے اندر ایک چھوٹا سا عبادت خانہ چھپا رہتا ہے۔

کارل مارکس نے مذہب کے بارے میں کہا تھا کہ ''یہ کچلی ہوئی اور پسی ہوئی مخلوق کی 'آہ' ہے اور ان کے لیے ایسی افیون کا کام دیتی ہے کہ جس سے وہ اپنے دکھوں کو اور اذیتوں کو برداشت کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔''

میں سمجھتا ہوں کہ غریب انسانوں کی اکثریت، جن کے دلوں میں خدا بستا ہے، وہ اپنے آج میں نہ سہی تو اپنے آنے والے کل میں دنیاوی خداؤں کا اجتماعی مقابلہ ضرور کرتے

ہیں۔تاریخ میں ہم نے یہی دیکھا۔پاکستان میں مذہبی اجارہ داروں نے ایک طویل عرصے سے عوام کی نظریں آسمان پر مرکوز کروائی ہوئی ہیں۔اب ان نگاہوں کو زمین پر واپس لوٹ آنا چاہیے اور اپنے مسائل کا حل خود تلاش کرنا چاہیے۔قرآن کے مطابق خدا بھی ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد کے لیے تیار ہوں۔

ہمارے جیسے معاشرے میں ذہنوں پر مسلط صدیوں سے چڑھائے ہوئے غلاف کو اتارنا ضروری ہے۔جب تک آپ یہ غلاف نہیں اتارتے آپ کو پتہ نہیں چل سکتا کہ اس کے اوپر ایک آسمان ہے جو غلاف سے کہیں بڑا ہے۔اس میں چاند بھی ہے اور سورج بھی، بادل بھی ہیں اور بجلی بھی اور یہ کہ خدا رب المسلمین ہی نہیں بلکہ رب العالمین ہے۔رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحمت اللمسلمین ہی نہیں بلکہ رحمت اللعالمین ہیں۔

میں نے قرآن پاک کا بغور مطالعہ کیا ہے۔مجھے تو اس میں انسان سے محبت اور انسانیت کی عظمت کا پیغام ملا ہے۔ایک ایسا پیغام جو معاشرے میں کچلے ہوئے، پسے ہوئے طبقات کے غصب شدہ حقوق کے حصول کا پیغام ہے۔اسی قسم کا پیغام بائیبل، رامائن، بھگوت گیتا، بدھ مت اور دیگر مذاہب کی تعلیمات میں بھی دیا گیا ہے۔ان تعلیمات کی روشنی میں ہم نے تاریخ انسانی کے مختلف ادوار میں مظلوموں کے حق میں انقلاب برپا ہوتے دیکھے۔

حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے علاوہ رام، کرشن، بدھ، سقراط، کنفیوشس، زرتشت، اولیائے کرام، بھگت کبیر، بابا نانک، کارل مارکس، لینن، سٹالن، ہوچی منہ اور ماؤزے تنگ سب ہی ظلم کے خلاف اور مظلوموں کے حق میں انقلاب برپا کرتے نظر آتے ہیں۔سبھی انسانوں کو خوشحال اور محفوظ دیکھنا چاہتے تھے اور سبھی انسانوں کے ہاتھوں انسانوں کے ظلم و استحصال کے خلاف تھے۔

تحریک پاکستان کو بھی اسی نکتہ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔حصول پاکستان اور قیام پاکستان کی کہانی عظیم مقاصد کے حصول کی کہانی ہے۔برصغیر میں بسنے والی مسلمان قوم ایک نہایت پرآشوب دور سے گزر رہی تھی۔وہ ہندو اور انگریز دونوں کے معاشی اور

سیاسی تسلط کا شکار تھی۔ پورا برصغیر آزادی کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔ اس جدوجہد میں جب مسلمانوں کو یہ یقین ہو گیا کہ ایک آزاد خطے کے حصول کے بغیر انہیں مکمل آزادی نہیں مل سکتی تو انہوں نے قائداعظم کی قیادت میں اپنی معاشرتی، معاشی، تہذیبی اور فکری آزادی کے حصول کی جدوجہد کی، قربانیاں دیں اور پاکستان قائم کیا۔ یہ قومی حق خودارادیت کی تحریک تھی۔ اسلامی نظام کے نفاذ کی تحریک نہیں تھی۔

قائداعظم ایک لبرل بورژوا سیاسی رہنما تھے۔ وہ برطانوی پارلیمانی طرز جمہوریت کے حق میں تھے اور ایک سیکولر پاکستان میں اسلامی سوشلزم کے مطابق اقتصادی نظام چاہتے تھے۔ اس سے پہلے علامہ اقبال نے بھی بالِ جبریل اور ضرب کلیم میں جمہوریت اور اشتراکیت کی تائید میں اپنے خیالات نہایت وضاحت سے بیان کر دیئے تھے۔

پاکستان اس خطے میں بسنے والے مظلوم و محکوم مسلمان عوام کے لیے قائم ہوا تھا۔ پاکستان کسی قسم کی نظریاتی سرحدیں قائم کرنے یا جاگیردارانہ آمرانہ ڈکٹیٹرشپ یا فوجی ڈکٹیٹرشپ کے لیے قائم نہیں ہوا تھا اور نہ ہی قاتلوں، چوروں اور ڈاکوؤں کی حکمرانی کے لیے۔

لڑکپن

ہاں تو بات ہو رہی تھی میرے بچپن اور لڑکپن کی۔ میں اپنے ذہنی ارتقاء کے ابتدائی مراحل میں تھا۔ ایک دن میں والد صاحب سے پوچھ بیٹھا کہ کامریڈ کا مطلب کیا ہے انہوں نے مطلب تو بتا دیا مگر انہیں اس بات کی تشویش ہوگئی کہ یہ لفظ میں نے کہاں سے سنا یا پڑھا ہے۔ ان کا خیال تو بچوں میں سے سب کو نہ سہی تو کم از کم ایک کو تو ایران بھیج کر مجتہد بنانے کا تھا۔

میرے اس سوال کے پس منظر کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ ہمارے والد کے رشتے کے بھانجے تاجدار دہلوی نے جن کا نام سید مصطفیٰ زیدی تھا سرگودھا منتقل ہونے کے بعد پریس لگا کر ایک اخبار نکال لیا تھا۔ وہ صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب، شاعر اور مقرر بھی تھے۔ نہایت چرب زبان، تاجدار دہلوی کے حلقہ احباب میں جو لوگ تھے ان میں ایک ضامن علی حیدری بھی تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ دہریے ہیں اور خدا کو نہیں مانتے۔ مجھے اس بات کا تجسس تھا کہ جو شخص خدا کو نہیں مانتا وہ کس طرح کا ہوگا؟ اس کی شکل، ہاتھ، پیر، حلیہ کیا ہوگا؟ کیونکہ ابھی تک میرے ذہن میں خدا کا جو تصور بنایا گیا تھا وہ محبت کرنے والے خدا کا نہیں بلکہ جبار اور قہار کا تھا جو اپنے نہ ماننے والوں کو اور اپنے مخالفین کو اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی جہنم کی آگ میں جلاتا ہے۔ میں ضامن علی حیدری کو دیکھنے اور ملنے کا خواہش مند تھا۔

ایک روز تاجدار دہلوی اپنے دوستوں کے ساتھ شام کو ہمارے گھر آئے۔ ان کے ساتھ آنے والوں میں سفید سوٹ ٹائی میں ملبوس ایک بڑی بڑی مونچھوں والا

خوبصورت نوجوان بھی تھا جو گفتگو بھی خوبصورت کر رہا تھا۔ پتہ چلا کہ یہ ضامن علی حیدری ہے۔اسی کی گفتگو سے میں نے کامریڈ کا لفظ سن کر والد صاحب سے اس لفظ کے معنی پوچھے تھے۔ میں نے ضامن حیدری کی گفتگو کو غور سے سنا۔ وہ خدا کے نہیں بلکہ اس دور کے اجارہ دار خداؤں کے خلاف تھا۔اس معاشی ،معاشرتی استحصالی نظام کے خلاف تھا جو مظلوم ومحکوم انسانوں پر مسلط کیا جاتا ہےاوران کی زندگیوں کو جہنم بنا دیتا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ ضامن علی حیدری نے اپنے بیٹوں کے نام لینن علی حیدری اور سٹالن علی حیدری رکھے تھے۔

پھر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ اچھے بھلے سفید نیکر پہن کر بیڈمنٹن کھیلنے اور فیملی کے ساتھ سنیما گھر جا کر فلم دیکھنے والے میرے والد سید اکبر حسین زیدی اچانک سیٹلائٹ ٹاؤن میں مسجد کی تعمیر میں لگ گئے۔ انجمن امامیہ قائم ہوئی۔ مسجد القائم تعمیر ہونے لگی۔ دھڑا دھڑ مجالس، جشن مولود وغیرہ ہونے لگے۔ انجمن اصغریہ بنا کر حسن کے حوالے کر دی گئی۔ مجھ سے وہ مایوس ہونا شروع ہو گئے تھے کیونکہ بقول ان کے، اماں اور آپا کے لاڈ و پیار نے مجھے خراب کر دیا تھا اور میں نے لال کتابیں پڑھنا شروع کر دی تھیں۔انہوں نے حسن جعفر میں مستقبل کا ایک نہایت جید مجتہد عالم دیکھنا شروع کر دیا۔مگر جب حسن نے بھی اپنے کمرے میں ماؤزے تنگ کی تصویر ٹانگ لی تو وہ اس سے چھوٹے سعید جعفر کو عمامہ، جُبّے، قُبّے میں دیکھنے لگے مگر سعید بھی اس راہ پر نہ لگ سکا۔ ایک ایک کر کے سب ہی سماج کے ارتقائی عمل اور جدید علوم کے ساتھ منسلک ہو گئے۔

وہ علوم جنہوں نے انیسویں صدی میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے آزادی اور خودمختاری کی ایک نئی جہت پیدا کی تھی، جس کی ابتداء 1543ء میں پولینڈ کے سائنس دان نیکولا کوپرنیکس نے یہ ثابت کر کے کی کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔اس وقت چرچ اور آسمانی کتابوں کے مطابق زمین جامد اور غیر متحرک تھی۔کوپرنیکس کی تحقیق ابھی چھپی ہی تھی کہ اس کا انتقال ہو گیا اور بادشاہان وقت اور مذہبی ٹھیکیدار اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔مگر 1619ء میں جب گلیلیو نے اس تحقیق پر مزید کام کیا اور اس کا کام منظر عام پر آیا تو ہر مذہب کا مُلّا اس کے پیچھے پڑ گیا۔ گلیلیو اس بات کا پرچار بھی کرتا تھا کہ خدا پر یقین کرنا یا نہ کرنا ایک

ذاتی اختیار کا معاملہ ہے۔ اسکی سائنسی تحقیق اور خیالات کی بنیاد پر اسے جیل میں ڈال دیا گیا۔ پھر لڈوگ فیور باخ (Ludwig Feurbach)، نیوٹن، کوپرنیکس، چارلس ڈارون، سیگمنڈ فرائڈ (Sigmund Frued)، نطشے، ہیگل، اینگلز، کارل مارکس کے خیالات پروان چڑھنے لگے۔ کانٹ اور لیپلس نے کرہ ارض کیسے وجود میں آئی پر تحقیق کی، اپنا اپنا نظریہ پیش کیا۔ ان تمام سائنس دانوں کی تحقیق، فلاسفرز کے فلسفے، سائنسی تشریح اور مفہوم، حقیقت کے روپ میں سامنے آئے جنہوں نے اس وقت کے مذہب کے تشخص کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ مسیحی اور انجیل کی تعلیمات کی صداقت کو شک کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ سائنس دانوں کو سخت سزائیں دی گئیں۔ پرونو کو آگ میں جلایا گیا۔ یوں انیسویں صدی کے آخر تک پوری دنیا اور مذہبی دنیا بدل گئی۔ غور و فکر کے ایک نئے عہد نے جنم لیا۔ انگلستان کے صنعتی انقلاب اور انقلاب فرانس کے بعد پوری دنیا صنعتی ترقی اور ترقی پسند خیالات کی لپیٹ میں آ گئی۔

یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان کے نواب اور شہزادے جدید علوم سے بے بہرہ، شیروں کے جبڑے پھاڑنے کے قصوں، گل و بلبل کی شاعری اور عیش وعشرت کی دنیا میں مست تھے اور مغلیہ سلطنت زوال پذیر تھی۔

مارکس اور اینگلز نے طبقاتی نقطہ نظر سے سماج کا بھرپور تجزیہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ویسے تو مارکس اور اینگلز سے پہلے بھی فلاسفروں نے طبقاتی نظام کو اجاگر کیا تھا۔ افلاطون نے تقریباً دو ہزار برس قبل کہا تھا کہ ہر شہر میں دو شہر بستے ہیں۔ ایک امیروں کا دوسرا غریبوں کا۔ مگر مارکس اور اینگلز نے پہلی بار سائنسی نقطہ نظر سے اس بات کی نشاندہی کی کہ دنیا کس طرح بدلی جاسکتی ہے اور یہ کہ سوشلزم، کمیونزم کا معاشی اور معاشرتی نظام قائم کر کے طبقات ختم کئے جا سکتے ہیں اور اس دکھ بھری دنیا کو خوشحالی سے منور کیا جاسکتا ہے۔

جلد ہی والد صاحب نے جدید عہد کے علمی تقاضوں اور حقیقتوں کو سمجھ لیا اور پھر وہ اپنے تمام بیٹوں پر فخر کرنے لگے۔ ہماری کوئی بہن نہیں۔ ہم چھ بھائی ہیں۔ حسن، سعید، عقیل اور وسیم انجینئرز ہیں۔ جبکہ سرفراز ڈاکٹر۔ سب اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے ملک سے باہر

چلے گئے اور تین نے کینیڈا اور امریکہ میں سکونت اختیار کر لی۔ میں بوجوہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ ہم اپنے مسائل کے باوجود وقت کے دھارے کے ساتھ رہے۔

ہمارے ترقی پسند خیالات اور طرزِ زندگی میں ہماری ماں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ وہ میکسم گورکی سے لے کر عصمت چغتائی تک سب کا نہایت خاموشی سے مطالعہ کرتیں۔ ایک دن انہوں نے مجھے یہ قول پڑھ کر سنایا کہ ''انسان کو زندگی ایک بار ملتی ہے وہ اسے اس طرح گزارنی چاہیے کہ کبھی اسے اپنے ماضی پر ندامت نہ ہو۔ وہ کہہ سکے کہ میں نے اپنی ساری زندگی اور طاقت بنی نوع انسان کی آزادی کے لیے وقف کر دی۔'' ان دنوں پاکستان میں اشتراکی لٹریچر کا داخلہ ممنوع تھا اور اس کا مطالعہ جرم تھا۔ کمیونسٹ پارٹی پر پابندی تھی مگر کہیں نہ کہیں سے ناولوں اور رسالوں کی شکل میں کچھ نہ کچھ دستیاب ہو جاتا تھا۔

سٹیلائٹ ٹاؤن سرگودھا میں ہمارے اردگرد نئے گھروں میں اضافہ ہونے لگا۔ وقت کی رفتار سست تھی۔ لوگوں کو اپنی ضمیر پرستی پر ناز تھا۔ رشوت لینے والے کا سوشل بائیکاٹ ہوتا اور ہر وہ گھر جس پر ھذا من فضل ربی لکھا جاتا مشکوک آمدنی سے تعمیر شدہ سمجھا جاتا۔ اس طرح کے گھروں کے مکینوں کا تعلق اکثر اوقات انکم ٹیکس، پولیس، پی ڈبلیو ڈی اور مقامی انتظامیہ کے محکموں سے ہوتا۔ راشی یعنی رشوت لینے والے کو معاشرے میں ایک گالی سمجھا جاتا تھا۔

پڑوس میں آ کر بسنے والے آغا محمد حسین کے صاحبزادے الطاف سے میری دوستی ہو گئی اور بعد میں اس کے بھائیوں حسنین اور اعجاز کے ساتھ بھی۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں اضافہ ہونے لگا۔ الطاف کو ابن صفی کے جاسوسی ناول پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ ابن صفی، شوکت تھانوی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، ساحر لدھیانوی، خشونت سنگھ، خواجہ احمد عباس، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، مصطفیٰ زیدی، قتیل شفائی، ایم اسلم، نسیم حجازی، غرضیکہ جو کچھ بھی آنہ لائبیری میں آتا وہ ہماری روزمرہ کی پڑھائی کا حصہ بن جاتا۔ وہی واہی چھپ کر پڑھنے والی چیز تھی۔ عمر بلوغت کی دنیا کو چھونے لگی تھی۔ مگر شجر ممنوعہ سے دور رہنے کا معاشرتی حصار قائم تھا۔ شیطان اکثر اس پھل کو کھانے کی

ترغیب دیتا مگر کسی حوا کی بیٹی نے اس ترغیب کو عملی شکل دینے میں حوصلہ افزائی نہیں کی۔ یوں بھی اس ''جرم'' میں جنت یعنی گھر سے نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں اب کالج میں جانے کے لیے تیار تھا۔ یہ 1960ء کی بات ہے۔

اس وقت تک پاکستان اپنی سیاسی تاریخ کی کچھ منزلیں طے کر چکا تھا۔ آئیں ذرا اس وقت تک کے پاکستان کا جائزہ لیں۔

پاکستان میں سیاسی تاریخ کی ابتدائی منزلیں

مسلم لیگ کی لیڈر شپ قائداعظم کی سرکردگی میں پاکستان آئی۔ 1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت قائداعظم پاکستان کے پہلے گورنر جنرل اور لیاقت علی خان وزیر اعظم بنے۔ اقتدار اعلیٰ گورنر جنرل کے پاس تھا۔

یعنی ریاست کا سربراہ گورنر جنرل اور حکومت کا سربراہ وزیر اعظم۔ ملک کی پہلی کابینہ میں نوابزادہ لیاقت علی کے علاوہ نہ تو کوئی جاگیردار تھا اور نہ ہی کوئی مُلّا۔ ان کے وزراء میں سردار عبدالرب نشتر، راجہ غضنفر علی، خواجہ شہاب الدین، سر ظفر اللہ خان، آئی آئی چندریگر، جوگندر ناتھ منڈل اور غلام محمد تھے۔ غلام محمد واحد وزیر تھا جس کا تعلق نوکر شاہی سے تھا۔

سندھ میں مسلم لیگ کی لیڈر شپ میں اختلاف ہو گئے تھے۔ جی ایم سید جو مسلم لیگ کے اہم رہنماؤں میں سے تھے اسمبلی کی چند ٹکٹیں نہ ملنے کی وجہ سے قائداعظم اور پھر پاکستان کے خلاف ہو گئے۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی جو انگریز کے پیدا کردہ جاگیرداروں کی پارٹی تھی، اقتدار میں رہنے اور اپنی جاگیریں بچانے کے لئے مسلم لیگ میں شامل ہو گئی تھی۔ سرحد میں خان عبدالغفار خان، خان عبدالولی خان کے والد جو سرحدی گاندھی کہلاتے تھے، مسلم لیگ سے الگ رہے۔ خان عبدالقیوم خان جو پہلے کانگرس اور پھر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے، ان کے اور غفار خان کے شدید اختلافات تھے۔ بلوچستان میں نواب آف قلات شروع سے ہی پاکستان کی حاکمیت ماننے کو تیار نہیں تھا۔ خود قائداعظم کو خان آف قلات کو منانے کے لیے جانا پڑا تھا۔ جبکہ باقی کے بلوچستان نے

پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کیا تھا۔ یوں پاکستان بننے کے فوراً بعد قائداعظم کو بڑی مشکلات کا سامنا تھا۔ اقتصادی حالات تو خراب تھے ہی۔ پھر مسلم لیگ ابھی تک ایک تحریک تھی، تنظیم کی شکل اختیار نہیں کر سکی تھی۔ لیاقت علی خان اور قائداعظم کے درمیان کشیدگی اور تضاد بڑھتا جا رہا تھا۔

لیاقت علی خان اور قائداعظم میں کشیدگی

اس کا اندازہ جولائی 1948ء کے اس واقعہ سے ہوتا ہے جس کا ذکر کرنل الٰہی بخش نے بھی اور محترمہ فاطمہ جناح نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ محترمہ فاطمہ جناح کے مطابق جولائی 1948ء کے آخر میں ایک روز وزیراعظم لیاقت علی خان اور سیکرٹری جنرل چوہدری محمد علی اچانک زیارت آ گئے۔ ان کے آنے کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ وزیراعظم نے ڈاکٹر الٰہی بخش سے پوچھا کہ قائداعظم کی صحت کیسی ہے؟ ڈاکٹر الٰہی بخش نے کہا کہ مس جناح ہی آپ کو ان کے بارے میں بتائیں گی۔ میں اپنے مریض کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مس فاطمہ جناح نے جب قائداعظم کو لیاقت علی خان کی آمد کی اطلاع دی تو وہ مسکرائے اور کہا ''تم جانتی ہو وہ کیوں آئے ہیں۔ وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ میری بیماری کتنی شدید ہے اور میں کتنے عرصے تک زندہ رہ سکتا ہوں۔'' پھر جس طرح قائداعظم کراچی میں سڑک کے کنارے شدید گرمی میں ایمبولینس کا انتظار کرتے ہوئے آخری دموں پر تھے وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔

ادھر مشرقی پاکستان پر، جو ایک ہزار میل کی دوری پر تھا اور اس کی آبادی پاکستان کا 56% فیصد تھی، اردو زبان کو مسلط کرنے کے نتیجے میں عوام میں شدید بے چینی اور ردعمل تھا۔ اقلیت کی زبان کو اکثریت پر مسلط کیا گیا تھا۔ حسین شہید سہروردی وزیراعظم بننے کے خواہاں تھے مگر قائداعظم نے لیاقت علی خان کو جو مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل تھے وزیراعظم بنا دیا۔ قائداعظم کی جانب سے سہروردی کو بنگال کے اتحاد کا کام سونپا گیا تھا۔ چوہدری خلیق الزمان جیسے لوگ جنہیں قائداعظم ہندوستان میں مسلم لیگ کی تنظیم کا کام سونپ کر آئے تھے، وہ

لوٹ مار میں حصہ لینے کے لیے پاکستان آ گئے۔ قائداعظم نے انہیں ملنے سے انکار کر دیا مگر لیاقت علی خان نے خلیق الزمان کو پاکستان مسلم لیگ کا صدر بنا دیا۔ پھر لیاقت علی خان خود پاکستان میں الاٹمنٹوں کے کھیل کے ذریعے اپنا ''انتخابی حلقہ'' بنانے میں مصروف ہو گئے۔

میرے خیال میں اگر لیاقت علی خان کی جگہ سہروردی کو ملک کا پہلا وزیراعظم بنایا جاتا اور اردو زبان کو بنگالیوں پر قومی زبان کے طور پر مسلط نہ کیا جاتا تو شاید ہماری تاریخ مختلف ہوتی۔

قائداعظم کی جیب میں کھوٹے سکے تھے۔ ملکی حالات پر قائداعظم کی گرفت کمزور ہوتی گئی۔ ایسے لگتا ہے کہ کوئی بھی ان کا کہنا ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اکتوبر 1947ء میں جب بھارتی افواج کشمیر میں داخل ہونا شروع ہوئیں تو قائداعظم اس وقت لاہور میں تھے۔ انہیں جب اس بارے میں علم ہوا تو انہوں نے قائم مقام کمانڈر ان چیف جنرل سر ڈگلس گریسی کو حکم دیا کہ پاکستانی افواج کو بلاتاخیر کشمیر بھیجا جائے۔ جنرل گریسی نے حکم ماننے سے انکار کر دیا اور جواب دیا کہ میں آپ کے حکم کا پابند نہیں ہوں بلکہ مارشل سر کلاڈ آکن لیک کے حکم کا پابند ہوں جو کہ دہلی میں ہندوستان اور پاکستان کی افواج کا مشترکہ کمانڈر ان چیف تھا۔ نہ صرف یہ کہ جنرل گریسی نے حکم نہ مانا بلکہ مارشل سر کلاڈ آکن لیک نے نئی دہلی سے لاہور آ کر دھمکی دی کہ اگر قائداعظم کے حکم کی تعمیل کی گئی تو افواج پاکستان کے تمام برطانوی افسروں کو واپس بلا لیا جائے گا۔ گویا تقسیم کے بعد بھی برطانیہ پاکستان پر ہندوستان کی بالادستی چاہتا تھا اور کشمیر کا مسئلہ قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اس سے قبل کہ اس سیاسی دھند کے چھٹنے کی کوئی شکل بنتی قائداعظم کا 11 ستمبر 1948ء کو انتقال ہو گیا۔

لیاقت علی خان نے پاکستان کو امریکہ کی گود میں ڈال دیا

لیاقت علی خان کو 1950ء میں سوویت یونین کی طرف سے دورے کی دعوت دی گئی۔ ابھی سٹالن زندہ تھے اور خواہاں تھے کہ ہندوستان اور پاکستان کی فیڈریشن بن جائے کہ امریکہ نے لیاقت علی کو اپنے یہاں بلوالیا۔ وہ پہلے ہی اس انتظار میں تھے۔

سوویت یونین کی دعوت کو چھوڑ کر وہ امریکہ چلے گئے اور پاکستان کو امریکہ کی گود میں ڈال دیا۔ یاد رہے کہ لیاقت علی خان کے دادا نواب احمد علی خان نے بھی 1857ء میں انگریزوں کی خدمت کی تھی اور جدوجہد آزادی کے متوالوں کو کچلنے کے لیے پنجاب سے دہلی جانے والی انگریز فوج کے اسلحہ بارود اور دیگر جنگی سامان کو کرنال سے بحفاظت گزارنے کا فریضہ انجام دیا تھا۔

اب جبکہ برطانوی سامراج کی جگہ امریکی سامراج لے چکا تھا ہمارے حکمران پاکستان کو امریکہ کی ملکیت سمجھنے لگے۔ اقتدار میں آنے اور اقتدار میں رہنے کا منبع امریکہ قرار پایا اور سب امریکہ کا طواف کرنے لگے۔ مسلم لیگ نے سرد جنگ میں ''کمیونزم کے خلاف'' ''اسلامی جہاد'' کے نام پر اس وقت سے ہی امریکہ کی کاسہ لیسی شروع کر دی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ امریکہ نے جب پاکستان کے عوام میں اپنے لیے ایک نرم گوشہ بنانے کی خاطر گندم کی امداد دی تھی تو کراچی میں اونٹ گاڑیوں کے اونٹوں کے گلے میں ''تھینک یو امریکہ'' کی تختیاں لٹکا کر امریکہ کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔

اسی دوران کشمیر میں محاذ آرائی شروع ہوگئی۔ ہندوستان کی تقسیم کے موقع پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے نہرو کا ساتھ دیتے ہوئے گورداسپور کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، بھارت میں 17/اگست 1947ء کو شامل کر کے بھارت کو کشمیر کا کھلا راستہ دے دیا تھا۔ یاد رہے پاکستان اور بھارت کی تقسیم 14 اور 15/اگست 1947ء کو ہوئی جبکہ باؤنڈری کمیشن نے حتمی باؤنڈری کا اعلان 17/اگست 1947ء کو کیا اور گورداسپور کے مسلمان آخر وقت تک اپنے آپ کو پاکستان میں سمجھتے رہے۔ ملک پہلے بن گئے سرحدیں بعد میں طے ہوئیں۔

کشمیر میں محاذ آرائی شروع ہوئی تو حریت پسند آزاد قبائل کا سیلاب مظفر آباد اور سری نگر کی طرف سے کشمیر میں داخل ہوگیا۔ چند ہی روز میں یہ مجاہدین چکوٹھی اور بارہ مولا کی سڑک پر سری نگر سے چار میل کے فاصلے پر تھے۔ اس محاذ آرائی میں پاکستانی افواج اس مقام تک پہنچ گئیں کہ پورے کشمیر پر مکمل قبضہ کر لیں کہ ہندوستان نے جو کہ گھٹنے ٹیک چکا

تھا، سلامتی کونسل کا رخ کیا اور جنگ بندی کا مطالبہ کر دیا۔

جب پاکستان کو کشمیر میں نمایاں کامیابیاں ہو رہی تھیں، وزیر اعظم لیاقت علی خان فوراً جنگ بندی کے لیے تیار ہو گئے۔ قرار داد کے ذریعے استصواب رائے کے وعدے کے نتیجے میں سیز فائر لائن طے ہوئی۔ سلامتی کونسل کی اس قرارداد پر آج تک عمل نہیں ہو سکا اور کشمیری اپنی آزادی کے لیے کئی نسلوں سے خون بہا رہے ہیں اور ہندوستان اور پاکستان کی فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہیں۔ آج تک کشمیریوں کو ان کے حق خود اختیاری سے محروم رکھا گیا ہے۔ علاقے کا امن تباہ ہو چکا ہے۔ دونوں ملکوں میں اسلحہ کی دوڑ ہے، دونوں ممالک ایٹمی ہتھیاروں میں اپنی حفاظت سمجھتے ہیں۔ دونوں ممالک کے عوام بھوکے مر رہے ہیں اور گھاس کھا رہے ہیں۔

پنڈی سازش کیس

پاک فوج میں اس جنگ بندی کے فیصلے کا ردعمل ایک بغاوت کی شکل میں ہوا اور 9/مارچ 1951ء کو پاکستانی فوج کے ایک میجر جنرل اکبر خان اور بری اور ہوائی فوج کے متعدد افسران کو، جن میں ایئر کموڈور جنجوعہ، میجر اسحاق، ظفر اللہ پوشنی اور دیگر شامل تھے، راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار کر لیا گیا۔ فیض احمد فیض ان دنوں روزنامہ پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر تھے۔ انہیں بھی گرفتار کر لیا گیا۔ بقول فیض صاحب جس کا ذکر انہوں نے لندن میں مجھ سے بھی کیا اور اپنے دیگر دوستوں سے بھی کیا کہ ''جنرل اکبر کی جانب سے بلائی گئی ملکی حالات سے متعلق یہ میٹنگ چھ سات گھنٹے چلی اور میٹنگ کے آخر میں طے پایا کہ لیاقت علی کی حکومت کا اس طرح سے تختہ الٹنا ممکن نہیں ہے چنانچہ اس طرح کی مہم جوئی نہیں کی جائے گی۔ مگر میٹنگ میں موجود جس شخص نے بھی لیاقت علی تک یہ خبر پہنچائی اس نے میٹنگ کا آخری حصہ یعنی آخری فیصلہ ان تک نہیں پہنچایا۔''

سرکاری بیان کے مطابق کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری جنرل سجاد ظہیر اور حسن ناصر بھی اس سازش میں شامل تھے جس کی وجہ سے یہ تاثر ایک مدت تک قائم رہا کہ یہ سازش

کمیونسٹوں کی سازش تھی۔ جبکہ ایسا نہیں تھا۔ بلکہ یہ میٹنگ پاکستان پر امریکہ اور برطانیہ کی بالادستی کے خلاف پہلا منظم احتجاج تھا۔ یہ تمام افراد کمیونسٹ نہیں تھے بلکہ سامراج دشمن اور محبت وطن افراد تھے۔ ان میں سے کچھ تو بقول سابق ایئر کموڈور جنجوعہ، کمیونسٹ دشمن تھے۔ مثلاً میجر جنرل نذیر احمد قادیانی فرقے سے تعلق رکھتے تھے، صوم وصلوٰۃ کے پابند اور کمیونزم سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ جنوری 1951ء سے لے کر گرفتاری تک برطانیہ میں ایک کورس کر رہے تھے یعنی پاکستان میں موجود ہی نہیں تھے۔ بریگیڈئر محمد لطیف تہجد گزار اور کمیونسٹ دشمن، بریگیڈیئر صدیق خان صوم وصلوٰۃ کا پابند، کرنل محمد ارباب کمیونزم سے کوئی واسطہ نہیں، کرنل ضیا الدین تہجد گزار اور کمیونزم دشمن۔ جنجوعہ صاحب، جنہوں نے خود اس کیس میں چار سال کی سزا بھگتی، ان کا کہنا یہ تھا کہ میجر جنرل اکبر خان سے لے کر ہم سب میں صرف ایک چیز مشترک تھی اور وہ تھی برطانوی سامراج کے تسلط کی شدید مخالفت اور جو سیاسی نظام ملک میں رائج کیا جا رہا تھا اس سے نفرت اور اس پر کھلی تنقید۔

مہاجر اور پنجابی شاونزم کا ٹکراؤ

سماجی طبقات کا عالم یہ تھا کہ ملک میں مہاجر اور پنجابی، حکومت میں اپنی حصے داری اور اپنی اپنی برتری کی دوڑ میں پڑ چکے تھے۔ اگر چہ مہاجروں کی اکثریت لٹ پٹ کر آنے والے غریب اور متوسط طبقے کی تھی مگر وہ جاگیردار اور تعلق دار جو ہوائی جہازوں پر سوار ہو کر کراچی پہنچے تھے، وہ اس نئے ملک پر حکمرانی کا خواب دیکھتے تھے۔ جبکہ پنجاب کے تعلیم یافتہ مگر سیاسی شعور سے بے بہرہ درمیانے طبقے کے عزائم بھی بہت اونچے تھے۔ وہ بھی راتوں رات کروڑ پتی بننا چاہتا تھا اور متروکہ جائیداد کی لوٹ کھسوٹ، درآمد برآمد کے لائسنسوں کے حصول میں مصروف تھا۔ اصولاً تو انہیں اپنے سیاسی و معاشی عزائم کے حصول کے لیے جاگیردارانہ نظام پروار کرنا چاہیے تھا مگر نہ تو انہیں اس کی ضرورت تھی اور نہ ہی فرصت۔ ایک ایک گھر میں کئی کئی ''ابا جی'' تھے۔ انہیں نواب ممدوٹ جیسے دقیانوسی جاگیردار کے سوا کوئی اور لیڈر نظر نہیں آتا تھا۔ چنانچہ پہلے طبقاتی شعور کے حصول کی کوشش اور اس کے

بعد طبقاتی جدوجہد کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے انہوں نے پنجابی شاونزم کی راہ اختیار کی۔ بنگالی، سندھی، پٹھان اور بلوچ اس دوڑ میں پیچھے تھے بلکہ تھے ہی نہیں۔ ایک طرف مہاجر شاونزم اور دوسری طرف پنجابی شاونزم، ان کے درمیان تضاد بڑھتا گیا۔ مگر دیگر قومیتوں نے جب بھی اپنے حقوق مانگے یا سر اٹھانے کی کوشش کی تو مہاجر اور پنجابی حکمران ان کے خلاف ہمیشہ اکٹھے ہو گئے۔ بنگالیوں کے استحصال کا عالم تو یہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں کاشت کئے جانے والا چاول مغربی پاکستان میں لا کر کم قیمت پر بیچا جاتا تھا جبکہ مشرقی پاکستان میں اس کی قیمت زیادہ رکھی جاتی تھی۔

میاں افتخار الدین کی بائیں بازو کی آزاد پاکستان پارٹی جاگیرداری اور سرمایہ داری کے خلاف ایک واضح موقف رکھتی تھی۔ مگر ہندوستان کے ساتھ تضاد پر اس پارٹی کا موقف واضح نہیں تھا اور میاں افتخار الدین کے اردگرد اس طرح کے کمیونسٹ جمع ہو گئے تھے جو پاکستان کے وجود کے جواز کو ہی تسلیم نہیں کرتے تھے اور پاکستان کو سامراج کی حرامی اولاد قرار دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کو دوبارہ بھارت کا حصہ بن جانا چاہیے۔ چنانچہ اپنے اس موقف کی وجہ سے عوام الناس میں یہ جماعت مطلوبہ مقام حاصل نہ کر سکی۔ اس وقت کی یہ انڈو-سوویت لابی سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد سنا گیا ہے کہ اب انڈو-امریکن لابی بن گئی ہے۔ البتہ مشرقی پاکستان میں مولانا عبدالحمید بھاشانی کا موقف بہت صاف تھا اور ان کی سیاسی سوچ طبقاتی جدوجہد پر مبنی اور جاگیرداری کے خلاف تھی اور اس کو عوام میں مقبولیت حاصل تھی۔ پنجاب میں بھی ''بابائے سوشلزم'' شیخ محمد رشید کی قیادت میں کہیں کہیں کسان کمیٹیاں بننا شروع ہو چکی تھیں۔

غرارے کی وجہ سے مودودی کا اسلام خطرے میں پڑ گیا

مذہب کے نام پر سیاست کرنے والے لوگ بھی دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک احراریوں کا گروپ لیاقت علی خان اور ممتاز دولتانہ دھڑے کی حمایت کرتا تھا اور اس دھڑے کی مخالفت کرنے والوں کو قادیانیوں کا ہمدرد قرار دیتا تھا۔ دوسری طرف مولانا

مودودی کی جماعت اسلامی یہ الزام عائد کرتی تھی کہ "لیاقت علی خان کے دور میں ملک میں عریانی اور فحاشی بہت بڑھ گئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لیاقت علی خان کی بیگم رعنا غرارہ پہنتی ہیں اور ان کی دیکھا دیکھی دوسری خواتین نے بھی غرارے پہننا شروع کر دیئے ہیں۔ جماعت اسلامی کا پراپیگنڈہ تھا کہ یہ لباس چونکہ طوائفوں کا لباس ہے اس لیے اس فحاشی پھیلانے والی حکومت کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ مذہب کی آڑ میں کردار کشی جماعت اسلامی کا ہمیشہ ہی طریقۂ سیاست رہا ہے۔ چنانچہ کوشش کی گئی کہ پنجاب میں جگہ جگہ "اینٹی غرارہ" دفاتر کھلنا شروع ہو جائیں۔ نظریہ پاکستان کا علمبردار "نوائے وقت" اس پراپیگنڈہ میں پیش پیش تھا۔ اس طرح پاکستان میں اس وقت "اسلام کو غرارے سے خطرہ" لاحق ہو گیا تھا۔

اس محاذ آرائی میں لیاقت علی خان نے ٹوانوں، نونوں، دولتانوں اور دوسرے جاگیرداروں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا اور پنجابی شاونسٹوں نے نواب ممدوٹ، حسین شہید سہروردی اور محترمہ فاطمہ جناح کا سہارا لیا۔ بالآخر ممدوٹ دولتانہ اور ملک فیروز خان نون کی سہ فریقی رسہ کشی کے نتیجے میں 16 / اکتوبر 1951ء کو راولپنڈی میں لیاقت علی خان کا قتل ہوا۔ قاتل سید اکبر کو موقع پر ہی گولی ماردی گئی تا کہ اصل قاتلوں کا سراغ نہ مل سکے۔

حکمرانی اور مالِ غنیمت بانٹنے کا کھیل

لیاقت علی خان کے قتل کے بعد سنا جانے لگا کہ اب سردار عبد الرب نشتر کو وزیر اعظم بنایا جائے گا۔ مگر حکمرانی کا مال غنیمت بانٹنے والوں نے خواجہ ناظم الدین کو، جنہیں 11 / ستمبر 1948ء کو گورنر جنرل بنایا گیا تھا، ہٹا کر وزیر اعظم اور ملک غلام محمد کو گورنر جنرل بنا دیا۔ چونکہ سارے اختیارات گورنر جنرل کے پاس ہوتے تھے۔

غلام محمد ان دنوں وزیر خزانہ تھے اور فالج کی وجہ سے سبکدوش کئے جانے والے تھے۔ پاکستان کی بدقسمتی کہ وہ شخص جو بغیر سہارے کے چل پھر نہیں سکتا تھا، نہ کچھ کر سکتا تھا اور نہ ہی اس کی بات کسی کو آسانی سے سمجھ آتی تھی ماسوائے قدرت اللہ شہاب کے جنہوں نے اپنے شہاب نامہ میں اس کا اعتراف کیا ہے، اس کو بستر علالت سے اٹھا کر گورنر جنرل کی

کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ پھر اس معذور گورنر جنرل نے ڈیڑھ سال کے اندر اپریل 1953ء میں خواجہ ناظم الدین کو وزارت عظمٰی کے عہدے سے برطرف کر دیا۔ محمد علی بوگرہ کو جو اس وقت امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے بلا کر وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ انہیں ''پلے بوائے'' وزیر اعظم کہا جاتا تھا۔ ان کے امریکی سیکرٹری آف سٹیٹ جان فاسٹر ڈلس (John Foster Dulles) کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ اس خطے میں سوشلزم کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے اس طرح کے افراد امریکہ کے لیے بے حد اہم تھے۔

پاکستان کا کاروبار حکومت ابھی تک 1935ء ایکٹ کے تحت چل رہا تھا جس میں گورنر جنرل کو اختیار کل تھا۔ اس ایکٹ کے تحت غلام محمد نے آئین ساز اسمبلی کو توڑ دیا اور مولوی تمیز الدین سپیکر اسمبلی کو رخصت کر دیا۔ مولوی تمیز الدین اپنی برطرفی اور اسمبلی کے توڑنے کے خلاف سندھ ہائی کورٹ گئے جہاں پر چیف جسٹس سندھ ہائی کورٹ نے ان کی برطرفی اور اسمبلی کے خاتمے کے خلاف ان کی اپیل کو مان لیا۔ مگر گورنر جنرل غلام محمد نے اس فیصلے کے خلاف چیف جسٹس آف پاکستان محمد منیر کے پاس اپیل کی اور جسٹس منیر کا بدنام زمانہ فیصلہ سامنے آیا۔ اس نے گورنر جنرل کے اقدامات کو جائز قرار دیا اور اس کے بعد آنے والے ہر ڈکٹیٹر کو جس نے بھی آئین معطل کیا، حکومت پر قبضہ کیا، جسٹس منیر جیسے جسٹس ملتے چلے گئے جنہوں نے ''نظریہ ضرورت'' کے تحت مارشل لا کو قانونی حیثیت بھی دی اور منتخب وزیر اعظم کا عدالتی قتل بھی کیا۔

1954ء کی آئین ساز اسمبلی توڑ دی گئی تھی۔ ملک میں ہنگامی حالت کا نفاذ تھا۔ وہ آئین جو چھپنے کے لیے پریس میں جا چکا تھا اس کو اور اسمبلی کو ختم کرنے کے ساتھ ہی کمانڈر ان چیف جنرل ایوب خان کو وزیر دفاع بھی بنا دیا گیا۔ میجر جنرل سکندر مرزا کو وزیر داخلہ مقرر کیا گیا۔ اس طرح پہلی بار سول اور فوجی بیوروکریسی کا اقتدار میں اشتراک ہو گیا۔ ان افراد کے ذریعے پاکستان کو مڈل ایسٹ ڈیفنس آرگنائزیشن (MEDO) یا بغداد پیکٹ جسے بعد میں CENTO کا نام دیا گیا اور ساؤتھ ایسٹ ایشیا ٹریٹی آرگنائزیشن (SEATO) جیسے فوجی معاہدوں میں جکڑا گیا اور امریکہ کا Most Allied Ally

قرار دے کر اس کے ساتھ مشترکہ دفاعی معاہدہ کیا گیا۔ یہ دفاعی معاہدے سوشلزم کا پھیلاؤ روکنے کے لئے کئے گئے تھے۔

خواجہ ناظم الدین کی برطرفی پر مشرقی پاکستان میں شدید ردعمل

خواجہ ناظم الدین جو مسلم لیگ مشرقی پاکستان کے رہنما تھے اور اسمبلی میں انہیں اکثریت حاصل تھی، ان کی وزارت عظمٰی سے برطرفی نے مشرقی پاکستان کے عوام میں جو کہ اکثریت میں تھے اور جن کی افواج پاکستان اور سول انتظامیہ میں نہ ہونے کے برابر نمائندگی تھی شدید ردعمل پیدا کیا اور مشرقی پاکستان کی سیاست کو ایک الگ رخ پر ڈال دیا۔ جبکہ ان میں معاشی، سیاسی اور معاشرتی محرومی کے ساتھ ساتھ 20 فیصد آبادی کی زبان اردو کو 56 فیصد بنگالی بولنے والی اکثریتی آبادی پر مسلط کرنے کے خلاف غم وغصہ پہلے سے موجود تھا۔

اسی سال آدم جی جیوٹ ملز میں مزدوروں کی ہڑتال ہوئی اور پولیس نے تقریباً ایک ہزار کے قریب بنگالی مزدوروں کو مار ڈالا۔ گورنر جنرل غلام محمد نے متحدہ محاذ جس نے 1954ء میں ہونے والے انتخابات میں مسلم لیگ کو بری طرح شکست دی تھی، اس کے چیف منسٹر فضل الحق کو برطرف کر کے جنرل سکندر مرزا کو مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کر دیا تاکہ وہ ڈنڈے کے زور پر وہاں کے حالات کو قابو میں لا سکے۔ مشرقی پاکستان کے عوام اپنے آپ کو مغربی پاکستان کے حکمرانوں کی کالونی سمجھنے لگے۔ انہوں نے انگریز سے آزادی حاصل کی تھی، مغربی پاکستان کے مہاجر پنجابی شاؤنسٹ حکمرانوں کی غلامی میں جانے کے لیے نہیں۔ بنگلہ دیش بننے کی بنیاد ڈال دی گئی۔

ملک غلام محمد کی جسمانی اور ذہنی حالت اتنی بگڑ گئی کہ ان سے استعفٰی لے لیا گیا۔ چند ماہ بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ 1955ء میں ان کی وفات ہوئی۔ 7/اگست 1955ء کو میجر جنرل سکندر مرزا نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھال لیا۔ سکندر مرزا نے 14/اکتوبر 1955ء کو مغربی پاکستان کے تمام صوبوں اور ریاستوں کو ملا کر انتظامی طور پر بدنام زمانہ ون یونٹ میں تبدیل کرنے کے بعد سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان عرف باچا خان کے بڑے

بھائی خان عبدالجبار خان المعروف ڈاکٹر خان صاحب کو مغربی پاکستان کا وزیر اعلیٰ بنا دیا۔ اس سے پہلے وہ محمد علی بوگرہ کی حکومت میں 1954ء میں وزیر مواصلات تھے۔ ون یونٹ بنانے کے بعد ڈاکٹر خان کے ذریعے مسلم لیگ کو تباہ کر کے ری پبلیکن پارٹی بنوائی گئی۔ نواب مشتاق گورمانی کو مغربی پاکستان کا گورنر مقرر کیا گیا۔

میجر جنرل سکندر مرزا کے ذریعے ملک پر سول ملٹری بیوروکریسی کا قبضہ

جولائی 1955ء کو محمد علی بوگرہ کی جگہ چودھری محمد علی کو وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ چودھری محمد علی نے 1956ء میں ملک کا پہلا آئین دیا جس میں مشرقی پاکستان کی 56 فی صد اکثریت کو مغربی پاکستان کی 44 فی صد اقلیت کے برابر کر کے ''پیریٹی'' کے نام پر بنگالیوں کے ساتھ سب سے بڑی زیادتی کی گئی۔ اس آئین کے ذریعے سربراہ مملکت کو گورنر جنرل کے بجائے صدر کا نام دیا گیا اور اس آئین ساز اسمبلی نے میجر جنرل سکندر مرزا کو پہلا صدر پاکستان منتخب کیا۔ قائد اعظم کے تصور کے خلاف، پاکستان کو اسلامی ریاست کا نام دیا گیا اور صدر بننے کی عمر چالیس سال قرار پائی۔

چودھری محمد علی نے وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دیا تو حسین شہید سہروردی کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی اور وہ وزیر اعظم بننے میں کامیاب ہو گئے۔ تیرہ مہینے کے بعد ان سے استعفیٰ لے لیا گیا تو آئی آئی چندریگر (اسماعیل ابراہیم چندری گر) جو صرف دو ماہ وزیر اعظم رہے اور پھر ملک فیروز خان نون۔

مشرقی پاکستان میں اے۔ کے فضل الحق، حسین شہید سہروردی اور مولانا بھاشانی کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کیا گیا۔ سہروردی نے عوامی لیگ بنالی مگر ان کی امریکہ نواز پالیسیوں کی وجہ سے مولانا بھاشانی نے ان سے الگ ہو کر نیشنل عوامی پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ اس تمام عرصے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ اس ملک کی باگ ڈور سنبھالے رکھنا سیاست دانوں کے بس کی بات نہیں۔ میجر جنرل سکندر مرزا کے ذریعے سول ملٹری نوکر شاہی نے ملک کو اب اپنے مکمل قبضے میں لے لیا۔

سکندر مرزا اور سر شاہنواز بھٹو کی دوستی

سکندر مرزا اور ذوالفقار علی بھٹو کے والد سر شاہنوار میں دیرینہ دوستی تھی۔ ان کی دوستی کی وجہ سکندر مرزا کے چچا تھے جو انجینئر تھے اور ان دنوں بمبئی میں ملازمت کر رہے تھے جب شاہنواز بمبئی میں وزیر تھے۔ بعد میں سر شاہنواز جونا گڑھ ریاست کے دیوان یعنی وزیر اعظم رہے۔

سندھ، بمبئی کا ایک حصہ تھا اور بمبئی کی مرکنٹائل کلاس نے سندھ کے جاگیرداروں کو ساتھ ملا کر صوبے کے اقتدار پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ سندھ کے عوام ہندو مہاجن اور مقامی جاگیرداروں کے استحصال کا شکار تھے۔ اس پس منظر میں سندھ کے مسلم رہنما سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک علیحدہ صوبہ بنانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ اس کوشش میں سر شاہنواز بھٹو بھی شامل تھے۔

1929ء میں جب قائداعظم نے تمام جماعتوں کے مشترکہ کنونشن میں چودہ نکات کو پیش کیا تو ان میں سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کا مطالبہ بھی شامل تھا۔ سر شاہنواز کی لندن میں قائداعظم کے ساتھ ملاقاتیں رہیں۔ بالآخر لارڈ رسل کی سربراہی میں سندھ کا صوبہ بنانے کا جائزہ لینے کے لیے کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اگرچہ سر شاہنواز بمبئی پریذیڈنسی میں لوکل سیلف گورنمنٹ کے وزیر تھے مگر وہ سندھ کو علیحدہ صوبے کی حیثیت دلانے کے لیے کام کرتے رہے۔ آخرکار 1933ء کی گول میز کانفرنس میں انگریز نے سندھ کو عملی طور پر علیحدہ صوبہ بنانے کا مسئلہ باقاعدہ تسلیم کر لیا اور سر شاہنواز کو اس کا مشیر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔

سندھ اسمبلی میں کل ساٹھ نشستیں تھیں۔ 36 مسلمانوں کی تھیں، 20 ہندوؤں کی، تین یورپی باشندوں کی اور ایک پارسیوں کی۔ سر شاہنواز نے مسلمانوں کی طرف سے اپنی بنائی ہوئی یونائیٹڈ پارٹی کے سربراہ کی حیثیت سے انتخابات میں حصہ لیا۔ اس پارٹی کے اٹھارہ امیدوار کامیاب ہوئے جبکہ سر شاہنواز خود منتخب نہ ہو سکے۔ کانگریس نے چودہ نشستیں حاصل کیں۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ کی زیر قیادت جو وزارت قائم ہوئی سر شاہنواز اس کی

مدد کرتے رہے۔ بعد میں انہیں پبلک سروس کمیشن کا سربراہ بنا دیا گیا۔ پھر وہ جونا گڑھ ریاست کے دیوان یعنی وزیراعظم رہے۔ قیام پاکستان کے موقع پر جونا گڑھ کی ریاست نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا مگر ماؤنٹ بیٹن اور نہرو کا نقشہ کچھ اور تھا۔ جونا گڑھ کو پاکستان کا حصہ نہ بننے دیا گیا۔

ذوالفقار علی بھٹو

ذوالفقار علی بھٹو سر شاہنواز کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ سر شاہنواز نے دو شادیاں کی تھیں۔ ان کا پہلا بیٹا سکندر سات برس کی عمر میں نمونیے سے انتقال کر گیا تھا۔ اس کی وفات سے دو ماہ قبل ان کا دوسرا بیٹا امداد علی پیدا ہوا جو کتیس سال کی عمر میں 1953ء میں وفات پا گیا۔ سٹینلے والپورٹ جس نے سر شاہ نواز کی غیر مطبوعہ سوانح عمری کو بغور پڑھا اور اپنی کتاب ''زلفی بھٹو آف پاکستان'' میں اس کے حوالہ جات دیئے ہیں، اس کے مطابق سر شاہنواز نے اس غیر مطبوعہ سوانح عمری میں ذوالفقار علی بھٹو کی پیدائش کا ذکر تک نہیں کیا۔ زلفی ان کی دوسری بیوی لکھی بائی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے جو ایک خوبصورت ہندو خاتون تھیں۔ 1924ء میں انہوں نے اس دوشیزہ کو سکھر میں اپنے برادر نسبتی میر مقبول سپرنٹنڈنٹ پولیس سکھر کے گھر میں پہلی بار دیکھا تھا اور پہلی نظر میں ہی گھائل ہو گئے۔ لکھی بائی پونہ کی رہنے والی تھیں۔ انہوں نے سر شاہنواز کے ساتھ شادی سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا اور ان کا نیا نام خورشید رکھا گیا تھا۔ 1925ء میں ان کی شادی کوئٹہ میں خان آف قلات کے محل میں ہوئی۔ اس وقت کی یادگار تصویر وہ ہے جس میں سر شاہنواز اپنی بیگم خورشید کے ہمراہ خان آف قلات کے باڈی گارڈ دستے کی تلواروں کے سائے سے گزرتے نظر آتے ہیں۔ میں نے یہ تصویر بھٹو صاحب کے ذاتی البم میں دیکھی تھی۔ شادی کے وقت خورشید بیگم کی عمر تقریباً 18 برس تھی۔ مستقبل میں یہ خاتون ان کے تین بچوں (MANNA) منا، بے نظیر اور سب سے چھوٹے بیٹے ذوالفقار علی کی ماں بننے والی تھیں۔

ذوالفقار علی بھٹو 5 رجنوری 1928ء کو المرتضیٰ لاڑکانہ میں پیدا ہوئے۔ 1936ء

میں جب ان کے والد بمبئی میں مقیم تھے تو کیتھڈرل ہائی سکول کے فرسٹ سٹینڈرڈ سے ان کی تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ وہ ایک عرصہ تک بمبئی میں ہی مقیم رہے اور وہیں سے سینئر کیمبرج تک تعلیم حاصل کی۔

ستمبر 1947ء سے یونیورسٹی آف ساؤتھ کیلیفورنیا میں دو سال کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے جون 1949ء سے برکلے میں بین الاقوامی قانون کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ ان کے استادوں میں پروفیسر HANS KELSEN جیسے استاد تھے جنہیں Jurist of the Century کہا جاتا ہے۔ بھٹو صاحب کے کلاس فیلو LEO ROSE کے مطابق انہیں اپنے اس پروفیسر سے بے حد لگاؤ تھا۔ KELSEN بین الاقوامی قانون میں ایک ایسے نشانِ راہ تھے جنہوں نے آزادی کا انصاف، امن کا انصاف، جمہوریت کا انصاف، تحمل و برداشت کا انصاف، جیسے اہم سوالات کا قانونی جواب تلاش کیا تھا۔ بھٹو صاحب نے ساری عمر KELSEN کے سبق یاد رکھے اور نہ صرف ان کا حوالہ اپنی اقوام متحدہ کی تقاریر میں اور 1973ء کے آئین پر مباحث کے دوران دیا بلکہ سپریم کورٹ کے سامنے اپنے مقدمے کے دوران بھی انہوں نے KELSEN کے حوالہ جات دیئے۔

نصرت اصفہانی کے ساتھ بھٹو کی ملاقات اور شادی

ستمبر 1949ء میں وہ اپنی بہن MANNA کی شادی میں شرکت کے لیے امریکہ سے واپس آئے۔ کراچی میں بڑی دھوم دھام کی اس شادی میں نصرت اصفہانی نے بھی شرکت کی۔ بہن کی شادی کے اس موقع پر بھٹو صاحب کی ملاقات نصرت اصفہانی سے ہوئی۔ نصرت اصفہانی 23/مارچ 1929ء کو بمبئی میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کے والد نے ایران سے نقل مکانی کرنے کے بعد بمبئی میں اصفہانی سوپ فیکٹری قائم کی تھی جو کہ عراق کو بہت بڑے پیمانے پر صابن ایکسپورٹ کرتی تھی۔ اس فیکٹری کا نام بدل کر انہوں نے بغداد سوپ فیکٹری رکھ لیا۔ 1947ء میں جب بمبئی میں ہندو مسلم فسادات نے شدت اختیار کی تو وہ کراچی چلے آئے۔ کچھ دن سر حاجی ہارون کے گھر مہمان رہے پھر 23 کلفٹن خرید کر اس

میں منتقل ہو گئے اور پاکستان میں انہوں نے سیلیکیٹ سوڈا فیکٹری قائم کر لی۔

بھٹو صاحب بارہ سال کے تھے جب ان کی شادی ان کی کزن شیریں سے کر دی گئی جو خان بہادر احمد خان بھٹو کی تین بیٹیوں میں سے ایک تھیں اور بھٹو صاحب سے آٹھ یا نو سال بڑی تھیں۔ شادی کے بعد ان کا نام امیر بیگم تھا۔ یہ شادی جائیداد یعنی لاکھوں ایکڑ زمین کو خاندان میں رکھنے کی غرض سے کی گئی تھی۔ بھٹو صاحب نے بارہ سال کی عمر میں اپنی اس شادی کا ہنی مون سری نگر کشمیر میں منایا۔

بہن کی شادی میں شمولیت کے بعد برکلے آ کر بھٹو صاحب نے اپنی سیاست کی ابتدا کی۔ انہوں نے سٹوڈنٹ کونسل کی سات نشستوں پر ہونے والے انتخابات میں حصہ لیا۔ وہ واحد غیر ملکی امیدوار تھے۔ انہوں نے یہ الیکشن جیتا۔ 1950ء میں انہوں نے امریکی سینیٹ کے انتخابات میں ڈیموکریٹ امیدوار HELEN GAHAGAN کی انتخابی مہم میں رضا کارانہ طور پر کام کیا۔ ہیلن کے مدمقابل ریپبلکن امیدوار رچرڈ نکسن تھے۔

پیلو مودی اور سٹینلے وال پورٹ کے مطابق برکلے کے آخری سال میں وہ اپنے آپ کو سوشلسٹ کہتے تھے۔ انہوں نے ہیرلڈ لاسکی کی گرامر آف پولیٹکس، کارل مارکس، اینگلز اور جواہر لعل نہرو کا مطالعہ شروع کر لیا تھا۔ وہ ہمیشہ پان اسلام ازم، عربوں کی قوم پرستی، مراکش، تیونس اور الجیریا میں فرانس کے خلاف ہونے والی جدوجہد آزادی، ویت نام کی آزادی کے حق میں بحثیں کیا کرتے۔ اس سب کے لیے سٹوڈنٹ کونسل ایک اہم پلیٹ فارم تھا۔

1950ء میں کیلیفورنیا اور برکلے سے پولیٹیکل سائنس اور قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ انگلینڈ چلے آئے اور آکسفورڈ کے کرائسٹ چرچ کالج میں قانون پڑھنے لگے۔ نصرت اصفہانی ان کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھیں۔ 1951ء میں وہ کراچی آئے۔ والدین کو، بالخصوص سر شاہنواز کو اپنی پسند کی شادی کے لیے بمشکل رضامند کیا اور 8 ستمبر 1951ء کو ان کی شادی ہو گئی۔ اب نصرت اصفہانی بیگم نصرت بھٹو تھیں۔ وہ بھٹو صاحب کے ساتھ آکسفورڈ چلی آئیں۔ تین ماہ بعد وہ واپس کراچی آ گئیں اور اپنے

سسرال کے گھر میں میکلین روڈ پر جس کا نام بے نظیر تھا رہنے لگیں۔

سر شاہنواز کی بیٹی اور بھٹو صاحب کی بہن بے نظیر کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی یاد میں بھٹو صاحب نے اپنی بیٹی کا نام بے نظیر رکھا۔ نئے شادی شدہ جوڑے کے لیے دوری کا یہ زمانہ مشکل تھا۔ اگلے سال یعنی 1952ء کے وسط میں وہ پھر انگلینڈ آئیں۔ اس وقت تک بھٹو صاحب کرائسٹ چرچ کالج کے تعلیمی رہائشی مدت کے تقاضے پورے کر چکے تھے چنانچہ انہیں لندن جانے کی اجازت مل گئی۔ لنکنز ان نے انہیں بیرسٹری کے لیے بلا لیا جہاں سے ولیم پٹ، لارڈ کیننگ، جان مورلے اور قائداعظم محمد علی جناح جیسے افراد بیرسٹر بنے تھے۔ وہ آکسفورڈ سے ایم۔ اے آنرز کر چکے تھے۔ بیگم نصرت بھٹو واپس چلی گئیں۔ ذوالفقار علی بھٹو بیرسٹر بن کر P&O کے جس بحری جہاز سے کراچی واپس لوٹے اس میں دراب پٹیل بھی تھے جنہوں نے لندن سکول آف اکنامکس سے ڈگری کے بعد بار کیا تھا۔ دونوں بیرسٹرز نے کراچی پہنچ کر رام چندانی ڈنگومل کے چیمبر میں پریکٹس شروع کر دی۔ بھٹو صاحب سندھ مسلم لا کالج میں کانسٹی ٹیوشن لا پڑھانے بھی جاتے تھے۔ ان ہی دنوں بیرسٹر فخر الدین جی ابراہیم بھی ڈنگومل کے چیمبر میں پریکٹس کر رہے تھے۔

پاکستان آئین بنانے کے بحران سے گزر رہا تھا۔ بھٹو صاحب نے ان آئینی مسائل پر لکھنا شروع کیا جو اس وقت زیر بحث تھے۔ پاکستان کو ایک ایسے آئین کی ضرورت تھی جو ملک کے دونوں حصوں کو قابل قبول ہو۔ حکمران طبقات اس کوشش میں تھے کہ مشرقی پاکستان کے اکثریتی حق کو کسی طرح صلب کر کے ان کو اس حق سے محروم رکھا جائے۔

سر شاہنواز سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر کے المرتضیٰ میں زیادہ وقت گزارتے تھے۔ ان کی مہمان نوازی اور پرتکلف دعوتیں سیاست دانوں اور دوستوں میں مشہور تھیں۔ بالخصوص شکار کے زمانے میں ان کے یہاں مہمان داری زوروں پر ہوتی۔ میجر جنرل سکندر مرزا اکثر ان کے یہاں آتے۔ اسی طرح حسین شہید سہروردی بھی ان کی دعوتوں میں شریک ہوتے تھے۔ سکندر مرزا کی ایران نژاد بیگم ناہید کی بیگم نصرت بھٹو کے ساتھ رشتے داری بھی تھی۔ بھٹو صاحب جب واپس پاکستان آئے تو وہ تمام سیاست دان اور مہمان جو لاڑکانہ

المرتضیٰ میں قیام کرتے نوجوان ذوالفقار علی بھٹو کی ذہانت اور قابلیت سے ضرور متاثر ہوتے۔ حسین شہید سہروردی نے کوشش کی کہ وہ عوامی لیگ میں شامل ہوجائیں اسی طرح سکندر مرزا اس کوشش میں رہے کہ وہ ری پبلیکن پارٹی میں شامل ہوجائیں۔

بھٹو سرکاری وفود میں شامل کئے جانے لگے

حسین شہید سہروردی جب وزیراعظم بنے تو انہوں نے پہلی بار بھٹو صاحب کو نیو یارک جانے والے وفد میں شامل کیا جس کی قیادت اس وقت کے وزیر خارجہ ملک فیروز خان نون کر رہے تھے۔ بھٹو صاحب نے 25/اکتوبر 1957ء کو اقوام متحدہ کی چھٹی کمیٹی سے خطاب کیا اور عالمی سطح پر ان کی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آئیں۔ اس کے بعد مارچ 1958ء میں جنیوا میں سمندر کے قوانین پر منعقد ہونے والی اقوام متحدہ کی کانفرنس میں انہیں پاکستانی وفد کا سربراہ بنا کر بھیجا گیا۔ اس بار اس اہم ذمہ داری کے لیے ان کا انتخاب صدر سکندر مرزا نے کیا تھا۔

سوئٹزرلینڈ پہنچ کر انہوں نے سکندر مرزا کو خط لکھا ''میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کی خدمات پاکستان کے لیے نہایت اہم اور ناگزیر ہیں...... جب کبھی بھی کسی غیر جانبدار تاریخ دان نے ہماری تاریخ لکھی تو آپ کا نام مسٹر جناح سے بھی بڑھ کر لکھا جائے گا۔ جناب میں یہ بات اس لیے نہیں لکھ رہا کہ آپ ملک کے صدر ہیں بلکہ میں اس بات میں یقین رکھتا ہوں۔ میرا نہیں خیال کہ مجھے خوشامد کے جرم میں سزاوار قرار دیا جائے گا۔'' یہ خط بھٹو فیملی آرکائیو اور لائبریری میں موجود ہے۔

اس کانفرنس میں بھٹو صاحب کو اقوام عالم کے سامنے اپنی صلاحیتوں کے ساتھ اپنے آپ کو متعارف کروانے کا جو موقع ملا تھا اس کا انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور کانفرنس کے اختتام پر ان کی تقاریر نے تمام مندوبین پر ایک گہرا اثر چھوڑا۔

صدر سکندر مرزا نے 1958ء کا مارشل لا نافذ کیا

صدر سکندر مرزا نے فیروز خان نون کو جنہیں حسین شہید سہروردی سے استعفیٰ لے

کر آئی آئی چندریگر کی دو ماہ کی وزارت عظمیٰ کے بعد وزیر اعظم بنا دیا گیا تھا 7 اکتوبر 1958ء کو خط لکھا۔ "اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ملک اس وقت تک مستحکم نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں خود اس کے نظم ونسق کی مکمل ذمہ داری نہ سنبھال لوں......آپ تک جب یہ خط پہنچے گا تو ملک میں مارشل لا لگ چکا ہوگا اور جنرل ایوب خان جنہیں میں نے مارشل لا ایڈ منسٹر مقرر کیا ہے اپنی ذمہ داری سنبھال چکے ہوں گے۔"

صدر سکندر مرزا نے 7 اکتوبر 1958ء کو مارشل لا نافذ کر دیا۔ 1956ء کا آئین منسوخ کر دیا گیا۔ مرکزی اور صوبائی حکومتیں توڑ دی گئیں اور جنرل ایوب خان کو مارشل لا ایڈ منسٹریٹر مقرر کر دیا گیا۔ یاد رہے میجر جنرل سکندر مرزا 1757ء کی جنگ پلاسی کے مشہور غدار میر جعفر کا پڑپوتا تھا۔ میر جعفر کا تعلق ایران سے تھا۔

27 اکتوبر 1958ء کو سکندر مرزا نے اپنی بارہ رکنی کابینہ کے وزراء کا حلف لیا جس میں منظور قادر وزیر خارجہ، محمد شعیب وزیر خزانہ اور ذوالفقار علی بھٹو وزیر تجارت تھے۔ ایوب خان کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ اپنے اس اقدام کے ذریعے سکندر مرزا ایوب خان کو اپنے ماتحت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر ایوب خان نے اسی شام اپنے تین اعلیٰ فوجی افسران جنرل اعظم خان، جنرل واجد علی خان برکی اور جرنیل شیخ کو سکندر مرزا کے گھر یہ پیغام دے کر بھیجا کہ "حکومت چھوڑ دو۔ اپنی زندگی اور پنشن رکھ لو۔"

میجر جنرل سکندر مرزا نے گورنر جنرل بنتے ہی اپنے جس دوست کمانڈر ان چیف جنرل ایوب خان کی پانچ سالہ مدت ملازمت میں توسیع کی تھی، اس نے سکندر مرزا کو نکال باہر کیا اور اقتدار پر مکمل قبضہ کر لیا۔ سکندر مرزا اپنی بیگم کے ساتھ لندن چلے گئے اور 13 نومبر 1969ء کو اپنی وفات تک وہاں پر ہی باقی زندگی گزاری۔

بھٹو ایوب خان کے منظور نظر وزیر

سکندر مرزا اپنے ساتھ پہلی بار ایوب خان کو 56-1955ء میں سر شاہنواز کے یہاں لاڑکانہ شکار کھیلنے کے لیے لائے تھے۔ اس کے بعد سے ایوب خان کئی بار لاڑکانہ

آ چکے تھے۔ حسین شہید سہروردی نے اپنی وزارت عظمیٰ کے دوران سندھ سے ایوب کھوڑو کو وزیر دفاع مقرر کیا تھا تا کہ وہ کمانڈر ان چیف جنرل ایوب خان کو قابو میں رکھے۔ ایوب خان کو سندھ میں کھوڑو کے مقابلے میں آکسفورڈ، لاس اینجلز، برکلے کے تعلیم یافتہ ذہین نوجوان کی ضرورت تھی جس کا اندازہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کی اقوام متحدہ میں دو بار کی گئی نمائندگی سے کر چکے تھے۔ ایوب خان نے سکندر مرزا کی بنائی ہوئی کابینہ کو جوں کا توں رکھا اور ایوب کھوڑو کو بلیک مارکیٹنگ کے الزام میں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔

ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد ایوب خان نے کوئٹہ، لاہور اور پھر پاکستان کے اہم شہروں کے دورے کئے اور بھٹو صاحب کو ہر جگہ اپنے ساتھ رکھنا شروع کر دیا۔ انہوں نے بھی ہر قدم پر اور ہر موقع پر ایوب خان کا ساتھ دینا شروع کر دیا اور بہت جلد وہ ایوب خان کے منظور نظر وزیر تھے۔ لیفٹننٹ جنرل موسیٰ کو کمانڈر ان چیف بنا دیا گیا۔ ایوب خان اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ "مجھے یاد ہے کہ ایک روز سینئر فوجی افسران کی میٹنگ کے دوران مجھے ایک کاغذ دیا گیا جس میں وضاحت کی گئی تھی کہ کس طرح ملک تباہی کی طرف جا رہا ہے۔ میں نے جنرل موسیٰ سے پوچھا کہ کیا تمہارے بھی یہی خیالات ہیں۔ جنرل موسیٰ نے کہا کہ ہاں ہم سب یہی سمجھتے ہیں۔ ایوب خان اپنے ان سینئر افسران جو ان کے ہم عصر جرنیل تھے، کے خیالات سے کافی پریشان ہوئے۔ انہوں نے بھٹو صاحب سے مشورہ مانگا کہ کس طرح ان جرنیلوں پر اپنے اختیار کو مزید بڑھایا جائے۔ بھٹو صاحب نے انہیں مشورہ دیا کہ آپ فیلڈ مارشل بن جائیں۔ ایوب خان اس مشورے پر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے مارشل لا نافذ کرنے اور سکندر مرزا کی حکومت کا تختہ الٹنے کی پہلی سالگرہ منانے کے موقع پر اپنے فیلڈ مارشل ہونے کا اعلان کر دیا۔ بھٹو صاحب کی وزارتوں اور ذمہ داریوں میں اضافہ ہونے لگا۔ الطاف گوہر اور وزیر خزانہ شعیب جو ایوب خان کے بہت قریب تھے اب بھٹو صاحب کو اپنا رقیب سمجھنے لگے۔

پاکستان کے کمانڈر ان چیف کا عہدہ سنبھالنے کے بعد ایوب خان واشنگٹن کے اکثر دورے کرتے تھے۔ غالباً ہر سال وہ وہاں جاتے۔ اس دوران انہوں نے اپنے

تعلقات نہ صرف پنٹا گون سے استوار کئے بلکہ سی آئی اے کے سر براہ ایلن ڈلس سے بھی ان کی دوستی ہوگئی۔ ائر مارشل اصغر خان نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے کہ ایوب خان 1951ء سے لے کر 1958ء تک واشنگٹن یا تراؤں میں ہمیشہ ایلن سے ملتے۔ ایلن ڈلس امریکی سیکرٹری آف سٹیٹ جان فاسٹر ڈلس کا بھائی تھا۔ 2رمئی 1958ء کو امریکہ کے دورے کے بارے میں ایوب خان اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں۔ ''آج شام کو میں سی آئی اے کے سر براہ ایلن ڈس سے ملا اور ان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اپنے بھائی، جو امریکہ کے وزیر خارجہ تھے کو ہمارے مسائل سے آگاہ کیا۔''

لیاقت علی خان نے پاکستان کو امریکہ کی گود میں ڈالا تھا۔ ایوب خان نے پاکستان کو امریکہ کی فرنٹ لائن ریاست بنانا شروع کر دیا۔ انہوں نے پشاور کے نزدیک بڈبیر کے مقام پر فضائی اڈہ امریکہ کو فراہم کیا جہاں سے سوویت یونین کی جاسوسی کے لیے U2 طیارے پرواز کرتے تھے۔ ایک طیارہ U2 جو بڈہ بیر سے اڑا روس میں گرالیا گیا۔ اس کا شدید ردعمل ہوا۔ روسی صدر خروشیف نے امریکی صدر آئزن ہاور کا دورۂ روس منسوخ کر دیا اور امریکہ سمیت جن ممالک کو دھمکی دی ان میں ناروے، ترکی اور پاکستان شامل تھے۔

اس واقعے کے کئی برس بعد نیو یارک ٹائمز نے اپنی 27رجنوری 1976ء کی اشاعت میں اس کا ذکر کچھ اس طرح کیا ''امریکہ کا ادارہ سی آئی اے اپنے خفیہ فنڈ سے تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک کے بعض اخبارات، فوجی اور سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کو ہر سال کروڑوں ڈالر کی بھاری رقم مہیا کرتا ہے۔'' نیویارک ٹائمز کی رپورٹ میں جو تفصیلات شامل کی گئی تھیں ان کے مطابق پاکستان میں دو نیم مذہبی اور سیاسی جماعتوں اور سربراہ مملکت پر دس کروڑ ڈالر خرچ کئے جاتے ہیں۔ سی آئی اے اور صدر ایوب کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس کے مطابق صدر ایوب نے سی آئی اے کو بین الاقوامی سرگرمیوں کے سلسلے میں پاکستان میں مراعات فراہم کی تھیں جس کے عوض انہیں امریکہ کی طرف سے سترہ ہزار ڈالر سالانہ زندگی بھر ملتے رہے جو ان کے بیرونی اکاؤنٹ میں جمع ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ ایوب خان کے 1974ء میں انتقال کے بعد منقطع ہوا۔ امریکہ کی

وجہ سے روس اور پاکستان کے تعلقات کشیدہ رہے۔ پھر ایک اور ڈکٹیٹر ضیاالحق نے پاکستان کو روس کے خلاف امریکہ کی جنگ میں جھونک دیا۔

جوں جوں پاکستان امریکہ کے قریب ہوتا گیا توں توں عوام کے حقوق سلب ہوتے گئے۔ میں اس سیاسی فضا میں پاکستان کے ساتھ ساتھ جوان ہو رہا تھا۔ چونکہ ہمارے یہاں تاریخ نویسی اور مطالعۂ تاریخ کا رواج کم ہے اور اگر کچھ پڑھا بھی جاتا ہے تو حکمرانوں کی لکھی یا لکھوائی ہوئی تاریخ پڑھنے کو ملتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے علماء بادشاہوں کی خوشنودی کے لیے ان کی مرضی کی فقہ تیار کرتے تھے۔ ہماری تاریخ کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ حقائق پر مبنی وہ واقعات جن کے ہم گواہ ہیں یا ہم تک یہ واقعات پہنچے ہیں، نئی نسل اور آنے والی نسل کے لیے قلمبند کر دیئے جائیں۔ اس لیے اگر کچھ حصے طویل ہو جائیں یا خشک محسوس ہوں تو طبیعت پر بوجھ نہیں بننے چاہئیں۔ ماضی کا جاننا یوں بھی ضروری ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ تاریخ ہمیشہ ہمیں دھوکہ دیتی ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں تاریخ کو سمجھنا ضروری ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا تھا کہ ''تجربوں کو یاد رکھنا عقل حاصل کرنے کا دوسرا نام ہے۔''

جوانی

لڑکپن جوانی کی حدود میں داخل ہونے لگا۔ میٹرک کا رزلٹ آیا تو میں نے 1960ء میں ڈیمونٹ مورنسی کالج سرگودھا میں داخلہ لے لیا۔ سکول کے زمانے کے بہت سے دوست کالج تک نہ پہنچ سکے۔ کچھ نے ملازمت ڈھونڈنا شروع کر دی اور کچھ نے خاندانی کاروبار میں شمولیت اختیار کر لی۔ پرویز اور ممتاز نے ٹھیکیداری شروع کر دی۔ پرویز کی ٹھیکیداری کا دوستوں کو فائدہ یہ ہوا کہ مجھ سمیت جب کبھی بھی کسی کو مالی ضرورت ہوتی تو پرویز نے ''ادھار محبت کی قینچی ہے'' کا بورڈ لگائے بغیر ہر ایک کی مدد کی اور محبت بھی قائم رکھی۔ کالج سٹوڈنٹس یونین کے الیکشن جاگیرداروں کے بیٹوں کو ان کے سیاسی مستقبل کی تربیت کے لیے لڑوائے جاتے اور ان انتخابات میں چھوٹے زمیندار یا شہر کے لڑکے حصہ لینے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ٹوانے، نگیانے، نون اور آباد کار جاٹ سیاسی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کرتے اور اس کھیل میں کبھی کبھار ایک آدھ طالب علم قتل بھی ہو جاتا۔ خاندانی دشمنیاں بھی ان انتخابات میں نکالی جاتیں۔ ہماری خوش قسمتی کہ خان عبدالولی خان کے بھائی خان عبدالعلی خان جو آکسفورڈ سے ایم اے کر کے آنے کے بعد میانوالی کالج کی بدنظمی کو درست کر چکے تھے، انہیں ہمارے کالج کا پرنسپل لگا دیا گیا۔ ان کے گورنر مغربی پاکستان امیر محمد خان کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے۔

انہوں نے آتے ہی کالج ہاسٹلز کے وہ کمرے جو جاگیرداروں کے بیٹوں کے نوکروں کے لیے اور ان کے شکاری کتوں کے لیے مخصوص تھے، خالی کروائے۔ کالج میں اسلحہ رکھنے پر پابندی عائد کی اور خواہ کتنا بڑا سیاستدان یا جاگیردار ہو، اس کا بلاوجہ کالج میں

داخلہ بند کر دیا۔ ڈسپلن کا یہ عالم تھا کہ کالج یونیفارم صرف رات کو سونے سے پہلے اتارا جاتا۔ کالج سے جاگیرداروں کا تسلط ختم ہوا تو شہر کے لڑکوں کو انتخابات میں حصہ لینے کی ہمت ہوئی۔ داخلے کے فوراً بعد انتخابات ہوئے اور میں نے اپنی زندگی کا پہلا الیکشن لڑا اور جیتا۔

کالج میں ہونے والے سالانہ ڈراموں کی بہت دھوم تھی۔ پچھلے سال کے ''انار کلی'' ڈرامے کا ابھی تک چرچا تھا۔ پہلے سال میں ہی مجھے سٹیج ڈرامے کا مرکزی کردار ملا۔ اداکاری کی، خوب تالیاں بجیں، انعامات ملے اور کالج کے ابتدائی چند ماہ ہی میں کالج اور شہر میں نام اور کام ابھرنے لگا۔ مجھے کالج کی ڈرامیٹک سوسائٹی کا مستقل سیکرٹری بنا دیا گیا۔ دوسرے سال ہم نے جو ڈرامہ سٹیج کیا اس کا نام ''سراج الدولہ۔ آخری کرن'' تھا۔ انگلش کے پروفیسر محمد طفیل ناز سوسائٹی کے صدر تھے۔ اب امتیاز علی تاج، آغا حشر وغیرہ کے ڈرامے، ادب، فن اور جدید آرٹ، شاعر اور ادیب، موسیقار اور گلوکار بہت تیزی سے شعوری زندگی کا حصہ بننے لگے۔

1960ء کا یہ وہ زمانہ ہے جب ہمارے اردو ادب پر بالخصوص اردو افسانے پر گورکی، ٹالسٹائی، دوستوئسکی، چیخوف، موپاساں وغیرہ کے فن کا اثر تھا۔ ہمارے تخلیق کار بھی معاشرے کے جبر، سیاسی حالات کے جبر، اقتصادی پریشانیوں کے جبر کے خلاف تخلیق میں مصروف تھے۔ اردو افسانے میں ہمارے دیہی معاشرے کی ترجمانی ہو رہی تھی۔ منشی پریم چند، کرشن چند اور سعادت حسن منٹو تو اس کی ابتدا کر چکے تھے۔ احمد ندیم قاسمی کا آگے چل کر اس میں ایک اہم کردار رہے۔ ہمارے ادب میں بھی وہی احتجاج نظر آنے لگا جو 1935ء میں ترقی پسند تحریک کے وقت نظر آتا تھا۔

1958ء کے بعد جب ایوب خان کی آمریت کے دور میں اظہار پر پابندیاں بڑھ گئیں تو مزاحمتی ادب و شاعری نے زور پکڑا تھا۔ گل و بلبل اور لب و رخسار، گھنی زلفوں کی لذت اور فرحت مہیا کرنے والے فن کے بجائے جسے ''فن برائے فن'' کہا جاتا تھا، ''فن برائے زندگی'' پاکستان میں بہت تیزی سے عروج کی منزلیں طے کرنے لگا تھا۔

فرانس کے فلاسفر اور ادیب ژین پال سارتر کے مطابق ''ادب اور فن کار کی

سماجی ذمہ داری اور وابستگی بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔'' ان کے خیال میں ''معاشرے میں تبدیلی اور انقلاب تو سیاسی عمل کے بغیر ممکن نہیں مگر فلسفہ، ادب اور فن اس کے ابتدائی محرکات ضرور ثابت ہوتے ہیں۔'' پاکستان میں ادیب اور فن کار اپنی سماجی ذمہ داریوں کو اور سماج سے اپنی وابستگی کو سمجھتے ہوئے اپنی بلندیوں کو چھوتے ہوئے اب میری پوری نسل کو اپنے افکار و نظریات سے متاثر کر رہا تھا۔

لاہور ترقی پسند ادب کا گہوارہ تھا مگر سرگودھا بھی ملک کے دیگر شہروں کی طرح اس کے اثر سے باہر نہیں تھا۔ جاگیردار ڈاکٹر وزیر آغا جنہیں سرگودھا کے لوگ ''کاٹھا انگریز'' کہتے تھے، کی رجعت پسندی اور ان کے چند ادبی مزارعین کو چھوڑ کر سرگودھا کا شاعر، ادیب اور صحافی ترقی پسند ادب اور بالشویک فکر کے ساتھ جڑا ہوا نظر آتا تھا۔

رجعت پسند اپنی سیاست اور ادب میں زمانے کو ٹھہرا ہوا سمجھتے ہیں

تمام رجعت پسند اپنی سیاست اور اپنے ادب میں زمانے کو ٹھہرا ہوا تصور کرتے ہیں اور ان کا سب سے بڑا سہارا تاریخی روایات اور ان پر قائم رہنے والے اعتقادات اور عادات ہیں جو عام انسانوں کے ذہنوں میں، شعور اور لاشعور میں صدیوں سے پیوست ہوتے ہیں۔ خیالات اور عقائد میں تبدیلیاں آسانی سے نہیں آتیں۔ ایسے حضرات آج کے ترقی یافتہ معاشروں میں رہتے ہوئے بھی سفید براق گھوڑے پر بیٹھ کر اسلام کا پرچم لہراتے ہوئے، تلوار ہاتھ میں لیے پوری دنیا کو فتح کرنے کے خواب دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔ ان کے ادب میں زمانہ قدیم سے جڑی ہوئی عادات اور رسومات نمایاں کی جاتی ہیں۔ اس کے باوجود کہ ایک قسم کی معاشرت کی جگہ دوسری معاشرت لے لیتی ہے۔ جیسے قبائلی نظام کی جگہ جاگیرداری نظام یا جاگیرداری نظام کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام یا سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ اشتراکی نظام۔ لیکن رجعت پسندوں کے سوچنے کے طریقے، تصورات اور عادتیں نہیں بدلتیں۔

انسان کے فکری اور ثقافتی ارتقا کے مراحل پر جب ایک نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ

تاریخ کا ایک زمانہ گزرا ہے جب غلامی جائز تھی۔ افلاطون اور ارسطو جیسے فلاسفر اور اکثر مقدس صحیفوں نے غلامی کو جائز قرار دیا تھا۔ مگر یہ زمانہ ہے جب غلامی کا نظام اس کے پہلے عہد سے ترقی یافتہ تھا۔ اس عہد سے پہلے جنگ کے قیدیوں کو قتل کر دیا جاتا تھا اس لیے کہ وہ معاشی طور پر ایک بوجھ تھے۔ مگر جب ذرائع پیداوار اتنی ترقی کر گئے کہ غلاموں کو زندہ رکھنے کے لیے نہ صرف کافی غذا تھی بلکہ فاضل پیداوار کے لیے غلاموں کی محنت درکار تھی تو غلامی کا یہ دور اپنے پرانے دور سے ترقی پسند نظر آتا ہے۔ مگر آج کی تمام اقوام، سعودی عرب کو چھوڑ کر، غلامی کے اس انداز اور دستور کو غلط، ناجائز، قابل سزا جرم اور غیر انسانی فعل سمجھتی ہیں۔

آج سے دو تین ہزار برس قبل کے معاشرے کی معاشی صورت حال، پیداواری ذرائع، آلات اور فنون پیداوار آج سے بہت مختلف تھے اور جس طرح جاگیردارانہ نظام، سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام کو بتدریج قائم کرنا وقت کی ضرورت بنتا گیا، معاشرہ ترقی کرتا گیا اسی طرح ہر وہ نظریہ حیات اور فنون لطیفہ کا تہذیبی مظہر جو بنی نوع انسان سے علم اور سائنس کی روشنی چھینتا ہو اور جس کی وجہ سے عوام اور اقوام کے لیے ایک بہتر معاشرے اور تہذیبی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو، متروک ہوتا گیا، ختم ہوتا گیا۔ مگر ہر دور میں رجعت پسندی اور ترقی پسندی کا تضاد رہا اور آپس میں ٹکراؤ ہوتا رہا۔

برصغیر میں ترقی پسند ادب اور رجعت پسند ادب کی تخلیق کو بھی اس تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ترقی پسند تحریک کی بنیاد حب الوطنی، انسان دوستی اور آزادی کے تصورات پر تھی جس نے وطن دشمنی اور رجعت پسند خیالات کا مقابلہ کیا اور آنے والی نسلوں کو ایک نیا اسلوب دیا۔ سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض اس کے روح رواں تھے۔

فیض احمد فیض، جنہیں اب میلہ بنا دیا گیا ہے

سامراج کے خلاف اور محکوم و مظلوم عوام کے حق میں اپنا سفر فیض صاحب نے 1935ء میں شروع کیا جب وہ ایم۔اے او کالج امرتسر میں لیکچرار تھے اور ڈاکٹر رشید جہاں اور ان کے خاوند محمود الظفر کے ساتھ مل کر نہ صرف کمیونسٹ مینیفیسٹو کا مطالعہ کر رہے

تھے بلکہ ان ہی دنوں قائم ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنفین کے کارواں کا حصہ تھے۔ اس کی تفصیلات سجاد ظہیر کی کتاب ''روشنائی'' اور ہمارے دوست مرحوم ڈاکٹر ایوب مرزا کی کتاب ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں موجود ہیں۔

فیض صاحب نے اپنی شاعری کی ابتدا تو ہر شاعر کی طرح گل و بلبل اور لب و رخسار کی شاعری سے ہی کی تھی مگر سوشلزم کے ساتھ اپنا نظریاتی رشتہ جوڑنے کے بعد انہوں نے، ''اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا''، کا راستہ دیکھا اور ''جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم'' اور ''خون میں نہائے'' مظلوم عوام کے دکھ اور درد کے ساتھ ان کی شاعری جڑ گئی۔

دوسری عالمی جنگ میں فاشزم کے خلاف جنگ میں حصہ لینے والے لیفٹیننٹ کرنل فیض احمد فیض امرتسر کی ٹریڈ یونین کا بھی حصہ رہے۔ پاکستان پوسٹل یونین کے صدر بھی اور مرزا ابراہیم کی ریلوے ورکرز یونین کے نائب صدر بھی۔ فیض صاحب ابھی کوئے یار سے نکلے ہی تھے کہ سوئے دار چل پڑے۔ انہیں 1951ء میں پنڈی سازش کیس میں پکڑ کر جیل میں ڈال دیا گیا۔ فیض صاحب نے اس زمانۂ اسیری میں زنداں نامہ لکھا جس میں انہیں متاعِ لوح و قلم کے چھن جانے کا کوئی غم نہیں تھا اس لیے کہ انہوں نے خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر سماج کے دل پر اپنی انقلابی فکر و جد و جہد کی عبارت رقم کرنا شروع کر دی تھی۔

فیض صاحب کو قیام پاکستان کی آزادی کی صبح پر جب جاگیرداروں کا پڑتا ہوا سایہ نظر آیا تو انہوں نے اس آزادی کے بارے میں نشان دہی کی کہ یہ اجالا داغدار ہے اور وہ سحر نہیں جس کا انتظار تھا۔ فیض صاحب کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن طبقاتی تقسیم کی دیواریں ضرور گریں گی۔ پاکستان اور دنیا بھر کے مزدور اور کسان ایک دن ضرور خوش حال ہوں گے۔ سامراج کا ایک دن ضرور خاتمہ ہوگا۔

انہیں یقین تھا کہ وہ اس دن کو، جس کا وعدہ ہے، لازم ہے کہ دیکھیں گے۔ جب تاج اچھالے جائیں گے اور تخت گرائے جائیں گے اور راج کرے گی خلق خدا۔ انہوں نے یہ نظم عالمی سامراج کے خاتمے اور دنیا پر مزدور، کسان کی حاکمیت کے قیام کے لیے لکھی تھی نہ

کہ پاکستان میں کسی جج کی بحالی کی تحریک کے لیے جو کہ بار بار پاکستان کے ایک ٹی وی چینل پر اس تحریک کے دوران سنوائی جاتی تھی گویا کہ یہ نظم فیض صاحب نے جج کو بحال کروانے کے لئے وکیلوں کے کہنے پر لکھی ہو۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس چینل کا نام ''جیو'' تھا۔

آج بدقسمتی سے پاکستان میں سیاسی رسہ کشی میں مصروف جاگیردار اور سول ملٹری بیوروکریسی کے نمائندے اور وہ تمام رجعت پسند سیاسی جماعتیں اور اسلام فروش افراد جو ان کی زندگی میں فیض صاحب اور ان کے نظریے کے دشمن رہے اور وہ تمام جو سامراج کے ٹکڑوں پر پلتے رہے آج لینن پرائز یافتہ فیض کو گنگناتے پھر رہے ہیں۔ فیض صاحب کو، ان کی سامراج دشمنی اور عوام دوستی کے پیغام کو، اپنی ذہنی لذت کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔ فیض صاحب کی سامراج دشمن، استحصالی طبقات دشمن جدوجہد کا اثر ختم کرنے کے لئے انہیں میلہ بنا دیا گیا ہے۔

مگر میں سمجھتا ہوں کہ بورژوا طبقات نہیں بلکہ پاکستان کے مزدور اور کسان، ترقی پسند سیاسی کارکن اور دانشور، جنہیں فیض صاحب کی سیاسی فکر کا وارث ہونا چاہیے وہ فیض صاحب کے خلاف اس سازش کو کامیاب نہ ہونے دیں گے جس میں فیض صاحب کے خاندان کے افراد بھی شامل ہیں۔ فیض ایک میلہ نہیں بلکہ عالمی سامراج، مظلوم ومحکوم عوام کے استحصالی نظام کے خلاف ایک تحریکِ مسلسل کا نام ہے۔

ترقی ادب، قہوہ خانے اور جشن بہاراں

ترقی ادب کے مختلف ادوار میں قہوہ خانوں کو نہ صرف یورپ بلکہ برصغیر میں بھی مثبت اہمیت حاصل تھی۔ عرب ہوٹل ہو یا نگینہ بیکری۔ جس طرح لاہور اور کراچی میں دانشور ادیب اور صحافی اپنی اپنی پسند اور معاشی حیثیت کے قہوہ خانوں میں بیٹھتے تھے، اسی طرح سرگودھا میں کچہری بازار کے ریسٹورانٹ غریب اور متوسط درجے کے قلم کاروں کی آماجگاہ تھے۔ اکثر کا ان میں اکاؤنٹ چلتا تھا۔ مقامی سیاست سے لے کر بین الاقوامی حالات تک، علم وادب سے وابستہ مسائل سے لے کر ذاتی زندگی کے مسائل تک ہر موضوع پر تبادلۂ خیال

ہوتا۔ لاہور کے پاک ٹی ہاؤس، شیزان یا کافی ہاؤس کی طرز پر سرگودھا میں بھی یہ محفلیں ذہنی تحریک کا باعث بنتیں۔ میں بھی کبھی کبھی ان میں جا بیٹھتا اور شام جب ڈھل کر رات کی تاریکی میں داخل ہونے لگتی تو یہ لوگ دیسی کپی یا ولائتی کی تلاش و جستجو میں بے چین نظر آتے تو میں گھر کی راہ پکڑتا۔

ہر سال سرگودھا میں جشن بہاراں و میلہ مویشیاں بڑے زور و شور کے ساتھ منایا جاتا۔ آرٹس کونسل کے زیر اہتمام ڈرامے اور مشاعروں کا دور چلتا جن میں مقامی شعراء کے علاوہ ملک بھر کے شاعر شیر افضل جعفری ہوں، عبدالحمید عدم ہوں یا احسان دانش، قتیل شفائی ہوں یا احمد ندیم قاسمی، سب ہی جمع ہوتے۔ اس میلہ مویشیاں میں دور دور سے کسان اپنے جانوروں کے ساتھ آتے۔ گورنر امیر محمد خان اور علاقے کے جاگیردار نیزہ بازی، کتوں کی دوڑ، گھوڑ دوڑ، پولو اور کبڈی وغیرہ کے مقابلے بھی اس جوش کے ساتھ کرواتے گویا اپنی پرانی دشمنی نکال رہے ہوں۔ جبکہ موت کے کنویں میں زندگی گزارنے والے محنت کش اور غریب کسان سیروں جلیبیاں کھا جاتے اور تھیٹرز اور موت کا کنواں دیکھنے میں دو تین ہفتے گزار دیتے۔ ان دنوں عنایت حسین بھٹی، عالم لوہار، بالی جٹی اور صبیحہ خانم وغیرہ ان تھیٹروں کی جان تھے۔ ٹی وی تھا نہیں۔ لوک ورثے کے مالک عوام تھے۔ ان ایام میں لاہور سے آنے والے ترقی پسند اپنے سوٹ اور ٹائیوں کو اور سرگودھا کے عصمت علیگ اپنے بوسکی کے کرتے کو ترک کر کے کھدر کا لباس پہنے نظر آتے۔ سرگودھا کی فضا میں مہینوں اس جشن کا نشہ رہتا۔

میں اپنی تمام پڑھائی رات کو کرتا۔ رات کی خاموشی اور خلا میں چیزوں کے خاموش وجود اور ان سے وابستگی کا احساس بڑھتا ہے۔ اندھیرا رخصت ہونے لگتا۔ رات کے سحر کا اثر ٹوٹتا، صبح کی پو پھٹتی، چند گھنٹے سو کر ناشتے کے بعد کالج کی طرف چل پڑتا۔

ہری ہری گھاس کے میدانوں میں زرد اور لال رنگ کی کالج کی عمارت، نئی تعمیر کی گئی تھی۔ بہت سارے گھنے درختوں کی چھاؤں، کیاریوں میں سلیقے سے لگائے گئے پودے اور مہکتے پھول، کھیل کے میدان، کئی مربعوں پر محیط کالج بہت جدید اور خوبصورت تھا۔

سیٹلائٹ ٹاؤن میں تھکی ہوئی خاموشی کی جگہ زندگی بھرنے لگی تھی۔ دن میں اب

یہاں بھی ترکاری اور پھل کی ریڑھی والے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاّتے۔ سردیوں کی راتوں میں چلغوزے، مونگ پھلی اور ریوڑیاں بیچنے والے آواز لگاتے۔ دکانوں پر گیس کے ہنڈے اور لالٹینوں کی مدھم روشنی کی جگہ بجلی کے جھلملاتے قمقمے چمکنے لگے تھے۔ گرد آلود تانگوں کے اڈے پر رات کے سناٹے میں بھی ایک آدھ تانگہ کھڑا مل جاتا تھا۔ گھروں میں لگائے گئے موتیے اور چنبیلی کے پودے بڑے ہو کر دور دور تک خوشبو پھیلانے لگے تھے اور گھر میں میرے ہاتھ کا لگایا ہوا شیشم کا پودا بھی شباب کی حدوں کو چھونے لگا تھا۔ اس کے پتے رات کو بہت پر اسرار طریقے سے سائیں سائیں کرتے۔ اماں کا پاؤں رات کے اندھیرے میں میرے پالتو کتے پر جا پڑتا تو دونوں ہی چیخ اٹھتے۔ سیٹلائٹ ٹاؤن شہر بنتا جارہا تھا اور ملک میں طبقاتی قطب مینار کی سب سے اونچی سیڑھی پر چڑھنے کی دوڑ شروع ہوگئی تھی۔

کالج میں آکر کچھ بے ساختہ سی آزادی مل گئی۔ ہر روز ڈھیروں کتابوں اور کاپیوں کا بستہ، سکول دیر سے پہنچنے پر بید کی چھڑی سے پٹائی اور ہاتھوں پر پڑ جانے والے نیل اب قصۂ پارینہ تھے۔ میں خودرو بیل کی طرح، درختوں کی طرح، بیرومیٹر کی طرح اونچا ہونے لگا تھا۔ ایسا لگنے لگا تھا کہ میں مصنوعی روشنیاں بجھا کر اندھیرے میں چلنے اور راستہ تلاش کرنے کا راز جاننے کی کوشش میں ہوں۔

انٹرمیڈیٹ پاس کر کے تھرڈ ائیر میں پہنچا تو بدنام زمانہ یونیورسٹی آرڈیننس کے خلاف ڈھاکہ، پھر کراچی سے ہوتی ہوئی طلبا کی تحریک پورے ملک میں پھیل گئی۔ کراچی کے طلبا نے لاہور کے طلبا کو چوڑیوں کا تحفہ بھیج کر ان کی غیرت کو للکارا تو وہ بھی بھرپور انداز میں اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ معراج محمد خان، فتح یاب علی خان، سید سعید حسن، علی مختار رضوی، حسین نقی، جوہر حسین، انوار احسن صدیقی، خرم مرزا، نواز بٹ، واحد بشیر اور این۔ ایس۔ ایف کے دیگر طالب علم رہنماؤں کو کراچی بدر کر دیا گیا۔ ان میں سے کچھ کوئٹہ چلے گئے اور کچھ حیدرآباد۔ معراج محمد خان لائل پور سے ہوتے ہوئے سرگودھا آئے تو ہم نے گورنر امیر محمد خان اور یونیورسٹی آرڈی نینس کے خلاف جلوس نکالا۔ اس وقت کے امیر محمد خان کا مغربی پاکستان میں اسی طرح خوف تھا جس طرح اپنے دور میں حجاج بن یوسف

کا۔ جاگیرداروں کے اس شہر اور سرگودھا کالج کی تاریخ میں پہلی بار حکومت کے خلاف بھرپور جلوس نکلا جس کی قیادت کرنے والوں میں میں بھی تھا۔ یہ 1963ء کی بات ہے۔ یونیورسٹی آرڈیننس کے ساتھ ساتھ گورنر امیر محمد خان نے پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس جیسا کالا قانون بھی نافذ کیا تھا۔ جس کے خلاف ملک بھر میں صحافیوں کا احتجاج جاری تھا۔ ان دنوں اثر چوہان صاحب سرگودھا یونین آف جرنلسٹ کے صدر تھے۔ انہوں نے اس آرڈیننس کے خلاف صحافیوں کے جلوس کی قیادت کی جو ہماری دوستی کی بنیاد بنی۔ میرے اندر طبقاتی شعور اپنی وسعت اور گہرائی کے ساتھ پھیل رہا تھا اور اس طبقاتی معاشرے کو بدل ڈالنے کے جذبے نے جنم لے لیا تھا۔

سنجیدہ کتابوں اور اصحاب علوم وفنون کے ساتھ میرا رشتہ مضبوط ہونے لگا۔ بابا فرید نے کہا تھا کہ اگر لوگوں کو علم کی طاقت اور اس کا مرتبہ معلوم ہو جائے تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر علم کی تلاش میں لگ جائیں۔ میں بھی اس علم کی تلاش میں چل پڑا تھا۔ ہارڈی، گورکی، شیکسپیئر، ٹالسٹائی، رابندرناتھ ٹیگور، بلھے شاہ، جین آئر، شیلے، کیٹس، بائرن، ساحرلدھیانوی، فیض احمد فیض، سجاد ظہیر، سبط حسن، طفیل عباس، جوش ملیح آبادی، حبیب جالب، قتیل شفائی، عبدالحمید عدم، احسان دانش، جون ایلیا اور مصطفیٰ زیدی ان کی شخصیات اور تحریروں میں مجھے اپنی چھپی ہوئی آرزوئیں اور بندھے ہوئے خواب نظر آنے لگے۔ ہیگل، کارل مارکس اور اینگلز ابھی ذرا مشکل تھے مگر ان کا بنیادی پیغام سمجھ میں آنے لگا تھا۔

ایک انسان دوست انگریز ٹامس مور جس نے ہنری ہشتم کو کلیسا کا سربراہ ماننے سے انکار کیا تھا اور اس جرم میں اس کی گردن اڑا دی گئی تھی۔ اس نے اپنی کتاب ''یوٹوپیا'' میں جو کہ 1516ء میں شائع ہوئی تھی، شخصی املاک کو سب سے بڑی اور سنگین لعنت قرار دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ''جب تک شخصی املاک موجود ہیں اور جب تک مال و دولت ہر شے کا معیار بنا ہوا ہے، کسی بھی قوم میں انصاف اور مسرت پر مبنی معاشرہ قائم نہیں ہو سکتا۔ انصاف اس لیے نہیں ہوگا کہ بہترین چیزوں پر بدترین لوگوں کا قبضہ ہوگا اور مسرت اس لیے نہیں ہوگی کہ تمام اچھی چیزیں گنتی کے چند افراد کے قبضے میں ہوں گی۔''

حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا تھا کہ سوئی کے ناکے میں سے اونٹ نکل سکتا ہے لیکن سرمایہ دار خدا کی بادشاہت میں داخل نہیں ہوسکتا اور شری کشن نے کہا تھا کہ جو لوگ اکیلے کھاتے ہیں اور دوسروں کو شریک نہیں کرتے وہ گناہ کھاتے ہیں۔ قرآن پاک میں کئی جگہ کہا گیا ہے کہ جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اسی سونے سے ان کی پیشانیوں اور پسلیوں کو داغا جائے گا۔ یہ پیغام الہامی بھی ہے اور سچ بھی یہی ہے۔

مگر مسلمان قرونِ وسطیٰ کے زمانے کے موروثی، شاہی سیاسی نظام کے عادی رہے ہیں۔ جب مسلمانوں نے ایران، شام، عراق اور مصر کو فتح کیا تو اسی نظام کو جاری رکھا جو صدیوں سے وہاں جاری تھا۔ مدینے کی بوریہ نشینی کو سلطانی اور ملوکیت میں تبدیل کر دیا گیا اور جو شاہی نظام بازنطینی حکومت روم کے عیسائی حاکم اور ایران کے مجوسی شہنشاہوں نے جاری رکھا تھا اس کو اپنا لیا گیا۔ بنو امیہ، بنو عباس، پٹھان، مغل سب نے ہی بادشاہت کا طرز حکومت اپنایا۔

البتہ برصغیر میں مغلوں کا انداز حکمرانی بنو امیہ اور بنو عباس کے انداز سے مختلف تھا۔ ترکوں اور افغانوں نے برصغیر میں تقریباً ساڑھے پانچ سو سال حکومت کی ہے اس تمام عرصے میں یہاں جس رہن سہن نے جنم لیا وہ عربی یا بازنطینی طرز رہن سہن نہیں تھا بلکہ اس علاقے کی مختلف قدیم تہذیبوں میں سے اس تہذیب نے جنم لیا اور اکبر اور شاہ جہاں کے دور میں یہ تہذیب اپنے عروج پر پہنچی۔ اس تہذیب کو اس مقام تک پہنچانے میں عالموں، صوفیوں، ادیبوں، فن کاروں نے اہم کردار ادا کیا۔ داتا گنج بخشؒ، خواجہ نظام الدین اولیاؒ، بابا فرید گنج شکرؒ، خواجہ معین الدین اجمیریؒ، لعل شہباز قلندرؒ، بری امامؒ، اور امیر خسروؒ، تلسی داس، بھگت کبیر، گرونانک، بلھے شاہؒ، سچل سرمستؒ، شاہ حسینؒ خوش حال خاں خٹک جیسے صوفی اور شاعر ایک انسان دوست سیکولر معاشرے اور تہذیب کے قیام کے راہنما ہیں۔

ان میں سے کسی نے بھی بازنطینی طرز حجاب، جس کو اب اسلامی کہا جاتا ہے، اور جو بازنطینی دور سلطنت میں اسلام کے آنے سے بہت پہلے سے بازنطینی عورتوں کا لباس تھا، کبھی بھی خواتین پر مسلط کرنے کی تلقین نہیں کی اور نہ ہی مردوں کا ٹخنوں تک کا فراک، جسے

عرب توپ کہتے ہیں اور ہمارے یہاں اسے مردوں کا اسلامی لباس بنایا جا رہا ہے، کبھی مکے اور مدینے کا لباس تھا اور نہ ہی بڑے بھائی کا کرتہ اور ٹخنوں سے اونچی چھوٹے بھائی کی شلوار پہننا اسلامی تہذیب یا اسلامی لباس تھا۔

مُلّا نے مدینے کے بوریہ نشینوں کے ساتھ نہ صرف لباس کے معاملے میں ظلم کیا ہے بلکہ اس پورے تصور انقلاب کو جو غریبوں، غلاموں اور محکوموں کی آزادی کے لیے آیا، اس کو ملوکیت اور ظالم حکمرانوں کے حق میں قید کر دیا ہے اور معصوم انسانوں کے بے پناہ خون کا تاوان لے کر بھی اسلام کے بنیادی تصور انقلاب کو رہا کرنے کے لیے تیار نہیں۔

ہمارے یہاں کے جاگیردار کے اندر بھی جابر بادشاہ سلامت ہی تھا اور ہے۔ چنانچہ گورنر مغربی پاکستان امیر محمد خان بھی ایک جابر بادشاہ تھا اور اس کے انداز حکمرانی کو حکمران طبقات میں پسند کیا جاتا تھا۔ اس کے خلاف سرگودھا کا یہ جلوس وہ بھی گورنمنٹ کالج کے پرنسپل خان عبدالعلی خان کے ہوتے ہوئے نکالا جائے، ایک قہرِ الٰہی کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ خان عبدالعلی خان نے کالج سے نکالنے کی دھمکی دی۔ ڈپٹی کمشنر نے میرے والد سے گلہ کیا اور مجھ سے آئندہ سختی سے نپٹنے کی دھمکی دی۔ لیکن یہ محض دھمکی ہی تھی۔ خان عبدالعلی خان بہت سمجھدار پرنسپل تھے۔ انہیں اندازہ تھا کہ سختی کے نتیجے میں اس تحریک کو مزید پھیلاؤ ملے گا۔ انہوں نے آئندہ "ایسے کام" نہ کرنے کی تنبیہ کرتے ہوئے پڑھائی جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ اس کام میں میرے ساتھ اسلام الحق، مبشر نقوی، عبدالحفیظ چیمہ اور دوسرے بہت سے دوست شامل تھے۔ باہر سے آئے ہوئے طالب علم رہنما واپس چلے گئے اور ہم سب پھر سے پڑھائی میں، شرارتوں میں، ڈراموں اور مباحثوں میں، مصروف ہو گئے۔ مگر 1963ء میں طلبا اور صحافیوں کی یہ تحریک ایوب خان کے خلاف ایک پہلا قدم تھا۔

بارش کے بعد جب باغ اور سبزہ بھیگا بھیگا سا ہوتا اور انوکھی سی زندگی اور خوشبو فضا میں تیرتی تو سٹیلائٹ ٹاؤن کے ساتھ کچی بستی "امولک نگر" کے غریب اور فاقہ کش انسانوں کے گھروں سے اٹھتا ہوا دھواں ایک کانپتی ہوئی دعا کی طرح آسمان کی طرف اٹھتا اور پھر

کچھ بلندی پر جا کر فضا میں محلول ہو جاتا۔ اس طرح کی بستیوں کے گھروں میں رہنے والے یہ وہ لوگ تھے جو اپنے دکھوں کے باوجود دوسروں کے کام آنے کی کوشش کرتے۔ ان کے مشترکہ خاندان کے رہن سہن کے مناظر، تصویر کی طرح آج بھی میرے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔

معاشرے کی اکثریت اس وقت بھی آج کی طرح پریشانیوں کا شکار تھی مگر پریشانیوں کی شدت کم تھی۔ ان کی پیشانیوں پر لکیروں کی تعداد اور گہرائی اتنی نہیں تھی جتنی کہ آج ہے مگر وہ ظلم کے خلاف احتجاج کرتے تھے۔ اب تو لگتا ہے کہ حالات کی بے رحمی، موت اور خطرات سے پاکستان کے عوام کی دوستی ہوگئی ہے۔ خطرناک طوفان میں گھری ہوئی قوم میں تھپیڑے کھانے کا حوصلہ آ گیا ہے یا سٹاک ہوم سنڈرم کے مطابق ظلم کے ساتھ زندہ رہنا اور ظالم کو ہی اپنا نجات دہندہ سمجھنا ان کا مقدر بن گیا ہے۔

سُست رو سرگودھا سے تیز رو کراچی میں آمد

ڈی مونٹ مورنسی سے گورنمنٹ کالج سرگودھا بننے والے اس تعلیمی ادارے میں اس وقت بی۔ اے تک کی ہی کلاسز تھیں۔ 1964ء میں گریجوایشن کرنے کے بعد مزید تعلیم کے حصول کے لیے میں کراچی چلا آیا۔ کراچی میں اپنی اکلوتی خالہ کے گھر پر میرا قیام تھا۔ وہ برصغیر کے نامور عالم قبلہ کلب حسن، جو مولانا کبن کے نام سے مشہور تھے، کے کزن سید ذاکر حسین نقوی کے ساتھ شادی کے بعد ناظم آباد میں آباد تھیں۔ ناظم آباد ایک نئی آبادی کے طور پر ابھی ابھر رہا تھا۔

مجھے کھیتوں اور جنگلوں کی آزاد فضا میں سرگودھا کی سُست روزندگی کی عادت تھی۔ کراچی کی تیز رفتار طرز معاشرت نے ابتدا میں بہت الجھن پیدا کی۔ مالٹے اور آم ڈھیری کے بجائے گنتی کے حساب سے بکتے دیکھ کر تعجب ہوا۔ پہلی بار اونٹ گاڑی، گدھا گاڑی میں گدھے کے ساتھ اس کی اخلاقی ہمدردی میں بلاوجہ دوڑتا ہوا ایک فالتو گدھا جسے ''پخ'' کہا جاتا تھا، لیاری میں مکرانی، جوڑیا بازار میں مالواڑی اور میمن، کاروباری بوہرے

ان سب کو پہلی بار دیکھا۔ جگہ جگہ ایرانی چائے خانے تھے، جہاں پر شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی اور اس کی بیوی فرح دیبا کی تصویر ٹنگی ہوتی اور لوگ وقت گزاری کے لیے چائے کی ایک پیالی اور اخبار سامنے رکھ کر گھنٹوں بیٹھے رہتے۔

کراچی کی صنعتی اور سرمایہ دار طرز معاشرت اور سرگودھا جیسے چھوٹے شہر کے جاگیردارانہ طرز زندگی کا فرق کھلا تو آنکھیں بھی کھلیں اور اس فرق کو عمر کے اس شعوری مرحلے پر سمجھنے کے لیے کراچی میں مارکسسٹوں کے ساتھ دوستیاں بڑھنے لگیں۔ معراج محمد خان این ایس ایف کے لیڈر تھے اور این ایس ایف زیر زمین پارٹی کا طالب علم فرنٹ تھا۔ سٹڈی سرکل بہت محتاط انداز میں ہوتے تھے۔ معراج محمد خان کے ساتھ سرگودھا کے بعد دوستی ہوگئی تھی اور میں کراچی میں اپنی فکری تلاش میں اکیلا نہیں تھا۔

تمام کامریڈ زیر زمین کام کر رہے تھے۔ این ایس ایف کے علاوہ پی آئی اے کے مزدوروں کی یونین ایئر ویز زیر زمین پارٹی کا دوسرا فرنٹ تھا جس کے ذریعے مزدوروں میں کام ہو رہا تھا۔ ہر ایک پر سی آئی ڈی والوں کی کڑی نظر رہتی۔ چنانچہ سٹڈی سرکلز میں شمولیت اور کام ایک عبادت سے کم نہیں تھا۔ ایک ایسی عبادت جس میں ہر طرح کی قربانی ممکن تھی۔ ان سٹڈی سرکلز کی بدولت میرے اضطراب اور میری شخصیت کو ایک منظم انداز فکر ملا اور حالات کو سائنسی بنیادوں پر سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔

معاشرے کے ارتقائی مراحل کا علم اور میرا تجسس

سٹڈی سرکلز میں مطالعے کے لئے اور تبادلہ خیال کے لئے جو دستاویزات سامنے آتیں وہ نہایت فکر انگیز ہوتیں۔ انسانی معاشرے کے ارتقائی مراحل کو سمجھنے سے متعلق ان مطالعاتی مجالس میں جب پتہ چلا کہ زمین کو سورج سے جدا ہوئے تقریباً دو ارب برس گزر چکے ہیں۔ زمین ایک دہکتا ہوا آگ کا گولہ تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ ٹھنڈی ہوئی۔ اس کی اوپر کی سطح کو سخت ہونے اور موجودہ شکل اختیار کرنے میں ہزار ہا سال لگے۔ زمین آج بھی اندر سے وہی کیچڑ نما آگ ہے جسے ہم لاوا کہتے ہیں اور جو آتش فشاں پہاڑوں سے برآمد ہوتا ہے۔ پھر لاکھوں برس کی تبدیلیوں کے دوران ہوا اور پانی کا ظہور ہوا۔

پھر ایک زمانہ ہے جب ہزار ہا برس تک مسلسل بارش برستی رہی۔ پہاڑوں اور سمندروں نے اپنی شکلیں اختیار کیں۔ ایک اندازے کے مطابق زندگی کی ابتدا سمندروں کے کنارے دلدل میں اسفنج نما پودوں سے ہوئی۔ زمین کا بیشتر حصہ دلدلوں سے پٹا پڑا تھا جس میں بے حد لمبے اور گھنے درخت، جنگلات، نباتات کے بعد حیوانات کی ابتدا ہوئی۔ مچھلیوں، رینگنے والے جانوروں اور دودھ پلانے والے جانوروں کا ظہور ہوا۔

پھر ہزاروں سال بعد برف کا زمانہ آیا جو ہزار ہا سال تک رہا۔ آخری برف کا زمانہ پچاس سے پچیس ہزار قبل مسیح کا بتایا جاتا ہے۔ بدلتے ہوئے شدید موسمی حالات کے ساتھ ساتھ زندگی بھی بدلتی گئی۔ ڈائینا سور جیسے بڑے بڑے جانور مشکل حالات کا مقابلہ نہ کر سکے اور وہ جانور زندہ رہے جو ان نامساعد حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کر سکے اور اپنے آپ کو ان شدید مشکلات سے بچا سکے۔ انسان کے آباؤ اجداد بھی ان مشکل اور شدید

حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے ذہنی جوہر کی نشوونما کرتے گئے اور دیگر حیوانات سے ممتاز ہو گئے۔

انسانی علم کے محققین کے مطابق انسان کو حیوانات کی صف سے جدا ہوئے ہزار ہا برس گزر چکے ہیں۔ جو انسانی ڈھانچے اور کھوپڑیاں اب تک سائنس دانوں کو ملی ہیں، ان میں سے اکثر کا تعلق پتھر کے دور کے انسان سے ہے جو غاروں میں رہتا تھا۔

پتھر کا زمانہ، جب ملکیت کا تصور نہیں تھا

یہ وہ زمانہ ہے جب انسان شکار اور جنگلی پھلوں سے پیٹ بھرتا تھا۔ وہ تنہا یا گروہ بنا کر شکار کرتا اور اسے آپس میں بانٹ لیتا۔ شکار اور جنگلی جانور کسی فرد واحد کی ملکیت نہیں تھے۔ ''الارض اللہ'' یعنی زمین خدا کی تھی۔ کوئی امیر تھا نہ ہی کوئی غریب، نہ ہی کوئی طبقاتی کشمکش۔ اس لیے کہ طبقے تھے ہی نہیں۔ نہ ہی ریاست اور نہ ہی حکومت۔

پتھر کے اس دور میں انسان کے ارد گرد ایسے خطرات تھے جن کو سمجھنا اور ان پر قابو پانا اس کی ضرورت تھی۔ وہ رات کے اندھیرے اور دن کی روشنی کا سبب جاننا چاہتا تھا۔ طوفان بادوباراں، زلزلے، آتش فشاں پہاڑ سے ابلتا ہوا الاوا۔ امراض و اموات حتیٰ کہ سانپ جیسی مخلوق کے سامنے بھی وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا تھا۔ اس نے انہیں ناقابل تسخیر طاقت سمجھ کر ان کی پوجا شروع کر دی۔ خوراک مہیا کرنے والے گائے جیسے جانور اور دن کی روشنی، گرمی پہنچانے والے سورج کو اس نے اپنا دیوتا مان لیا۔ مگر اس نے ان قوانین قدرت کو سمجھنے کی کوشش بھی جاری رکھی۔ اس جدوجہد میں انسانی ذہن و دماغ نے ترقی کے مراحل طے کرنا شروع کئے اور اس کے دماغ کا وزن اور حجم بڑھنے لگا۔ TED GRANT (1913-2006ء) کے مطابق مادہ انسانی دماغ میں آ کر اپنے بارے میں باشعور ہو گیا۔ پھر آگ کی دریافت نے اس کے بہت سے مسائل حل کئے۔ اس نے آگ کی پوجا بھی شروع کر دی۔ مگر ابھی تک وہ شکار اور پھل کی تلاش میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔

فصل اگانے کا راز عورت نے دریافت کیا

محققین نے پتھر کے زمانے کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پتھر کے تیسرے اور آخری دور Neolithic Age میں عورت نے فصلیں اگانے کا راز پرندوں کو دیکھ کر دریافت کیا۔ عورت نے دیکھا کہ پرندے جہاں کہیں دانہ گراتے ہیں وہاں پر پودے نکلتے ہیں اور پودوں پر لگنے یا جھڑنے والا اناج پرندے کھاتے ہیں۔ چنانچہ اس نے اس عمل کو دہرانا شروع کیا اور بیج کا استعمال انسان کی سمجھ میں آ گیا۔ انسانی ذہن تجسس کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا۔ اس نے تجربے سے یہ سیکھا کہ پانی، خاص درجہ حرارت اور روشنی پیداوار کے لیے اہم ہیں۔ چنانچہ دریائے سندھ، نیل، دجلہ، فرات کے کنارے انسان آباد ہوا اور بستیاں بننے لگیں۔ انسان کا طرز معاشرت بدلنے لگا۔ اب شکار اور پھلوں کی تلاش میں مارے مارے پھرنے کے بجائے انسان ایک جگہ رہنے لگا اور اس کی معاشرتی زندگی کا آغاز ہوا۔ ایک اندازے کے مطابق دس ہزار سال قبل مسیح میں کھیتی باڑی کی ابتدا ہوئی۔

زمین خدا کی تھی، محنت اور پیداوار مشترکہ تھی

ابھی تک زمین خدا کی تھی اور سب مل کر فصلیں اگاتے اور پیداوار کو آپس میں بانٹ لیتے۔ ذرائع پیداوار یعنی زمین، بیج اور انسانی محنت پورے معاشرے کی مشترکہ تھی اور پیداوار بھی مشترکہ۔ ذاتی ملکیت کا تصور ابھی نہیں آیا تھا۔ یہ ابتدائی اشتراکیت کا زمانہ ہزار ہا برس تک جاری رہا۔ اس ابتدائی زرعی معاشرے کو مادری معاشرہ کہا جاتا ہے۔ اس معاشرے میں عورت کو مرد پر برتری حاصل تھی۔ اپنے ٹوگو (مغربی افریقہ کا ایک ملک) کے قیام کے دوران میں نے دیکھا کہ آج بھی کئی قبیلوں میں عورت روزگار مہیا کرتی ہے۔ کھیتی باڑی کرتی ہے، شہر جا کر اپنی اگائی ہوئی سبزیاں، پھل اور اناج بیچتی ہے۔ جبکہ مرد گھر کا کام کرتا ہے اور بچوں اور مویشیوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

دھات کی دریافت ہوئی اور اس کی وجہ سے ذرائع پیداوار میں ترقی ہوئی اور

انسانی طرز زندگی میں بھی ترقی ہوئی۔ کاریگر طبقہ وجود میں آیا۔ ضرورت سے زیادہ پیداوار ہونے لگی۔ اجناس کے بدلے اوزار خریدے جانے لگے۔ تقسیم کار نے جنم لیا تو طبقات بھی پیدا ہوئے اور زمانہ قبائلی اشتراکیت سے نکل کر ایک نئے دور میں داخل ہوا۔

قبائلی جنگی سردار نے ڈیڑھ لاکھ سال میں نیٹو کی شکل اختیار کر لی

وہ انسان جو ابھی تک کھیتی باڑی کے دور میں داخل نہیں ہوئے تھے اور ابھی تک شکار اور پھلوں پر زندہ تھے، وہ آباد بستیوں پر ٹوٹ پڑتے اور قتل و غارت گری کرتے۔ ان کا مقابلہ مرد کرتے۔ ان میں سے کچھ کو یہ کام کل وقتی طور پر سونپ دیا گیا اور بستی کی حفاظت ان کے ذمے ہو گئی۔ کاشتکاروں نے اپنی حفاظت کے لیے انہیں پیداوار کا کچھ حصہ دینا شروع کیا۔ اس طرح ان جنگی سرداروں کا طبقہ پیدا ہوا جو پیداواری عمل میں براہ راست شامل نہیں تھا۔ دوسرے لوگ ان کے لیے پیداوار مہیا کرتے تھے۔ گویا اپنی حفاظت کے لیے قبیلہ ان کو پالتا تھا اور یہ جنگی سردار قبیلے کی حفاظت کرتے تھے۔ جب معاشرہ قبیلوں سے اقوام اور ممالک کی منظم شکل اختیار کر گیا تو اس جنگی سردار نے فوج کے ادارے کی شکل اختیار کر لی۔ آج تمام اقوام اور ممالک اپنی حفاظت کے لیے فوجیں پالتی ہیں اور ان کی قومی آمدنی کا بیشتر حصہ جنگی ساز و سامان اور افواج پر خرچ ہوتا ہے۔ انسان کے ارتقاء کا عمل جاری ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ لاکھ برس میں اس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ پتھروں اور لکڑیوں کے بجائے اب ڈرون حملہ کرتا ہے۔ جنگی سرداروں نے مل کر نیٹو جیسا ادارہ بنا لیا ہے جس کے ذریعے وہ دوسروں کے وسائل اور علاقوں پر قبضہ کرنے کے لئے حملہ کرتے ہیں۔ یا حملہ کے بغیر جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اس معاشرے میں جسمانی طاقت اور ذہنی طاقت رکھنے والے کو برتری حاصل تھی۔ ذہنی طاقت جہاں پر ایجادات اور قوانین قدرت کو سمجھنے اور اس کو تسخیر کی جستجو میں تھی، وہاں پر جادوگر اور آسمانی آفات سے قبیلے کو محفوظ رکھنے والے پروہت بھی پیدا ہو رہے تھے۔ جسمانی طاقت رکھنے والے جنگی سردار نے یہ طاقت بھی یا تو براہ راست آسمانی طاقتوں کا از خود نمائندہ بن کر یا مذہبی پروہت کو ساتھ ملا کر حاصل کر لی اور وہ مذہبی، سیاسی و معاشی

طاقت کا مالک بن بیٹھا۔ اب وہ قبیلے کا سردار تھا۔ اس نے اپنے قبیلے اور علاقے کی حفاظت کے ساتھ ساتھ دوسرے زرخیز علاقوں اور کمزور قبیلوں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ جیسا کہ آج عالمی استعمار دوسری قوموں اور علاقوں کے وسائل پر قبضے کے لیے مختلف حیلے بہانوں سے، کبھی جمہوریت کی بقاء کے لیے، کبھی کہیں بادشاہوں، ڈکٹیٹر اور سلاطین کی بقاء کے لیے، کبھی دہشت گردی کا خطرہ خود پیدا کر کے اس کو ختم کرنے کے لیے، کبھی (Weapons of mass destruction) کا بہانہ کرکے، کبھی لیبیا جیسے ملک کے شہریوں کی حفاظت کے بہانے، سیکورٹی کونسل کی قرارداد نمبر 1973 منظور کروا کر جنگیں مسلط کرتا ہے۔

اس دور کا جنگی سردار اپنے توسیع پسندی کے عمل کے نتیجے میں حاصل ہونے والے فوائد اور مال کو اپنے قبیلے میں تقسیم کرتا تھا اور اس لوٹ مار کا فائدہ قبیلے کے ہر فرد کو پہنچتا تھا۔ اس ابتدائی اشتراکی قبائلی نظام میں مال غنیمت کی تقسیم مساوی اور ہر فرد کی ضرورت کے مطابق ہوتی تھی۔ معاشرہ تبدیل ہوتا گیا تقسیم کا معاملہ بھی تبدیل ہوتا گیا۔ آج کا جنگی سردار لوٹ کا مال تقسیم نہیں کرتا Corporates کے ذریعے اپنے پاس رکھتا ہے تو وال سٹریٹ کے خلاف تحریک چلتی ہے اور 99% غریب اس ایک فی صد سے اپنا حصہ مانگنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔

انسان طبقات میں تقسیم ہو گیا۔ دورِ غلامی سے سوشلزم تک کا سفر

قبائلی دور کی توسیع پسندی کے عمل کے نتیجے میں زرعی علاقے میں اضافے کے ساتھ زرعی پیداوار کے لیے انسانی قوت درکار تھی۔ ابتدا میں مفتوح علاقوں کے قبائل کو قتل کیا جاتا تھا اب انہیں غلام بنایا جانے لگا۔ آقا اور غلام کے طبقات نے جنم لیا اور علاقوں اور غلاموں کے حصول کے لیے جنگیں لڑی جانے لگیں۔ غلاموں کی تجارت شروع ہوئی۔ ذاتی ملکیت کا تصور مضبوط ہوتا گیا جس میں انسان بھی کسی جنس کی طرح، زمین کی طرح، آقا کی ملکیت تھے۔ غلامی کا یہ دور بھی کئی ہزار سال پر محیط ہے۔ اس دور میں جنگی سردار، بادشاہ اور

شہنشاہ بنتے گئے اور ریاستیں، مملکتیں اور سلطنتیں قائم ہوتی گئیں۔ انسان طبقات میں تقسیم ہو گیا۔ آقا و غلام، حاکم و محکوم، ظالم و مظلوم۔ ان حاکم طبقات کے خلاف کئی بار علم بغاوت بلند ہوا۔ کبھی یہ بغاوتیں کامیاب ہوئیں اور کبھی ان کو کچل دیا گیا۔ مگر ہر بار اس طبقاتی جدوجہد یا بغاوت کے نتیجے میں جو کامیاب ہوئی یا ناکام، حکمران طبقات کمزور ہوئے۔

انسان ابتدائی قبائلی اشتراکیت کے نظام سے نکل کر غلامی کے دور سے ہوتا ہوا جاگیرداری دور میں داخل ہوا۔ جاگیرداراور مزارع کے طبقات نے آقا اور غلام کے طبقات کی جگہ لے لی۔ پھر اٹھارویں اور انیسویں صدی میں سائنس کی ایجادات کے ساتھ پیداواری قوتوں میں مزید اضافہ ہوا۔ پہیئے، بھاپ اور مشین کی ایجاد یعنی آلات و وسائل پیداوار بدلے جس سے جاگیردار معاشرہ سرمایہ داری نظام میں داخل ہوا اور سرمایہ دار اور مزدور کے طبقات پیدا ہوئے۔ مگر معاشرے کی ان بنیادی تبدیلیوں اور ترقی کے منازل طے کرنے کی بنیاد ہمیشہ محنت اور پیداوار سے ہی وابستہ رہی ہے۔

جاگیرداری نظام دور غلامی سے ترقی یافتہ نظام تھا۔ اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام جاگیرداری اور بادشاہت کے خلاف اپنے وقت کا ایک ایسا ترقی پسند انقلاب تھا جس نے جاگیردارانہ معاشرے کے تینوں ستون ملوکیت، نوابیت یا بادشاہت اور کلیسائیت یا پاپائیت گرادیئے۔ پھر اشتراکیت یعنی سوشلزم کے نفاذ کی جدوجہد ہوئی۔ مزدوروں اور کسانوں نے شخصی املاک اور معاشی استحصال کے نظام کا خاتمہ کرتے ہوئے اجتماعی طریق پیداوار اور تقسیم پیداوار کا نظام نافذ کیا اور طبقاتی معاشرے اور استحصال کا خاتمہ کیا۔ اس طرح انسانوں کی مساوی خوش حالی اور ترقی کے لیے سوشلزم کا نظام معیشت سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے میں ترقی یافتہ نظام ثابت ہوا۔

سوویت یونین کی تباہی سوشلزم کی ناکامی نہیں

سوویت یونین کی تباہی کو سوشلزم کی ناکامی نہیں سمجھنا چاہیے۔ وہاں پر سوشلزم کی ناکامی نہیں ہوئی بلکہ وہاں کی حکمران جماعت کی ناکامی ہوئی جس نے سوشل سامراج کی

حیثیت اختیار کر لی تھی۔ دراصل یہ سوشل سامراج اور مغربی سامراج کا ٹکراؤ تھا جس میں سوشل سامراج کو شکست ہوئی۔ سوشل سامراج کی شکست کو سوشلزم کی شکست نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی اس کو مارکسزم کی شکست تسلیم کرنا چاہیے۔

سوویت یونین کے بکھر جانے سے جہاں پر جماعت اسلامی سے لے کر امریکہ اور سعودی عرب تک سب نے شادیانے بجائے وہیں وہ فیشن زدہ اشتراکی دانشور جو سوویت یونین کو اور سوشلزم کو ایک سمجھتے تھے ان کی سرخی زردی میں تبدیل ہوگئی اور وہ این جی اوز بنا کر امریکہ کی گود میں جا بیٹھے۔

لینن اور اس کے ساتھیوں نے روس میں جو اشتراکی معاشرہ قائم کیا تھا اور سٹالن نے جس کی تعمیر کی تھی۔ خروشیف اور اس کے ساتھیوں نے اس کو ترمیم پسندی کی راہ پر ڈالا، توسیع پسندی کی اور وہ سوشلسٹ ملک جس نے دنیا کو ہٹلر اور میسولینی جیسے فاشسٹوں سے بچایا تھا، سوشل سامراج کی شکل اختیار کر گیا۔

اسی سوویت یونین کے بارے میں ایک انگریز فلسفی C.M. Joad لکھتا ہے۔

''میں 1930ء میں روس گیا تو وہاں مساوات قائم کی جا چکی تھی۔ قصبات میں نہ امیر تھے اور نہ غریب، تمام شہری ایک سو اسی پونڈ سالانہ آمدنی پر گزر اوقات کرتے تھے۔ بالشویکیوں نے ایک ایسا معاشرہ قائم کر لیا تھا جہاں پر رقم کو معاشی قدر کی حیثیت سے ختم کر دیا گیا۔ وہاں اس دولت کا غرور جو اینگلو سیکسن اقوام کی خصوصیت ہے، کا نام و نشان تک نہیں تھا۔''

برٹرنڈ رسل نے اپنی کتاب New hopes for a changing world میں لکھا کہ ''اسلام کے علاوہ کسی نظریئے یا نظام کو ایسی حیرت ناک ترقی نصیب نہیں ہوئی جتنی کہ سوشلزم کو ہوئی۔''

دراصل جب پیداواری قوتوں میں اضافہ ہوتا ہے تو برسراقتدار طبقہ جو پیداواری وسائل کا مالک ہوتا ہے، وہ محنت کش کو اس اضافے سے فیض یاب ہونے سے روکتا ہے۔ طبقاتی کشمکش تیز ہوتی جاتی ہے، اضافی دولت چند افراد اور طبقات میں مرکوز ہوتی جاتی ہے،

سماج مالی بحران کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر یہ افراد اور طبقات جو کہ حکمران بھی ہوتے ہیں، اسی طرح کے دوسرے ممالک کے حکمرانوں کے ساتھ مل کر ایک ایسا عالمی معاشرتی نظام وضع کرتے ہیں، جو عالمی استحصال پر مبنی ہوتا ہے اور دنیا ظالم اور مظلوم یعنی دو دنیاؤں میں تقسیم ہوتی چلی جاتی ہے۔ جس کی واضح شکل آج ہمیں نظر آتی ہے۔

عالمی سامراج کے ہاتھ پیر

ظالم اکٹھے ہوکر عالمی سامراج کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اگرچہ ان کا آپس میں بھی مفادات کا ٹکراؤ ہوتا ہے اور یہ ٹکراؤ دنیا کے وسائل اور منڈیوں پر قبضے کی تقسیم پر ہوتا ہے مگر محنت کش مظلوم ومحکوم طبقات کے خلاف ان کا اتحاد قائم رہتا ہے۔

اپنے لوٹ مار کے نظام کو اخلاقی اور قانونی حیثیت دینے کے لیے اقوام متحدہ، سیکیورٹی کونسل، عرب لیگ، ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن، آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک جیسے عالمی ادارے قائم کئے جاتے ہیں اور ان کو مضبوط کیا جاتا ہے۔ جنگیں مسلط کر کے نیٹو کی افواج کے ذریعے تباہی کی جاتی ہے۔ پھر وقت اور حالات کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق یہ ادارے بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا لیگ آف نیشنز بنی اور پھر اس کا خاتمہ ہوا۔ حال ہی میں سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد غالباً 1992ء میں وارسا پیکٹ ختم کیا گیا جس کے ساتھ ہی نیٹو کو ختم ہو جانا چاہیے تھا مگر نیٹو کی ضرورت تھی اس لیے نہ صرف یہ کہ اس کو ختم نہیں کیا گیا بلکہ اس میں پولینڈ اور وارسا پیکٹ کے جتنے ممالک تھے، سب شامل کر لیے گئے۔ آج امریکہ دنیا پر نیٹو کے ذریعے اپنی جنگیں مسلط کرتا ہے اور نیٹو کو سامنے رکھ کر انسانوں کا قتل عام کرتا ہے۔

نیٹو، القاعدہ اور داعش جیسی مذہبی دہشت گرد تنظیمیں، اقوام متحدہ، سیکیورٹی کونسل، عرب لیگ، بادشاہتیں اور ان کی حاشیہ بردار حکومتیں، ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن، آئی ایم ایف، ورلڈ بینک، ملٹی نیشنل کمپنیاں اور این جی اوز وغیرہ عالمی سامراج کے ہاتھ پیر ہیں۔

ایک وقت تھا جب کہ یو ایس ایڈ کے ذریعے غریب اور پسماندہ ممالک میں

سامراج اپنے لیے کارندے اور ہمدرد خریدتا اور پیدا کرتا تھا اب یہی کام این جی اوز کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ سامراج پہلے عراق میں تیس لاکھ انسانوں کا قتل عام کرتا ہے اور دنیا بھر میں اپنے ہی قائم کردہ انسانی حقوق کے اداروں، این جی اوز کو وہاں بھیجتا ہے جو قتل عام کے بعد خوراک اور کپڑے لے کر سامراج کے تباہ کردہ ممالک میں انسانوں کی مدد کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔

چنانچہ ادارے اور ہتھکنڈے بدلتے رہتے ہیں مگر ہدف نہیں بدلتا اور وہ ہے پیداواری وسائل اور ذخائر پر سامراج کا قبضہ۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے آج مغربی ممالک حکومتوں کا تختہ الٹتے ہیں، نیو ورلڈ آرڈر لے کر آتے ہیں۔ بادشاہوں اور ڈکٹیٹرز کو پالتے ہیں۔ ان کی بقاء میں ان کی مدد کرتے ہیں۔ پاکستان میں ضیاالحق ہو یا عراق میں صدام حسین، مصر میں حسنی مبارک ہو یا تیونس میں زین العابدین یا ایران میں شہنشاہ رضا شاہ پہلوی، ان سب کو اس وقت تک قائم رکھتے ہیں جب تک ان کی ضرورت رہتی ہے۔ پھر تختے الٹتے ہیں۔ ان ممالک کے اندر سے ہی۔ ''جمہوریت کی خوبصورتی'' کی رٹ لگانے والے سیاسی شعبدہ باز ہر طرف سے برسات کے مینڈکوں کی طرح نکل آتے ہیں اور عوامی جمہوریت کی بجائے جاگیردارانہ، موروثی پارلیمانی ڈکٹیٹرشپ قائم ہو جاتی ہے۔

''جمہوریت کی خوبصورتی'' کے عنوان کے تحت قائم ہونے والی اس طرز کی حکومتوں کی تازہ ترین مثالیں پاکستان، افغانستان اور عراق کی ''منتخب حکومتیں'' ہیں۔ قطر، سعودی عرب، بحرین اور یمن جیسے فاشسٹ حکمران اس ''خوبصورتی'' سے لطف اندوز نہیں ہوتے۔ یہ شیوخ، بادشاہ اور ڈکیٹر نہ صرف پالے جاتے ہیں بلکہ انہیں اندرونی اور بیرونی خطرات سے محفوظ بھی رکھا جاتا ہے۔

پاکستان، افغانستان اور عراق کے حکمران طبقات یہ جانتے ہیں کہ بورژوا جمہوریت صنعتی معاشرت کی پیداوار ہے جو کہ انگلستان میں صنعتی انقلاب کے بعد قائم ہوئی۔ یہ جاگیردارانہ یا قبائلی سرداری نظام کی پیداوار نہیں ہے۔ بورژوا جمہوریت قبائلی یا جاگیرداری نظام کو ختم کئے بغیر قائم نہیں ہوسکتی۔ مگر یہ حکمران اپنی جاگیردارانہ پارلیمانی

آمریت کی ''خوبصورت جمہوریت'' کا مغربی صنعتی معاشروں کی جمہوریتوں کے ساتھ موازنہ کرتے اور عوام کو سبز باغ دکھاتے رہتے ہیں۔

پاکستان میں جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں کی حاکمیت ہے اور اس حاکمیت کو امریکی سامراج کی مکمل پشت پناہی حاصل ہے۔ پاکستان کی استحصالی پارلیمنٹ میں مزدوروں اور کسانوں کا ایک بھی نمائندہ نہیں جبکہ یہ ملک کی آبادی کا ستر فی صد ہیں۔ چنانچہ اس طرح کی ''جمہوریت کی خوبصورتی'' پاکستان کے استحصالی طبقوں کو لوٹ مار کی خوبصورتی مہیا کرتی ہے اور جب یہ عناصر آپس میں چھینا جھپٹی کی بنیاد پر عنان حکومت نہیں سنبھال سکتے تو فوج خود اقتدار میں آجاتی ہے اور اس کو بھی امریکی سامراج کی مکمل حمایت حاصل ہوتی ہے۔

پاکستان میں پچھلے 67 سالوں میں جنرل ایوب خان کا دورِ حکومت 1958ء سے 1969ء تک رہا۔ پھر یحییٰ خان کا مارشل لا۔ اس کے بعد جنرل ضیاالحق کا بھیانک دور 1977ء سے 1988ء تک، اور پھر جنرل پرویز مشرف کے ہاتھ میں 1999ء سے 2008ء تک عنان حکومت رہی۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور کے چند ابتدائی سالوں کے علاوہ ان تمام 67 سالوں میں تمام سول حکومتیں بھی پاکستانی فوج اور امریکی سامراج کا سول فرنٹ تھیں۔

آج مغربی استعماری طاقتیں، جمہوریت کے نفاذ کا ڈھول بجاتے ہوئے ان تمام ممالک میں جہاں جہاں ان کا مفاد ہے، اس ''خوبصورت جمہوریت'' کے نفاذ کے لیے جنگیں مسلط کر رہی ہیں۔ لیبیا ہو یا عراق یا شام لاکھوں انسانوں کی لاشوں پر سامراج کی اس ''خوبصورت جمہوریت'' کے محل تعمیر ہو رہے ہیں۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر نسل انسانی کی تباہی کرنے والے، ویت نام میں نیپام بم جیسے ہزاروں بموں کا استعمال کرنے والے، دوہرا معیار رکھنے والے، یہ تمام قاتل اور لٹیرے جو خود نہ صرف ایٹم بم رکھتے ہیں بلکہ اس کا استعمال بھی کرتے ہیں پاکستان، شمالی کوریا اور ایران کے ایٹمی پروگرام کے خلاف محاذ قائم کرتے ہیں مگر اسرائیل جس کے پاس سینکڑوں کی تعداد میں ایٹم بم ہیں، اس کو نظر انداز کرتے ہیں۔

سامراج کے تابع حکمران طبقات کو مغربی استعمار کے اس دوہرے معیار کا پیغام یہ ہے کہ اگر حکمرانی میں رہنا ہے تو ہماری وفاداری اور ہمارے مفادات کی نگرانی اور ان کا تحفظ کرنا بنیادی شرائط ہیں۔ پاکستان کے حکمران طبقات کو یہ پیغام بہت جلد سمجھ میں آتا ہے اور انگریز کے پیدا کردہ اس غلام ابن غلام ابن غلام طبقے کے افراد ہاتھ باندھ کر خدمت کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں بھی سیاسی مہم باز جنہیں سامراج تلاش کرتا ہے یا ان کی تخلیق کرتا ہے، سامراج کے گماشتے کے طور پر حکمران بنتے ہیں اور ان کی حکمرانی کی بقاء بھی سامراج کی خوشنودی پر رہتی ہے۔ یہ لوگ اپنے ذاتی مفادات کے لیے ملک وقوم کے اجتماعی مفادات کو قربان کرنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتے۔ لوٹ مار سے حاصل کی ہوئی دولت اور اپنی اولاد کو ملک سے باہر رکھتے ہیں۔ 'حکومت کون کرے گا' سے لے کر بجلی کے نرخ کیا ہوں گے تک کا فیصلہ عالمی سامراج کرتا ہے۔ ان بھاری قرضوں کی ادائیگی کا بوجھ عوام نسل در نسل اٹھائے پھرتے ہیں۔ موقع پرست سیاست دان ''جمہوریت کی خوبصورتی'' کا راگ الاپتے رہتے ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد ''مارشل لا کی خوبصورتی'' اور اس سے پہلے ''انگریز کی حکمرانی کی خوبصورتی'' کی دھنیں بجایا کرتے تھے۔

ایک وقت تھا جب پاکستان میں فوجی آمریت امریکہ کی ضرورت تھی۔ اب سول آمریت اس کی ضرورت ہے۔ اس کے برعکس ہم نے اپنی زندگی میں ہی جمال عبدالناصر، سوئیکارنو، احمد بن بلا، بومدین، کم ال سنگ، ہوچی منہ، ماؤزے تنگ اور امام خمینی جیسے رہنماؤں کو بھی دیکھا ہے جنہوں نے سامراج اور اس کے اندرونی اور بیرونی گماشتوں کے خلاف جدوجہد کی اور ملک وقوم کو معاشی اور سیاسی غلامی سے آزاد کروایا۔

ہم نے اپنے زمانے میں ہی دیکھا ہے کہ فیڈل کاسترو بھی جنم لیتے ہیں۔ جب کاسترو نے چی گویرا جیسے سوشلسٹ ساتھیوں کے ساتھ مل کر مسلح جدوجہد کے ذریعے کیوبا کے عوام کو سامراج کی غلامی سے آزاد کروایا، اس وقت کیوبا کی شوگر انڈسٹری میں امریکہ نے ایک ارب بیس کروڑ ڈالر کی سرمایہ کاری کر رکھی تھی اور تمام تمباکو اور سگار کی صنعت پر امریکہ

کے صنعت کاروں کا قبضہ تھا۔ کاسترو نے گنے اور تمباکو کی صنعت کو قومی ملکیت میں لے کر غیر ملکی مالکان کو اپنی سرزمین سے بھگایا اور ان صنعتوں کا پھل عوام تک پہنچایا۔ میں نے کیوبا میں اپنے دورے کے دوران ان مقامات کو دیکھا ہے جہاں سے سامراج دم دبا کر بھاگا تھا۔ اور وہ کشتیاں ابھی تک محفوظ ہیں جن کے ذریعے فیڈرل کاسترو، راہول اور چی گوویرا نے گوریلا کاروائیاں کی تھیں۔ کاسترو کو قتل کروانے اور اس کی حکومت کا تختہ الٹنے کی امریکہ مسلسل کوشش کرتا رہا اور آج بھی راہول کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

الاندے کے اقتدار میں آنے تک چلی کی لوہے، تانبے اور کوئلے کی کانوں پر امریکی سرمایہ کاروں کا قبضہ تھا۔ جب الاندے نے سوشلزم کے نفاذ کی راہ ہموار کی اور قومی وسائل کو قومیانے کا عمل جاری ہوا تو سی آئی اے نے سازش کر کے اسے قتل کروا دیا اور فوجی ڈکٹیٹر جنرل پنے شے کو ملک پر مسلط کر دیا۔

پاکستان کو نیوکلیئر طاقت بنانے کی پاداش میں بھٹو صاحب کا عدالتی قتل ہوا اور ملک پر ضیاالحق جیسے ڈکٹیٹر کو مسلط کیا گیا۔ امریکہ ابھی تک پاکستان کے جغرافیائی محل وقوع، بلوچستان کے بے شمار معدنی ذخائر اور پاکستان کے ایٹم بم کو اپنی مکمل گرفت میں کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

بولیویا کو، جس کے جنگلوں میں چی گویرا کو سی آئی اے نے گولیوں سے چھلنی کیا تھا، امریکہ نے کروڑوں ڈالر کے قرضوں میں جکڑ کر اس کے قلعی کے ذخائر پر قبضہ کئے رکھا تا آنکہ عوامی سوشلسٹ تحریک نے وطن فروشوں اور سامراج کے گماشتوں سے نجات حاصل کی۔

پھر وینزویلا جہاں پر دنیا کا تیسرا سب سے بڑا تیل کا ذخیرہ ہے، سامراج کے زیر تسلط رہا۔ مگر ہیوگو شاویز نے عوام کی طاقت کے ذریعے انقلاب برپا کیا اور تمام غیر ملکیوں سے ملک کو آزاد کروایا اور تیل کے ذخائر ملک اور قوم کے استعمال میں آئے۔ امریکہ کئی بار کوشش کرتا رہا کہ شاویز کی حکومت کو ختم کروا سکے۔ ایک بار فوجی جرنیلوں کے ذریعے بھی اس کا تختہ الٹوایا گیا مگر چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر جونیئر آفیسرز اور عوام نے مل کر ان

جرنیلوں کا منصوبہ ناکام بنایا اور شاویز کی حکومت بحال ہوئی۔ شاویز کے پچھلے سال انتقال کے بعد نیکولس ماڈیرو کے خلاف سازشیں جاری رہیں۔

شاہ کے زمانے میں ایران کا تیل اسرائیل، ساؤتھ افریقہ کی نسلی امتیاز کی اپارتھائیڈ حکومت اور امریکہ کے زیر تسلط تھا۔ ایران میں چالیس ہزار امریکی موجود تھے۔ شاہ آف ایران مشرق وسطیٰ میں امریکہ اور اسرائیل کے مفادات کا محافظ تھا مگر انقلاب ایران نے امام خمینی کی قیادت میں ملک کو نہ صرف عالمی سامراج سے آزادی دلائی بلکہ دیگر مسلم ممالک کے عوام کو جدوجہد کا حوصلہ ہوا۔ ایران کا تیل اور دیگر قدرتی وسائل پر غیر ملکی قبضہ ختم ہوا۔ چالیس ہزار امریکیوں کو بھاگنا پڑا اور عوام کی طاقت اور امام خمینی کی قیادت نے نو سال تک مغربی استعمار کی جانب سے عراق کے صدر صدام حسین کے ذریعے مسلط کی گئی جنگ کا نہ صرف مقابلہ کیا بلکہ یہ جنگ جیتی۔ عوام نے معاشی وسیاسی آزادی حاصل کی۔

ان تمام ممالک میں آج ''خوبصورتی'' والی نہیں بلکہ عوامی جمہوریت قائم ہے اور قومی وسائل قوم کے اختیار اور استعمال میں ہیں۔ معاشی پابندیوں کے باوجود ایران مشرق وسطیٰ کی وہ طاقت بن چکا ہے جس سے نہ صرف اسرائیل اور سعودی بادشاہت کو خطرہ ہے بلکہ مشرق وسطیٰ کے شیوخ اور ڈکٹیٹرز کو بھی اپنی بقاء خطرے میں نظر آرہی ہے۔ اسی وجہ سے سعودی عرب اور امریکہ اس خطے میں موجود بحرین، یمن، قطر اور اردن جیسے ممالک میں اپنے حواری حکمرانوں کے ساتھ مل کر ایران کو گھیرنا چاہتے ہیں اور اس کوشش میں ہیں کہ ایران پر ایک بار پھر مغرب نواز حکومت قائم ہو جائے۔

عالمی سامراج کے کتنے ہاتھ پیر ہوتے ہیں اور کس طرح دوسری اقوام کو اپنے شکنجے میں جکڑتا ہے اس کا علم حاصل کر کے ہی اس سے آزادی حاصل کرنے کا راستہ ڈھونڈا جا سکتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ تاریخ عالم کا مطالعہ کیا جائے۔ بالخصوص ان اقوام کی تاریخ ضرور پڑھی اور سمجھی جائے جنہوں نے آزادی کے لیے جدوجہد کی اور آزادی کو حاصل کیا۔ یہ مطالعہ سائنسی انداز فکر کو اپنا کر کیا جائے تو اپنے مستقبل کا اور اپنی جدوجہد کے راستے کا تعین کرنا آسان ہو سکتا ہے اور تاریخ کی بہت سی الجھی ہوئی گتھیوں

کو کھولنا اور سمجھنا بھی آسان ہو سکتا ہے۔

کراچی کے سٹڈی سرکل جاری تھے۔ جن کی وجہ سے بہت سی گتھیاں میرے لئے کھل گئیں۔ میں نے کراچی یونیورسٹی میں ایم۔اے انٹرنیشنل ریلیشنز اور شام کے وقت لاء کالج میں داخلہ لے لیا۔ فلمی دنیا کے دوستوں کے ساتھ ایسٹرن سٹوڈیوز میں بھی جانا رہتا۔ دکھی پریم نگری سے لے کر وحید مراد تک منیر اور مقصود سے لے کر شیخ حسن، ندیم اور این کے زیری تک سب ہی اپنے اپنے خیالات میں ترقی پسند اور وطن دوست تھے۔ سٹوڈیوز سے نکل کر رات کے پچھلے پہر بندو خان کے کباب کھانے کے لیے کاروں کی لمبی لمبی قطاروں میں ہم بھی ہوتے۔ جیکب لائنز کے کواٹروں کے کونے پر اس کا ایک چھوٹا سا کھوکھا تھا اور سینکڑوں چاہنے والے۔ مگر ابھی تک سرگودھا کی گرمیوں کے طویل دوپہر کے سناٹے، شام کو صحن میں پانی چھڑک کر بچھائی جانے والی بان کی چارپائیاں، جاڑوں کی رات کے سرد اندھیرے، برسات کی بھیگی شامیں، جب یاد آتیں تو طبیعت گھنٹوں اداس رہتی۔ یہ نسٹلجیا بھی ایک عجیب شے ہے۔

ان دنوں سید محمد تقی روزنامہ جنگ کے ایڈیٹر تھے اور کارل مارکس کے داس کیپٹیال کا ترجمہ اردو میں کر رہے تھے۔ ابھی میری کلاسز شروع نہیں ہوئی تھیں۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو بہت خوش ہوتے۔ کبھی کبھی ترجمے کا کچھ حصہ بھی سننے کو مل جاتا۔ داس کیپٹیال بجائے خود بے حد مشکل اور اس پر تقی صاحب کی اردو، مگر کچھ نہ کچھ پلے پڑ ہی جاتا۔ سید محمد تقی، رئیس امروہوی اور جون ایلیا کے بڑے بھائی تھے۔

شوکت صدیقی روزنامہ انجام کے ڈپٹی ایڈیٹر تھے۔ وہ میرے سرگودھا کے زمانے کے دوست اکرام کے بہنوئی تھے۔ اکرام ان دنوں ناظم آباد میں شوکت صاحب کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ وہ کرائے کے مکان میں رہتے تھے جو میرے گھر کے قریب تھا۔ ان کے ساتھ ہفتہ وار ملاقات ایک معمول سا بن گئی۔ ان دنوں شوکت صاحب کے گھر کی تعمیر نارتھ ناظم آباد میں ہو رہی تھی اور وہ ''خدا کی بستی'' کے مصنف کی حیثیت سے اپنی شہرت کی بلندیوں پر پہنچ کر ''جانگلوس'' لکھنے میں مصروف تھے اور چین کے انقلاب اور ماؤزے تنگ

سے بے حد متاثر تھے۔ میرے اور ان کے درمیان اکرام کے علاوہ اشتراکی نظریات کا رشتہ بھی قائم ہو گیا، جو ان کی وفات تک جاری رہا۔ وہ ان دنوں قومی آزادی کی تحریکوں پر بھی کام کر رہے تھے۔

دو عالمی جنگوں کے درمیان کے عرصے میں بالخصوص اکتوبر 1917ء کے انقلاب روس کے بعد دنیا بھر میں اشتراکی نظریات کے پھیلاؤ اور قومی آزادی کی تحریکوں نے جو زور پکڑا تھا اس کا مطالعہ اور اس پر لکھنے کا کام پاکستان میں کسی نہ کسی شکل میں جاری تھا۔ دنیا امریکی بلاک اور روسی بلاک میں تقسیم تھی مگر چین کے عوامی انقلاب کا اثر پاکستان میں شدت سے محسوس کیا جانے لگا تھا۔ دنیا بھر میں ہونے والی قومی آزادی کی تحریکوں کے اثرات بھی مرتب ہو رہے تھے۔ بنڈونگ کانفرنس اور اس میں متحرک رہنماؤں نے بھی ترقی پسندوں کو متاثر کیا ہوا تھا۔ جمال عبدالناصر، چو این لائی، سوئیکارنو، بن بلا، بومدین، بورقیبہ کی شخصیات ترقی پسند نوجوانوں کے لئے اجنبی نہیں تھیں اور نہ ہی ان کی جدوجہد سے ہم فکری اعتبار سے غیر وابستہ تھے۔

لومبا کا قتل ہو یا ویت نام پر مسلط کی جانے والی جنگ، ترقی پسند طالب علم بالخصوص این ایس ایف سے وابستہ طالب علم سڑکوں پر نکل کر احتجاج کرتے اور دنیا بھر کی آزادی کی تحریکوں کے ساتھ یک جہتی کا اظہار کرتے۔ مشرقی پاکستان کے طالب علم ہم سے آگے تھے۔ حکمرانوں اور اسلام پسندوں کے لئے اس سارے عمل اور ماحول کا ہضم کرنا ہمیشہ کی طرح مشکل رہتا۔ پکڑ دھکڑ ہوتی۔ زیر زمین کام میں اضافہ ہو جاتا اور اس کے ساتھ ہی جدوجہد کے جذبے میں بھی۔ سب دوستوں کے گھر سب کے لئے محفوظ پناہ گاہیں تھیں۔ ان کے والدین کی شفقت اور محبت کی گرمی آج تک میرے دل و دماغ میں محفوظ ہے۔ اگر کبھی کوئی پکڑا جاتا تو اندر سے مخبری کرنے والے کی وجہ سے۔ مخبری کرنے والے یہ طالب علم جاسوس، بعد میں اسمبلیوں کے ممبر بھی بنے اور انہوں نے کئی حکومتوں میں وزارتوں کے مزے بھی لوٹے۔

قومی آزادی کی تحریکیں
جنہوں نے میری نسل کو متاثر کیا

دوسری عالمی جنگ تک قومی آزادی کی تحریکوں نے بہت زیادہ کامیابیاں حاصل نہیں کی تھیں مگر اس جنگ میں قومی آزادی کی تحریکوں نے ایک یا دوسرے اتحادی کے ساتھ حصہ ضرور لیا تھا اور اس جنگ کے اختتام پر جب امپیریلزم بالخصوص برطانیہ کا بطور عالمی طاقت زوال ہوا اور سوویت یونین فاشزم سے پوری دنیا کو بچانے کے بعد ایک نئی عالمی طاقت کے طور پر ابھرا تو ان تحریکوں میں مزید جان پڑی۔ 1945ء میں جاپان کی شکست سے ویت نام اور چین میں آزادی کی جدوجہد تیز ہوئی۔ سوئیکارنو نے انڈونیشیا کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ چین کی آزادی کی جنگ، کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں کسانوں اور دہقانوں نے، جس کی قیادت مزدور طبقہ اور دانشور کر رہے تھے، لڑی اور جیتی۔ برصغیر میں آزادی کی لہر نے زور پکڑا۔ مصر، جہاں پر شاہ فاروق سامراجی مفادات کا تحفظ کر رہا تھا، جمال عبدالناصر نے نومبر 1954ء میں اس کا تختہ الٹ کر قومی حکومت قائم کی۔ 1956ء میں سوویت یونین کی مدد سے نہر سویز جو کہ مغرب کی شاہ رگ تھی اور ہے اس کو قومی تحویل میں لے لیا اور آنے والے چودہ سال ناصر کی عرب نیشنلزم کے عروج کے سال تھے۔

عرب نیشنلزم ایک سیکولر سامراج مخالف، عرب قومی پرستی کی تحریک تھی۔ اس دوران امریکہ جو کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد عالمی سامراج کی جگہ لے چکا تھا، اس نے رجعت پسند مذہبی رہنماؤں، بادشاہوں اور شیوخ کی مدد سے اس ترقی پسند سیکولر تحریک کو ختم

کرنا چاہا مگر چند کو چھوڑ کر عرب ممالک مغربی استعمار سے آزادی حاصل کرتے چلے گئے۔

1956ء میں فرانسیسیوں کے خلاف ویت نام کی فتح، سامراجیت کے خلاف 1959ء کا فیڈل کاسترو اور چی گویرا کا کیوبا کا انقلاب اور 1962ء میں بن بلا کا الجیریا کا انقلاب، ان سب نے دنیا میں نہ صرف ابھی تک موجودہ باقی کالونیوں کے عوام کو حوصلہ بخشا بلکہ امریکہ کے اپنے اندر بھی انسانی حقوق کی تحریکوں کو تقویت ملی۔ وہ کالے جو غربت اور نسل پرستی کا شکار تھے اور جن تک امپریلزم سے حاصل شدہ فوائد نہیں پہنچے تھے، ان میں بھی مضبوط تحریکوں نے جنم لیا۔

عالمی سامراج بننے سے پہلے اور بیسویں صدی کے شروع تک امریکہ خود آزادی کی تحریکوں کا حامی تھا اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امریکی سرمائے کو ان یورپین کالونیوں تک پہنچنے میں دشواری تھی جو کہ سستی محنت اور خام مال مہیا کرتی تھیں۔ نئے نوآبادیاتی نظام کے اس سربراہ نے ان منڈیوں پر معاشی نظام کے ذریعے قبضہ کرنا شروع کیا اور منافع بخش استحصالی نظام پر جدید امپیریلزم کی بنیاد رکھی۔

یورپی ممالک کی ناکامی اس کے حق میں جاتی رہی۔ امریکہ نے اس معاشی جنگ میں فوجی جنگوں کو بھی شامل کر لیا۔ 1956ء میں ویت نام جنگ اور کیوبا کا محاصرہ اس کے ابتدائی اقدامات ہیں۔

قومی آزادی کی تحریکیں جن کا بنیادی مقصد بیرونی آقاؤں اور غیر ملکی حاکمیت سے آزادی حاصل کرنا تھا، روس کے انقلاب سے متاثر ضرور تھیں مگر ہر ایک نے سوشلسٹ انقلاب کا راستہ اختیار نہیں کیا کیونکہ آزادی کی تحریک اور مزدوروں کی حاکمیت کی تحریک میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ سارا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ قومی آزادی کی تحریک کی رہنمائی کس کے ہاتھ میں ہے۔ قیادت قومی بورژوا کے پاس ہے یا پرولتاریہ کے پاس۔

جس طرح امریکہ میں غلامی کے خاتمے کی مادی وجوہات تھیں یعنی غلام کو رکھنے کا خرچ بھی تھا اور جبری مشقت سے پیداوار بھی اتنی مقدار میں حاصل نہیں ہوتی تھی جتنا کہ بظاہر ان کو آزادی دے کر، گھنٹوں کی اجرت پر رکھ کر، جدید آلات کے ذریعے اور قومی

بورژوازی کے ذریعے پیداوار کو منظم کر کے حاصل ہوتی تھی۔ چنانچہ غلاموں کو جسمانی آزادی ملی اور انہیں کچھ انسانی حقوق میسر آئے۔ بالکل اسی طرح یورپی امپیریلزم کے لیے کالونیوں کو پرانے انداز میں چلانا جبکہ دوسری عالمی جنگ میں ان کی کمر ٹوٹ چکی تھی، مشکل بھی تھا اور منافع بخش بھی نہیں تھا۔ چنانچہ قومی آزادی کی تحریکیں آزاد ممالک قائم کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ مگر امریکہ نے جب جدید سامراج کی جگہ لے لی تو وہ ممالک جو آزادی حاصل کرنے کے بعد اشتراکی نظام معیشت اور عوامی حاکمیت کو اختیار نہیں کر سکے، اس حاصل کردہ آزادی کو محفوظ نہیں رکھ سکے اور بہت جلد امریکہ کے آئی۔ ایم۔ ایف، ورلڈ بنک اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائیزیشن جیسے اداروں کے ذریعے وضع کردہ نئے معاشی نظام کی غلامی میں چلے گئے۔ اور آج تک نیو ورلڈ آرڈر کا شکار ہیں۔

وہ ممالک جنہوں نے امریکہ کے اس نئے کردار کو تسلیم نہیں کیا، انہوں نے اپنی سیاسی، فوجی اور معاشی وابستگیاں سوویت یونین کے ساتھ جوڑ لیں۔ اس طرح دوسری عالمی جنگ کے بعد دنیا دو دنیاؤں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک کا سربراہ امریکہ اور دوسری دنیا کا سربراہ سوویت یونین۔

چین میں ہونے والا سوشلزم کا تجربہ ہمارے قریب تھا

ہم چینی انقلاب سے متاثر تھے

سٹالن کے بعد جب سوویت یونین نے بھی سوشل سامراج کی شکل اختیار کر لی تو اب چین میں ہونے والا تجربہ وہ واحد تجربہ تھا جس پر میری طرح ان تمام اقوام اور افراد کی نظریں لگی ہوئی تھیں جو ان دونوں سامراجوں کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ پاکستان جیسے ملک کے لیے چین میں ہونے والا اشتراکی نظام کا تجربہ پاکستان کے معروضی حالات کے بہت قریب تھا۔ اس لیے کہ چین جاگیردارانہ نظام سے سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں جائے بغیر ہی سوشلزم کے نظام معیشت میں گیا تھا چنانچہ چین کے انقلاب اور ماؤزے تنگ کو پاکستان میں سنجیدگی اور

مقبولیت کے ساتھ سمجھا جا رہا تھا۔ حکمران طبقات بہر حال امریکہ کے حواری تھے مگر معاشی انقلاب اور عوامی حاکمیت پر یقین رکھنے والے افراد اور گروہ چین کا مطالعہ کر رہے تھے۔

انقلاب چین اور ماؤزے تنگ کے بارے میں خدشات

ہم سب چین نواز تھے۔ طفیل عباس کو 1966ء میں حکومت چین کی جانب سے سرکاری مہمان کی حیثیت سے اکتوبر انقلاب کی تقریبات میں شرکت کے لئے بلایا گیا۔ چین سے واپس آ کر انہوں نے چین کے انقلاب اور ماؤزے تنگ کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کیا جس کو اس وقت ہم میں سے کوئی بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب ''صبح کی لگن'' میں اس طرح کیا ہے۔

''چین میں میرا قیام 18 روز تک رہا۔ اِس دوران متعلقہ چینی حکام سے ہر موضوع پر سیر حاصل گفتگو رہی۔ یہ دور ثقافتی انقلاب کا تھا۔ صدر لیوشاوچی کے خلاف مہم زوروں پر تھی، یہاں تک کہ اُن کی لکھی ہوئی کتابیں بھی معتوب ٹھہریں۔ بہر حال وہاں میری معلومات میں کافی اضافہ ہوا۔ بہت سے سوالات ایسے تھے جن پر ذہن صاف نہیں تھا۔ میں نے وہ سوالات چینی دوستوں کے سامنے رکھے اور ان پر تفصیلی گفتگو کی اور تمام باتیں لکھ کر بھی اُن کے حوالے کیں، مثلاً یہ کہ پاکستان میں جو بھی حکومت برسرِ اقتدار آتی ہے، چینی حکومت اُس کو اچھا کہہ دیتی ہے۔ پاک چین دوستی اپنی جگہ، مگر استحصالی طبقوں کی نمائندہ حکومتوں کے کردار کا تجزیہ کرنا بہت ضروری ہوتا ہے تا کہ بین الاقوامی سطح پر، اور خود چین کے لوگوں کو اُن کے کردار سے آگاہی ہو سکے۔ ''پیکنگ ریویو'' ہفتہ وار رسالہ جو بیجنگ سے نکلتا تھا، وہ بین الاقوامی سوچ کا آئینہ دار کہلاتا تھا، اس میں ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے بارے میں بالکل مختلف رویہ اختیار کیا جاتا، حالانکہ طبقاتی طور سے دونوں میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ پھر پاکستان میں ہونے والے واقعات اور استحصالی جبر واستبداد کے بارے میں کبھی اس رسالہ میں نہیں لکھا گیا، بلکہ ہر موقع پر حکومت پاکستان کی تعریف کی جاتی رہی، یہاں تک کہ ایوب خان کی بنیادی جمہوریت کی بھی تعریف کی گئی۔ میں نے اپنی

بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ جب ہند۔چینی بھائی بھائی کا دور تھا، اُس وقت ہندوستان کی رجعت پسند حکومت کا تجزیہ بھی نہیں کیا گیا، مگر جب 1962ء میں چین اور ہندوستان کے درمیان سرحدی تنازعہ کا آغاز ہوا اور اختلاف بڑھا، تو ہندوستان کی حکومت کے بارے میں، پیکنگ ریویو میں ہی لکھا گیا کہ وہ ایک رجعت پسند، جاگیردارانہ گماشتہ اور سرمایہ دارانہ حکومت ہے۔ اِس رسالہ میں پاکستان کی حکومت کا کبھی طبقاتی تجزیہ نہیں کیا گیا چاہے وہاں مارشل لا ہو، فوجی سربراہ ہو، یا کوئی رجعت پسند حکومت، اُسے اچھا ہی کہا جاتا ہے۔

''میں ان پر واضح کرنا چاہتا تھا کہ پیکنگ ریویو کا انداز Bucharest سے نکلنے والے پرچے For Lasting Peace of People'sDemocracy کی طرح ہونا چاہیے۔ اس رسالے سے اگرچہ ہمارا کوئی رابطہ نہیں تھا مگر جب 1954ء میں پاکستان میں ترقی پسندوں کی گرفتاریاں ہوئیں، تو اس پرچے نے ان کے بارے میں خبریں شائع کیں جس سے بین الاقوامی سطح پر ان گرفتاریوں اور گرفتار ہونے والوں کے بارے میں معلومات پہنچیں۔ میں نے بتایا کہ پاکستان میں مختلف حکومتوں کے دور میں، ہم پر بہت ظلم وتشدد ہوا، یہاں تک کہ ہمارے ساتھی حسن ناصر کو لاہور قلعہ میں مار دیا گیا مگر پیکنگ ریویو میں اس کا ذکر تک نہیں ہوا۔ ہمارے اس تجزیہ کے جواب میں چینی حکام کا موقف تھا کہ جن ممالک سے ان کی دوستی ہے اُن کے ساتھ، اُن کی دوستی کا رویہ پنج شیل اُصولوں کی بنیاد پر ہوتا ہے اور ان ممالک میں بھی چین کی ہمدردیاں، وہاں کی ترقی پسند طاقتوں کے ساتھ ہوتی ہیں۔

''انڈونیشیا اور چین کے تعلقات کے بارے میں میرا سوال تھا کہ صدر سوئیکارنو اور ان کی حکومت سے ان کی دوستی کس نوعیت کی تھی جبکہ وہاں کی انقلابی پارٹی کے سیکرٹری ڈی این ایڈٹ سے بھی صدر سوئیکارنو کے تعلقات تھے۔ ڈی این ایڈٹ، حکومتی جلسے جلوسوں میں صدر سوئیکارنو کو انڈونیشیا کا سپوت کہتے تھے، اس طرح وہ صاف طور پر ترمیم پسندی کا شکار تھے، مگر پیکنگ ریویو میں اُن کو اور پارٹی کو، انقلابی بنا کر پیش کیا گیا اور صدر سوئیکارنو کے ساتھ ان کے تعلقات کو سراہا گیا۔ میں نے بتایا کہ ہم لوگ اس تجزیہ سے قطعی

اتفاق نہیں کرتے تھے۔ جب انڈونیشیا میں فوجی آمریت قائم ہوئی جس کے نتیجے میں وہاں لاکھوں لوگ مارے گئے، تو پیکنگ ریویو میں انڈونیشیا کی انقلابی پارٹی کی غلطیوں کا جو تجزیہ شائع ہوا وہ درست تھا اور ہمیں اس تجزیہ سے مکمل اتفاق تھا، اس بنا پر اپنے کارکنوں کی تربیت کے لئے ہم نے یہ خصوصی مضمون اردو میں ترجمہ کر کے منشور رسالے میں چھاپا۔
چین کے ثقافتی انقلاب کے بارے میں، میں نے انہیں بتایا کہ ہماری رائے میں یہ درست ہے، مگر اس بات کا تجزیہ ہونا چاہیے تھا کہ صدر لیوشاوچی کی کتابیں، جو کل تک صحیح تھیں اور جنہیں بین الاقوامی معاملات کو سمجھنے کے لئے پڑھنا ضروری سمجھا جاتا تھا، ایک دم ترمیم پسندی کا مظہر کیسے ہوگئیں۔ ہم سمجھتے تھے اس کا مکمل تجزیہ ہونا چاہیے تھا، تاکہ آئندہ اس طرح کی کسی بھی ممکنہ صورتحال سے بچا جاسکے۔ ان باتوں پر بھی وہ زیادہ تر خاموش رہے۔

''ایک اور اہم موضوع جس پر میری چین میں متعلقہ لوگوں سے بات ہوئی وہ ''تیسری دنیا'' کا موضوع تھا، جس پر ہم ذہنی طور سے صاف نہیں تھے۔ غیر جانبدار دنیا کے خالق، مارشل ٹیٹو کے خلاف پیکنگ ریویو میں مضامین آتے رہتے تھے اور ہم مارشل ٹیٹو کے کردار کے بارے میں ان تجزیوں سے اتفاق کرتے تھے۔ مگر ہمیں غیر جانبدار دنیا اور تیسری دنیا میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آیا، ماسوائے اس کے کہ غیر جانبدار دنیا میں ٹیٹو کا عمل دخل تھا اور تیسری دنیا کے خالق چیئرمین ماؤ تھے۔ ہمارے خیال میں تیسری دنیا کے حکمران طبقات بھی کسی نہ کسی طور، سپر پاورز کے ہی دست نگر تھے۔ اس مسئلہ پر بھی ہمیں ان سے کوئی خاطر خواہ اور تسلی بخش جواب نہ مل سکا۔

''اسی دوران وہاں کے متعلقہ حضرات سے جو میری گفتگو ہورہی تھی، اس میں روس کے بارے میں ان کے موقف سے نظریاتی طور پر پورا اتفاق تھا کہ روس سوشل سامراج ہے۔ ثقافتی انقلاب کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بہت سی باتوں پر ذہن الجھ بھی گیا۔ دو ایک باتوں پر تو میں نے متعلقہ افراد سے بات بھی کی، جیسے کہ صدر لیوشاوچی اور چین کے وزیر خارجہ کے متعلق ایک دم حکومتی رویہ کا مکمل تبدیل ہونا۔ مگر ان باتوں پر اُن کی طرف سے کوئی معقول جواز یا جملہ نہ آیا۔

’’چین میں قیام کے دوران بہت سی ایسی باتوں کا بھی مشاہدہ ہوا جن کو ذہن قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا، مگر میں نے متعلقہ حکام سے اس بارے میں کوئی ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ چیئر مین ماؤ سے مجھے بہت عقیدت تھی اور ان کے افکار سے ذہن متاثر تھا۔ اُس وقت بین الاقوامی سطح پر ہم انہیں انقلاب کا نقیب تصور کرتے تھے۔ مگر چین میں جو شخصیت پرستی کا مظاہرہ دیکھا، وہ بہت غیر سائنسی اور ذہن کو الجھا دینے والا تھا۔ چیئر مین ماؤ کے بھجن اور گیت گائے جا رہے تھے، باجے، ڈھول وغیرہ سب پاکستان اور ہندوستان کے لوگوں کا سا انداز لگ رہا تھا۔

’’یکم اکتوبر 1966ء کو، 25 لاکھ کی ریلی کو میں سیڑھیوں پر کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا۔ صبح 10 بجے سے کھڑے کھڑے میں تھک گیا۔ ہاتھ میں ایک اخبار تھا، سوچا کہ اخبار کو بچھا کر اس پر بیٹھ جاؤں مگر چونکہ اُس پر چیئر مین ماؤ کی تصویر چھپی ہوئی تھی، اس لئے ایسا کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ جو صاحب میری رہنمائی پر مامور تھے انہوں نے شاید میری کیفیت کو بھانپ لیا، اس لئے خود ہی اخبار بچھا دیا تاکہ میں اس پر بیٹھ جاؤں۔

’’مجھے ریڈ گارڈز کی اس ریلی نے بہت متاثر کیا۔ دس لاکھ ریڈ گارڈز کا تعلق صرف بیجنگ شہر سے تھا، باقی ملک کے دوسرے حصوں سے آئے ہوئے تھے۔ دل کو چھو لینے والا منظر تھا۔ چیئر مین ماؤ جس چبوترے پر کھڑے تھے، وہ ہماری سیڑھیوں سے ذرا اُوپر تھا۔ چیئر مین ماؤ کے ساتھ چینی کمیونسٹ پارٹی کے دیگر افراد بھی کھڑے تھے۔ اپنی جگہ سے میں تمام منظر کو بہت اچھی طرح سے دیکھ سکتا تھا۔ 25 لاکھ نوجوانوں کا ایک جم غفیر سامنے سے گزر رہا تھا۔ یہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں، سب چیئر مین ماؤ کو سلامی دیتے ہوئے ’’ماؤ توسی وان سے‘‘ یعنی ماؤ زندہ باد، کے نعرے لگا رہے تھے۔ تالیوں کی گونج بھی برابر سنائی دے رہی تھی۔ چیئر مین ماؤ کبھی اپنا ہاتھ اور کبھی اقوال کی لال کتاب ہلا کر نوجوانوں کی سلامی کا جواب دے رہے تھے۔ چیئر مین ماؤ کے ساتھ، لن پیاؤ اور چوئن لائی بھی، چیئر مین ماؤ کے اقوال کی لال کتاب کو زور زور سے ہلا رہے تھے۔ چیئر مین ماؤ کے ساتھ تمام لوگ صبح 10 بجے سے کھڑے ہوئے تھے۔ تقریباً 2 بجے دوپہر کو یہ سب کچھ دیر کے لئے

وہاں سے ہٹ گئے، شاید چائے وغیرہ پینے کے لئے، اس اعلان کے باوجود کہ ریڈ گارڈز اپنی سلامی جاری رکھیں گے، چیئرمین ماؤ کے چبوترے سے ہٹتے ہی، تمام ریڈ گارڈز وہیں رُک گئے۔ کوئی ایک انچ بھی آگے بڑھنے کو تیار نہ تھا۔ حکام نے اس موقع پر سوائے اعلان کے کچھ اور نہیں کیا۔ کوئی پولیس فورس حرکت میں نہیں آئی، جو انہیں زبردستی آگے بڑھاتی۔ جیسے ہی چیئرمین ماؤ سلامی کے چبوترے پر واپس آئے، تمام گارڈز نعرے لگاتے ہوئے چبوترے کے سامنے سے سلامی دیتے ہوئے آگے بڑھے اور اپنے دوسرے ساتھیوں سے جا ملے۔ یہ منظر اور اس عظیم اجتماع کا نظم وضبط دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ 25 لاکھ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی ریلی تھی مگر کیا مجال کہ کسی نے ایک دوسرے کو دھکا دیا ہو یا ایک نے دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی ہو۔

''بیجنگ کے، یکم اکتوبر کے اس رُوح پرور منظر نے، دل ودماغ پر بہت گہرا اثر کیا۔ چیئرمین ماؤ کو اتنے قریب سے دیکھنا اور باقی مناظر بھی بہت متاثر کرنے والے تھے۔ لاکھوں لوگوں کا، چیئرمین ماؤ کی عظمت کا اعتراف کرنا اچھا لگا، لیکن ان تمام مناظر کو دیکھنے اور ان سے متاثر ہونے کے ساتھ ہی ساتھ، ذہن میں چند سوالات نے بھی جنم لیا۔ وائس چیئرمین لن پیاؤ، چیئرمین ماؤ کی لال کتاب کو زور زور سے ہلا رہے تھے جب کہ چوئن لائی اسے ذرا آہستہ آہستہ ہلا رہے تھے۔ جہاں تک نعروں کا تعلق تھا، وہ زیادہ تر ذاتی حوالوں سے تھے، جو شخصیت پرستی کی مکمل عکاسی تھے، اور یہ سب کچھ اُس عظیم شخصیت کے سامنے ہو رہا تھا! مجھے یہ تمام عمل بہت ہی غیر سائنسی دکھائی دیا۔ ہر شخص کا لال کتاب کو اس انداز میں ہلانا اور خود چیئرمین ماؤ کا اسے ہاتھ میں لے کر ہلاتے رہنا، ایسا تاثر دے رہا تھا گویا یہ کتاب ہی نجات دہندہ ہے۔ چبوترے پر موجود تمام بڑی بڑی شخصیات جس انداز سے لال کتاب ہلا رہی تھیں، خاص کر وائس چیئرمین لن پیاؤ کا انداز، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس صورت حال کو دیکھ کر ذہن میں خیال پیدا ہوا کہ شاید چین کی پارٹی ٹھیک طرح سے کام نہیں کر رہی ہے، ورنہ اس غیر سائنسی رویہ کے کیا معنی اور یہ شخصیت پرستی کیسی؟

''چین سے آنے کے بعد جب ساتھیوں سے اس پہلو پر تفصیلی بات ہوئی تو چند ساتھی ناراض ہوگئے۔ ان کا کہنا تھا کہ چیئرمین ماؤ کے خلاف کوئی بات نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے اُنہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ بات چیئرمین ماؤ کے خلاف ہونے کی نہیں ہے، بلکہ یہ میرے تاثرات ہیں۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جن خدشات کا اظہار میں نے کیا تھا، وہ سب باتیں یکے بعد دیگر سامنے آتی چلی گئیں۔ سب سے پہلے لن پیاؤ، ہوائی جہاز میں بھاگنے کی کوشش میں میزائل سے مار دیئے گئے، پھر چیئرمین ماؤ اور چوئن لائی کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے۔ چیئرمین ماؤ کے مرنے کے بعد جو صورتِ حال سامنے آئی وہ اور بھی زیادہ تکلیف دہ تھی، کیونکہ ان کے جانشین ہوا کوفنگ، شاہ ایران کے دربار میں حاضر ہوئے اور انہوں نے ٹیٹو کو اپنا اُستاد بھی مانا، بالکل اسی طرح جیسے خروشیف نے ٹیٹو کو اپنا استاد مانا تھا۔ میرے خیال کے مطابق تو معاملہ وہیں ختم ہوگیا، کہاں کی نظریاتی بحث اور کہاں کی سائنسی پارٹی۔ بعد کے حالات نے بھی ثابت کر دیا کہ چین کی کمیونسٹ پارٹی ترمیم پسندی کا شکار ہوگئی ہے۔ اب جو کچھ چین میں ہورہا ہے اُس نے میری بات پر مہرِ تصدیق ثبت کردی ہے۔

''بہر حال یہ سفر میری زندگی میں ایک بڑا اہم موڑ تھا، جس سے حالات نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ چین کو پاکستان کی ترقی پسند تحریک کے حالات سے آگاہی ہوئی اور اس بات کا انہوں نے بھرپور انداز میں اعتراف بھی کیا اور چین کی حکومت نے اسی لئے چین کے پیپلز ہال میں پاکستان کے اس مزدور کارکن کا بھی فوٹو لگایا۔''

مگر اس وقت ہم نے ماؤزے تنگ کی لال کتابیں اٹھا رکھی تھیں اور کارل مارکس، لینن، سٹالن اور ماؤزے تنگ ہمارا اوڑھنا بچھونا تھے اور ماؤزے تنگ انقلاب کا نقیب تھے۔ طفیل عباس کی گفتگو کو ماؤزے تنگ سے عقیدت اور جذبات کی گہری چادر نے جذب کرلیا۔ بعد میں البانیہ کے انورھوجا (Hoxha) نے اپنی کتاب Imperialism and Revolution میں روسی سوشل سامراج اور ماؤزے تنگ کی پالیسیوں پر تنقید کی جو اس وقت کی درست سیاسی لائن تھی. میں نے اس کتاب کی تلخیص و ترجمہ ''سامراج اور انقلاب'' کے نام سے کیا تھا جسے ادارہ عوامی منشور کراچی نے چھاپا تھا۔

مزدور تحریک اور کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان

جب پاکستان آزاد ہوا تو مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان زرعی پیداوار کے علاقے تھے۔ مغربی حصے میں مسلمان زیادہ تر زمیندار تھے یا کاشتکار جبکہ مشرقی پاکستان میں زمیندار زیادہ تر اونچی ذات کے ہندو تھے اور کھیت مزدور مسلمان تھے۔

1945-46ء کے انتخابات کے دوران کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے بالخصوص بنگال میں ہندو مہاجن اور تجارت پر قابض ہندوؤں کے خلاف مسلمان کھیت مزدوروں کو یہ تصور دیا تھا کہ پاکستان کسانوں اور کھیت مزدوروں کے لئے ایک جنت ہوگا جہاں پر مہاجنوں کے قرضے معاف کردیئے جائیں گے اور زمین کی ملکیت اس کی ہوگی جو اس میں ہل چلائے گا۔ مگر جب 1946ء میں مغربی پاکستان کے جاگیرداروں کو یہ یقین ہوگیا کہ پاکستان میں جاگیرداری پر زد نہیں پڑے گی تو انہوں نے مسلم لیگ میں جوق در جوق شمولیت اختیار کی اور قیام پاکستان کے بعد کمیونزم کی مخالفت پاکستانی حکومتوں کا بنیادی نکتہ رہا۔

تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان کے کسانوں اور محنت کش طبقات کی وہ سیاسی تحریک جو کمیونسٹ پارٹی یا برصغیر کے دیگر علاقوں سے جڑی ہوئی تھی وہ کٹ گئی اور بغیر کسی رہنما کے رہ گئی۔ جبکہ مغربی پاکستان میں کوئی منظم کسان تحریک تھی ہی نہیں اور مزدور تحریک برائے نام تھی۔ چونکہ صنعتیں نہیں تھیں تو ٹریڈ یونین بھی نہیں تھی۔

قیام پاکستان کے وقت پاکستان کے حصے میں صرف 9.6 فیصد انڈسٹریل یونٹس آئے تھے۔ کل یونٹس 14677 تھے جن میں سے پاکستان کو صرف 1414 یونٹس ملے تھے۔ بجلی کی صلاحیت جو ملی تھی وہ کل kw 1375000 میں سے صرف kw 72700

تھی اور 10 فی صد معدنی ذخائر۔ صنعتی ورکرز کی کل تعداد 3141800 تھی جس میں سے پاکستان کے حصے میں صرف 206100 ورکرز آئے تھے جو کہ 6.5 فی صد تھے۔ اکثر انڈسٹریل یونٹس بہت چھوٹے پیمانے کے تھے بلکہ یوں کہا جائے کہ گھروں میں مشینیں لگا کر کام کرنے والے یونٹس تھے۔ درمیانہ درجے اور بڑے درجے کی صنعت میں سے بہت کم حصہ تھا جو ہمیں ملا تھا۔ مثلاً انڈیا کے 451 ٹیکسٹائل ملز میں سے صرف 16 اور 60 شوگر ملز میں سے صرف پانچ ہمارے حصے میں آئی تھیں یعنی پاکستان کی اس وقت کی کل آبادی جو کہ ساڑھے سات کروڑ تھی، میں سے بہت کم تعداد تھی جو صنعت میں کام کرتی تھی۔ کراچی میں صرف تین جگہ مزدور یونٹس تھے۔ ڈالمیا سیمنٹ فیکٹری، ٹرام کمپنی (اس وقت کراچی میں ٹرام چلا کرتی تھی) اور اورئینٹ ایئرویز جس کو بعد میں پی آئی اے کا نام دیا گیا۔ مغلپورہ لاہور میں ریلوے ورکشاپس تھیں اور ریلوے ورکرز کی ٹریڈ یونین خاصی فعال تھی۔ پاکستان کی تمام فیکٹریاں اور کارخانے جو پاکستان بننے کے بعد قائم ہوئے وہاں پر مزدور یونٹس اور پھر مزدور یونینز بعد میں قائم ہوئیں۔ چنانچہ کوئی کمیونسٹ طرز پر تنظیم یا تحریک نہیں تھی۔

پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کے قیام کا فیصلہ بھی 1948ء میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی سالانہ کانگرس میں جو کلکتہ میں منعقد ہوئی تھی کیا گیا۔ اس میں پاکستان کے وفد نے شرکت کی۔ کچھ کمیونسٹ بھارت سے پاکستان آئے تا کہ پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم سازی اور رہبری کر سکیں۔ اس میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے پہلے سیکرٹری جنرل سجاد ظہیر عرف بنّے میاں تھے جو یوپی سے آئے تھے۔ ان کا تعلق امیر گھرانے سے تھا اور برصغیر میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھنے والوں میں سے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین لندن میں قائم کی گئی تھی جہاں پر سجاد ظہیر تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

1935ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد جس میں کمیونسٹوں کی اکثریت تھی 1936ء میں مزدوروں میں مزدور تحریک کا شعور پیدا کرنے کے لیے سٹڈی سرکل قائم کیے گئے۔ ان سٹڈی سرکلز میں فیض احمد فیض، رمیش چندر، جے گوپال اور دانیال لطیفی مزدوروں کی سیاسی و نظریاتی تربیت کرتے تھے۔ ان سٹڈی سرکلز نے مختلف یونینوں میں کام

کرنے والے کارکنوں میں مزدور تحریک کے متعلق سوجھ بوجھ پیدا کی۔ سیاسی شعور پیدا ہوا اور تنظیمی صلاحیتوں اور طریقہ کار میں تیزی آئی، سٹڈی سرکل بہت کارآمد ثابت ہوئے۔

1939ء میں دوسری عالمی جنگ کے شروع ہونے کے بعد ہندوستان میں مزدور تحریک دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک فریق انڈین ٹریڈ یونین کانگرس کے ساتھ وابستہ رہا اور دوسرے فریق نے انڈین فیڈریشن آف لیبر قائم کر لی۔ اس وقت برصغیر کی مزدور تحریک میں کام کرنے والوں میں کمیونسٹ، سوشلسٹ، کانگریسی، غدر پارٹی کے کارکن جو امریکہ میں قائم ہوئی تھی جسے ہندوستان میں کرتی کسان پارٹی کا نام دیا گیا تھا اور ایم این رائے کے ساتھی شامل تھے۔ یہ سب ابتدائی طور پر انڈین ٹریڈ یونین کانگرس میں کام کرتے تھے۔ جب دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو انڈین ٹریڈ یونین کانگرس نے برطانیہ سے عدم تعاون کی مہم کا آغاز کیا اور ہندوستان کے باشندوں کو برطانوی فوج میں بھرتی نہ ہونے کی تلقین کی۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ چونکہ یہ جنگ برطانیہ کی شہنشاہیت کے تحفظ کے لیے ہے اس لیے ہندوستانی عوام کو اس میں حصہ نہیں لینا چاہیے لیکن ایم این رائے نے اس سے اختلاف کیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ چونکہ ہٹلر ڈکٹیٹر ہے اس لیے وہ لازمی طور پر سوشلسٹ روس پر بھی حملہ کرے گا اس لیے یہ جنگ عوامی ہے۔

جرمنی نے یورپ کے مختلف ملکوں پر قبضہ کرنے کے بعد روس پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں برطانیہ ہٹلر کے خلاف روس اور امریکہ کا اتحادی تھا۔ وہ سوشلسٹ یا کمیونسٹ جو ہندوستان میں اس وقت نظر بند تھے انہوں نے بھی اس جنگ کو پیپلز وار قرار دے دیا اور انگریز حکومت نے ان کو رہا کر دیا۔ ان حالات کی روشنی میں ایم این رائے نے 1941ء میں دہلی میں ہم خیال مزدور راہنماؤں کا کنونشن منعقد کیا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ انڈین ٹریڈ یونین کانگرس سے الگ ہو کر اپنی تنظیم قائم کی جائے۔ چنانچہ اس موقع پر انڈین فیڈریشن آف لیبر کے نام سے مزدور تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس فیڈریشن کے صدر جمنا داس مہتا منتخب ہوئے جو اس وقت مرکزی اسمبلی کے رکن تھے۔ جنرل سیکرٹری ایم این رائے اور نائب صدر ایم اے خان۔ اس کی مجلس عاملہ میں بشیر احمد بختیار اور ایم اے خطیب بھی شامل

تھے۔ قیام پاکستان کے بعد 1948ء میں اس فیڈریشن کا نام پاکستان فیڈریشن آف لیبر رکھا گیا۔ اس کا صدر ایم اے خان کو چنا گیا اور جنرل سیکرٹری ایم اے خطیب کو چنا گیا۔

اگرچہ ہندوستان کی مزدور تحریک یا ترقی پسند تحریک میں آل انڈیا مسلم لیگ کا کوئی قابل ذکر کردار نظر نہیں آتا مگر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے پاکستان کے قیام کی حمایت کی کیونکہ وہ مسلمانوں کی اس تحریک کو حق خود ارادیت کی تحریک سمجھتی تھی۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کے ترقی پسند ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دانشوروں نے جو عوام کی ذہنی تربیت اور رہنمائی کا فرض ادا کیا تھا اس کے نتیجے میں ایک ایسا انسان پیدا ہوا تھا جس کی جھلک پاکستان میں نمایاں نظر آتی تھی۔ یہاں سے ترقی پسند شاعر، سیاسی دانشور، ادیب، صحافی اور کارکن نکلے جنھوں نے نہ صرف معاشرے کو بدلنے کی کوشش کی بلکہ پاکستان جیسے جاگیردارانہ، قبائلی معاشرے میں رہتے ہوئے اپنے اندر بھی تبدیلی پیدا کی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام اور اس سے وابستہ تمام ترقی پسندوں اور کمیونسٹوں کی سرگرمیوں پر سجاد ظہیر نے اپنی کتاب ''روشنائی'' میں تفصیلات بیان کی ہیں۔

کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان نے کراچی میں جو کہ اس وقت پاکستان کا دارالخلافہ تھا کام شروع کیا۔ پارٹی مضبوط ہونے لگی اور پنجاب میں بالخصوص لاہور میں بھی اس کی گونج سنائی دینے لگی۔ اس کے تقریباً ڈھائی سو ممبر بن چکے تھے اور کسی بھی کمیونسٹ پارٹی میں کام کو آگے بڑھانے کے لیے کامریڈز کی اتنی بڑی تعداد بہت کافی تھی۔ جب کمیونسٹ پارٹی مضبوط ہو رہی تھی اس وقت پنجاب کے ترقی پسندوں میں پنجابی شاؤنزم جڑیں پکڑ رہا تھا۔ سجاد ظہیر نے لاہور میں کام شروع کیا تو ان کا مذاق اڑایا جانے لگا کہ جو شخص گوجرانوالہ کو ''گوجران والا'' کہتا ہے وہ یہاں کے معروضی حالات کا کس طرح سے جائزہ لے گا اور کمیونسٹ پارٹی کس طرح بنائے گا۔ رجعت پسند امریکی نواز حکومتی ادارے ویسے ہی کمیونسٹ تحریک اور مزدور تحریک کے دشمن تھے۔ اسلام پسندوں کے نزدیک بھی اسلام میں مزدور تحریک اور مزدور ہڑتال کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یعنی مظلوم طبقات کا ظالم طبقات سے یا اپنے مالکان سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرنا غیر اسلامی تھا۔

1948ء میں ڈاک لینڈ کراچی کے ورکرز نے ہڑتال کی اور اپنے حقوق کا مطالبہ کیا تو شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے ایک فتویٰ جاری کیا اور وہ یہ کہ ''اسلام ہڑتال کی اجازت نہیں دیتا۔ ہڑتال کرنے والے کافر ہیں کیونکہ انہیں کمیونسٹوں نے ورغلایا ہے۔'' پھر ان ہی مُلّاؤں نے بعد میں ہر جمعہ کی نماز کے بعد ہڑتال کو اپنی بلیک میلنگ کا ذریعہ بنالیا۔

14 رجنوری 1948ء کو جب کمیونزم کے حامی مزدور رہنما جمع ہوئے اور انہوں نے پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن قائم کی تو حکومت نے 1926ء کا پبلک سیفٹی ایکٹ لگا کر ان میں سے اکثر کو گرفتار کرلیا۔

1951ء میں فوجی بغاوت کا منصوبہ، جسے راولپنڈی سازش کہا جاتا ہے، پکڑا گیا۔ بغاوت کی اس تیاری میں کافی ناپختگی تھی۔ جنرل اکبر خان جو اس آپریشن کے سربراہ تھے، انہوں نے آرمی افسران سے کھل کر ملاقاتیں کیں اور سجاد ظہیر کی ملاقاتیں بھی کروائیں۔ ایوب خان اس وقت پاکستان کے کمانڈران چیف تھے اور لیاقت علی وزیراعظم۔ میجر جنرل اکبر خان، کموڈور جنجوعہ، فیض احمد فیض، میجر اسحاق، محمد حسین عطاء، ظفراللہ پوشنی، سجاد ظہیر اور کمیونسٹ پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے سارے ارکان بشمول حسن ناصر گرفتار کر لیے گئے۔ بند کمرے میں ٹریبونل کے سامنے کیس چلا۔ ان کو وکیل کرنے اور گواہوں کے طلب کرنے یا جرح کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ سول افراد کو چار چار سال قید بامشقت اور جرمانہ اور فوجی افراد کو تین سے لے کر سات سال تک کی سزا سنائی گئی۔ میجر جنرل اکبر خان کو بارہ سالہ طویل جلاوطنی کی سزا ملی۔ اس کے بعد بائیں بازو کے افراد پر سختیاں بڑھ گئیں۔ سجاد ظہیر اپنی رہائی کے بعد واپس بھارت چلے گئے۔

1954ء میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگا دی گئی

حسن ناصر کو لاہور قلعہ میں تشدد کر کے مار دیا گیا

1954ء میں پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگا دی گئی اور پورے پاکستان سے کارکنوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ پارٹی کے کچھ افراد جو بچ گئے انہوں نے زیرزمین

کام جاری رکھا۔ سندھ میں ہاریوں کا معاشی استحصال اپنی بدترین شکل میں تھا۔ جاگیرداروں کی ذاتی جیلیں تھیں۔ ان حالات میں ہاریوں میں پارٹی کا کام کرنے کی گنجائش تھی۔ حسن ناصر جنہیں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے فیصلے کی روشنی میں پاکستان بھیجا گیا تھا، وہ جب سازش کیس سے رہا ہوئے تو 1955ء میں دوسال کے لیے ہندوستان چلے گئے۔ 1957ء میں وہ جب کراچی واپس آئے تو دوبارہ کام شروع ہوا۔ 1958ء میں ایوب خان کا مارشل لاء لگ گیا۔ حسن ناصر جوروپوش تھے اور اندرون سندھ زیر زمین کام کررہے تھے، 1960ء میں پکڑے گئے۔ ان کی گرفتاری کے بعد 12 کارکن پکڑے گئے جن میں طفیل عباس بھی تھے۔ اظہر عباس پہلے ہی گرفتار ہو گئے تھے۔ حکومت نے حسن ناصر کو گرفتار کر کے لاہور قلعہ میں قید کر دیا اور پھر تشدد کر کے مار دیا۔ کراچی میں بھی تمام گرفتار کارکنوں پر تشدد ہوا۔ طفیل عباس 22 مہینے تک جیل میں رہے۔ اُن پرانے ساتھیوں میں سے اظہر عباس، ذکی عباس اور شفیق اپنی زندگی کے آخری سانس تک محنت کش عوام کے روشن مستقبل کی تحریک سے جڑے رہے۔

کامریڈ امام علی نازش جو نازش امروہوی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ 1956ء میں کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری تھے۔

حسن ناصر کی والدہ جب ہندوستان سے اپنے بیٹے کی لاش لینے پاکستان آئیں تو انہیں لاش نہیں دی گئی۔ جو لاش انہیں دکھائی گئی اس کو دیکھ کر انہوں نے کہا کہ یہ لاش میرے بیٹے کی نہیں ہوسکتی۔ یہ تو کسی گنوار کی لاش ہے۔

حسن ناصر کے خاندان والوں نے انہیں بیرسٹر بننے کے لیےلندن بھیجا تھا مگر کمیونسٹ پارٹی کے فیصلے کی وجہ سے وہ کراچی میں آ کر کمیونسٹ پارٹی کو پھر سے منظم کررہے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی کمیٹی جس کی اکثریت باہر سے آنے والوں پر مشتمل تھی واپس چلی گئی تھی۔ جو پاکستان میں رہ گئے تھے وہ یا تو گھر میں بیٹھے رہے یا حکومت سے مل گئے تھے۔ کراچی پارٹی کے سیکرٹری سمیت کچھ لوگ یورپ چلے گئے۔ لیڈرشپ نہ ہونے اور مرکزیت ختم ہو جانے کی وجہ سے پارٹی کا جو حشر ہونا تھا وہ ہوا۔ مختلف علاقوں میں الگ الگ گروپ قائم ہو گئے۔

مرزا ابراہیم، بشیر بختیار اور فیض ٹریڈ یونین میں کام کرتے رہے

ابھی تک پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن پر پابندی نہیں لگی تھی۔ لاہور میں مرزا ابراہیم اور بشیر بختیار مزدور یونین کو مضبوط کر رہے تھے۔ فیض احمد فیض پوسٹل ورکرز یونین کے صدر اور ٹریڈ یونین فیڈریشن کے نائب صدر تھے۔ مشرقی پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کافی منظم ہو چکی تھی اور بہت مستعد تھی۔ 1956ء کے بعد دوبارہ کام شروع ہوا۔ ابھی ترقی پسندوں نے سانس لینا ہی شروع کیا تھا کہ ایوب خان نے 1958ء میں مارشل لا لگا دیا۔ سول ادارے ختم ہو گئے۔ شہری آزادیوں پر پابندی لگا دی گئی اور جب 1959ء میں امریکی صدر آئزن ہاور پاکستان آیا تو ملک بھر میں ترقی پسندوں کی گرفتاریاں ہوئیں۔ پھر 1960ء میں بڑے پیمانے پر گرفتاریاں کی گئیں۔

ترقی پسند، چین نواز اور روس نواز گروہوں میں بٹ گئے

1960ء سے 1962ء تک کا زمانہ اپنی صفوں کو دوبارہ سے درست کرنے کا زمانہ تھا۔ مگر اس دوران ایک ظلم اور ہوا اور وہ یہ کہ دنیا بھر کے ترقی پسند چین نواز اور روس نواز ہو کر اپنی اجتماعی طاقت کو تقسیم کرنے میں لگ گئے۔ پاکستان میں بھی ترقی پسند ترمیم پسندی کا شکار ہو گئے اور زیر زمین تحریک، جو چین نواز تھی، اس کے خلاف مہم بازی میں شامل ہو گئے۔

روس نواز جماعتیں پرامن رہ کر کمیونزم کا دائرہ بڑھانا چاہتی تھیں جبکہ چین نواز جماعتیں مسلح جدوجہد میں یقین رکھتی تھیں۔ پارٹیوں کا چین نواز ہونا یا روس نواز ہونا ان ممالک اور اقوام کے معروضی حالات کے مطابق تھا۔ مثلاً پاکستان میں روس نواز ہونے کا مطلب ملک دشمن ہوتا تھا جبکہ بھارت میں چین نواز ہونے کا مطلب ملک سے غداری تھی۔

امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے مطابق ساٹھ کی دہائی میں پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کے ممبران کی تعداد تین ہزار تھی۔ کمیونزم اینڈ اکنامک ڈویلپمنٹ امریکن پولیٹکل

سائنس رویو مارچ 1968ء Vol. 62, No. 2

ایک طرف امریکہ کی سرپرستی میں قائم مذہبی جماعتیں اور حکومت، اور دوسری طرف روسی ترمیم پسند، دونوں نے ہی پاکستان کے قوم پرست ترقی پسندوں کے خلاف فتوے بازی اور ''جہاد'' شروع کردیا۔ مگر زیرزمین جو بھی کام ہوتا رہا اس کی کامیابی ایک تو این ایس ایف کی شکل میں ہوئی جہاں سے ایسے طالب علم رہنما نکلے جو ملکی سیاست، صحافت اور فکری محاذ پر ملک اور قوم کا بہت بڑا اثاثہ ثابت ہوئے۔ دوسرے ائیرویز ایمپلائز یونین۔ اس کے ذریعے مزدور محاذ پر دیگر یونینوں کے ساتھ وسیع تر اتحاد بننا شروع ہوا جو بالآخر مزدور محاذ کی شکل میں قائم ہوا۔ جس کو بعد میں پاکستان مزدور محاذ کا نام دیا گیا۔

پی آئی اے کی ٹریڈ یونین ائرویز اور طالب علموں کی تنظیم این ایس ایف، مارکس، لینن، سٹالن اور ماؤزے تنگ کے افکار سے لیس ہو کر مزدوروں، کسانوں اور طالب علموں میں کام کر رہی تھیں۔ بعد میں لاہور میں قائم ہونے والی طالب علم تنظیم NSO بھی ماؤزے تنگ کے خیالات سے متاثر تھی۔ ترقی پسند شاعر، ادیب، دانشور اور صحافی بھی انقلاب چین کے مداح تھے۔ چنانچہ 1967ء میں جب پیپلز پارٹی قائم ہوئی، سوشلزم کا پروگرام دیا، بھارت سے ایک ہزار سال تک جنگ کا نعرہ لگایا اور بھٹو صاحب نے ماؤزے تنگ کی ٹوپی پہن کر عوام سے خطاب کرنا شروع کیا تو مغربی پاکستان کے عوام ذوالفقار علی بھٹو کو ماؤزے تنگ کی طرح اپنا مسیحا اور پیپلز پارٹی سے مسیحائی کا یقین اور اعتماد کرنے لگے۔

1964ء میں زیرزمین چین نواز پارٹی کا ماہنامہ منشور جاری ہوا۔ اس کے چیف ایڈیٹر طفیل عباس تھے۔ اس کی تمام تر ذمہ داری طفیل عباس کے علاوہ اظہر عباس اور ذکی عباس پر تھی۔ اس جریدے نے پاکستان اور پاکستان سے باہر بین الاقوامی سطح پر مزدور طبقے کی طبقاتی اور مثبت سیاست کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ منشور کو بھٹو صاحب اپنا رسالہ کہا کرتے تھے۔ اقتدار میں آنے کے بعد انہوں نے اسے بند کر دیا اور طفیل عباس کو جیل میں بھیج دیا۔ 1989ء میں جب منشور دوبارہ عوامی منشور کے نام سے شروع ہوا تو میں لندن آچکا تھا۔ منشور کے ذریعے اور سٹڈی سرکلز کے ذریعے ترقی پسند کارکنوں کی نظریاتی

تعلیم وتربیت ہوتی گئی۔فیض صاحب کی اور سبط حسن کی زیرادارت نکلنے والے لیل ونہار نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا۔

کمیونسٹ پارٹیاں بورژوا پارٹیوں میں سے قائدِ انقلاب تلاش کرتی رہیں

انقلابی نظریے کے بغیر کوئی انقلابی تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی اور انقلابی تحریک کو مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں کے اتحاد سے ہی آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ چین نواز پارٹی نے پاکستان کی بورژوا پارٹیوں کے ساتھ کئی بار اصولی اتحاد بنایا۔اس میں سہروردی کی عوامی لیگ (جب تک وہ امریکہ نواز نہیں ہوئی تھی)، میاں افتخارالدین کی آزاد پاکستان پارٹی،مولانا بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی، ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی اور بعد میں اصغر خان کی تحریک استقلال شامل ہیں۔تحریک استقلال کے ساتھ اتحاد کی وجہ شاید طفیل عباس اور اصغر خان کی ذاتی دوستی رہی ہو۔

ان اتحادوں کے نتیجے میں انقلابی نظریہ تو عوام تک ضرور پہنچا مگر انقلابی قیادت نہ ہونے کی وجہ سے عوامی انقلاب برپا نہ ہوسکا۔ انقلاب لانے کے لئے قائد انقلاب کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ پاکستان کی کمیونسٹ پارٹیاں اپنے اندر سے قائد انقلاب پیدا کرنے کے بجائے بورژوا پارٹیوں میں سے قائد انقلاب تلاش کرتی رہیں،مایوس ہوتی رہیں اور مار کھاتی رہیں۔

اگرچہ پاکستان میں بائیں بازو کی پارٹیوں کے درمیان عدم اتحاد تھا اور ان کی سیاست چین نواز اور روس نواز ہونے میں تقسیم ہوچکی تھی مگر ان تمام جماعتوں اور افراد نے خواہ وہ طفیل عباس ہوں یا فیض احمد فیض، ظہیر کاشمیری ہوں یا سی آر اسلم، عابد حسن منٹو ہوں یا پروفیسر عزیز الدین، حمید اختر ہوں یا حبیب جالب، امین مغل، حسین نقی، جام ساقی، زاہد چودھری، ڈاکٹر عزیز الحق یا معراج محمد خان سب نے ہی اپنی اپنی جگہ طبقاتی جدوجہد اور

عالمی سامراج کے بارے میں ترقی پسند سیاسی کارکنوں کی تربیت کی اور طبقاتی شعور دیا۔

مشرقی پاکستان میں مولانا عبدالحمید بھاشانی چین نواز نیشنل عوامی پارٹی کے مقبول اور ہردلعزیز رہنما تھے۔ مولانا کو سرخ مولانا بھی کہا جاتا تھا۔ انہوں نے عوامی مسلم لیگ بنائی تھی جو بعد میں عوامی لیگ بنی۔ حسین شہید سہروردی اس کے رہنما تھے جو رجعت پسند تھے۔ ان کے ساتھ مولانا بھاشانی کے اختلاف ہوئے اور یہ اختلاف اور بھی شدید ہوگئے جب حسین شہید سہروردی وزیراعظم بنے اور پاکستان نے سیٹو اور سینٹو میں شمولیت اختیار کی۔ مولانا بھاشانی نے 1957ء میں ان سے علیحدہ ہوکر نیشنل عوامی پارٹی قائم کی جو بعد میں روس نواز اور چین نواز دھڑوں میں تقسیم ہوگئی۔ مولانا بھاشانی چین نواز نیشنل عوامی پارٹی کے رہنما تھے اور مشرقی پاکستان میں روس نواز دھڑے کے رہنما پروفیسر مظفر احمد تھے۔ جبکہ مغربی پاکستان میں سرحدی گاندھی کے بیٹے خان عبدالولی خان روس نواز دھڑے کے رہنما تھے۔ بعد میں ولی خان کی نیپ کے دھڑے سے علیحدہ ہوکر کمیونسٹوں نے 1968ء میں مزدور کسان پارٹی قائم کی جس میں سرحد کے لیڈر افضل بنگش اور پنجاب کے لیڈر میجر اسحاق تھے۔ یہ چین نواز تھے۔ بعد میں یہ دھڑا بھی افضل بنگش گروپ اور میجر اسحاق گروپ میں تقسیم ہوگیا۔

میں کراچی میں تیز رفتار زندگی کے ساتھ چل رہا تھا

میں کراچی میں تیز رفتار زندگی کے ساتھ چل رہا تھا۔ اگرچہ کراچی سے دارالحکومت اسلام آباد منتقل کیا جا رہا تھا لیکن اب بھی وہ پاکستان کا سب سے بڑا صنعتی و تجارتی مرکز تھا۔ ہزاروں مزدور، مرد اور عورتیں کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ اندرونِ سندھ کے ہاری یا پنجاب کے کسان جب کبھی زمین سے بے دخل کئے جاتے یا سرحد میں خان ان کی زندگی اجیرن کر دیتا تو وہ کراچی کا رخ کرتے اور پھر اپنی زمینوں پر واپس جانا انہیں کبھی نصیب نہ ہوتا۔ وہ کراچی کی گہا گہمی میں گم ہو جاتے۔ ان کے بچے گھر میں اپنی زبان بولتے اور باہر اردو بولتے۔

سرگودھا کے ٹھنڈے اور دھیمے زمانے کو میں یاد کرتا اور کوشش کرتا کہ کائنات کی اس گونج میں، جو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی، ڈوب جاؤں۔ مگر احساسات کے اس بھنور میں، میں ڈولتا رہتا۔ یہاں کے سٹی یعنی فنانشل اداروں کے علاقے میں اونچی اونچی عمارتیں سرگودھا کی کریانہ پہاڑی کی طرح کھڑی نظر آتیں۔ دن میں سورج کی کرنیں ان سے گلے مل کر جدا ہوتیں۔ کئی عمارتوں پر کائی جمی رہتی اور اندر سیل کی بدبو، فٹ پاتھ پر بیٹھے مزدور حیدرآباد کی بنی ہوئی بیڑی پی رہے ہوتے۔ کراچی ایک غریب پرور شہر تھا۔

ان دنوں ذوالفقار علی بھٹو چین اور پاکستان کے درمیان دوستی کا پل تعمیر کر رہے تھے۔ پاک چین دوستی کی اس فضاء میں پاکستان کے کمیونسٹوں کو مارکس، لینن اور ماؤزے تنگ خیالات پر بات اور کام کرنا آسان ہو گیا۔ ماؤزے تنگ کی لال کتابیں اور کارل مارکس کے ورکس کتابوں کی دکانوں پر آسانی سے دستیاب ہونے لگے۔

ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ میری پہلی ملاقات

میری نسل کے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی پسندیدہ شخصیات ذوالفقار علی بھٹو، جان ایف کینیڈی، چی گویرا، مارلن منرو اور ایلوس پریسلے وغیرہ تھے۔ ان سب تک پہنچنا تو ناممکن تھا البتہ بھٹو صاحب سے ملاقات کی کوشش ہو سکتی تھی۔ ان ہی دنوں ہمارے ایک رشتے دار جو اندرون سندھ قنبر میں رہتے تھے، اپنے بچوں کے ساتھ موسم گرما کی چھٹیاں گزارنے کراچی آئے ہوئے تھے۔ قنبر میں ان کا چاول چھڑنے کا کارخانہ تھا۔ وہ کبھی کبھار بھٹو صاحب سے ملاقات کے لیے لاڑکانہ جاتے تھے۔ بھٹو صاحب کے لاڑکانہ اور سندھ کا نہایت ذہین سپوت ہونے پر فخر کرتے اور ہمیشہ ان کا تذکرہ کرتے ہوئے پیش گوئی کرتے جس میں ان کی چھپی ہوئی خواہش بھی ہوتی کہ ''یہ ملک کی آئندہ سیاست میں بہت آگے جائے گا اور دنیا میں بڑا نام پائے گا۔'' وہ زور دیتے کہ تم جیسے نوجوانوں کو ان سے ضرور ملنا چاہیے۔ میں پہلے ہی بھٹو صاحب سے ملنا چاہتا تھا۔ جب وہ واپس قنبر گئے تو میں بھی ان کے ساتھ چلا گیا۔ پھر ہم لاڑکانہ بھٹو صاحب سے ملنے گئے۔ میری ان سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ بھٹو صاحب سے مصافحہ کیا تو ان کا ہاتھ نرم نرم سا لگا۔ ان کی آپس میں گفتگو جو سندھی میں رہی، بہت زیادہ سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن سرائیکی کے بہت سے الفاظ سندھی میں ہیں چنانچہ مفہوم سمجھ میں آتا رہا۔ زیادہ گفتگو انگریزی میں رہی۔ یہ 1964ء کی بات ہے۔

میری عمر کے نوجوانوں کے لیے بھٹو صاحب کی خوبصورت انگریزی، انداز تحریر و تقریر، خوبصورت لباس، خوبصورت شخصیت اور پاک چین دوستی ہی مرعوب اور دلدادہ کرنے کے لیے کافی تھی مگر ان کا جذبہ حب الوطنی اور خارجہ پالیسی میں ان کے انداز سے مجھے لگا تھا کہ قائداعظم محمد علی جناح کے بعد یہ وہ گل تھا جس کی ہمارے اجڑے ہوئے چمن کو برسوں سے آرزو تھی اور جس چمن کو جاگیردار، سرمایہ داروں کے بائیس خاندان، ایوب خان کی اولاد، رشتے دار اور کنونشن مسلم لیگ کے لیڈروں کی اکثریت مزید اجاڑنے پر لگی ہوئی تھی۔

بھٹو صاحب کو بھی اس بات کا اندازہ تھا کہ نوجوان ان کو پسند کرتے ہیں۔ اس

ملاقات کے بعد مجھے کچھ یقین سا ہونے لگا کہ اگر انہیں موقع ملا تو وہ خزاں کے پھیلتے سایوں کو بہار کے ابھرتے موسموں میں بدل سکتے ہیں۔ یہ جان کر کہ میرا رجحان کارل مارکس، لینن اور ماؤزے تنگ خیالات کی جانب ہے، انہوں نے مارکس کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ''دنیا بھر کے محنت کشو! اکٹھے ہو جاؤ۔ تمہارے پاس گنوانے کے لیے سوائے زنجیروں کے کچھ بھی نہیں۔ تمہیں پوری دنیا فتح کرنی ہے۔'' پھر اس بات پر اصرار کیا کہ برٹرنڈ رسل کو بھی ضرور پڑھو اور نپولین کے بارے میں بھی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے خوشی کا اظہار کیا کہ ہمارے نوجوان چین میں ہونے والی تبدیلی سے متاثر ہیں۔

دنیا میں اشتراکی حکومتیں اور انقلابی خیالات تیزی سے پھیل رہے تھے۔ پاکستان امریکہ کی گود میں جا چکا تھا۔ ہماری ڈیفنس کی منصوبہ بندی دفاعی تھی اور اس بنیاد اور حقیقت پر ہو رہی تھی کہ پاکستان کی بقاء کو بھارت سے خطرہ ہے۔ سیٹو اور سینٹو جیسے معاہدوں میں شمولیت کے بعد اور امریکہ کو اس یقین دہانی کے بعد کہ پاکستان جنوبی ایشیاء میں کمیونزم کے پھیلاؤ کے خلاف ایک ڈھال کا کردار ادا کرے گا، امریکہ نے پاکستان کو جدید اسلحہ بھی فراہم کرنا شروع کیا ہوا تھا۔ ایسی فضاء میں بھٹو صاحب کی چین کے ساتھ دوستی کے تصور نے انہیں ترقی پسند حلقوں میں مقبول کر دیا۔

چین اور پاکستان کے درمیان دوستی کی وجہ اور بنیاد چین اور بھارت کے درمیان کشیدگی تھی۔ 1962ء میں چین اور بھارت کی جنگ کے بعد یہ دوستی پروان چڑھی تھی۔ اس فضا میں ترقی پسندوں کو سانس لینے کا موقع مل گیا۔ روس کے خلاف ہتھکنڈے کے طور پر امریکہ کو بھی اس دوستی پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ بعد میں بھٹو صاحب کی وجہ سے چین اور امریکہ میں دوستی استوار ہوئی۔ حکومت پاکستان امریکہ کے لئے پی آئی اے کے جہازوں کے ذریعے چین کی جاسوسی بھی کرتی تھی۔

مسائل کا حل ''بنیادی جمہوریت''، ''نجات دہندہ'' ایوب خان

بھٹو صاحب ایوب خان کے منظور نظر وزیر تھے مگر بین الاقوامی معاملات پر ان

کی تقریروں کی گونج ہر ایک کو متاثر کر رہی تھی۔ ایوب خان بنیادی جمہوریت کے نظام کی بنیاد پر الیکشن کروا کر اپنی فوجی وردی اتارنا چاہتے تھے اور عوام کے مسائل کا حل بنیادی جمہوریت میں تلاش کیا جا رہا تھا۔ الطاف گوہر سے لے کر بھٹو صاحب تک سب اس نظام کو اور ایوب خان کو عوام کا نجات دہندہ بنا کر پیش کر رہے تھے۔ مگر عوام کے سامنے ایوب خان کے کچھ اور طرح کے کارنامے آ رہے تھے۔ مثلاً جب ایوب خان نے غالباً اپریل 1963ء میں جنرل موٹرز کو گندھارا انڈسٹریز کی تحویل میں دے دیا جوان کے بیٹے اور سمدھی کی تھی تو ایوب خان کے بھائی سردار بہادر خان، جو 1962ء کے قومی اسمبلی کے انتخابات میں جیت کر قومی اسمبلی کے ممبر تھے، ایوب خان اور ان کی اولاد کی کرپشن کے واقعات عوام کے سامنے لانے لگے۔ اسمبلی میں تقریر کے دوران ''ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے انجام گلستاں کیا ہوگا'' انہوں نے جب یہ مصرع پڑھا تو یوں لگا کہ پوری قوم کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

1962ء کی اس اسمبلی میں چوہدری فضل الٰہی، محمد علی بوگرہ، مفتی محمود، نوابزادہ نصر اللہ خان، غلام مصطفیٰ کھر، غلام مصطفیٰ جتوئی، مخدوم طالب المولیٰ، چوہدری ظہور الٰہی، ذوالفقار علی بھٹو، سردار عطاء اللہ مینگل وغیرہ شامل تھے۔ سردار بہادر خان کا تعلق کونسل مسلم لیگ سے تھا اور وہ اپوزیشن میں تھے۔ تیسرا گروپ جس کے لیڈر مسیح الرحمن، جن کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا، بہت تنقیدی اور بے باک تھا۔

ایوب خان کی اقرباء پروری اور کرپشن کے علاوہ مغربی پاکستان کے گورنر امیر محمد خان اور مشرقی پاکستان کے گورنر منعم خان اپنے جبر وتشدد سے ایوب خان کے زوال کا راستہ ہموار کرنے میں مصروف تھے۔

کنونشن مسلم لیگ کے چیف آرگنائزر چوہدری خلیق الزمان، جنہیں نوائے وقت نے ''مفرور ملت'' کا خطاب اس وقت دیا تھا جب وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی ذمہ داری، جو قائداعظم نے انہیں سونپی تھی، چھوڑ کر پاکستان آ گئے تھے۔ ان جیسے خوشامدی ایوب خان سے زیادہ ایوب خان کے وفادار تھے۔ 1962ء کا آئین جس نے ایوب خان کو ایک آمر کے اختیارات دے دیئے تھے، اس کے بارے میں خلیق الزمان جیسے لوگوں کا کہنا تھا، ایک

اسلامی مملکت کے حاکم اعلیٰ کے پاس لازماً آمرانہ اختیارات ہونے چاہئیں کیونکہ اسلامی نظام سیاست کا تقاضا یہی ہے۔

اس وقت ایوب خان کی کنونشن مسلم لیگ کی مجلس عامہ میں چوہدری خلیق الزمان، میاں امیر الدین، خان حبیب اللہ خان، محمد شعیب، ذوالفقار علی بھٹو، محمد خان جونیجو، شیخ مسعود صادق، احمد نواز گردیزی، فدا محمد خان، چوہدری ظہور الٰہی، بیگم جی اے خان اور سردار نذر محمد خان ترین شامل تھے۔ ان میں سے اکثر اصحاب اس دور میں نوخیز سیاست دان تھے۔ ایبڈو زدہ سیاست دان بھی دوبارہ سیاست میں داخل ہونے کے لیے بے چین تھے۔ شیر سرحد خان عبدالقیوم خان نے سب سے پہلے ایوب خان کو معافی کی درخواست دی۔ پھر حسن محمود، غلام علی تالپور، قاضی فضل اللہ، ایوب کھوڑو وغیرہ لائن میں لگ گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ایوب خان کو اپنے گھر لاڑکانہ میں ڈنر پر بلا کر ان تمام حضرات کو معافی دلوادی۔ اس ڈنر میں امریکی سفیر بھی شامل ہوا۔

اس دور میں کوئی بھی وزیر رکن اسمبلی نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ جب 1963ء میں ضمنی انتخابات ہوئے تو جاگیرداروں کی موروثی سیاست سامنے آئی۔ وزیروں نے اپنی نشستیں اپنے رشتے داروں اور عزیزوں میں بانٹ دیں۔ بھٹو صاحب نے اپنی نشست پر اپنے چچا اور بھٹو قبیلے کے سردار پیر بخش بھٹو کو انتخاب لڑوایا۔

فاطمہ جناح نے انتخابات میں حصہ لیا، ایوبی آمریت کا زوال شروع ہو گیا

فیلڈ مارشل ایوب خان نے صدارتی انتخاب لڑنے کا اعلان کر دیا۔ یہ انتخاب 2 رجنوری 1965ء میں ہونا قرار پائے۔ اس سے پہلے بنیادی جمہوریت کے ممبر یعنی بی ڈی ممبران منتخب ہو چکے تھے جن کی تعداد مشرقی اور مغربی پاکستان میں مجموعی طور پر 80 ہزار تھی جنھوں نے ان صدارتی انتخابات میں حصہ لینا تھا اور صدر کو چننا تھا۔ 40 ہزار مغربی پاکستان میں اور 40 ہزار مشرقی پاکستان میں۔ مشرقی پاکستان کا عددی قد چھوٹا کر کے مغربی پاکستان

کے برابر کرلیا گیا تھا۔ ایوب خان کو یقین تھا کہ متحدہ حزب اختلاف کے پاس کوئی ایسا امیدوار نہیں ہوگا جوان کا مقابلہ کر سکے۔ مگر جب محترمہ فاطمہ جناح نے، جنہوں نے اپنے بھائی قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ تحریک پاکستان میں اہم کردار ادا کیا تھا اس صدارتی انتخاب میں ایوب خان کے خلاف انتخاب لڑنے کا اعلان کیا تو ایوبی آمریت کا قلعہ ہلنے لگا۔ ایوب خان بوکھلا اٹھے۔

مادرملت ویسے تو متحدہ حزب اختلاف کی مشترکہ امیدوار تھیں مگر کونسل لیگ کے پلیٹ فارم سے وہ انتخاب لڑ رہی تھیں اور خان عبدالولی خان کی نیشنل عوامی پارٹی (ولی خان کے والد خان عبدالغفار خان عرف باچا خان نے قیام پاکستان کی مخالف کی تھی) اور جماعت اسلامی جیسی جماعتیں جو پاکستان، قیام پاکستان اور قائداعظم کے خلاف رہی تھیں اور وہ مودودی صاحب جن کا ہمیشہ یہ موقف رہا تھا کہ اسلام میں عورت کی سربراہی جائز نہیں، محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت میں پیش پیش تھے۔

اس دوران یہ شک تھا کہ چونکہ ایوب خان فیلڈ مارشل کی حیثیت سے سرکاری ملازم ہیں، کہیں چیف الیکشن کمشنر ان کو انتخاب لڑنے کا نااہل نہ قرار دے دے۔ چنانچہ دھاندلی کی ضرورت پڑی اور یہ دھاندلی کی گئی۔ مرکزی حکومت کی جانب سے ایک نوٹیفکیشن جاری کیا گیا جس میں کہا گیا کہ صدر ایوب خان فلاں پچھلی تاریخ سے فیلڈ مارشل کے عہدے سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اس دھاندلی کے باوجود وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو اور وزیر خزانہ شعیب کے کاغذات بھی متبادل صدارتی امیدوار کے طور پر داخل کئے گئے۔ ان دنوں بھٹو صاحب صدر ایوب خان کو کمال اتاترک، ایشیاء کا ڈیگال اور صلاح الدین ایوبی جیسا مرد مجاہد کہا کرتے تھے۔

اخبارات کو حکم تھا کہ محترمہ فاطمہ جناح کو مادرملت نہ لکھا جائے۔ اس حکم کو نوائے وقت کے علاوہ تمام اخبارات نے حکم سمجھ کر قبول کیا۔ اس انتخاب میں پاکستان کے عام شہریوں کو ووٹ ڈالنے کا حق نہیں تھا بلکہ منتخب بی ڈی ممبران کو صرف یہ حق حاصل تھا۔ صدر ایوب خان، امیر محمد خان اور منعم خان کی دہشت اور سرکاری مشینری کے مکمل استعمال کے

باوجود محترمہ فاطمہ جناح نے مشرقی پاکستان میں 18080 ووٹ حاصل کئے جب کہ ایوب خان کو 20720 ووٹ ملے۔ دھاندلی اس انداز سے کی گئی تھی کہ انتخابات غیر جانبدار اور شفاف نظر آئیں۔

ایوب خان کی آمریت کے تابوت میں یہ پہلا کیل تھا۔ مگر ایوب خان اپنے قصیدہ خوانوں میں خوش تھے۔ جب اسلام آباد کو دارالحکومت بنایا گیا تو راجہ حسن اختر نے صدر ایوب خان کو مصطفیٰ کمال پاشا سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا کہ ''جس طرح مصطفیٰ کمال پاشا ترکی کا دارالخلافہ قسطنطنیہ سے انقرہ لے گئے تھے اسی طرح ایوب خان کراچی سے دارالحکومت اسلام آباد لے گئے ہیں۔'' سعید الزمان نے اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''صدر ایوب اکبر اعظم ہیں بلکہ اکبر اعظم سے بھی ایک درجہ بلند۔ اکبر اعظم نے تو صرف نورتن جمع کئے تھے۔ صدر ایوب کے دس وزراء ان کے دس رتن ہیں۔'' یوسف خٹک نے انہیں نپولین سے تشبیہہ دی۔ میاں عبدالباری سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ''صدر ایوب مصطفیٰ کمال پاشا ہیں نہ اکبر اعظم نہ نپولین۔ وہ تو محض محمد شاہ رنگیلا ہیں۔''

محترمہ فاطمہ جناح انتخاب ہار کر بھی جیت گئیں۔ ایوب خان کا زوال شروع ہوگیا۔ محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دینے پر کراچی کے مہاجروں کو سزا دی گئی۔ ایوب خان کے بیٹوں نے جیت کے نشے میں لالوکھیت اور ناظم آباد کے محنت کشوں کی جھگیاں جلا کر رقص فتح کیا۔ یہاں پر قتل عام کیا گیا اور ایوب خان نے کہا کہ اگر مہاجرین کو کراچی میں ہم پناہ نہ دیں تو انہیں بحیرہ عرب میں ڈوبنا پڑے۔ ایوب خان اور ان کی پارٹی کنونشن مسلم لیگ پر ابھی اس فتح کا نشہ طاری تھا کہ کشمیر میں کھٹ پٹ شروع ہوگئی۔

مسئلہ کشمیر اور پاک بھارت جنگ 1965ء

کشمیر کے معاملے پر پاکستان اور بھارت کے تعلقات شروع سے ہی کشیدہ چلے آرہے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ بھارت آہستہ آہستہ کشمیر کے اندرونی معاملات پر قبضہ کرتا چلا آیا تھا۔ اگست 1953ء میں شیخ عبداللہ جو کہ شروع میں کمیونسٹ نواز تھا اور کشمیر کی مکمل آزادی چاہتا تھا، کشمیر میں اس کی حکومت کو معزول کئے جانے کے بعد سری نگر اور دہلی کے درمیان تعلقات کو باقاعدہ آئینی شکل دی جانے لگی تھی۔ جنوری 1957ء میں جموں و کشمیر کو نیا آئین دیا گیا جس میں ریاست کشمیر کو یونین آف انڈیا کا حصہ قرار دے دیا گیا۔ اکتوبر 1963ء میں جموں اور کشمیر کے وزیراعظم بخشی غلام محمد نے مزید آئینی تبدیلیاں کیں جن کے ذریعے ریاست پر بھارت کا قبضہ مضبوط ہوگیا۔

8/اپریل 1964ء کو نہرو حکومت نے جب شیخ عبداللہ کو رہا کیا تو اس کو ایوب خان سے ملاقات کی اجازت ملی۔ مئی 1964ء میں شیخ عبداللہ کا راولپنڈی میں ہزاروں افراد نے استقبال کیا۔ ایوب خان نے اعلان کیا کہ وہ جون 1964ء میں نہرو کے ساتھ مسئلہ کشمیر پر مذاکرات کے لیے بھارت جائیں گے اور پہلی بار کشمیر کے مسئلہ پر مثبت پیش رفت کی امید نظر آنے لگی۔ مگر 27/مئی 1964ء کو نہرو کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد لال بہادر شاستری کی حکومت نے 4/دسمبر 1964ء کو آئین کی آرٹیکلز 356 اور 357 کا اضافہ کیا جس کی رو سے کشمیر کو بھی دیگر بھارتی ریاستوں کی طرح براہ راست بھارتی صدارتی راج کے ماتحت کر دیا گیا۔ شاستری نے اعلان کر دیا کہ جموں و کشمیر کی ریاست بھارت کا اٹوٹ انگ ہے اور پاکستان کا اس کے کسی حصے پر کوئی حق نہیں۔ اس طرح پاکستان اور

بھارت کے درمیان پہلے سے موجود کشیدگی میں مزید اضافہ ہوگیا۔

اقوام متحدہ اور سیکورٹی کونسل اینگلو امریکی سامراج کے زیر اثر تھے اور مسئلہ کشمیر تھا کہ حل ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ستمبر 1947ء میں جب جموں میں ہونے والے مسلمانوں کے قتل عام کی وجہ سے 80 ہزار کشمیری سیالکوٹ میں ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے اس وقت سے لے کر اب تک مقبوضہ کشمیر میں بھارتی حکومت کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل عام جاری تھا۔ شروع کے نسلی فسادات میں تو پٹیالہ، فرید کوٹ اور نابھا کی ریاستوں سے مسلح سکھوں کے جتھوں نے بھی ریاستی پولیس اور ڈوگرہ فوج کے ساتھ مل کر اس قتل عام میں حصہ لیا تھا اور جب اس مسلم کشی کو روکنے کے لیے قبائلی پٹھان جموں میں داخل ہوئے تھے تو ان قبائلی رضا کاروں کو روکنے کے لیے کشمیر کے راجہ نے بھارتی افواج کی مدد مانگی تھی۔ جواب مستقل طور پر کشمیر میں براجمان تھیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بھارتی فوج کے اس اپریشن کی خودنگرانی کی تھی اور جب قائداعظم نے پاکستانی فوج کے کمانڈر جنرل گریسی کو کشمیر میں فوجیں بھیجنے کا حکم دیا تھا تو اس نے قائداعظم کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

1947-49ء میں کشمیر کی محاذ آرائی کے نتیجے میں پاکستان کی دفاع کی سیاسی معیشت نے جنم لیا۔ نتیجتاً 1947-50ء میں ہی ہمارے قومی بجٹ کا 70 فی صد محکمہ دفاع کو مختص کیا جانے لگا۔ اور بعد میں عائشہ جلال کی کتاب The State of Martial Rule صفحہ 238 کے مطابق امریکی انٹیلی جنس رپورٹ نے اس امر کی تصدیق کر دی کہ 1958ء تک پاکستانی فوج ایک پریشر گروپ بن چکی ہے اور ملک کی معاشی ترقی کے مقابلے میں اپنا حصہ ترجیحی بنیادوں پر حاصل کرتی رہے گی خواہ بھارت ایک وجہ ہو یا نہ ہو۔

قومی پیداوار کا اکثریتی حصہ مشرقی پاکستان سے آتا تھا اور پاکستان کی فوجی اور انتظامی ضرورتوں پر خرچ ہوتا تھا جبکہ مسئلہ کشمیر مشرقی پاکستان کے لیے اتنی اہمیت کا حامل نہیں تھا جتنا کہ مغربی پاکستان کے لیے تھا۔ مگر مشرقی پاکستان کے عوام کو یہ باور کرایا جاتا تھا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان میں ہے۔ مفروضہ یہ تھا کہ اگر مشرقی پاکستان پر بھارت نے کبھی حملہ کیا تو بھارت کے ساتھ مغربی پاکستان کے محاذ پر لڑ کر مشرقی پاکستان کو

بچایا جائے گا۔ یہ مفروضہ 1971ء کی پاک بھارت جنگ میں غلط ثابت ہوا۔

سرد جنگ میں پاکستان امریکہ کی ضرورت تھا اور پاکستان کا دفاع اور انتظامی امور پر سالانہ خرچ اس کے وسائل سے زیادہ تھا۔ امریکہ پاکستان کی اس معاشی صورت حال سے پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ جب 1954ء میں امریکہ کی فوجی اور معاشی امداد پاکستان پہنچی تو سیٹو اور بغداد پیکٹ جو بعد میں سینٹو کہلایا، اس کا حصہ تھے یعنی ان معاہدوں میں پاکستان کی شمولیت اس امداد کے ساتھ مشروط تھی۔ ہماری خارجہ اور اندرونی پالیسیاں امریکہ کے تابع تھیں۔ سول اور ملٹری بیوروکریسی کا ملک کے تمام معاملات پر مکمل کنٹرول تھا۔

چنانچہ جب پاکستان کا سوشلسٹ ممالک بالخصوص چین کی طرف جھکاؤ ہوا اور خارجہ پالیسی میں تبدیلی آنے لگی تو Ian Talbot کی کتاب Pakistan a Modern History صفحہ 177 اور پاکستان کرانیکل کے صفحہ 128 کے مطابق کشمیر کو لڑ کر آزاد کروانے کا تصور مضبوط ہونے لگا اور وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے ایوب خان کو قائل کر لیا کہ کشمیر کو گوریلا لڑائی لڑ کر آزاد کروایا جا سکتا ہے۔ کشمیر میں گوریلا جنگ لڑنے کے پس منظر میں چند ایک ایسے واقعات بھی تھے جنہوں نے اس تصور کو تقویت دی تھی۔

''آپریشن جبرالٹر''، لڑ کر کشمیر کو آزاد کروایا جائے

1962ء میں جب بھارت اور چین کی جنگ ہوئی تو بھارتی افواج کی ناقص کارکردگی اور کمزور صلاحیت کا مظاہرہ ہوا۔ 1963ء میں جب سری نگر میں اپردل جھیل کے کنارے حضرت بل کے مزار سے رسول پاک ﷺ کے تبرکات، موئے مبارک غائب کر دیئے گئے تو سری نگر میں شدید ہنگامے ہوئے اور بڑے پیمانے پر نسلی فسادات ہوئے۔ جنوری 1964ء میں کراچی، کھلنا، جیسور، کلکتہ اور بھارت کے تمام بڑے شہروں میں مسلمانوں نے شدید احتجاج کیا۔ پھر 1965ء کے اوائل میں رن آف کچھ میں بھارتی اور پاکستانی بارڈر پولیس کے درمیان جھڑپیں ہوئیں جو کہ باقاعدہ لڑائی کی شکل اختیار کر گئیں اور پاکستانی افواج نے بھارت کو شکست دی۔

ان واقعات کی روشنی میں کشمیر میں گوریلا لڑائی لڑنے کا منصوبہ بنایا گیا جس کو ''آپریشن جبرالٹر'' کا نام دیا گیا۔ جنرل گل حسن کی یاداشتوں کی کتاب Memoirs of Lt. General Gul Hassan Khan کے صفحہ 169,168,167,116 کے مطابق رن آف کچھ کے فوراً بعد اس گوریلا لڑائی پر سنجیدگی سے سوچا جانے لگا۔ وزارت خارجہ میں ایک خفیہ کشمیر سیل قائم کیا گیا جس میں جنرل گل حسن بھی شامل تھا۔ بھٹو صاحب بطور وزیر خارجہ اس سیل کے نگران تھے۔

جنرل گل حسن 1965ء میں ڈائریکٹر ملٹری آپریشن تھا اور بھٹو صاحب کے ساتھ اس کی دوستی تھی۔ بعد میں جنرل گل حسن کو بھٹو صاحب کے اقتدار میں آنے کے بعد افواج پاکستان کا کمانڈر ان چیف بھی مقرر کیا گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ رن آف کچھ میں پاکستان سے شکست کے بعد بھارتی افواج کا حوصلہ پست تھا۔ اس وقت یہ فیصلہ کیا گیا کہ کشمیر میں گوریلا لڑائی لڑ کر جو پاکستانی افواج کی مدد سے لڑی جائے، کشمیر کو آزاد کرایا جا سکتا ہے۔ الطاف گوہر کی کتاب ''پاکستان کا پہلا فوجی حکمران'' صفحہ 319 کے مطابق سیکرٹری وزارت خارجہ عزیز احمد کا بھی یہی خیال تھا۔ ''آپریشن جبرالٹر'' میں جہاں بھارتی فوج کی رن آف کچھ میں شکست اور بھارت چین جنگ میں بھارتی فوج کی ناقص کارکردگی کی وجوہات تھیں وہاں ایک مفروضہ یہ بھی تھا اور جس کی بنیاد حضرت بل کے واقعہ پر مسلمانوں کا شدید ردعمل تھا کہ جب ''آپریشن جبرالٹر'' شروع ہوگا تو مقامی کشمیری مسلمان بھی اس گوریلا لڑائی میں شامل ہو کر شانہ بشانہ لڑیں گے اور بھارتی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ مزید یہ کہ اگر بھارت اس مسئلے میں الجھا بھی تو محض کشمیر کی حد تک ہی الجھے گا۔ مگر جب آپریشن شروع ہوا تو نہ تو کشمیری عوام اس طرح سے اس میں شامل ہوئے جس طرح کی توقع کی جا رہی تھی اور نہ ہی بھارت کشمیر تک محدود رہا۔ اس نے اس جنگ کو پاکستان کی سرحدوں تک پھیلا دیا جو کہ ستمبر 1965ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان بھرپور اور مکمل جنگ کی شکل اختیار کر گئی۔

مسئلہ کشمیر کی المناک داستان

تنازعہ کشمیر کی المناک داستان پر ایک نظر ڈالی جائے تو حقائق کچھ اس طرح نظر آتے ہیں۔

1- 1947ء میں برطانوی سامراج کے وزیر اعظم ایٹلی کی زیر قیادت برسر اقتدار ٹولے نے ریاست جموں و کشمیر کو ہندوستان کے بورژوا ارباب اقتدار کے حوالے کر دیا تھا۔ حالانکہ برصغیر کی تقسیم جس اصول کی بنیاد پر ہوئی تھی اس کے مطابق یہ علاقہ پاکستان میں شامل کیا جانا چاہیے تھا۔

2- فروری 1948ء میں برطانیہ کے وزیر امور دولت مشترکہ نوئل بیکر نے وزیر خارجہ بیون کی ہدایت کے مطابق اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں یہ کوشش کی تھی کہ یہ متنازعہ علاقہ اقوام متحدہ کی مدد سے پاکستان کو مل جائے مگر ہندوستان کے گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن، برطانیہ کے وزیر خزانہ سر سٹیفورڈ کرپس اور وزیر اعظم ایٹلی کی مخالفت کے باعث اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی اور پھر سلامتی کونسل میں ایک ایسی قرارداد منظور کی گئی جس کا عملاً مقصد یہ تھا کہ یہ علاقہ ہندوستان کے پاس ہی رہے۔

3- 1949-50ء میں برطانوی سامراج نے نیم دلانہ کوشش کی کہ تنازعہ کشمیر کے بارے میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کوئی پر امن تصفیہ ہو جائے اور اگر وادئ کشمیر کا علاقہ پاکستان کو مل جائے تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔

4- 1951-52ء میں اینگلو امریکی سامراج نے کوشش کی کہ اقوام متحدہ کی مدد سے وادی کشمیر پاکستان کو مل جائے۔

5- 1953-56ء میں اینگلو امریکی سامراج نے یہ کوشش کی کہ تنازعہ کشمیر کو بین الاقوامی سطح پر مزید زیر بحث لا کر ہندوستان کے حکمران بورژوا طبقے کی ناراضگی میں اضافہ نہ کیا جائے بلکہ دوطرفہ بات چیت کے ذریعے کسی نہ کسی طرح کی تقسیم

کی بنیاد پر تنازعہ کشمیر کا پرامن تصفیہ کرا دیا جائے۔

6- 1957-58ء میں اینگلو امریکی سامراج کی پالیسی یہ تھی کہ کشمیر کا جو علاقہ ہندوستان کے قبضے میں ہے وہ اس کے پاس رہنے دیا جائے اور تنازعہ کشمیر کو بالائے طاق رکھ کر چین کے خلاف ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مشترکہ دفاعی نظام قائم کیا جائے۔

کشمیر کے معاملے پر اینگلو امریکی سامراج کی پالیسی میں اتار چڑھاؤ کیوں آتا رہا اور مندرجہ بالا حقائق کی تفصیلات جاننے کے لیے زاہد چودھری اور حسن جعفر زیدی کی ''پاکستان کی سیاسی تاریخ'' کے سلسلۂ تحقیق کی بارہ جلدوں میں سے تیسری جلد ''پاک بھارت تنازعہ اور مسئلہ کشمیر کا آغاز'' کا مطالعہ ضروری ہے۔

کشمیر کی سرحدیں چین اور روس کے ساتھ ہیں۔ اینگلو امریکی سامراج کسی بھی طرح کشمیر کی جغرافیائی اور دفاعی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اور نہ پاکستان کر سکتا ہے۔ بھارت کا بھی یہی معاملہ ہے۔

1947ء میں تقسیم ہند کے وقت دنیا سرد جنگ میں داخل ہو چکی تھی۔ 1948ء کے وسط میں کمیونسٹوں نے تقریباً سارے چین پر قبضہ کر لیا تھا اور کچھ عرصہ بعد ان کی فوجیں سنکیانگ اور تبت میں پہنچ گئیں۔ کشمیر جغرافیائی اعتبار سے کیمونسٹ سنکیانگ اور تبت سے منسلک ہے۔ 1949ء میں ماؤزے تنگ کی قیادت میں اشتراکی انقلاب کے بعد جب چین مکمل طور پر آزاد ہوا تو طاقت کا توازن کمیونزم اور سوویت بلاک کے حق میں ہو گیا۔ دنیا امریکی بلاک اور کمیونسٹ بلاک میں تقسیم ہو گئی۔

1947-50ء میں کشمیر میں شیخ عبداللہ کی حکومت کافی حد تک مقامی کمیونسٹوں کے زیر اثر تھی۔ شیخ عبداللہ بھی اپنی تقریروں میں اشتراکی اصطلاحات استعمال کرتا تھا اور اس نے 1948-49ء میں کشمیر کے بارے میں اینگلو امریکی سامراج کے عزائم کی کھلے الفاظ میں مخالفت کی تھی اور 1950ء میں کوریا پر امریکی سامراج کے حملے کی پرزور مذمت کی تھی۔ اس کے علاوہ کشمیر نیشنل کانفرنس کی قراردادوں میں اینگلو امریکی سامراج کی

مذمت کی جاتی تھی۔ اس وقت کشمیر کے کمیونسٹوں کی پالیسی یہ تھی کہ کشمیر کو جس قدر ممکن ہو بھارت سے الگ تھلگ رکھا جائے۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ کشمیر کو ہندوستان یا پاکستان میں شامل نہیں ہونا چاہیے اور فی الحال آزاد رہنا چاہیے۔

شیخ عبداللہ نے اپریل 1949ء میں لندن آبزرور سے ایک انٹرویو کے دوران کشمیر کے ہندوستان یا پاکستان میں شامل ہونے کی مخالفت کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ''کشمیر کو آزاد ہونا چاہیے اور ہندوستان، پاکستان، برطانیہ اور امریکہ کے علاوہ اقوام متحدہ کے دوسرے رکن ممالک کو اس کی آزادی کی ضمانت دینی چاہیے۔'' لیکن بعد میں 18 رمئی کو وہ اس بیان سے منحرف ہوگیا۔ شیخ عبداللہ نہرو کا ''ذاتی دوست'' تھا۔

1948-49ء میں نہرو ابھی تک سوویت یونین کا منظور نظر نہیں تھا۔ پریم ناتھ بزاز کی کتاب "The History of Struggle for Freedom in Kashmir" (صفحہ 418-428) کے مطابق کشمیر کی کمیونسٹ پارٹی کی سرکاری حلقوں سے باہر کوئی مقبولیت نہیں تھی۔ وادیٔ کشمیر کے مسلم عوام ان سے نفرت کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ کشمیر کی کمیونسٹ پارٹی زیادہ تر ہندوؤں پر مشتمل تھی اور ان ہندو کمیونسٹوں نے مارکسزم کی علمبرداری کے باوجود اپنے فرقہ وارانہ رجحان کو ترک نہیں کیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اگر کشمیر کا دونوں ملکوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ملحق ہونا لازمی ہے تو پھر اس کو ہندوستان میں شامل ہونا چاہیے۔ ان کا فرقہ پرستانہ رویہ کشمیری مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں تھا اور اسی بناء پر 1950ء میں کشمیر کمیونسٹ پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ جب پارٹی کے مسلم ارکان کی اکثریت محی الدین کرا کی قیادت میں ہندو کمیونسٹوں سے الگ ہوگئی تو ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے کشمیر کے ہندو دھڑے کا ساتھ دیا۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی سوویت یونین کے زیر اثر تھی۔

اس وقت امریکی سامراج پاکستان میں اپنے حاشیہ بردار حکمرانوں کے ذریعے گلگت میں اپنے فوجی اڈے قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت تک نوابزادہ لیاقت علی خان جس نے 1948ء میں اپنے وزیر خارجہ ظفر اللہ خان کی وساطت سے سوویت یونین سے سفارتی

تعلقات قائم کرنے کی ابتدا کی تھی اور 1949ء میں سٹالن کی دعوت کو اعلانیہ قبول کرنے کے باوجود سوویت یونین نہیں گیا بلکہ وہ ٹرومین کی دعوت پر 1950ء کے اوائل میں امریکہ چلا گیا تھا اور اپنے دورۂ امریکہ کے دوران سوویت یونین اور چین کے خلاف اینگلو امریکی سامراج کا ساتھ دینے پر اعلانیہ آمادگی کا اظہار کر چکا تھا۔

نہرو نہ تو سوشلسٹ تھا اور نہ ہی سیکولر

ادھر نہرو بھی کمیونسٹ مخالف تھا اور آزادی کے فوراً بعد نہ صرف اندرون ملک کمیونسٹوں کی سرکوبی کے لیے وسیع پیمانے پر اس نے مہم شروع کر رکھی تھی بلکہ اس نے برما کی حکومت کو ''کمیونسٹوں کی بغاوت'' کچلنے کے لیے ہر قسم کی عملی امداد بھی جاری رکھی ہوئی تھی۔ اس نے حکومت برطانیہ کو یہ سہولت بھی دی تھی کہ وہ ملایا میں کمیونسٹوں کی زیر قیادت تحریک آزادی کو بزور قوت ختم کرنے کے لیے گورکھا فوج کی بھرتی کر لے۔

نہرو نے ویت نام میں ہوچی منہ کی زیر قیادت تحریک آزادی کی تائید وحمایت کرنے کی بجائے فرانسیسی سامراج کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ وہ انڈونیشیا کی تحریک آزادی کا محض اس لیے حامی تھا کہ اس تحریک کی قیادت کمیونسٹ پارٹی نہیں کر رہی تھی۔ وہ برطانوی سامراج کی اس رائے سے اتفاق کرتا تھا کہ انڈونیشیا کے بورژوا قوم پرستوں کو جلد از جلد اقتدار منتقل کر دیا جائے ورنہ یہ تحریک آزادی مکمل طور پر کمیونسٹوں کے قبضے میں چلی جائے گی۔

نہرو جس کو سوشلسٹ اور سیکولر بنا کر پیش کیا جاتا ہے دراصل نہ تو سوشلسٹ تھا اور نہ ہی سیکولر۔ ان دنوں یعنی 49-1948ء میں جب کبھی بھی سوویت یونین کے اخبارات میں جواہر لال نہرو کا ذکر کیا جاتا تھا تو اسے ''ہندوستان کا چیانگ کائی شک'' اور سامراج کا پٹھو کہا جاتا تھا اور شیخ عبداللہ کی ترقی پسندی اور جمہوریت نوازی کی تعریف کی جاتی تھی۔ ایشیاء میں کمیونسٹوں کی زیر قیادت آزادی کی تحریکوں کو کچلنے کے لیے اینگلو امریکی سامراج لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے دوست نہرو سے مکمل فائدہ اٹھا رہا تھا۔ رجنی پالمے دت کی کتاب "The Crisis of Britain and the British Empire" کے مطابق ''نہرو

کی حکومت پرانے برطانوی سامراج سے بدستور وابستہ تھی۔ اس کی سول اور فوجی مشینری کا ڈھانچہ وہی تھا جو برطانوی سامراجیوں نے تعمیر کیا تھا۔ وہی بیوروکریسی، وہی عدلیہ اور وہی پولیس تھی اور عوام الناس پر جبر و تشدد کے بھی وہی سامراجی طریقے تھے۔ نہتے عوام کو لاٹھیوں اور گولیوں سے مارا جاتا تھا۔ مزدوروں اور کسانوں کی تنظیموں کو دبایا جاتا تھا اور جیلیں بائیں بازو کے ہزاروں سیاسی قیدیوں سے بھری پڑی تھیں۔

''سامراج کی سرمایہ کاری اور مالی مفادات کا بڑی سرگرمی سے تحفظ کیا جاتا تھا اور بیرونی سامراجیوں کو غریب عوام کا استحصال کرنے کی کھلی چھٹی تھی، فوج پر بھی انگریزوں کا غلبہ تھا اور ابتدائی مراحل میں تو نہ صرف گورنر جنرل انگریز تھا بلکہ اہم صوبوں میں گورنری کے عہدوں پر بھی انگریز متعین تھے۔ نہ صرف تینوں افواج کے کمانڈر انچیف انگریز تھے بلکہ افواج کے بہت سے دوسرے کلیدی عہدوں پر بھی انگریز بطور مشیر فائز تھے۔ عوامی تحریکوں بالخصوص مزدوروں اور کسانوں کی تحریکوں کو بری طرح کچلا جاتا تھا۔ 1948ء میں کمیونسٹ پارٹی، آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگرس، مزدوروں اور کسانوں کی تنظیمیں اور بائیں بازو کے اخبارات کے خلاف بڑی جارحانہ کاروائی کی گئی تھی۔ پہلے مغربی بنگال اور پھر مدراس میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگا دی گئی تھی اور دوسرے صوبوں میں بھی پارٹی تقریباً غیر قانونی حالت میں ہی تھی۔ مزدوروں کے تقریباً سارے بڑے لیڈر جیلوں میں بند تھے اور جیلوں کے اندر اور باہر بہت سے نہتے مظاہرین پولیس کی گولیوں سے ہلاک ہو گئے تھے۔

سامراجیوں نے غریب عوام کی تحریکوں کو کچلنے کے لیے جو قوانین بنائے ہوئے تھے ان میں سے کسی قانون کو منسوخ نہیں کیا گیا تھا بلکہ ان سب کو مزید سخت کر دیا گیا تھا۔ 1949ء میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگرس کے بیان میں بتایا گیا تھا کہ ان دنوں مزدوروں اور کسانوں کے تقریباً 25 ہزار لیڈر جیلوں میں بند تھے اور ان میں سے بیشتر کے خلاف نہ تو کوئی الزام عائد کیا گیا تھا اور نہ ہی کوئی مقدمہ چلایا گیا تھا۔ 1950ء میں حکومت ہندوستان نے ایک سرکاری بیان میں تسلیم کیا تھا کہ 15 راگست 1947ء سے لے کر یکم اگست 1950ء تک پولیس اور فوج نے 1982 مرتبہ گولی چلائی تھی جس سے 3784 افراد مارے گئے تھے اور تقریباً دس

ہزار زخمی ہوئے تھے، پچاس ہزار افراد کو قید کیا گیا تھا جن میں سے 82 قیدی جیلوں کے اندر پولیس کی گولیوں سے جاں بحق ہو گئے تھے۔"

رجنی پالمے دت نے اپنی کتاب میں نئے ہندوستان کے معاشی اور انتظامی ڈھانچے کا تفصیل کے ساتھ نقشہ کھینچا ہے۔ اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ 50-1947ء میں نہرو کی معاشی پالیسی بھی مغربی سامراج کے مفادات کے تابع تھی۔ انڈین نیشنل کانگرس نے آزادی سے پہلے ہندوستانی معیشت پر غیر ملکی کنٹرول ختم کرنے کے لیے بڑی بڑی صنعتوں کا جو پروگرام بنایا ہوا تھا نہرو کی حکومت نے اس پر کوئی عمل نہیں کیا تھا بلکہ 17 رفروری 1948ء کو یہ اعلان کیا تھا کہ ملک کے معاشی ڈھانچے میں یکا یک کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ موجودہ صنعتوں کو حتی الامکان قومی ملکیت میں نہیں لیا جائے گا۔ پھر اپریل 1948ء میں حکومت ہندوستان نے اپنی معاشی پالیسی کے بارے میں جو قرارداد منظور کی تھی اس کے مطابق غیر ملکی سرمایہ داروں کو یقین دلایا گیا تھا کہ انہیں ہندوستان کی صنعتوں میں سرمایہ کاری کرنے کی کھلی چھٹی ہوگی۔ ہندوستان کے بڑے بڑے صنعت کار اور تاجر نہرو کی اس بے قید پالیسی سے بہت خوش تھے۔

جب اپریل 1949ء میں کامن ویلتھ وزرائے اعظم کی کانفرنس نے اعلان کیا کہ ہندوستان ایک آزاد خود مختار جمہوریہ ہونے کے باوجود برطانوی کامن ویلتھ میں شامل رہے گا تو سارے سامراجیوں نے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ اکتوبر 1949ء میں جب نہرو امریکہ گیا تو نیو یارک ٹائمز کا تبصرہ تھا کہ ایشیاء میں ایک جمہوری مرکز کے قیام کے لیے واشنگٹن نے اپنی امیدیں ہندوستان سے جو ایشیاء کی دوسری سب سے بڑی قوم ہے اور وزیر اعظم جواہر لال نہرو سے جو ہندوستان کی پالیسی متعین کرتا ہے وابستہ کر رکھی ہیں۔ اور پھر اسی اخبار نے اگست 1950ء میں لکھا کہ نہرو دراصل جمہوریت کی جانب سے ماؤزے تنگ کا جوابی مہرہ ہے۔ اگر پنڈت نہرو ایشیاء کی حمایت حاصل کرنے کی جدوجہد میں اتحادی بن جائے تو اس کی قدر و قیمت بہت سی ڈویژن فوجوں کے برابر ہوگی۔

نیو یارک ٹائمز نے نہرو کا قصیدہ اس لیے بھی لکھا تھا کہ بھارت نے جون

1950ء میں کوریا پر امریکی حملے کے متعلق اقوام متحدہ میں اینگلو امریکی سامراج کی قرارداد کی تائید وحمایت کی تھی اور 20/اکتوبر 1950ء کو لندن کے ڈیلی ٹیلی گراف کی ایک رپورٹ کے مطابق چرچل نے امریکی کانگریس کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''برطانوی ایمپائر اور کامن ویلتھ میں درحقیقت کوئی فرق نہیں ہے۔ ہم اپنے سارے گاہکوں کے ذوق کے مطابق اپنے تجارتی لیبل استعمال کرتے ہیں۔''

عالمی سامراج آج تک کبھی ''جمہوریت کی بقا کے لیے''، کبھی ''جمہوری نظام کے نفاذ کے لیے''، کبھی ''انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے'' جیسے لیبل لگا کر اپنی اور نیٹو کی افواج کے ذریعے اور کبھی غریب اقوام کے سربراہوں کو ساتھ ملا کر، ڈکیٹر بٹھا کر، جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں کی پارلیمنٹ بنوا کر، کبھی حکومتوں کا تختہ الٹ کر اپنا یہ مال بیچتا رہا ہے اور ان اقوام کی اقتصادی اور سیاسی آزادیوں کو سلب کرتا رہا ہے۔

شنگھائی کے ایک اخباری مبصر کی رائے یہ تھی کہ ''امریکی سامراج نے ایشیا میں ہندوستان سے اپنی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کے مالی امداد کے پروگرام میں ہندوستان کو ترجیح دی جاتی ہے۔ نہرو کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ایک طرف تو امریکہ سے امداد حاصل کرنے کا خواہاں ہے اور دوسری طرف ہندوستانی عوام کو فریب دینے کے لیے ترقی پسندی کا منافقانہ کردار ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

اینگلو امریکی سامراج کا جھکاؤ کشمیر کے مسئلے پر بھارت کی جانب تھا

13/مئی کو پیکنگ ریڈیو کے ایک نشریے میں چین کے صوبے تبت کے خلاف ہندوستانی توسیع پسندوں اور امریکی سامراجیوں کی سازش کی شدید مذمت کی گئی۔ ریڈیو کا الزام تھا کہ نئی دہلی میں مقیم امریکی سفیر ہینڈرسن (Handerson) اور حکومت ہندوستان نے ایک معاہدہ کیا ہے جس کے تحت حکومت امریکہ رائفلیں، مشین گن اور دوسرے ہتھیار کلکتہ پہنچائے گی اور وہاں سے اسلحہ پہاڑی سڑکوں کے ذریعے تبت میں پہنچایا جائے گا۔ 17/جولائی کو حکومت برطانیہ نے یونائیٹڈ پریس انٹرنیشنل کو بتایا کہ اگر چین نے بزور قوت

تبت پر اقتدار قائم کرنے کی کوشش کی تو تبت برطانیہ کو مداخلت کی درخواست کر سکتا ہے اور پھر 8 اگست کو ہندوستان نے اعلان کر دیا کہ ریاست بھوٹان نے اس کے زیر تحفظ علاقے کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور تبت نے چین کی حاکمیت کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ ان حالات میں اینگلو امریکی سامراجیوں کو ایشیائی کمیونزم کے خلاف ہندوستان کی اہمیت کا پورا اندازہ تھا اور وہ اتنے بڑے ملک کو اپنے ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ جبکہ انہیں پاکستان کی جاگیردار اور سامراج نواز سول اور فوجی افسر شاہی کی جانب سے کوئی خطرہ نہیں تھا چنانچہ ان کا جھکاؤ کشمیر کے مسئلے پر بھارت کی جانب تھا۔

جنوری 1951ء میں جنرل محمد ایوب خان کے کمانڈر ان چیف بننے کے فوراً ہی بعد امریکہ اور پاکستان کے درمیان فوجی معاہدے کی بات چیت شروع ہو گئی تھی۔ میجر جنرل اکبر خان اپنی کتاب کے صفحہ 162-160 پر لکھتے ہیں۔ ''جنرل ایوب خان 1951ء میں روس اور چین کے حملے کے خطرے کا اکثر ذکر کیا کرتا تھا اور اس کی باتوں کی بنیاد یہ تھی کہ مغربی طاقتوں کو ایشیاء میں سوویت یونین اور چین کے خلاف فوجی اڈے قائم کرنے کی ضرورت تھی۔ ہندوستان نے بڑی طاقتوں کی اس رسہ کشی میں ملوث ہونے سے انکار کر دیا تھا لیکن پاکستان میں جنرل محمد ایوب خان جیسے عناصر ملک وقوم کی آزادی وخودمختاری کو سامراجیوں کے ہاتھوں فروخت کرنے پر آمادہ تھے۔''

جولائی 1952ء میں جنرل ایوب خان نے واشنگٹن میں مقیم پاکستانی ملٹری اتاشی بریگیڈیر غلام جیلانی کو ہدایت کی کہ وہ پاکستان اور امریکہ کے درمیان فوجی اتحاد کے امکانات کا جائزہ لے۔ 17 ستمبر کو امریکہ اور پاکستان کے درمیان ایک معاہدے پر دستخط ہوئے جس کے تحت امریکہ نے پاکستان کو 15 ملین ڈالر مالیت کی گندم کی سپلائی کی اور پھر نومبر 1952ء میں بحرالکاہل کے علاقے کا امریکی کمانڈر ان چیف ایڈمرل آرتھر ریڈ فورڈ پاکستان آیا اور اس نے 12 نومبر کو کراچی سے روانگی سے قبل اعلان کیا کہ پاکستان کا محل وقوع بڑی اہمیت کا حامل ہے اور یہ ملک کمیونزم کے خلاف عالمی جنگ میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ (ہم آج تک امریکہ کے مفادات کی جنگ امریکہ کے لیے لڑتے چلے آرہے

ہیں قوم کو یہ بتا کر کہ یہ ہمارے مفادات کی جنگ ہے کبھی اسلام کے نام پر اور کبھی دہشت گردی کے نام پر اینگلو امریکی سامراج ہمیں استعمال کرتا رہا ہے۔)

ایک طرف وزیر اعظم ایٹلی نے سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پر بھارت کی مخالفت نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا دوسری طرف اینگلو امریکی سامراج کو مشرق وسطیٰ میں پاکستان کی اسلامی مملکت کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت تھی اور وہ سلامتی کونسل میں کشمیر کے مسئلے پر پاکستان کو بھی خوش رکھنا چاہتا تھا۔ ان دنوں مشرق وسطیٰ کے سارے ممالک میں تنازعہ فلسطین کی وجہ سے اینگلو امریکی سامراج کے خلاف زبردست عوامی تحریکیں جاری تھیں اور پاکستان نے چونکہ اقوام متحدہ میں اس مسئلہ پر بحث کے دوران عربوں کے موقف کی پرزور وکالت کی تھی اور پاکستان کو پہلے کے مقابلے میں عرب ممالک میں قدرے عزت واحترام سے دیکھا جانے لگا تھا تو ایٹلی حکومت کا یہ خیال تھا کہ فلسطین کی تقسیم کے باعث مشرق وسطیٰ میں اینگلو امریکی سامراج کے اثر ورسوخ اور وقار کو جو نقصان پہنچا ہے اسے پاکستان کی ''اسلامی مملکت'' کے ذریعے پورا کیا جاسکتا ہے۔ ایٹلی نے امریکی حکومت کو بھی اس خیال سے متفق کر لیا تھا۔

پاکستان کو کمیونزم کے سیلاب کے سامنے بند باندھنے کے لیے اسے اسلامی نظریاتی مملکت بنانے کا عمل جاری ہوا تھا جو آج تک جاری ہے۔

ان دنوں پاکستان میں عالم اسلام کے اتحاد کے زبردست نعرے لگائے جا رہے تھے۔ بلکہ بعض حلقے تو پاکستان کو عالم اسلام کا لیڈر بنانے کے اعلانات کر رہے تھے۔ مگر ایٹلی کی حکومت نے جب سامراجی ترازو میں مسئلہ کشمیر پر ہندوستان کے بورژوا طبقے اور پاکستان کے جاگیردار طبقے کو تولا تو اسے ہندوستانی بورژوا کا پلڑا بھاری نظر آیا۔ جبکہ اسے غلام محمد، اکرام اللہ، سر ظفر اللہ، سکندر مرزا، چودھری محمد علی پر مشتمل افسر شاہی ٹولے کی وفاداری پر پورا اعتماد تھا۔ خواہ ایٹلی حکومت پاکستان کے مستقبل کے مفادات کے خلاف کوئی بھی فیصلہ کرتی، پاکستان کے جاگیردار پٹھوؤں سے بغاوت کے خطرے کا تو

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

چنانچہ فروری 1948ء میں برطانیہ کے وزیر امور دولت مشترکہ نوئل بیکر نے وزیر خارجہ بیون کی ہدایت کے مطابق اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں جو یہ کوشش کی تھی کہ یہ متنازعہ علاقہ اقوام متحدہ کی مدد سے پاکستان کو مل جائے، وزیر اعظم ایٹلی اور ہندوستان کے گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن نے اس کی مخالفت کی اور پھر سلامتی کونسل میں اپریل 1948ء میں ایسی قرارداد منظور کرائی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ کشمیر کا علاقہ ہندوستان کے پاس ہی رہے۔ اس مسئلے پر نوئل بیکر اور ایٹلی کے درمیان شدید اختلاف پیدا ہوا۔ ایٹلی نے پہلے تو بیکر کو کامن ویلتھ کی وزارت سے علیحدہ کر کے بجلی اور ایندھن کا وزیر بنایا پھر کچھ عرصے بعد وزارت سے الگ کر دیا۔

چرچل کی کنزرویٹو پارٹی نے بھی پاکستان اور کشمیر کے بارے میں لیبر حکومت کی فروری 1948ء کی پالیسی اور پھر اپریل 1948ء میں اس پالیسی میں یکا یک تبدیلی کی مخالفت نہیں کی بلکہ بعدازاں جب کنزرویٹو پارٹی اقتدار میں آئی تو اس نے اس پالیسی کو جاری رکھا۔ مسئلہ کشمیر پر برطانیہ کی اس قلابازی پر قائداعظم نے وزیر اعظم ایٹلی کو اپنے وزیر اعظم لیاقت علی خان کے ذریعے نہ صرف احتجاجی تار بھجوایا بلکہ انہوں نے پاکستان کے کامن ویلتھ سے الگ ہو جانے کی دھمکی بھی دی۔ انہوں نے امریکہ کے سفیر کو بلا کر حکومت امریکہ کو یہ پیغام بھی بھجوایا کہ پاکستان کے بارے میں برطانیہ کا رویہ منصفانہ نہیں اور یہ کہ ''امریکہ کو برطانیہ کی چالوں سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔''

غالباً اس وقت برطانوی سامراج کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ گورنر جنرل محمد علی جناح بیمار ہیں اور پاکستان کا حکمران وزیر اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان اور برطانیہ کا وفادار جاگیردار ٹولہ اور نوکر شاہی ہر صورت برطانیہ کے وفادار ہیں۔ مسئلہ کشمیر پر برطانیہ کے اس رویے کے خلاف پاکستان میں عوامی دباؤ تھا کہ کامن ویلتھ کو چھوڑ دیا جائے مگر لیاقت علی نے نہ تو کامن ویلتھ کو چھوڑا اور نہ ہی سوویت یونین سے تعلقات بنانے کی کوشش کی۔ ایٹلی

کا اندازہ ٹھیک تھا۔

سوویت یونین نے اپریل 1948ء کی سلامتی کونسل کی قرارداد پر رائے شماری میں حصہ نہیں لیا۔ اپنی اس غیر جانبداری کی آڑ میں وہ دونوں ممالک کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھنا چاہتا تھا۔ بلکہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے جو سوویت یونین کے زیر اثر تھی نہرو کی مخالفت ترک کر دی تھی۔ سوویت یونین کو بھارت کی ضرورت تھی اور کشمیر کی بھی۔

عالمی سامراج کے مفادات اور سوویت یونین کے مفادات کے درمیان کشمکش میں پاکستان حکومت نے پاکستان کے مفادات کو اینگلو امریکی مفادات کے ساتھ منسلک کر دیا جبکہ نہرو کمیونسٹ دشمنی بھی کر رہا تھا، سوویت یونین کے ساتھ دوستی کی پینگیں بھی بڑھا رہا تھا، اینگلو امریکی سامراج کے ساتھ بھی تعلقات رکھے ہوئے تھا۔ بلکہ کمیونزم کے خلاف سامراجی منصوبوں کی تکمیل کے لیے بھارت کی افرادی قوت، وسائل اور جغرافیائی محل وقوع کی اینگلو امریکی سامراج کو جس قدر اشد ضرورت تھی اس کے لئے نہرو نے ماؤنٹ بیٹن کے ذریعے برطانیہ کو اپنے بھرپور تعاون اور اشتراک عمل کا یقین دلا رکھا تھا۔ بھارت کامن ویلتھ میں بھی شامل تھا مگر اپنے آپ کو نہ تو اس نے کسی مغربی دفاعی معاہدے میں جکڑا تھا اور سوویت یونین کے ساتھ تعلقات کا راستہ بھی کھلا رکھا تھا۔ بعد میں جب چین اور روس کے درمیان تضاد پیدا ہوا تو بھارت نے چین کے خلاف روس کے ساتھ تعلقات مضبوط کر لیے۔ مغربی استعمار کے ساتھ تو اس کے تعلقات تھے ہی۔ وہ ڈپلومیسی کی شطرنج میز پر اپنے ملکی مفادات کے لئے محفوظ اور ہوشیار چالیں چلتا رہا۔

کشمیر پر بھارت کے قبضے کا ذمہ دار جہاں پر اینگلو امریکی سامراج اور بھارتی حکمران ہیں وہاں پر مسلم لیگ کی غیر عوامی اور غیر حقیقی ریاستی پالیسی بھی اس کی ذمہ دار ہے۔ سفارتی سطح پر ابتدا میں ہی پاکستان نے بھارت کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔

اینگلوامریکی سامراج اور بھارت کی چالوں کو بھٹو اچھی طرح سمجھتے تھے

23 /جنوری 1963ء میں محمد علی بوگرہ جو امریکہ نواز تھا اور پاکستان کا وزیر خارجہ تھا اس کی اچانک موت واقع ہوئی تو بھٹو صاحب کو اس کی جگہ وزیر خارجہ مقرر کیا گیا۔ وہ اینگلو امریکی سامراج اور اس کی چالوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ جلد از جلد کشمیر کا مسئلہ حل کرانا چاہتے تھے جو کہ ایک آزاد خارجہ پالیسی یا کم از کم سامراج سے آزاد خارجہ پالیسی کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ بھارت روس کے ساتھ جڑ چکا تھا۔ بھٹو صاحب نے چین کے ساتھ دوستی بڑھانا شروع کی۔ وہ ہی تھے جو بھارت کی شاطرانہ چالوں کو سمجھ بھی سکتے تھے اور ان کا توڑ بھی کر سکتے تھے چنانچہ پاکستان چین کے قریب ہونے لگا۔ 2 /مارچ 1963ء کو چینی وزیر خارجہ مارشل چن ژی اور بھٹو صاحب نے پاک چین سرحدی معاہدے پر دستخط کئے۔ بھارت نے بہت شور مچایا۔ روس کو تو یہ بات پسند آ ہی نہیں سکتی تھی جبکہ امریکہ بھی بہت برہم ہوا۔

اس سے پیشتر پشاور کے قریب بڈہ بیر کا اڈہ امریکہ کو دیا جا چکا تھا جہاں سے امریکی جاسوس طیارے اڑ کر روس کی جاسوسی کیا کرتے تھے۔ اس وقت بھٹو صاحب تیل، معدنی ذخائر، پاور اور قدرتی وسائل کے وزیر تھے اور ایوب خان کے قریب تھے۔ انہوں نے روس کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے پر زور دیا اور پاکستان نے روس کے ساتھ جنوری 1961ء میں اٹک میں تیل کی تلاش کے لئے سوویت یونین کے ساتھ معاہدہ کیا۔ پاکستان کی امریکہ کے ساتھ پہلی بار تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوئی۔ اس میں اس وقت اور بھی اضافہ ہوا جب 1961ء کے خزاں میں باجوڑ کے تنازعے پر پاکستان اور افغانستان میں کھچاؤ پیدا ہوا اور پاکستان نے یہ باڈر بند کر دیا۔ امریکی پریس اور سینٹ نے پاکستان کو ذمہ دار ٹھہرایا کہ پاکستان کے اس عمل سے افغانستان روس کے بازوؤں میں چلا جائے گا۔ پاکستان کو اسلحہ سپلائی پر پابندی کے بارے میں بھی سوچا جانے لگا کیونکہ یہ اسلحہ کمیونزم کو روکنے کے لیے دیا جا رہا تھا۔

1962ء میں چین اور بھارت کے درمیان جنگ ہوئی۔ بھارت چین کا سرحدی تنازعہ چلا آ رہا تھا۔ نہرو "میں نہ مانوں" کی راگنی الاپ رہا تھا جبکہ چو این لائی بار بار اس

مسئلے کو مذاکرات کے ذریعے حل کرنا چاہتا تھا۔ نہرو اس مؤقف پر ڈٹا ہوا تھا کہ سرحدیں طے ہو چکی ہیں۔ ان پر بات چیت نہیں ہوسکتی۔ کشمیر کے مسئلے کی طرح بھارت اس مسئلے کو بھی حل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس تناظر میں چین اور بھارت کے درمیان سرحدی جھڑپیں جنگ کی شکل اختیار کر گئیں اور چین نے بھارت کی وہ پٹائی کی جس کی وہ توقع نہیں کر رہا تھا۔ نہرو نے امریکہ سے مدد مانگی اور امریکہ اور برطانیہ نے بھارت کو اسلحہ کی بہت بڑی کھیپ ہنگامی بنیادوں پر مہیا کی۔ امریکہ بھارت کے ذریعے کمیونزم کو ہمالیہ کے شمال میں روکنا چاہتا تھا۔ امریکہ کی جانب سے بھارت کو اسلحہ کی اس سپلائی کے خلاف پاکستان بھر میں شدید ردعمل ہوا۔ 21 رنومبر سے 8 ردسمبر 1962ء کے قومی اسمبلی کے اجلاس میں اس کی بھرپور مذمت کی گئی۔ امریکہ کے خلاف ملک بھر میں مظاہرے ہوئے۔ کراچی میں امریکی سنٹر میں توڑ پھوڑ کی گئی۔ فوج اور حکومت کی گاڑیوں کو نقصان پہنچایا گیا۔ کراچی، ڈھاکہ، لاہور، پشاور اور راولپنڈی میں دفعہ 144 لگادی گئی۔

دسمبر 1962ء میں امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو کراچی امریکی سفارت خانے سے جو اطلاعات بھجوائی گئی تھیں ان میں یہ بھی تھا کہ بھارت کو اسلحہ کی سپلائی پر پاکستان فوج کے نوجوان افسروں میں بے حد غم و غصہ ہے۔ اس کے باوجود امریکہ کو پاکستان کے حکمرانوں کی وفاداری پر اتنا یقین تھا کہ 22 ردسمبر 1962ء کو جان ایف کینیڈی اور ہیرلڈ میکمیلن کے درمیان باہاما کے دارالخلافہ NASSAU کے مقام پر یہ طے پایا کہ بھارت کو 120 ملین ڈالر کی فوجی امداد فوراً دی جائے گی۔

پاکستان کے عوام اور ترقی پسند دانشوروں، صحافیوں، سیاسی کارکنوں اور طلبا میں امریکہ کے اس فیصلے کے خلاف غم و غصے کی لہر بہت شدید تھی۔ ان بدلتے ہوئے حالات پر بھٹو صاحب کی گہری نظر تھی۔ انہوں نے جب سے ہی پاک چین دوستی کا پل تعمیر کرنا شروع کر دیا تھا۔

اگست 1963ء میں جب چین اور پاکستان کے درمیان فضائی معاہدہ ہوا تو امریکہ نے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے 4.3 ملین ڈالر کا وہ قرضہ جو ڈھاکہ ایئرپورٹ

کی تعمیر و تزئین کے لیے دیا جانا تھا وہ معطل کر دیا۔ اس کے باوجود کہ پی آئی اے کا سربراہ درانی پی آئی اے کی پروازوں کے ذریعے امریکہ کے لیے چین کی جاسوسی کرتا تھا۔ اور چین کو اس کا علم بھی ہو چکا تھا، مگر امریکہ چین کے ساتھ پاکستان کے بڑھتے ہوئے تعلقات سے خوش نہیں تھا۔ مارچ 1965ء میں ایوب خان کا چین میں زبردست استقبال ہوا اور مشترکہ اعلامیے میں جہاں نو آبادیاتی نظام، افرو ایشین سالیڈیریٹی وغیرہ کا ذکر ہوا اس میں کشمیر کے تنازعے کا ذکر بھی ہوا اور چین نے پاکستان کو 60 ملین ڈالر کا آسان شرائط پر بلا سود قرضہ (یعنی سوشلسٹ ملک نے اسلامی قرضہ) فراہم کیا۔ پاکستان کے عوام جو پاکستان پر امریکہ کی بالادستی کے خلاف تھے پاک چین دوستی کے معمار ذوالفقار علی بھٹو کے گرویدہ ہوتے چلے گئے۔ ہم گردن اٹھا کر چلنا چاہتے تھے۔ آزاد ملک میں آزاد شہری کی طرح!!

اکھنور پر قبضہ ایوب خان نے رکوا دیا، بھٹو ایوب اختلاف کا نکتۂ آغاز

ایوب خان نے ایک ماہ بعد ماسکو کا دورہ کیا اور 13 رمئی 1965ء کو مری میں اس نے ''آپریشن جبرالٹر'' پر مکمل بریفنگ لی۔ یہ آپریشن میجر جنرل اختر ملک نے تیار کیا تھا جو اس وقت بارھویں ڈویژن کا جنرل آفیسر کمانڈنگ (GOC) تھا۔ کشمیر بارڈر چار سو میل لمبا ہے اور شمال میں لداخ سے لے کر جنوب میں چھمب تک پھیلا ہوا ہے۔ بارھویں ڈویژن اس بارڈر کے دفاع کی ذمہ دار تھی۔ جنرل موسیٰ جو اس وقت کمانڈر انچیف تھا اپنی کتاب My VERSION-INDO PAK WAR 1965 میں صفحہ 36 پر انکشاف کرتا ہے کہ مری میں بریفنگ کے دوران ایوب خان نے یہ مشورہ دیا کہ ''آپریشن جبرالٹر'' کے دوران ہی اکھنور پر بھی قبضہ کر لیا جائے۔ اکھنور پر قبضہ کرنے کے آپریشن کو OPERATION GRAND SLAM کا نام دیا گیا۔

8 رمئی 1965ء کو جب شیخ عبداللہ کو بھارت میں گرفتار کیا گیا تو سری نگر میں ہنگامے اپنے عروج پر پہنچ گئے۔ رضا کار جتھے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہونے لگے اور اگست 1965ء تک ان کی کاروائیاں اتنی تیز ہو گئیں کہ پاکستانی افواج بھی اس میں شامل ہو گئیں۔

مقبوضہ کشمیر میں کئے جانے والے آپریشن جبرالٹر کی افرادی قوت لیفٹیننٹ کرنل مختار احمد گیلانی کی کتاب کے مطابق پانچ ہزار سے سات ہزار تک تھی جس میں کشمیری رضا کار، پاکستانی فوج کے SSG کے کمانڈوز اور انفنٹری کے فوجی شامل تھے۔ یہ آپریشن اگست 1965ء کے پہلے ہفتے سے شروع ہوا۔ لیفٹیننٹ جنرل ہربخش سنگھ جو کہ بھارت کی ویسٹرن کمانڈ کا کمانڈر تھا اپنے ڈسپیچز میں لکھتا ہے کہ ''پاکستان کی جانب سے دراندازی کا یہ آپریشن اپنے تصور میں نہایت عمدہ تھا۔''

24/اگست 1965ء کو بھارت نے اپنی افواج کی بھاری نفری درہ حاجی پیر پر جمع کرنا شروع کر دیں جہاں سے رضا کاروں کی اکثریت کشمیر میں داخل ہو رہی تھی۔ اسی دن جنرل اختر ملک نے جی ایچ کیو سے OPERATION GRAND SLAM کو شروع کرنے کی اجازت مانگی۔ ڈائریکٹر آپریشنز بریگیڈیئر گل حسن نے جنرل موسیٰ کو اس کی اطلاع دی۔ اس نے جواب دیا کہ بھٹو سے کہو کہ ایوب خان سے اجازت مانگے۔ ایوب خان مری میں آرام فرما رہے تھے۔ یہ کیا خوب جنگ تھی جس میں کمانڈر ان چیف فیصلہ کرنے کو تیار نہیں تھا اور سپریم کمانڈر مزے کر رہا تھا۔ بالآخر جب 29/اگست کو اجازت ملی تو بھارتی افواج اپنے مورچے مضبوط کر چکی تھیں۔ جب یکم ستمبر 1965ء کو آپریشن شروع ہوا تو سہ پہر تک بہت سے اہداف حاصل کر لیے گئے تھے۔

1965ء کی جنگ پر جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ہر ایک نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ یکم ستمبر کی شام ساڑھے چھ بجے تک پاکستانی افواج کامیابی حاصل کرتی ہوئی توائی نالہ تک پہنچ چکی تھیں۔ چھمب پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا اور اکھنور زیادہ دور نہیں تھا جس پر قبضے کے بعد بھارت کی سپلائی لائن کٹ جاتی اور راجوڑی، جھنگار، نوشہرہ اور پونچھ کے قبضے میں آنے کے بعد کشمیر پر مکمل فتح حاصل کرنا مشکل نہیں تھا کہ کمانڈر ان چیف جنرل موسیٰ خان اپنے ہیلی کاپٹر میں نمودار ہوا۔ جنرل یحییٰ خان جو کہ ایوب خان کا منظور نظر تھا وہ اس کے ساتھ تھا۔ جنرل موسیٰ نے جنرل اختر سے کمانڈ لے کر یحییٰ خان کے حوالے کی اور جنرل اختر کو اپنے ساتھ بٹھا کر واپس لے آیا۔

بھارتی صحافی ایم جے اکبر کہتا ہے کہ اس موقع پر کسی کی دعائیں ہمارے کام آئیں اور ایک ایسی کمانڈ کی تبدیلی واقع ہوئی جو کہ اَن ہونی تھی۔ اس نازک اور اہم موقع پر کی گئی اس تبدیلی پر بھارتی بھی حیران رہ گئے۔ بھارتی ملٹری تاریخ دان میجر کے سی پراوال اپنی کتاب "Indian Army After Indepedence" کے صفحہ 216 پر لکھتا ہے کہ اس تبدیلی کی وجہ سے بھارتی افواج کو سنبھلنے اور اپنے دفاع کی تیاری اور مزید کمک حاصل کرنے کے لیے چوبیس گھنٹے مل گئے۔

بریگیڈیئر امجد چودھری جو اس محاذ پر لڑ رہا تھا اپنی کتاب "Sep.65 Before and After" میں لکھتا ہے کہ ایسے موقع پر یہ تبدیلی بہت مایوس کن اور حوصلہ شکن تھی۔ جنرل اختر ملک یکم ستمبر تک اکھنور پر مکمل قبضہ کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ کمانڈ کی تبدیلی کے بعد یحییٰ خان نے تین ستمبر کو اپنے تساہلانہ انداز میں پیش قدمی کی تو بھارتی افواج اپنی پوزیشن مضبوط کر چکی تھیں۔ اس کے باوجود 4 ستمبر کی شام تک اکھنور پر قبضے کا امکان موجود تھا۔

بریگیڈیئر امجد علی چودھری نے اپنی کتاب میں، جو 1977ء میں چھپی، اس جانب اشارہ کیا ہے کہ اکھنور پر قبضہ ایوب خان نے امریکہ کے کہنے پر رکوایا تھا جو کہ کمانڈ کی تبدیلی کر کے حاصل کیا گیا۔ امجد مزید لکھتا ہے کہ اس نے خود یحییٰ خان کو یہ کہتے سنا کہ اس نے اس لیے اکھنور پر قبضہ نہیں کیا کیونکہ اس کو اعلیٰ کمانڈ کا حکم تھا کہ قبضہ نہ کیا جائے۔

قدرت اللہ شہاب کے مطابق ''ایک ایسے وقت میں جبکہ اختر حسین ملک اکھنور پر قبضہ کر کے مقبوضہ کشمیر کے دارالخلافہ سری نگر کو حاصل کرنے کی پوزیشن میں تھا، اس کو ہٹا کر کمانڈ جنرل یحییٰ خان کو دی گئی۔ غالباً مقصد یہ تھا کہ پاکستان اکھنور پر قبضہ نہ کرے۔ یہ کام یحییٰ خان نے بخوبی انجام دیا۔''

بھٹو صاحب جو اس آپریشن کا اہم کردار تھے ان کے مطابق اگر جنرل اختر ملک کو چھمب جوڑیاں سیکٹر پر نہ روکا جاتا تو بھارت کو سنجیدہ نقصانات اٹھانے پڑتے۔

بعد میں جنرل اختر ملک کو انقرہ میں سینٹو میں تعینات کیا گیا جہاں پر وہ سڑک کے ایک حادثے میں انتقال کر گیا اور اس کی میت کو پاکستان میں لا کر ربوہ میں دفن کر دیا گیا۔

کمانڈ کی اس تبدیلی پر افواج پاکستان میں اس قدر بحث ہوئی کہ جی ایچ کیو کو ہدایات جاری کرنا پڑیں کہ اس موضوع پر گفتگو بند کر دی جائے۔

کشمیر میں آپریشن ناکام ہو گیا یا کر دیا گیا اور بھارت نے 5 اور 6 ستمبر 1965ء کی شب کو بین الاقوامی سرحد کو توڑ کر سیالکوٹ، لاہور اور قصور پر حملہ کر کے پاکستان کے ساتھ باقاعدہ مکمل جنگ کا آغاز کر دیا۔ امریکہ نے اعلان کر دیا کہ پاکستان کو ہر قسم کا جنگی سامان فراہم کرنا بند کر دیا جائے۔ بھٹو صاحب کا ایوب خان کے ساتھ اختلافات کا یہ نکتہ آغاز تھا۔

کشمیر کو حاصل کرنے کا ایک موقع اس سے پہلے بھی 1962ء کی چین بھارت جنگ کے موقع پر آیا تھا جس کو ایوب خان نے گنوا دیا تھا۔ قدرت اللہ شہاب جو اس وقت ایوب خان کا سویلین سٹاف آفیسر تھا اپنے شہاب نامے کے صفحہ 917، 918 اور 919 پر لکھتا ہے: ''ہند چینی بھائی بھائی'' کا بلند بانگ نعرہ کافی عرصے سے سرد پڑ چکا تھا اور اکتوبر 1962ء کے اوائل ہی سے پنڈت نہرو یہ گیدڑ دھمکیاں دے رہے تھے کہ ہندوستانی فوجیں چینیوں کو لداخ اور نیفا کے متنازعہ علاقوں سے بہت جلد نکال باہر پھینکیں گی۔ اسی ماہ غالباً 20 تاریخ تھی کہ میں ہارلے سٹریٹ راولپنڈی میں اپنے گھر سویا پڑا تھا۔ رات کے ڈھائی بجے تھے کہ اچانک میری کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں ایک کار داخل ہونے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں میں میرے ملازم نے اندر آ کر مجھے بتایا کہ ایک چینی آپ سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔ غالباً وہ چینی پاکستان میں اردو زبان سیکھنے آیا ہوا تھا اور پہلے بھی مجھ سے کئی تقریبوں میں مل چکا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ بھارت نے چینی سرحدوں پر پے در پے حملے کر کے چین کو جوابی کارروائی پر مجبور کر دیا ہے اور چینی فوج چند مقامات پر بھارت میں داخل ہو کر آگے بڑھ رہی ہے اور وہ اس وقت مجھے یہی اطلاع دینے آیا تھا۔ میں نے پوچھا ''کیا آپ نے یہ بات ہماری وزارت خارجہ تک پہنچا دی ہے؟''

''چینی مسکرایا اور بولا۔ ''ہمارا خیال ہے کہ شاید صدر ایوب کو اس خبر میں خاص دلچسپی اور اہمیت محسوس ہو۔ ہمارے اندازے کے مطابق آپ یہ خبر ان تک فوری طور پر پہنچانے میں زیادہ کام آ سکتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے آپ کو ایسے بے وقت میں جگا کر یہ

تکلیف دی ہے۔ یہ میرا ذاتی فعل ہے۔ سفارت خانے کی جانب سے نہیں۔''

''سفارت کاری کے فن میں چینیوں کا اپنا ہی ایک خاص اور نرالا انداز ہے۔ وہ اپنے دوستوں پر بھی اپنی رائے یا مشورہ خوامخواہ یا برملا ٹھونسنے کے عادی نہیں ہیں۔ لیکن اشاروں کنایوں میں اپنا عندیہ نہایت خوش اسلوبی سے واشگاف طور پر ظاہر کر دینے میں انتہائی مہارت رکھتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ رات کے ڈھائی بجے مجھے جگا کر غالباً وہ اپنے مخصوص انداز میں یہ پیغام پہنچا رہے تھے کہ جنگ کے یہی چند ابتدائی گھنٹے انتہائی اہم ہیں۔ ہندوستانی افواج کے پاؤں اکھڑ گئے ہیں اور چینیوں کے خوف سے وہ سر پر پاؤں رکھ کر ہر محاذ سے بھاگ رہی ہے۔ اگر پاکستان اس موقع سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو ہرگز وقت ضائع نہ کریں۔

''میں نے فوراً لباس تبدیل کیا اور اپنی کار نکال کر تیز رفتاری سے ایوان صدر جا پہنچا۔ اس وقت کوئی تین بجے کا عمل تھا۔ کسی قدر تگ و دو کے بعد مجھے صدر ایوب کی خواب گاہ تک رسائی حاصل ہوگئی۔ میں نے انہیں چینی کے ساتھ اپنی گفتگو تفصیلاً سنائی تو انہوں نے بے ساختہ کہا۔ یہ کوئی غیر متوقع خبر ہرگز نہیں۔ لیکن رات گئے تمہیں صرف یہ خبر سنانے کے لیے آنے سے اس کا اصلی مقصد کیا تھا۔

''میں نے اپنا قیاس بیان کیا کہ شاید اس کا مقصد یہ ہو کہ ہم ان لمحات کو اپنے حق میں کسی فائدہ مندی کے لیے استعمال میں لے آئیں۔ ''مثلاً'' صدر ایوب نے پوچھا۔

''مثلاً میں نے اناڑیوں کی طرح تجویز پیش کی۔ اس لمحے اگر ہماری افواج کی نقل و حرکت بھی مقبوضہ کشمیر کی سرحدوں کے خاص خاص مقامات کی جانب شروع ہو جائے تو......صدر ایوب نے تندو تیز لہجے میں میری بات کاٹ کر کہا۔ تم سویلین لوگ فوجی نقل و حرکت کو بچوں کا کھیل سمجھتے ہو۔ جاؤ اب تم بھی جا کر آرام کرو۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔''

امریکا کا صدر کینیڈی ایوب خان پر زور ڈال چکا تھا کہ چین کے ساتھ جنگ کے دوران جواہر لال نہرو کو یقین دلایا جائے کہ ہندوستان کی سرحدوں پر پاکستان کی جانب سے ہرگز کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔

1965ء کی اس پاک بھارت جنگ میں چین نے نہ صرف بھارت کی سرحدوں پر اپنی فوجوں کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا بلکہ بھارت کو ایک الٹی میٹم بھی دے دیا تھا۔ ایران اور ترکی نے بھی 1965ء کی جنگ میں ہماری مدد کی تھی۔ انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو نے تو اپنا سب کچھ پاکستان کے حوالے کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ سوئیکارنو نے کئی لڑاکا ہوائی جہاز، میزائل بردار سمندری جہاز اور دو جنگی آبدوزیں ہمارے حوالے کر دی تھیں۔

پاکستان کی یہ وہ جنگ ہے جس میں پاکستانی قوم نے اپنی افواج کا بھرپور ساتھ دیا۔ عوام کے جوش وجذبے کا عالم یہ تھا کہ جب یہ خبر نشتر ہوئی کہ بھارت رات کے وقت لاہور میں چھاپہ مار اتارنے والا ہے تو زندہ دلان لاہور ہوائی حملوں کے سائرن سن کر، خندقوں یا تہہ خانوں میں جانے کے بجائے ساری رات اپنی چھتوں پر چڑھ کر چھاپہ ماروں کے اترنے اور انہیں پکڑنے کا انتظار کرتے رہے۔ نور جہاں، امانت علی، شوکت علی، حبیب ولی محمد، مہدی حسن اور تمام فنکاروں نے قوم کے جوش وجذبے کو گرمائے رکھا۔

بھارتی حملے کو روکنے اور پسپا کرنے کا سہرا، ہماری ایئر فورس، فوجی جوان افسروں اور جوانوں کے سر ہے۔ انہوں نے حیرت انگیز جرأت اور جواں مردی کا مظاہرہ کر کے بھارت کا حملہ نہ صرف پسپا کیا بلکہ بھارت کے بہت سے علاقوں پر قبضہ بھی کیا۔ سکواڈرن لیڈر ایم ایم عالم (محمد محمود عالم) نے چھ ستمبر کو بھارت کے دو جہاز گرائے اور تین کو نقصان پہنچایا۔ اور سات ستمبر کو ایک منٹ سے بھی کم وقت میں بھارت کے پانچ جہاز تباہ کر ڈالے۔ دنیا کی ہوائی جنگ میں آج تک یہ ایک ریکارڈ ہے۔ ایم ایم عالم نے مجموعی طور پر دس جہاز تباہ کئے اور تین کو نقصان پہنچایا۔ ایم ایم عالم بنگالی تھا جن کے بارے میں پنجابی مہاجر شاؤنسٹ حقارت سے کہا کرتے تھے کہ بنگالی چھوٹے قد ہونے کی وجہ سے جنگ لڑنے کے قابل نہیں۔

بھٹو صاحب نے 6 ستمبر کو بھارت کے حملے کے فوراً بعد امریکہ سے 1959ء پاک امریکہ معاہدہ کے تحت مدد مانگی۔ مدد کرنے کے بجائے امریکی صدر جانسن نے پاکستان اور بھارت کو ہتھیاروں کی سپلائی پر پابندی عائد کر دی۔ یہ پابندی اصل میں پاکستان کے خلاف تھی۔ بھارت کے جنگی ہتھیاروں کی ساخت کا تعلق تو سوویت یونین کے

ساتھ تھا۔ اس موقع پر چین مدد کو آیا۔ 19 ستمبر 1965ء کو ایوب خان اور بھٹو صاحب نے چین کی قیادت سے پیکنگ میں خفیہ ملاقات کی جس میں چین نے ہر طرح کی مدد کا وعدہ کیا اور مشورہ دیا کہ بھارت کے ساتھ ایک طویل گوریلا جنگ پہاڑوں میں لڑی جانی چاہیے۔

مغربی ممالک کا پاکستان پر دباؤ تھا کہ اگر چین نے پاکستان کے حق میں مزید پیش قدمی کی تو دیگر ممالک بھی اس جنگ میں شامل ہو جائیں گے۔ ایوب خان اور جنرل موسیٰ اس جنگ کا بوجھ اٹھانے سے معذور نظر آنے لگے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ جلد از جلد جنگ کے اس جھنجھٹ سے باہر نکلنا چاہتے ہیں اور ہتھیار ڈالنا چاہتے ہیں جبکہ سلامتی کونسل کے اجلاس میں بھٹو صاحب نہایت جوشیلی تقریریں کر رہے تھے اور بھارت کے ساتھ ایک ہزار سال تک جنگ لڑنے کا اعلان کر رہے تھے۔ ایوب خان جنگ بندی کے لیے تیار ہو گیا اور 6 ستمبر 1965ء کو شروع ہونے والی یہ جنگ 23 ستمبر کی سہ پہر کو بند کر دی گئی اور تمام توپیں خاموش ہو گئیں۔

سلامتی کونسل میں تقریر اور آنکھ میں آنسو

بھٹو عوام کے دلوں کی دھڑکن بن گئے

بھٹو صاحب کی سلامتی کونسل میں معرکتہ الآرا تقریر اور تقریر کے دوران ان کی آنکھ کے آنسو پاکستانی عوام کے دلوں کی دھڑکن بن گئے۔ بھٹو صاحب اب قوم کے ہیرو تھے۔ وہ نیویارک سے براستہ لندن واپس پاکستان پہنچے۔ ایوب خان سے وہ دلبرداشتہ ہو چکے تھے اور ان کے اور ایوب خان کے درمیان خلیج بڑھنا شروع ہو گئی تھی۔

جنگ بندی کے بعد تنازعہ کشمیر کا معاملہ اصولی طور پر اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل میں جانا چاہیے تھا کہ وہاں پر ہی تمام قراردادوں پر بحث ہوتی چلی آئی تھی اور جنہیں سوویت یونین ہمیشہ بھارت کے حق میں ویٹو کرتا چلا آیا تھا مگر بھارت اور پاکستان کے درمیان ثالثی اور مذاکرات کے لیے سوویت یونین کی پیش کش کو قبول کرتے ہوئے پاکستان کا وفد صدر ایوب خان کی قیادت میں اور بھارت کا وفد وزیر اعظم لال بہادر شاستری کی قیادت میں

تین جنوری 1966ء کو تاشقند پہنچ گیا۔

یہ مذاکرات آٹھ روز تک جاری رہے۔ شاستری کشمیر کا نام سننے کو تیار نہیں تھا۔ شاستری کا موقف یہ تھا کہ یہ مسئلہ تو پہلے سے طے شدہ ہے اور ریاست جموں وکشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔ اس پر بات چیت نہیں ہو سکتی۔ ابتدائی مذاکرات 4 رجنوری کو پاکستانی وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو اور بھارتی وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ کے درمیان شروع ہوئے اور تعطل کا شکار ہو گئے۔ بھٹو صاحب کا خیال تھا کہ ان حالات میں یہ مذاکرات ناکام ہوں گے اور ہمیں بغیر کوئی معاہدہ کئے واپس چلے جانا چاہیے۔ ایوب خان اور سوویت یونین کے وزیراعظم کوسیگن کی علیحدہ ملاقاتوں کے نتیجے میں ایوب خان قائل ہو گئے کہ معاہدے کے بغیر نہیں جانا چاہیے۔ شاستری بھی کشمیر پر بات سننے کے لیے تیار ہو گیا۔ کوسیگن سے بات چیت کے دوران بھٹو صاحب نے ایوب خان کو کچھ مشورہ دینے کی کوشش کی تو ایوب خان نے بھٹو صاحب کو اردو میں کہا "الو کے پٹھے بکواس بند کرو۔"

بھٹو صاحب اور ایوب خان کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کو پُر کرنا اب ناممکن تھا۔ ان کے راستے مختلف ہو چکے تھے۔

معاہدہ تاشقند ہوا اور بھارتی وزیراعظم شاستری مر گیا

10 رجنوری 1966ء کو وزیراعظم شاستری اور صدر ایوب خان کے درمیان معاہدے پر دستخط ہوئے اور وزیراعظم کوسیگن نے اس پر اپنی گواہی کی مہر لگا دی۔ اس شام کو کوسیگن نے دونوں وفود کو زبردست ڈنر دیا۔ شاستری اس سمجھوتے سے بے حد خوش تھا۔ ڈنر کے بعد وہ اپنے کمرے میں گیا اور دو تین گھنٹوں میں حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے مر گیا۔ 10 رجنوری 1966ء کے بعد مسئلہ کشمیر کا حوالہ اب سیکورٹی کونسل کی قراردادیں نہیں تھیں بلکہ معاہدہ تاشقند تھا جس میں جموں وکشمیر پر سرسری ساذکر کرنے کے بعد یہ طے پایا تھا کہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔ یعنی ریاست جموں وکشمیر اب بھارت کا اندرونی معاملہ تھا اور پاکستان کی اس میں دخل

اندازی کا مطلب معاہدہ تاشقند کی خلاف ورزی تھی۔

معاہدے کے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر پاکستان بالخصوص لاہور میں ایوب خان کے خلاف ہنگامے شروع ہوگئے۔ عوامی لیگ کے نوابزادہ نصر اللہ خان، کونسل مسلم لیگ کے سردار شوکت حیات، نظام اسلام پارٹی کے چودھری محمد علی، جماعت اسلامی کے مولانا مودودی (جو کشمیر جہاد اور پاکستان کے خلاف رہے تھے) نے مشترکہ پریس کانفرنس کر کے ایوب خان کو مسئلہ کشمیر سے غداری کا مرتکب ٹھہرایا۔ عام تاثر یہ تھا کہ ایوب خان نے کمزوری دکھائی ہے اور پاکستان کے وقار اور کشمیر کے مفاد کے خلاف یہ معاہدہ کیا ہے۔

کشمیری عوام کی آزادی کی جدوجہد میں پاکستان ہمیشہ ان کے ساتھ رہا ہے اور ان کی جدوجہد کو کامیاب دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ جدوجہد کشمیری عوام کی ایک ایسے ملک سے علیحدگی اور آزادی کی جدوجہد ہے جس نے ان کی مرضی کے خلاف ان پر زبردستی قبضہ کر رکھا ہے۔ ان کی اس قومی آزادی کی تحریک (اسلام کی سربلندی کی تحریک نہیں) میں نہ صرف کشمیری مسلمانوں نے بلکہ کشمیری ہندو پنڈتوں نے بھی حصہ لیا ہے اور جدوجہد کی ہے۔ بھارت کے خوشونت سنگھ جیسے روشن خیال افراد بھی یہ یقین رکھتے ہیں کہ اگر آج بھی کشمیر میں استصواب رائے کرایا جائے تو بھارت بری طرح ہار جائے گا۔

کشمیر کے محاذ پر جنرل اختر ملک کو پیچھے ہٹا کر اور مذاکرات کے محاذ پر ذوالفقار علی بھٹو کو پیچھے ہٹا کر ایوب خان نے دونوں محاذوں پر جیتی جانے والی جنگ ہار دی۔ اب ایوب خان کو اس کے زوال اور حتمی انجام سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

ستمبر 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد بھٹو صاحب، اپنی سلامتی کونسل کی تقریر اور معاہدہ تاشقند پر ایوب خان سے اعلانیہ اختلاف کے بعد عوامی محبت اور لگاؤ کے نقطۂ عروج پر آ کھڑے ہوئے۔ بالخصوص پنجاب اور سندھ کے عوام نے ان کو اپنا قومی ہیرو بنالیا۔ اس وقت تک روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ تھا، نہ ہی پیپلز پارٹی تھی۔ 1965ء کی جنگ کے بعد وہ ایک قومی ہیرو بن کر ابھرے اور عوام نے اپنا اور ملک کا مستقبل ان میں دیکھنا شروع کر دیا۔

بھٹو صاحب سے ملاقات کے بعد مجھے لگا تھا کہ یہی وہ دیدہ ور ہے جو ہمارے

سیاسی و اقتصادی بحرانوں پر کمنڈ ڈال سکتا ہے اور خارجہ پالیسی کے بحران سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ قوم کی آرزوئیں اور امنگیں کیا ہیں۔

پاکستان کو ایک ایسی قیادت کی ضرورت تھی جو تاریخ کی روش سے آگاہی رکھتی ہو، جو لوگوں کے دلوں میں داخل ہو کر ان کے حوصلے بلند کر سکے، جو اطراف عالم سے ہونے والے حملوں کے آگے سینہ سپر ہو کر وقت کی طنابیں تھام لے۔ پھر 1967ء میں پیپلز پارٹی کے قیام کے بعد ہم نے دیکھا کہ اس نے پاکستان کی سیاست میں ایک نئے آہنگ کو جنم دیا۔ ایک نئی معیشت کی نوید سنائی۔ اقوام عالم میں تھرتھراہٹ پیدا کی۔ پاکستان کے عوام اور ہم جیسے وہ سب جنہوں نے بھٹو صاحب سے یک طرفہ عشق شروع کیا تھا، سمجھنے لگے کہ اس ملک وقوم کے آفاق پر برسوں تک گھنے اندھیرے چھائے رہے ہیں، اب ان کی قسمت بدلے گی اور وہ بھی دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکیں گے کہ پاکستان غیرت مند، طاقتور اور خوش حال ملک ہے۔

بھٹو اقتدار سے الگ ہو گئے

بھٹو صاحب اقتدار سے الگ ہو گئے۔ گورنر امیر محمد خان اور گورنر عبدالمنعم خان نے ایوب خان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور ایوب خان کے دونوں بازو مفلوج ہو گئے تھے۔ بھٹو صاحب کے الگ ہونے پر اس کا کچھ اور حصہ کٹ گیا۔ بھٹو اور ایوب خان کے درمیان جو آخری بار گفتگو ہوئی وہ بھٹو صاحب کی اپنی زبانی کچھ یوں تھی۔

''ایوب خان سے الوداعی ملاقات تھی۔ شام کا وقت تھا۔ میں ایوان صدر کے اس خاص کمرے میں تھا جس کی دیواروں کا رنگ سبز ہے اور جس کے بارے میں مشہور ہے کہ صدر صاحب وہاں اہم مسائل پر گفتگو فرماتے ہیں۔ صدر صاحب نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا دیکھئے اب میری اور آپ کی پالیسی کے درمیان بڑا فرق پیدا ہو گیا ہے۔ میں نے آپ کو بہت سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ایسی پالیسی سے آپ پرہیز کریں جو میری مرضی اور منشاء کے خلاف ہو لیکن آپ میری خواہشات کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ انہوں

نے میز پر پڑے ہوئے ''اردو ڈائجسٹ'' کی طرف اشارہ کیا جس میں میرا بیان چھپا تھا کہ کشمیری عوام کی آزادی اور حق خودارادیت کے حصول کی خاطر اگر ہمیں دوبارہ ہندوستان سے مقابلہ کرنا پڑا تو ہم ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ یہ سب کیا ہے؟ آپ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں آپ کو وزارت سے علیحدہ کر دوں۔ میں نے انہیں جواب دیا کہ میں تو پہلے ہی آپ سے دو تین بار رخصت کی گزارش کر چکا ہوں اور یہ صحیح ہے کہ میرے اور آپ کے درمیان خیالات اور نظریات کا بہت بڑا فرق آ چکا ہے۔ اس لیے میں حکومت سے علیحدگی اور رخصت چاہتا ہوں۔ اس پر انہوں نے فوراً گفتگو کا رخ بدلا اور کہا کہ تم نے ملک اور قوم کی بہت خدمت کی ہے۔ میں تمہیں اقتدار سے گرانا نہیں چاہتا۔ میں نے لاڑکانہ میں بھی تم سے یہی کہا تھا۔ میں نے پھر اصرار کیا کہ مجھے اب رخصت چاہیے۔ پھر انہوں نے کہا کہ اگر تمہیں اب وزارت سے سبکدوش کیا گیا تو ملک میں بڑی گڑبڑ اور خلفشار ہوگا۔ تم کچھ روز کے لیے چھٹی پر چلے جاؤ بعد میں دیکھا جائے گا۔

''میں پہلے ہی حکومت سے بے زار تھا میں نے فوراً ان کا یہ فیصلہ قبول کر لیا۔ لیکن صدر صاحب نے مزید فرمایا کہ ایک بات یاد رکھو! آئندہ کبھی سیاست کا رخ نہ کرنا۔ میں ان کی یہ دھمکی برداشت نہیں کر سکا۔ میں نے کہا دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے عوام سے علیحدہ نہیں رکھ سکتی۔ اگر قوم کو میری خدمات کی ضرورت ہوئی تو میں ہر قیمت پر ان کی آواز پر لبیک کہوں گا اور اس کا فیصلہ تو عوام کریں گے کہ مجھے سیاست میں حصہ لینا چاہیے یا نہیں۔ انہوں نے میرے اٹل فیصلے کو دیکھتے ہوئے مجھے سفارت اور مال کا لالچ دیا۔ میں نے انہیں انکار کیا اور کہا کہ اقتدار آنی جانی چیز ہے۔ جو چیز غیر فانی ہے وہ ہے عوام کی خدمت اور ان کے ساتھ کیا گیا عدل وانصاف۔ جس کسی نے قوم پرستی کی اور اپنا سب کچھ عوام پر قربان کر دیا، تاریخ نے اس کو سنہری الفاظ میں یاد رکھا۔ تاریخ کبھی کسی ظالم کو خراج عقیدت پیش نہیں کرتی اور نہ کسی مظلوم و انسانیت دوست کی قربانی کو نظر انداز کرتی ہے۔

''میں نے ان تمام تجاویز کو ماننے سے انکار کیا تو انہوں نے کہا بھٹو! تمہارے انداز میں غرور اور تکبر آ گیا ہے ورنہ تم مجھے جواب نہ دیتے۔ خیر پھر بھی مجھے تم پر رحم آتا ہے۔

تم نے آرام و آسائش میں آنکھ کھولی ہے۔ تم ابھی دکھ، تکلیف اور مشکلات سے ناواقف ہو۔ یاد رکھو! میں اس ملک کا صدر ہوں۔ تم جانتے ہو میں اپنے مخالفین کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں۔ تم کو آخری بار تنبیہ کر رہا ہوں کہ اگر تم نے واپس آ کر سیاست میں حصہ لیا تو میں تم کو تباہ کر دوں گا۔ مت بھولو! تم اس سندھ سے تعلق رکھتے ہو جہاں کے بڑے بڑے ''پیر پگاڑوں'' کے لیے میرا ایک تحصیل دار اور تھانے دار ہی کافی ہے۔ میں نے کہا آپ سندھی یا غیر سندھی کی بنیاد پر مجھے ڈرانے کی بات نہ کریں۔ آپ ابھی اس ریگستان کے عوام سے واقف نہیں۔ آپ کو کیا حق ہے کہ آپ سندھ کے عوام کو بزدل کہیں۔ اگر آپ تباہ کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمہیں قبر تک نہیں چھوڑوں گا تو یہ بھی خیال کریں کہ آخر سب کو ہی قبر میں جانا ہے۔ میرے اس جواب پر انہوں نے فرمایا۔ اچھا آپ چھٹیاں گزاریں یہ سب کچھ بعد میں دیکھا جائے گا۔''

یہ وہی ذوالفقار علی بھٹو تھے جنہیں ایک مشکل گھڑی میں، ایک نازک سلسلے میں عوامی جمہوریہ چین روانہ کیا گیا اور جب وہ کامیاب ہو کر واپس آئے تھے تو ایوب خان نے سینے سے لگا کر کہا تھا کہ بھٹو! تمہارے سوا اور کوئی یہ کام سرانجام نہیں دے سکتا تھا۔ قوم ہمیشہ تمہاری شکر گزار اور احسان مند رہے گی۔

وہ تمام موقع پرست سیاست دان جو دن رات بھٹو صاحب کے آگے پیچھے ہاتھ جوڑ کر کھڑے نظر آتے تھے اور وہ بھی جن کا سیاست میں داخلہ ہی ذوالفقار علی بھٹو کی وجہ سے ہوا تھا اس موقع پر سب غائب ہو گئے۔ 22 رجون 1966ء کی شام کو بھٹو صاحب جب خیبر میل کے ذریعے راولپنڈی سے اقتدار کو خدا حافظ کہہ کر روانہ ہوئے تو سٹیشن پر انہیں الوداع کہنے والوں میں صرف تین افراد تھے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی، غلام مصطفیٰ کھر اور مشرقی پاکستان کے مسیح الرحمن۔ جب خیبر میل لاہور پہنچی تو ہزاروں افراد جن میں اکثریت کا تعلق طالب علموں اور نوجوان طبقے سے تھا، ان کو دیکھنے کے لیے جمع تھے اور ان کے حق میں نعرے لگا رہے تھے اور حبیب جالب کی نظم۔

''دشت خزاں میں اپنا چمن چھوڑ کر نہ جا''

تقسیم کی جا رہی تھی۔ بھٹو صاحب نے سلامتی کونسل میں تقریر کے بعد جس رومال سے آنسو پونچھے تھے وہ رومال اس موقع پر ہزاروں روپے میں بکا تھا۔ بھٹو صاحب باہر چلے گئے اور اپنے سیاسی مستقبل کے بارے میں غور وفکر اور رابطہ شروع کیا۔

ایک نئی سیاسی پارٹی کی ضرورت

ابتداء میں بھٹو صاحب کا خیال کونسل مسلم لیگ میں شامل ہونے کا تھا۔ مگر ڈاکٹر مبشر حسن اور جے اے رحیم جیسے دوستوں کا خیال تھا کہ ایک نئی طرح کی سیاست، غیر روایتی سیاست، عوامی سیاست کے لیے ایک نئی پارٹی کی ضرورت ہے۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔

☆ بھٹو صاحب اپنی خارجہ پالیسی کی وجہ سے نہ صرف طالب علموں بلکہ تمام شعبہ ہائے زندگی کے نوجوانوں میں بے حد مقبول تھے اور اس کی وجہ بھٹو صاحب کی وہ قوت مزاحمت تھی جس کا مظاہرہ انہوں نے سلامتی کونسل، اعلانِ تاشقند اور اس کے بعد سرکاری دباؤ کے سامنے کیا تھا۔

☆ عوام سیاسی، سماجی و اقتصادی نظام اور شخصیتوں سے بے زار تھے۔ بین الاقوامی سطح پر وہ ابھرتی ہوئی طاقتوں بالخصوص چین کا ساتھ دینا چاہتے تھے اور امریکی تسلط کے خلاف تھے۔ اندرونی سطح پر وہ اقتصادی ترقی کے ساتھ ساتھ اقتصادی مساوات چاہتے تھے۔

☆ اس وقت اپنے حقوق (کشمیر کے حق خودارادیت سے لے کر آزادیٔ اظہار تک) کے حصول کی خاطر، شخصی اور قومی آزادی و خودمختاری کی خاطر عوام میں بے پناہ قربانی دینے کا جذبہ موجود تھا۔

☆ عوام کو برسر اقتدار اور حزب اختلاف کے لیڈروں اور جماعتوں سے اب کسی قسم کی توقع نہیں تھی۔ بدتر ہوتے ہوئے حالات کو نہ تو سرکاری مشینری اور نہ ہی اپوزیشن کی کوئی جماعت برسر اقتدار آ کر ٹھیک کرنے کی پوزیشن میں تھی۔ عوام

اور سیاسی جماعتوں کے درمیان آج کی طرح براہ راست کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ ایک طرف عوام اور ان کے مسائل تھے اور دوسری طرف سیاسی جماعتیں اپنے اقتدار کی رسہ کشی میں مصروف تھیں۔

☆ سیاسی لیڈر اپنی عمر کے اعتبار سے اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جو مصلحتوں اور سمجھوتوں میں الجھ کر ''عیسیٰ کے حواریوں'' کا روپ دھار چکے تھے۔ صرف نوجوان نسل ہی ذہنی، فکری اور سیاسی تبدیلی یا انقلاب لانے میں مددگار ثابت ہوسکتی تھی۔ اس نوجوان نسل کا کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں تھا۔ وہ سب میری طرح ذوالفقار علی بھٹو میں ملک اور قوم کا مستقبل دیکھ رہے تھے۔

بھٹو صاحب کے MENTOR جے۔اے۔رحیم نے پارٹی کا فلسفہ اور منشور تیار کیا

1966ء میں بھٹو صاحب نے جے۔اے۔رحیم سے پیرس میں کئی ملاقاتیں کیں۔ جے۔اے۔رحیم کا پورا نام جلال الدین عبدالرحیم تھا۔ وہ ان دنوں پیرس میں پاکستان کے سفیر تھے۔ بھٹو صاحب ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ وہ بھٹو صاحب کے لیے ایک مرشد اور فلاسفر کا درجہ رکھتے تھے۔ بقول بھٹو صاحب جے۔اے۔رحیم نے افسر شاہی اور ریاستی معاملات کی باریکیاں اس وقت سے انہیں سکھائیں اور سمجھائی تھیں جب بھٹو صاحب نے ایوب خان کی حکومت میں شمولیت اختیار کی تھی۔

جے۔اے۔رحیم نہایت ذہین اور بے حد قابل احترام سفارت کار تھے۔ ان کا تعلق بنگال کی اشرافیہ سے تھا۔ ان کی والدہ کا تعلق سراج الدولہ کے خاندان سے تھا اور والد سر بیرسٹر عبدالرحیم 1908ء میں مدراس ہائی کورٹ کے جج تھے۔ بعد میں وہ چیف جسٹس بنے اور 1920ء میں اس عہدے سے استعفیٰ دے کر عملی سیاست میں حصہ لیا۔ مسلم لیگ کے سرکردہ رہنماؤں میں سے تھے اور انڈین مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر تھے۔

جے۔اے۔رحیم نے کیمبرج سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد میونخ یونیورسٹی

جرمنی سے کیمسٹری میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور وہاں پر ہی انہیں اپنی بیگم ESTHER ملی تھیں جنہوں نے سائیکالوجی میں میونخ یونیورسٹی جرمنی سے پی ایچ ڈی کی تھی۔ 1929ء میں شادی کے بعد جب جے اے رحیم نے انڈین سول سروس میں شمولیت اختیار کی تو وہ 1931ء میں اپنے خاوند کے ساتھ مدراس منتقل ہو گئیں۔ جے اے رحیم کی مدت ملازمت کا زیادہ وقت فارن سروس میں گزرا۔ وہ کئی جگہ سفیر رہے۔ سیکرٹری وزارت خارجہ بھی رہے۔ 1962ء سے وہ فرانس میں سفیر تھے وہاں پر ہی 1963ء میں ان کی بیگم ایستھر انتقال کر گئیں تھیں۔ جے اے رحیم کی بہن بیگم نیاز فاطمہ، حسین شہید سہروردی کی بیگم تھیں۔

پیرس میں 1966ء میں بھٹو جے اے رحیم ملاقاتوں کے بعد جے اے رحیم نے بھٹو صاحب کی زیر قیادت ایک نئی پارٹی کے فلسفے اور منشور کا خاکہ تیار کرنا شروع کر دیا۔ بھٹو صاحب یورپ میں طالب علموں اور نوجوانوں سے ملاقاتیں کر رہے تھے۔ طارق علی ان دنوں برطانیہ کی طالب علم سیاست میں اپنے عروج پر تھے انہوں نے بھی بھٹو صاحب سے ملاقات کی۔ طارق علی اپنی کتاب Street Fighting Years, an Auto Biography of Sixties کے صفحہ 318 اور 319 پر لکھتے ہیں کہ ''CLARIDGES میں لنچ کے بعد ہم بھٹو صاحب کے کمرے میں چلے گئے جہاں پر جے اے رحیم نے پاکستان پیپلز پارٹی کا ٹائپ شدہ منشور مجھے تھما دیا۔ اسی وقت پڑھنے کو کہا اور پارٹی کا بنیادی رکن بننے کے فارم پر دستخط کرنے کے لیے کہا۔ میں نے تیزی سے منشور پڑھا اور ممبر بننے سے انکار کر دیا۔ بھٹو صاحب چیخے کیوں؟ کیوں؟ اور تمہیں کیا چاہیے۔ میں نے دو اہم مگر کمزور نکات کی طرف نشان دہی کی۔ اول یہ کہ مذہب کو ریاست سے الگ نہیں رکھا گیا جیسا کہ ایم اے جناح نے مشورہ دیا تھا اور جیسا کہ نیشنل عوامی پارٹی اور مجیب الرحمن کی عوامی لیگ نے اس کو اپنایا تھا۔ دوسرا یہ کہ معاشی محاذ پر آدھا تیتر آدھا بٹیر کا نظام کسی کو بھی مطمئن نہیں کرے گا۔ اس سے مظلوموں کی توقعات وابستہ ہو جائیں گی جبکہ ان کی ضرورتیں پوری نہیں ہوں گی اور سرمایہ دار طبقہ بھی ناراض ہو جائے گا۔ رحیم مجھ سے اتفاق کر رہے تھے کہ انہوں نے بھی یہی بات بھٹو صاحب کو کہی تھی۔ مگر بھٹو صاحب کی ہدایات تھیں کہ میانہ روی رکھی جائے۔ بھٹو نے

میری تنقید کو کم از کم اس موقع پر برداشت کیا مگر اپنے نقطۂ نظر میں لچک پیدا نہیں کی۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ Bloody Mullahs ہوں گے۔ تمہارے خالص پن کی بنیاد پر مجھے ایک بازو پیچھے باندھ کر میدان جنگ میں جانا پڑے گا۔ میں نے زور دیتے ہوئے انہیں کہا کہ ایک بے معنی اسلامی سوشلزم کی بنیاد پر وہ خود مُلّاؤں کے ہاتھوں میں کھیلے جائیں گے۔ اسلام اور سوشلزم کو اکٹھا کرنے کی بنیاد پر مُلّا انہیں کافر قرار دینے کا طوفان اٹھائیں گے اور مجبوراً انہیں قرآن میں سے اس کے معنی تلاش کرنے کے لیے تحقیق اور تحریر کرنے والے تلاش کرنا ہوں گے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو آپ مُلّا کے چنے ہوئے میدان میں جنگ لڑیں گے اور بالآخر فتح مُلّا کی ہوگی۔ رحیم بار بار سر ہلاتے رہے اور اس تمام گفتگو میں خاموش رہے۔''

طارق علی نے جس ملاقات کا ذکر کیا ہے، یہ 1966ء کا زمانہ ہے۔ اس وقت نہ تو پیپلز پارٹی بنی تھی اور نہ ہی اس کے ممبر شپ فارم تھے۔ اس وقت اسلامی سوشلزم کا بھٹو صاحب اور جے۔ اے۔ رحیم کے نزدیک کہیں دور دور بھی ذکر نہیں تھا۔ نومبر/ 1967ء میں پیپلز پارٹی کی تشکیل کے موقع پر 95 صفحے پر مبنی پاکستان پیپلز پارٹی کی جو اساسی دستاویز انگریزی زبان میں چھپی تھی اور جس کا اردو ترجمہ بعد میں ہم نے نصرت میں چھاپا تھا، اس میں جو اصول درج تھا وہ ''سوشلزم ہماری معیشت ہے'' تھا، نہ کہ ''اسلامی سوشلزم ہماری معیشت ہے۔'' پارٹی کے قیام کے بعد بھی ''سوشلزم ہماری معیشت ہے'' پاکستان پیپلز پارٹی کا اقتصادی پروگرام رہا۔

نومبر 1967ء میں پاکستان پیپلز پارٹی قائم ہوئی۔ ہفت روزہ نصرت پیپلز پارٹی کے نظریاتی ترجمان کے طور پر 1968ء میں جاری ہوا۔ جب میں نے 1968ء میں نصرت کی ذمہ داری سنبھالی تو ہم نے ''سوشلزم ہماری معیشت ہے'' کا نظریہ عوام تک پہنچایا۔ بھٹو صاحب بھی اس وقت صرف سوشلزم کی بات کرتے تھے۔ البتہ بعد میں اسلامی سوشلزم کی اصطلاح کا سہارا لیا گیا۔ اس سے پہلے البتہ اگست 1966ء میں محمد حنیف رامے نے جو اس وقت کنونشن مسلم لیگ میں تھے اور ماہنامہ نصرت جو کہ ان کا ذاتی جریدہ تھا، اس کا اسلامی

سوشلزم نمبر ضرور شائع کیا تھا جس پر دانشوروں میں تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ان میں سے اکثر بھٹو صاحب کے حامی تھے اور جب عوامی تحریک نے زور پکڑا اور پاکستان کی گلی گلی میں امریکی سامراج مردہ باد، سوشلزم آوے ای آوے، مودودی ٹھاہ، یہودی ٹھاہ، ایشیا سرخ ہے، سرمایہ داری نہیں چلے گی، جاگیرداری مردہ باد جیسے نعرے گونجنے لگے تو مُلاؤں نے پاکستان میں سوشلزم کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے ہمیشہ کی طرح مذہب کو استعمال کیا۔ سوشلسٹوں کو دہریہ قرار دے کر ان پر کفر کے فتوے لگادیئے گئے۔عوام کی ابھرتی ہوئی طاقت کو اسلام اور کفر کی جنگ میں تبدیل کیا جانے لگا تو سیاسی حکمت عملی کے طور پر اسلامی سوشلزم کی اصطلاح کو اپنایا گیا۔

26ر مارچ 1948ء کو چٹا گانگ کی تقریر میں قائد اعظم نے بھی اس اصطلاح کا ذکر کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا ''جب یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان سماجی انصاف اور اسلامی سوشلزم کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہوتو نہ صرف میرے بلکہ کروڑوں مسلمانوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔'' اسی طرح علامہ اقبال نے کہا تھا ''اسلام کے لیے اشتراکیت کی جمہوریت (سوشل ڈیموکریسی) کو کسی موزوں شکل میں قبول کرنا حقیقت میں اسلام سے انحراف نہیں بلکہ اسلام کی اصل روح کی طرف لوٹنے کے مترادف ہے۔ (قائداعظم کے نام خط 21ر جون 1937ء)۔ اس سے پہلے مولانا حسرت موہانی نے 7ر اکتوبر 1950ء کو مشہور صحافی احمد بشیر کے ساتھ انٹرویو میں کہا تھا'' میرے نزدیک اسلام کا اقتصادی نظام اشتراکیت ہی ہے اور نہ صرف یہ کہ میں مسلمان ہوتے ہوئے اشتراکی ہوں بلکہ میں اشتراکی اس لیے ہوں کہ مسلمان ہوں۔''

ہم سوشلزم کے اقتصادی نظام کا اسلام کے اقتصادی نظام سے کوئی ٹکراؤ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس کو اسلام کے بنیادی اصولوں کے عین مطابق سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب ہم نے ہفت روزہ نصرت کے ذریعے، تحقیق اور تحریر کے ذریعے سوشلزم کے اقتصادی نظام کو اسلام کے معاشی اصولوں کی روشنی میں پاکستان کے عوام کے سامنے رکھا تو 113 مُلاؤں کے کفر کے فتوے کے باوجود عوام نے 1970ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کو اس کے اقتصادی

پروگرام یعنی ''سوشلزم ہماری معیشت ہے'' پر ووٹ دے کر کامیاب کروایا۔ اس دور میں ہم نے جو پمفلٹ لکھے اور کارکنوں اور عوام نے لاکھوں کی تعداد میں خریدے اور پڑھے، ان میں ایک اہم پمفلٹ ''اسلام اور سوشلزم'' بھی تھا۔

پاکستان اور دنیا بھر کے غریب اور مظلوم مسلمان آج بھی یہ یقین رکھتے ہیں کہ اسلام میں مساوات کے تصور کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مسجد میں تو مساوات قائم ہو، ایک ہی صف میں محمود و ایاز کھڑے ہو جائیں مگر دستر خوان پر اور تقسیم رزق پر مساوات قائم نہ ہو۔ ذرائع پیداوار اور تقسیم پیداوار پر چند افراد کا قبضہ ہو۔ دنیا بھر کے وسائل پر ایک فی صد کا قبضہ ہو اور ننانوے فیصد ان کے بنائے ہوئے تقسیم کے نظام کے غلام ہوں۔

حضرت ابوذر غفاریؓ جیسے جلیل القدر صحابی اور امام ابن حزمؒ جیسے عالم اور فقیہ نے بھی جو تعلیم دی تھی وہ سراسر سوشلزم سے ہم آہنگ تھی۔ سبط حسن کی تحریروں سے مجھ جیسے طالب علم کو معلوم ہوا تھا کہ وادی سندھ کے سوشلسٹ صوفی شاہ عنایت نے بھی بہت پہلے قانون فطرت کا یہ راز پالیا تھا کہ اصل چیز پیداواری عمل ہے اور اصل مساوات وہ ہے جو پیداواری عمل کے دوران بھی قائم ہو اور تقسیم کے دوران بھی۔ شاہ عنایت نے پیداواری عمل میں مساوی شرکت اور پیداوار کو حسب ضرورت بانٹ لینے کا نہ صرف اشتراکی تصور دیا بلکہ ان کے مرید فقیر اس طرز کی کاشت کاری میں مصروف ہو گئے اور ان کا یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔ جھوک میں آباد فقیروں کا یہ تجربہ سندھ میں جب مشہور ہونے لگا اور پھیلنے لگا تو اس دور کا حکمران طبقہ اور نظام حکومت خطرے میں پڑ گیا۔ انہوں نے لشکر کشی کر کے، قتل عام کر کے، ان کی اس تحریک کو کچلا۔ صوفی عنایت سندھ کے بہت بڑے سوشلسٹ صوفی تھے۔

جب بھٹو صاحب نے پیپلز پارٹی کا اقتصادی نظام، سوشلزم ہماری معیشت ہے، کا اعلان کیا تو مجھے ایسا لگا کہ وادئ سندھ نے ایک بار پھر صوفی عنایت شاہ جیسا انقلابی پیدا کیا ہے۔

مگر جب پیپلز پارٹی اقتدار میں آ کر رجعت پسندوں اور موقع پرستوں کے غلبے میں آ گئی، بھٹو صاحب نے اسلامی کانفرنس بلا کر اسلامی دنیا کا لیڈر بننا چاہا تو اسلامی سوشلزم

کی جگہ اسلامی مساوات کی اصطلاح نے لے لی اور پھر بات مساوات محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آ کر رک گئی۔ یہ وہ وقت ہے جب پیپلز پارٹی مُلاّئیت کا شکار ہو کر مُلاّ کے چنے ہوئے میدان میں پھنس گئی۔ پھر اس میدان میں ضیاالحق نے مُلاّؤں کے ساتھ مل کر پاکستان اور عوام کو ایسا چاروں شانے چت کیا کہ آج تک وہ اٹھ نہیں سکے۔

کراچی سے میری واپسی

میں ابھی تک کراچی میں تھا۔ چین نواز سوشلسٹوں کے ساتھ دوستیاں مضبوط ہوگئ تھیں۔ کراچی بڑا شہر، غریبوں اور مزدوروں کا شہر۔ مزدور خالی ناشتے دانوں کی میلی پوٹلیاں باندھے کارخانوں سے چیونٹیوں کی طرح نکلتے، بسوں کے انتظار میں کھڑے کلرکوں اور سکول کے بچوں کی قطاریں، جگہ جگہ ایرانی چائے خانے، کہیں کہیں فٹ پاتھ پر سوئے ہوئے انسان، نہایت تیزی سے دوڑتی زندگی، سب ایک سفر میں..........اپنے جسمانی وجود کی بقاء کی جدوجہد کا سفر، جس میں صبح ہوئی، شام ہوئی اور زندگی تمام ہوئی۔ نہیں معلوم کب جوانی گزری، کب بڑھاپا آیا۔ پھر یہی عمل اگلی نسل کو ورثے میں مل گیا۔ ایک مسلسل سفر، جس کا کوئی کنارہ نہیں۔

منوڑہ اور کیماڑی کے ساحل پر گودی میں کھڑے سمندری جہازوں کو مکرانی مزدوروں نے دیکھا ضرور تھا مگر کبھی بندرگاہ کو نظروں سے اوجھل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ ان کے پاؤں میں گردش تھی مگر گلے میں معاشی غلامی کی زنجیر۔ یہ سفر میں تھے مگر کئی نسلوں سے وہیں پر کھڑے تھے جہاں سے ان کے بزرگوں نے سفر شروع کیا تھا۔ سر جھکائے چلے جارہے تھے۔ میں سوچتا کہ سر اٹھا کر چلنا معلوم نہیں کب ان کو میسر آئے گا۔

جس طرح گورکی کی تحریروں میں پہلی بار چلتے پھرتے جاندار کردار نمودار ہوئے تھے اسی طرح برصغیر میں منشی پریم چند، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی اور شوکت صدیقی کی تحریروں میں محنت کشوں کے مسائل اور مظلوم طبقات کی محرومی نظر آتی تھی۔

اپنے پہلے عشق میں ناکامی کے بعد مجھے کراچی اب بے حد اداس لگتا تھا۔ زندگی بے مقصدیت کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔ میں بہت بیمار رہنے لگا تھا۔ والدہ آ کر مجھے واپس سرگودھا لے آئیں۔ میں شکست خوردہ سا واپس آ گیا مگر کراچی میں میرے احساس شکست سے ہی میری تکمیل کا راستہ بنا۔

سرگودھا میں اب بھی سب چیزیں اسی طرح ٹھہری ہوئی تھیں۔ سٹیلائٹ ٹاؤن کافی حد تک بھر چکا تھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ ساری کائنات پر ایک تھکی ہوئی اداسی اور ایک بیمار جمود طاری ہے۔ باہر کی کائنات کا انسان کے اپنے اندر کی کائنات سے کتنا گہرا تعلق ہے۔

آپا کی سیدھی مانگ اور سیاہ بالوں میں جا بجا چاندی کے تار چمکنے لگے تھے۔ ملکی حالات اور گھر کے معاملات پر اماں کے تبصرے، ابا کے ساتھ ان کی نوک جھونک گھر کی خاموش فضا میں ہمیشہ کی طرح ارتعاش پیدا کئے رکھتی۔ آپا اور اماں کی آنکھوں میں میرے بارے میں پریشانی، ایک نامعلوم سا خوف اور ایک غیر واضح اشتیاق کے ساتھ ساتھ ممتا زیادہ نظر آتی۔ گھر گھر سارنگی بجا کر، ''بستی بستی پربت پربت گاتا جائے بنجارہ''، گانے والا فن کار کبھی کبھار آن نکلتا تو میں اسے اپنے پاس بٹھا کر کچھ دیر اس کے انبالوی لہجے میں غزلیں اور گیت سنتا۔ اس کو معلوم تھا کہ کس گھر سے اسے روٹی، کس گھر سے پیسے اور کس گھر سے انکار ملے گا۔ وہ گا نا گا کر ایک وقار کے ساتھ بھیک مانگتا تھا۔ ہمارے سربراہان مملکت بھی بھیک مانگتے ہیں مگر جھولی پھیلا کر۔ قومی عزت و وقار کی ٹیون ان کو نہیں آتی۔

کراچی میں اپنی امنگوں اور آرزوؤں کی ناکامی پر غمزدہ رہنا بیکار تھا۔ صحت آہستہ آہستہ سنبھل رہی تھی اور اندر کی دنیا میں خوشگواری سی آنے لگی تھی۔

پاکستان ٹائمز میں پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے جغرافیہ میں داخلے کا اشتہار پڑھ کر میں لاہور کی طرف چل پڑا۔ قاضی سعید الدین شعبہ جغرافیہ کے سربراہ تھے۔ کرنل خلیل اللہ قریشی آ چکے تھے مگر شعبہ پر مضبوط گرفت ڈاکٹر مریم کی تھی جو گرلز ہاسٹل کی انچارج بھی تھیں اور اسلامی جمعیت طلبا کو ان کی سرپرستی حاصل تھی۔

میں جب انٹرویو کے لیے شعبہ جغرافیہ میں جو کہ نئے کیمپس میں تھا پہنچا تو چپڑاسی

سے لے کر طالب علموں تک سب ہی سہمے سہمے، جدید زمانے سے بچھڑے ہوئے، کئی سو سال پرانی سُست رفتاری کے ساتھ بگڑے ہوئے حلیے پر قدامت پرستی کا چہرہ لگائے، اپنے اپنے کام میں مصروف نظر آئے۔ میرے لباس اور انداز پر ان کی چھبتی نظریں کہہ رہی تھیں کہ تم غلط جگہ پر آ گئے ہو۔ ٹیڈی پتلون، سرخ قمیض، نوک دار جوتے، ایلوس پریسلے جیسے جمے ہوئے بال، اور لمبی لمبی گھنی مونچھیں، یہ حُلیہ ان کے لیے کچھ زیادہ ہی پریشان کن تھا۔ ڈاکٹر مریم نے ایک فقرہ کہا اور انٹرویو ختم ہو گیا۔ ''تم پڑھنے آئے ہو یا کسی فلم میں اداکاری کرنے۔ پڑھنے والوں کا حلیہ ایسا ہوتا ہے؟''

کرنل خلیل اللہ قریشی جو قاضی سعید الدین کے بعد شعبہ کے سربراہ بنے، خود بھی خوش شکل، خوش پوشاک اور خوش اخلاق انسان تھے مگر شعبہ پر اجارہ داری چونکہ ڈاکٹر مریم کی تھی اور ان کے نظم و نسق میں جہاں پر اسلامی جمعیت طلباء کے ناظم، کارکن، متفقین اور صالحین کو ان کی سرپرستی حاصل تھی، میں ایک خطرے کی علامت تھا۔ چنانچہ پھر واپس سرگودھا۔

راولپنڈی سے میرے مستقبل کا تعین

چند روز بعد راولپنڈی گورنمنٹ کالج میں جہاں پر ایم اے جغرافیہ کی کلاسز کا اجراء ہوا تھا داخلے کا اشتہار نظر سے گزرا۔ میں چناب ایکسپریس کے ذریعے جو سرگودھا سے رات کو چلتی تھی، علی الصبح راولپنڈی پہنچ گیا۔ اس وقت جغرافیہ میں ہی ایم اے کرنے کی دھن سوار تھی۔ بعد کے واقعات سے پتہ چلا کہ یہاں سے ہی فطرت نے میرے مستقبل کا تعین کرنا تھا۔

انٹرویو میں ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف نے جہاں اور سوالات کئے ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ ''کتاب پڑھنے کی رفتار کیا ہے۔ پڑھنا بہت پڑے گا ایک دن میں کتنی کتاب پڑھ سکتے ہو'' میں نے جواب دیا کہ ناول یا ڈرامہ ایک سے زیادہ اور بھاری بھر کم سنجیدہ کتاب کی رفتار کم۔ وہ بھی غالباً مجھے غیر سنجیدہ اور لاابالی سا انسان سمجھ رہی تھیں۔ کبھی

لاء، کبھی انٹرنیشنل ریلشنز اوراب جغرافیہ۔ انہوں نے اس شرط پر کہ بہت پڑھنا پڑے گا اور ماحول بھی خراب نہیں کرو گے، داخلہ دیتے ہوئے کہا کہ اگلے ہفتے سے کلاسز شروع ہو رہی ہیں، ہاسٹل میں رہائش کا بندوبست کرو یا کہیں بھی، مگر وقت پر پہنچ جانا۔ پتہ چلا کہ ڈاکٹر مریم اور ڈاکٹر کنیزہ فاطمہ یوسف لڑکپن کی سہیلیاں اور کلاس فیلوز تھیں۔ ایک رجعت پسند اور دوسری اس وقت کے تناظر میں ترقی پسند!!

باہر برآمدے میں دوسرے امیدوار لڑکے اور لڑکیاں اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ شمیم بھی ان میں تھیں اور سعید شفقت بھی۔ بعد میں شمیم نے میری زندگی کا ساتھی بننا تھا اور سعید شفقت نے عمر بھر کا دوست۔ میں کمرے کے حصول کے لیے ہاسٹل کی جانب بڑھا تو شکار کی تاک میں بیٹھا اسلامی جمعیت طلباء کا ناظم مدد کے لیے آن پہنچا۔ ہاسٹل کے وارڈن سے ملاقات کے بعد میں اس ناظم کے کمرے میں چائے پی رہا تھا اور وہ اپنے کئی بار کے دہرائے ہوئے درس کو دہرا رہا تھا۔ ''اگر فرد نماز، روزے کا پابند ہو جائے تو معاشرہ جنت نظیر بن جائے'' وغیرہ وغیرہ۔

یہ لوگ چھوٹے شہروں یا گاؤں سے آنے والے طالب علموں کو دبوچ لیتے تھے۔ گفتگو کا آغاز نماز کی فضیلت اور اسلام کی سربلندی سے شروع ہو کر مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی ''دعوت فکر'' پر ختم ہوتا تھا۔ معلوم نہیں آج کل بھرتی کا کیا طریقہ کار ہے مگر اس وقت ان کے یہاں بھرتی کا یہی طریقہ تھا۔ تعلیمی اداروں میں یونین پر قبضہ ان کا ہدف ہوتا تھا۔ اسلامی جمعیت طلباء، جماعت اسلامی کا طالب علم فرنٹ تھا۔ ان کا تنظیمی ڈھانچہ کمیونسٹ پارٹی کی طرز پر تھا۔ ابتدائی دعوت کے بعد سٹڈی سرکل، پھر ہم خیال، ہمدرد، متفق اور رکن بننے کے مراحل اور رکن بننے کے بعد کسی عہدے تک رسائی کے لیے وفاداری کے امتحان!!

حقوق اللہ پر جب اس کا درس ختم ہوا اور میں نے حقوق العباد کا موضوع شروع کر کے سوشلزم کے معاشی نظام کو جو کہ اسلام کے معاشی نظام مساوات کے قریب ہے اپنا کر معاشی استحصال سے پاک معاشرے کے قیام کی بحث چھیڑی تو اسے معلوم ہوا کہ میری

فکر کا تعلق مارکس، لینن اور ماؤزے تنگ کے خیالات سے ہم آہنگ ہے تو وہ کافی پریشان ہوا۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ بعد میں اس کے ساتھ دوستی ہوگئی۔ اس کا نام طارق تھا اور اس کا تعلق مانسہرہ سے تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب اس نے عملی زندگی میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ اس نے جماعت اسلامی سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔

ایک بار مولانا امین الدین احسن اصلاحی سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے زندگی کا ایک طویل حصہ جماعت کے ساتھ گزارا آپ کو اس میں کون سی بات سب سے زیادہ اچھی لگی۔ مولانا نے کہا ''سب سے اچھی بات یہ ہے کہ جماعت انسان کو عقل سکھاتی ہے اور جب اسے عقل آجاتی ہے تو وہ جماعت کو چھوڑ دیتا ہے۔'' ہمارے دوست پروفیسر امین مغل کی بھی جمعیت کو خیر باد کہنے کی وجہ یقیناً یہی رہی ہوگی۔

کالج کی بوسیدہ سی عمارت اصغر مال روڈ پر تھی جس پر آسیب زدہ ہونے کا گمان ہوتا۔ ہاسٹل اپنی سمجھ سے باہر تھا۔ میں نے سٹیلائٹ ٹاؤن میں گھر کرائے پر لے لیا اور محمد ایوب نے دیہات سے آکر کھانا پکانے اور دیگر امور کا کام سنبھال لیا۔ ان دنوں سٹیلائٹ ٹاؤن سے آگے سید پور وغیرہ کی طرف شام کے اندھیرے میں جانے کا مطلب گھڑی، بٹوہ یا نقدی اور سائیکل سے محروم ہونا تھا۔ شہر سے باہر چھوٹے چھوٹے دیہات تھے۔ سنگلاخ زمین کی طرح لوگ بھی سخت جان تھے۔ فصلوں کا انحصار آب باراں پر تھا۔ بارش ہوتی تو فصلیں اُگتیں۔ شہر میں گنتی کی چند کاریں تھیں۔ البتہ کینٹونمنٹ میں جہاں پر جی ایچ کیو بھی تھا، صدر بھی، وزراء بھی اور سرکاری دفاتر بھی، اکثر فوجی جیپوں اور سرکاری کاروں کی ریل پیل رہتی۔ مری روڈ پر نہایت خوبصورت رنگ برنگے سجے ہوئے تانگے ہوتے۔ ابھی تک نہ ویگنیں تھیں اور نہ ہی رکشہ، زرد اور کالے رنگ کی مورس ٹیکسیاں تھیں اور گورنمنٹ کی خستہ حال بسیں۔

سطح مرتفع پوٹھوار کی اونچی نیچی پتھریلی زمین پر راولپنڈی ایک ٹھہرا ہوا سا شہر تھا۔ ٹیلے اور جنگلی جھاڑیاں، بارش کی وجہ سے صدیوں سے جاری زمین کی تراش خراش کے عمل کے نتیجے میں بننے والے برساتی نالے اور کھائیاں اور دور سے نظر آنے والا مارگلہ پہاڑیوں

کا سلسلہ جس کے دامن میں حضرت شاہ عبداللطیف بری امام کا مزار۔

کینٹونمنٹ میں فوجی اور سرکاری افسروں کے بنگلے دھند میں جگمگاتے نظر آتے۔ آرمی میس کے برآمدوں میں سرخ اور زرد پھولوں کا سایہ ہوتا۔ میس میں جماعت اسلامی کا ترجمان ہفت روزہ ایشیا اور اس کا نیم سرکاری ترجمان اردو ڈائجسٹ بھی ملتا اور مری بروری کی بیئر بھی اور سکاچ وہسکی بھی۔ بیئر اور سکاچ والوں کی اکثریت تھی۔ ایک دوسرے کو ''سر'' سے مخاطب کرنے والے نوجوان افسر شام کو کبھی کبھی جب ٹپسی ہو جاتے تو بے حد مؤدب ہو کر ایک دوسرے کو ایڈ مائر کرتے۔ طبقاتی اعتبار سے ان کا تعلق غریب یا متوسط گھرانوں سے ہوتا مگر سویلینز کو اپنے سے کم تر سمجھنے کی ابتدائی تربیت سے گزر کر جلد ہی ان کی گردن میں حاکمیت کا سریہ پھنس جاتا۔

رات کو راولپنڈی کا خاموش شہر بھیانک حد تک خاموش ہو جاتا۔ البتہ راجہ بازار کے آخری کونے میں چپل کباب کی ایک آدھ دکان کھلی رہتی۔ فوارہ چوک کے قریب بسوں کا اڈہ کپکپاتی سردی میں بھی سرگرم نظر آتا۔ اس کے ارد گرد اکثر اوقات مولوی نما حضرات ازار بند اپنے دانتوں میں دبائے، ہاتھ شلوار کے اندر ڈالے، چلتے پھرتے استنجا کرتے نظر آتے۔ یہ کام دن کی روشنی میں بھی دیکھنے کو ملتا۔ اتنی بڑی تعداد میں ڈھیلا لگانے والے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ میں نے سعادت حسن منٹو کے چچا سام کے نام 1954ء میں لکھے گئے خطوط دوبارہ پڑھے۔ پھر کئی بار پڑھے۔

منٹو نے چچا سام سے یہ درخواست کی تھی: میں نے آپ سے صرف ایک چھوٹا، بہت ہی چھوٹا ایٹم بم مانگا تھا۔ جس سے میں ایک ایسے آدمی کو اڑا سکتا جو مجھے اپنے گھیرے دار شلوار کے نیفے کے اندر ہاتھ ڈال کر ڈھیلا لگاتا نظر آتا ہے۔

''ایک چھوٹا سا، ننھا سا ایٹم بم تو میں آپ سے ضرور لوں گا۔ میرے دل میں مدت سے یہ خواہش دبی پڑی ہے کہ میں زندگی میں ایک نیک کام کروں۔ آپ پوچھیں گے یہ نیک کام کیا ہے۔ آپ نے خیر کئی نیک کام کئے ہیں اور بدستور کر رہے ہیں۔ آپ نے ہیرو شیما کو صفحہ ہستی سے نابود کیا، ناگاساکی کو دھوئیں اور گرد و غبار میں تبدیل کر دیا۔ اس کے

ساتھ ساتھ آپ نے جاپان میں لاکھوں امریکی بچے پیدا کئے۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست............ میں ایک ڈرائی کلین کرنے والے کو مارنا چاہتا ہوں۔ ہمارے یہاں بعض مولوی قسم کے حضرات پیشاب کرتے ہیں تو ڈھیلا لگاتے ہیں............ مگر آپ کیا سمجھیں گے............ بہر حال معاملہ کچھ یوں ہوتا ہے کہ پیشاب کرنے کے بعد وہ صفائی کی خاطر کوئی ڈھیلا اٹھاتے ہیں اور شلوار کے اندر ہاتھ ڈال کر سر بازار ڈرائی کلین کرتے چلتے پھرتے ہیں۔

''میں بس یہ چاہتا ہوں کہ جونہی مجھے کوئی ایسا آدمی نظر آئے جیب سے آپ کا دیا ہوا منی ایچر ایٹم بم نکالوں اور اس پر دے ماروں تا کہ وہ ڈھیلے سمیت دھواں بن کر اڑ جائے۔''

منٹو کو کیا معلوم تھا کہ چچا سام اسی سر بازار ڈرائی کلین کرنے والے کو تیار کر کے اسے ایک ایسا خوفناک چلتا پھرتا بم بنائے گا کہ وہ معصوم عوام کو سر عام اڑاتا پھرے گا۔

گیارہ مئی 1912ء کو سمبرالہ ضلع لدھیانہ میں پیدا ہونے والے سعادت حسن منٹو کا پہلا افسانہ تماشا تھا۔ اس کے بعد ان کے قلم سے ایسا ایسا افسانہ نکلا کہ خدا کی پناہ! ٹوبہ ٹیک سنگھ، نیا قانون، بو، ٹھنڈا گوشت، ہتک، دھواں وغیرہ وغیرہ۔ معاشرے کے جعلی پن کی تہوں میں چھپی ہوئی حقیقتوں کو انہوں نے اس انداز سے بے نقاب کیا کہ عدالت کے ذریعے ان کی تحریر کی کاٹ کو قید کرنے کی کوشش کی گئی۔ ترقی پسند ادیبوں اور نقادوں نے بھی اور بدبودار رجعت پسند مخالفوں نے بھی منٹو کو خوب رگڑا دیا۔ مگر منٹو کھرا تھا اور ہمیشہ کھری بات کرتا رہا۔

اشاعت گھروں کے مالکوں نے ان کی تحریروں کو بغیر رائلٹی ادا کیئے کئی نسلوں تک بیچا اور ابھی تک بیچ رہے ہیں۔ جب میں نے ہفت روزہ نصرت کی ذمہ داری سنبھالی تو مجھے حسین نقی نے تنبیہ کی کہ تم ان لوگوں کو نہیں جانتے۔ یہ لوگ منٹو فیملی کو رلا رلا کر پیسے دیتے تھے اور بیس روپے دے کر کسی بچے کو ساتھ کر دیتے تھے یہ کہہ کر کہ جاؤ انکل تمہیں جلیبیاں خرید کر دیں گے۔ اس طرح یہ کاروباری لوگ بیس روپے میں سے بھی ایک دو روپیہ واپس لے لیتے تھے۔ حسین نقی جو ان دنوں صحافیوں کی تنظیم پنجاب یونین آف جرنلسٹس کے

سیکرٹری تھے انہوں نے کہا کہ اگر تم نے ان لوگوں سے اپنی کوئی تنخواہ مقرر نہیں کی تو طے کرو۔ اور اگر تم نے اپنی طے شدہ تنخواہ وصول نہ کی تو صحافتی برادری کے لیے اچھی مثال نہیں ہوگی۔ ویج بورڈ ایوارڈ آچکا ہے اور تمہاری تنخواہ اس کے مطابق ہونی چاہیے۔'' نقی صاحب جیسے ذہین، نڈر، بے باک اور سینئر صحافی کے پاس ان دنوں ایک سائیکل تھی۔ اکثر ادیب اور صحافی پیدل، تانگے، بس، رکشہ یا موٹر سائیکل پر سفر کرنے کی استطاعت رکھتے تھے۔ چند کے پاس کار تھی۔ اب تو حالات بدل چکے ہیں۔ معاشرے کے اس بدبودار گٹر میں جعل ساز اور بلیک میلرز اب اینکر اور صحافی بن کر کروڑوں میں کھیل رہے ہیں۔ سنا ہے با اصول صحافی اور لکھاری آج بھی معاشی مشکلات کا شکار ہیں۔

ایوب خان نے پاکستان کا دارالخلافہ کراچی سے اسلام آباد منتقل کرنے کا اعلان 1959ء میں کیا تھا اور 1960ء میں اس کی تعمیر شروع ہوگئی تھی۔ 1963ء میں کراچی سے سرکاری ملازمین اسلام آباد کے سرکاری کوارٹرز اور مکانات میں آنے لگے تھے۔ گھروں اور دفتروں کی تعمیر ہوتی گئی اور ملازمین منتقل ہوتے گئے۔ کراچی اور ڈھاکہ سے آنے والوں کے لیے اسلام آباد کا موسم بے حد شدید تھا۔ کراچی والے اپنے عزیز و اقارب اور دوستوں کو بتاتے کہ اسلام آباد میں آٹھ لحاف کا جاڑا پڑتا ہے۔ اور اگر کبھی کسی نوجوان کو نل کے نیچے لنگوٹا باندھے کھلے عام نہاتے دیکھ لیتے تو انہیں خود کو نمونیہ ہونے کا ڈر محسوس ہونے لگتا۔

ہمارے دوست مرحوم محمد علوی کی بیگم راشدہ علوی نے اسلام آباد پر ایک خوبصورت کتاب لکھی ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ آب پارہ رہائش کا مرکز تھا مگر سبزی ہو یا گوشت کی خریداری، دھوبی کی ضرورت ہو یا نائی کی، اسلام آباد کے مکینوں کو راولپنڈی جانا پڑتا تھا۔ یہ بستی آہستہ آہستہ بس رہی تھی۔ انہوں نے اپنی کتاب کا نام بھی ''بستے بستے بستی ہے'' رکھا ہے۔

وہ بنگالی جو اس جدید دارالحکومت میں کام کرتے تھے انہیں اس کی تعمیر و ترقی میں مشرقی پاکستان کی محرومی اور پٹ سن سے کمائے گئے زرمبادلہ کی بو آتی تھی۔

پڑھائی شروع ہوگئی۔ میں پوسٹ گریجویٹ جغرافیائی سوسائٹی کا صدر منتخب ہوگیا۔ یہ پلیٹ فارم آنے والے دنوں میں بہت کام آیا۔ ایوب خان نے اپنی حکومت کی

پالیسیوں کی تشہیر کے لیے پاکستان سنٹرز قائم کئے ہوئے تھے جہاں پر ان کے وزراء الطاف گوہر اور قدرت اللہ شہاب جیسے سرکاری دانشور لیکچرز دینے آتے تھے۔ راولپنڈی میں ان کو خورشید حسن میر اور دیگر ''سرپھروں'' کی تنقید کا نشانہ بننا پڑتا۔ میں اور سعید شفقت بھی ان مباحثوں میں باقاعدگی سے شامل ہونے لگے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا بھی اکثر نظر آتے اور راولپنڈی تو تھا ہی دادا میر حیدر کا شہر۔

خورشید حسن میر کا تعلق وادی کشمیر سے تھا۔ راولپنڈی میں وکالت کرتے تھے اور مولانا بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی میں سرگرم تھے۔ نہایت دلیر اور بے باک!! ان کی بیگم سرسید کالج میں لیکچرر تھیں۔ اور کالج کے زمانے میں میری بیگم کی استاد بھی رہی تھیں۔ میر صاحب کے ساتھ ہماری ملاقاتیں ڈاکٹر صاحبہ کے گھر کئی بار ہو چکی تھیں اور میرے پلیٹ فارم سے میر صاحب لیکچرز بھی دے چکے تھے۔

ایک روز ڈاکٹر صاحبہ نے ہم سب کو محمد حنیف رامے سے ملوانے کے لیے اپنے گھر بلوایا۔ یہ میری حنیف رامے کے ساتھ پہلی ملاقات تھی۔ اس سے پہلے صرف ان کی تحریریں، ان کی مصوری اور نصرت کی ادارت، جس کے وہ مالک بھی تھے میرے علم میں تھا۔ خورشید حسن میر اور ان کے درمیان اس روز کافی دلچسپ بحث رہی۔ حنیف صاحب نے اپنے قرآن پاک کے گہرے مطالعے کی روشنی میں گفتگو کی اور اسلام کے معاشی نظام کو سوشلزم کے عین مطابق ثابت کیا۔ جبکہ میر صاحب سوشلزم کو اقتصادی سائنس اور جدلیاتی عمل کی روشنی میں دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحبہ کی گفتگو کا مرکز ہمیشہ کی طرح قائداعظم اور علامہ اقبال کے تصورات تھے۔ میں حنیف صاحب کی گفتگو اور گفتگو میں استعمال ہونے والے لفظوں کے چناؤ سے متاثر ہوا۔ اگلے روز میں نے ان کا لیکچر رکھا اور انہوں نے دو گھنٹے تک قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں سوشلزم پر لیکچر دیا۔ وہ ابھی تک ایوب خان کی کنونشن مسلم لیگ کے پبلسٹی آفیسر تھے اور بھٹو صاحب اس پارٹی کے سیکرٹری جنرل۔

حنیف رامے اور بیگم شاہین رامے کی ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف کے ساتھ کوئٹہ میں دوستی استوار ہوئی تھی جہاں پر وہ کالج کی پرنسپل تھیں۔ ان دنوں حنیف صاحب اپنی

سسرال میں رہ کر مصوری بھی کر رہے تھے اور قرآن کا مطالعہ بھی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ انہوں نے دو سال تک قرآن پاک کا نہایت گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ غلام احمد پرویز کے ساتھ بھی ان کے خیالات کی ہم آہنگی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ بین الاقوامی زیرزمین تنظیم ''فری میسن'' کے ممبر بھی تھے۔

بشیر الاسلام عثمانی اور منو بھائی روزنامہ تعمیر سے وابستہ تھے۔ ان کا بھی ڈاکٹر صاحبہ کے یہاں آنا جانا تھا۔ گارڈن کالج کے خواجہ مسعود بھی کبھی کبھار نظر آجاتے۔ ڈاکٹر صاحبہ کا گھر ترقی پسندوں کی ملاقاتوں کا مرکز بنتا گیا۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ، معاہدہ تاشقند، ویت نام اور فلسطین میں جدوجہد آزادی، پاکستان اور عوام کا مستقبل، یہ سب وہ موضوعات تھے جنہوں نے سب کو فکرمند کیا ہوا تھا۔ ایوب خان اور بھٹو صاحب کے درمیان کشیدگی پر سب کی نظر تھی اور ہر ایک کا خیال تھا کہ ملک میں ایک نئی سیاسی پارٹی اور قیادت کی ضرورت ہے۔ کراچی کے کامریڈز بھی انہی خطوط پر سوچ رہے تھے۔ طفیل عباس کی اور معراج محمد خان کی بھٹو صاحب سے ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔

عوام ریاستی جبر اور مہنگائی کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ اظہار رائے پر بندش تھی۔ اس کے باوجود، صفدر میر، فیض احمد فیض، حسین نقی، سبط حسن، طفیل عباس، احمد ندیم قاسمی، شوکت صدیقی، شفقت تنویر مرزا، جون ایلیا، ابن انشاء، ساغر صدیقی، ظہیر بابر، مسعود کھدر پوش، ظہیر کاشمیری غرضیکہ ہر ایک ترقی پسند شاعر و ادیب، صحافی و مفکر ملکی حالات پر فکری بحث میں شامل تھا۔ حبیب جالب نے محترمہ فاطمہ جناح کے انتخابات کے دوران جن نظموں کو تخلیق کیا اور اپنی سریلی آواز میں عوام تک پہنچایا وہ زبان زد عام تھیں۔ دستور، بچوں پر چلی گولی، 20 روپے من ہے آٹا، جیسی نظمیں عوام کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھیں۔ مہدی حسن نے فیض صاحب کی غزل ''گلوں میں رنگ بھرے'' گا کر فیض صاحب کو انقلابی دانشوروں کے ڈرائینگ روموں سے نکال کر عوامی حلقوں تک پہنچا دیا تھا اور معاشرے میں حاکم وقت کے خلاف، استحصالی نظام کے خلاف، سرمایہ داروں، جاگیرداروں کے خلاف، امریکی تسلط کے خلاف، بغاوت کا دیو انگڑائی لے رہا تھا۔

بھٹو واپس پاکستان آگئے

بھٹو صاحب اکتوبر 1966ء تک ملک سے باہر رہے۔ ان کی واپسی پر مشترکہ دوستوں کے ساتھ ان کی چند ملاقاتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ نئی پارٹی بنانے جا رہے ہیں۔ 1965ء کی جنگ کے معاہدۂ تاشقند کے خلاف بالخصوص پنجاب کے عوام کے جذبات کی شدت، افواج پاکستان میں بھی پنجاب کی اکثریت، پھر ایوب خان سے علیحدگی کے بعد لاہور ریلوے اسٹیشن پر لاکھوں انسانوں کا پر جوش استقبال، ان سب کے پیش نظر بھٹو صاحب نے ''بھارت مخالف زرخیز زمین'' پنجاب کو اپنی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنالیا۔

لاہور کے فلیٹیز ہوٹل کے کمرہ نمبر 55 میں بھٹو صاحب اکثر ٹھہرا کرتے تھے۔ یہی وہ کمرہ ہے جس میں قائداعظم بھی قیام فرماتے تھے۔ یہاں پر کنور محمد دلشاد نے اپریل 1967ء میں حنیف رامے کی ملاقات بھٹو صاحب سے رات کے دو بجے کروائی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ان دنوں رامے صاحب مرکزی اردو بورڈ کے ریسرچ آفیسر تھے اور ایجنسیوں کے خوف کی وجہ سے یہ ملاقات اس وقت میں ہی ممکن تھی۔ یہ ان کی بھٹو صاحب سے پہلی ملاقات تھی۔ اس سے پیشتر دسمبر 1966ء میں بھی حنیف رامے نے کنور دلشاد کے ذریعے ہی بھٹو صاحب سے ملاقات کی کوشش کی تھی۔ حنیف صاحب ان سے ملنے کراچی گئے اور کولمبس ہوٹل میں ٹھہرے جو کہ 70 کلفٹن کے قریب تھا۔ وہ وقت مقررہ پر 70 کلفٹن پہنچے مگر بھٹو صاحب نے ان سے ملاقات نہیں کی۔ بعد میں کنور دلشاد کے استفسار پر بھٹو صاحب نے بتایا کہ انہیں پروگرام کی تبدیلی کی وجہ سے کہیں جانا پڑا۔ ''مگر اسلامی سوشلزم سے متعلق جو دستاویزات وہ چھوڑ گئے تھے وہ میں نے دیکھ لی ہیں۔ یہی دستاویزات انہوں نے ایوب خان کو بھی بھجوائی تھیں جب

میں کنونشن مسلم لیگ کا سیکرٹری جنرل تھا۔ اور یہ میری نظر سے گزر چکی ہیں۔"

چین نواز پارٹی کے ساتھ بھٹو کا اتحاد

کراچی کے چین نواز دوست اور ساتھی پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ اگر بھٹو صاحب نے پارٹی بنائی تو ان کے ساتھ مل کر اس گلے سڑے نظام اور آمریت کے خلاف جدوجہد کی جائے گی۔ این ایس ایف اور ایئر ویز یونین جو زیر زمین پارٹی کے اوپن فرنٹ تھے ان کی قوت کا بھٹو صاحب کو اندازہ تھا۔

اس زیر زمین پارٹی کے ساتھ بھٹو صاحب نے اتحاد بنایا اور جب پیپلز پارٹی نے ہالہ کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا کہ انقلاب نہیں انتخاب تو بھٹو صاحب نے اس زیر زمین چین نواز پارٹی کو پیپلز پارٹی کے جھنڈے تلے تینتیس (33) نشستوں سے انتخابات میں حصہ لینے کی پیش کش بھی کی۔

پاکستان پیپلز پارٹی بننے کے بعد مجھ سمیت اس زیر زمین پارٹی کے معراج محمد خان سے لے کر ملتان کے اشفاق احمد تک سب نے پیپلز پارٹی میں بھر پور کام کیا تھا۔ مگر انتخابات میں حصہ لینے کے بارے میں پارٹی کا یہ خیال تھا کہ اگر کامریڈز انتخابی عمل میں گئے اور جیت کر پارلیمنٹ میں گئے تو اقتدار کی چمک دمک دیکھ کر وہ انقلابی جدوجہد کے راستے سے ہٹ جائیں گے۔ پارٹی اپنے کیڈر سے ہاتھ دھو بیٹھے گی اور انقلابی جدوجہد پیچھے چلی جائے گی۔ چنانچہ بھٹو صاحب نے زیر زمین پارٹی کے ان کامریڈز کو قومی اور صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لینے کے لئے جب ٹکٹ جاری کئے تو پارٹی کے فیصلے کے مطابق یہ ٹکٹ واپس کر دیئے گئے۔ معراج محمد خان نے اپنا ٹکٹ جیل سے واپس کیا۔ بعد کے حالات نے یہ ثابت کیا کہ یہ فیصلہ درست نہیں تھا۔ اس لیے کہ زیر زمین پارٹی کا کیڈر سال ہا سال کی تنظیمی اور فکری تربیت اور صلاحیت رکھتا تھا۔ ایک معراج محمد خان کئی سو روایتی سیاست دانوں پر بھاری تھا۔ گجایہ کی تینتیس کامریڈز۔ پارلیمنٹ میں اتنی بڑی تعداد میں ہم سب کی موجودگی کی وجہ سے شاید آنے والے وقت میں بھٹو صاحب کو جاگیرداروں، سول اور فوجی

نوکرشاہی کے ساتھ سمجھوتے کرنے اور بعد میں ان پر مکمل بھروسہ کرنے میں مشکل پیش آتی۔حکومت کی پالیسیاں بھی شاید پیپلز پارٹی کے بنیادی منشور کے مطابق مرتب ہوتیں اور اقتدار میں آنے کے بعد بھٹو صاحب کے لیے سوشلسٹ مخالف کردار اپنانا بھی دشوار ہوتا۔

زیر زمین پارٹی کا اس وقت کا یہ تجزیہ تو ٹھیک تھا کہ کچھ دور جا کر، اقتدار میں آکر بھٹو صاحب اپنا راستہ تبدیل کریں گے مگر ان کا یہ خیال کہ جب بھٹو صاحب عوام کو چھوڑیں گے اور سوشلسٹ مخالف کردار ادا کریں گے تو زیر زمین پارٹی کا یہ کیڈر، پیپلز پارٹی میں موجود رہ کر عوامی جدوجہد کو لے کر آگے بڑھ جائے گا، غلط ثابت ہوا۔ پیپلز پارٹی کا شیرازہ بھی بکھرا، عوام کی طاقت بھی ٹوٹی اور زیر زمین پارٹی اور اس کا کیڈر بھی تباہ ہوگیا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ پارٹی کیڈر کو اس وقت کی اسمبلیوں میں جا کر اپنا کردار ادا کرنا چاہیے تھا۔

ہمیں معلوم تھا کہ بھٹو قوم پرست ہیں، سوشلسٹ نہیں ہیں

ان کا ساتھ دینا تاریخ کا تقاضا تھا

بائیں بازو کے افراد اور تنظیموں نے ذوالفقار علی بھٹو کا ساتھ کسی رومان پسندی کی وجہ سے نہیں دیا تھا۔ ہم سب کو یہ معلوم تھا کہ بھٹو صاحب پاکستانی قوم پرست ضرور ہیں مگر سوشلسٹ نہیں ہیں اور یہ بھی معلوم تھا کہ سوشلسٹ انقلاب، انتخابات کے ذریعے یا انتخابات کے نتیجے میں تو نہیں آئے گا، کیونکہ انقلاب ایک طویل عمل ہے جس کو اپنی خواہش، عجلت یا بے صبری میں پابند نہیں کیا جاسکتا اور یہ کہ عوامی انقلاب ایک لڑائی کا نام نہیں بلکہ کئی لڑائیوں پر مشتمل ایک طویل طبقاتی جنگ کا عمل ہے۔ لینن نے 1919ء میں کہا تھا ''صرف بدمعاش اور بے وقوف ہی یہ سوچ سکتے ہیں کہ پرولتاریہ سرمایہ داروں کی غلامی کے تحت ہوتے ہوئے بورژوا پارلیمنٹ میں الیکشن کے ذریعے اکثریت حاصل کرسکتی ہے اور اسے سرمایے کی غلامی میں الیکشن کے ذریعے اکثریت حاصل ہوسکتی ہے۔ یہ اعلیٰ درجے کی بے وقوفی اور دھوکے بازی ہے کہ پرانے نظام میں ہم یہ سوچیں کہ الیکشن سے انقلاب لاسکتے ہیں اور فرسودہ نظام کے ہوتے ہوئے طبقاتی جدوجہد اور انقلاب تک پہنچ سکتے ہیں۔''

مگر ہمیں یہ یقین ضرور تھا کہ بھٹو صاحب کے اقتدار میں آنے کے بعد کم از کم وہ رجحانات ضرور مرتب ہو جائیں گے جن کے حتمی نتیجے کے طور پر آج نہیں تو آنے والے کل میں روٹی کپڑا اور مکان جیسی بنیادی ضروریاتِ زندگی کے بوجھ سے آزادی دلانے والے معاشی نظام کی داغ بیل پڑ جائے گی۔ ہمارا یہ بھی خیال تھا کہ اقتدار میں آنے کے بعد سوشلسٹ طرز معیشت کے نظام کو نافذ کرنا بھٹو صاحب کی ضرورت اس لیے بھی رہے گا کہ عوام کی طاقت ان کے ساتھ رہے۔ یوں بھی تاریخ میں کبھی کبھار ایسا ہوا ہے کہ لوگوں کو تپتی، سلگتی دھوپ کی شدت سے نجات دلوانے کے لیے ظالم اور استحصالی طبقات کی چوڑی اور بظاہر مضبوط دیوار سے سایہ نکلا ہے۔ فرعون کے گھروں میں موسیٰ پروان چڑھ سکتے ہیں۔ اس لیے ترقی پسندوں کی بھٹو صاحب سے وابستہ امیدیں غلط نہیں تھیں۔

جب 30 نومبر 1967ء کو ڈاکٹر مبشر حسن کی گلبرگ میں قیام گاہ پر پاکستان پیپلز پارٹی عالم وجود میں آئی تو اس کے منعقدہ کنونشن میں جن اصولوں کا اعلان کیا گیا تھا اور جن کے عملی حصول کے لیے پارٹی کا قیام عمل میں لایا گیا تھا اس کا حتمی مقصد ملک میں غیر طبقاتی معاشرے کا قیام اور جدید نو آبادیاتی طاقت یعنی امریکہ کے محور سے نکل کر پاکستان کی پس ماندہ اور غلامانہ صورت حال کو ختم کرنا تھا۔ اور جب نومبر 1970ء میں پاکستان پیپلز پارٹی نے اپنے انتخابی منشور کا اعلان کیا تب بھی اس کے دوسرے باب میں غیر طبقاتی معاشرے کے قیام کے عنوان کے تحت اس کا اعادہ کیا گیا تھا۔

چنانچہ بائیں بازو کے افراد اور تنظیمیں یہ سمجھ رہے تھے کہ بھٹو صاحب ان کی امنگوں اور خواہشات کی ترجمانی کر رہے ہیں اور عوام کو متحرک کرنے کا وہ کام جو ان سے اس پیمانے پر نہیں ہو سکا تھا وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے پلیٹ فارم سے سرانجام ہو رہا ہے۔ یعنی وہ بھٹو صاحب کو اپنے پروگرام کی ترویج کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ جبکہ بھٹو صاحب اپنے اقتدار میں آنے کے لیے ترقی پسند افراد، بائیں بازو کی تنظیموں، ترقی پسند طالب علموں، مزدوروں، کسانوں، سوشلسٹ نظریات، انقلابی فکر اور نعروں کو استعمال کر رہے تھے۔ اقتدار میں آنے کے بعد جب بھٹو صاحب کا سوشلزم مخالف کردار ظاہر ہوا اور ایک

دوسرے کو استعمال کرنے کا یہ کھیل ختم ہوا تو ترقی پسند ہمیشہ کی طرح اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ تحریک کو لے کر آگے بڑھ سکتے۔ جبکہ عوام ایک عرصے تک بھٹو صاحب کو اپنا مسیحا سمجھتے رہے اور یقین کرتے رہے کہ ذوالفقار علی بھٹو ان کی غربت کے دریا پر ایک مضبوط پل تعمیر کرنے والے ہیں جس پر چل کر وہ اپنی معاشی غلامی سے نجات حاصل کر لیں گے۔

وہ تمام افراد جو انتہائی جوش وخروش یا انتہائی خاموشی کے ساتھ اپنے آپ کو انقلابی کہتے تھے یا سمجھتے تھے ان کی اکثریت پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر چکی تھی۔ روس نواز گروہ یا افراد ہر نکتے کی وضاحت کے لیے چونکہ ماسکو کی طرف دیکھتے تھے اس لئے وہ پیپلز پارٹی میں شامل ہونے کے لئے تیار نہیں تھے کیونکہ ماسکو کی طرف سے اس کا اشارہ نہیں تھا۔

اس وقت تک پوری دنیا میں روس نواز گروہوں کو خروشیف اور برزنیف نے سوویت یونین کی ''این جی اوز'' بنا ڈالا تھا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ سوویت یونین ٹوٹنے کے بعد یہی ''این جی اوز'' امریکہ اور یورپ کی گود میں جا بیٹھیں۔ ان ترمیم پسندوں کا یہ دلخراش انجام ہوگا اس کا اس وقت کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا۔ امریکہ اور یورپ نے سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد روس میں بھی اپنی این جی اوز قائم کیں جن پر حال ہی میں روس کے صدر پوٹن نے پابندی عائد کر دی ہے کیونکہ وہ روس کے خلاف اور امریکہ کے ایجنڈے پر عمل کر رہی تھیں۔

گول باغ لاہور کے جلسہ عام میں سیاسی پارٹی بنانے کا اعلان

22رجون 1967ء کو بھٹو صاحب لاہور میں مشرق وسطیٰ کی صورت حال بالخصوص عرب اسرائیل جنگ اور جمال عبدالناصر کے حوالے سے جلسہ عام سے خطاب کرنے والے تھے جہاں پر انہوں نے اپنی سیاسی پارٹی کا اعلان بھی کرنا تھا۔ اگرچہ اس جلسے میں خطاب کی دعوت افروایشین سالیڈیریٹی کے صدر ملک معراج خالد، پاک چین دوستی کے صدر ممتاز احمد خان اور پاکستان مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر کنور محمد دلشاد کی طرف سے دی گئی مگر ملک معراج خالد اور ممتاز احمد خان نے ایک روز پہلے بھٹو صاحب کو

اپنی مجبوریوں سے آگاہ کر کے جلسہ گاہ میں نہ جانے کا مشورہ دیا جس پر بھٹو صاحب بے حد ناراض تھے۔ وہ ہر قیمت پر جلسے سے خطاب کرنا چاہتے تھے۔ ملک معراج خالد، ممتاز احمد خان اور شیخ رشید (بابائے سوشلزم) نے کنور محمد دلشاد کے ذریعے ان کو پیغام بھیجا کہ تقریر کے دوران آپ سوویت یونین اور معاہدۂ تاشقند کے حوالے سے بات نہ کریں۔ ان کی تنظیمیں وزارت خارجہ کے ماتحت تھیں اور ان کو یہ ہدایت وزارت خارجہ کی جانب سے موصول ہوئی تھیں۔ کنور دلشاد بتاتے ہیں کہ جب میں نے ان کا پیغام بھٹو صاحب تک پہنچایا تو بھٹو صاحب کا پارہ آسمان تک پہنچ گیا۔ پاکستان مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن ایوب خان کی کنونشن مسلم لیگ کی ذیلی تنظیم تھی۔ جب یہ قائم ہوئی تو بھٹو صاحب کنونشن مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل تھے اور اس تنظیم کے سرپرست تھے۔ اس حوالے سے کنور محمد دلشاد جو کہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر رتھے، کا واسطہ بھٹو صاحب کے ساتھ تھا۔

جلسے کا اعلان ہو چکا تھا۔ شورش کاشمیری کے پریس سے پوسٹر چھپ کر پورے شہر میں چسپاں تھے۔ جلسہ گاہ میں کم وبیش دو سے تین لاکھ تک لوگ بھٹو صاحب کو سننے کے لئے جمع تھے۔ جنہوں نے مدعو کیا تھا وہ غائب تھے اور اب سٹیج نوجوانوں کے کنٹرول میں تھا جن میں ملک حامد سرفراز، کنور محمد دلشاد، احمد رضا قصوری، میاں اسلم، امان اللہ خان اور شیخ صفدر نمایاں تھے۔ اس جلسے کو درہم برہم کرنے کے لئے گورنر محمد موسیٰ خان اور احمد سعید کرمانی نے غنڈے بھیجے ہوئے تھے۔ پہلے تو سارے باغ کو پانی سے بھر دیا گیا۔ اس پانی کی پرواہ کئے بغیر بھی جب لوگ جمع ہوتے گئے تو انہوں نے بجلی کی تاریں کاٹ کر اس میں چھوڑ دیں جس سے پانی میں کرنٹ آ گیا اور لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ اس دوران بھٹو صاحب مصطفےٰ کھر کے ساتھ سٹیج پر پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز کیا ہی تھا کہ غنڈوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ بلب توڑ دیئے گئے۔ اندھیرے میں بھٹو صاحب سٹیج سے نیچے گر کر زخمی ہو گئے۔ غنڈے ہوائی فائر کرتے رہے اور بڑھکیں مارتے رہے ''ماردو، جانے نہ پائے۔'' ملک حامد سرفراز، مصطفےٰ کھر، احمد رضا قصوری، امان اللہ خان، میاں اسلم، شیخ صفدر وغیرہ نے بھٹو صاحب کو بمشکل جلسہ گاہ سے نکال کر گورنمنٹ کالج تک پہنچایا۔ کالج کے پرنسپل نے ڈر

کی وجہ سے اپنے گھر کا دروازہ نہ کھولا۔ بھٹو صاحب زخمی تھے۔ انہیں سڑک تک لایا گیا۔ جہاں پر روشن علی نامی رکشہ والے نے بھٹو صاحب کو ہوٹل تک پہنچایا۔ (بھٹو صاحب نے اقتدار میں آنے کے بعد روشن علی کو ایک نیا رکشہ انعام کے طور پر دیا تھا) اس جلسے میں بھٹو صاحب نے اپنی سیاسی پارٹی بنانے کا اعلان کر دیا۔

پارٹی کیسی ہونی چاہیے، اس کے بنیادی اصول کیا ہوں گے۔ اس کا نام کیا ہوگا، اس کا جھنڈا کیسا ہوگا، اس کی تاسیسی دستاویز کیا ہوگی، داخلہ و خارجہ پالیسی کے علاوہ کس معاشی و معاشرتی نظام کے تصور کی بنیاد پر اس کی عمارت کو کھڑا کیا جائے گا، اس تنظیم میں کن طبقات کو کیا نمائندگی دی جائے گی وغیرہ وغیرہ، یہ وہ سوالات تھے جن کا جواب صرف ذوالفقار علی بھٹو اور جے۔ اے۔ رحیم کے پاس تھا۔

عوام دوست اور وطن پرست دانشور سامراج دشمن تھے۔ بالخصوص 1965ء کی جنگ میں شکست کے بعد پاکستان پر امریکہ کی بالادستی کے خلاف تھے۔ ایوب خان، اس کی حکومت اور کنونشن مسلم لیگ سے نجات چاہتے تھے۔ وہ نئی پارٹی اور نئی قیادت کے انتظار میں تھے۔ لاہور میں ڈاکٹر مبشر حسن اور ان کے چند ہم خیال دانشوروں کا ماہانہ اجلاس ہوتا تھا جس میں ملکی مسائل زیر بحث آتے۔ اس میں مرزا عبداللطیف، میاں اسلم اور ملک حامد سرفراز وغیرہ شامل ہوتے۔ ڈاکٹر مبشر حسن نے ان تمام حضرات کی شمولیت کے ساتھ ایک انقلابی منشور یا دستاویز تیار کی جس کا عنوان تھا A declaration of the unity of the people

یہ دستاویز بھٹو صاحب کو ارسال کی گئی اور طے پایا کہ بھٹو صاحب اور جے اے رحیم کے ساتھ ڈاکٹر صاحب لاڑکانہ اور کراچی میں ملاقاتیں کر کے نئی پارٹی کی تفصیلات اور پروگرام سے آگاہی حاصل کریں گے۔ ان ملاقاتوں میں بھٹو صاحب کو دی گئی دستاویز پر جے اے رحیم اور بھٹو صاحب نے مکمل اتفاق کیا اور ڈاکٹر صاحب کو دعوت دی کہ پارٹی کے قیام کے موقع پر وہ اپنے تمام رفقاء کے ساتھ شامل ہوں۔ بعد میں اس دستاویز کو اور خورشید حسن میر کا کتابچہ ''پارٹی کیسی ہونی چاہیے'' کو پیپلز پارٹی کی بنیادی دستاویز کا حصہ بنایا گیا۔

ڈاکٹر مبشر حسن ضلع کرنال کی تحصیل پانی پت میں پیدا ہوئے تھے اور قیام

پاکستان کے موقع پر ان کا خاندان ہجرت کر کے لاہور اور منٹگمری (حالیہ ساہیوال) میں آباد ہوا تھا۔ امریکہ کی IOWA سٹیٹ یونیورسٹی سے سول انجیئرنگ میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں پروفیسر تھے اور شعبہ سول انجینئرنگ کے انچارج تھے کہ 1965ء میں ان کو امیر محمد خان نے ان کے خیالات کی وجہ سے ملازمت سے برطرف کردیا تھا۔

ڈاکٹر مبشر حسن اور پارٹی کنونشن کی تیاری

ایوب خان بھٹو صاحب کے ساتھ ذاتی دشمنی پر اتر آیا تھا۔ ملک پر طاری جبرو خوف کی فضاء میں ایک نئی پارٹی کا قیام ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ بھٹو صاحب نے ملک بھر سے ان تمام افراد کو جوان کے ساتھ رابطے میں تھے اور ان کے نئے سیاسی سفر میں، آنے والے مشکل حالات میں ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھے، نئی پارٹی کے تاسیسی اجلاس میں شرکت کی دعوت دے دی۔ یہ کنونشن ڈاکٹر مبشر حسن کی رہائش گاہ واقع گلبرگ میں ہونا قرار پایا۔ ڈاکٹر صاحب کو پہلے تو حکومتی اداروں کی جانب سے منع کیا گیا۔ پھر انہیں قتل کرنے اور ان کے گھر کو جلانے کی دھمکیاں دی جانے لگیں۔

ڈاکٹر صاحب کے گھر کے قریب اوریگا سینما تھا۔ کنونشن کی تیاریوں اور آنے جانے والوں پر نظر رکھنے کے لیے حکومت کی وفادار انٹیلی جنس ایجنسیوں کے بھوری آنکھوں والے کی زیر نگرانی دو جیپیں اس سینما کے پاس کھڑی رہتیں۔ اس وقت کی ایجنسیوں کے طریقۂ کار اور وسائل کچھ ایسے ہی تھے۔ ایک آدھ جیپ اور سفید کپڑوں میں چند فدویان سے ان کا کام چل جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی وفادار کتیا ''مشی'' بھی اپنے مالک کی وفاداری کرتے ہوئے گھر میں آنے جانے والوں پر نظریں جمائے رکھتی۔ اس کنونشن کی تیاری میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ان کے گھر کے افراد اور ان کی بہن آئمہ حسن کے علاوہ بیگم آباد احمد تحریک پاکستان کی ایک سرگرم مجاہدہ، ملک حامد سرفراز، امان اللہ خان اور میاں محمد اسلم پیش پیش تھے۔

1967ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کا قیام

ڈاکٹر صاحب کے گھر کے لان میں شامیانہ لگایا گیا اور 30 نومبر اور یکم دسمبر 1967ء کو پاکستان پیپلز پارٹی کا دوروزہ تاسیسی اجلاس منعقد ہوا جس میں پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کنونشن میں تقریباً دوسوسے ڈھائی سو مندوبین نے شرکت کی۔ ایوب خان کے جبر اور خوف کی فضاء میں جن افراد نے اس کنونشن میں شریک ہوکر پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی وہ سب بہت بہادر لوگ تھے یہ تمام کے تمام پارٹی کے بنیادی اراکین تھے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ جہاں اور مذاق کئے گئے، اس کی شکلیں بگاڑی گئیں، اس پر قبضے کئے، ان میں ایک ظلم یہ بھی ہوا کہ وہ افراد جو پارٹی کے قیام کے وقت اپنے بچپن یا لڑکپن میں تھے بلکہ وہ بھی جو 1967ء کے دس سال بعد تک بھی اپنی شکم مادر میں نہیں تھے وہ بھی پارٹی کے ''فاؤنڈر ممبر'' یعنی پارٹی کی بنیاد رکھنے والے کارکن کہلواتے ہیں۔ بے نظیر بھی کم سن تھیں اور اپنی عمر کی وجہ سے ممبر نہیں بن سکتی تھیں۔ البتہ 70 کلفٹن میں جب پارٹی کا دفتر قائم کیا گیا تو بیگم نصرت بھٹو سے لے کر ملازم بابو تک جو بھی ممبر بننے کی عمر رکھتا تھا چار آنے کی پرچی کٹوا کر ممبر بنا۔

اس کنونشن میں پاکستان پیپلز پارٹی کا نام اور جھنڈا منظور کیا گیا۔ بہت سی قرار دادیں منظور کی گئیں۔ تاسیسی دستاویز تقسیم کی گئی جس میں وضاحت کی گئی کہ سوشلزم کو اپنانا کیوں ضروری ہے۔ بھٹو صاحب کو پارٹی کا چیئرمین اور جے اے رحیم کو سیکرٹری جنرل چنا گیا۔ شیخ محمد رشید کو پنجاب اور بہاولپور، خان حیات محمد خان شیر پاؤ کو سرحد، میر رسول بخش تالپور کو سندھ اور امان اللہ خان گچکی کو بلوچستان کا کنوینر مقرر کیا گیا۔ جبکہ مولانا نور الزمان کو

مشرقی پاکستان کا کنوینر مقرر کیا گیا۔ بعد میں جے اے رحیم، ڈاکٹر مبشر حسن، اور محمد حنیف رامے، ان تین افراد پر مشتمل اصولی کمیٹی بنائی گئی۔ بھٹو صاحب کی ہدایت کے مطابق ان کے دوست غلام مصطفیٰ جتوئی اور غلام مصطفیٰ کھر اور ان کے کزن ممتاز بھٹو اس اجلاس میں شریک نہیں ہوئے کیونکہ وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن تھے اور اسمبلی میں ان کی موجودگی ضروری تھی۔ ملک معراج خالد بھی اس وقت اسمبلی کے ممبر تھے انہوں نے 1969ء میں ''ضمیر کا بحران'' کتابچہ لکھ کر کنونشن مسلم لیگ اور ایوب خان سے علیحدگی اختیار کر کے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ محمد حنیف رامے اس کنونشن میں اس لیے شامل نہیں ہو سکے کہ وہ سرکاری ملازم تھے اور ایک سرکاری وفد میں جاپان کی پرنٹنگ انڈسٹری سے متعلق سرکاری دورے پر جاپان گئے ہوئے تھے۔ ان کی جگہ بیگم شاہین رامے نے کنونشن میں شرکت کی تھی۔

جے۔ اے۔ رحیم کے تجویز کردہ تین جھنڈوں میں سے لال، سبز اور کالے رنگ کا جھنڈا منتخب کیا گیا تھا جس کے بارے میں طے پایا تھا کہ جس طرح جے۔ اے۔ رحیم نے کنونشن میں اس کی وضاحت کی ہے اسی طرح اس کو قلمبند کیا جائے اور پارٹی کے ارکان میں تقسیم کیا جائے۔ جے اے رحیم نے ''فلاسفی آف دی فلیگ'' لکھا جس کو ہم نے نصرت میں چھاپ کر بعد میں اس کو پمفلٹ کی شکل میں چھاپا۔ جھنڈے کے فلسفے کی تشریح جلسہ عام میں عوام الناس تک پہنچانے کی ذمہ داری معراج محمد خان کے سپرد کی گئی جس کو معراج نے اپنی شعلہ بیانی سے خوب نبھایا۔

پاکستان پیپلز پارٹی عالم وجود میں آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے عوام کی ترسی ہوئی آنکھوں کا تارا اور ان کے دکھوں کا سہارا بن گئی۔ بھٹو صاحب نے پارٹی کے انقلابی پروگرام کو اس وقت کے بارہ کروڑ عوام کے سامنے اس انداز میں پیش کیا کہ ایک سال کے اندر اندر ملک کے گوشے گوشے میں پارٹی کی تنظیم کا کام شروع ہو گیا۔ جگہ جگہ سے بھٹو صاحب کو بلاوے آنے لگے۔ بالخصوص پنجاب اور سندھ کے بڑے شہروں میں پارٹی کے دفاتر کھلنے لگے۔ ابتدا میں پارٹی کے عہدیدار صدر اور سیکرٹری نہیں بلکہ چیئرمین اور سیکرٹری کہلاتے تھے۔ راولپنڈی کے چیئرمین خورشید حسن میر وائس چیئرمین خواجہ عبدالرؤف اور

سیکرٹری ظفر علی شاہ، لاہور کے چیر مین ڈاکٹر مبشر حسن، پشاور کے ملک محمد شریف، گوجرانوالہ کے رانا محمد اقبال، جہلم کے عبدالحکیم مرزا جہلم شہر کے نذیر حسین برلاس، گجرات کے عثمان فتح، لائل پور کے مختار رانا، چکوال کے چودھری امیر محمد خان (عرف چاچا میرو) بھاولنگر کے محمد افضل وٹو، جھنگ کے ظفر عباس قریشی، سرگودھا کے ممتاز احمد کاہلوں، ملتان کے بابو فیروز الدین انصاری، سیالکوٹ کے میاں مسعود احمد، منٹگمری (حالیہ ساہیوال) کے راؤ خورشید علی، دینہ کے سید لیاقت شاہ گیلانی، نواب شاہ کے شیخ عبدالغنی، کوہاٹ کے ماسٹر مرید شاہ، کراچی کے عبدالحفیظ پیرزادہ چیئرمین اور سیکرٹری معراج محمد خان مقرر ہوئے۔ سندھ کے دیگر رہنماؤں میں میر علی احمد تالپور، عبدالوحید کٹپر، طارق عزیز، شمیم زین الدین، پیر غلام رسول شاہ، عبدالحمید وغیرہ تھے۔ غلام مصطفیٰ کھر، غلام مصطفیٰ جتوئی اور ممتاز بھٹو کو ایوب خان نے اس الزام پر کہ وہ بھٹو صاحب کا ساتھ دے رہے تھے کنونشن مسلم لیگ سے جب نکال دیا تو وہ بھی عوامی جدوجہد کے اس قافلے کی صف اول میں شامل ہو گئے۔

پارٹی کے ان ابتدائی مراحل میں بھٹو صاحب کے چند ذاتی دوستوں کو چھوڑ کر جتنے لوگ بھی پارٹی قائم کر رہے تھے ان سب کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ یہ طبقہ اصل میں سفید پوش مگر غریب طبقہ ہوتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی کرپٹ یعنی بے ایمان نہیں تھا اور نہ ہی چور یا ڈاکو!! ایوب خان اور اس کے حواری حقارت سے پیپلز پارٹی کو تانگے والوں، ریڑھی والوں کی پارٹی کہتے تھے۔

حیدر آباد میں پارٹی کنونشن اور ایوب خان کے خلاف تحریک چلانے کا فیصلہ

21 ستمبر 1968ء کو حیدر آباد میں پاکستان پیپلز پارٹی کا کنونشن منعقد ہوا۔ جہاں پر سندھ کے قریب قریب تمام اضلاع سے اور مغربی پاکستان کے دیگر اضلاع سے وفود نے شرکت کی اور پارٹی کے تنظیمی ڈھانچے کو باقاعدہ شکل دی گئی۔ اس اہم موقع پر بھٹو صاحب نے اپنی وہ عظیم الشان مجاہدانہ اور حقیقت افروز تقریر کی جس نے ایوب حکومت کے عوام

پروف ایوانوں میں قیامت خیز لرزہ پیدا کر دیا۔ اس تقریر کو بغاوت قرار دینے کے لیے ایوب کے ترجمان زیڈ اے سلہری جب اپنی ایڑی چوٹی کا زور صرف کر چکے تو جنرل موسیٰ گورنر مغربی پاکستان نے بھٹو صاحب پر اکیس الزامات لگا کر عوام میں انہیں گرانے کی کوشش کی۔ لیکن عوام نے ان اکیس الزامات کو اکیس توپوں کی سلامی سمجھا کیونکہ پریس پر پابندیوں کے باوجود جو تھوڑی بہت رپورٹ حیدر آباد کی تقریر کی نوائے وقت لاہور میں شائع ہوئی تھی وہ پتہ دیتی تھی کہ بھٹو نے عوام کی طرف سے عوام کے حقوق کے قاتلوں پر پوری قوت سے حملہ کر دیا ہے۔

بھٹو، موسیٰ سوال و جواب اور زیڈ اے سلہری کے بھٹو مخالف مضامین کی وجہ سے پریس میں بھٹو صاحب کو جگہ ملنے لگی۔ ادھر 25/ اکتوبر 1968ء سے بھٹو صاحب نے سابق صوبہ سرحد کا جو تنظیمی دورہ شروع کیا اس کی بدولت اجتماعات کا موقع پیدا ہو گیا اور یوں ایوب خان کی آمریت کے دس سالوں میں اندر ہی اندر سلگتی ہوئی محرومیوں کی آگ زبردست آگ کی صورت اختیار کر گئی۔ اس وقت بھی باہر جنگل تھا اور اندر آگ تھی۔ اس آگ کو زندہ و تابندہ رکھنے کے لیے جہاں بھٹو صاحب اور ان کے متعدد ساتھیوں نے جیلوں میں غیر انسانی سلوک برداشت کیا وہاں طالب علموں، صحافیوں، وکیلوں، دانشوروں مزدوروں نے خون اور وقت کی قربانی دے کر اس آگ کو عوامی امنگوں کے نور میں تبدیل کیا۔ اس نور کو ایوب خان کی گول میز کانفرنس، جماعت اسلامی جیسی دہشت پسند فسطائی تنظیم اور گولی لاٹھی کی ریاستی دہشت گردی بھی نہیں دھندلا سکی۔ یہ نور اس وقت کے بارہ کروڑ عوام کے دلوں کا نور بن چکا تھا۔ یہ نور اس قوم اور ملک کے آفاق پر اس انقلابی صبح کے طلوع ہونے کا منتظر تھا جب سامراج، سرمایہ داری اور جاگیرداری کے بت پاش پاش ہو جائیں گے اور خدا کے بندے صرف خدا کی بندگی کریں گے اور ان کے درمیان طبقات کی دیواریں مٹ جائیں گی۔

1968-69ء کی عوامی تحریک

پاکستان کی اس وقت تک کی بائیس سالہ تاریخ میں 25/اکتوبر 1968ء سے 25/مارچ 1969ء تک کا مختصر سا عرصہ بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ پانچ ماہ کے اس عرصے میں اہل پاکستان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ طاقت کا مالک نہ کوئی آمر ہوا ہے اور نہ ہی لاٹھی گولی کی سرکار، نہ ہی بے لگام و بدعنوان نوکر شاہی اور نہ ہی استحصال پیشہ سرمایہ دار اور جاگیر دار ٹولہ، بلکہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں۔ مگر یہ اس وقت ہی ممکن ہے جب سیاسی قیادت کا تعلق عوام سے ہو، عوام اس قیادت پر اعتماد کرتے ہوں اور وہ قیادت بھی عوام کی طاقت پر اعتماد کرتی ہو۔ تاریخ کے اس مرحلے پر یہ ذوالفقار علی بھٹو کے نام لکھا جانا تھا کہ وہ عوامی طاقتوں کو افیون کے اس نشے سے بیدار کریں جو غیر عوامی سیاست اور ایوبی آمریت نے ان کے حلق میں اتار رکھی تھی۔ ان کا شعور بیدار کریں اور انہیں جبر کے خوف سے باہر نکال کر زندہ رہنے کا حوصلہ دیں۔

صوبہ سرحد سے انقلابی دورے کا آغاز

بھٹو صاحب نے 25/اکتوبر کو صوبہ سرحد سے اپنے انقلابی دورے کا آغاز کیا۔ 25/اکتوبر 1968ء کی صبح کو جب بھٹو صاحب کراچی سے راولپنڈی پہنچے تو ان کے ساتھ مصطفیٰ کھر اور ممتاز علی بھٹو تھے۔ اس مختصر سے قافلے میں راولپنڈی ایئرپورٹ پر دو ساتھیوں کا اضافہ ہوگیا۔ محمد حنیف رامے اور ڈاکٹر مبشر حسن، جو لاہور سے راولپنڈی پہنچے تھے۔ چک لالہ ایئرپورٹ پر پشاور جانے والے طیارے کا انتظار ہو رہا تھا، جو کہ لیٹ

ہوئے جارہا تھا۔ پتہ چلا کہ ایوب خان کراچی جارہے ہیں۔ جب تک ان کا جہاز حرکت میں نہیں آتا اور کوئی جہاز حرکت میں نہیں آسکتا۔ آخر ایوب خان کی گاڑی رن وے پر نظر آئی اور وہ خلا میں ہاتھ ہلاتے ہوئے جہاز پر سوار ہو گئے۔ پانچوں میں سے کسی ایک نے کہا یہ کسے سلام کر رہا ہے۔ دوسرے نے جواب دیا اپنے عہدِ حکومت کو آخری سلام کر رہا ہے۔ اور یہ الفاظ تاریخ کی پیشانی پر گہرا نقش چھوڑ گئے۔ بھٹو صاحب کے سامان میں ایک سوٹ کیس تھا جو اس دستاویز کی سائیکلوسٹائلڈ نقلوں سے بھرا ہوا تھا جو انہوں نے گورنر موسیٰ کے اکیس الزامات کے جواب میں تیار کی تھیں۔ ایئرپورٹ پر راولپنڈی پیپلز پارٹی کے چیئرمین خورشید حسن میر کو کچھ نقلیں پریس ریلیز کے لئے دے دی گئیں۔ اور پنڈی ایئرپورٹ سے ہی کچھ نقلیں میاں اسلم کو لاہور کے اخبارات کے لیے سپرد کر دی گئیں۔

پشاور کے فضائی مستقر پر صبح ساڑھے دس بجے ہوائی جہاز اترا تو ایئرپورٹ پر انسانوں کا ایک سیلاب اُمڈ پڑا۔ ہر طرف سر ہی سر تھے۔ ایک جم غفیر بھٹو زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگا رہا تھا۔ اس دن پشاور کے کالجوں اور سکولوں میں حاضری نہ ہونے کے برابر تھی۔ یوں لگتا تھا کہ سارا شہر ایئرپورٹ پر چلا آیا ہو۔ بھٹو صاحب جہاز سے برآمد ہوئے تو ایئرپورٹ کی روایتی حد بندی ختم ہوگئی۔ پرشوق اور پرجوش عوام کے سیلاب نے فضائی رن وے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ نوجوانوں نے بھٹو صاحب کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔ انہیں ایک کار میں سوار کر کے سینکڑوں سکوٹروں، سائیکلوں، موٹر کاروں کے جلوسوں میں ہزاروں افراد کے ہمراہ ایک جلوس کی شکل میں شہر لے جایا گیا۔ یہ جلوس پشاور کی اہم سڑکوں مال روڈ، ارباب روڈ، سٹی صدر روڈ، خیبر بازار، قصہ خوانی بازار، بازار دلگر، رستم گراں اور چوک یادگار سے ہوتا ہوا زریاب کالونی پہنچا۔ یہ بھٹو صاحب کے دورۂ سرحد کا پہلا دن تھا اور مغربی پاکستان کی تاریخ میں پہلا عوامی جلوس۔

پشاور میں تھوڑی دیر قیام کے بعد بھٹو صاحب کوہاٹ روانہ ہوئے جہاں انہوں نے بار ایسوسی ایشن میں موسیٰ کے جواب میں مذکورہ دستاویز پڑھ کر سنائی اور یوں کوہاٹ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ ایوب حکومت کے قلعے پر برسنے والا پہلا گولا یہاں سے چلا۔ اس کے

بعد انہوں نے میونسپل پارک میں ایک جلسہ عام سے خطاب کیا۔ ہزاروں کے اس مجمع میں بھٹو صاحب نے تاریخی اعلان کیا ''خواہ نتائج کچھ ہوں ہم انتخابات میں حصہ لیں گے۔'' رات کو بھٹو صاحب واپس پشاور آ گئے۔ اگلا روز بے حد مصروف گزرا انہوں نے متعدد سیاسی لیڈروں سے ملاقاتیں کیں۔ خان عبدالقیوم نے ان کے اعزاز میں دعوت دی۔ شام کو پیپلز پارٹی پشاور کی طرف سے دیئے گئے استقبالیے سے خطاب کیا۔

27 اکتوبر 1968ء کو اتوار تھا۔ پروگرام کے مطابق اس روز بھٹو صاحب نے ایک جلسہ عام سے خطاب کرنا تھا لیکن اس روز جلسے کی اجازت نہ ملی اور اس دن عوام نے پاکستان کے اخباروں میں ایوب خان کی ''انقلابی تقریر'' پڑھی کہ ملک میں اقتصادی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ دفتروں اور گھروں میں ایئر کنڈیشننگ کی سہولتیں عام کی جائیں۔ ان سے پہلے وہ فرما چکے تھے کہ جمہوریت گرم ممالک کے لیے موزوں نہیں بلکہ سرد ملکوں کے لیے ہے۔ جمہوریت کا پودا گرم ممالک میں پروان نہیں چڑھ سکتا۔

28 اکتوبر کو جب بھٹو صاحب پشاور سے چارسدہ پہنچے تو بہت بڑا استقبال ہوا۔ پشاور اور چارسدہ کے راستے میں جگہ جگہ لوگوں کے ہجوم تھے۔ ایک طویل جلوس کے ہمراہ جلسہ گاہ تک لے جایا گیا۔ اسی رات بھٹو صاحب کا قافلہ چارسدہ سے شیر پاؤ پہنچا جو پیپلز پارٹی سرحد کے چیئرمین خان حیات محمد خان کا گاؤں تھا۔ گاؤں کے لوگوں نے اس قافلے کا اس طرح استقبال کیا جیسے کسی برات کا کرتے ہیں۔ رات کو حیات محمد خان کے گھر کے ایک کمرے میں بھٹو صاحب، ڈاکٹر مبشر حسن، مصطفیٰ کھر، ممتاز بھٹو اور حنیف رامے کے ساتھ بیٹھے تھے کہ اچانک انہوں نے کہا ''ہم انقلاب کے دروازے تک آ پہنچے ہیں۔ ایوب خان اب چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔ اگر وہ مجھے قید کرتا ہے تو عوام اور بھڑک جائیں گے اگر نہیں کرتا تو انقلاب کی جو لہریں ہم نے کوہاٹ اور چارسدہ میں دیکھی ہیں وہ جلد ہی اسلام آباد میں حکومت کے ایوانوں سے جا ٹکرائیں گی۔'' اس رات حنیف صاحب کو ہفت روزہ نصرت کے مقدمے کی پیروی کرنے اور سلہری کو جواب دینے کی غرض سے لاہور جانے کا حکم ہوا۔ باقی قافلہ اگلے روز مردان روانہ ہو گیا۔ ابھی تک نصرت پر پابندی عائد تھی۔

جب بھٹو صاحب مردان پہنچے تو یہاں دفعہ 144 کا نفاذ کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مردان سے چودہ میل دور اسماعیلیہ کے مقام پر مردان کے عوام سے خطاب کیا جہاں پر انہوں نے پارٹی کے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے اعلان کیا کہ پیپلز پارٹی برسر اقتدار آکر دولت کی منصفانہ تقسیم کا اہتمام کرے گی۔ بھٹو صاحب ابھی تک اردو میں رواں نہیں ہوئے تھے۔ اس دن ڈسٹرکٹ بار سے بھی خطاب کیا۔ تاہم مردان بار کے باہر ان کو ایک نظر دیکھنے کے لیے ہزاروں افراد کا مجمع جمع ہو گیا تھا۔

19/ اکتوبر 1968ء کو جب بھٹو صاحب پشاور سے ایبٹ آباد پہنچے تو ان کا والہانہ استقبال ہوا اور انہیں فوارہ چوک، جناح روڈ، صدر بازار اور کچہری روڈ سے جلوس کی شکل میں ڈسٹرٹ بار ایسوسی ایشن لے جایا گیا، جہاں پر انہوں نے وکلا سے خطاب کیا۔ ایبٹ آباد میں بھٹو صاحب نے باغ جناح میں منعقدہ ایک جلسہ عام سے بھی خطاب کیا۔ اس جلسے میں کی گئی تقریر آج بھی موجودہ حالات کی آئینہ دار ہے۔ انہوں نے کہا تھا ''کروڑوں عوام جنہوں نے خوش حالی اور آزادی کے لیے پاکستان حاصل کیا تھا پہلے سے بھی زیادہ مفلس ہو چکے ہیں۔ اکثریت کو ایک وقت کا کھانا نہیں مل رہا۔ ان کے بچوں کو پوری تعلیمی سہولتیں میسر نہیں۔ ترقی کے مواقع چند خاندانوں تک محدود ہیں۔ گندم کے نرخ آسمان تک جا پہنچے ہیں۔ چینی نایاب ہے، یہ حالات کب تک قائم رہ سکتے ہیں۔ عوام بیدار ہو رہے ہیں۔ انہیں ہمیشہ خوفزدہ نہیں رکھا جا سکتا۔ عوام اپنے حقوق واپس لے کر رہیں گے۔'' ایسا لگتا ہے کہ بھٹو صاحب 1968ء میں بھی آج کے حالات پر تقریر کر رہے تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس وقت ایوب خان کی حکمرانی تھی، آج ان کی پارٹی پر قابض افراد کی حکمرانی ہے۔

بھٹو صاحب نے اس روز ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خان سے ملاقات کی اور انہیں سیاست میں آنے کے لیے قائل کیا۔ 30/ اکتوبر 1968ء کو بھٹو صاحب نے مانسہرہ کے عوام سے خطاب کیا، اسی شام بھٹو صاحب کیمبل پور پہنچے۔ ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن سے خطاب کیا اور یہاں کی تقریر کے بعض فقرے بھی تاریخی اہمیت رکھتے ہیں انہوں نے کہا کہ ''میں اور میرا خاندان پاکستان کو اپنا وطن سمجھتے ہیں۔ ہم یہیں جئیں گے اور یہیں مریں گے۔

ہم نے سوئٹزرلینڈ، آسٹریلیا، کینیڈا یا امریکہ کے بنکوں میں اپنا سرمایہ جمع نہیں کرایا کہ ہم وہاں بھاگ جائیں گے۔ پاکستان کسی کی جاگیر نہیں۔ یہ بارہ کروڑ عوام کا وطن ہے۔''

بعد کے حالات کیا ہو نگے اس کا اندازہ بھٹو صاحب کبھی کر ہی نہیں سکتے تھے۔ اور نہ ہی ان کے وہم و گمان میں تھا کہ آنے والے وقتوں میں سوئٹزرلینڈ اور باہر کے بنکوں میں جمع شدہ سرمایہ ان کے خاندان کے حوالے سے برس ہا برس تک موضوع سیاست بنا رہے گا۔

یہ یکم نومبر 1968ء کا دن تھا جب لاہور میں ایوب خان کے صوبائی وزیر قانون ایک بیان فرما رہے تھے کہ مسٹر بھٹو نے محکمہ زراعت کے ملازمین سے ساز باز کر کے اپنی اراضی میں استعمال کرنے کے لیے ناجائز طور پر ٹریکٹر حاصل کئے اور اس طرح حکومت کو دو لاکھ تین ہزار روپے کا نقصان پہنچایا۔ ان کے یہ اقدامات 1962ء سے 1966ء کی مدت پر محیط ہیں جبکہ بھٹو صاحب مرکزی کابینہ کے وزیر تھے۔

لاڑکانہ پولیس نے سابق وزیر خارجہ پر تعزیرات پاکستان کی دفعہ 477,471,420 انسداد رشوت ستانی ایکٹ کے تحت سپیشل جج اینٹی کرپشن سکھر کی عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ یہ کیس ٹریکٹر کیس کے نام سے مشہور ہوا۔ بھٹو صاحب کی سیاست یا شخصیت سے اختلاف کرنے والے بھی یہ تسلیم کرتے چلے آئے ہیں کہ نہ صرف بھٹو صاحب بلکہ ابتدا کے دنوں میں ان کے تمام ساتھیوں میں سے کوئی بھی کرپٹ نہیں تھا۔ مگر ایوب خان اب اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا تھا۔

یکم نومبر کو پروگرام کے مطابق بھٹو صاحب کو ڈیرہ اسماعیل خان پہنچنا تھا۔ ان کی آمد سے قبل دفعہ 144 لگا دی گئی تھی مگر عوام کا ایک زبردست ہجوم ڈیرہ اسماعیل خان سے دور بنوں روڈ پر جمع ہو چکا تھا۔ ڈی آئی خان کے چیئرمین حق نواز گنڈاپور اجن پر ایک روز پیشتر پولیس نے تشدد کیا تھا، اپنی جان نثاری کے بھرپور جذبے کے ساتھ پیش پیش تھے۔ پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔ اشک آور گیس استعمال کی۔ بھٹو صاحب نے شاہانی بلڈنگ کی بالکونی سے ایک مختصر خطاب کیا۔ اشک آور گیس کی وجہ سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ اسی روز بھٹو صاحب کو بار ایسوسی ایشن نے ایک سپاسنامہ پیش کیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ جس

طرح قیام پاکستان کی راہ میں ڈیرہ کے عوام نے قائداعظم کا ساتھ دیا تھا اسی طرح وہ مسٹر بھٹو کا بھی ساتھ دیں گے۔ اور انہوں نے یہ عہد نبھایا۔

2 نومبر 1968ء کو بھٹو صاحب نے صوبہ سرحد پیپلز پارٹی کے کنونشن کا شیر پاؤ میں افتتاح کیا۔ اس کنونشن میں صوبہ سرحد کے لیڈروں، کارکنوں کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے رہنماؤں اور ورکروں، میر رسول بخش تالپور، شیخ محمد رشید، ڈاکٹر مبشر حسن وغیرہ نے شرکت کی۔ بھٹو صاحب نے اس موقع پر کارکنوں کو تفصیل کے ساتھ بتایا کہ انہیں آئینی محاذ پر جدوجہد کرنے کے لیے کیا طریق کار اختیار کرنے چاہئیں اور عوام کے ساتھ رابطہ مہم کس طرح شروع کرنی چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ پیپلز پارٹی کے قیام کا اصل سبب یہ ہے کہ "قائداعظم کے بعد مسلم لیگ ایک مریض جماعت بن چکی تھی۔ مارشل لا نے اس کا جنازہ نکال دیا اور اس کی وراثت کے لئے رسہ کشی ہونے لگی۔" بھٹو صاحب کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ آنے والے کل میں ان کی اپنی جماعت کا انجام بھی وہی ہونے والا ہے۔ 4 نومبر کو بھٹو صاحب نے نیلاب ہوٹل پشاور میں یونیورسٹی طلبا کی طرف سے پیش کئے گئے سپاس نامے کا جواب دیا۔

5 نومبر کو پشاور کے شاہی باغ میں عوام کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن تھا۔ بھٹو صاحب نے ایک طویل تقریر کی۔ ملک کو درپیش مسائل کا تجزیہ کیا اور کہا کہ اسلام اور سوشلزم میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ اگر سوشلزم اور اسلام میں کوئی تصادم ہوتا تو ہم ہرگز سوشلزم کا نام نہ لیتے کیونکہ ہم اول و آخر مسلمان ہیں۔

بھٹو بذریعہ کار راولپنڈی پہنچے، طالب علم عبدالحمید کو شہید کر دیا گیا

بھٹو صاحب نے صوبہ سرحد کا دورہ کر کے 7 نومبر 1968ء کو بذریعہ کار راولپنڈی پہنچنا تھا۔ عبدالرشید شیخ گورنمنٹ کالج راولپنڈی کی سٹوڈنٹس یونین کا صدارتی الیکشن جیت چکے تھے اور یونین کی حلف وفاداری کی تقریب کی صدارت کے لیے بھٹو صاحب نے وعدہ کیا ہوا تھا جس کو پورا کرنے کے لیے وہ راولپنڈی آ رہے تھے۔ شیخ کو میں

نے کس طرح دریافت کیا تھا، ایم اے جغرافیہ میں داخلہ دلوا کر کس طرح الیکشن لڑوایا تھا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ وہ ایک بہادر اور نڈر نوجوان تھا اور یہ عبدالرشید شیخ کی بہادری اور جوانمردی تھی جس کی وجہ سے ایوب خان کے تمام ظالمانہ ہتھکنڈوں کے باوجود طالب علموں کی تحریک جو اس دن راولپنڈی سے شروع ہوئی اور جس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، نہ صرف قائم رہی بلکہ ہر روز اس کی قوت میں اضافہ ہوا اور ایوب خان کی حکومت کے خاتمے کا باعث بنی۔ اس تحریک سے بہت سے ایسے سیاسی کارکن نکلے جو آج بھی میدان سیاست میں سرگرم ہیں۔ یہ الگ بات کہ عبدالرشید نے بعد میں اپنے آپ کو محض وکالت کے پیشے تک محدود کر لیا اور عملی سیاست سے دور ہو گئے مگر ان کے نام اور کام کا فائدہ موجودہ شیخ رشید کو پہنچا جو اس تحریک کے دنوں میں ابھی کالج کے زمانہ طالب علمی کے آغاز میں تھے اور رشید بٹ کے نام سے جانے جاتے تھے۔ عبدالرشید شیخ کی گوشہ نشینی کے بعد انہوں نے شیخ رشید نام اپنا لیا تاکہ عبدالرشید شیخ کی قربانیاں اور جدوجہد ان کے ساتھ منسوب ہو جائیں۔ اس تحریک میں غزالہ شبنم، حسام الحق اور ابرار کاظمی بھی ابھرے مگر بعد میں گوشۂ گمنامی میں چلے گئے۔

میں 6 نومبر 1968ء کو راولپنڈی پہنچ گیا۔ طے یہ پایا تھا کہ بھٹو صاحب کو ہم جی ٹی روڈ پر ٹیکسلا کے مقام پر ملیں گے اور وہاں سے اکٹھے راولپنڈی پہنچیں گے۔ بھٹو صاحب نے انٹرکانٹی نینٹل میں ٹھہرنا تھا جہاں پر انہیں تقریباً تین بجے پہنچنا تھا۔ میں، عبدالرشید شیخ اور سعید شفقت اپنے ایک دوست جعفر حسین کی کار میں راولپنڈی سے ٹیکسلا پہنچے۔ جعفر حسین کی یہ کار زمانۂ طالب علمی میں اکثر ہمارے استعمال میں رہتی تھی۔ ہمیں انتظار کرتے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کریم رنگ کی زائفر کار جس کو مصطفیٰ کھر چلا رہے تھے دور سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ ہم نے اشارہ کیا، کار رکی۔ رشید شیخ اور میں بھٹو صاحب کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور سعید شفقت ممتاز بھٹو کے ساتھ آگے۔ جعفر حسین کی کار پائلٹ کار کے طور پر ہمارے آگے تھی۔ صبح سے ہی راولپنڈی میں ہزاروں طلباء انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل کے گرد جمع ہونا شروع ہو چکے تھے۔ میں نے بھٹو صاحب کو پنڈی کی صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ اپنے صوبہ سرحد کے دورے سے بہت خوش تھے۔ حیات محمد خان شیرپاؤ سرحد کے چیئرمین پیپلز

پارٹی تھے۔ ان کو بھٹو صاحب پہلے ہی سے بہت پسند کرتے تھے مگر اس دورے کی کامیابی میں ان کی تنظیمی صلاحیتوں کی وجہ سے ان پر بھٹو صاحب کا اعتماد اور یقین پختہ ہو گیا تھا۔

میں نے انہیں اس بات سے بھی آگاہ کیا کہ راولپنڈی داخل ہونے سے پہلے راستے میں پولی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ بھی آئے گا جہاں پر سینکڑوں طالب علم آپ کے استقبال کے لیے جمع ہو چکے ہیں۔ بھٹو صاحب کا خیال تھا کہ ہمیں رکے بغیر سیدھا ہوٹل پہنچنا چاہیے۔ مگر جب ہم پولی ٹیکنیک پہنچے تو طلباء کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی تھی اور وہ سب بھٹو صاحب کی ایک جھلک دیکھنے اور ان کی تقریر سننے کے لیے بے چین تھے۔ جونہی گاڑی قریب پہنچی پولیس نے طلباء پر فائرنگ اور لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ فائرنگ سے پولی ٹیکنیک کا ایک سترہ سالہ طالب علم عبدالحمید ہلاک ہو گیا اور کئی زخمی ہو گئے۔ عبدالحمید کو لگنے والی یہ گولی ایوب خان کے اقتدار کے قلب میں پیوست ہو گئی اور ایوب خان کی حکومت کے خاتمے کا باعث بنی۔ 7 نومبر 1968ء ایوب خان کے زوال کا یہ لمحہ آغاز تھا۔ مصطفیٰ کھر کی ڈرائیونگ کی مہارت سب کو معلوم تھی وہ بحفاظت گاڑی نکال کر انٹر کانٹی نینٹل پہنچے جہاں پر پولیس پہلے ہی پر امن طلباء پر لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا استعمال کر چکی تھی اور فضاء میں آنسو گیس کی تیزی موجود تھی۔ ہوٹل پر نصب جھنڈے کے پول سے طالب علموں نے پاکستان پیپلز پارٹی کا پرچم صبح سے ہی لہرا دیا تھا جو ابھی تک لہرا رہا تھا۔ ان دنوں خالد چوہدری بھی بہت سرگرم تھے اور ہوٹل میں بھٹو صاحب کے ساتھ تھے۔

ایوب خان کے خلاف طالب علم تحریک چل پڑی، عبدالرشید شیخ نے تحریک کو سنبھال لیا

عبدالحمید کے قتل کی صدائے بازگشت اتنی طاقتور تھی کہ پاکستان بھر میں ایک طویل تعطل، عوامی مطالبات، اجتماعات، اضطراب اور کشمکش کا نقطہ آغاز بن گئی۔ دوسرے روز 8 نومبر کو عبدالحمید کی غائبانہ نماز جنازہ کا اعلان عبدالرشید شیخ نے کیا۔ پولیس نے اپنا گھیرا تنگ کیا تو ہم نے اعلان کیا کہ یہ نماز جنازہ قبرستان میں ادا کی جائے گی۔ قبرستان میں طلبا

اور پولیس کے درمیان متعدد جھڑپیں ہوئیں۔ سرکاری بسوں، گاڑیوں اور سرکاری املاک کو نقصان پہنچا۔ راولپنڈی میں فوج طلب کر لی گئی اور کرفیو لگا دیا گیا۔ بھٹو صاحب نے مرحوم عبدالحمید کے خاندان سے پنڈی گھیب پہنچ کر اظہار تعزیت کیا۔ اس روز انہوں نے راولپنڈی بار ایسوسی ایشن کے ارکان سے خطاب کیا۔

9 رنومبر کو راولپنڈی میں مری روڈ پر کرفیو کے باوجود مظاہرین اور پولیس کے درمیان جھڑپیں ہوئیں۔ پولیس نے فائرنگ کی اور دو افراد ہلاک ہوگئے۔ کرفیو کی معیاد میں ایک ہفتہ کی توسیع کر دی گئی۔ بہت سی گرفتاریاں عمل میں آئیں جن میں پیپلز پارٹی راولپنڈی کے چیئرمین خورشید حسن میر بھی شامل تھے۔ میں اور سعید شفقت مری روڈ پر ایک چائے کی دکان میں بیٹھے یہ خواب دیکھ رہے تھے کہ جب عوامی حکومت آئے گی تو ان جگہوں پر جہاں ان معصوم انسانوں کا خون بہایا گیا ہے، انہیں قتل کیا گیا ہے، ان کی یادگاریں تعمیر کی جائیں گی۔ کیسے خواب تھے جو ہم نے اور پاکستان کے عوام نے دیکھے تھے۔

راولپنڈی کے واقعات کے ردعمل کے طور پر لاہور، پشاور، ڈیرہ اسماعیل خان، مردان، چارسدہ، ملتان، لائل پور (حالیہ فیصل آباد)، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، حافظ آباد، گجرات، نارووال میں زبردست مظاہرے ہوئے۔ کراچی میں معراج محمد خان اور این ایس ایف کے طالب علم رہنماؤں بشمول ڈاکٹر رشید حسن خان کو گرفتار کرلیا گیا۔ ملک بھر میں ایوب خان کے خلاف تحریک شروع ہوگئی۔ طالب علموں کی اس تحریک کا لیڈر اس وقت عبدالرشید شیخ تھا۔ اس پر قاتلانہ حملہ کروایا گیا۔ اپنے زخمی ہونے اور کئی ہفتے تک علالت میں رہنے کے باوجود اس نے تحریک کو ٹھنڈا نہیں ہونے دیا۔ پرویز رشید، شوکت، نعیم، راجہ انور سب ہی اس تحریک کا ہراول دستہ تھے۔

لاہور میں بھٹو کا تاریخی استقبال

9 رنومبر 1968ء کو بھٹو صاحب راولپنڈی سے بذریعہ تیز گام لاہور کے لیے روانہ ہوگئے۔ راولپنڈی کے واقعات نے پورے صوبے یعنی مغربی پاکستان کو ایک

اضطراب اور جوش وخروش سے دو چار کر دیا۔ لاہور میں بھٹو صاحب کا یہ تاریخی استقبال اپنے جوش وجذبے اور تعداد کے اعتبار سے پاکستان کی تاریخ میں پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ تیز گام لاہور پہنچی تو گوجرانوالہ، جہلم، گجرات، لالہ موسیٰ، وزیر آباد کے سٹیشنوں پر عوام کے جوش وخروش اور استقبال کے غیر معمولی مظاہروں کی وجہ سے کئی گھنٹے لیٹ ہو چکی تھی۔ زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد، طلبا، لاہور کے مضافات کے باشندے، پیپلز پارٹی کے کارکن اور رہنما، انسانوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا جو پلیٹ فارم نمبر 2 اور 4 کے علاوہ سیڑھیوں، چھتوں، گارڈروں، بیرونی برآمدوں، سٹیشن سے متصل سبزہ زاروں اور سڑکوں پر کھڑا نعرے لگا رہا تھا۔ جب تیز گام پلیٹ فارم نمبر 2 میں داخل ہوئی تو انجن کے اگلے حصے، بوگیوں، چھتوں اور پائیدانوں سے لوگ چیونٹیوں کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ پیپلز پارٹی کے ارکان بھٹو صاحب کو گاڑی سے اتارنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ گاڑی رکنے کے آدھ گھنٹے کے بعد بہت مشکل سے ڈاکٹر مبشر حسن پلیٹ فارم پر اپنی چھوٹی سی کار (آج بھی ان کے پاس وہی فاکس ویگن ہے) پہنچانے میں کامیاب ہوئے جسے بھٹو صاحب کے ڈبے کے بالکل برابر کھڑا کیا گیا۔ بہت مشکل سے تھوڑا سا راستہ بنایا گیا اور یہ کار سٹیشن کی حدود سے باہر جا سکی۔

بھٹو صاحب کے جانے کے بعد پولیس اور عوام میں تصادم ہوا جو لاہور کی سڑکوں اور گلیوں میں کئی گھنٹے تک جاری رہا۔ بھٹو صاحب نے اپنے بیان میں اس تاریخی استقبال کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ "میں اپنی قوم کے محب وطن اور جرات مند عوام اور طلبہ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس جدوجہد کو منطقی نتیجے پر پہنچانے کے لئے میں آخر دم تک ساتھ رہوں گا۔ عوام نے مجھ پر جس اعتماد کا اظہار کیا ہے میں انشاء اللہ اس پر پورا اتروں گا۔"

لاہور میں 10 نومبر کو بھٹو صاحب اپنی پارٹی کے ورکرز سے خطاب کرنے پارٹی کے دفتر مزنگ روڈ پہنچے تو ہزاروں افراد دفتر کے باہر جمع تھے۔ ان کے اصرار پر انہوں نے دفتر کی بالکونی پر کھڑے ہو کر ان سے مختصر سا خطاب کیا اور اندرا گاندھی کو خبردار کیا کہ وہ تھوڑی دیر اور کشمیریوں پر ظلم کر لیں۔ جوں ہی پاکستان میں عوامی حکومت قائم ہوگی بھارت

کو پتہ چل جائے گا کہ کشمیریوں سے ناانصافی کے کیا نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔

11 نومبر کو لاہور میں ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن سے خطاب کیا۔ 12 نومبر کو ینگ لائرز سرکل کے استقبالیہ میں پاکستان کے غیر ممالک کے ساتھ تعلقات پر تقریر کی اور 13 نومبر کو ایوب حکومت نے وہ اقدام اٹھالیا جو غیر متوقع نہیں تھا۔

بھٹو کو گرفتار کرلیا گیا، پورا ملک سڑکوں پر نکل آیا

13 نومبر کا سورج طلوع ہونے میں ابھی چند گھنٹے باقی تھے۔ رات کا ڈیڑھ بجا تھا۔ گلبرگ میں ڈاکٹر مبشر حسن کی کوٹھی کے باہر کسی نے دستک دی۔ چوکیدار سے دروازہ کھولنے کو کہا گیا۔ حکم کی تعمیل جب نہ ہوئی تو زبردستی دروازہ کھول لیا گیا۔ یہ پولیس کے مسلح سپاہی تھے۔ پولیس برآمدے میں پہنچی تو ڈاکٹر مبشر حسن نے جو بیرونی آہٹ کی بنا پر جاگ گئے تھے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آئے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟ ڈی ایس پی نے جواب دیا "ہم بھٹو صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔" ڈاکٹر مبشر نے انہیں ٹھہرایا اور بھٹو صاحب کو ان کے کمرے میں جا کر اطلاع دی۔ پولیس کی آمد کا سن کر بھٹو صاحب نے کسی تشویش یا حیرت کا اظہار نہ کیا اور کہا کہ "انہیں اندر بلالو۔" ڈی ایس پی اندر آیا۔ بھٹو صاحب کی گرفتاری کے کاغذات دکھائے۔ بھٹو صاحب نے کہا "میں تیار ہوں۔ آپ چند منٹ انتظار کریں!" سوا دو بجے سیاہ رنگ کی ایک شیورلیٹ کار بھٹو صاحب کو ان کی نئی منزل کی طرف لے جا رہی تھی اور اس کے چند لمحے بعد ڈاکٹر مبشر حسن اور مسٹر ممتاز بھٹو بھی اسی سمت رواں تھے۔

اس دن پورے مغربی پاکستان میں ڈیفینس آف پاکستان رولز کے تحت ان رہنماؤں کے علاوہ جو دوسرے سیاسی لیڈر اور کارکن گرفتار ہوئے ان میں میر رسول بخش تالپور، مصطفیٰ کھر، امان اللہ خان، احمد رضا قصوری، ارباب سکندر خان، اجمل خٹک، شوکت لودھی۔ ملک اسلم حیات، خان حیات محمد خان شیر پاؤ اور نیشنل عوامی پارٹی کے عبدالولی خان

اور محمود الحق عثمانی تھے۔ بھٹو صاحب کی گرفتاری کے چوبیں گھنٹوں کے اندر اندر پورے صوبے یعنی مغربی پاکستان سے سینکڑوں کارکن اور لیڈر گرفتار کر لئے گئے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت بیگم نصرت بھٹو نے نہیں بلکہ قائم مقام چیئر مین جے۔ اے۔ رحیم نے سنبھال لی۔ ابھی تک پارٹی میں وراثت کا تصور نہیں آیا تھا۔

اصغر خان نے سیاست میں چھلانگ ماردی

17 نومبر کو پاکستان کی سیاست نے ایک اور کروٹ لی جب ائیر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان نے باقاعدہ سیاست میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے پریس کانفرنس میں ایک طویل بیان دیتے ہوئے کہا کہ مسٹر بھٹو کی گرفتاری کے بعد مجھے خیال ہوا کہ حکومت اس تحریک کو تشدد کے ذریعے کچل دے گی۔ چنانچہ میں اس موقع پر میدان میں نکل آیا تا کہ بھٹو صاحب کے مشن کو پورا کر سکوں۔ ان کا خیال تھا کہ بھٹو صاحب کو اپنا مشن پورا کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ اس موقع پر میدان میں نکل کر شہرت حاصل کرنے اور اس تحریک کو اغوا کرنے کا ان کے لئے یہ بہترین موقع تھا۔ انہوں نے پیپلز پارٹی کی اٹھائی ہوئی موج پر اپنی قیادت کی کشتی کا لنگر اٹھایا اور بھٹو صاحب کے برپا کئے ہوئے سیلاب سے اپنی کھیتی کو سیراب کرنے کی کوشش کی۔ مگر عوام پر جلد ہی ثابت ہو گیا کہ ان کا مشن کیا تھا۔

انہوں نے 26 راگست 1970ء کے روزنامہ نوائے وقت میں بیان دیا کہ ملک میں سوشلزم لانے کا مطلب ملک کا خاتمہ ہے۔ یہ وہ وقت ہے جبکہ مغربی پاکستان کے عوام پاکستان پیپلز پارٹی اور مشرقی پاکستان کے عوام نیشنل عوامی پارٹی کے سوشلسٹ پروگرام پر اپنی قربانیاں پیش کر رہے تھے اور پوری عوامی تحریک اور جدوجہد کا مقصد سوشلسٹ پروگرام کے ذریعے معاشی آزادی کا حصول تھا اور امریکی سامراج اس خطے میں سوشلزم کے پھیلتے ہوئے اس طوفان سے خوفزدہ تھا۔

اصغر خان جنہیں بھٹو صاحب ''آلو خان'' کہا کرتے تھے اور بقول اُن کے اصغر خان کو سیاست کے ججے بھی نہیں آتے تھے، کا مشن نہ صرف پاکستان میں ایک گلے سڑے

معاشی نظام کا تحفظ کرنا تھا بلکہ اس خطے میں امریکی مفادات کا تحفظ کرنا بھی تھا۔ وہ عوام کی اس تحریک پر اپنی کاٹھی ڈال کر قابض ہونا چاہتے تھے۔ بعد میں بنگلہ دیش بننے سے لے کر بھٹو صاحب کی پھانسی تک کے واقعات نے ثابت کیا کہ انہوں نے کس کا مشن پورا کیا۔

بھٹو صاحب کی گرفتاری ایک آتش فشاں ثابت ہوئی، پورا ملک احتجاج، اضطراب، جلسے جلوسوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے خود زنجیریں پہن کر قوم کی زنجیریں توڑ دیں۔ جوں جوں بھٹو کو زنجیریں پہنائی جاتی رہیں توں توں عوام کی زنجیریں کٹتی رہیں۔ ایک طرف ایوب خان کی نوکر شاہی لاٹھیاں اور گولیاں لے کر مورچہ بند ہوگئی تو دوسری طرف بھٹو کی فوج اپنے نہتے ہاتھوں کو آزادی کے پرچموں کی صورت میں لہراتے ہوئے صف آرا ہوگئی۔ پاکستانی عوام کی فوج ظفر موج نے ایوب خان کے "دس سالہ استحکام" کے افسانے کی دھجیاں اڑا دیں۔ اس کشمکش میں قوم کے نوجوانوں کا مقدس خون بہا۔ قوم کے بیٹوں نے جوان سینوں پر گولیاں کھائیں، ان کی بہنوں کے سروں پر لاٹھیاں برسیں۔ پیپلز پارٹی اور دوسری پارٹیوں کے رہنماؤں کو قید و بند میں جکڑا گیا۔ لیکن خلق خدا کی حمایت کی راہ میں دی جانے والی یہ قربانی رائیگاں نہیں گئی۔ ان قربانیوں نے ہماری اس عوامی جدوجہد کو پائیدار اور گہری بنیادیں فراہم کیں جس کا تقاضہ ہماری قومی تاریخ ہم سے کب کا کر رہی تھی۔ لیکن جو 1968ء میں آ کر شروع ہو پائی۔

ایوب خان کی گول میز کانفرنس، اقتدار کو بچانے کی آخری کوشش

ایوب خان کے اقتدار کا سنگھاسن ڈول رہا تھا۔ اس نے اپنی شاہی حکومت کو بچانے کی آخری کوشش کی اور عوام کے سیاسی حقوق کی بحالی کے لئے گول میز کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان کیا اور کہا کہ میں کسی صورت میں انتخابات میں حصہ نہیں لوں گا۔ جمہوری مجلس عمل میں شامل آٹھ جماعتیں ایوب خان کے اس اعلان کے ساتھ ہی اقتدار کی کشمکش کے عمل میں تیز ہوگئیں اور اس میں شرکت کا اعلان کر دیا۔ اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لیے اگر تلہ سازش کیس ختم کر کے شیخ مجیب الرحمن کو رہا کیا گیا اور کانفرنس میں ان کی شرکت

کو یقینی بنانے کے لئے خصوصی انتظامات کے تحت مشرقی پاکستان سے بلایا گیا۔

ذوالفقار علی بھٹو جنہیں زبردست عوامی دباؤ کے تحت رہا کیا جا چکا تھا، انہوں نے اس کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا جبکہ مشرقی پاکستان سے نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ مولانا عبدالحمید بھاشانی جو وہاں پر اس وقت کی مقبول ترین سیاسی شخصیت تھے اور ابھی تک شیخ مجیب الرحمن بھی ان کے گیارہ نکات میں سے ہی اپنے چھ نکات کا راستہ ڈھونڈ تے تھے انہوں نے بھی کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا۔ جمہوری مجلس عمل کے مندوبین ایک خاص طیارے میں جب اس کانفرنس میں شرکت کے لیے چکلالہ ہوائی اڈے پر پہنچے تو ہزاروں کی تعداد میں طالب علم جن کی قیادت عبدالرشید شیخ، راجہ انور، نعیم قریشی، پرویز رشید، شوکت چودھری، غزالہ شبنم، حسام الدین اور ابرار کاظمی کر رہے تھے انہوں نے ''سودے بازو واپس جاؤ'' کے نعرے لگا کر ان کا محاسبہ کیا۔

ادھر گول میز کانفرنس میں اس وقت ہنگامہ ہو گیا جب وائس ایڈمرل اے۔ آر۔ خان نے ریٹائرڈ ایر مارشل اصغر خان پر یہ الزام عائد کیا کہ وہ کسی غیر ملکی طاقت کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اصغر خان اپنے سابق ساتھی کے اس بیان پر بطور احتجاج واک آؤٹ کر گئے۔ مشرقی پاکستان کی اس متفقہ قرارداد پر جس میں صوبائی خودمختاری اور آبادی کی بنیاد پر نمائندگی دینے کا مطالبہ شامل تھا جمہوری مجلس عمل کے نوابزادہ نصر اللہ خان، چودھری محمد علی اور مولانا مودودی نے اتفاق نہ کیا۔ شیخ مجیب نے کانفرنس کے فیصلوں پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ان کی جدوجہد بدستور جاری رہے گی۔ ایوب خان نے دو مطالبات تسلیم کر لئے۔ براہ راست انتخابات میں بالغ رائے دہی کا حق اور صدارتی طرز حکومت کی بجائے پارلیمانی طرز حکومت۔

ایوب خان جیسے آئے تھے اسی طرح چلے گئے

یحییٰ خان نے مارشل لا نافذ کر دیا

یہ کانفرنس ناکام ہو گئی۔ مودودی صاحب نے یہ اعلان کر دیا کہ ملک کی معیشت

کو سوشلسٹ طرز حکومت پر چلانے کے خواہش مند کروڑوں کسان، مزدور، طالب علم اور ملازمت پیشہ لوگ اسلام پر ایمان نہیں رکھتے اور کافر ہیں۔ اس وقت بھٹو صاحب لاہور کے جلسہ عام میں ان لاکھوں انسانوں کو یقین دلا رہے تھے کہ سوشلسٹ طرز معیشت کے ذریعے ہی معاشی آزادی حاصل کی جاسکتی ہے۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب اقتدار میں آنے کے بعد اور سوشلسٹ معیشت سے انحراف کے بعد بھٹو صاحب مودودی صاحب کو منانے 1977ء میں ان کے گھر تشریف لے گئے۔

25 مارچ 1969ء کو ایوب خان نے جنرل یحییٰ خان کو اقتدار سونپ کر اپنی رخصتی کا اعلان کر دیا۔ وہ جس طرح آئے تھے اسی طرح چلے گئے۔ ملک اسی مقام پر کھڑا تھا جہاں پر اس کے پیش روؤں نے اسے پہنچایا تھا۔ صدر ایوب گئے، ان کی کنونشن مسلم لیگ گئی اور ساتھ ہی ان سیاسی سودے بازوں کا ٹولہ بھی گیا جو ایوب خان سے مار کھاتے رہنے کے باوجود ان کی مدد کو اس لالچ میں آئے تھے کہ شاید اب ان کی دال گل جائے گی اور ان کے اقتدار کی ہنڈیا منڈھے چڑھ جائے گی۔

گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد ایوب خان نے اقتدار سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ایوب خان دستور کے مطابق اسپیکر قومی اسمبلی کو اقتدار حوالے کرتے مگر ایوب خان نے اس یقین دہانی کے بعد کہ ان کو اور ان کے خاندان کو کچھ نہیں کہا جائے گا، اور ان کی جائیداد کی پوری حفاظت کی جائے گی، یحییٰ خان کے مارشل لا کو اقتدار حوالے کر دیا۔

دنیا بھر میں آزادی کی تحریکیں عروج پر تھیں

ان ہی دنوں دنیا بھر کے آزادی پسند عوام کو ویت نام کے قومی محاذ آزادی کے بہادر درس عمل دے رہے تھے۔ صرف مارچ 1969ء میں، یعنی صرف اس ایک ماہ میں قومی محاذ آزادی نے امریکی سامراجیوں اور اس کے مقامی فوجی ایجنٹوں کے اکتیس ہزار حملہ آوروں کو جن میں تیرہ ہزار امریکی شامل تھے واصل جہنم کیا تھا۔ اس دوران حریت پسندوں نے دو سو سے زائد گاؤں آزاد کروائے تھے۔ دشمن کے بائیس ہوائی اڈے تباہ کئے تھے۔ یہاں تک کہ امریکہ نے اپنے مشہور بحری جہاز ''نیو جرسی'' کو جس نے ویت نامیوں پر لاکھوں گولے برسائے تھے، اس کی تباہی کے خوف سے واپس بلا لیا تھا۔ ویت نام کی سرسبز زمین میں جس قدر گولہ و بارود جذب ہوا تھا تاریخ عالم میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اسی طرح جس بڑی تعداد میں ویت نام کے حریت پسندوں نے موت کو ذلت آمیز غلامی کی زندگی پر ترجیح دی اس کی مثال بھی کہیں نہیں ملتی۔ یہ خبریں پاکستان میں سیاسی کارکنوں کے لیے اور ان تمام مظلوم و حریت پسند عوام کے لیے باعث فخر اور حوصلہ افزا تھیں جو امریکی سامراج کے خلاف اپنے اپنے ممالک میں اپنے اپنے انداز سے جدوجہد کر رہے تھے۔

ساٹھ کی یہ دہائی جس میں پاکستان پیپلز پارٹی قائم ہوئی کئی اعتبار سے نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ دنیا میں جو واقعات اس دہائی میں رونما ہو رہے تھے ان کا ان تمام اقوام، عوام اور باشعور افراد پر بہت گہرا اثر تھا جو اپنے سیاسی اور معاشی حقوق اور اپنی قومی آزادی کی جدوجہد کر رہے تھے یا کرنا چاہتے تھے۔ دنیا بھر میں قومی آزادی کی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ ملک آزاد ہو رہے تھے۔ مراکش آزاد ہو چکا تھا، تنزانیہ آزاد ہوا، یوگنڈا

آزاد ہوا، ملادی اور زیمبیا آزاد ہوا، بوٹسوانا آزاد ہوا، الجزائر، موزمبیق، اری ٹیریا، ویت نام غرضیکہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے میدانوں، کھیت کھلیانوں، پہاڑوں، جنگلوں، دریاؤں، ندی نالوں، جگہ جگہ عوام اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ یزیدیت کے خلاف، ظلم واستحصال کے خلاف، جگہ جگہ حسینیت برسرِ پیکار تھی اور حق وانصاف کا پرچم بلند ہو رہا تھا۔ جبر و استحصال پر مبنی نظام اور حکومتیں ختم ہو رہی تھیں یا پھر خطرے میں تھیں۔ سلطنتوں یا بادشاہوں سے یا مغرب کے تسلط سے جو ممالک چھٹکارا حاصل کر رہے تھے وہ سوشلسٹ نظام معیشت کو اپنا رہے تھے یا اس کے حصول اور قیام کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ''دنیا بھر کے محنت کشو! اکٹھے ہو جاؤ'' کا نعرہ عروج پر تھا۔ استحصالی طبقات، سرمایہ دار، جاگیردار اپنے آقا عالمی سامراج کی طرف نظریں اٹھائے، سوشلزم کے خلاف مذہب فروشوں کا سہارا لیے اپنی اور اپنے نظام کے بقا کی کوشش میں تھے مگر سوشلزم کے سورج کی روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔

سوویت یونین اور امریکہ کے درمیان، دنیا پر اپنے سیاسی معاشی نظام کی بالادستی قائم کرنے کی ''سرد جنگ'' جو دوسری عالمی جنگ کے بعد سے شروع ہوئی تھی، چین میں انقلاب کے بعد بہت زوروں پر تھی۔ ان کے درمیان سائنس اور ٹیکنالوجی میں برتری حاصل کرنے کی دوڑ بھی تھی۔ 1961ء میں جب سوویت یونین نے خلاء میں پہلی بار انسان کو بھیجا تو جان ایف کینیڈی جو کہ وائٹ ہاؤس میں آ چکا تھا اس نے اعلان کیا کہ اس دہائی کے ختم ہونے سے پہلے امریکہ چاند پر انسان کو اتارے گا اور 1969ء میں نیل آرمسٹرونگ نے چاند پر قدم رکھا۔

امریکہ اور روس کے درمیان کشیدگی اپنے عروج پر تھی کہ 1962ء میں کیوبا کا میزائل بحران اس مقام تک آ گیا کہ کسی بھی لمحے دنیا ایٹمی جنگ یا تیسری عالمی جنگ کا شکار ہو سکتی تھی کہ کینیڈی اس بات پر رضامند ہو گیا کہ وہ ترکی میں نصب شدہ اپنے میزائل جو کہ سوویت یونین کے خلاف لگائے گئے تھے ان کو ہٹا لے گا اور جواباً سوویت یونین کیوبا سے اپنے میزائل ہٹانے پر آمادہ ہو گیا اور اس طرح دنیا ایک بہت بڑی تباہی سے بچ گئی۔

1963ء میں جان ایف کینیڈی کو قتل کر دیا گیا۔ کراچی اور دنیا بھر کی لڑکیوں کی

آنکھیں آنسوؤں سے کئی روز تر رہیں۔ اسی سال مارٹن لوتھر کنگ جونیئر نے ڈھائی لاکھ کے مجمع میں اپنی معرکتہ الآرا تقریر I have a dream کی جس کے اثرات دور دور تک پھیلے۔ انسانی حقوق سے محروم طبقات کی جدوجہد میں شدت آئی۔ یاد رہے کہ جمہوریت کے علمبردار یورپ میں سوئٹزرلینڈ جیسے ملک میں بھی ابھی تک عورتوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل نہیں ہوا تھا۔ انہیں یہ حق 1971ء میں جا کر حاصل ہوا اور امریکہ میں بھی 1965ء میں انسانی حقوق کا ایکٹ پاس کیا گیا۔ Malcom-X جو انسانی حقوق کو معاشی حقوق کے ساتھ منسلک کر کے استحصالی طبقات سے مکمل حقوق کے حصول کی بات کرتا تھا اس کو قتل کر دیا گیا اور اسی سال ساؤتھ افریقہ میں نیلسن منڈیلا کو عمر قید کی سزا دے دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ویت نام کے عوام کی آزادی کی وہ جنگ جو 1961ء سے جاری تھی اس کو کچلنے کے لیے 1965ء میں امریکہ نے ویت نام میں اپنی فوجیں اتار دیں اور صدر جانسن نے شمالی ویت نام پر بمباری کا حکم دے دیا۔ دنیا بھر میں امریکہ کے اس اقدام کے خلاف مظاہرے اور اجتماع شروع ہو گئے اور ویت نام میں امریکہ کے خلاف ویت نامیوں کی شدید گوریلا مزاحمت شروع ہو گئی۔

کیوبا میں فیڈل کاسترو اور راؤل کے ساتھ مل کر، کیوبا میں مسلح جدوجہد کر کے امریکی پٹھو ڈکٹیٹر FULGENCIO BATISTA کا تختہ الٹنے اور عوامی انقلاب کو مستحکم کرنے کے بعد، چی گویرا جو کہ ارجنٹائن کا رہنے والا تھا، ڈاکٹر تھا، مصنف تھا اور جنگ آزادی میں مسلح جدوجہد کا ہیرو تھا پہلے کانگو، پھر ساؤتھ افریقہ، افریقہ کے دیگر ممالک اور لاطینی امریکہ کے دوسرے ملکوں سے ہوتا ہوا بولیویا کے عوام کے ساتھ مل کر مسلح جدوجہد میں ان کی قیادت کر رہا تھا کہ 8/اکتوبر 1967ء کو بولیویا کے صدر RENE BARRIENTOS جو کہ سامراج کا گماشتہ تھا، کے حکم پر گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ 1968ء میں مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کو بھی قتل کر دیا گیا اور اس کے دو ماہ بعد جان ایف کینیڈی کے بھائی رابرٹ کینیڈی کو بھی قتل کر دیا گیا۔ اس سے پہلے کانگو میں قومی آزادی کی جنگ لڑ کر جون 1960ء میں بلجیم سے اپنے ملک کو آزادی دلوانے والے پہلے منتخب وزیراعظم

پیٹرک لوممبا جس کی حکومت کو بنے ابھی بارہ ہفتے ہی گزرے تھے کہ اُس کا تختہ الٹوایا گیا، قید کیا گیا اور بلجیم حکومت کی ایما پر فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا کر کے گولیوں کی بوچھاڑ کر کے قتل کیا گیا۔ لوممبا کی عمر اس وقت صرف پینتیس برس کی تھی۔ اس پر پاکستان میں ترقی پسند طالب علموں کی تنظیموں نے بھرپور احتجاج کیا تھا۔ پاکستان کے طالب علم اور مزدور دنیا بھر کے عوام کی آزادی کی تحریکوں کا نہ صرف علم رکھتے تھے بلکہ ان کے ساتھ اظہار یک جہتی میں مظاہرے اور احتجاج بھی کرتے تھے۔ ڈھاکہ سے شروع ہونے والے مظاہرے پورے پاکستان میں پھیل جاتے۔ ویت نام پر امریکی جارحیت ہو یا لوممبا کا قتل۔ اس کے قتل میں ملوث ہونے پر بلجیم حکومت نے 2002ء میں معافی بھی مانگی ہے۔

ادھر مشرق وسطیٰ ایک مدت سے یورپ، پھر امریکہ کی رسہ کشی کا شکار تھا، ان کے رحم و کرم پر تھا اور باہمی چپقلش میں الجھا ہوا تھا۔ ایران میں 1953ء میں مصدق کا تختہ الٹ کر سی آئی اے نے شاہ آف ایران کو اپنے مفادات کا چوکیدار، ایرانی قوم پر ہی نہیں، بلکہ مشرق وسطیٰ میں مقرر کر دیا تھا جو اپنا فرض بہت وفاداری سے نبھا رہا تھا۔

عربوں کی تاریخ اور بیسویں صدی کی سیاست میں شاہ فاروق کا تختہ الٹ کر مصر میں جمال عبدالناصر جیسی قوم پرست قدآور قیادت ابھر چکی تھی۔ اس نے نہ صرف نہر سویز کو قومی تحویل میں لیا بلکہ تیل سمیت ملک کی صنعت و زراعت پر قابض تمام غیر ملکی کمپنیوں کو بالخصوص برطانوی اور فرانسیسی کمپنیوں کو ملک سے نکال باہر کیا تھا۔ نہر سویز، تیل، زراعت و صنعت کی آمدنی جو مصر کے عوام کی تھی اب ان پر استعمال ہونے لگی تھی۔ اس نے زرعی اصلاحات کر کے لاکھوں ایکٹر زمین کاشتکاروں میں تقسیم کر دی تھی اور اسوان ڈیم جیسے دیوہیکل منصوبے پر کام شروع کر دیا۔ اس نے ملک کو سوشلزم کی راہ پر ڈالا تھا جس کے ثمرات عوام تک پہنچنے لگے۔ ملک خوش حال اور خود کفیل ہونے لگا اور اس کے اثرات دیگر عرب ممالک تک پھیل گئے۔

یمن اور عراق میں بادشاہوں کا تختہ الٹ دیا گیا تھا اور سوشلسٹ حکومتیں قائم ہوئی تھیں۔ ناصر نے عربوں کو اس بات کا شعور بھی دلایا تھا کہ تیل عربوں کی ملکیت ہے مگر

اس پر قابض بیرونی کمپنیاں اس کو کوڑیوں کے بھاؤ خریدتی ہیں اور تیل کی قیمت بھی وہ خود مقرر کرتی ہیں، تیل کی قیمت تیل پیدا کرنے والے عرب ممالک کو خود طے کرنی چاہیے۔ وہ عربوں کی اقوام متحدہ بنانا چاہتا تھا تا کہ عرب دنیا عالمی سامراج کے تسلط سے باہر نکل آئے اور اپنے فیصلے خود کر سکے۔ ناصر کے عرب نیشنلزم کی گونج الجزائر سے لے کر سعودی عرب کے مضافات تک میں سنائی دینے لگی اور جمال عبدالناصر عرب قوم پرستی کا ہیرو بن گیا۔

1961ء میں قائم ہونے والی غیر وابستہ تحریک (NAM) کی بنیاد رکھنے والوں میں بھی مصر کے صدر جمال عبدالناصر تھے۔ ان کے علاوہ یوگوسلاویہ کے مارشل ٹیٹو، انڈونیشیاء کے سوئیکارنو، گھانا کے صدر نکروما، بھارت کے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو اور چین کے وزیر اعظم چواین لائی شامل تھے۔

نہر سویز کو قومی تحویل میں لینا اور برطانوی افواج کو مصر چھوڑ دینے کا حکم دینا یہ وہ اقدامات تھے جس کی وجہ سے مغرب ناصر کے مخالف ہو گیا۔ چنانچہ اخوان المسلمین کے ممبر محمد عبداللطیف نے 26 اکتوبر 1954ء کو جمال عبدالناصر پر اس وقت حملہ کیا جب پورا مصر برطانیہ سے فوجوں کی واپسی کا جشن منا رہا تھا اور ناصر اسکندریہ میں ایک بہت بڑے جلسہ عام سے خطاب کر رہا تھا۔ ناصر پر آٹھ گولیاں چلائی گئیں جن میں وہ بال بال بچ گیا۔ اس نے واپس قاہرہ پہنچ کر اخوان المسلمین پر پابندی لگا دی اس کے ہزاروں ممبران کو گرفتار کیا گیا۔ کچھ ملک چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس کے سرکردہ آٹھ رہنماؤں کو پھانسی دی گئی جبکہ ناصر نے سید قطب کی سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا اور اس کو پھانسی نہیں دی گئی۔

1954ء سے 1964ء تک سید قطب جیل میں رہا۔ بالآخر عراق کے صدر عبدالسلام عارف کی مداخلت پر مئی 1964ء کو اسے رہا کیا گیا۔ 9 اگست 1965ء کو سید قطب کو دوبارہ گرفتار کیا گیا اور 21 اگست 1966ء کو اس کے ساتھیوں سمیت جن میں اس کا جانشین محمد یوسف حواش بھی شامل تھا۔ حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کے جرم میں سزائے موت سنائی گئی اور پھانسی دے دی گئی۔ سید قطب، شہید کہلایا جانے لگا۔

سید قطب نے بہت سے انڈے اور بچے دیئے

جن میں اسامہ بن لادن، ایمن الظواہری، شیخ عمر عبدالرحمن، شیخ فتح اور زرقاوی شامل ہیں

شیخ محمد بن عبدالوہاب، سید احمد شہید، جمال الدین افغانی، محمد عبدہٗ، مولانا مودودی اور سید قطب نے بہت سے انڈے اور بچے دیئے، جن میں اسامہ بن لادن، ایمن الظواہری، شیخ عمر عبدالرحمن، شیخ فتح اور زرقاوی وغیرہ شامل ہیں جنہیں امریکہ نے دودھ پلا کر پالا، پہلے جہادی بنایا اور پھر دہشت گرد قرار دے کر دنیا کو تہذیبوں کے ٹکراؤ میں تقسیم کرکے کرۂ ارض کو خون میں لت پت کر دیا۔ ہم نے تاریخ میں تہذیبوں کو ٹکراتے نہیں دیکھا بلکہ سلطنتوں کے پھیلاؤ کی کشمکش میں امپیریلزم کو ٹکراتے دیکھا ہے۔ تہذیبیں نہیں ٹکراتیں بلکہ سامراجی مفادات ٹکراتے ہیں۔

سید قطب، امام ابن تیمیہؒ اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کا پیروکار تھا۔ ابوالاعلیٰ مودودی کا ہم عصر تھا اور اسامہ بن لادن، ایمن الظواہری ڈاکٹر عبداللہ عزام اور القاعدہ کا نظریاتی سرپرست تھا۔ ایمن الظواہری جو جون 1951ء میں مصر میں پیدا ہوا۔ قاہرہ یونیورسٹی سے 1978ء میں ڈاکٹر بنا، تین سال تک مصری فوج میں سرجن کے طور پر کام کیا اور 81-1980ء میں پشاور آکر جہادیوں کی مرہم پٹی کرتا رہا۔ جب انور سادات کو 16 را کتوبر 1981ء کو قتل کیا گیا تو الظواہری کو گرفتار کر لیا گیا۔ وہ تین سال تک جیل میں رہا۔ وہاں سے سعودی عرب جدہ میڈیکل سنٹر میں ملازمت کی غرض سے چلا گیا جہاں پر اس کی اسامہ بن لادن سے ملاقات ہوئی۔ 02-2001ء میں وہ لندن سے نکلنے والے ایک عربی اخبار الشرق الاوسط میں ''فرسان تحت رایۃ النبی'' 'Knights under the Prophet's Banner' کے عنوان سے اپنی سوانح عمری لکھتا رہا جس میں وہ سید قطب کے پیروکار کے طور پر خدا کی شریعت کا ٹھیکیدار بن گیا۔

پاکستان میں بن لادن اور ایمن الظواہری نے مل کر کام کیا۔ ان کے ساتھ ان کا پیروکار ساتھی ڈاکٹر عبداللہ عزام بھی تھا۔ عزام جدہ کی عبدالعزیز یونیورسٹی میں پڑھا رہا تھا جہاں سے اس کو انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں لایا گیا۔ وہ اسامہ بن لادن کا گرو (MENTOR) تھا۔ یہ سب کے سب پشاور میں امریکہ کے قائم کردہ مدرسہ تبلیغ و جہاد (College for Preaching and Jihad) میں کام کرتے رہے اور ''مکتب الخدمات'' کے ذریعے مجاہدین کی بھرتی اور تربیت کرتے رہے۔ عزام نے اس پراجیکٹ کا نام القاعدہ السلبہ (Al-Qaeda Al-Sulba) رکھا۔ اور کبھی اسے الکفاح کا نام بھی دیا گیا۔

پاکستان کی حکومت اور فوج کی مدد اور سرپرستی سے القاعدہ کا یہ پراجیکٹ امریکہ نے خود تیار کروایا تھا۔ عزام کو 24/نومبر 1989ء کو پشاور میں واصل جہنم کیا گیا۔ 89ء میں جب روسی افغانستان سے واپس چلے گئے تو بہت سے عرب مجاہدین مصر اور الجیریا واپس چلے گئے تاکہ وہاں کی ''کافرانہ'' حکومتوں کے خلاف جہاد کریں۔ باقی جہادی تین سال کے لئے بلقان کے ممالک (Balkans) میں چیچنیا کے مجاہدین کی مدد کے لئے پہنچ گئے جو سوویت یونین کے خلاف امریکہ کی لڑائی لڑ رہے تھے۔

الظواہری کے پیروکاروں میں 9/11 والا محمد عاطف بھی تھا جو ابوالحفص المصری (Abu Hafs Al-Masri) کے نام سے جانا جاتا تھا۔ جس نے سعودی عرب، افریقہ اور یمن میں 1990ء کی دہائی میں کاروائیاں کی تھیں۔ اس کے شاگردوں میں محمد مکاوی (Muhammad Makkawi) بھی تھا جو سیف العدل (Seif-Al-Adl) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسی گروپ نے 1987ء میں مسافروں کے جہاز کو اغوا کر کے مصری عوامی اسمبلی کی عمارت سے ٹکرایا تھا۔

الظواہری نے 1989ء میں اور 1993ء میں دوبار امریکہ جا کر جہادیوں کے لئے بھاری رقوم وصول کیں۔ صدر ریگن ان مجاہدین کا موازنہ امریکہ کے Founding Fathers کے ساتھ کرتا تھا۔ 1989ء میں الظواہری مجاہدین سروسز بیورو برانچ آفس

بروکلین نیویارک میں رہا۔ پھر 1993ء میں ریڈ کراس کویت کا نمائندہ بن کر کیلیفورنیا میں رہا۔ الظواہری اسرائیل کے خلاف لڑنے کے بجائے کہتا تھا ''یروشلم جانے کی شاہراہ قاہرہ سے گزرتی ہے۔'' "The road to Jerusalam passes through Cario"
الظواہری اور اسامہ کو سوڈان کی ذمہ داری سونپی گئی تو 1996ء میں انہیں سوڈان سے نکال دیا گیا۔ انہوں نے طالبان کے زیر اثر افغانستان کے شہر جلال آباد میں آ کر ڈیرہ جمالیا۔ پھر الظواہری اور اس کے ساتھی چیچنیا چلے گئے۔ انہیں داغستان (Dagestan) میں گرفتار کرلیا گیا۔ جب رہا ہوئے تو مئی 1997ء میں یہ سب اسامہ کے ساتھ جلال آباد میں آ کر مل گئے۔ جہاں پر دنیا بھر کے جہادی، اسامہ کے جہادی کیمپ میں جمع ہو رہے تھے۔

سید قطب کا ایک اور پیروکار جو الظواہری کا ہم عصر جہادی تھا اس کا نام شیخ عمر عبدالرحمن ہے۔ جس کو امریکہ نیو جرسی میں جرسی سٹی مسجد میں لایا گیا۔ یہ 1993ء میں نیویارک میں ہونے والے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے دھماکے کا ذمہ دار تھا۔ جب یہ مقدمہ چلا تو اس کی تشہیر اس طرح سے کی گئی کہ امریکی عوام واقعتاً دہشت گردوں، جہادیوں سے خوفزدہ ہونے لگے۔ ان کے اپنے اقتصادی مسائل اور معاشی حقوق کے مطالبات پس پشت چلے گئے۔ یہ وہی عمر عبدالرحمن تھا جو جمال عبدالناصر کے خلاف سازشیں اور ہنگامے کرواتا رہا تھا، امریکہ کا پروردہ تھا، سوشلسٹوں کو قتل کرتا تھا اور اس نے فتویٰ جاری کیا تھا کہ جمال عبدالناصر کا نماز جنازہ پڑھنا ناجائز ہے۔ جو نماز پڑھے گا وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ ناصریوں (NASSERITES) اور مارکسٹوں کو مروانے کے لئے صدر انور سادات بھی اس کی سرپرستی کرتا رہا۔ جب سادات کو قتل کیا گیا تو شیخ عمر عبدالرحمن کو بھی جیل میں ڈالا گیا۔ پھر اس کو امریکہ بلوالیا گیا۔ 2001ء میں اس کے دو بیٹے اسد اور احمد، اسامہ بن لادن کے مشیر تھے۔ عمر عبدالرحمن کا مسلمانوں کو یہ پیغام ہے کہ ان کے پاس خوب مال و دولت ہونا چاہیے۔ زیادہ دولت مند مسلمان بمقابلہ غریب مسلمان کے اللہ کو زیادہ عزیز ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کا یہ جہادی محافظ اندھا یعنی نابینا تھا۔ دولت کی ریل پیل کو اس نے محسوس کیا تھا۔ دیکھا نہیں تھا۔ اگر دیکھ لیتا تو معلوم نہیں فتوے کی نوعیت کیا ہوتی۔

قطب کا ایک اور دہشت گرد جہادی پیروکار جو الظو اھری، اسامہ بن لادن، عمر عبدالرحمن کا ہم عصر اور ساتھی ہے اس کا نام ہے شیخ مُلّا فتح کریکار (Sheikh / Mullah Fateh Krekar) یہ عراق کے کردستان کا رہنے والا ہے اور ناروے میں آباد ہے۔ 1978-79ء میں ایران کے انقلاب کے بعد اس کے پیدا کردہ جہادیوں نے ایران کے خلاف ''امریکہ کا جہاد'' کیا۔ اس مُلّا فتح کریکار کو نجم الدین فراج بھی کہا جاتا ہے۔ جب بش اور بلیئر نے جھوٹی کہانیاں گھڑ کر عراق پر حملہ کیا تو اس وقت اس کی تنظیم انصار الاسلام نے مشرقی کردستان کے بارڈر کے بہت سے دیہاتوں پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ ایران کے قریب یہ علاقے ہمیشہ سیکولر اور سوشلسٹوں بالخصوص (Patriot Union of Kurdistan) کے زیر اثر تھے۔ اس مُلّا کی تنظیم ان سوشلسٹوں کو جو امریکہ مخالف تھے چن چن کر مارتی تھی۔ اس کی تنظیم میں افغان جہادی بھی شامل تھے۔ اردن کا ''جہادی'' ابومعصب الزرقاوی (Abu-Mus'ab Al Zarqawi) بھی اس کے پاس تھا۔ جب امریکہ کی ایک لاکھ تین ہزار فوج نے عراق میں ڈیرہ جمایا تو اس مُلّا کی تنظیم کے جہادی زائرین پر، مزاروں پر، گرجا گھروں پر، بازاروں میں کار بم پھوڑتے اور سینکڑوں معصوم انسانوں کا قتل کر کے امریکی فوج کی عراق میں موجودگی کا جواز مہیا کرتے۔ یہ فوج عراق میں اس ''دہشت گردی'' کو ختم کرنے اور امن قائم کرنے کے بہانے سے وہاں پر متعین رہی۔ حا آنکہ عراق اور اس کے تیل پر امریکہ کا قبضہ نہیں ہو گیا۔

سید قطب اور اس کے ہم عصر مولانا مودودی کے پیروکار، یہ دہشت گرد دنیا میں امریکی مفادات کا تحفظ کرتے چلے آرہے ہیں۔ امریکہ اپنے اہداف ان کے ذریعے حاصل کر رہا ہے۔ جہادی اور سامراج ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ ان کے ذریعے حکومتوں کے تختے الٹوائے گئے۔ مارشل لا لگوائے گئے۔ اپنی مرضی کی حکومتیں قائم کی گئیں۔ سوویت یونین جو کہ سوشل سامراج بن کر اندرونی تضادات کی وجہ سے مسائل کا شکار تھا، اس کو توڑنے میں استعمال کیا۔ آج کا شام ہو یا لیبیا، نائیجریا ہو یا یمن، امریکہ کے پیدا کردہ دہشت گرد لاکھوں معصوم انسانوں کا قتل عام کر رہے ہیں۔

امریکی سینٹ سے ان کی سر پرستی کے لئے بجٹ کی منظوری چونکہ ممکن نہیں اس لئے سعودی عرب اور مشرق وسطیٰ کے شیوخ کے ذریعے ان کی مالی امداد کی جاتی ہے۔ اسلحہ مہیا کیا جاتا ہے۔ پاکستان کے حکمران بھی اس میں شامل ہیں۔ سنا گیا ہے کہ پاکستان کی جیلوں سے دہشت گرد رہا کر کے انہیں شام کے خلاف بھیجا گیا ہے اور موجودہ حکومت پاکستانی افواج کو بھی شام کے خلاف اس کھیل میں شامل کرنا چاہتی ہے۔ جس کے لئے افواہ گردش کر رہی ہے کہ 1.5 بلین ڈالرز کی پہلی قسط بھی وصول کی جا چکی ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ پاکستانی فوج اس کھیل کا حصہ نہیں بننا چاہتی۔

سید قطب کی زندگی کا سفر کس طرح ایک سیکولر شاعر اور تنقید نگار سے شروع ہو کر سلفی، جہادی اور دہشت گردی کا علمبردار بننے پر اختتام پذیر ہوا اس کی تفصیلات Adnan A Musallam کی کتاب From Secularism to Jihad میں موجود ہیں۔ چنانچہ ساٹھ کی دہائی میں جب پیپلز پارٹی قائم ہوئی دنیا میں جو کچھ ہو رہا تھا اس نے کئی نسلوں کو متاثر کیا اور آج تک دنیا ان کی لپیٹ میں ہے۔

یاسر عرفات کی زیر قیادت فلسطینی حریت پسندوں کی مسلح جدوجہد

جون 1967ء کی چھ روزہ عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل کے ہاتھوں عربوں کی شکست کے نتیجے میں جمال عبدالناصر کا عرب نیشنلزم اور اس کی اپنی شخصیت دونوں ہی بے حد متاثر ہوئے۔ ناصر کو صدارت سے استعفیٰ دینا پڑا۔ وادیٔ سینا اور بیت المقدس دونوں عربوں کے ہاتھ سے نکل کر اسرائیل کے قبضے میں چلے گئے۔ دریائے اردن کے مغربی کنارے پر بھی اسرائیل قابض ہو گیا۔ پاکستان میں امریکی سامراج مردہ باد کے نعرے بلند ہوئے۔ مزدور یونین، این۔ ایس۔ ایف اور نیپ کے ساتھ ساتھ دیگر بائیں بازو کی جماعتوں نے جلوس نکال کر امریکہ کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا۔ جبکہ اخوان المسلمین اور جماعت اسلامی ناصر کے خلاف امریکہ کے ساتھ تھیں۔

ناصر کی اس شکست پر ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف صاحبہ سمیت ہم سب بہت اداس

تھے۔ اس روز کلاس میں جب ڈاکٹر صاحبہ نے اس موضوع پر گفتگو شروع کی تو ہمارا کلاس فیلو راجہ صنوبر جس کا تعلق گوجر خان سے تھا فلسطینیوں کے بارے میں بولا "They have been thrashed by Israel." ''اسرائیل نے ان کا کچومر نکال دیا ہے۔'' اس فقرے کے بعد ڈاکٹر صاحبہ کا بس نہیں تھا کہ اس کو کچا چبا جائیں۔ وہ کچھ دن بعد برطانیہ چلا گیا۔ 1983ء میں جب سو سالہ سال کے بعد اس سے ملاقات ہوئی تو اس واقع پر ہنستے ہوئے بولا کہ ''تم تو جانتے ہو کہ مجھے انگریزی بولنے کا شوق تھا اور میں تو صرف لفظ Thrash کو استعمال کرنا چاہتا تھا۔'' ڈاکٹر صاحبہ نے Arab-Israel Conflict کے نام سے ایک کتابچہ بھی لکھا تھا۔

بیشتر عرب ریاستیں دعوے دار تھیں کہ وہ اسرائیل کے خلاف ہیں۔ مگر ان میں سے کچھ روس کے تابع فرمان تھیں اور کچھ امریکہ کے۔ ایران اور سعودی عرب مکمل طور پر امریکہ کی گرفت میں تھے۔ اسرائیل کے خلاف اس جنگ میں حصہ لینے والے عرب ممالک میں سے مصر، شام اور عراق کا تعلق سوویت یونین کے ساتھ تھا۔ ان ممالک نے اس جنگ میں سوویت یونین کا اسلحہ استعمال کیا جو کہ امریکی ساخت کے اسلحے کے مقابلے میں، جو کہ اسرائیل نے استعمال کیا تھا، بے کار ثابت ہوا۔ سوویت یونین کی اسلحہ میں یہ کم تری اس کے اتحادیوں کے لئے ایک سوالیہ نشان بن گئی۔

سوویت یونین کا عرب دنیا میں اثر زائل ہونے لگا۔ امریکہ جو ابھی تک ویت نام میں اپنی شکست کے زخم چاٹ رہا تھا اپنی اس برتری پر شادیانے بجانے لگا اور امریکی میڈیا اپنی قوم کا مورال بلند کرنے میں مصروف ہو گیا۔ پاکستان جیسے ممالک کا امریکہ کی اسلحہ سازصنعت کی برتری پر اور بھی اعتماد بڑھ گیا۔

اس ماحول میں اردن کے شاہ حسین نے جب امریکہ اور پھر اسرائیل کے ساتھ دوستی بڑھانا شروع کی تو شاہ حسین کی اپنے عوام اور سیکورٹی فورسز میں مقبولیت اور عزت ختم ہونے لگی۔ مصر نے بھی امریکہ سے مذاکرات شروع کر دیئے تھے۔ اس صورت حال میں عرب عوام نے اپنی قسمت اپنے ہاتھ میں لے لی اور ظلم کا قلع قمع کرنے کے لئے اس واحد

راستے کو اپنایا جسے مسلح جدو جہد کہتے ہیں۔ فلسطین کی آزادی کا وہ شعلہ جو اول اول فلسطینی مہاجروں کی بستیوں سے بلند ہوا تھا عرب عوام کی مسلح جدو جہد کی صورت اختیار کر گیا۔ الفتح اور العاصفہ کے پرچم اسی شعلے کی زبان بن گئیں۔

"الفتح"، تنظیم آزادئ فلسطین یا PLO

(PALISTINIAN LIBERATION ORGANISATION) کا عسکری بازو تھا۔ PLO اور اس کے رہنما یاسر عرفات بہت تیزی سے عرب عوام کی صبح امید بن گئے۔ آزادئ فلسطین کی اس تنظیم میں دنیائے عرب سے ہزاروں فدائین شامل ہونے لگے۔ "الفتح"، اسرائیل کے خلاف گوریلا جنگ لڑ رہی تھی۔ ہر روز اس کے کامیاب حملوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یاسر عرفات کو اس جدو جہد کے حوالے سے عربوں کا چی گویرا کہا جانے لگا تھا جس نے عالمی سامراج کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ PLO اسرائیل کے لئے ایک سنگین خطرہ بن گئی۔

فلسطینیوں کی جدو جہد یوں تو 1947ء کے اواخر سے جاری تھی جب اقوام متحدہ نے تقسیم فلسطین کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ مئی 1948ء میں اسرائیل کے اس علاقے پر قبضے کے خلاف عرب ممالک نے بھی اعلانِ جنگ کیا تھا جس کو اقوام متحدہ نے 1949ء میں جنگ بندی معاہدہ کے ذریعے ختم کروایا تھا اور اسرائیل قائم ہوا تھا۔ فلسطینی علاقے مصر اور شرق اردن (Transjordan) کے کنٹرول میں دے دیئے گئے تھے۔ 1949ء میں ہی اسے اردن کا نام دے دیا گیا تھا۔

1950ء میں دریائے اردن کے مغربی کنارے کو اس میں شامل کر کے فلسطینی نمائندے کو حکومت میں شامل کیا گیا۔ اس وقت دریائے اردن کے مشرقی کنارے پر تقریباً چار لاکھ فلسطینی مہاجرین آباد تھے۔ یہ تعداد اردن کی کل آبادی کا ایک تہائی تھی۔ دوسری تہائی مغربی کنارے پر آباد تھی۔ جبکہ ایک تہائی آبادی اردنیوں کی تھی گویا اردن میں ایک تہائی اردنی تھے اور دو تہائی فلسطینی۔

1950ء سے ہی مغربی کنارے پر آباد فلسطینی، اسرائیل کے بھی خلاف تھے اور

اردن کی بادشاہت کے بھی۔ شاہ حسین کو ہمیشہ سے یہ خطرہ لاحق تھا کہ مغربی کنارہ اگر فلسطینیوں یعنی، PLO کے زیر تسلط چلا گیا تو اس کی بادشاہت ختم ہوسکتی ہے۔ PLO کو مصر کے صدر ناصر کی حمایت حاصل تھی اور ''الفتح'' نے 1965ء سے ہی اسرائیل کے خلاف گوریلا کارروائی شروع کر رکھی تھی۔ شاہ حسین کی بادشاہت کے خطرے میں اسرائیل کی بقا کا خطرہ بھی پوشیدہ تھا۔

اردن کی دو تہائی آبادی جو فلسطینیوں کی آبادی تھی، الفتح ان کے دل کی دھڑکن تھی۔ اردن کے دوسرے بڑے شہر اربد پر PLO کا مکمل قبضہ تھا۔ عمان بھی PLO کے زیر تسلط تھا۔ PLO کی اسرائیل کے خلاف گوریلا کامیابیوں کو ختم کرنے کے لئے 1969ء میں اسرائیل نے اربد پر حملہ کر دیا۔ شاہ حسین کی مرضی بھی اس حملے میں شامل تھی، اس نے اپنی افواج کو اسرائیلی ڈیفنس فورسز کے خلاف اس جنگ میں ملوث نہ ہونے کی ہدایات کی تھیں مگر اردن کے جنرل حدیثہ نے شاہ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے PLO کے ساتھ مل کر اسرائیل کو اس جنگ میں شکست دی۔ اس جنگ کو جنگ کرامہ کہا جاتا ہے۔ PLO بیک وقت شاہ حسین کی مخالفت بھی برداشت کر رہی تھی اور اسرائیل کے ساتھ عالم جنگ میں بھی تھی۔ فلسطینیوں کی آبادی اور علاقوں میں شاہ حسین کا اختیار بتدریج ختم ہو رہا تھا۔ میں نے اس زمانے میں اس پر ایک بھر پور مضمون بھی نصرت میں لکھا تھا۔

فروری 1970ء میں امریکی صدر رچرڈ نکسن اور مصر کے صدر ناصر کے ساتھ شاہ حسین نے ملاقات کرنے کے بعد دس نکاتی احکامات جاری کئے جن کے ذریعے PLO کی کارروائیوں کو کنٹرول میں کرنا تھا۔ 11رفروری کو عمان میں شاہ حسین کی سیکورٹی کے افراد اور PLO میں شدید لڑائی ہوئی جس میں تین سو افراد مارے گئے۔ شاہ حسین نے وقت کی نزاکت کا اندازہ کرتے ہوئے اعلان کیا کہ فلسطینی ہی نہیں، PLO ہی نہیں بلکہ ہم سب فدائین ہیں اور اپنے اس وزیر داخلہ کو برخواست کر دیا جو کہ PLO کے بے حد خلاف تھا۔ اب تک مسلح فلسطینیوں نے اردن کے بہت سے علاقوں پر کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔

جب عرب عوام کی مسلح جدو جہد تیز ہوئی تو پتہ چلا کہ اسرائیل کے حق میں روس

اور امریکہ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ جس طرح پاک و ہند کی 1965ء کی جنگ کے بعد اعلان تاشقند کروانے میں ان دونوں بڑی طاقتوں کا یکساں ہاتھ تھا اسی طرح مشرق وسطیٰ میں امریکی امن منصوبے ''راجرز پلان'' کے پیچھے بھی ان دونوں کا مشترکہ مفاد کارفرما تھا۔

جولائی 1970ء میں امریکہ کا دیا ہوا یہ پلان مصر اور اردن نے تسلیم کرلیا۔ عرب عوام اسی طرح غم و غصہ میں مضطرب تھے جس طرح پاکستان کے عوام 65 کی جنگ بندی اور 1966ء میں معاہدہ تاشقند سے تھے۔ ایک طرف سعودی عرب اور دوسری طرف مصر کی بے نیازی، معنی خیز تھی۔ اردن کی شاہی حکومت اور اسرائیلی حکومت دونوں ہی فلسطینیوں کی مسلح جدوجہد سے خوفزدہ تھیں۔ سامراج اور سامراجی گماشتے شاہ حسین کی حمایت کر رہے تھے جبکہ فدائین کی حمایت میں دنیا بھر کی حریت پسند اقوام آواز اٹھا رہی تھیں۔

راجرز پلان کے نتیجے میں مصر اور اسرائیل کے درمیان جنگ بندی ہوئی۔ 1967ء میں اسرائیل نے جو علاقے قبضہ کئے تھے ان کی واپسی طے پائی مگر اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کی قرارداد 242 کے مطابق دریائے اردن کے مغربی کنارے کا علاقہ (West Bank) شاہ حسین کے قبضے میں ہی رہنے دیا گیا جو کہ یاسر عرفات کی PLO، جارج حباش کے POPULAR FRONT FOR THE LIBERATION OF PALESTINE اور نائف حواتمہ کے DEMOCRATIC FRONT FOR THE LIBERATION OF PALESTINE کے لئے قابل قبول نہیں تھا۔ ان کی گوریلا کارروائیوں میں مزید شدت آگئی۔ شاہ حسین جس کی بیوی انگریز تھی اور جس کے بطن سے اس کا بیٹا آج کل اردن کا شاہ ہے، راجرز پلان کے بعد اپنے آپ کو مضبوط سمجھ کر فدائین کے خلاف فوجی کاروائیوں میں مصروف ہوگیا۔

پاکستان میں نوابزادہ نصر اللہ سے لے کر یحییٰ خان کی حکومت تک سب شاہ حسین کی وکالت کر رہے تھے۔ جبکہ ذوالفقار علی بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی یاسر عرفات اور ان کے فدائین کا ساتھ دے رہے تھے۔ ہم نے نصرت کا الفتح نمبر بھی ان ہی دنوں میں شائع کیا تھا۔

یکم ستمبر 1970ء کو شاہ حسین کو قتل کرنے کی کوشش ہوئی۔ 7رستمبر کو فدائین نے تین جہاز اغوا کئے۔ سوئس ایئر اور TWA کے جہاز اردن میں واقع ازرق کے ہوائی اڈے پر اتارے گئے اور PAN-AM کا جہاز اغوا کر کے قاہرہ لے جایا گیا۔ مسافروں کو اتارنے کے بعد ان جہازوں کو اُڑا دیا گیا۔ 9رستمبر کو BOAC کے ایک جہاز کو اغوا کیا گیا۔ فدائین اب شاہ حسین کے ساتھ باقاعدہ حالت جنگ میں تھے اور اردن کے عوام اور فلسطینی عوام ان کے ساتھ تھے۔ PLO نے اپنے کنٹرول میں اربد کے علاقے کو آزاد علاقہ قرار دے دیا۔ 15رستمبر 1970ء کو شاہ حسین نے ملک میں مارشل لا لگا کر فلسطینیوں کا صفایا کرنے کا حکم دے دیا۔ عربوں کی تاریخ میں اس کو ''بلیک ستمبر'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

1919ء میں ترکوں کی عثمانی خلافت کے خاتمے کے بعد مشرق وسطیٰ کو فرانس اور برطانیہ نے اپنے اپنے مفادات کے ٹکڑوں میں بانٹ کر مختلف ممالک اور حکومتیں بنائی تھیں۔ موجودہ اردن بھی ان ہی مفادات کی پیداوار ہے۔ اردن کا شاہ حسین اس خاندان کا براہ راست وارث تھا جو عرب عوام کے نزدیک ایک غدار اور مفاد پرست خاندان تھا، جس کا اردن کی سرزمین سے کوئی تعلق نہیں تھا، جس کو حجاز سے لاکر اردن اور عراق کا حاکم بنایا گیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد جب امریکہ نے برطانیہ کی جگہ لے لی تو شاہ حسین مشرق وسطیٰ میں امریکہ اور اسرائیل کے مفادات کے محافظ کے طور پر پہچانا جانے لگا۔ شاہ حسین کا کردار عوام دشمن، سامراج پرست اور اسرائیل نواز تھا۔

ستمبر 1970ء میں دنیا بھر کے اخبارات پر مشرق وسطیٰ کے واقعات چھائے رہے۔ شاہ حسین اور اس کے فیلڈ مارشل حابس المجالی نے فلسطینی حریت پسندوں کو کچلنا شروع کیا۔ امریکہ کا چھٹا بحری بیڑہ حرکت میں آ گیا۔ امریکہ کے ''اسلامی حلیف'' ترکی میں امریکی فوجی اڈوں پر امریکہ کے فوجی دستے کسی بھی وقت عمان کی طرف پرواز کے لئے تیار کھڑے تھے۔ شاہ حسین کی بادشاہت کو بچانے کے لئے امریکہ کا وزیر جنگ کہہ رہا تھا کہ امریکہ اردن میں فوجی مداخلت کرے گا۔

اردن کا تمام شمالی حصہ، اہم سڑکیں اور عمان کے بعد دوسرا بڑا شہر اربد فلسطینی

فدائین کے قبضے میں تھا۔ فلسطینیوں کا مکمل صفایا کرنے کی ذمہ داری پاکستانی فوج کے بریگیڈیئر ضیاالحق کے ذمے لگا دی گئی۔ جو اُن دنوں اردن میں تعینات تھا۔

ضیاالحق نے ہزاروں فلسطینی حریت پسندوں کا قتل عام کیا

اردن کا شاہ حسین اور اسرائیل دونوں محفوظ ہو گئے

1967ء عرب اسرائیل جنگ کے بعد اردن، شام اور عراق میں ان ممالک کی افواج کی تربیت کے لئے پاکستان سے فوجی تربیتی Contingents بھیجے گئے تھے۔ پاکستان سے اردن میں جو مشن بھیجا گیا تھا وہ نیول، ایئر فورس اور بری فوج سے منتخب کئے گئے بیس سینئر افسران پر مشتمل تھا۔ اس ٹیم کے سربراہ آرمرڈ کور کے میجر جنرل نوازش تھے۔ ان کے معاونین میں سینئر معاون بریگیڈیر ضیاالحق تھا۔ اس کے علاوہ بریگیڈیر افتخار رانا اور کرنل یاسین ملک تھے۔ ایئر فورس کی ٹیم کے سربراہ کموڈور انور شمیم تھے جو بعد میں پاکستان ایئر فورس کے چیف بنے۔ اس ٹیم کی ذمہ داری صرف JORDANIAN DEFENCE FORCES کی تربیت کرنا تھی۔ کسی بھی محاذ جنگ پر اردن کی فوج کے ساتھ مل کر لڑائی میں شامل ہونا ان کے فرائض میں شامل نہیں تھا۔ طیب صدیقی جو اس وقت اردن میں پاکستان کے Charge 'd' affair تھے، 14/اگست 2010ء کے The News میں لکھتے ہیں:۔

"2/ستمبر 1970ء کو مجھے بریگیڈیر ضیاالحق کا ٹیلی فون یہ بتانے کے لئے آیا کہ انہیں اردن کے شاہ حسین نے اردن کی آرمرڈ ڈویژن جو کہ اربد میں تعینات ہے اس کی کمانڈ Take over کرنے کے لئے کہا ہے۔ اردن کی فوج کے میجر جنرل قاسم موطہ (Qasim Motta) نے فلسطینیوں کے خلاف لڑنے سے انکار کر دیا ہے اور ضیاالحق کو شاہ حسین نے اس کی جگہ Take over کرنے کو کہا ہے۔

"ہمارے سفیر بھی اور جنرل نوازش بھی، دونوں ہی اردن سے باہر تھے۔ سفیر کے بعد چارج ڈی افیئر میں تھا اور فوجیوں میں ضیا سینئر افسر تھا۔ ضیاالحق نے شاہ کو بتایا کہ

کوئی بھی اقدام اٹھانے سے پہلے اس کو پاکستانی سفارت خانے سے Political Clearance لینا ہوگی۔ میں نے ضیاالحق کو کہا کہ چونکہ پاکستانی تربیتی مشن کا Mandate کسی بھی محاذ جنگ میں شامل ہونا نہیں ہے اس لئے مجھے اسلام آباد سے رابطہ کرنا ہوگا۔

''تمام ٹیلیفون منقطع تھے۔ Cypher کا رابطہ بھی نہیں تھا۔ واحد رابطے کا ذریعہ Telex تھا۔ چند گھنٹوں کی تگ و دو کے بعد سیکرٹری دفتر خارجہ سلطان محمود خاں سے رابطہ ہوسکا جنہوں نے کسی بھی قسم کی ہدایات دینے سے انکار کرتے ہوئے فوجیوں سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا۔ بالآخر میرا رابطہ سیکرٹری دفاع غیاث الدین سے ہوسکا۔

''میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر گرین سگنل دے دیا۔ میں نے اس کے نتائج واضح کرنا چاہے تو انہوں نے میری بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے استخارہ دیکھ لیا ہے۔ ہاشمی بادشاہت خطرے میں ہے۔ اردن کے شاہ کے احکامات پر عمل کرو۔''

ضیاالحق نے شاہ حسین اور اسرائیل کو PLO سے بچانے کے لئے ''اسلامی جہاد'' کیا۔ اس نے 25 ہزار فلسطینی نہتے شہریوں اور 10 ہزار PLO کے فدائین کا قتل عام کیا۔ اربد کی ہر گلی اور ہر گھر لہولہان تھا۔ PLO کی کمر ٹوٹ گئی۔ ضیاالحق فلسطینی فدائین کے لئے ایک جلاد ثابت ہوا۔ شاہ حسین اور یاسر عرفات کے درمیان امن معاہدہ ہوگیا اور وہ فدائین جو بچ گئے لبنان منتقل ہو گئے۔ انہوں نے بعد میں اپنی جدوجہد کو جاری رکھا۔

ضیاالحق نے 27 ستمبر کو اردن کی سرزمین سے فلسطینیوں کا جس طرح صفایا کیا اس کے بارے میں اسرائیل کے موشے دایان کا کہنا یہ تھا کہ شاہ حسین نے جس تعداد میں فلسطینی مارے ہیں اسرائیل شاید آنے والے بیس سالوں میں بھی نہ مار سکتا۔ شاہ حسین نے ضیاالحق کو جس ''خلعتِ فاخرہ'' سے نوازا تھا اس کو پہن کر وہ پاکستان میں بھی اپنے مخالفین، ترقی پسندوں، دانشوروں، شاعروں ادیبوں اور سیاسی کارکنوں کو جیلوں میں ٹھونستا رہا۔ ان کے خون سے ہولی کھیلتا رہا۔ اس نے عوام کے منتخب وزیر اعظم کا عدالتی قتل کیا۔ وہ جب کبھی یہ وردی پہن کر ٹی وی پر نمودار ہوتا تو عوام اس کو بینڈ ماسٹر کہتے۔

پیپلز پارٹی کے ترجمان ہفت روزہ نصرت کا اجرا

دنیا کے یہ وہ حالات تھے اور ساٹھ کی یہ وہ دہائی تھی جب پیپلز پارٹی قائم ہوئی۔ اس کو اپنے نظریات و افکار کو پھیلانے اور عوام کو فکری لڑی میں پرونے کے لئے ایک ترجمان کی ضرورت تھی۔ یہ دور نظریات کی بنیاد پر جدوجہد کا دور تھا۔ عالمی سامراج اور اس کے استحصالی نظام کے خلاف عوام کی تحریکوں کا دور تھا۔ یہ پرنٹ میڈیا کا زمانہ تھا جس پر ایوبی آمریت کا مکمل قبضہ تھا۔

نومبر 1967ء میں پارٹی کی تشکیل کے موقع پر 75 صفحات پر مشتمل پاکستان پیپلز پارٹی کی اساسی دستاویز چھاپی گئی تھی جس میں پارٹی کا سیاسی و معاشی پروگرام دیا گیا تھا۔ یہ دستاویز انگریزی زبان میں تھی اور اس کا عوامی سطح پر بہت کم لوگوں کو علم تھا۔ بھٹو صاحب اور جے۔ اے رحیم انگریزی زبان میں ہی لکھتے تھے۔ جبکہ پارٹی بہت تیزی کے ساتھ مزدوروں، کسانوں، طالب علموں، ریڑھی والوں، تانگے والوں، محنت کشوں، کلرکوں اور خواتین کی پارٹی بنتی جارہی تھی۔ بھٹو صاحب سے عوام کی محبت اور مقبولیت کو کنارہ بند کرنے کے لیے بھی اور پارٹی کو منظم کرنے کے لیے بھی، پارٹی کے پروگرام اور فلسفے کو اردو زبان میں اور آسان اسلوب میں ملک کے گوشے گوشے تک باقاعدگی سے پہنچانا بے حد اہم تھا۔

نیشنل پریس ٹرسٹ اور کنونشن مسلم لیگ کے اخبارات و جرائد میں بھٹو صاحب کی ذات پر اور پیپلز پارٹی کے بارے میں انتہائی شر انگیز خبریں، مضامین اور تبصرے چھپ رہے تھے۔ پریس ٹرسٹ کے ذریعے آزادئ اظہار اور بالخصوص ترقی پسند صحافیوں اور دانشوروں اور ان کی تحریروں کو پابند کر دیا گیا تھا۔

ایوب خان کے 1958ء کے مارشل لا کے بعد میاں افتخار الدین کی کمپنی، پروگریسو پیپرز لمیٹڈ (PPL) کے چار اخبارات و جرائد، روزنامہ پاکستان ٹائمز، روزنامہ امروز، ہفت روزہ لیل ونہار اور سپورٹس ٹائمز کو 1959ء میں فوجی قبضے میں لے لیا گیا تھا۔ جب ان اخبارات پر فوجی قبضہ ہوا تو قدرت اللہ شہاب اس قبضہ گروپ کا حصہ تھے۔ اس فوجی قبضے کے بعد پاکستان ٹائمز کا پہلا اداریہ بھی انہوں نے ہی لکھا تھا۔ جب (PPL) پر قبضہ کیا گیا تو اس وقت روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' کے ایڈیٹر مظہر علی خان، روزنامہ ''امروز'' کے ایڈیٹر احمد ندیم قاسمی اور ہفت روزہ ''لیل ونہار'' کے ایڈیٹر سبط حسن تھے۔ فیض احمد فیض ان تینوں کے چیف ایڈیٹر یعنی گروپ ایڈیٹر تھے۔ قبضے کے بعد یہ اخبارات پہلے سیٹھ داؤد نے خریدے پھر لاہور کے ایک ان پڑھ ممبر اسمبلی چودھری محمد حسین کی ملکیت بنے جو اپنے پاس دو ٹوپیاں رکھتا تھا۔ ایک اپنے سر پر رکھنے کے لیے اور دوسری حکمرانوں کے پاؤں میں رکھنے کے لیے۔ پھر یہ اخبارات چودھری ظہور الٰہی نے خرید لئے۔ چودھری ظہور الٰہی سیاست دان کے طور پر ابھر رہے تھے اور یہ اخبارات ان کے لیے سیڑھی کا درجہ رکھتے تھے۔ مگر امیر محمد خان گورنر مغربی پاکستان ان کو اپنے لیے دھمکی محسوس کرنے لگے کیونکہ چودھری صاحب نے ایوب خان کے ساتھ براہ راست تعلقات قائم کر لیے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نیشنل پریس ٹرسٹ قائم ہوا اور ان اخبارات کے علاوہ روزنامہ ''مشرق'' اور ''مارننگ نیوز'' کو بھی اس میں شامل کر کے ایوب خان کے معتمد خاص غلام فاروق کو اس کا چیئرمین بنا دیا گیا۔

چودھری ظہور الٰہی ذوالفقار علی بھٹو کو پسند کرتے تھے اور پیپلز پارٹی میں بھی شمولیت کرنا چاہتے تھے لیکن غلام مصطفی کھر اور محمد حنیف رامے نے انہیں بھٹو سے دور رکھا۔ دونوں صاحبان کو ڈر تھا کہ چودھری ظہور الٰہی اپنے طریقۂ جوڑ توڑ، وسیع دستر خوان اور شاہ خرچی کی وجہ سے پارٹی کے کارکنوں کو اپنے ساتھ ملا لیں گے۔

پاکستان ٹرسٹ کے پرچے اور درجنوں اخبارات و رسائل پیپلز پارٹی اور اس کی قیادت پر گندگی اچھال رہے تھے۔ روزنامہ نوائے وقت اور روزنامہ جنگ کبھی کبھار کچھ نہ کچھ چھاپنے کا اہتمام کرتے مگر اکثر اوقات وہ بھی حکومت کا دباؤ برداشت نہیں کر سکتے

تھے۔کوئی روزنامہ اخبار یا رسالہ پیپلز پارٹی کی سوچ، اس کی کارکردگی اور صحیح سیاسی صورت حال عوام کے سامنے پیش نہیں کر رہا تھا۔ چنانچہ ایک روزنامے یا کم از کم ہفت روزہ رسالے کی ضرورت تھی جو کہ پیپلز پارٹی کی ترجمانی کر سکے۔

لاہور کے کچھ ادیبوں اور صحافیوں نے ''پاکستان پیپلز پارٹی کیسی ہونی چاہیے'' کے عنوان سے ایک پمفلٹ شائع کر کے تقسیم کیا۔ پمفلٹ کے ابتدائی حصے میں پاکستان بننے کے بعد مختلف سیاسی پارٹیوں کے کردار کا مختصر تجزیہ تھا اور پیپلز پارٹی کی تنظیم کے بارے میں بہت سے کارآمد مشورے درج کئے گئے تھے۔جن میں ایک یہ بھی تھا کہ پارٹی اگر ایک روزنامہ جاری نہیں کر سکتی تو کم از کم دو ہفت روزہ جرائد (ایک مغربی پاکستان میں اور ایک مشرقی پاکستان میں) کو فوری طور پر شروع کیا جائے۔خواہ یہ جرائد نئے ڈیکلیریشن کے ذریعے شروع کئے جائیں یا پہلے سے موجود جرائد کی معاونت کر کے کام چلایا جائے۔ جب یہ پمفلٹ جو، حسین نقی، اطہر ندیم، مسعود اللہ خان، شفقت تنویر مرزا، عباس اطہر اور چند دیگر ساتھیوں کی کاوش کا نتیجہ تھا، رامے صاحب نے بھٹو صاحب کو دیا تو وہ ان حضرات سے ملنا چاہتے تھے تا کہ اس کی عملی راہ تلاش کی جا سکے۔لاہور میں بھٹو صاحب کے قیام کے دوران اس میٹنگ کا ہونا طے پایا۔

حنیف رامے نے اطہر ندیم کے ذمے یہ کام سونپا کہ اس میٹنگ میں پرچہ نکلوانے اور پارٹی پروگرام ونظریات کی نشرواشاعت کی ذمہ داری بھٹو صاحب سے اُن کو دلوانی ہے۔ اطہر ندیم اور حسین نقی کی دوستی تھی اور اطہر ندیم اور حنیف رامے کے درمیان ذاتی اور ارائیں برادرانہ تعلقات تھے۔اس کام کے لیے اطہر ندیم کو حسین نقی کی مدد درکار تھی۔ چنانچہ نقی صاحب کا اس میٹنگ میں جانا لازمی قرار پایا۔اتوار کا دن تھا۔حسین نقی اور ان کی بیگم زہرہ نقی جو خود بھی صحافت کرتی تھیں ان کو صرف یہ ایک دن ہی اپنے چھوٹے بچوں اور گھر کے سودے سلف کے لئے میسر آتا تھا۔مگر اطہر ندیم کسی نہ کسی طرح نقی صاحب کو لے کر میٹنگ میں پہنچ گئے۔ اس میٹنگ میں جہاں اور بہت سی باتیں ہوئیں ان میں نقی صاحب کا یہ تاریخی مکالمہ یادگار ہے۔انہوں نے بھٹو صاحب کو کہا کہ '' آپ فوج کی مدد

سے یا عوام کی طاقت کے ذریعے اس ملک کے حکمران بنیں گے۔اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ آپ سب سے پہلے ہمیں ہی گرفتار کریں گے (پھر یہی ہوا)۔ مگر تاریخ کا یہ تقاضا ہے کہ ہم آپ کا ساتھ دیں۔ ہم آپ کا ساتھ جذبات سے نہیں بلکہ شعوری طور پر دے رہے ہیں۔ آج آپ کی پارٹی میں کام لینے کی صلاحیت نہیں ہے۔ آپ ایک کمیٹی بنائیں جو ہفتہ وار میٹنگ کرے اور مخالف پروپیگنڈا کا جواب دے اور یہ کمیٹی براہ راست آپ کی نگرانی میں کام کرے۔'' جب اخبار کی ضرورت پر بات ہوئی تو بھٹو صاحب نے یہ ذمہ داری بھی ڈاکٹر مبشر حسن پر ڈالنا چاہی۔ جس پر نقی صاحب نے کہا کہ ''اگر آپ ایک شخص کو بیس کام سونپ دیں گے تو وہ ہر کام کا ستیاناس کر کے رکھ دے گا۔ رامے اصولی کمیٹی کے رکن بھی ہیں اور ان کا ایک جریدہ نصرت کے نام سے باقاعدہ چھپ رہا ہے۔ اس ماہنامے کو بآسانی ہفت روزہ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ آپ یہ ذمہ داری ان کو دیں۔''

اس طرح ''نصرت'' کو پیپلز پارٹی کے ترجمان کے طور پر شائع کرنے کی ذمہ داری حنیف رامے کو سونپ دی گئی۔ کمیٹی کی میٹنگز تو بہت زیادہ نہیں ہو پائیں مگر میں اور حسین نقی ہفت روزہ نصرت کی ذمے داری اور سنجیدگی کو سمجھتے ہوئے براہ راست اس کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ محمد حنیف رامے اس کے چیف ایڈیٹر تھے، میں ایڈیٹر تھا اور حسین نقی جو لاہور میں پی پی اے نیوز ایجنسی کے بیورو چیف تھے، باقاعدگی سے ہفتہ وار کالم ''حالات حاضرہ'' لکھنے لگے۔

نصرت نے پیپلز پارٹی کے ترجمان کے طور پر نئے سفر کا آغاز کیا اور سیاست کے میدان خارزار میں قدم رکھا۔ 18 مارچ 1968ء کو اس کا پہلا شمارہ چھپا۔ ابھی نو شمارے ہی نکلے تھے کہ ایوب خان کی حکومت نے اس کی شعلہ نوائی کو سرد کرنے کے لیے اسے بند کر دیا۔ سات ماہ کی جبری بندش کے بعد جب ایوب خان کو ہائی کورٹ میں اپنا پلہ دبتا نظر آیا تو گیارہ نومبر 1968ء کو اسے دوبارہ اشاعت کی اجازت مل گئی۔ دو روز بعد یعنی 13 نومبر 1968ء کو جب بھٹو صاحب کو لاہور میں ڈاکٹر مبشر کی رہائش گاہ سے گرفتار کیا گیا تو عوام کے ہاتھوں میں ایک نظریاتی تلوار بنا نصرت قید سے باہر آ چکا تھا۔

اب میں تھا اور ہفت روزہ نصرت

میں اب لاہور میں تھا۔ اپنے اندر سینکڑوں سال کی تاریخ سمیٹے ہوئے آہستہ آہستہ خشک ہوتی ہوئی خاموش راوی کے کنارے لاہور۔ حبیب جالب، استاد دامن، منیر نیازی، ناصر کاظمی اور سعادت حسن منٹو کا شہر، جس کے بارے میں منٹو نے کہا تھا کہ اس شہر پر خدا کا نور برستا ہے اور یہاں پر خاموش گھنگھرو بھی بجتے ہیں۔

پطرس بخاری نے ''لاہور کا جغرافیہ'' میں لاہور کے بارے میں لکھا تھا۔ ''لاہور تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں۔ لیکن دو ان میں سے بہت مشہور ہیں۔ ایک پشاور سے آتا ہے اور دوسرا دہلی سے۔ وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے راستے اور یوپی کے حملہ آور دہلی کے راستے وارد ہوتے ہیں۔ اول الذکر اہل سیف کہلاتے ہیں اور غزنوی یا غوری تخلص کرتے ہیں۔ مؤخر الذکر اہل زبان کہلاتے ہیں۔'' میں نے سرگودھا سے آنے کا راستہ اختیار کیا تھا جن کا ان دونوں راستوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

انارکلی چوک کے ایک کونے کے سامنے ایک مینار والی مسلم مسجد کے نیچے حنیف رامے کی البیان نام سے پبلشنگ کی دکان تھی۔ اس دکان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد نصرت کے حصے میں تقریباً دس فٹ لمبی اور چھ فٹ چوڑی جگہ آئی تھی جس میں مشکل سے میری اور حنیف صاحب کی دو کرسیاں اور دو میزیں آسکی تھیں۔ باہر کے حصے میں رامے صاحب کا بھانجا اکرام کتابوں کی فروخت اور ترسیل کا کام سنبھالے ہوئے تھا۔ اکثر کتابیں سعادت حسن منٹو کی تحریر کردہ تھیں مگر اب پیپلز پارٹی کا لٹریچر بھی البیان کے زیر اہتمام چھپ رہا تھا۔

نصرت اور البیان کے لئے ایک دفتری یعنی چپڑاسی اقبال بھی تھا جو دن میں کئی بار سامنے کی دوکان سے کاڑھا قسم کی چائے جس میں تانگوں کے گھوڑوں کی لید، جو دن بھر اڑتی رہتی تھی، کا تڑکا بھی لگا ہوتا تھا، مہیا کرتا رہتا۔ حنیف صاحب کا چھوٹا بھانجا اشفاق جسے مومن کہتے تھے شام کو اپنی دوکان بند کر کے آتا اور رات گئے تک پمفلٹس اور کتابوں کے بنڈل باندھنے، ان کو ریلوے سٹیشن، بسوں کے اڈے اور پوسٹ آفس تک پہنچانے میں

اکرام اور اقبال کی مدد کرتا۔ اشرف قدسی اور اطہر ندیم بھی کبھی کبھار چکر لگا لیتے۔

میں ایڈیٹر بھی تھا، رپورٹر بھی، پروف ریڈر بھی، مضمون نگار بھی، کاپی جوڑنے کا کام بھی کرتا۔ یعنی کتابت کے علاوہ نصرت کو تیار کر کے پریس تک بھیجنے کے تمام مراحل کی ذمہ داری میری تھی۔ اس لئے کہ پارٹی کے پاس پیسے نہیں تھے کہ کسی بھی طرح کے سٹاف کو رکھا جا سکتا۔ کاتب سلیم ''بولا'' (وہ اونچا سنتا تھا) میری کرسی کے ساتھ جو تھوڑی سی جگہ بچی تھی وہاں زمین پر بیٹھ کر کتابت کرتا اور وقت پر تنخواہ نہ ملنے کا شکوہ کرتا رہتا۔ فوری کتابت اور پرچے کی تیاری میں عمر فاروقی ہماری معاونت کرتے۔ (آج کل وہ مختلف اخبارات و رسائل میں اچھے مضامین لکھ رہے ہیں)۔ نصرت کی قیمت تیس پیسے تھی اور پمفلٹس جن میں بھٹو صاحب کی تحریریں، اسلام اور سوشلزم، پیپلز پارٹی کیوں بنائی گئی، قائداعظم کس طرح کا پاکستان چاہتے تھے، پیپلز پارٹی کا پروگرام، پارٹی جھنڈے کا فلسفہ وغیرہ وغیرہ کی قیمت پانچ پانچ پیسے تھی۔ اس سے بمشکل چھپائی اور تقسیم کے اخراجات پورے ہوتے۔

سارا دن پاکستان بھر سے سیاسی کارکن اور رہنما جو پارٹی کے رہنماؤں سے ملاقات کے لیے لاہور آتے وہ نصرت کے دفتر ضرور آتے اور تمام دن ملاقاتوں کے اس تانتے میں گزر جاتا۔ شام گئے پرچے کا کام شروع ہوتا۔ اس نہ ختم ہونے والے کام سے فارغ ہو کر جب میں گھر کی طرف چلتا تو صبح کا جھٹپٹا ہو چکا ہوتا اور میونسپل کارپوریشن کا عملۂ صفائی سڑکیں صاف کر رہا ہوتا۔

اس دکان نما دفتر میں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا۔ برسات کے دنوں میں بے پناہ حبس، بجلی کے پنکھے میں بھی دم گھٹتا، تھکن اور نیند کے باعث اکثر اوقات کرسی پر بیٹھنا مشکل ہو جاتا۔ اپنی تھکاوٹ یا اکتاہٹ کا کسی پر اظہار کئے بغیر میں کام میں جُتا رہتا۔ دکان (دفتر) کے سامنے تانگے والوں کی چھینا جھپٹی، بے پناہ گرمی کے باوجود انارکلی میں انسانوں کا ہجوم، ہتھ گاڑیاں اور رکشے، قلچے، بھٹورے اور آلو چھولے، دودھ کے جوڑے کڑاہوں کے پیچھے چوکی پر بیٹھے ہوئے موٹی موٹی توند والے پیڑوں کی لسی بلوتے ہوئے پہلوان حلوائی، گوالمنڈی کی مچھلی، بچھے کے پائے، کھوئی کی برفی، گردے کپورے، حلیم اور

پائے اور لاہور کے خوش خوراک زندہ دل لوگ!! گنپت روڈ، رتن چند روڈ، گنگا رام، لکشمی چوک، کرشن نگر، رام گلی، گلاب دیوی ہسپتال، قلعہ گوجر سنگھ جیسے ناموں کو تبدیل کر کے ناموں کی تاریخ مسخ کرنے اور ان کو ''مشرف بہ عربستان'' یا ''مشرف بہ خاندان'' کرنے کا عمل ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔

انارکلی، لوہاری گیٹ، موری یا بھاٹی گیٹ، موچی گیٹ اور ان سے منسوب باغ۔ سنا ہے پرانے لاہور کے چاروں طرف بڑی چوڑی خندق تھی۔ انگریزوں نے اس کو پاٹ کر اس پر پودے لگا دیئے تھے۔ وہ نہر جس سے خندق میں پانی آتا تھا اسے انہوں نے چھوٹی سی پکی نہر میں تبدیل کر دیا تھا۔ یہ نہر اس باغ کے وسط میں بہتی تھی۔ جہاں شہر کے دروازے آتے۔ یہ نہر سڑک کے نیچے سے ہو کر پھر باغ میں جا نکلتی۔ اور دروازے کے نام کی مناسبت سے انہیں باغ بیرون موچی دروازہ، باغ بیرون لوہاری دروازہ وغیرہ کہا جاتا تھا۔

جمعہ کے روز میں اور حنیف رامے چھٹی کرتے تھے۔ اس روز میں اور خورشید عالم جو ایک زمانے میں سول اینڈ ملٹری گزٹ سے وابستہ تھے اور عالم جوانی میں لندن میں مقیم چودھری رحمت علی کے ساتھ ان کی خط و کتابت تھی اور اپنے خطوط میں پہلی بار لفظ پاکستان خورشید عالم نے چودھری رحمت علی کو تجویز کیا تھا جو بالآخر چودھری صاحب سے منسوب کر دیا گیا، گول باغ میں جا بیٹھتے۔ انقلاب کی تاریخ، کارل مارکس اور ماؤزے تنگ کے افکار کی روشنی میں پاکستان میں ابھری ہوئی تحریک اور عوام کی سیاسی بیداری کی لہر میں سے مثبت نتائج نکالنے کا تجزیہ کرتے۔ خورشید عالم بے حد حساس اور خوبصورت انسانی جذبات کے مالک تھے۔ مظلوم عوام اور اقوام پر ہونے والے مظالم پر بات کرتے ہوئے ان کی آواز بھرا جاتی اور ظلم کے خلاف عوام کی جدوجہد پر، ان کی کامیابیوں پر، ان کی آنکھیں چمک اٹھتیں۔ خورشید صاحب اپنی اس نسل سے جو سرسید، جناح، اقبال اور غلام احمد پرویز پر رُک چکی تھی، مختلف تھے۔ انہوں نے اور زاہد چودھری نے، جو کہ کافی عرصہ عوامی جمہوریہ چین میں گزار کر آئے تھے اپنی عمر کے اس حصے میں سائنٹیفک سوشلزم کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور ان کے سیاسی تجزیوں، تحریروں اور مکالمات میں کوئی ابہام نہیں تھا۔

اس باغ میں مالشئے اپنی تیل کی بوتلیں کھٹکھٹاتے پھرتے، بیکار لوگ تاش کھیل رہے ہوتے، کچھ لوگ یونہی گھاس پر لیٹے آرام کر رہے ہوتے، کہیں کہیں بچے اور نوجوان پتنگ اڑا رہے ہوتے۔ ایک کونے میں چھوٹا سا پہلوانوں کا اکھاڑہ بھی تھا۔ یہاں پر کشتی کے داؤ پیچ سیکھے اور سکھائے جاتے اور قریب ہی گھنگھرو والے سونٹے سے بھنگ گھوٹنے کی موسیقی سنائی دیتی۔ یہ باغ عوامی باغ تھا۔ جبکہ لارنس گارڈن امرا اور اشرافیہ کے سیر سپاٹے کا باغ تھا۔ جہاں پر وہ صبح اور شام کی سیر کے دوران اپنے تعلقات عامہ کو فروغ دیتے۔

اس لاہور میں، میں تھا اور ہفت روزہ نصرت۔ جواب پاکستان کے عوام کی امیدوں اور عزائم کے لیے وہ قطبی ستارہ بن چکا تھا جو سفر کے ہر موڑ پر عوامی جدوجہد کے کارواں کو جس کی راہبری ذوالفقار علی بھٹو کر رہے تھے نئی فتوحات کے لیے راستہ دکھا رہا تھا اور عروج و کمال کی منزلوں تک لے جا رہا تھا۔ پیپلز پارٹی کے اس دور کے کارکن اور رہنما اپنے سیاسی ماضی میں اگر جھانک کر دیکھیں تو انہیں نظر آئے گا کہ کیا شان تھی عوام کی اور کیا کاٹ تھی ان کی زبان کی جس کا نام ''نصرت'' تھا۔ نہتے عوام کے ہاتھوں میں دلیل کی یہ ذوالفقار ایوبی آمریت اور اس کے گماشتوں، اسلام فروشوں اور عوام دشمنوں پر بجلی بن کر گرتی رہی۔

''نصرت'' کے ابتدائی دور کے شمارے اگر آپ اٹھا کر دیکھیں تو باقاعدہ لکھنے والوں میں آپ کو صفدر میر، حسین نقی، اطہر ندیم، پروفیسر محمد عثمان، شفقت تنویر مرزا اور احمد بشیر کے علاوہ اگر کچھ نام ملیں گے تو وہ چند قلمی نام ہیں جو ہمارے ذاتی دوستوں کے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف جو میری اور میری بیگم کی ایم اے جغرافیہ میں استاد تھیں اور جن کی وجہ سے حنیف رامے اور خورشید حسن میر کے ساتھ میری دوستی ہوئی تھی وہ اپنے قلمی نام ''عالیہ احسان'' کے نام سے لکھتی تھیں۔ حنیف صاحب اور ڈاکٹر مبشر حسن کے ایک مشترکہ دوست لطیف مرزا ''ایک پاکستانی'' کے نام سے لکھتے تھے۔ پروفیسر رفیع اللہ شہاب کا قلمی نام ''شاہد عادل'' تھا۔ یہ سب سرکاری ملازم تھے۔ لندن سے کبھی کبھار نسیم احمد باجوہ ڈائری لکھ کر بھیج دیتے تھے۔ پھر اس قافلے میں اور لکھنے والے شامل ہونے لگے۔

رحمت اللہ طارق، فقیر بخش بگٹی، اسماعیل آزاد، سلطان شاہد، ان کی تحریر و تحقیق کے بغیر یہ بحث کہ سوشلزم کا اسلام کے معاشی نظام سے کوئی ٹکراؤ نہیں، سوشلزم ہماری معیشت ہے، کی نظریاتی جنگ جیتنا بہت مشکل تھا۔ رامے صاحب کی اپنی تحقیق و تشریح اس بارے میں بہت گہری اور وزن دار تھی۔ اور پارٹی کا ترجمان بنانے سے پہلے رامے صاحب نصرت کا ''اسلامی سوشلزم'' نمبر بھی نکال چکے تھے۔ 1966ء میں چھپنے والے اس نمبر نے ملکی سطح پر علمی و سیاسی محاذ پر اسلامی سوشلزم کے بارے میں ایک بحث کا آغاز کر دیا تھا۔ اب ایسے وقت میں جبکہ 113 مولوی حضرات نے پارٹی کے اقتصادی پروگرام، سوشلزم، کو کفر قرار دے کر بھٹو صاحب، ان کے ساتھیوں اور ہم سب کو کافر اور قابل قتل قرار دے کر ملک میں خون کی ہولی کھیلنے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا، مولانا مودودی کی جماعت اسلامی پیش پیش تھی، ان دوستوں کی تحریر و تحقیق پارٹی کی سیاسی و نظریاتی زندگی کے لیے اسی طرح اہم تھی جس طرح انسان کی زندگی کے لیے اس کے جسم میں دوڑنے والا خون۔

صفدر میر نے ''مودودیت اور سیاسی کشمکش'' قسط وار لکھ کر مولانا مودودی کو ان کی اپنی تحریروں کی روشنی میں ننگا کیا۔ عوام دشمن اور پاکستان دشمن جماعت اسلامی کو جس طرح سیاق و سباق کے ساتھ انہوں نے بے نقاب کیا وہ اپنی جگہ ایک تاریخ ہے۔ رحمت اللہ طارق اور دیگر علما نے قرآن پاک کی آیات کی روشنی میں وضاحت کی کہ روٹی کے طالب نادار عوام نہ تو دہریے ہیں اور نہ ہی دین کی تکذیب کرنے والے، بلکہ دہریے وہ زردار ہیں جو رزق کے سرچشموں پر قابض ہیں۔ جو عوام الناس کی بھوک اور افلاس کا باعث ہیں۔ اور وہ مولوی حضرات جو سرمایہ داری اور جاگیرداری کا تحفظ کرتے ہیں وہ بھی قرآن پاک کی رو سے بے دین یعنی دہریے ہیں۔ عوام الناس کا سوال یہ تھا کہ کیا اسلام میں معاش، معاشیات کا سوال اٹھانا اور معاشی حقوق کا مطالبہ کرنا کفر ہے۔ ہفت روزہ نصرت نے قلم کے ذریعے اور بھٹو صاحب نے اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے عوام میں سیاسی و معاشی حقوق کے حصول کی بیداری کی جو لہر پیدا کی وہ آج تک پاکستان کے عوام کے سینوں میں زندہ ہے۔

پارٹی کی طرف سے لکھنے والوں میں بھٹو صاحب، جے اے رحیم، ڈاکٹر مبشر

حسن، مختار رانا، غیاث الدین جانباز، احمد رضا قصوری اور امان اللہ خان تھے۔ وقتاً فوقتاً شیخ محمد رشید، جنہیں ''بابائے سوشلزم'' کہا جاتا تھا اور ملک معراج خالد بھی 1969ء کے بعد مضمون لکھ بھیجتے۔ بھٹو صاحب کے مضامین کا ترجمہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ کام یا رامے صاحب کرتے یا میں خود۔

حسین نقی کا کالم ''حالات حاضرہ'' پہلے روز سے چھپ رہا تھا۔ ان کی زوردار تحریر کا بھٹو صاحب سے لے کر عام کارکن کو انتظار رہتا۔ اب سعید شفقت بھی ہمارے ساتھ اس محاذ پر راولپنڈی سے آ کر شامل ہو گئے۔ دوستی بھی تھی اور نظریاتی ہم آہنگی بھی۔ میرا کافی بوجھ انہوں نے سنبھال لیا۔ ان کا کالم ''عالمی سیاست'' بے حد مقبول ہوا۔ اثر چوہان بھی دسمبر 1969ء میں سرگودھا سے آ کر اس بھرپور جنگ میں شامل ہو گئے۔ ان کا کالم ''عداوت ہی سہی'' عوام دشمنوں اور اسلام فروشوں پر ہر ہفتے قہر بن کر نازل ہوتا۔ حسن جعفر زیدی، جو ابھی اپنے زمانہ طالب علمی میں تھے اور میری بیگم شمیم جعفر، گھر کے لکھنے والوں میں سے تھے۔ کبھی کبھی شاہین رامے بھی لکھتیں۔ ہمراز احسن بھی باقاعدگی سے لکھنے لگے تھے۔ اپنے ہر مضمون کے بعد وہ اسلامی جمعیت طلبا کے غنڈوں کے ہاتھوں زخمی ہوتے اور ان کا اگلا مضمون پہلے سے بھی زیادہ کاٹ دار ہوتا۔ وہ میرے لیے ہمیشہ چھوٹے بھائیوں کی طرح تھے اور ہمارا محبت کا رشتہ آج تک اسی طرح قائم ہے۔ فاروق اعظم نے طالب علموں کا صفحہ سنبھال لیا۔ اسلم گورداسپوری، مسعود منور اور اعزاز احمد آذر پارٹی کے انقلابی شاعر تھے۔ فوٹوگرافر مجید میر بھٹو صاحب کے عاشقوں میں سے تھے۔ ان کی تصاویر نہ صرف ''نصرت'' بلکہ پارٹی کے لئے سرمایہ تھیں جن کی عالمی سطح پر بھی پذیرائی ہوئی۔ جوں جوں عوامی تحریک زور پکڑ رہی تھی نصرت میں لکھنے والوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ عوام کی اس نظریاتی و سیاسی جدوجہد میں سب کے قلم کی طاقت عوام کے ساتھ تھی۔

اب بھٹو صاحب کو ایک عالم دین کی ضرورت محسوس ہوئی۔ رامے صاحب نے مجھے علامہ نصیر اجتہادی کو آمادہ کرنے کے لئے کہا۔ ابھی بات چلی ہی تھی کہ مولانا کوثر نیازی، جن کا اصلی نام ملک محمد حیات خان نیازی تھا، نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ ان

کے ہفت روزہ شہاب نے اپنے نئے دور کا آغاز کیا اور اس چوکھی جنگ میں اپنی تیز کاٹ کے ساتھ شامل ہوا۔ کراچی سے محمود شام کا ''معیار''، طفیل عباس کا ''منشور''، سبط حسن کا ''لیل ونہار''، ارشاد راؤ کا ''الفتح'' اپنے اپنے انداز میں اس جنگ کو اپنی جنگ سمجھتے ہوئے ہمارے شانہ بشانہ کھڑے تھے۔

مخالفین میں الطاف حسن قریشی کا ہفت روزہ ''زندگی'' تھا جس کی ادارت مجیب الرحمن شامی کر رہے تھے۔ شامی صاحب ایک مخصوص انداز میں مگر دلیل کے ساتھ مخالفت کرتے جبکہ ہفت روزہ ''چٹان'' شورش کاشمیری کی مغلظات سے بھرا ہوتا۔ پنجاب کے عوام کو بھٹو کا ساتھ دینے پر وہ گالی دیتا۔ یکم مئی کے مزدوروں کے جلوس کے بارے میں اس نے لکھا کہ ''پنجاب بے غیرت ہے جو بھٹو کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہے۔'' کبھی لکھتا ''پنجابی غدار و بھونکو'' کبھی ''لاوارث پنجاب۔'' وہ اور اس کے پنجابی شاونسٹ ساتھی ظالم اور مظلوم طبقات کے تضاد کو سندھی پنجابی بحث میں الجھانا چاہتے تھے۔ روزنامہ ''نوائے وقت'' اور روزنامہ ''ندائے ملت'' وغیرہ لکھ رہے تھے کہ پنجاب سے بھٹو کا الیکشن لڑنا پنجاب کی غیرت کے لیے ایک کھلا چیلنج ہے اور مسلمانان پنجاب کے ایمان کو چیلنج ہے کیونکہ بھٹو کافر ہے۔ باقی سرکاری و نیم سرکاری روزنامے، جرائد و رسائل بھٹو صاحب کی کردار کشی میں مصروف تھے۔

ایک مدت تک بے حد مقبول رہنے والا روزنامہ کوہستان جو کہ مر رہا تھا اس میں پھر سے جان ڈالنے کے لیے نسیم حجازی کو ''اعتکاف'' سے اٹھوا کر اس کا چیف ایڈیٹر بنایا گیا۔ نسیم حجازی اسلامی رومانی ناول نگار تھے۔ مسلمانوں کی تاریخ سے نابلد، اس کو مسخ کرنے کے ماہر مگر انڈر میٹرک نوجوانوں میں ان کے ناول بے حد مقبول تھے۔ میں نے بھی اپنے سکول کے زمانے میں ان کو پڑھا ہے۔ ان کے ناولوں سے متاثر اس نسل کے کچھ ریٹائرڈ آرمی جرنیل اور دانشور آج بھی سفید گھوڑے پر سوار، سر پر عقال رومال باندھے، تلوار لہراتے ہوئے دنیا کو فتح کرنے کا خواب دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔ غرضیکہ پوری کوششیں ہو رہی تھیں کہ عوام کے ذہنی انقلاب کے سامنے بند کھڑے کئے جا سکیں۔ مگر عوام مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے راستے پر گامزن تھے۔

صحافت کا تجربہ میرے لیے بالکل نیا تھا۔ رامے صاحب الفاظ کی طاقت اور الفاظ کے کھوکھلے پن، دونوں کو نہ صرف سمجھتے تھے بلکہ ان کا استعمال بھی بخوبی کرتے تھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور نصرت کو مکمل طور پر سنبھال لیا۔ جبکہ رامے صاحب اپنا تمام وقت پارٹی کے معاملات اور تنظیمی امور کو دیتے رہے۔ پہلا سبق جو مجھے ملا تھا وہ یہ تھا کہ اچھا ایڈیٹر ہونے کے لیے اچھا پروف ریڈر ہونا ضروری ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ مجھے بہت جلد ہو گیا کہ کس طرح کوما (،) اور فل سٹاپ (.) سے جملے کا مفہوم بدل سکتا ہے۔ ابھی صحافیوں نے اپنی تحریروں میں ''مک مکا'' اور ''ایویں کیویں'' کی تراکیب کا استعمال شروع نہیں کیا تھا اور نہ ہی قومی سطح کی سیاست میں پھکڑ پن کا رواج ہوا تھا۔

مولانا ظفر علی خان اپنے دور کے بہت مشہور اداریہ نویس تھے۔ رامے صاحب ان سے متاثر تھے اور میں نے بھی ان کی اداریہ نویسی کی باریکیاں ٹٹولنا شروع کر دی تھیں۔ ہمارے یہاں اداریہ خواہ وہ جریدے کا ہو یا روزنامے کا، پڑھنے کی عادت نہیں تھی اور اب بھی نہیں ہے۔ چونکہ پیپلز پارٹی کا پیغام اور نظریہ، نصرت کے ذریعے کارکنوں اور عوام تک پہنچتا تھا اس لیے اداریے کا ہر لفظ اہمیت کا حامل اور ہر فقرے کا با معنی ہونا اس لئے ضروری تھا کہ عام کارکن مشکل فلسفے اور پیغام کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں۔ نصرت کی کرن اُفقِ صحافت پر آفتاب بن کر چمکنے لگی اور اس نے لاکھوں انسانوں تک پیپلز پارٹی کے انقلابی پروگرام کو انتہائی موثر انداز میں پہنچا کر دانشوروں، طالب علموں، مزدوروں اور کسانوں کے دل و دماغ میں سوشلزم کی بنیاد رکھی۔

اس انقلابی دور میں نصرت کے ذریعے عوام کی خدمت کا جو عظیم الشان موقع مجھے اور نصرت میں لکھنے والے تمام ساتھیوں کو ملا وہ قابل فخر ہے اور مجھے یقین ہے کہ عوامی تاریخ میں ہمیشہ شاندار الفاظ میں یاد رکھا جائے گا۔

اس کو یاد رکھنے سے مجھے ایک قصہ یاد آ گیا۔ 2007ء میں جب بے نظیر پاکستان واپس جانے کی تیاری کر رہی تھیں اور ان کی بنائی ہوئی پارٹی کے رہنماؤں کا لندن میں تانتا بندھا ہوا تھا تو ایک روز سندھ سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب نے مخدوم امین فہیم کا کھانا

کیا۔ میں نے ایک مدت سے اس طرح کے کھانوں میں جانا ترک کر دیا ہے مگر اس میں کچھ ایسے دوستوں کا اصرار تھا کہ مجھ سے انکار نہ ہو سکا۔ میں اور مخدوم صاحب ایک کمرے میں جا بیٹھے۔ کچھ پرانی باتیں ہونے لگیں۔ بھٹو صاحب کی پیپلز پارٹی میں مخدوم طالب المولیٰ یعنی مخدوم امین فہیم کے والد سینئر وائس چیئر مین تھے اور ان کے یہاں ہالہ میں ہونے والی کانفرنس تاریخی اہمیت کی حامل تھی۔ اس پر بات ہونے لگی۔ اس دوران ایک صاحب جو امین فہیم صاحب کا بریف کیس اٹھائے ہوئے تھے وہ بھی اُن کے پاس آ بیٹھے۔ ہالہ کانفرنس پر بات ہو رہی تھی۔ ہم نے اس کانفرنس کی مکمل روئیداد ''نصرت'' میں چھاپی تھی۔ گفتگو کے دوران کئی بار ''نصرت'' اور ایڈیٹر ''نصرت'' کا لفظ استعمال ہوا۔ امین فہیم اٹھ کر باتھ روم گئے تو ان حضرت نے مجھ سے سوال کیا ''زیدی صاحب آپ بیگم نصرت بھٹو کے ایڈیٹر تھے۔'' مجھے یہ سوال کچھ دیر تک بالکل سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید میرے کان دھوکا کھا رہے تھے۔ مگر انہوں نے اس سوال کو دہرایا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ صاحب جو پارٹی کے مرکزی عہدیدار اور اہم لیڈر کہلاتے ہیں، انہیں جہاں یہ نہیں معلوم کہ بیگم نصرت بھٹو نہیں بلکہ ہفت روزہ ''نصرت'' پارٹی کا ترجمان تھا وہاں انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ایڈیٹر کسی شخص کا نہیں بلکہ اخبار یا رسالے کا ہوا کرتا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ عقلی زوال کی اس گہرائی میں رہنے والا اور بھٹو صاحب کی پیپلز پارٹی کی تاریخ سے بے بہرہ یہ شخص راجہ پرویز اشرف تھا جو پہلے تو پاکستان کے سب سے بڑے بحران کی وزارت یعنی پانی و بجلی کا مرکزی وزیر بنا اور پھر ملک کا وزیر اعظم۔

یہ ایک تو کیا، پیپلز پارٹی کی سلیمانی ٹوپی تو اب ان کے ہاتھ بھی لگ چکی ہے جو ذوالفقار علی بھٹو کے قتل میں یا ملوث تھے یا قاتلوں کی صف میں کھڑے تھے۔ تاریخ کا یہ جبر، بہت ظالمانہ جبر ہے۔ رامے صاحب جب لندن میرے پاس رُکے تو کہنے لگے کہ اقتدار میں آنے کے بعد وہ اور بے نظیر اکٹھے مساوات کے دفتر گئے۔ بے نظیر کہنے لگیں کہ سنا ہے آپ بھی مساوات میں کام کرتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں میں یہاں پر چپڑاسی تھا۔

وہ تحریک جس کے لیے عوام اور نصرت نے مشترکہ جدوجہد کی بہت جلد پاکستان

کوعوامی جمہوریت اور سوشلزم کے نفاذ کی منزل تک لے آئی۔ پارٹی کے لیے اب دو راستے تھے۔ انتخابات کے ذریعے برسر اقتدار آنا یا انتخابات کا بائیکاٹ کر کے عوامی طاقت کے ذریعے حکومت پر قبضہ کرنا۔ ہالہ کانفرنس میں یہ طے پایا تھا کہ انقلاب نہیں انتخاب کا راستہ اختیار کیا جائے گا چنانچہ پارٹی نے جمہوری راستہ اختیار کیا۔ جبکہ مشرقی پاکستان میں نیشنل عوامی پارٹی نے جو اس وقت وہاں کی مقبول ترین جماعت تھی انتخابات میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا اور اس طرح مولانا عبدالحمید بھاشانی کے اس فیصلے کے نتیجے میں شیخ مجیب الرحمن کی عوامی لیگ کو کھلا میدان مل گیا۔

روزنامہ مساوات نے ہفت روزہ نصرت کی کوکھ سے جنم لیا

1970ء کے انتخابات کی تیاری ہونے لگی تو ''نصرت'' نے ذوالفقار علی بھٹو کی زیرِ ہدایت عوام کے اخبار روزنامہ ''مساوات'' کا ڈول ڈالا۔ مساوات نے ''نصرت'' کی کوکھ سے جنم لیا۔ انتخابات میں پارٹی کو ایک روزنامہ کی ضرورت تھی۔ بھٹو صاحب پیسوں کے معاملے میں کافی کنجوس تھے اور پارٹی کے پاس فنڈز نہیں تھے، مگر عوام کی طاقت کا خزانہ تھا۔

اپریل 1970ء میں روزنامہ مساوات نکالنے کی تیاری شروع ہوئی۔ اخبار کے لئے اپنا پریس ہونا ضروری تھا۔ پاکستان میں روٹری پریس جہلم میں بننے لگا تھا۔ میں، رامے صاحب اور اکرام جہلم گئے اور پریس کا آڈر دے کر آ گئے، اس امید پر کہ رقم کا بندوبست کسی نہ کسی طرح ہو ہی جائے گا۔ اس وقت اس پریس کی قیمت ستر ہزار روپے طے ہوئی تھی۔ نصرت میں ہم نے اعلان چھاپنا شروع کیا کہ ''پارٹی کارکن اور تنظیمیں اس عظیم عوامی منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے جلد از جلد رقم کا بندوبست کریں۔ ایک شخص دس روپے سے بیس ہزار روپے تک رقم لگا سکتا ہے اور یہ رقم بعد میں کمپنی کے حصص میں بدل جائے گی۔ اس کے مطابق کاروبار میں باقاعدہ شرکت دی جائے گی۔ اس طرح مساوات کی پالیسی نہ صرف عوامی ہوگی بلکہ اس کی ملکیت بھی عوامی ہوگی۔ منجانب محمد حنیف رامے رکن اصولی کمیٹی پاکستان پیپلز پارٹی۔''

ابتدائی طور پر مساوات کا دفتر ماہنامہ ''ادب لطیف'' واقع بیرون اردو بازار کے اوپر دو کمروں میں بنایا گیا۔ جس میں ابھی تک وہ کرسی موجود تھی جس پر بیٹھ کر کرشن چندر ماہنامہ ''ادب لطیف'' کی ادارت کرتے تھے۔ اس کرسی کا استعمال میرے لئے باعثِ افتخار تھا۔

غریب کارکن دس دس روپے لے کر آنے لگے۔ ایک روز ایک بوڑھا شخص سو روپے لے کر آیا۔ اس کے ہاتھوں میں لگے کتھے اور چونے کی رنگت سے لگتا تھا کہ اس کی پان سگریٹ کی دکان ہے۔ ایک غریب کارکن کے لئے سو روپے کی رقم ان دنوں میں بڑی رقم تھی۔ میں نے اس کو سمجھانا چاہا کہ اخبار منافع کا کاروبار نہیں ہے۔ (کم از کم اس وقت نہیں تھا) اور آپ کے دس روپے بھی ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ آپ یہ رقم واپس لے لیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے کہا کہ میں اگر اپنی ساری عمر کی پونجی تو کیا اپنی زندگی بھی بھٹو پر نچھاور کر دوں تو بہت کم ہے۔ عوام کا یہ جذبۂ ایثار و قربانی ہی پیپلز پارٹی کی اصل طاقت تھا۔ مساوات کے اجرا کی تاریخ کا اعلان ہوگیا۔ 70-7-7 یعنی 7/جولائی 1970ء۔ لیکن دس دس روپے سے ہزاروں کی رقم بالخصوص پریس کی مشینری کی رقم جمع نہ ہوسکی۔ وقت تیزی کے ساتھ گزر رہا تھا۔

ایک رات جب ''البیان'' میں ''نصرت'' کی کاپیاں جوڑی جارہی تھیں، رامے صاحب برابر والی بند دوکان کے باہر والے تھڑے پر لیٹے سوچوں میں غرق تھے۔ اثر چوہان حسب معمول آئے تو مساوات کے اجرا سے متعلق انتظامی امور، دفتر، صحافیوں کی بھرتی وغیرہ پر بات ہوتی رہی مگر اصل پریشانی سرمایہ نہ ہونے کی تھی۔ میں اگلے روز سرگودھا گیا۔ والد صاحب سے ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کہ فوری طور پر تو سیٹلائٹ ٹاؤن میں جو دوسرا نیا گھر تعمیر کیا گیا ہے اس کو بیچ کر ہی رقم حاصل کی جاسکتی ہے۔ میں واپس آ گیا۔ ایک ہفتہ کے بعد والد صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ جلدی میں بیچنے کی وجہ سے مکان اونے پونے بک گیا ہے اور اگلے ہفتے مکمل رقم مل جائے گی تم آ کر لے جاؤ۔ میں نے رامے صاحب کو بتایا کہ رقم کا بندوبست ہوگیا ہے اب آپ اطمینان سے دیگر معاملات پر توجہ

دیں۔ میں نے جب تمام رقم کیش کی شکل میں لا کر ان کے حوالے کی تو انہیں یقین نہیں آیا۔ ان کے مشورے پر میں نے یہ رقم اپنے بنک میں جمع کروادی۔

بھٹو صاحب کے ساتھ ملاقات میں بقول رامے صاحب طے پایا کہ مساوات لمیٹڈ کے پانچ ڈائریکٹرز ہوں گے۔ بھٹو صاحب اور بیگم بھٹو، حنیف رامے اور بیگم شاہین رامے اور علی جعفر زیدی۔ رامے صاحب نے اپنا اور بیگم کا حصہ ہفت روزہ نصرت کی Good Will کے عوض میں حاصل کیا تھا۔ اسی دوران بھٹو صاحب لاہور آئے اور رامے صاحب نے ان سے ملاقات کے بعد مجھے آ کر کہا کہ ''آپ ایسا کریں کہ ماہنامہ ''طلوع اسلام'' کا پریس فروخت ہو رہا ہے آپ اسے خرید لیں اور اگر کبھی مساوات پریس پر مشکل وقت آیا تو ہمارے پاس متبادل پریس موجود ہوگا اور کاروباری اعتبار سے بھی آپ فائدے میں رہیں گے۔'' میں ہکا بکا اس تمہید کے بعد ان کی تقریر سنتا رہا۔ وہ معلوم نہیں کس فائدے اور نقصان کی بات کر رہے تھے۔ مگر اس سارے معاملے کا ایک نقصان مجھے ضرور ہوا اور وہ یہ کہ میرے چھوٹے بھائیوں میں سے ایک نے ہمارے مکان کے اس طرح سے بکنے کو ایک مدت تک نہیں بھلایا۔ اب مساوات کے انتظامی امور ہوں یا صحافیوں کا انتخاب یا تقرری، رامے صاحب مجھ سے آنکھیں چرانے لگے۔ بعد میں پتہ چلا کہ بھٹو صاحب کے علم میں یہ تمام معاملات لائے ہی نہیں گئے تھے۔

دراصل رامے صاحب مساوات کے انتظامات و معاملات کو بلاشرکت غیرے چلانا چاہتے تھے۔ پہلے انہوں نے اپنے دوست سلیم شیخ کو جوان کا فری میسنری بھائی تھا، جنرل مینجر مقرر کیا پھر اس کو نکال کر اپنے بھانجے محمد اکرام کو، جو صرف اردو میں اپنے دستخط کرنا جانتا تھا جنرل مینجر مقرر کر دیا۔ اب میں نے زندگی کو سنجیدگی اور گہرائی سے دیکھنا شروع کر دیا اور حقیقتوں کے اندر کی حقیقتیں نظر آنے لگیں۔

حسین نقی کے مشورے سے حنیف رامے نے مساوات کے لئے صحافیوں کا چناؤ کیا اور 23رجون 1970ء کو انہیں ملازمت نامے جاری کر دیئے گئے۔ نقی صاحب خود مساوات کی ٹیم کا حصہ نہیں بنے البتہ معاشیات پر ہفتہ وار کالم لکھتے تھے۔ فتح محمد ملک ڈپٹی

ایڈیٹر، احمد بشیر اسسٹنٹ ایڈیٹر، شفقت تنویر مرزا نیوز ایڈیٹر، منو بھائی چیف رپورٹر مقرر ہوئے اور اثر چوہان ملک بھر کے ضلعی نامہ نگاروں، ضلعی خبروں کے انچارج، جو زیادہ تر پیپلز پارٹی کے قائدین اور امیدواران قومی وصوبائی اسمبلی اور سیاسی کارکنوں کی ہوتی تھیں۔ سٹاف رپورٹرز میں ہمراز احسن، نوید بٹ، خادم حسین، چاچا رفیق میر، عاشق جعفری، زاہد عکاسی، محمد سلیم اور لیڈی رپورٹر نرگس پروین اور بعد میں نواز چودھری، ہدایت مرزا کا اضافہ ہوا۔ نیوز سیکشن میں شفٹ انچارج اور سب ایڈیٹرز میں الطاف احمد قریشی، مسعود سلمان، اطہر ندیم، اعجاز رضوی، توصیف احمد خان، اورنگ زیب، راشد چودھری، فاروق اختر، مظفر شیخ، محمد عارف، خلیل ملک، منیر الدین بابر، انور شاہد، وحید عثمانی وغیرہ تھے۔ مجید میر، حفیظ میر، محمد اظہر اور طاہر ملک فوٹو گرافر تھے۔ کالم نگاروں اور مضمون نگاروں میں ظہیر بابر، صفدر میر، ظہیر کاشمیری، خورشید عالم، منو بھائی، نذیر ناجی، ظہیر جاوید، عبدالقدیر اشک، وحید عثمانی اور کشور ناہید تھے۔

ریفرنس سیکشن کے انچارج ڈاکٹر رشید تھے۔ بعد میں آزاد کوثری بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئے۔ تائب رضوی، حفیظ راقب اور رفیق پروف ریڈر تھے۔ اس بھاری بھر کم ٹیم کو داتا دربار کے پڑوس میں ایک گھر کی نچلی منزل کو کرائے پر لے کر، فرنیچر ڈال کر، مساوات کا بورڈ لگا کر بٹھا دیا گیا۔ سات جولائی 1970ء کو روزنامہ مساوات جاری ہوگیا اور بھٹو صاحب نے آکر دفتر کا افتتاح کردیا۔

ہفت روزہ نصرت کی میری ٹیم میں بھی اضافہ ہوگیا۔ سعید شفقت کے علاوہ پروین ملک، منیر تاثیر اور شاہد اس میں آن شامل ہوئے۔

داتا دربار گو محکمہ اوقاف کے ماتحت تھا مگر اس کے مجاوروں میں سے کچھ لوگ پیشہ ور بدمعاش تھے۔ جواء، چرس، افیم، ہیروئن، عورتوں کا کاروبار، گھر خالی کروانا یا گھر پر قبضہ کروانا جیسے جرائم اور وارداتیں ان کی سرپرستی میں ہوتی تھیں۔ جب انہیں پتہ چلا کہ اخبار کا دفتر وہ بھی بھٹو صاحب کے اخبار کا دفتر ان کے پڑوس میں آ گیا ہے تو پہلے ان کو پریشانی ہوئی۔ کچھ دنوں تک انہوں نے لنگر کا کھانا بھجوایا۔ ان کے جرائم میں وقتی طور پر کمی ہوئی اور

پھران کے حالات معمول پر آ گئے۔

کونے والی عمارت کے برآمدے میں ساغر صدیقی دنیا و مافیہ سے بے خبر نشے کی حالت میں زمین پر مدہوش پڑے رہتے۔ کیا عظیم شاعر تھے ساغر صدیقی۔ اف، خدا کی پناہ۔ ان کی شاعری تو اپنے کال پر تھی ہی مگر ان کی لکھی ہوئی دھمال ''دمادم مست قلندر۔ سخی شہباز قلندر'' تو ہمیشہ کے لئے امر ہو چکی۔ برصغیر تو کیا دنیا بھر میں گائے جانے والی یہ دھمال یوں لگتا ہے گویا صدیوں سے گائی جا رہی ہو اور نہ جانے کب سے سندھ کی ثقافت کا یہ صوفیانہ کلام ہو۔ اس دھمال کی دُھن اپنے دور کے یعنی ہماری جوانی کے دور کے، چوٹی کے میوزک ڈائریکٹر اور فلم ڈائریکٹر ماسٹر عاشق حسین نے ترتیب دی تھی اور پہلی بار ملکہ ترنم نور جہاں نے ان کی فلم کے لئے اسے گایا تھا۔ آج اس دھمال کے گانے والوں کو یہ نہیں معلوم کہ یہ کلام ساغر صدیقی کا ہے جسے ماسٹر عاشق حسین کی دُھن نے بام عروج تک پہنچایا ہے۔ اس کو گانے والے فنکار لاکھوں روپوں میں بکتے ہیں جبکہ عاشق حسین لاہور کے ایک خستہ حال گھر میں کسمپرسی کی حالت میں اپنی زندگی کے آخری دن برداشت کر رہا ہے۔ اس کا وہ بیٹا بھی جو پکوڑے بیچ کر اس کی کفالت کرتا تھا دل کا دورہ پڑنے کے بعد انتقال کر چکا ہے۔ بہت باہمت ہیں عاشق حسین جیسے ہمارے خود دار آرٹسٹ اور بہت ظالم ہے ہمارا معاشی، معاشرتی نظام اور اس کے حکمران، انسانی حقوق کی علمبردار این۔ جی۔ اوز بھی چن کر اپنی پسند کے کیس پکڑتی ہیں۔

ساغر صدیقی اتنا بڑا شاعر تھا کہ کئی شاعر ''نامور شاعر'' بننے کے لئے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرتے، ایک غزل یا نظم کے عوض بیس یا پچیس روپے بہت احترام کے ساتھ پیش کرتے اور بڑا شاعر بننے نکل پڑتے۔ ان میں سے اکثر کی شاعری ساغر صدیقی کے انتقال کے ساتھ ہی دفن ہو گئی۔

روزنامہ مساوات خبروں کے محاذ پر اور نصرت نظریاتی محاذ پر عوام کی جنگ لڑتے رہے۔ دونوں نے عوام کی خدمت کی، دونوں عوام کی طاقت بنے، آمریت کے جبر، 113

مولویوں کے کفر کے فتووں کے خلاف فکری و علمی محاذ پر اسلامی سوشلزم کی نظریاتی جنگ جیتی۔ سوشلزم ہماری معیشت ہے کا راستہ ہموار کیا اور عوام کو ایک ایسے مرکز پر لا کھڑا کیا جہاں سے عوامی حاکمیت کا راستہ نظر آتا تھا۔ عوام آندھی کی طرح ملکی سیاست پر چھاتے چلے گئے، ان کے لئے ہر صبح امید کی روشنی لے کر نمودار ہوتی اور بالآخر انہوں نے پیپلز پارٹی کو ووٹ دے کر کامیاب کرا دیا۔ 7 ردسمبر 1970ء کو قومی اسمبلی اور 17 ردسمبر 1970ء کو صوبائی انتخابات میں بالخصوص پنجاب اور سندھ میں پیپلز پارٹی کو جو شاندار کامیابیاں حاصل ہوئیں ان میں ''نصرت'' اور ''مساوات'' کا کردار نا قابل فراموش ہے۔

ینگ پیپلز فرنٹ اور ڈاکٹر عزیز الحق

جب پیپلز پارٹی قائم ہوئی تو پنجاب میں ترقی پسند طالب علموں کی باقاعدہ کوئی تنظیم نہیں تھی۔ این ایس ایف سندھ کی حد تک فعال تھی اور پنجاب میں ابھی قدم جمانا شروع کئے تھے۔ شفیق مرحوم کراچی سے لاہور آ گئے تھے اور کل وقتی تنظیمی کام میں مصروف تھے۔ لاہور میں ان کے ساتھ ممتاز بھی نظر آتے تھے۔ پرویز رشید این ایس ایف پنجاب کے صدر تھے۔

ڈھاکہ میں طالب علموں کی تحریک بہت مضبوط تھی۔ وہاں کا طالب علم سیاست دانوں سے بہت آگے تھا۔ اندرون سندھ، سرحد اور بلوچستان میں طالب علموں کی تنظیمیں قومی رہنماؤں کے زیر اثر تھیں، ان کی سیاست قومی سوال کے حوالے سے تھی۔ پنجاب کے تعلیمی اداروں میں طلبا یونین، مشاعرے، ڈرامے اور مباحثے کروانے والی سوشل تنظیمیں تھیں۔ البتہ پنجاب یونیورسٹی ایک شہر تھا۔ اس کے طلبا کی تعداد سات ہزار تھی جس میں سے تین ہزار کیمپس پر رہتے تھے۔ جماعت اسلامی کا طالب علم فرنٹ اسلامی جمعیت طلبا منظم بھی تھا اور مولانا مودودی، شیخ محمد بن عبدالوہاب اور سید قطب کے نظریاتی ڈنک اور لاٹھی گولی سے مسلح بھی۔ پنجاب یونیورسٹی میں جماعت اسلامی کے کل وقتی تنخواہ دار ممبر (صالحین) طالب علم بنے ہوئے تھے اور ہاسٹلز میں سالوں سے ڈیرہ جمائے ہوئے تھے۔

اس ماحول میں ڈاکٹر عزیز الحق نے کینیڈا سے واپس آ کر ترقی پسند طالب علموں میں نہ صرف نظریاتی جان ڈالی بلکہ پروفیسر عزیز الدین کے ساتھ مل کر انہیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا شروع کیا۔ طالب علموں اور اساتذہ میں انہیں پروفیسرز گروپ کے نام سے

پکارا جانے لگا۔ دونوں چین نواز مارکسٹ تھے۔ پروفیسر عزیز الدین میں بے پناہ تنظیمی صلاحیت تھی جبکہ ڈاکٹر عزیز الحق ایک ایسا عظیم مارکسٹ دانشور تھا جس پر حالات وواقعات کو سائنسی انداز میں سمجھنے اور سمجھانے کی بارش ہوتی تھی۔ زاہد چودھری بھی چین سے واپس آ چکے تھے۔ زاہد چودھری اور ڈاکٹر عزیز الحق کی فکری گونج اور سچائی کی خوشبو نے بہت تیزی سے لاہور کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

1968-69ء کی طلباء تحریک کے دوران یونیورسٹیاں اور کالج بند تھے۔ جب یحییٰ خان نے مارشل لا نافذ کر کے اقتدار پر قبضہ کیا اور پنجاب یونیورسٹی اور کالج کھلے تو پروفیسر عزیز الدین اور ڈاکٹر عزیز الحق نے طے کیا کہ طالب علموں کی باقاعدہ تنظیم کھڑی کی جائے۔ ترقی پسند طالب علم لارنس گارڈن میں جمع ہوئے اور NSO کی بنیاد رکھی گئی۔ بعد میں پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس کے لان میں ایک اجتماع ہوا اور NSO کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔

NSO نے بہت تیزی سے پنجاب یونیورسٹی اور لاہور کے کالجوں میں قدم جمائے اور یونیورسٹی کے انتخابات میں حصہ لینا شروع کیا۔ 1970ء میں جب پیپلز پارٹی نے انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کیا تو این ایس او میں پہلا اختلاف پیدا ہوا اور وہ اس بات پر کہ انتخابات میں پیپلز پارٹی کی حمایت کی جائے یا مخالفت۔ ڈاکٹر عزیز الحق اس بات کے حق میں تھے کہ پیپلز پارٹی کی حمایت کی جائے اور پیپلز پارٹی کے کارکنوں میں کام کرتے ہوئے ان کو انقلابی نظریات سے لیس کیا جائے۔ جبکہ پروفیسر عزیز الدین اس کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پیپلز پارٹی ایک بورژوا پارٹی ہے اس لئے اس کا ساتھ نہیں دیا جانا چاہیے۔ اکثریت نے ڈاکٹر عزیز الحق کا ساتھ دیا جبکہ چند پروفیسر عزیز الدین کے ساتھ رہے۔ NSO تقسیم ہونے لگی۔

مشرقی پاکستان میں 1971ء کے آرمی ایکشن پر دونوں کے درمیان شدید اختلاف پیدا ہوا اور پروفیسرز گروپ تقسیم ہو گیا۔ ڈاکٹر عزیز الحق کا خیال تھا کہ بنگالیوں کی حق خودارادیت کی جدوجہد میں ان کی حمایت کی جائے جبکہ پروفیسر عزیز الدین احمد اس

کے حق میں نہیں تھے۔ان کا خیال تھا کہ چونکہ یہ جدوجہد بورژواژی کر رہی ہے اس لئے اس کا ساتھ نہیں دیا جاسکتا۔ پروفیسرز تقسیم ہو گئے تو این ایس او بھی تقسیم ہو گئی۔ بہت سے ممبران این ایس او کو چھوڑ کر ینگ پیپلز فرنٹ میں شامل ہو گئے جو ڈاکٹر عزیز الحق نے قائم کیا تھا۔ ینگ پیپلز فرنٹ بہت تیزی سے مقبول ہونے لگا۔اس کے سٹڈی سرکلز اور پمفلٹس نے لاہور کے نوجوان ترقی پسندوں کو مارکسزم اور سوشلسٹ نظریات کو سمجھنے کی ایک ٹھوس بنیاد فراہم کی۔

ڈاکٹر عزیز الحق نے اپنے کینیڈا کے قیام کے دوران کیمونسٹ پارٹی آف کینیڈا کے ہردیال سنگھ بینز کے ساتھ کام کیا تھا جس کا ان پر اثر تھا اور پاکستان آنے کے بعد زاہد چودھری کی صحبت کا ان پر گہرا اثر تھا۔ زاہد چودھری اور ہردیال سنگھ بینز کا پاک بھارت قومی تضاد پر ایک جیسا تجزیہ تھا۔ ہردیال سنگھ جب کبھی بھارت جاتے ہوئے لندن رکتے تو میرے ساتھ ملاقات کا ہونا ان کے پروگرام میں ہمیشہ شامل ہوتا۔طفیل عباس سے بھی ان کی ملاقاتیں رہی تھیں۔

ینگ پیپلز فرنٹ میں ڈاکٹر عزیز الحق کے ساتھ خالد محبوب لڈو، منظور اعجاز، انوار الحق، عزت مجید، زبیر رانا اور دیگر مزدور رہنما، سعید احمد اور مسز سعید (رابعہ سنبل) افتخار جالب، طارق لطیف، طارق رحمن، منور حیات، شاہد محمود ندیم، سمیع اللہ ظفر اور ہمراز احسن دن رات سرگرم تھے۔ حلقہ ارباب ذوق ہو یا پاک ٹی ہاؤس ڈاکٹر عزیز الحق کا انتظار ہونے لگا۔ پاک ٹی ہاؤس ایک ادارہ تھا جہاں پر نئے لکھنے والے، پرانے لکھنے والے، شاعر، ادیب، صحافی، تنقید نگار، تخلیق کار خواہ رجعت پسند ہوں یا ترقی پسند، سب ہی موجود ہوتے تھے۔ ناصر کاظمی، منیر نیازی، ظہیر کاشمیری، انتظار حسین، افتخار جالب، حبیب جالب، شہزاد احمد، اطہر ندیم، زاہد ڈار، سعادت سعید، انیس ناگی، احمد مشتاق، کشور ناہید، یوسف کامران، منو بھائی، شفقت تنویر مرزا، عباس اطہر، حسین نقی، شاہد محمود ندیم، حسن جعفر زیدی، منظور اعجاز، عدیم ہاشمی، ناصر زیدی، غرضیکہ لاہور کا شاید ہی کوئی تخلیق کار ہو گا جو ان دنوں پاک ٹی ہاؤس اور حلقے کے اجلاس میں نظر نہ آتا ہو۔ میں، سعید شفقت اور

خورشید عالم بھی گا ہے بگا ہے چکر لگا لیتے۔ پنجابی ادبی سنگت بھی تھی جس میں تنویر ظہور، شفقت تنویر مرزا اور سبط الحسن ضیغم وغیرہ تھے۔

عزیز الحق کا خیال تھا کہ دانشوروں کا طبقہ جو کہ معاشرے میں نظریات اور تصورات کے رخ کا تعین کرتا ہے اگر سوشلسٹ انقلاب برپا کرنے کے لئے تیار ہو جائے تو عوامی انقلاب کے فاصلے اور وقت کو کم کیا جا سکتا ہے۔ مظلوم کو یہ تو معلوم ہے کہ ظالم کون ہے۔ اس کو یہ نہیں معلوم کہ ظالموں سے نجات کا راستہ کیا ہے۔ استحصالی نظام کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے۔ مزدور کسان کو یہ نہیں معلوم کہ انتخابات کے ذریعے سوشلسٹ نظام کو اپنایا جا سکتا ہے یا انقلاب کے ذریعے۔ اور یہ کہ جب تک عوام اقتدار حاصل نہیں کرتے جن کی اکثریت کا تعلق مزدور کسان اور محنت کش طبقے سے ہے ان کے مسائل کا حل ہونا ناممکن ہے۔ یہ دانشور طبقہ ہی ان کو ذہنی راہنمائی فراہم کر سکتا ہے۔ چنانچہ عزیز الحق کی گرما گرم بحثیں برف کو پگھلانے کا کام کر رہی تھیں۔

ڈاکٹر نے ''گل و بلبل'' کی دنیا کو Existentialism اور مارکسزم کی طرف موڑ دیا۔ حلقے کی علمی اور ادبی بحثیں اب جدلیاتی مادیت کے حوالے سے ہونے لگیں۔ انتظار حسین اور دیگر رجعت پسند اس صورت حال سے پریشان تھے۔ فلسفے کی ٹھوس شکل کے مقابلے میں روایت کا جال بن لینا انسانی ذہن کے لئے آسان بات ہے۔ چنانچہ سہل پسندوں نے حلقۂ ارباب ذوق ادبی کے نام سے الگ تنظیم بنالی اور اپنی گل و بلبل کی دنیا میں جا بیٹھے۔ دنیا کہیں اور جا رہی تھی۔ وہ اپنی ادب برائے ادب کی دنیا سے باہر نہیں آنا چاہتے تھے۔

1972ء میں ینگ پیپلز فرنٹ نے قائم ہونے کے بعد فیروز پور روڈ پر ایک دفتر بنالیا تھا۔ مزدوروں اور کسانوں میں اس کا کام تیزی سے پھیلنے لگا۔ پنجاب میں فرنٹ کے سٹڈی سرکل جگہ جگہ کھلنے لگے۔ بھٹو صاحب نے جب مختار رانا کو جیل میں ڈال کر پارٹی کے اندر بائیں بازو کے افراد کو ایک طرح سے پیغام دیا تو اس وقت فرنٹ فیصل آباد (لائل پور) میں کافی فعال ہو چکا تھا۔ مختار رانا جیل میں تھے۔ ان کی قومی اسمبلی کی نشست پر ان کی بہن زرینہ رانا انتخاب لڑ رہی تھیں۔ ان کی انتخابی مہم میں مدد کرنے کے لئے لاہور سے ڈاکٹر

عزیز الحق اور ان کے ساتھی فیصل آباد گئے۔ ان میں گوجرانوالہ کے ایک ابھرتے ہوئے سرمایہ دار سعید احمد اور ان کی بیگم رابعہ سنبل بھی موجود تھیں۔ نظریاتی اختلافات میاں بیوی کے درمیان موجود تھے۔ لائل پور قیام کے دوران بحث و تمحیص میں شدت آ گئی۔ سعید احمد نے ان کے ساتھ واپس سفر کرنے سے انکار کر دیا اور پھر لاہور آ کر عزیز الحق اور رابعہ سنبل کو جو کہ لڈو کے گھر کے باہر کار میں بیٹھے تھے گولیاں مار کر اپنے آپ کو بھی گولی مار لی۔ سعید احمد اور ڈاکٹر عزیز الحق موقع پر ہی انتقال کر گئے جبکہ رابعہ زندگی و موت کی کشمکش میں رہنے کے بعد زندہ بچ گئیں۔ اس طرح پاکستان ایک ایسے عظیم مارکسٹ دانشور سے محروم ہو گیا جس نے مستقبل میں بہت دور تک اندھیروں کو چاک کرنا تھا، اجالا کرنا تھا۔

سوشلسٹوں کے قتل عام کا منصوبہ

قرآن جلائے جانے کا واقعہ

جن دنوں ایوب خان کے خلاف عوامی تحریک زوروں پر تھی۔ ایوب خان کی حکومت اور تمام غیر عوامی عناصر کا آپس میں گٹھ جوڑ تھا۔ دس سال کے قومی جمود کے بعد ہم میں بطور قوم عمل کی آگ بھڑکی تھی اور ایک ایسی راہِ عمل کی تلاش شروع ہوئی تھی جو اس آگ کو، اس تحریک کو، ایک عوامی انقلاب میں ڈھال سکے۔ یہ خطرہ سروں پر منڈلا رہا تھا کہ کہیں مارشل لا نہ لگا دیا جائے۔ ساتھ ساتھ بھارت کی فوجی تیاریوں کی خبریں زور پکڑ رہی تھیں۔ روزنامہ ڈان کے مضامین ''غیب'' سے آ رہے تھے۔ یہ کیفیت ہی کافی پریشان کن تھی کہ جماعتِ اسلامی نے ایک شر انگیز فتنہ کھڑا کر دیا۔

جماعت اسلامی کافی عرصے سے پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی کے خلاف سرگرم عمل تھی اور پراپیگنڈہ کر رہی تھی کہ یہ دونوں جماعتیں اسلام دشمن ہیں اور یہ کہ ذوالفقار علی بھٹو اور مولانا بھاشانی اور ان کے کارکن کافر ہیں۔ جب پاکستان کے عوام نے اس پراپیگنڈا پر کان نہ دھرا، ان دونوں جماعتوں کے سوشلسٹ معیشت کے پروگرام کے ذریعے انہیں اپنے مسائل اور پریشانیوں کا حل نظر آنے لگا تو جماعت اسلامی نے عوام کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرنے کا ایک نیا حربہ اختیار کیا۔

لاہور میں جماعت اسلامی کے ایک دفتر واقع انارکلی پر ایک مشتعل ہجوم نے حملہ کر دیا اور اس کا فرنیچر توڑ ڈالا اور بعض کاغذات کو نذر آتش کر دیا۔ یہ مشتعل ہجوم نیشنل عوامی

پارٹی کے اس جلسے سے واپس ہو رہا تھا جہاں مولانا عبدالحمید بھاشانی کی تقریر کے دوران جماعت اسلامی کے کارکنوں نے بار بار ہنگامہ آرائی کی تھی اور پتھر بازی بھی کی تھی۔ جماعت نے فوراً یہ افواہ اڑا دی کہ سوشلسٹوں نے قرآن پاک کو جلا دیا ہے۔ مختلف افراد نے اس آگ کو بجھانے اور اس شرانگیز خبر کی تصدیق کرنا چاہی تو لوگوں کو آگ کے قریب جانے سے روک دیا گیا۔ اخبارنویسوں نے بھی اس کی تصدیق چاہی تو جماعت کے کارکنوں نے آگ میں سے کوئی ایک پرزہ بھی نکالنے سے انہیں روک دیا۔ بعد میں جب ایک صحافی اوپر دفتر جانے میں کامیاب ہوا تو ایک جماعتی کارکن کمرے میں داخل ہوا اور الماری کے اوپر ایک بڑی کتاب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا کہ دیکھئے۔ ''یہ قرآن جل گیا۔'' جب اس اخبارنویس نے اس کتاب کو کھولا تو وہ ایک کیش رجسٹر تھا۔ یہ خبر رپورٹر نے دی اور خبر رساں ایجنسی سے جاری ہوئی۔ جماعت اور جمعیت کے کارکنوں نے اس دفتر میں جا کر توڑ پھوڑ کی اور کارکنوں کو دھمکیاں دیں۔ اس کے کچھ گھنٹوں بعد جماعت کے کارکن مولانا مودودی کی تفہیم القرآن کی ایک جلد لوگوں کو دکھانے لگے جس کے اندر کے کاغذات جلے ہوئے تھے مگر جلد محفوظ تھی اور اوراق کے کناروں پر دھوئیں کی سیاہی بھی نہیں تھی۔ اخبارنویسوں کو دھمکیاں دی گئیں تھیں کہ وہ کیش رجسٹر کی بات خبروں میں نہ لکھیں۔ یہ واقع مارچ 1970ء کا ہے۔

سوشلسٹوں کا خون بہانے کے لئے یہ ڈرامہ رچایا گیا تھا۔ چونکہ CIA کا یہی ہتھکنڈہ انڈونیشیا میں کامیاب ہوا تھا۔ مذہب کے نام پر امریکی مفادات کا تحفظ کرتے ہوئے وہاں کی جماعت اسلامی (مسجومی پارٹی) نے دس لاکھ معصوم سوشلسٹ مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا اور صدر سوئیکارنو کی حکومت کا تختہ الٹا تھا۔ اب پاکستان میں امریکہ جماعت اسلامی کے ذریعے یہ تجربہ دہرانا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لئے امریکی سفیر فارلینڈ کو انڈونیشیا سے تبدیل کرکے پاکستان میں تعینات کیا گیا تھا۔

میں اور رائے صاحب جمعہ کے روز چھٹی کرتے تھے۔ مگر میں کبھی کبھار دوپہر کو دفتر میں آجاتا تھا۔ یہ دن میں نے پارٹی کے ان کارکنوں سے ملاقات کے لئے رکھا ہوا تھا

جو دور دراز سے لاہور آتے، پارٹی کے رہنماؤں سے ملتے یا نہ ملتے مگر ''نصرت'' کے دفتر ضرور آتے، اپنے علاقے کی تنظیم کے لئے لٹریچر خریدتے، ملاقات کرتے اور ایک اطمینان قلب کے ساتھ واپس جاتے۔

اس روز رامے صاحب کا مجھے فون آیا کہ آج دفتر مت جانا۔ خطرہ ہے کہ جماعت کے غنڈے دفتر پر حملہ نہ کر دیں۔ میں نے کہا کہ اگر انہوں نے حملہ کرنا ہے تو پھر ہمارے دفتر میں بھی کلام پاک کے بہت سے نسخے ہیں، تفاسیر ہیں اور یہ کہ میں سید ہوں، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آل میں سے ہوں، اگر انہوں نے یہ سب کچھ جلایا اور مجھے نقصان پہنچایا تو نہ صرف یہ کہ جماعت اسلامی کا اسلام اور قرآن پاک سے ان کی محبت کا بھرم کھل جائے گا بلکہ عوامی تحریک کو مزید تقویت ملے گی۔

میں حسب معمول دفتر آیا۔ پتہ چلا کہ ملتان میں پیپلز پارٹی کے دفتر اور نیشنل عوامی پارٹی کے جنرل سیکرٹری کی کتابوں کی دکان اور دیگر دکانوں کو جماعت اسلامی کے کارکنوں نے نذر آتش کر دیا۔ جس میں کلام پاک اور مولانا عبیداللہ سندھی کی تفسیر قرآن اور دیگر مذہبی کتابیں نذر آتش ہوئیں۔ دن دہاڑے لوگوں نے ان مقدس کتابوں کو جماعت کے ہاتھوں جلتے دیکھا تو ان کے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ شفقت تنویر مرزا اُس وقت امروز میں تھے۔ انہوں نے بروقت اس خبر کو تفصیل کے ساتھ اور جلی سرخیوں کے ساتھ اس روز کے اخبار میں چھاپا۔ حسین نقی اس وقت پی پی آئی نیوز ایجنسی لاہور کے چیف رپورٹر تھے۔ انہوں نے رپورٹر (مرحوم) محمد اصغر کی کیش رجسٹر کو قرآن بتانے والی خبر چلائی۔ جماعت اسلامی کے منصوبہ قتل عام کا پردہ چاک کیا تو انہیں نوکری سے نکال دیا گیا۔ اس وقت پی پی آئی کے چیف ایگزیکٹو ایک نہایت متشدد رجعت پسند بشیر قریشی تھے۔

جب اخبارات نے جماعت اسلامی کے منصوبے کے مطابق عامتہ المسلمین کے درمیان فتنہ وفساد کو بھڑکانے والی افواہوں کے بجائے اصل واقعات پر مبنی خبریں دینا شروع کیں تو یہ کلمہ گو اخبار نویس بے دین اور ملحد قرار دے دیئے گئے۔ مودودی جماعت کی سازش کو ناکام بنانے اور حقیقت کو عوام تک پہنچانے میں جن اخبارات اور اخبار نویسوں نے

قتل کی دھمکیوں کے باوجود اپنا فریضہ انجام دیا اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خون میں ہاتھ رنگنے سے بچایا۔ اس کی مثال اس ملک کی صحافت میں مشکل سے ملے گی۔

اس کے ساتھ ہی مزدوروں نے ملک گیر ہڑتال کی۔ لاہور کے ایک عظیم تاریخی اجتماع سے مرزا ابراہیم، بشیر بختیار اور دیگر مزدور رہنماؤں نے حق گوئی اور بے باکی کا نمونہ پیش کیا اور جماعت اسلامی کے منصوبہ قتل عام کا پردہ چاک کیا۔ اس طرح ایک بڑے پیمانے پر مسلمانوں کے قتل عام کا منصوبہ ناکام ہوگیا۔ بعض حلقوں کی جانب سے یہ اطلاع بھی سامنے آئی کہ امریکی سفارت خانے نے پاکستان کے ایک بینک سے خطیر رقم نکلوائی اور جماعت نے یہ رقم وصول کی۔ کچھ روز بعد مولانا مودودی نے اس الزام کی تردید کی۔ اس دوران اسلام فروشوں نے لاہور مال روڈ پر موجود ترقی پسند کتابوں کی دکان 'کلاسیک' کو جلا ڈالا۔

جماعت اسلامی کا اسلام کبھی حصول پاکستان کے لئے قائداعظم کی جدوجہد اور تحریک سے خطرے میں تھا، کبھی بیگم لیاقت علی کے غرارے سے ان کا امریکی اسلام خطرے میں تھا، کبھی مزدوروں کے جلوسوں سے، کبھی اپنے حقوق کے حصول کے لئے عوام کے ابھرتے ہوئے سیلاب سے، کبھی بھٹو آ گیا میدان میں، ہے جمالو، کے والہانہ طربیہ رقص سے، سوشلزم سے، پیپلز پارٹی کے قیام سے، ذوالفقار علی بھٹو سے، ہر وقت جماعت کا امریکی سعودی برانڈ اسلام خطرے میں تھا۔

جماعت اسلامی کے خالق مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، جن کا اصلی نام محمد حسین چشتی تھا اور وہ اپنے آپ کو اعلیٰ کا باپ کہلواتے تھے (برصغیر کے مسلمانوں میں لفظ اعلیٰ خدا کی ذات کے لئے استعمال ہوتا ہے) سوشلزم زندہ باد کہنے والوں کی زبانیں گدی سے کھینچنے اور ان کو گنگ کرنے اور خاموش کرنے کا اعلان کر رہے تھے۔ انہوں نے کوشش کی کہ ملک بھر میں ''زبان کھینچ کمیٹیاں'' بن سکیں مگر اس وقت کے عوام باشعور تھے اور عوام کا سیلاب روز بروز طاقت ور ہوتا جا رہا تھا۔

اپنی طرز کے اسلام کی یہ جماعت جو رسولوں، صحابیوں، صوفیوں اور عالموں کی توہین کرتی چلی آئی تھی اب پاکستان میں خانہ جنگی کی فضا تیار کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ سعودی

عرب اور امریکہ اس کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ سعودی عرب کے فرمانرواؤں نے مکہ اور مدینہ میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے، ان کو اپنے جیسا انسان قرار دے کر، ان کی اور ان کے اہل بیت وصحابہ کرام کی نشانیاں مسمار کر دی تھیں۔ فتوے لگا کر جنت البقیع، جنت المعلیٰ میں مزارات کو تڑوایا گیا تھا۔ ان کے یہ ایجنٹ حضرات اب پاکستان میں بھی اولیائے کرام کے مزار کھدوانا چاہتے تھے۔

صوفیا نے بلھے شاہ کی زبان میں روٹھے ہوئے یار کو منانے کے لئے "کر کے تھیا تھیا" اور سخی شہباز قلندر نے جس رقص سرمدی کا آغاز کیا اور صاحبان حال نے سماع کی محفلوں کو زندہ رکھا۔ جماعت اسلامی اس کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

گلف انسٹیٹیوٹ کے مطابق مکہ اور مدینہ میں موجود 1000 سال یا اس سے بھی زیادہ پرانی عمارات میں سے 90 فی صد کو پچھلے بیس سالوں میں گرادیا گیا ہے۔ ان کو منہدم کر کے ان کی جگہ شاپنگ مال اور ہوٹل بنا دیئے گئے ہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ خانۂ خدا مسجد الحرام یعنی کعبۃ اللہ کے اردگرد بنائی گئی ان عالیشان عمارتوں، جہاں پر حج اور عمرہ کرنے والے مسلمان ٹھہرتے ہیں، کے باتھ روم یعنی بیت الخلا خانہ کعبہ کی عمارت سے کہیں بلند ہیں۔ وہ کھڑکی میں سے خانہ کعبہ کی زیارت بھی کرتے ہیں اور اس سے بلند ہو کر رفع حاجت بھی۔ یہ خانہ کعبہ کا مذاق اڑایا گیا ہے اور اس کی بے حرمتی کی گئی ہے۔

سعودی حکومت نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش کی جگہ کو گرا کر وہ گھنٹہ گھر تعمیر کیا ہے جسے دیکھ کر حاجی حضرات ماشاء اللہ کی تسبیح کرتے ہیں۔ حضرت خدیجہؓ کے گھر کو گرا کر اس کی جگہ غسل خانے بنائے گئے ہیں۔ آل سعود، سعودی حکمرانوں نے توہین رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہے اور توہین خدا کے مرتکب ہوئے۔ ان گستاخ شان رسول وخدا پر ضیاالحق کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق اس وقت مقدمہ چلایا جانا چاہیے جب وہ پاکستان میں داخل ہوں۔ ان کے پیروکار جو داتا صاحب سے لے کر عبداللہ شاہ غازی کے مزار تک مسجدوں، امام بارگاہوں، جلوسوں میں معصوم اور نہتے مسلمانوں پر بم برساتے پھرتے ہیں ان پر بھی ضیاالحق کا قانون نافذ ہونا چاہیے۔

ضیا الحق کے زمانے میں ان عوامل کو ریاستی پشت پناہی حاصل ہوئی۔ مذہبی دہشت گردی، مذہبی جنونیت کو نہ صرف تقویت ملی بلکہ اس کو ایک منظم شکل دی گئی، دینی مدرسوں سے طالبان تیار ہوئے۔ اسامہ بن لادن کی سربراہی میں امریکہ اور برطانیہ نے روس کے خلاف پاکستان کو اس جنگ میں ملوث کیا جو بظاہر اسلام کے نام پر لڑی گئی مگر یہ امریکی مفادات کے اس خطے میں تحفظ کی جنگ تھی اور یہ جنگ آج تک جاری ہے۔ طالبان، القاعدہ، دہشت گرد تنظیمیں سب مل کر اپنے عمل سے امریکہ کی اس خطے میں موجودگی کا جواز مہیا کر رہی ہیں۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ طالبان کا سلیبس نیبر اسکا یونیورسٹی میں تیار کیا گیا تھا اور وہاں کی چھپی ہوئی یہ کتابیں ابھی تک اُن کو پڑھائی جاتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ پاکستان میں بھی وہ مذہبی درس گاہیں جو انسانی بم بنانے کی فیکٹریاں بن چکی ہیں وہ بھی اس سلیبس کا استعمال کرتی ہوں۔

مگر اُس وقت یعنی 69-1968ء میں پاکستان میں بسنے والے مسلمان، مزدور کسان، طالب علم، ملازمت پیشہ افراد اور تمام محنت کش، پیپلز پارٹی اور مولانا بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی کے سوشلزم اور عوامی جمہوریت کے پروگرام کو سر آنکھوں پر بٹھا چکے تھے اور اس کے لئے ہر قربانی دینے کو تیار تھے اور امریکہ اور اس کے حواری اس صورت حال سے گھبرائے ہوئے تھے۔

خطرے میں اسلام نہیں

18 ر مارچ 1970ء کو موچی دروازے کے جلسہ عام میں جس کا انتظام ڈاکٹر مبشر حسن نے کیا تھا، بھٹو صاحب کی تین گھنٹے کی تقریر نے ایک نئی تاریخ کو رقم کیا۔ جہاں عوام کے اتحاد کا عظیم الشان مظاہرہ ہوا وہاں غیر عوامی قیادت کو اپنے برے دن نظر آنے لگے۔ موچی دروازے کے اس تاریخی باغ میں پولیس چوکی کی دیوار سے لے کر اکبری دروازے کے موڑ تک لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ سرکلر روڈ کے دونوں طرف لوگ ہی لوگ تھے۔ جلسہ گاہ کے قریبی علاقوں کے تمام مکانوں کی چھتوں پر اور گردونواح کے درختوں، بجلی

کے کھمبوں پر ہزاروں لوگ چڑھے ہوئے تھے۔ جلسہ گاہ میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی اور قابل ذکر بات یہ کہ یہ جلسہ اس فتویٰ کے بعد منعقد ہوا تھا جو 113 فتویٰ فروش مُلّاؤں نے سوشلزم اور سوشلسٹوں کے خلاف دیا تھا۔ پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے جلسہ گاہ کو جن نعروں سے سجایا تھا وہ کچھ یوں تھے۔

اسلامی سوشلزم مساواتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ سرمایہ داری جاگیرداری کے سومنات توڑنے والا کون؟ ذوالفقار علی بھٹو۔ مشرق بائیں جانب ہے۔ مانگ رہا ہے ہر انسان، روٹی، کپڑا اور مکان۔ اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگادو۔ امریکی سامراجیو! ویت نام میں جارحیت بند کرو۔ شہدائے آزادی زندہ باد، دنیا کے حریت پسند زندہ باد۔ آزادیٔ فلسطین کی جدوجہد میں ہم الفتح کے ساتھ ہیں۔ تحریک آزادی اری ٹیریا زندہ باد۔ کشمیر، ویت نام، فلسطین، سامراج کے مدفن ہیں۔

ان نعروں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پیپلز پارٹی کی عمارت کن بنیادوں پر قائم ہوئی تھی، اس کا پیغام کیا تھا اور عوام کا بھٹو صاحب کے ساتھ عشق کیوں تھا۔ حبیب جالب نے جو نظم اس جلسے میں پڑھی وہ اس وقت بھی عوام کے جذبات کی ترجمان تھی اور آج بھی ان کی ترجمانی کرتی ہے۔

خطرہ ہے زرداروں کو
گرتی ہوئی دیواروں کو
صدیوں کے بیماروں کو
خطرہ ہے خوں خواروں کو
رنگ برنگی کاروں کو
امریکہ کے پیاروں کو
خطرے میں اسلام نہیں!

یہ تھی پیپلز پارٹی۔ اور یہ تھے عوام کے وہ جذبات جن کی ترجمانی پیپلز پارٹی کر رہی تھی۔ عوام سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف، امریکہ کے خلاف، اسلام فروشوں کے خلاف پاکستان پیپلز پارٹی کے جھنڈے تلے جمع ہوئے اور ''سوشلزم آوے ای آوے'' کو انہوں نے اپنا مقدر اور عزم بنالیا۔

113 مولویوں کا فتویٰ

113 مولویوں کا فتویٰ 18/مارچ کو ہونے والے اس جلسے سے پہلے 24/فروری 1970ء کو پاکستان کے 113 مولویوں نے دیا جن میں ہر مکتبہ فکر کے لوگ تھے۔ فتویٰ یہ تھا کہ ''سوشلزم کا اقتصادی پروگرام دینے والی جماعتیں اللہ تعالیٰ کے وجود کا اقرار نہیں کرتیں اور انفرادی ملکیت کے خلاف ہیں لہٰذا ان کو ووٹ دینا، ان کی کسی بھی قسم سے امداد کرنا کفر کی امداد کرنے کے مترادف ہے اور سخت حرام ہے۔ اسی طرح قومیت اور علاقائیت کا پرچار کرنے والی جماعتوں کو چندہ دینا یا ان کے جلسے جلوس میں شرکت کرنا ناجائز اور گناہ ہے۔''

ان 113 مولویوں میں سے 78 کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا اور 35 کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا۔ ان میں سے چند مشہور نام کچھ یوں تھے:۔ مولانا محمد شفیع، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا اظہر علی، مولانا عبدالغفور ہزاروی، مولانا سید ابوالبرکات، مولانا شاہ احمد نورانی، مفتی محمد حسین نعیمی، مجتہد سید محمد دہلوی، علامہ ابن حسن جارچوی، مجتہد جعفر حسین، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا سید منتخب الحق، مولانا محمد متین خطیب، مولانا سید محمود احمد رضوی اور مولانا محمد بخش مسلم وغیرہ۔ دلچسپ بات کہ ہمارا دفتر یعنی ''نصرت'' کا دفتر مولانا محمد بخش مسلم کی ایک مینار والی مسجد کی دکانوں میں سے ایک دکان میں تھا۔

ایک دوسرے کے خلاف وقتاً فوقتاً دیئے جانے والے فتووں کی رو سے یہ سب کے سب ایک دوسرے کو کئی بار کافر قرار دے چکے تھے۔ سید سبط حسن کی زیرادارت نکلنے والے ''لیل ونہار'' کے 19/اپریل 1970ء کے تاریخی شمارے ''فتویٰ جواب فتویٰ'' میں

فتووں کی تاریخ کا تحقیقی جائزہ لیا گیا تھا اور ایسے فتوے شائع کئے گئے تھے جن کی رو سے مُلاّؤں اور اسلام فروشوں نے حضرت امام حسینؓ، امام شافعیؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، ابن رشد، منصور حلاج، سرمد شہید، سر سید احمد خان، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، مولانا ظفر علی خان، علامہ اقبال، قائداعظم کو بے دین اور کافر قرار دیا تھا۔

سانگھڑ میں بھٹو پر حملہ

18 مارچ کے لاہور کے جلسے کے بعد بھٹو صاحب 31 مارچ 1970ء کو ایک جلسے سے خطاب کرنے کے لئے جب سانگھڑ پہنچے تو پیر پگاڑو نے بھٹو صاحب پر قاتلانہ حملہ کروا دیا۔ یہ حملہ بندوقوں، کلہاڑیوں اور ڈنڈوں سے کیا گیا۔ معراج محمد خان بھٹو صاحب کے اوپر ایک ڈھال بن کر لیٹ گئے۔ بھٹو صاحب اس حملے میں بال بال بچے۔ کارکنوں نے ان کو حیدر آباد پہنچایا۔ پیر پگاڑو کے خلیفہ اول جام صادق علی اس حملے کے نگران تھے جو بعد میں بھٹو صاحب کے منظور نظر ہو گئے تھے۔ اس حملے میں پولیس کے ایک اے۔ ایس۔ آئی سمیت چار افراد ہلاک اور اکسٹھ افراد زخمی ہوئے۔ مخالفین بوکھلا کر اب بھٹو صاحب کے قتل کے درپے تھے۔ مگر جوں جوں بھٹو مخالفت بڑھ رہی تھی توں توں عوام کا سمندر بھٹو صاحب کے گرد جمع ہو رہا تھا۔

انقلاب نہیں، انتخاب

یکم اور دو جولائی 1970ء کو مخدوم طالب المولیٰ کے گاؤں ہالہ میں پیپلز پارٹی کی دو روزہ کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ساڑھے سات سو مندوبین نے پورے مغربی پاکستان سے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں میر علی احمد تالپور اور معراج محمد خان کا موقف یہ تھا کہ عام انتخابات سے نہ تو ملک کے حالات بہتر ہو سکتے ہیں اور نہ ہی عوام کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ معراج نے ماؤزے تنگ اور چین کے انقلاب کا حوالہ دیتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں انقلاب کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ انتخابات میں حصہ لینے سے پارٹی اپنی منزل سے ہٹ جائے گی۔ معراج کی شعلہ بیانی نے کانفرنس کا موڈ انقلاب کی جانب موڑ دیا۔ مگر بھٹو صاحب انتخابات میں جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ماؤزے تنگ کو میں، معراج سے زیادہ جانتا ہوں اور سوشلزم کو بہتر طور پر پڑھا ہے۔

حنیف رامے نے جمہوریت ہماری سیاست ہے پر تقریر کی اور معراج کی تقریر کے اثر کو زائل کیا۔ بھٹو صاحب اس کانفرنس سے پہلے ''انقلاب یا انتخاب'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون بھی لکھ چکے تھے جس کا اردو ترجمہ کر کے میں اسے تین قسطوں میں نصرت میں چھاپ چکا تھا۔ بھٹو صاحب کی مرضی کو بھانپتے ہوئے اکثر مقررین نے انتخابات میں حصہ لینے کی حمایت کی۔ ہالہ کانفرنس ایک ایسا تاریخی لمحہ تھا جس میں پاکستان پیپلز پارٹی کی مستقبل کی سیاست کا تعین ہو گیا۔ انقلاب نہیں بلکہ انتخاب پارٹی کا ہدف ٹھہرا اور پارٹی انتخابات کی تیاری میں لگ گئی۔ اسی کانفرنس میں روزنامہ مساوات کو 7رجولائی 1970ء سے نکالنے کا اعلان بھی کیا گیا۔

یحییٰ خان کو یہ یقین تھا کہ پاکستان پیپلز پارٹی بمشکل پندرہ یا بیس نشستیں حاصل کر سکے گی چنانچہ شفاف انتخابات کروانے میں اس کے نزدیک کوئی حرج نہیں تھا۔ اسی لئے 1970ء کے انتخابات پاکستان کی تاریخ میں وہ واحد انتخابات ہیں جن میں دھاندلی نہیں کی گئی۔ چند جاگیرداروں کو چھوڑ کر پیپلز پارٹی کی اکثریت چونکہ متوسط اور غریب طبقے سے تھی جن کے جیتنے کے امکانات یحییٰ خان اور اس کے حواریوں کے نزدیک ناممکن تھے۔ چنانچہ شفاف انتخابات کروائے گئے۔

انتخابات کا اعلان اور یحییٰ خان کا لیگل فریم ورک آرڈر

یحییٰ خان نے 28رنومبر 1969ء کو قوم سے خطاب کرتے ہوئے اقتدار کی منتقلی کے لئے ایک آدمی ایک ووٹ کی بنیاد پر 15راکتوبر 1970ء کو انتخابات کروانے کا اعلان کر دیا تھا۔ اپنے اس خطاب میں ہی اس نے ون یونٹ توڑنے کا اعلان بھی کیا تھا اور یہ اعلان بھی کیا کہ اسمبلی کو اپنے پہلے اجلاس کے بعد 120 دن کے اندر اندر ملک کا نیا آئین تیار کرنا ہوگا اور اگر اس مدت میں آئین نہ بنایا گیا تو قومی اسمبلی توڑ دی جائے گی۔ یحییٰ خان کو یہ بھی یقین تھا کہ 120 دن میں نیا آئین نہیں بن پائے گا۔ نتیجتاً وہ مسلسل اقتدار میں رہے گا۔

اس دوران پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو جیلوں میں ٹھونسا جانے لگا۔ جو انتخابات کے انعقاد کے بعد تک جیل میں رہے۔ مگر عوام نے انہیں قید کے دوران ووٹ دے کر فتح سے ہمکنار کیا۔

وزیر اطلاعات نوابزادہ شیر علی جو یحییٰ خان کا دست راست تھا ترقی پسند صحافیوں کو سرکاری نشریاتی اداروں سے نکالنے لگا۔ تعلیمی اداروں میں بھی ترقی پسند اساتذہ زیر عتاب آئے۔ ایرک سیرین، امین مغل، منظور احمد کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ دانشوروں، شاعروں ادیبوں پر بے روزگاری کی تلوار لٹکا دی گئی۔ ڈاکٹر مہدی حسن جو پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ صحافت سے وابستہ تھے انہیں نوکری سے نکال دیا گیا۔

مشرقی پاکستان میں سیلاب نے قیامت برپا کردی

انتخابات ملتوی ہو گئے

مشرقی پاکستان میں سیلاب آتے رہتے تھے۔ اب کی بار ستمبر 1970ء میں بنگال پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ قیامت خیز طوفان اٹھا اور چودہ لاکھ بھائی بہن موت کے پانیوں میں فنا ہو گئے۔ پاکستان حکومت کی تیاری کا عالم یہ تھا کہ وہ نہ تو سمندری سیلاب کی موجوں کے زور کا اندازہ کر سکی اور نہ ہی آبادیوں کو بروقت محفوظ ٹھکانوں تک پہنچا سکی۔ سیلابوں کے مسئلے پر پاکستان کے حکمرانوں کی سردمہری کے ساتھ ساتھ شیخ مجیب نے بھی اسی طرح چپ سادھ رکھی تھی گویا چودہ لاکھ انسان نہیں بلکہ چودہ لاکھ مکھیاں مر گئی ہوں۔ مولانا بھاشانی بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان میں وہ "اسلامی رہنما" جو دونوں صوبوں میں اسلام کو اتحاد کی بنیاد ٹھہراتے تھے چپ سادھے بیٹھے تھے۔ ان کے خطبوں کی یہ کہانی کہ ایک مسلمان عورت کی فریاد پر محمد بن قاسم نے سندھ فتح کر لیا تھا، ایسے موقعوں پر ان کے اپنے لئے بے معنی تھی۔

یحییٰ خان جب سیلاب زدگان کی امداد کا کام دیکھنے دس روزہ دورے پر ڈھاکہ پہنچا تو شراب کے نشے میں دھت تھا۔ عورتوں کا مجمع اس کے گرد تھا۔ حتیٰ کہ سیلاب زدہ علاقوں میں جب وہ گیا تب بھی یہ بدنام عورتیں اس کے ساتھ تھیں۔ کسی نے بھی اس کی عزت نہیں کی۔ عوام اس سے مزید بدظن ہو گئے۔ حالانکہ یہ وہی بنگالی تھے جو جنرل اعظم خان کو جس نے سیلابوں کے موقع پر ان کی مدد کی تھی انہیں ہمیشہ اپنے باپ کے طور پر یاد کرتے تھے کیونکہ انہوں نے ان کے دکھ میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ جب شیخ مجیب نے بنگالی تعصب کا سہارا لیا تو بنگالیوں کے دماغوں میں جہاں ماضی میں ان کے ساتھ کی گئی دیگر زیادتیاں تازہ ہوئیں وہاں مغربی پاکستان کے حکمرانوں کی اس موقع پر سردمہری نے

بھی جلتی پر تیل کا کام کیا۔

اطلاعات آنے لگیں کہ مشرقی پاکستان میں سیلاب کی تباہ کاریوں میں امداد کے لئے امریکہ کا قومی دفاع کا محکمہ امدادی کاروائی کرتے ہوئے فوجی جہاز، فوجی عملہ اور ساز و سامان مشرقی پاکستان میں لا رہا ہے۔ اس کی نشاندہی مشرقی پاکستان کے ایک بزرگ رہنما پاکستان نیشنل لیگ کے سربراہ عطا الرحمن خان بار بار کر رہے تھے۔ مشرقی پاکستان میں طوفان اور سیلاب کاریوں کی روک تھام کے لئے امریکہ نے پاکستان پر عوامی جمہوریہ چین سے مدد لینے پر بھی پابندی لگا رکھی تھی۔ صرف عطا الرحمن خان ہی نہیں بلکہ بھٹو صاحب اور مولانا بھاشانی نے بھی مشرقی پاکستان میں امریکی اور برطانوی فوجیوں کی آمد پر احتجاج کیا۔ اس دوران امریکی سفیر فارلینڈ اور شیخ مجیب کی ملاقاتوں میں تیزی آگئی۔ فارلینڈ کو ملک بدر کئے جانے کا مطالبہ مسلسل عوام کی جانب سے کیا جا رہا تھا۔ مگر یحیٰی خان اور اس کا ٹولہ ان مطالبات کو سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔

اس قیامت خیز طوفان کی وجہ سے اکتوبر 1970ء میں منعقد ہونے والے انتخابات ملتوی کر دیئے گئے۔ انتخابات کی نئی تاریخ دے دی گئی۔ 7ر دسمبر 1970ء کو قومی اسمبلی کے انتخابات منعقد ہونا قرار پائے۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے انتخابی منشور دے دیا۔ ہم نے بھی لکھا کہ یہ منشور انتخابی نہیں انقلابی ہے اور یہ اپنی روح میں تھا بھی انقلابی منشور۔ یہ ملک کی سیاسی، اقتصادی اور سماجی زندگی میں ایک زبردست انقلاب کا وعدہ تھا۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے سوشلسٹ پروگرام پر اور عوامی لیگ نے چھ نکات پر اکثریت حاصل کی

پاکستان پیپلز پارٹی نے ایک غیر طبقاتی معاشرے کے قیام کا عہد کیا تھا جس میں جاگیرداری اور سرمایہ داری کا خاتمہ تھا۔ ایک ایسا معاشی نظام جو کہ ہر طرح کے استحصال

سے پاک ہو اس کے نفاذ کا عہد تھا۔ سوشلسٹ نظام معیشت کو اپنانے کا عہد تھا۔ ایک ایسی خارجہ پالیسی کو اپنانے کا عہد تھا جس کے ذریعے پاکستان سامراجی اور جدید نوآبادیاتی طاقتوں کے شکنجے سے باہر نکل سکے۔ اس میں عہد کیا گیا تھا کہ ہم ایشیاء کی سرزمین سے امریکہ اور مغربی نوآبادیاتی طاقتوں کی فوجوں کو نکال باہر کرنے کے لئے دوسری قوموں کے ساتھ مل کر مشترکہ کوشش کریں گے۔ ایشیاء سے نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کی جدوجہد اور دنیا بھر میں آزادی کی تحریکوں کی حمایت سے کسی بھی صورت دستبردار نہیں ہوں گے۔

7 رد سمبر کا دن آن پہنچا۔ پارٹی اور بھٹو صاحب کے عہد کے مطابق یہ جاگیرداری، سرمایہ داری کا آخری دن تھا۔ ہر طرف ساڈا بھٹو آوے ای آوے کے نعرے بلند تھے۔ رامے صاحب کے پاس ایک بزرگ تشریف لائے، فرمانے لگے میں نے آسمانوں میں پیپلز پارٹی کے جھنڈے کی تصویر دیکھی ہے۔ دراصل اس بزرگ نے اپنے دل پر کھدی ہوئی تصویر کو ستاروں میں دیکھا تھا۔ اسی طرح ایک روز ایک صاحب جو صوبائی اسمبلی کے امیدوار تھے تشریف لائے اور اپنی جیب سے درخت کا ایک پتہ نکالا۔ دیکھا تو پتے سے زیادہ وہ پیپلز پارٹی کا جھنڈا تھا۔ یہ پتے پہلے بھی لگتے تھے مگر اب یہ عوام کو مستقبل کی تصویر کے طور پر نظر آرہے تھے۔

انتخابات ہوئے اور گلیوں اور بازاروں میں کل تک جو آواز گونج رہی تھی ساڈا بھٹو آوے ای آوے، 7 رد سمبر 1970ء کا نعرہ یہ تھا ''ساڈا بھٹو آ گیا۔'' انتخابات کے نتائج نے ثابت کر دیا کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں اور عوام کے سیاسی شعور کے مقابلے میں سامراج کے دلال کاغذی شیروں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

کل تک نام نہاد ''اسلام پسند'' اخباروں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا کہ جماعت اسلامی قومی اسمبلی کی سب سے بڑی جماعت ہوگی اور کونسل لیگ پنجاب پر چھا جائے گی۔ ادھر قیوم خان بڑہانک رہے تھے کہ وہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو فتح کرلیں گے اور

عنقریب وہ پنجاب کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے۔ لیکن انتخابات نے ان کاغذی شیروں پر گھڑوں پانی ڈال دیا۔ وہ اسمبلی کے ایک کونے میں ایک چلو بھر پانی کی تلاش میں کھڑے تھے۔ انتخابات سے ایک بات اور بھی سامنے آئی کہ پاکستان میں اسلام کو کوئی خطرہ نہیں، جن کو خطرہ تھا وہ ''اسلام پسند'' اب اپنے نام ونشان کو ڈھونڈ رہے تھے۔

یحییٰ خان، جس نے انتخابات سے چند روز پہلے اپنی نشری تقریر میں عوام پر زور دیا کہ وہ اپنا ووٹ ڈالتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ امیدوار ''نظریۂ پاکستان'' پر یقین رکھتا ہو (یعنی یحییٰ خان نے دائیں بازو کی جماعتوں کے حق میں ووٹ ڈالنے کا مشورہ دیا تھا) ان غیر متوقع نتائج کے لئے تیار نہیں تھا۔ ادھر پاکستان کے ''جغادری سوشلسٹ'' بھی ان نتائج سے پریشان تھے۔ راولپنڈی سے دادا امیر حیدر نے لاہور آ کر عوامی فکری محاذ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ڈاکٹر مبشر حسن نقلی سوشلسٹ ہیں۔ پیپلز پارٹی نے اصلی سوشلسٹ مرزا ابراہیم کے مقابلے میں ڈاکٹر مبشر حسن کو اپنا امیدوار نامزد کر کے اصلی سوشلسٹ کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ مگر لاہور کے حلقہ نمبر 2 کے ووٹروں نے دادا امیر حیدر کے اصلی اور نقلی کو نظر انداز کرتے ہوئے مرزا ابراہیم کی ضمانت ضبط کروا دی۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو اور پیپلز پارٹی کے عشق میں گرفتار تھے۔

مغربی پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ جبکہ مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمن زبردست اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوئے تھے۔ شیخ مجیب کی انتخابی مہم مکمل طور پر مغربی پاکستان کے خلاف نفرت پر مبنی تھی۔ ان کے چھ نکات ان کی تحریک کا محور تھے۔ مولانا عبدالحمید بھاشانی نے ان انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا۔ چنانچہ اس کھلے میدان میں انہوں نے اپنی انتخابی مہم اتنی شدت اور تیزی کے ساتھ کی کہ بعد میں شیخ صاحب کے لئے خود بھی چھ نکات کی اسیری سے رہائی پانا ممکن نہ رہا۔

1970ء کے انتخابات کے نتائج

پارٹی کا نام	پنجاب	سندھ	سرحد	بلوچستان	مغربی پاکستان	مشرقی پاکستان	کل تعداد
عوامی لیگ	0	0	0	0	0	160	160
پاکستان پیپلز پارٹی	62	18	1	0	81	0	81
پاکستان مسلم لیگ (قیوم)	1	1	7	0	9	0	9
پاکستان مسلم لیگ (کنونشن)	7	0	0	0	7	0	7
جمعیت علمائے اسلام	0	0	6	1	7	0	7
مرکزی جمعیت علمائے پاکستان	4	3	0	0	7	0	7
نیشنل عوامی پارٹی (ولی)	0	0	3	3	6	0	6
جماعت اسلامی	1	2	1	0	4	0	4
پاکستان مسلم لیگ (کونسل)	2	0	0	0	2	0	2
پی ڈی پی	0	0	0	0	0	1	1
آزاد امیدوار	5	3	7	0	15	1	16
کل تعداد	82	27	25	4	138	162	300

مشرقی پاکستان کی سیاسی تاریخ

1947ء میں قائم ہونے والے پاکستان کا مشرقی پاکستان، جس کے حصول کے لئے وہاں کے عوام نے مسلم لیگ کے قیام سے لے کر حصول پاکستان تک مسلسل جدوجہد کی تھی، قربانیاں دی تھیں، کس طرح 1971ء میں شیخ مجیب کے چھ نکات کے گرداب میں پھنس کر بنگلہ دیش بن گیا اس کو سمجھنے کے لئے مغربی پاکستان کے مہاجر، پنجابی اور فوجی حکمرانوں کے بنگالیوں کے بارے میں رویے اور پالیسیاں، مشرقی پاکستان کے سیاسی رہنماؤں، بالخصوص شیخ مجیب الرحمن کی سیاست اور جغرافیائی اہمیت کے حامل اس خطے میں بھارت سمیت بین الاقوامی طاقتوں کی رسہ کشی کا تاریخی جائزہ لینا ضروری ہے۔

کلکتہ کے بغیر بنگال اسی طرح تھا جیسا گورداسپور کے بغیر پنجاب

قائداعظم کو کٹا پھٹا پاکستان ملا تھا۔ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے لئے جو باؤنڈری کمیشن ترتیب دیئے گئے ریڈ کلف کو ان دونوں کا چیئرمین بنایا گیا تھا۔ ریڈ کلف اصل میں نہرو اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا فرنٹ مین تھا جبکہ باؤنڈری کی تمام تفصیلات ان دونوں کے درمیان طے پا چکی تھی۔ 3رجون 1947ء کے پارٹیشن ایوارڈ میں کلکتہ مغربی بنگال میں شامل کر دیا گیا تھا۔ جبکہ کلکتہ کے بغیر مشرقی پاکستان بے معنی تھا۔ تقسیم کے دو برس بعد ولبھ بھائی پٹیل نے کلکتہ میں اپنی تقریر میں انکشاف کیا کہ کانگرس نے ہندوستان کی تقسیم اس شرط پر تسلیم کی تھی کہ کلکتہ ہندوستان کے حصے میں آئے گا۔ یہ معاہدہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور کانگریس کے درمیان طے پایا تھا جس کا علم مسلم لیگ کو نہیں تھا۔

پنجاب کی حد بندی بھی ریڈ کلف نے اسی طرح کی تھی۔ کلکتہ کی طرح گورداسپور کے ضلع میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور تقسیم کے فارمولے کی ہر شق کے مطابق یہ ضلع پاکستان میں آنا تھا۔ لیکن یہ ضلع بھارت کو دے دیا گیا۔ اس طرح بھارت کو گورداسپور کے ذریعے ریاست جموں وکشمیر کا راستہ مل گیا۔ اگر گورداسپور کا پورا ضلع پاکستان کو مل جاتا تو آج نہ مسئلہ کشمیر ہوتا اور نہ ہی پانی کا مسئلہ۔ اس حد بندی کا یہ نتیجہ بھی نکلا کہ راوی، بیاس اور ستلج بھارت کے دریا بن گئے جبکہ چناب، جہلم اور سندھ پاکستان کے حصے میں آئے۔ 1948ء میں بھارت نے راوی، بیاس اور ستلج سے نکلنے والی نہروں کا پانی روک دیا۔ حکومت پاکستان جو اس وقت مہاجرین کی آبادکاری اور معاشی استحکام کی تلاش میں تھی بھارت کے اس جارحانہ عمل سے سخت پریشان ہوئی اور 4رمئی 1948ء کو پانی جاری رکھنے کے ایک ایسے معاہدے پر دستخط کر بیٹھی جس کی رو سے تسلیم کر لیا گیا کہ تینوں دریا بھارت کے ہیں۔ یہ معاہدہ غلام محمد، سردار شوکت حیات اور میاں ممتاز دولتانہ نے کیا۔ جس کی توثیق 1960ء میں ایوب خان نے کی۔ اس معاہدے کو انڈس بیسن واٹر ٹریٹی یعنی Indus Basin Water Treaty ''سندھ طاس معاہدہ'' کہا جاتا ہے۔ چنانچہ جس طرح گورداسپور ضلع اپنے جغرافیائی اعتبار سے مغربی پاکستان اور کشمیر کے لئے بنیادی اہمیت کا حامل تھا اسی طرح کلکتہ مشرقی پاکستان کے لئے جغرافیائی، سیاسی و معاشی طاقت اور اہمیت کا حامل تھا۔

14راگست 1947ء کو آزادی کا اعلان تو ہو گیا۔ دو ملک بھی بن گئے، مگر باؤنڈری کمیشن نے اپنا ایوارڈ 17راگست 1947ء کو جاری کیا۔ گویا 17راگست 1947ء تک یہ معلوم نہیں تھا کہ دونوں ممالک یعنی پاکستان اور بھارت کی سرحدیں کیا ہوں گی۔ بالخصوص پنجاب اور بنگال کا کونسا علاقہ کس ملک میں ہوگا۔ اماں کہا کرتی تھیں کہ ہم یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان دلّی تک بنے گا یعنی پنجاب تقسیم نہیں ہوگا اور سکھ یہ سمجھتے تھے کہ لاہور ہندوستان کے مشرقی پنجاب میں جائے گا۔ نقل مکانی میں جو بے ترتیبی اور قتل وغارت گری نظر آتی ہے اس میں اس غیر یقینی کی صورت حال بھی ایک بڑی وجہ تھی۔

پنجابی اور مہاجر حکمران بنگالیوں کو حقارت سے دیکھتے تھے

اسی غیر یقینی کی صورت حال میں کلکتہ کے بغیر مشرقی پاکستان معرض وجود میں آ گیا اس پر مزید جو ظلم ہوا وہ یہ کہ لیاقت علی خان سے لے کر یحیٰی خان تک، ایوب ہوں یا مغربی پاکستان کے پنجابی مہاجر حکمران، سب کے سب بنگالیوں کو حقارت سے دیکھنے لگے۔ انہیں پستہ قد اور کند ذہن کہہ کر ان کی تحقیر کی جاتی۔ بنگالیوں کو جس حقارت سے دیکھا جاتا تھا اس کی ہلکی سی جھلک آپ قدرت اللہ کے شہاب نامے میں دیکھیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''کراچی میں دفتری اور رہائش کی ضرورت کے لئے جو نئی عمارتیں اور کوارٹرز تعمیر ہو رہے تھے ان کے لئے سینٹری کا سامان درآمد کیا جانا تھا۔ میٹنگ میں چار وزیر بھی شامل تھے۔ ان میں فضل الرحمن بھی تھے (مولانا فضل الرحمن نہیں) جن کے پاس امور داخلہ، اطلاعات اور تعلیم کا چارج تھا۔ درآمد کرنے کا جب فیصلہ ہو گیا تو فضل الرحمن نے دبے لفظوں میں کہا۔ مشرقی پاکستان میں کوئی تعمیری کام شروع نہیں ہوا وہاں کوئی تعمیری سامان کیوں نہ بھیجا جائے؟ ایک نے یہ پھبتی اڑائی کہ بنگالی تو کیلے کے جھنڈ کی اوٹ میں بیٹھ کر رفع حاجت کرتے ہیں اور کیلے کے پتے سے طہارت کر لیتے ہیں تو انہیں کموڈ اور بیسن کی کیا ضرورت ہے؟''

پاکستان کے بدنام زمانہ سابق چیف جسٹس محمد منیر جس کو 1962ء میں ایوب خان نے اپنی کابینہ میں وزیر قانون لے لیا تھا، قدرت اللہ شہاب کے مطابق، اس کا بیان تھا۔ ''اسمبلی میں کوئی تعمیری کام نہیں ہو رہا تھا۔ ہر روز پورا دن مشرقی پاکستان کے اراکین کی طویل تقریریں سننا پڑتی تھیں اور دن گزر جاتا تھا۔ ان تقریروں میں مشرقی پاکستان کے استحصال اور اس کے ساتھ سوتیلے پن کے سلوک کے طعنے اور گلے شکوے ہوتے۔ ایوب خان وہ تقریریں ریڈیو پر سنتے اور صورت حال سے بے زار ہو جاتے۔ میں نے صدر ایوب سے کہا جب دونوں صوبوں میں کوئی قدر مشترک نہیں تو کیوں نہ بنگالیوں سے کہا جائے کہ وہ اپنے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیں اور انہیں خود سنبھالیں۔ صدر ایوب خان نے مشورہ دیا کہ مجھے یہ بات مشرقی پاکستان کے بااثر لیڈروں کے ساتھ کرنی چاہیے۔ اسی مشورے

کے تحت ایک روز میں مسٹر میض الدین سے باتیں کر رہا تھا جو مشرقی پاکستان کے تھے اور وہاں وزیر بھی رہ چکے تھے۔ میں نے تمام معاملہ ان کے سامنے رکھا تو ان کا جواب برجستہ اور فوری تھا۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا میں علیحدگی کی بات کر رہا ہوں۔ میں نے جواب دیا جی ہاں! علیحدگی یا اس طرح کی کوئی اور چیز۔ کنفیڈریشن یا زیادہ خود مختاری۔ انہوں نے جواب دیا ''ہم ہیں اکثریتی صوبہ اور یہ معاملہ اقلیتی صوبے کا ہے۔ وہ چاہے تو الگ ہو جائے کیونکہ ہم پاکستانی ہیں۔ بات یہیں ختم ہوگئی اور اسمبلی میں شکایتوں کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔''

بنگلہ دیش تو اسی دن بن گیا تھا جب بنگالیوں پر اردو مسلط کی گئی تھی

دراصل بنگلہ دیش تو اس دن ہی بن گیا تھا جب قیام پاکستان کے بعد قائداعظم نے بنگلہ زبان بولنے اور صدیوں پرانی تہذیب و ثقافت رکھنے والی 56 فی صد آبادی پر اردو زبان کو سرکاری زبان کے طور پر نافذ کرنے کا اعلان کیا۔ پھر اس کے خلاف تحریک شروع ہوگئی۔ بنگلہ زبان کے حق میں ایک نہایت پرجوش جلوس نکلا۔ گولی چلی۔ برکت، سلام، رفیق، جبار، لعل اور کئی دوسرے جاں بحق ہوئے اور ان کی یاد میں ڈھاکہ میڈیکل کالج کے دروازے اور سٹاف کوارٹرز کے درمیان سڑک کے کنارے شہید مینار تعمیر کیا گیا۔ اگرچہ 1954ء میں بنگلہ زبان کو سرکاری حیثیت تو دے دی گئی مگر 1952ء سے لے کر بنگلہ دیش کے قیام تک مشرقی پاکستان کے عوام 21 رفروری کو بنگلہ زبان کے شہیدوں کا دن بڑی عقیدت اور احترام سے مناتے رہے۔

صدر ایوب خان اور ان کے رفقا بنگالیوں سے بے زار تھے اور بنگال کو اپنے لئے بوجھ سمجھتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان کی کالونی سمجھ کر حکمرانی کی جا رہی تھی۔ آبادی کے تناسب سے ملکی تعمیر و ترقی میں حصہ تو دور کی بات ان کو برابری کی سطح پر بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ان کے کمائے ہوئے زرمبادلہ سے پہلے کراچی اور پھر اسلام آباد کی تعمیر و ترقی ہو رہی تھی۔ معاشی استحصال کا عالم یہ تھا کہ بنگالیوں کا پیدا کردہ چاول مغربی پاکستان لا کر سستے داموں بیچا جاتا جبکہ وہ بنگالی جو یہ چاول پیدا کرتا تھا اس کو

مہنگوں داموں خریدنا پڑتا۔ یہ وہ رویہ اور سلوک تھا جس کا ردعمل بنگالیوں میں شدت سے پایا جاتا تھا۔ بنگالیوں کا معاشی، سیاسی ومعاشرتی استحصال کرنے والے حکمران اس خواب غفلت میں تھے کہ بنگالی کبھی سرنہیں اٹھائیں گے۔ حالانکہ جگتو فرنٹ کی حکومت کا خاتمہ ہو یا ون یونٹ کا قیام سب سے پہلے ڈھاکہ یونیورسٹی سے شدید ردعمل سامنے آتا تھا۔ پھر کراچی کی این ایس ایف کے طلبا کی آواز ان کی جدوجہد میں شامل ہوا کرتی تھی۔

پہلے بائیس نکات آئے پھر گیارہ نکات اور پھر چھ نکات

ابتداء میں بنگالیوں نے اپنے حقوق کا مطالبہ بائیس نکات کی شکل میں کیا۔ پھر گیارہ نکات آئے اور پھر شیخ مجیب کے چھ نکات!!

1969ء تک مشرقی پاکستان کے عوام کی تحریک کا مرکز گیارہ نکات تھے۔ جماعت اسلامی کی ذیلی طلبا تنظیم اسلامی چھاترو شنگھو کو چھوڑ کر مشرقی پاکستان کی تمام طالب علم تنظیموں نے مل کر عوام کو جو ایک واضح پروگرام دیا تھا وہ گیارہ نکات پر مشتمل تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلباء، مولانا عبدالحمید بھاشانی اور ان کی نیشنل عوامی پارٹی کا اس میں بنیادی اور اہم کردار تھا۔ ان نکات کا مطلب معاشی استحصال کا مکمل خاتمہ تھا۔ صوبائی خودمختاری کا مطالبہ ابھی تک ثانوی تھا اور اس تحریک میں مرکزی کردار مولانا بھاشانی اور ان کی جماعت نیشنل عوامی پارٹی کا تھا جو سوشلسٹ معاشی نظام کے نفاذ کی تحریک تھی۔ شیخ مجیب کے چھ نکات پر ابھی تک گیارہ نکات حاوی تھے۔

یہ تحریک مغربی پاکستان کے حکمرانوں کی ناانصافی کے خلاف تھی۔ پاکستان سے علیحدگی کے لئے نہیں تھی۔ حتیٰ کہ ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس لیگ جو عوامی لیگ کی ذیلی تنظیم تھی اور جس کے رہنماؤں میں شیخ مجیب کی بیٹی اور ان کا بیٹا شامل تھے وہ بھی گیارہ نکات کے حامی تھے۔ عوامی لیگ کے رہنما بھی اپنے چھ نکات کے ساتھ ساتھ ان گیارہ نکات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے تھے۔

1968ء میں ایوب خان کے خلاف طالب علموں کی تحریک جب راولپنڈی سے

شروع ہوئی۔تو ملک کے دیگر بڑے شہروں کی طرح ڈھاکہ کے طالب علم بھی زور وشور کے ساتھ اس تحریک میں شامل ہوئے۔ 1968ء کے اواخر سے جنوری ر 1969ء تک ایوب خان کے خلاف اس تحریک نے ایک واضح سیاسی شکل اختیار کرلی۔ 19 رفروری 1969ء کو جب ہر سال کی طرح بنگالی زبان کی تحریک میں شہید ہونے والوں کا دن منایا گیا تو محمد پور ڈھاکہ میں اردو بولنے والے بہاریوں کے گھروں پر حملہ کیا گیا۔عورتوں اور بچوں کو قتل کیا گیا۔مکتی باہنی کے ذریعے یہ کام کروایا گیا۔مکتی باہنی بھارتی فوج کا بازو تھا جسے ''را'' نے تیار کیا تھا۔دوسری طرف پولیس نے جلوس پر فائرنگ کی جس کے نتیجے میں بہت سے بنگالی مارے گئے۔ بعدازاں پتہ چلا کہ اس سارے قتل عام میں پولیس کے سینئر حکام شامل تھے۔اس واقعہ کا خوب پروپیگنڈا کیا گیا۔ایک اخبار نے یہاں تک لکھا کہ محمد پور مشرقی پاکستان میں اسی طرح مغربی پاکستان کا اڈہ ہے جس طرح اسرائیل مشرق وسطیٰ میں امریکہ کا اڈہ ہے۔ یہاں سے آمریت اور استحصال کے خلاف جو گیارہ نکاتی تحریک تھی وہ بنگال دوست اور مغربی پاکستان دشمن تحریک کا رنگ اختیار کر گئی اور تحریک کی قیادت چھ نکاتی پروگرام کے رہنماؤں کے ہاتھ میں چلی گئی۔

چھ نکات کیا تھے؟

عوامی لیگ کے چھ نکات کچھ اس طرح تھے:۔

1- 1940ء کی قرار داد لاہور کے مطابق آئین تیار کیا جائے جس کی اساس پارلیمانی حکومت، پارلیمنٹ کی بالادستی، بالغ رائے دہی کے اصول پر براہ راست انتخابات پر رکھی جائے۔

2- وفاقی حکومت کے پاس صرف دفاع اور امور خارجہ کے محکمے اور باقی تمام محکمے صوبوں کے پاس ہوں گے۔

3- پاکستان کے دونوں حصوں کے لئے الگ الگ کرنسی جاری کی جائے جو آسانی سے تبدیل ہوسکتی ہو یا پورے ملک کے لئے ایک ہی کرنسی رکھی جائے اور قانونی

ضمانت دی جائے کہ مشرقی پاکستان کی دولت مغربی پاکستان میں منتقل نہیں کی جائے گی۔ مشرقی پاکستان کے لئے علیحدہ ریزرو بینک قائم کیا جائے اور الگ مالیاتی پالیسی وضع کی جائے۔

-4 ٹیکس اور ریونیو اکٹھا کرنے کا اختیار صوبوں کو دیا جائے اور فیڈرل گورنمنٹ کا اختیار کلی طور پر ختم کیا جائے۔ وفاق اپنے اخراجات صوبائی ٹیکسوں سے وصول کرے۔

-5 مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے بیرونی زرمبادلہ کی آمدن کے علیحدہ اکاؤنٹس ہوں۔ مشرقی پاکستان کی آمدنی مشرقی پاکستان میں رہے اور مغربی پاکستان کی آمدنی مغربی پاکستان میں رہے۔ فیڈرل گورنمنٹ کی زرمبادلہ کی ضروریات دونوں حصے مساوی طور پر فکسڈ تناسب سے پوری کریں۔ خام مال ڈیوٹی کے بغیر دونوں حصوں میں منتقل ہو سکے۔ آئین صوبائی حکومتوں کو یہ اختیار دے کہ وہ دوسرے ملکوں کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کرسکیں۔ ٹریڈ مشن بنا سکیں اور بیرونی حکومتوں سے تجارتی معاہدے کرسکیں۔

-6 مشرقی پاکستان کو اپنی ملیشیا یا پیراملٹری فورس بنانے کا اختیار ہو۔

شیخ مجیب کے چھ نکات کے پیچھے تحقیر اور احساس محرومی کا یہ احساس کارفرما تھا کہ مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کی پرواہ نہیں کی۔ شیخ مجیب نے اپنے چھ نکات کے ذریعے مشرقی پاکستان کے عوام کو مغربی پاکستان سے علیحدگی کی راہ دکھائی۔ مشرقی پاکستان کے عوام کی اکثریت پاکستان توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ انہیں پاکستان کے حکمرانوں سے شکایات ضرور تھیں۔ وہ ناراض تھے۔ ان کی اس ناراضگی کی زمین میں شیخ مجیب نے اپنے چھ نکات کا پودا لگایا گیا اور پاکستان کے حکمران طبقات نے اپنے رویے سے اس پودے کی آبیاری کی تھی۔ دونوں طرف دلوں میں دراڑیں پڑ چکی تھیں۔

عوامی لیگ اور شیخ مجیب الرحمٰن

حسین شہید سہروردی نے عوامی لیگ قائم کی تھی۔ شیخ مجیب الرحمن ان کے سیاسی شاگرد تھے۔ وہ 22 دسمبر 1922ء کو مشرقی پاکستان کے قصبہ فرید پور میں پیدا ہوئے اور انہوں نے 1947ء میں کلکتہ کے اسلامیہ کالج سے بی اے کیا۔ ان کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ نوجوانی میں انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ 1939ء میں گوپال گنج میں آل انڈیا مسلم لیگ کے ممبر بنے۔ 1945ء میں اسلامیہ کالج سٹوڈنٹس یونین کے جنرل سیکرٹری چنے گئے۔ اسی سال بہار میں ہونے والے ہولناک مسلم ہندو فسادات کے زمانے میں مسلمانوں کے لئے کام کیا اور 1946ء میں بنگال کی قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور 1947ء میں آسام کے سلہٹ ڈویژن کو پاکستان میں شامل کرانے کے سلسلے میں منعقد ہونے والے ریفرنڈم کی مہم میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ 1948ء میں بنگالی زبان کو قومی زبان بنانے کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا اور اس جرم میں انہیں گرفتار کیا گیا۔ 1954ء میں مشرقی پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ حزب اختلاف کی جماعتوں نے حسین شہید سہروردی، مولوی اے کے فضل الحق اور مولانا عبدالحمید بھاشانی کی قیادت میں جگتو فرنٹ قائم کیا۔

جگتو فرنٹ جیت گیا۔ شیخ مجیب نے جگتو فرنٹ کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کا انتخاب جیتا اور جب مولوی فضل الحق کی سربراہی میں مشرقی پاکستان میں حکومت قائم ہوئی تو شیخ مجیب کو بھی اس میں شامل کیا گیا۔ وزارت کا یہ عرصہ بہت مختصر تھا۔ کیونکہ جگتو فرنٹ کی حکومت توڑ کر گورنر راج نافذ کیا گیا تھا۔ 1954ء میں انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ رہائی کے بعد مشرقی پاکستان میں بننے والی عوامی لیگ کی حکومت میں وزیر بنے مگر 1957ء میں انہوں نے وزارت سے استعفٰی دے دیا۔ جب 1958ء کے ایوب خان کے مارشل لا کے بعد 1962ء میں سیاسی سرگرمیاں بحال ہوئیں تو شیخ مجیب نے مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کو دوبارہ زندہ کیا اور اس کے جنرل سیکرٹری مقرر ہوئے۔ 1964ء میں شیخ مجیب نے عوامی

لیگ کا منشور مرتب کیا اور مشرقی پاکستان کے سیاسی رہنماؤں کے پانچ رکنی وفد کی قیادت کی جس نے لاہور میں منعقد ہونے والی کل جماعتی اپوزیشن کانفرنس میں شرکت کی۔ یہی وہ موقع تھا جب شیخ مجیب نے اپنا چھ نکاتی پروگرام پیش کیا جس کو کانفرنس نے منظور نہیں کیا۔ چھ نکات مشرقی پاکستان کے عوام کے مسلسل استحصال کا نتیجہ تھے۔ جب لاہور کانفرنس میں یہ چھ نکات 1964ء میں پیش ہوئے تھے، وقت کا تقاضا تھا کہ اس وقت ہی ان پر بحث کی جاتی اور ان کا حل ڈھونڈا جاتا۔ ان پر بحث ہونی چاہیے تھی۔ مگر مغربی پاکستان کے سیاست دان پنجابی، مہاجر شاؤنسٹ اور فوجی حکمران، مشرقی پاکستان کو اپنی ایک کالونی کی حیثیت سے ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔ بھٹو صاحب نے ایوب خان کو مشورہ دیا تھا کہ خواہ کتنے ہی نکات کیوں نہ ہوں ان کو زیر غور لایا جائے۔ سیاسی ڈائیلاگ کیا جائے اور یہ کہ آپ اس میں جتنی دیر کریں گے مسئلہ پیچیدہ ہوتا چلا جائے گا۔

19 رمارچ 1966ء کو شیخ مجیب کو مشرقی پاکستان عوامی لیگ کا صدر چن لیا گیا اور اسی سال انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ وہ ابھی جیل ہی میں تھے کہ ان کے خلاف اگرتلہ سازش کیس کے نام سے مقدمہ قائم کیا گیا اور ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت ان کی نظر بندی جاری رکھتے ہوئے اس مقدمے کو چلایا گیا۔ 1968ء کی عوامی تحریک نے جب پاکستان میں زور پکڑا تو انہیں 22 رفروری 1969ء کو رہا کیا گیا اور اگرتلہ سازش کیس بھی واپس لے لیا گیا۔ یہ رہائی ان کی اس گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے کی گئی تھی جو ایوب خان نے دائیں بازو کی جماعتوں اور نوکر شاہی کے مشورے سے راولپنڈی میں طلب کی تھی۔ شیخ مجیب اس گول میز کانفرنس میں شامل ہوئے، جب کہ پیپلز پارٹی کے سربراہ ذوالفقار علی بھٹو اور نیشنل عوامی پارٹی کے صدر مولانا عبدالحمید بھاشانی اس کانفرنس میں شامل نہیں ہوئے۔ بلکہ جس وقت ایوب خان یہ کانفرنس کر رہے تھے بھٹو صاحب ہزاروں افراد پر مشتمل عوامی کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے۔

ایوب خان نے عبدالمنعم خان کے ساتھ مل کر جو کہ مشرقی پاکستان کے گورنر تھے، اپنے دور اقتدار میں شیخ مجیب کو کبھی جیل میں رکھ کر اور کبھی آزاد کر کے مولانا بھاشانی کے

مقابلے میں بطور لیڈر تیار کیا۔

مولانا بھاشانی چین کے بانیٔ انقلاب ماؤزے تنگ کے حامی تھے اور مشرقی پاکستان کے مزدوروں کسانوں میں بے حد مقبول تھے۔ ان کا خیال تھا کہ چین میں عوامی انقلاب کا تجربہ پاکستان، بالخصوص مشرقی پاکستان کے معروضی حالات کے مطابق کامیاب رہے گا۔ وہ طبقاتی تضاد میں سے انقلابی تحریک کو پھوٹتا ہوا دیکھتے تھے۔ اس وقت ان کے نزدیک بنگال پرستی کا تصور معاشی استحصال ختم کرنے کی تحریک کے خلاف ایک سازش تھا۔ مولانا پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں میں رہتے ہوئے یعنی ایک وحدت میں رہتے ہوئے معاشی اور معاشرتی عوامی انقلاب کی بات کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ٹوبہ ٹیک سنگھ کا کسان بھی اتنا ہی مظلوم تھا جتنا کہ راجشاہی کا کسان۔ وہ نظام بدلنا چاہتے تھے جبکہ شیخ مجیب اپنے چھ نکات یعنی مکمل صوبائی خودمختاری کے پروگرام کے ذریعے پیغام دے رہے تھے کہ مغربی پاکستان کے حکمرانوں سے آزادی حاصل کر کے ہی معاشی آزادی حاصل کی جاسکتی ہے۔

امریکہ، عوامی لیگ اور ہارون برادرز

حسین شہید سہروردی جنہوں نے عوامی لیگ قائم کی تھی وہ امریکہ نواز تھے۔ اور عوامی لیگ کی قیادت بشمول شیخ مجیب الرحمن امریکہ نواز تھی۔ شیخ مجیب کے ہارون فیملی کے ساتھ بہت قریبی تعلقات تھے۔ یہ فیملی اپنے سی۔آئی۔اے اور امریکہ کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے پاکستان میں جانی جاتی تھی۔ شیخ مجیب کے سارے اخراجات کی کفالت بھی یہی فیملی کرتی تھی۔ شیخ مجیب میں امریکہ اور برطانیہ کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جب شیخ مجیب 1970ء میں لندن آئے تو حکومت برطانیہ نے انہیں فارن آفس کے ذریعے مکمل پروٹوکول دیا حالانکہ ابھی پاکستان میں انتخابات بھی نہیں ہوئے تھے۔ عوامی لیگ کے سینئر وائس پریذیڈنٹ مشتاق کھنڈکر کے بقول عوامی لیگ کا سارا خرچہ یوسف ہارون برداشت کرتے تھے۔ پاکستان سے رہائی کے بعد 1971ء میں جب وہ

لندن پہنچے تو سب سے پہلے انہوں نے محمود ہارون کو فون کیا۔ ہارون برادرز کا بنگلہ دیش بنانے میں کتنا ہاتھ ہے، اس پر بھی تحقیق ہونی چاہیے۔

عوامی لیگ اور مشرقی پاکستان میں امریکہ کی دلچسپی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ آپ کو یاد ہوگا ایک بار نوابزادہ نصر اللہ خان نے کہا تھا کہ چھ نکات ایوب خان کی ایماء پر تیار کئے گئے ہیں اور ان کا خالق الطاف گوہر ہے۔ الطاف گوہر کی ہارون فیملی کے ساتھ دوستی تھی۔ ہارون برادرز شیخ مجیب کے سرپرست اور پروموٹرز تھے اور ایوب خان اس خطے میں امریکی مفادات کے محافظ!!

حسین شہید سہروردی مجیب الرحمن کے سیاسی استاد تھے۔ 1956ء میں جب مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے نہر سویز کو قومی ملکیت میں لیا اور امریکہ اور مغربی استعمار اس کے خلاف ہو گیا تو سہروردی نے صدر ناصر کے خلاف امریکہ کا ساتھ دے کر پاکستان کو کافی رسوا کیا تھا اور سہروردی کے امریکہ نواز ہونے کی وجہ سے ہی مولانا بھاشانی نے اُن سے الگ ہو کر نیشنل عوامی پارٹی بنائی تھی۔ چنانچہ پاکستان کے ترقی پسند حلقوں میں یہ احساس موجود تھا کہ عوامی لیگ مشرقی پاکستان کو امریکی سامراج کے اس منصوبے کا حصہ بنا دے گی جس کا مقصد جنوب مشرقی ایشیاء پر چین کے خلاف امریکہ کا سامراجی تسلط برقرار رکھنا تھا۔ ان کے سیاسی استاد پہلے ہی مشرقِ وسطیٰ میں یہ کارنامہ دکھا چکے تھے۔

یاد رہے کہ اس وقت جب پاکستان میں 1970ء کے عام انتخابات منعقد ہوئے تو امریکہ نے جنوب مشرقی ایشیاء میں ویت نام جنگ کے ساتھ ساتھ کمبوڈیا پھر لاؤس پر جنگی محاذ کھول لیا تھا۔ چین کی بڑھتی ہوئی طاقت، جنوبی ایشیا میں سوشلسٹ، کمیونسٹ تحریکوں کا زور، بالخصوص مغربی بنگال میں انقلابیوں کا اٹھا ہوا طوفان، اس سب کو روکنے کے لئے امریکہ کو مشرقی پاکستان کی ضرورت تھی۔ جنوب مشرقی ایشیاء میں اس کو فوجی اڈوں کی ضرورت تھی۔ صدر سوئیکارنو کے محروم اقتدار ہونے کے بعد انڈونیشیا اور ملائیشیا پہلے ہی امریکی تسلط میں جا چکے تھے۔

انڈونیشیا کی مسجومی پارٹی نے لاکھوں سوشلسٹوں کا قتل عام کیا

مودودی نے بھی پاکستان کو انڈونیشیا بنانے کی دھمکی دے دی

1970ء کے انتخابات کے نتیجے میں مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی اور مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اکثریتی پارٹیوں کے طور پر اُبھریں۔ پیپلز پارٹی کے ان نعروں اور پروگرام کی روشنی میں کہ ''امریکی سامراج مردہ باد''۔ ''ایشیا سرخ ہے۔''''سوشلزم آوے ہی آوے'' اس بات کا امکان نہیں تھا کہ امریکی بھٹو صاحب پر اعتبار کرتے۔ ایک پاکستان میں رہتے ہوئے اگر ذوالفقار علی بھٹو کسی نہ کسی شکل میں حکومت میں شامل ہوتے تب بھی، اپوزیشن میں بیٹھتے تب بھی، دونوں صورتوں میں چین کے گرد پاکستان کے ذریعے حصار ڈالنا مشکل تھا۔ بھٹو چین کے ساتھ پاکستان کی دوستی کے معمار تھے۔ بھارت بھی اپنی چین دشمنی کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں امریکی دلچسپی کو اپنے لئے سودمند سمجھتا تھا۔ ان دنوں شیخ مجیب اور پاکستان میں متعین امریکی سفیر جوزف فارلینڈ کی ملاقاتوں میں اضافہ ہوگیا تھا جس پر میں نے ''نصرت'' میں ان ملاقاتوں کے بارے میں سوالات بھی اٹھائے تھے۔

فارلینڈ نے انڈونیشیا میں سوئیکارنو کی حکومت ختم کرانے میں گھناؤنا کردار ادا کیا تھا۔ جماعت اسلامی کی طرز پر قائم کردہ مذہبی تنظیم مسجومی پارٹی کے ذریعے بیس لاکھ انسانوں کا انڈونیشیاء میں قتل عام، اسلامی نظام کے نفاذ کے نعروں تلے ہوا تھا اور جب پاکستان میں انتخابات ہونے والے تھے فارلینڈ کو پاکستان میں تعینات کیا گیا تھا۔ انہی دنوں مولانا کوثر نیازی نے اپنے ہفت روزہ ''شہاب'' میں اس چیک کا عکس بھی چھاپا تھا جو فارلینڈ نے امیر جماعت اسلامی مولانا مودودی کے نام جاری کیا تھا۔

امریکہ جماعت اسلامی کے ذریعے پاکستان میں بھی یہی کھیل کھیلنا چاہتا تھا۔ مودودی انہی دنوں اپنے امریکہ کے دورے کے بعد واپسی پر یہ اعلان بھی کر چکے تھے کہ ''ہم پاکستان کو انڈونیشیا بنادیں گے اور سوشلسٹوں کی زبان گدی سے کھینچ لیں گے۔''

جنرل یحییٰ خان کا دست راست اور وزیر اطلاعات نوابزادہ شیر علی خان انڈونیشیا میں ان دنوں پاکستان کا سفیر تھا جب فارلینڈ کے ذریعے وہاں کی فوج اور اسلام پسندوں کے ذریعے یہ قتل عام ہوا تھا۔ پھر نوابزادہ واپس پاکستان آ گیا اور فارلینڈ بھی پاکستان میں امریکہ کا سفیر متعین ہوا۔ پاکستان میں جماعت اسلامی امریکہ کی گماشتہ جماعت تھی۔ نوابزادہ شیر علی کے جماعت اسلامی کے ساتھ گہرے روابط تھے۔

جماعت اسلامی یحییٰ خان کی شراب نوشی اور زنا کاری کے باوجود اس کو مرد مومن قرار دیتی تھی جبکہ ترقی پسندوں کی کردار کشی کرنے کے لئے وہ ان ہی الزامات کا سہارا لیتی تھی۔ انڈونیشیا میں سوئیکارنو کی کردار کشی میں بھی ان ہی باتوں کو اجاگر کیا گیا تھا۔ پاکستان میں بھی بھٹو صاحب کی کردار کشی اسی طرح کی جاتی تھی جس طرح انڈونیشیا میں سوئیکارنو کی۔

جب سقوط ڈھاکہ ہوا تب بھی جماعت اسلامی اور اسلام پسندوں کے نزدیک سقوط ڈھاکہ کی وجوہات ماضی کے حالات نہیں تھے بلکہ یحییٰ خان کی شراب نوشی اور عورتوں میں دلچسپی کی وجہ سے بنگلہ دیش قائم ہوا اور افواج پاکستان کی شکست ہوئی۔ یعنی 16 ردسمبر 1971ء تک جو مرد مومن تھا وہ راتوں رات 17 ردسمبر 1971ء کو شرابی اور زانی بن گیا تھا۔ یحییٰ خان کے بارے میں جماعت اسلامی کے میاں طفیل محمد نے جماعت کے سرکاری ترجمان ہفت روزہ ایشیا کے 14 ردسمبر 1969ء کے شمارے میں کہا تھا۔

''مجھے قومی امید ہے کہ اسلامی نظام کا جو سلسلہ حضرت علیؓ کی شخصیت سے منقطع ہوا تھا اس کی بحالی کا آغاز انشاء اللہ حضرت علیؓ ہی کے عاشقوں میں سے ایک شخص کے ہاتھوں پاکستان کی سرزمین میں ہوگا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ یحییٰ خان صاحب کو عزم و ہمت اور اس اخلاص کے ساتھ پاکستان میں اسلامی جمہوری نظام بحال کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔'' پھر انہیں یحییٰ خان کا عزم و ہمت اور اخلاص صرف شراب اور عورتوں میں نظر آنے لگا۔ جماعت اسلامی اس وقت کی طالبان تھی جو امریکی ایجنڈے پر کام کر رہی تھی۔

مولانا بھاشانی نے کہا ”امریکہ مشرقی پاکستان کو الگ کرنا چاہتا ہے“

23 مارچ 1970ء کوٹوبہ ٹیک سنگھ میں کسان کانفرنس منعقد ہوئی جس میں نیشنل عوامی پارٹی کے صدر مولانا عبدالحمید بھاشانی خاص طور پر مشرقی پاکستان سے مدعو کئے گئے تھے۔ ان دنوں اثر چوہان روزنامہ وفاق لاہور سے وابستہ تھے۔ انہوں نے اس کانفرنس میں شرکت کرکے ”نصرت“ کے لئے مجاہد کے نام سے رپورٹ لکھی۔ اس کانفرنس میں مولانا بھاشانی نے خبردار کیا کہ امریکہ مشرقی پاکستان کو الگ کرنا چاہتا ہے۔ انہوں نے اس ڈیڑھ لاکھ کے مجمع میں اعلان کیا کہ سی آئی اے نے مشرقی اور مغربی پاکستان کو الگ کرنے کی سازش کی ہے اور آزاد مشرقی پاکستان کے قیام کے لئے پانچ سو کروڑ ڈالر کی امداد کا وعدہ کیا ہے۔ امریکہ اور اس کے دوست ملکوں نے مشرقی پاکستان کو ایک آزاد ملک کی حیثیت سے تسلیم کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ انہوں نے اس دستاویز کی ایک نقل صدر یحییٰ خان اور گورنر ایس۔ ایم۔ احسن کو بھجوائی تھی جس کے جواب کا انہیں انتظار تھا۔ اس کانفرنس میں انہوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ اس دستاویز کو شائع کیا جائے اور اس بارے میں تحقیقات کرائی جائیں۔

چین کے خلاف بھارت اور روس کو بھی مشرقی پاکستان کے جغرافیائی محل وقوع میں اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی کہ امریکہ کو۔ بھارت یوں بھی اکھنڈ بھارت کا راگ الاپتا رہتا تھا۔ چنانچہ بحر ہند میں بڑی طاقتوں کے درمیان رسہ کشی تھی۔ ایشیاء میں چین کی اُبھرتی ہوئی طاقت اور چین اور روس کے نظریاتی اختلاف نے پورے ایشیاء کی سیاست کو ایک نیا رخ دے دیا تھا۔ بحر الکاہل میں امریکہ نے چین کی بحری طاقت کو جاپان، فلپائن اور اپنی ریاست اور جنوبی کوریا کی بدولت محدود کرلیا تھا۔ جبکہ بحر ہند میں وہ اس مقصد کے حصول کے لئے انڈونیشیا، جنوبی افریقہ، آسٹریلیا، جاپان اور بھارت کو استعمال کرنے کی کوشش میں تھا۔ یحییٰ خان اور اس کے گرد ٹولے کے پاس اس ساری صورت حال کو سمجھنے کی نہ تو عقل تھی اور نہ ہی فرصت۔

پہلا لندن پلان

1970ء کے انتخابات سے قبل لندن میں شیخ مجیب الرحمن اور مغربی پاکستان کے چند سیاست دانوں کی ملاقات ہوئی جس میں پاکستان کے مستقبل کا جو سیاسی منصوبہ بنایا گیا تھا اس کو لندن پلان کا نام دیا جاتا ہے۔

اکتوبر 1970ء میں لندن میں عوامی لیگ کے صدر شیخ مجیب الرحمن، نیشنل عوامی پارٹی (روس نواز) کے صدر ولی خان، کونسل مسلم لیگ کے صدر میاں ممتاز دولتانہ، سابق گورنر مغربی پاکستان اور مشہور صنعت کار سیٹھ یوسف ہارون کے درمیان ملاقات میں پاکستان کے مستقبل کا منصوبہ جسے ''لندن پلان'' یا ''روم پلان'' کے نام سے جانا جاتا ہے کچھ اس طرح طے پایا تھا۔

صدر پاکستان ایئر مارشل اصغر خان، وزیر اعظم شیخ مجیب الرحمن، وزیر دفاع میاں دولتانہ، وزیر خارجہ خان عبدالولی خان، قومی اسمبلی کا سپیکر مشتاق احمد کھنڈ کر، محمود ہارون گورنر سندھ، ارباب سکندر خان گورنر سرحد، اکبر بگٹی گورنر بلوچستان، وائس ایڈمرل (ریٹائرڈ) احسن گورنر مشرقی پاکستان، وزیر اعلیٰ مشرقی پاکستان کیپٹن منصور علی، وزیر اعلیٰ پنجاب سردار شوکت حیات، وزیر اعلیٰ سندھ جی ایم سید، وزیر اعلیٰ بلوچستان عطا اللہ مینگل، وزیر اعلیٰ سرحد ولی خان کا کوئی نمائندہ۔ سیٹھ یوسف ہارون نے اپنے لئے سفیر امریکہ کا عہدہ چنا۔ اس منصوبے میں جن بنیادی اصولوں پر اتفاق کیا گیا اور جو پاکستان پریس میں چھپے وہ کچھ یوں تھے۔

☆ معاہدہ تاشقند پر فوری عمل کر کے کشمیر کی حد متارکہ جنگ کو پاکستان اور ہندوستان کی مستقل حد کے طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ یعنی آزاد کشمیر کو مغربی پاکستان میں شامل کر کے مقبوضہ کشمیر کو بھارت کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کے بدلے ہندوستان فرخابند سے مشرقی پاکستان کو اس کی ضرورت کے مطابق پانی دے گا۔

☆ تمام بڑی طاقتوں کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کئے جائیں مگر عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ خصوصی دوستانہ تعلقات کو ختم کیا جائے گا۔

☆ پاکستان میں یہودی مملکت اسرائیل کے خلاف جذبات کی شدت کے خاتمے کی کوشش کی جائے گی۔

☆ بھارت کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں گے۔

☆ اندرون ملک عوام کو مطمئن کرنے کے لئے بعض اصلاحات کی جائیں گی۔

اس لندن پلان کے بارے میں کراچی میں منعقدہ پریس کانفرنس میں ایک برطانوی اخبار نویس کے سوال کے جواب میں بھٹو صاحب نے کہا تھا کہ ہمیں اس پلان کے بارے میں علم ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ برطانوی حکومت اس سازش کے پیچھے ہے، بلکہ یہ سازش چند افراد نے تیار کی ہے جسے ہم ''روم پلان'' بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ لندن میں ان بنیادی اصولوں پر اتفاق کے بعد اس پلان کی نوک پلک درست کرنے کے لئے روم میں یہ افراد جمع ہوئے تھے۔

ریٹائرڈ ایئر مارشل نور خان نے جو پنجاب کے گورنر تھے، لندن پلان والوں کو یہ یقین دہانی کرادی تھی کہ وہ مناسب وقت آنے پر حکومت سے مستعفی ہو کر عملی سیاست میں داخل ہو جائیں گے اور ان کے ساتھ آن ملیں گے۔

اصغر خان اور نور خان میں ایک عرصے سے چپقلش چلی آرہی تھی۔ ان میں صلح کروانے کا کام میاں ممتاز دولتانہ نے اپنے ذمے لیا تھا۔ ان کے مطابق ان کے درمیان کوئی اصولی جھگڑا نہیں تھا بلکہ شخصیات اور خواہشات کا جھگڑا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عام انتخابات کے بعد ایئر مارشل اصغر خان اور میاں ممتاز دولتانہ، شیخ مجیب الرحمن کو بلاشرکت غیرے اقتدار کی منتقلی کا شدت سے مطالبہ کرتے رہے اور عوامی لیگ کی تحریک عدم تعاون یعنی سول نافرمانی کی برملا حمایت کرتے رہے۔ مگر جب شیخ مجیب الرحمن کو گرفتار کر کے مغربی پاکستان کی جیل میں رکھا گیا تو یہ حضرات مکمل خاموشی اختیار کر گئے۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اصل منصوبہ جو کہ پاکستان کو تقسیم کرنے کا تھا شیخ مجیب اور یوسف ہارون کے علم میں تھا اور

شاید ولی خان اس سے باخبر تھے۔ باقی حضرات کو حکومت کا لالچ دے کر ساتھ ملایا گیا تھا اور اس منصوبے کے تحت چھ ماہ یا سال بھر کی حکومت کے عرصے میں پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنا تھا۔

لندن میں اس میٹنگ کے ایک ماہ بعد نومبر 1970ء میں یحییٰ خان چین کے دورے پر جاتے ہوئے ڈھاکہ رکے اور شیخ مجیب سے ملاقات کی۔ یحییٰ خان نے شیخ مجیب کو کہا کہ ''تم وزیراعظم بن سکتے ہو جبکہ میں صدر رہوں گا۔ مگر تم نے بھٹو کو کنٹرول کرنا ہے۔'' یہ بات شیخ مجیب نے بھٹو صاحب کو اپنی بعد کی ملاقات میں بتائی۔

انتخابات کے بعد دستور سازی اور حکومت سازی

1970ء کے انتخابات ہوئے اور انتخابی نتائج یحییٰ خان، حکومتی ایجنسیوں، اسلام پسند اخباروں اور رجعت پسند جماعتوں کے تخمینوں کے برعکس نکلے۔ ان کا یقین تھا کہ مغربی پاکستان میں جماعت اسلامی سب پر چھا جائے گی۔ کونسل لیگ پنجاب میں اکثریت حاصل کرے گی۔ خان عبدالقیوم خان سرحد سندھ اور بلوچستان فتح کرلیں گے۔ ذوالفقار علی بھٹو دس سے بارہ نشستیں حاصل کرسکیں گے اور مشرقی پاکستان میں کسی کو اکثریت حاصل نہیں ہوگی۔ اس طرح یحییٰ خان ہی اس پوزیشن میں ہوں گے کہ حکومتیں بناتے اور بگاڑتے ہیں اور ان کا اقتدار جاری رہے۔ مگر عوامی سیلاب نے ان سب کو خس و خاشاک کی طرح بہادیا۔

ان انتخابات میں مغربی پاکستان کے عوام بالخصوص پنجاب اور سندھ کے عوام نے پاکستان پیپلز پارٹی کے سوشلسٹ اقتصادی پروگرام کے حق میں جبکہ مشرقی پاکستان کے عوام نے شیخ مجیب الرحمن کے چھ نکات کے حق میں فیصلہ دیا۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی اکثریتی پارٹیاں بن کر سامنے آئیں۔

یحییٰ خان نے ایک لیگل فریم ورک دیا تھا جس کے تحت 1970ء کے انتخابات ہوئے تھے۔ اس لیگل فریم ورک میں پاکستان کی سا لمیت کی ضمانت دی گئی تھی اور تمام سیاسی جماعتوں نے بشمول عوامی لیگ، اسی لیگل فریم ورک کے تحت انتخابات میں حصہ لیا تھا۔ یحییٰ خان کو معلوم تھا کہ شیخ مجیب کے چھ نکات اس لیگل فریم ورک سے ٹکراتے ہیں۔ مگر انتخابات میں جانے سے پہلے یحییٰ خان نے اس ٹکراؤ کو سلجھانے کی کوشش نہیں کی۔ انتخابات

کے بعد ملک کا آئین بننا تھا جس کے تحت ملک نے چلنا تھا۔ یحییٰ خان جانتے تھے کہ شیخ مجیب کے چھ نکات کی موجودگی میں آئین نہیں بن پائے گا۔ ملک سیاسی تعطل کا شکار رہے گا اور وہ بطور فوجی ڈکٹیٹر ملک پر حکمرانی کرتے رہیں گے

انتخابات کے بعد اب پہلا مرحلہ دستور سازی کا تھا اور دوسرا مرحلہ حکومت سازی کا۔ دستور سازی کے لئے یحییٰ خان نے ایک سو بیس دن کی مدت دی تھی۔ دستور سازی کا مرحلہ آسان نہیں تھا۔ حکومت میں پیپلز پارٹی کی شمولیت یا نہ شمولیت کا انحصار، اس بات پر تھا کہ دستور سازی کے سلسلے میں شیخ مجیب کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔

ہم نے 13 ردسمبر 1970ء کے نصرت میں پیپلز پارٹی کے مستقبل کے لائحہ عمل کو واضح کر دیا تھا کہ اگر شیخ مجیب الرحمن نے دستور کے معاملے میں صوبائیت اور علاقائیت کے بجائے پورے پاکستان کے عوام کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارے ساتھ ایک عوامی دستور بنانے میں تعاون کیا تو ہم حکومت میں بھی ان کے ساتھ شریک ہونے کے لئے آمادہ ہو سکتے ہیں۔ شیخ مجیب کی عوامی لیگ کا منشور بھی سوشلسٹ خطوط پر مبنی ہے اور پیپلز پارٹی اپنے سوشلسٹ انتخابی منشور کی بنیاد پر جیت کر آئی ہے۔ اس اعتبار سے پیپلز پارٹی عوامی لیگ کے ساتھ دستور سازی کے معاملے میں بڑی حد تک تعاون کرنے کو تیار ہے۔

پیپلز پارٹی نے چھ نکات میں سے ساڑھے پانچ کو تسلیم کرلیا

بھٹو صاحب نے 20 اور 21 رفروری 1971ء کو کراچی میں پیپلز پارٹی کے قومی و صوبائی اسمبلیوں کے ممبران کے اجلاس سے خطاب کیا۔ اس دو روزہ اجلاس میں یہ طے پایا کہ پیپلز پارٹی قومی اسمبلی کے اجلاس میں اس صورت میں ہی شامل ہوگی جب یہ یقین دہانی کرائی جائے کہ آئین افہام و تفہیم کے ذریعے تیار کیا جائے گا۔ اس اجلاس میں پیپلز پارٹی نے چھ نکات کی روح کو تسلیم کر لیا تھا مگر تفصیلات طے ہونا ضروری تھیں۔ چھ نکات کا پہلا نکتہ وفاقی حکومت کے بارے میں تسلیم کر لیا گیا تھا مگر دو ایوانوں کے ساتھ۔ کیونکہ دنیا میں کوئی بھی ملک ایسا نہیں جہاں وفاقی آئین ہو اور دو ایوان نہ ہوں۔

چونکہ اسمبلی میں اکثریت مشرقی پاکستان کے منتخب نمائندوں کی تھی چنانچہ یہ طے تھا کہ وزیراعظم مشرقی پاکستان سے ہوگا۔ اس کا اعلان بھی بھٹو صاحب نے اپنی تقریر میں کردیا تھا۔ ملک کے دو مختلف حصوں میں دو مختلف آئین نہیں ہو سکتے تھے اور پیپلز پارٹی قطعاً مضبوط مرکز نہیں چاہتی تھی مگر ایسا وفاقی دستور چاہتی تھی جس کے پاس بے شک کم از کم محکمے ہوں مگر مرکز کام کر سکے۔

بھٹو صاحب نے چھ نکات میں سے ساڑھے پانچ نکات مکمل طور پر مان لئے تھے۔ کرنسی کے نکتے پر بھی سمجھوتہ ہوسکتا تھا اور ٹیکس پر بھی سمجھوتہ ہوسکتا تھا۔ مگر امور تجارت اور بیرونی امداد کو مرکز کے امور خارجہ کے ساتھ منسلک کرنا وہ بنیادی نکتہ تھا جس پر اختلاف تھا۔ بھٹو صاحب کا کہنا تھا کہ بیرونی تجارت اور بیرونی امداد کی ہر صوبے میں مکمل آزادی کے نتیجے میں ملک کے پانچ صوبوں میں پانچ غیر ملکی اڈے قائم ہو جائیں گے۔ جس طرح مغلوں کے آخری دور میں ہندوستان میں پرتگالی، فرانسیسی اور برطانوی اڈے قائم ہو گئے تھے۔ اس طرح پاکستان غیر ملکی طاقتوں کی آماجگاہ بن جائے گا اور کھینچا تانی کا شکار ہو جائے گا۔

پیپلز پارٹی کراچی اجلاس کی اس قرارداد کی روشنی میں چھ نکات کو تھوڑی بہت رد و بدل کے بعد قابل قبول سمجھتی تھی اور عوامی لیگ کے ساتھ مخاصمت کی بجائے باہمی مفاہمت کو ترجیح دیتی تھی۔ مگر شیخ مجیب کے نزدیک چھ نکات اٹل تھے اور ان کا کہنا تھا کہ ”جس کو ضرورت ہو وہ چھ نکاتی آئین کو قبول کرے ورنہ ہم اپنا راستہ الگ بنالیں گے۔“

مجیب کی ہٹ دھرمی اور یحییٰ خان کی ایک سو بیس دن کی شرط

نہ دستور بن سکتا تھا اور نہ ہی حکومت

چھ نکات پر بننے والا آئین ملک کے باقی صوبوں کے لئے بھی ہونا تھا اور یہ نکات ان حدوں کو چھوتے تھے جہاں سے مکمل آزادی کی حد شروع ہوتی ہے۔ ایک

طرف چھ نکات۔ شیخ مجیب ہٹنے کو تیار نہیں۔ دوسری طرف یحییٰ خان نے دستور کی تیاری کے لئے ایک سو بیس دن کی شرط لگا دی تھی۔ ''اگر ان دنوں میں قومی اسمبلی آئین نہ بنا سکی تو یہ انتخابات کالعدم قرار دیئے جائیں گے۔'' گویا ان دونوں وجوہات کی بنا پر قومی اسمبلی میں دستور سازی پر تعطل کا پیدا ہونا یقینی امر تھا۔ بھٹو صاحب کا خیال تھا کہ اجلاس شروع ہونے سے پہلے بہتر ہے کہ اس مسئلے پر اسمبلی سے باہر مفاہمت کی فضا بنائی جائے۔ ورنہ دو ہی صورتیں تھیں یا چھ نکات کے مطابق بنے بنائے دستور پر انگوٹھا لگانے کے لئے پیپلز پارٹی اجلاس میں شرکت کرتی یا اسمبلی تعطل کا شکار ہو جاتی۔ کیونکہ ایک سو بیس دن میں حساس اور نازک نکات پر بحث کر کے دستور سازی کرنا ناممکن تھا۔ یعنی دونوں ہی صورتوں میں فضا مارشل لا اور یحییٰ خان کے حق میں تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ مجیب کی ہٹ دھرمی اور ایک سو بیس دن کی شرط پر دستور نہیں بن سکے گا اور وہ کرسی صدارت پر براجمان رہیں گے۔ یحییٰ خان نے تین مارچ 1971ء کو اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا۔

''انتقال اقتدار چاہتے ہیں، انتقال پاکستان نہیں''

ٹانگیں توڑنے والی بات

ان دنوں روزنامہ ''مشرق'' اور روزنامہ ''کوہستان'' اسلام پسندوں اور بھٹو دشمن عناصر کے قبضے میں تھے۔ انہوں نے ایک جھوٹی خبر چھاپی کہ پیپلز پارٹی کے ستر ارکان عوامی لیگ میں شامل ہو جائیں گے اور یہ کہ بہت جلد پیپلز پارٹی میں فارورڈ بلاک بننے والا ہے۔ اس وقت فارورڈ بلاک تو کیا پیپلز پارٹی کے اندر اختلاف کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو اپنی پارٹی میں ابھی تک ہر دلعزیز رہنما تھے۔

28رفروری 1971ء کے تاریخی دن کو بھٹو صاحب نے مینار پاکستان تلے لاکھوں انسانوں کے ایک تاریخی جلسے سے خطاب کیا۔ عجیب سماں تھا۔ ایک روز پہلے بارش ہوئی تھی۔ ماحول میں خنکی تھی مگر عوام میں جوش وخروش کی گرمی تھی۔ وہ کیچڑ پانی کی پرواہ کئے بغیر صبح سے ہی جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ تقریباً دو بجے ہم جلسہ گاہ میں پہنچے تو ڈاکٹر مبشر

حسن کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا۔ اسلم گورداسپوری کی نظم بھٹو جئے ہزاروں سال بار بار سنی گئی۔ مسلسل تالیوں اور نعروں کی گونج میں بھٹو صاحب نے اپنی اس تاریخی تقریر میں تفصیل کے ساتھ شیخ مجیب کے چھ نکات اور پیپلز پارٹی کے موقف کی وضاحت کی۔

اس جلسے میں بھٹو صاحب نے کہا تھا کہ اگر مغربی پاکستان کے سیاست دانوں بالخصوص پیپلز پارٹی کے منتخب نمائندوں نے مشرقی پاکستان جا کر شیخ مجیب کے بنے بنائے آئین پر انگوٹھا لگایا تو پھر واپسی پر ہم ان کی ٹانگیں توڑ دیں گے۔ (اس کے باوجود احمد رضا قصوری اس اجلاس میں شرکت کے لئے ڈھاکہ گئے۔) ہم انتقالِ اقتدار چاہتے ہیں، انتقال پاکستان نہیں۔ ان کے مخالفین نے ہڈیاں توڑنے یا ٹانگیں توڑنے کی بات کو تو خوب اچھالا مگر اس جلسے میں کہے گئے اُن کے ان فقروں کو کہیں یاد نہیں رکھا گیا کہ ''میرا پروردگار میرا گواہ ہے۔ اے شاہی مسجد کے مینار و اور مینار پاکستان اور راوی کی لہرو! تم بھی گواہ رہنا کہ ہم ایک پاکستان چاہتے ہیں۔ ہم انتقال اقتدار چاہتے ہیں انتقال پاکستان نہیں۔ ہم مارشل لا کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ ہم فوجی حکومت کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم پاکستان کو ختم کرنا نہیں چاہتے۔ ہم کسی صورت نہیں چاہتے کہ مشرقی پاکستان کے ساتھ ہمارا سمجھوتہ نہ ہو۔ ہم ایک پاکستان چاہتے ہیں۔ عوامی پاکستان!!''

انہوں نے اسی جلسے میں مطالبہ کیا کہ اسمبلی کا اجلاس ملتوی کیا جائے تاکہ شیخ مجیب کے ساتھ مزید مذاکرات ہو سکیں۔ ''میں پھر ڈھاکہ جانا چاہتا ہوں۔ بڑے بھائی سے بات کرنے۔'' انہوں نے سندھ کے مشہور صوفی شاعر عبداللطیف بھٹائی کا ایک شعر بھی پڑھا جس کا ترجمہ میر رسول بخش تالپور نے کیا۔ جس کا مطلب کچھ یوں تھا کہ ''میں ان کی (محبوب کی) منتیں کروں گا۔ قدم پکڑ لوں گا کہ آج کی رات یہاں رُک جاؤ۔''

''یحییٰ خان ایک سو بیس دن کی شرط ختم کرو، میں کل ڈھاکہ جانے کو تیار ہوں''

بھٹو صاحب نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ آئین بنانے کی ایک سو بیس دن کی مدت کی

شرط بھی ختم کی جائے تا کہ اسمبلی کو ایک ایسا آئین بنانے کا موقع مل سکے جو ملک کے ہر صوبے اور عوام کے لئے قابل قبول ہو اور قابل عمل بھی۔ انہوں نے کہا کہ آپ ایک سو بیس دن کی شرط ختم کر دیں ہم کل ڈھاکہ جانے کے لئے تیار ہیں۔

یحییٰ خان نے یکم مارچ کو قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا۔ شیخ مجیب کی طرف سے جو ردعمل سامنے آیا وہ غیر متوقع نہیں تھا۔ انہوں نے یحییٰ خان کے فیصلے کو بھٹو صاحب کے مطالبے کی روشنی میں دیکھا اور کہا کہ ہم اکثریت میں ہیں لیکن بات اقلیت کی مانی گئی۔ ہم سے مشورہ تک نہیں کیا گیا۔ چنانچہ دو مارچ کو مشرقی پاکستان میں زبردست ہڑتال ہوئی۔ ریلیں منجمد، ٹیلی فون خاموش، ڈاک رُک گئی، دکانوں اور دفتروں میں تالے پڑ گئے۔ ادھر یحییٰ خان اور بھٹو صاحب میں پھر ملاقات ہوئی۔ ہر طرف لوگ سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

شیخ مجیب علیحدگی کا فیصلہ تو کر چکے تھے مگر انہیں کچھ مہلت درکار تھی تا کہ وہ اپنی سہولت کے وقت پر علیحدگی کا اعلان کریں۔

یحییٰ خان نے دوبارہ 25/مارچ کو اسمبلی کا اجلاس بلانے کا اعلان کیا جس کے جواب میں شیخ مجیب نے مزید سات شرطیں رکھ دیں۔ جن میں سے چار شرائط کو فوری طور پر قبول کرنے کا مطالبہ تھا۔ یہ مطالبہ انہوں نے پلٹن میدان میں بہت بڑے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کیا تھا۔

-1 مارشل لا فوری طور پر ہٹایا جائے۔
-2 اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو منتقل کیا جائے۔
-3 فوجوں کو بلا تاخیر بیرکوں میں واپس بھیجا جائے۔
-4 نہتے شہریوں پر فائرنگ فوراً بند کی جائے۔

مغربی پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں نے بشمول پیپلز پارٹی قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت پر رضا مندی کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ پیپلز پارٹی 120 دن کی مدت ختم کرنے کا مطالبہ کرتی چلی آئی تھی۔ شیخ مجیب نے اس بات کو دھرایا کہ ابھی بھی وقت

ہے اگر تمام باتیں پرامن ماحول میں طے ہو جائیں تو ہم بھائیوں کی طرح رہ سکتے ہیں۔ ان مطالبات کو تسلیم کرنے کے بجائے یحییٰ خان نے اعلان کیا کہ وہ جلد مشرقی پاکستان جائیں گے۔

25/مارچ کو ہونے والا اسمبلی کا اجلاس ایک بار پھر ملتوی ہو گیا۔ مگر اب کی بار شیخ مجیب کے کہنے پر ملتوی کیا گیا۔ انہیں بھی اسمبلی سے قبل سیاسی جماعتوں کی باہمی افہام و تفہیم کی ضرورت تھی اور انہوں نے بھی ایک سو بیس دن کی قید کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔

شیخ مجیب نے آزاد ملک کے سربراہ کا روپ اختیار کرلیا

شیخ مجیب نے 2/مارچ 1971ء کو ڈھاکہ میں اور اس کے بعد پورے مشرقی پاکستان میں عام ہڑتال کا حکم دے دیا۔ عوام سڑکوں اور گلیوں میں نکل آئے۔ عوامی لیگ کے کارکنوں نے غیر بنگالیوں کا قتل عام کیا۔ صوبے کے سول حکام اور ملازمین کو مرکزی حکومت کے ساتھ عدم تعاون کا حکم ملا۔ بنکوں کو حکم ملا کہ وہ صرف عوامی لیگ کی ہدایات پر عمل کریں۔ ججوں کو اپنے گھروں سے باہر نہ نکلنے کا حکم دیا گیا۔ شیخ مجیب نے ایک آزاد ملک کے سربراہ کا روپ اختیار کرلیا۔

اس دوران گورنر مشرقی پاکستان عبدالمالک جو عوامی لیگ کا ہمدرد تھا اس کو تبدیل کر کے یحییٰ خان نے جنرل ٹکا خان کو گورنر مقرر کیا۔ عوامی لیگ کی ہدایات پر مشرقی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے نئے گورنر سے حلف لینے سے انکار کر دیا۔ دکانیں لوٹی جانے لگیں۔ جیلوں سے مجرموں کو اور سیاسی قیدیوں کو رہا کرایا گیا۔ فیکٹریوں کو نذر آتش کیا گیا۔ قائداعظم کی تصویر اور پاکستان کے جھنڈے جلائے گئے۔ مواصلات کا نظام درہم برہم ہو گیا اور بھارت سے 1947ء میں ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین 1970ء میں مشرقی پاکستان میں دوبارہ بے گھر بنا دیئے گئے۔ بندرگاہوں، ہوائی اڈوں، ریلوے سٹیشنوں پر لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے اور وہ مغربی پاکستان جانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔

مولانا بھاشانی نے بھی ''وعلیکم السلام'' کہہ دیا اور آزاد سوشلسٹ بنگلہ دیش کا نعرہ لگا دیا

4ر دسمبر 1970ء کو مولانا بھاشانی نے مغربی پاکستان والوں کو ''وعلیکم السلام'' کہنے والی تقریر میں ''آزاد سوشلسٹ بنگلہ دیش'' کا نعرہ لگایا تھا۔ نیشنل عوامی پارٹی جو کہ چین نواز تھی، اس نے اب اس نعرے کو باقاعدہ پروگرام کی شکل دے دی اور صوبہ گیر تحریک شروع ہوگئی جس نے عوام میں مقبولیت حاصل کر لی۔ روزنامہ جاداواں کے مؤرخہ 5ر مارچ 1971ء کے شمارے میں شائع شدہ ایک رپورٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ، بھارت اور روس کی پریشانی کیا تھی۔

''قومی اسمبلی کے التوا کے اعلان کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان میں احتجاج کی مہم نے صوبہ گیر صورت اختیار کر لی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صورت حال رفتہ رفتہ شیخ مجیب الرحمن کے کنٹرول سے نکل کر ایسے عناصر کے ہاتھ میں جا رہی ہے جو مغربی بنگال کی کمیونسٹ تحریک نکسلائٹ کا چربہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان عناصر نے تباہی مچا رکھی ہے۔ ڈھاکہ میں ان دنوں مکمل افراتفری اور لاقانونیت کا مظاہرہ ہے۔ ابھی تک صوبہ بھر میں مکمل ہڑتال ہے۔ اگرچہ عوامی لیگ نے اعلان کر رکھا ہے کہ روزانہ دو بجے سے شام کے چھ بجے تک ہڑتال نہیں ہوگی، مگر اس کے باوجود کم از کم ڈھاکہ شہر میں تقریباً مکمل ہڑتال ہے...... نوجوان، جن کا زیادہ تر تعلق کارخانے کے مزدوروں سے ہوتا ہے، سرخ بینر اور بانس کی بڑی بڑی لاٹھیاں اور سلاخیں اٹھائے روزانہ سڑکوں پر نکل آتے ہیں۔ وہ شیخ مجیب الرحمن کے حق میں نعرے تو لگاتے ہیں مگر عوامی لیگ سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ڈھاکہ کے سیاسی حلقوں میں اس خطرے کی طرف بھی اشارہ کیا جا رہا ہے کہ اگر ڈھاکہ میں ہونے والی نکسلائٹ قسم کی سرگرمیاں مشرقی پاکستان کے دیہات اور دوسرے دور دراز علاقوں میں پھیل گئیں تو پورا مشرقی پاکستان ایک خطرناک آگ کی لپیٹ میں آجائے گا اور یہ خطرہ روز بروز زیادہ ہوتا

جارہا ہے...... اگر شیخ مجیب الرحمن کو موجودہ حالات پر قابو پانے کا جواز مل گیا تو ہوسکتا ہے کہ مشرقی پاکستان کچھ عرصے کے لئے بچ جائے۔ لیکن اگر یہ تحریک مولانا بھاشانی کے ہاتھ میں چلی گئی تو پھر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تباہی و بربادی کے سائے کہاں تک پہنچ جائیں۔''

بنگلہ دیش میں سوشلسٹ انقلاب کا خطرہ

یہی وہ خطرہ تھا جس کے پیش نظر امریکہ نے 1970ء کے اواخر میں فوجی ساز و سامان کے فاضل پرزوں کی سپلائی بحال کردی تھی جو 1965ء سے بند تھی۔ سینیٹر کینیڈی نے بھی نکسن حکومت پر یہ الزام لگایا تھا کہ پاکستان کو 25/مارچ 1971ء (آرمی ایکشن) سے قبل یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ اگر ضرورت پڑی تو امریکی سپاہی پاکستانی افواج کی امداد کے لئے بھیجے جاسکتے ہیں۔ کینیڈی کا یہ بیان 12/اگست 1971ء کے نیوز ویک میں موجود ہے جس پر پاکستان میں پابندی عائد کردی گئی تھی۔ روزنامہ پاکستان ٹائمز میں مؤرخہ 8/اپریل 1971ء کو یہ خبر چھپی کہ حکومت پاکستان ملکی گڑبڑ کو ختم کرنے کے لئے امریکی اسلحہ استعمال کرسکتی ہے۔

مولانا بھاشانی سے بھی زیادہ خطرہ اگر سامراج کو تھا تو ڈاکٹر طٰحہ سے تھا۔ ڈاکٹر طٰحہ کمیونسٹ پارٹی آف ایسٹ پاکستان کے لیڈر تھے جن کی قیادت کے گرد بھارت دشمن، چین نواز انقلابی عوام جمع تھے جو مسلح جدوجہد کررہے تھے۔ ایک وقت میں، ڈاکٹر طٰحہ مشرقی پاکستان کے سولہ میں سے کم وبیش بارہ اضلاع میں، ہندوستان نواز حکومت، مکتی باہنی اور ہندوستانی فوج کے خلاف مسلح جدوجہد کررہے تھے۔

Far Eastern Economic Review 20th کا یہ اقتباس نہایت اہم ہے۔
Nov. 1971, Werner Adam special correspondent in Dacca.
"The biggest anxiety the Mukti Bahni fighters have is caused by the attempts of local Maoist extremists to assume the leadership of the Liberation Movement. Such a struggle

within the struggle had been forecast by many observers even in the early stages of the crises. Now it appears that the 'Naxalites' have become influential in some districts.........
Eye-witness say the fight between the Naxalites and the Awami League elements in the Mukti Bahni is even more fierce than that between the Bengalis and the West Pakistanis. The Naxalites denounce the Awami League in ideological terms. While the Awami League is bent simply on driving the West Pakistanis out of Bangla Desh. The Naxalites seem to be looking further ahead to an ideological dawn over West Bengal."

اس بات کی سب کو فکر تھی کہ بنگلہ دیش بننے کی صورت میں یہ ملک کہیں چین کے زیر اثر نہ چلا جائے۔ اس صورت میں بھارت کے لئے مغربی بنگال، آندھرا اور کیرالا کو سنبھالنا مشکل تھا۔ وہاں پر ماؤنسٹوں کی تحریکیں بہت مضبوط تھیں۔ بھارت، روس اور امریکہ کے لئے یہ صورت حال نہایت خطرناک ہوسکتی تھی۔ چنانچہ مولانا عبدالحمید بھاشانی کو آسام سے گرفتار کر کے بھارت نے اپنے یہاں اپنی نظر بندی میں رکھ لیا۔

Far Eastern Economic Review 11th Dec. 1971 کے مضمون "Can Mujeeb Survive Victory" میں اسی خوف کا اظہار کیا گیا۔
"If Pakistan loses its Eastern Wing, the natural spirit of vengeance would demand the final blow of death for the Sheikh. Besides, killing him would serve a sound political purpose: It would leave Bangla Desh without real leadership, the ensuring instability in the new country could even help rise of communist forces which, with the Blood-and-Guts

revolutionaries who have almost turned India's West Bengal upside down, could leave India stewing in its own juice. It will be consolation of sorts for Pakistan."

سول نافرمانی کے نام پر عوامی لیگ نے اپنی متوازی حکومت قائم کر لی اور جب یہ سب کچھ ہو چکا تو یحییٰ خان ڈھاکہ تشریف لے گئے۔ شیخ مجیب سے ملے۔ دونوں میں کچھ طے پایا اور پھر بھٹو صاحب کو صدر صاحب کا پیغام ملا کہ آپ بھی آ جایئے۔ انہوں نے پوچھا کہ مجھے صدر صاحب سے ملنا ہے یا شیخ صاحب سے یا دونوں سے۔ جواب ملا صدر صاحب سے!! انہوں نے کہا کہ اگر مجھے صدر صاحب سے بات کرنی ہے تو یہ ملاقاتیں تو مغربی پاکستان میں بھی ہوتی رہتی ہیں اس کے لئے ڈھاکہ آنا بے معنی ہوگا۔ پھر مجیب کا بیان آیا کہ بھٹو اگر آئیں تو میں ان سے ملوں گا۔

یحییٰ خان نے آرمی ایکشن شروع کر دیا

شیخ مجیب کو غدار قرار دے کر گرفتار کر لیا گیا

پاکستان کے اندرونی معاملات میں بھارت کی مداخلت پر سب خاموش تھے

بھارت نے اس دوران پاکستان کی سرحدوں پر اپنی فوجیں جمع کرنا شروع کر دی تھیں اور شیخ مجیب کے رویے اور لہجے میں سختی بڑھ رہی تھی۔ بھٹو صاحب اپنی ٹیم کے ہمراہ ڈھاکہ پہنچے۔ ڈھاکہ کے ان مذاکرات نے قوم میں ایک نئی امید پیدا کی۔ ابھی مذاکرات جاری تھے کہ 25 مارچ 1971ء کو یحییٰ خان نے آرمی ایکشن (آپریشن سرچ لائٹ) کا حکم دے دیا۔ مذاکرات کے راستے بند ہو گئے اور شیخ مجیب نے اعلان کر دیا کہ آج سے بنگلہ دیش ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے۔ شیخ مجیب کو غدار قرار دے دیا گیا۔ عوامی لیگ پر پابندی لگا دی گئی اور شیخ مجیب اور اس کے ساتھیوں کو 25 اور 26 مارچ کی رات کو گرفتار کر لیا گیا۔ شیخ مجیب کو مغربی پاکستان میں لا کر قید کر دیا گیا۔

ملک کے مغربی حصے کے تمام سیاست دان اس کی گرفتاری پر مکمل خاموشی اختیار کر گئے۔ ایک بیان بھی اس کے حق میں نہیں آیا۔ بھٹو صاحب نے کہا "خدا کا شکر ہے، پاکستان بچ گیا۔" البتہ بھارتی میڈیا شیخ مجیب کے حق میں مسلسل پروپیگنڈا کر رہا تھا اور بھارتی افواج کی مشرقی پاکستان میں داخلے کی خبریں زور پکڑ رہی تھیں۔ پاکستان کے داخلی معاملات میں بھارت کی مداخلت پر روس، امریکہ اور اقوام متحدہ سب ہی خاموش تھے۔

یہ درست ہے کہ مغربی پاکستان محض ون یونٹ کی صورت میں تھا ورنہ مغربی حصے

میں پہلے بھی صوبے تھے، اور اس وقت بھی حکمرانوں سے غلطیاں ہوئی تھیں مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارت پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرے۔ بھارت کی طرف سے پاکستان کے اندرونی معاملات میں یہ کھلی مداخلت تھی مگر سفارتی سطح پر اور عالمی رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے یحییٰ خان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ سیاسی بصیرت سے بے بہرہ لوگ حکمرانی کر رہے تھے۔

مشرقی پاکستان بھارت کی بارہ ڈویژن فوج کے نرغے میں آ گیا۔ اس کے طیارے اور ٹینک میدان میں آ گئے۔ مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے بنگالی سپاہیوں کی تعداد پاکستانی فوج میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ جو تھے وہ مارچ 1971ء میں پاکستانی فوج کا ساتھ چھوڑ گئے۔ ایسٹ بنگال رجمنٹ میں جس کا انچارج میجر ضیاالرحمن تھا اس نے 28/مارچ کو آزادی کا اعلان نشر کرتے ہوئے کہا کہ ''میں میجر ضیاالرحمن شیخ مجیب بنگلہ بندھو کی ہدایت پر عوامی ری پبلک آف بنگلہ دیش کے قیام کا اعلان کرتا ہوں اور ان کی ہدایت پر میں نے عارضی طور پر اس ری پبلک کے سربراہ کی حیثیت میں باگ ڈور سنبھال لی ہے۔''
آکاش وانی سے خبریں آنے لگیں کہ دیناج پور (بھارتی سرحد سے کوئی تین میل دور) کشتیا (کوئی بیس میل دور) کومیلا (دو میل دور) میں سخت جنگ جاری ہے۔ پاکستانی فوجیوں اور سول شہریوں پر حملے ہونے لگے۔

''اسلامی جہادی'' اور بہاری بنگالیوں کے قتل عام میں مصروف ہو گئے

''البدر'' اور ''الشمس'' جو کہ جماعت اسلامی کی ذیلی تنظیمیں تھیں، خدائی فوجدار، بہاری رضاکاروں پر مشتمل تنظیمیں، سب فوج کے ساتھ مل کر بنگالیوں کے قتل عام میں مصروف ہو گئے۔ ادھر مکتی باہنی کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان میں 1947ء سے تقریباً ایک کروڑ ہندو آباد تھا جس کی ہمدردیاں بھی بنگلہ دیش کی آزادی کے ساتھ ہو گئی تھیں۔

کوئی بھی جنگ مقامی آبادی اور عوام کی حمایت کے بغیر نہیں لڑی جاسکتی۔ اب وہاں

کے عوام پاکستان اور فوج سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ شروع شروع میں مزاحمت محدود تھی مگر اس ''آپریشن سرچ لائٹ'' میں فوج نے بنگالیوں کو بڑی تعداد میں مارنا شروع کیا تو مزاحمت بڑھتی گئی جبکہ مکتی باہنی اور باغیوں کو بھارت اسلحہ اور دیگر امداد مہیا کر رہا تھا۔

آرمی ایکشن نے علیحدگی پر مہر لگا دی

شیخ مجیب کے چھ نکات نے عوام کی محرومی، غربت واستحصال کو مغربی پاکستان سے علیحدگی کی راہ دکھائی، یحییٰ خان کے آرمی ایکشن نے اس پر مہر لگا دی۔ اب مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ بھارت نے اس علیحدگی میں اپنے کردار کی تیاری پہلے سے کی ہوئی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کا استحصال ہوا تھا مگر وہ پاکستان کے مغربی حصے کے عوام نے نہیں کیا تھا۔ البتہ اس کا فائدہ انہیں ضرور ہوتا تھا۔ علاقے علاقوں کا استحصال نہیں کرتے بلکہ معاشی معاشرتی نظام کی وجہ سے غریب عوام کا استحصال ہوتا ہے اور یہ نظام مغربی بازو کے حکمران طبقات نے مشرقی بازو کے مفاد پرست افراد کے ساتھ مل کر پورے پاکستان پر مسلط کیا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ اس ظالم اور استحصالی گروہ کی اکثریت کا تعلق مغربی بازو سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی بازو میں عوام نے سوشلسٹ نظام معیشت اور ایک آزاد خارجہ پالیسی کے لئے پیپلز پارٹی کو ووٹ دیا تھا۔

انہی دنوں شاہراہ قراقرم پاک چین دوستی کی شاہراہ کے طور پر مکمل ہوئی۔ جب اس کا افتتاح ہوا تو پاکستان کے اندر عوام دشمن، پاکستان دشمن، اسلام فروش، رجعت پسندوں نے اس کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا کہ اس شاہراہ کے ذریعے مال کے ساتھ ساتھ سوشلزم جیسے ملحدانہ نظریات بھی چین سے پاکستان آئیں گے۔ گویا ایسے نظریات جو عوام کی غربت وافلاس کو دور کر سکیں اور ایسی دوستی جو امریکہ کے مفادات کے خلاف ہو ان لوگوں کو قابل قبول نہیں تھی اور ایسے وقت میں جبکہ بھارت کے خلاف پاکستان کو چین کی مکمل حمایت درکار تھی یہ افراد اور پارٹیاں پاکستان دشمن کردار ادا کر رہی تھیں۔

بھارت ایک مدت سے تیاری کر رہا تھا مگر بین الاقوامی سطح پر جھوٹ بول رہا تھا

بھارت مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنے کی ایک مدت سے تیاری کر رہا تھا مگر بین الاقوامی سطح پر ہمیشہ جھوٹ بولتا رہا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ بھارت کے وزیر اعظم نے صدر کینیڈی کے ساتھ ملاقات میں اعلان کیا کہ "امن ہمارے لئے ایک جذبہ اور امنگ ہے۔" اس کے چند ہی دنوں بعد بھارتی فوج نے گوا کی طرف پیش قدمی کی۔ پھر اعلان ہوا کہ "ہندی چینی بھائی بھائی ہیں" اور "بھارت چین کے ساتھ کبھی لڑائی نہیں کرے گا۔" کچھ ہی سالوں بعد بھارتی فوجوں کو حکم ملا کہ چینیوں کو نیفا اور لداخ سے اٹھا کر باہر پھینک دیں۔ وعدہ کرنے کے باوجود بھارت نے اپنی افواج حیدر آباد میں داخل کیں۔ جونا گڑھ، منگرول اور مناودر پر قبضہ کیا۔

رچرڈ نکسن نے اپنی یادداشتوں میں 6 نومبر 1971ء کی مسز اندرا گاندھی کے ساتھ ملاقات کا حوالے دیتے ہوئے لکھا ہے کہ مسز گاندھی نے اس بات پر زور دیا کہ انہوں نے پاکستان دشمن رویہ اختیار نہیں کیا۔ "ہم نے کبھی پاکستان کی تباہی کا نہیں سوچا۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہاں استحکام ہو" وغیرہ وغیرہ۔ پھر وہ لکھتا ہے کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ جس وقت ہم یہ گفتگو کر رہے تھے مسز اندرا گاندھی اچھی طرح جانتی تھیں کہ ان کے جرنیل اور مشیر اس وقت مشرقی بازو میں مداخلت کا منصوبہ بنا رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ مغربی بازو پر حملے کے منصوبے بھی بن رہے تھے۔

نکسن یحییٰ خان کو نہیں ہٹانا چاہتا تھا

"Do not Sequeeze Yahya at this time"

ابھی چند ماہ پیشتر امریکہ کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے آفس آف دی ہسٹورین نے

VOL-XI جو کہ 1971ء میں جنوبی ایشیا، بالخصوص 1971ء جنگ کے بارے میں ہے، جاری کی ہے۔اس کے کچھ حصے بہت دلچسپ ہیں۔ ہنری کسنجر جو اس وقت صدر نکسن کے قومی سیکورٹی کے ایڈوائزر تھے، کہتے ہیں کہ ''جب نکسن نے قلمدان صدارت سنبھالا تو ہماری پالیسی برصغیر کے بارے میں سادہ اور آسان تھی۔'' اور وہ یہ کہ ''ہم اپنے پہلے سے موجود ایجنڈے میں کسی اور الجھن یا پیچیدگی کا اضافہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہمیں اس جھنجھٹ سے دور رہنا چاہیے۔ بیافرا کی طرح۔ What the hell we can do? مگر برصغیر میں تبدیل ہونے والے واقعات اور چین کی وجہ سے نکسن کو اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔ نکسن نے پاکستان کے ذریعے پیکنگ کے ساتھ تعلقات کو بڑھانا شروع کیا۔ وہ یحییٰ خان کو ہٹانا نہیں چاہتا تھا۔

جب 28/اپریل 1971ء کو پاکستان کے ساتھ امریکہ کے مستقبل کے تعلقات کے بارے میں کسنجر نے اپنا نوٹ بھیجا تو نکسن نے اپنی تحریر میں نوٹ لکھا Don't sequeeze Yahya at this time. کچھ دن بعد مسز اندرا گاندھی نے نکسن کو مشرقی پاکستان سے سینکڑوں بنگالی مہاجروں کی بھارت آمد کے بارے میں لکھا اور اپنے سفیر کے ذریعے پیغام بھیجا کہ مہاجروں کے اس سیلاب کو روکنے کے لئے ہم اپنے گوریلے مشرقی پاکستان میں داخل کریں گے تو نکسن نے کہا By God we will cut off economic aid to India مگر ہم سب نے دیکھا کہ یہ ایڈ جاری رہی۔

جولائی 1971ء کے دوسرے ہفتے میں کسنجر نے چین کا دورہ کیا۔ جہاں پر وزیراعظم چو۔این۔لائی نے کہا کہ ہمارے خیال میں اگر بھارت عالمی برادری کے دباؤ کے باوجود اپنے موجودہ جارحانہ اقدامات سے باز نہیں آتا تو ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھے رہیں گے۔ کسنجر نے جواباً کہا کہ ہماری ہمدردیاں بھی پاکستان کے ساتھ ہیں۔

واشنگٹن کو سب سے بڑا دھچکہ اس وقت لگا جب 9/اگست 1971ء کو بھارت اور روس نے ''امن، دوستی اور تعاون'' کے نام سے آپس میں معاہدہ کیا اور دہلی ماسکو مشترکہ مفادات کھل کر سامنے آ گئے۔ دراصل یہ بیس سالہ معاہدہ، امن اور دوستی کی آڑ میں، دفاعی معاہدہ تھا۔

4 رنومبر اور 5 رنومبر 1971ء کو اندرا گاندھی اور نکسن کی واشنگٹن میں ملاقات ہوئی جس میں یہ یقین دلایا گیا کہ برصغیر میں ایک اور جنگ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے روز نکسن نے کسنجر کو کہا ''بھارتی بہر حال حرامی ہیں اور جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔''

جب جنگ شروع ہوئی تو یہ جاننے کے باوجود کہ چین اپنی پالیسی اور فیصلوں کا تعین خود کرتا ہے امریکہ چاہتا تھا کہ چین بھارت کو خوفزدہ کرنے کے لئے اپنی افواج کی نقل و حرکت کرے۔ کسنجر نے اقوام متحدہ میں چین کے مندوب ہوانگ کو بلا کر کہا کہ اگر روس نے چین پر حملہ کیا تو امریکہ روس کے خلاف کارروائی کرے گا۔ گویا روس اگر بھارت کی مدد کرتا ہے تو چین پاکستان کی مدد کرے۔

امریکہ کا ساتواں بحری بیڑہ حرکت میں نہیں آیا

اس وقت امریکہ کی پالیسی کچھ اس طرح سے تھی کہ Let Asians fight with Asians یہی وجہ ہے کہ امریکہ کا ساتواں بحری بیڑہ 1971ء کی جنگ میں آخری وقت تک پاکستان کی مدد کو نہیں پہنچا۔ حالانکہ روس نے اپنے بحری جہاز جو کہ نیوکلیئر میزائل سے لیس تھے 6 ردسمبر کو Vladivostok سے بھارت کی مدد کو روانہ کر دیئے تھے اور دوسرا گروپ 13 ردسمبر کو بھیجا گیا تھا۔

9 ردسمبر 1971ء کو جب CIA کے ڈائریکٹر نے نکسن کو اطلاع دی کہ East Pakistan is Crumbling تب نکسن نے فیصلہ کیا کہ Anti-Aircraft Carrier "USA Enterprise" کو حرکت میں لایا جائے۔

بھارتی ایسٹ کمانڈ کے میجر جنرل کے کے تیواڑی کا کہنا ہے کہ تینوں افواج کے سربراہ اندرا گاندھی کو جنگ کی بریفنگ دے رہے تھے کہ ایڈمرل ایم نندا نیوی چیف نے اس بریفنگ کو رکوا کر اطلاع دی کہ ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ امریکہ کا ساتواں بحری بیڑہ خلیج بنگال کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اندرا گاندھی نے سُنی ان سُنی کر دی۔ کچھ دیر بعد ایڈمرل نے اس خبر کو پھر دہرایا۔ اندرا کہنے لگیں ''سن لیا ہے۔ بریفنگ جاری رکھیں۔'' بعد میں یہ پتہ چلا

کہ اندرا امریکہ کے اس Bluff کو جانتی تھیں۔

البتہ چین نے NEFA کا فرنٹ کھول دیا تھا۔ ایک اور پہلو جس کے بارے میں بہت کم معلومات سامنے آئی ہیں وہ یہ ہے کہ 1962ء کی چین بھارت جنگ کے بعد بھارت نے چین کے خلاف آئندہ جنگ کی تیاری کے لئے تبت کے نوجوانوں کو بھرتی کرنا شروع کیا ہوا تھا۔ اس سپیشل فرنٹیئر فورس کی گوریلا تربیت ایک جرنیل کے ماتحت یوپی میں چکراتا کے مقام پر کی جاتی تھی۔ اکتوبر ر 1971ء میں ان میں سے ہزاروں کو آہستہ آہستہ چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے میں گوریلا جنگ کے لئے داخل کیا گیا۔ اس علاقے کے گھنے جنگلوں اور جونکوں سے بھرے نشیبی دلدل کے علاقوں میں پاکستانی فوج کی ایک مضبوط بریگیڈ موجود تھی جس سے بھارت کو خطرہ تھا کہ اس کی موجودگی میں اس راستے سے ڈھاکہ تک پہنچنا مشکل ہوگا۔ چنانچہ ان گوریلوں نے جن کے پاس بلغارین رائفلز اور ان کا اپنا روایتی ہتھیار چاقو تھا، پاکستانی افواج کے مورچوں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ ان کا کمانڈر ایس ایس اوبان تھا۔ اس کے بقول 16 ر دسمبر 1971ء کو یہ فورس چٹاگانگ پورٹ سے 40 کلومیٹر تک کے فاصلے پر پہنچ چکی تھی۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بھارت نے مشرقی پاکستان کو توڑنے کی فوجی تیاری کب سے اور کس کس طرح سے کی تھی۔ جبکہ ہماری افواج ایک ہزار میل کے فاصلے پر اندر اور باہر دونوں طرف سے گھری ہوئی تھیں اور بھارتی طیارے گنگا کے اغوا کے بعد، جو کہ پاکستان کے خلاف ایک سازش تھی، بھارت نے ہوائی راستہ بھی بند کیا ہوا تھا۔ ہمارے جہازوں کو لمبا چکر کاٹ کر مشرقی پاکستان پہنچنا پڑتا تھا اور یحییٰ خان اور اس کا ٹولہ ملکی حفاظت سے زیادہ اپنے اقتدار کی حفاظت میں مصروف تھا۔

بھارتی جہاز ''گنگا'' کا اغوا

30 ر جنوری 1971ء کو بھارتی جہاز گنگا کو، جو جموں سے پرواز کر رہا تھا، اغوا کر کے لاہور لایا گیا۔ میں ایئر پورٹ پہنچا۔ بھٹو صاحب اغواء کنندگان محمد اشرف اور ہاشم قریشی سے ملے۔ شیخ رشید (بابائے سوشلزم) کو انہوں نے ہدایت کی کہ ان (اشرف اور ہاشم) کا

ہیروز کی طرح سے استقبال کیا جائے۔ گنگا جلانے کے بعد ان کو ایک ٹرک پر جلوس کی شکل میں مال روڈ لایا گیا۔ اس ٹرک پر شیخ رشید اور پیپلز پارٹی کے کئی لیڈر سوار تھے۔ ہم نے اور پاکستان کے تمام اخبارات نے اشرف اور ہاشم کو ہیرو کے طور پر چھاپا۔ اشرف کا تعلق اسلامی جمعیت طلبا کے ساتھ تھا اور وہ یہاں ہی رہتا تھا۔ جہاز کے اس اغوا کے نتیجے میں مشرقی اور مغربی بازو کے درمیان بھارت پر سے جانے والے فضائی رابطے منقطع ہو گئے۔

مظالم کی لرزہ خیز داستان

عوامی لیگ اور مکتی باہنی کی جانب سے کئے جانے والے مظالم کی بھی ایک لرزہ خیز داستان ہے۔ لندن کے اخبار سنڈے ٹائمز کے رپورٹر نے 2 رمئی 1971ء کے شمارے میں جو رپورٹ چھاپی وہ یوں تھی ''(ان ہنگاموں میں) زندہ انسانوں کی آنکھیں نکالی گئیں۔ مردوں اور عورتوں کو سرعام پیٹا گیا۔ عورتوں کی چھاتیاں کاٹی گئیں اور جو لوگ ان کے قابو میں آئے انہیں گولیوں یا سنگینوں سے قتل کرنے سے پہلے ان کے اعضا بری طرح کاٹے گئے۔ فوج کے پنجابی افسروں اور غیر بنگالی سول ملازمین اور ان کے بیوی بچوں کو اسی طرح وحشت اور درندگی سے قتل کرنے کے لئے خاص طور پر چنا گیا۔ چٹا گانگ میں ملٹری اکیڈمی کے کرنل کو گولی مار کر ہلاک کیا گیا اور اس کی آٹھ ماہ کی حاملہ بیوی کی پہلے عصمت دری کی گئی پھر اس کے پیٹ میں سنگینوں کے کچوکے دے دے کر (تڑپا تڑپا کر) مارا گیا۔ چٹا گانگ کے ایک حصے سے ایسٹ پاکستان رائفلز کے ایک افسر کی زندہ کھال کھینچی گئی۔ اس کے لڑکوں کے سر کاٹے گئے اور اس کی بیوی کے پیٹ میں سنگین گھونپ گھونپ کر مارا گیا اور پھر اس کے بچے کا سر اس کے برہنہ جسم کے اوپر رکھ دیا گیا۔ بہت سی نوجوان لڑکیوں کی لاشیں اس حالت میں ملیں کہ بنگلہ دیش کے جھنڈے کی ڈنڈیاں ان کی شرمگاہوں میں گھسی ہوئی تھیں۔

''چٹا گانگ اور کھلنا میں مغربی پاکستان کے باشندے زیادہ تعداد میں تھے اس لئے زیادہ تباہی ان ہی شہروں میں ہوئی۔ چٹا گانگ میں مقتول غیر بنگالی اور سرکاری افراد کی تعداد نو ہزار کے قریب پہنچی ہے اور کم و بیش اتنی ہی تعداد کھلنا کی ہے۔ قتل و غارت گری کے

ہولناک واقعات کی رپورٹیں دیگر مقامات سے بھی موصول ہوئی ہیں۔ دیناج پور کے قریب ٹھاکوزاؤن کے مقام پر قریباً تین ہزار ذبح شدہ عورتوں اور بچوں کی لاشیں ملی ہیں۔ جیسور کے قریب ایشردی کے مقام پر قریباً دو ہزار، ڈھاکہ کے شمال مشرق میں بھیراب بازار کے قریب پانچ سو اور کالوگھامڑو کے علاقے میں پٹ سن کے کارخانے کے ایک شیڈ میں 253 لاشیں ملی ہیں۔ بھارتی صوبہ تری پورہ کے اس پار برہمن باڑیہ کے مقام پر میں نے 82 بچوں کی لاشیں دیکھیں جنہیں ایک لائن میں کھڑا کر کے گولی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ ایک جیل خانے کے اردگرد میں نے قریب تین سو بنگالیوں کی لاشیں دیکھیں۔ باغیوں نے انہیں اس وقت گولی ماری جب وہ پاکستانی فوج کی آمد پر بھاگ رہے تھے۔''

ادھر بنگلہ دیش حکام کا کہنا تھا کہ پاکستانی فوج نے کہیں زیادہ دہشت گردی کی۔ تین ملین لوگ مارے۔ جبکہ حمودالرحمن کمیشن رپورٹ میں سویلین کی یہ تعداد 26 ہزار ہے۔ جو مہاجرین مشرقی پاکستان سے بھاگ کر بھارت پہنچے، بھارتی ذرائع کے مطابق ان کی تعداد 8 سے 10 ملین تک تھی۔ بنگلہ دیش کے حکام کے مطابق لاکھوں بنگالی عورتوں کی عصمت دری کی گئی جنہوں نے بعد میں ہزاروں ''وار بے بی'' پیدا کئے۔

جماعت اسلامی کی ''البدر'' اور ''الشمس'' تنظیموں نے پاکستانی فوج کے ساتھ مل کر بنگالیوں کا قتل عام کیا۔ ابھی حال ہی میں بنگلہ دیش میں جنگی جرائم کے ایک ٹریبونل نے جماعت اسلامی کے رہنما دلاور حسین کو 1971ء کی جنگ میں بنگالیوں کے قتل کے جرم میں ملوث ہونے پر سزائے موت دی ہے۔

یہ اعدادوشمار کتنے بھی صحیح یا غلط ہوں مگر یہ حقیقت ہے کہ یحییٰ خان اور اس کے ٹولے کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے بہت بڑی تعداد میں عصمتیں لٹیں۔ لاکھوں افراد گھر سے بے گھر ہوئے۔ ایک بہت بڑی تعداد میں انسانی قتل عام ہوا، خواہ وہ بنگالی تھے یا غیر بنگالی۔

26/مارچ 1970ء کو مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن کے بعد سے لے کر نومبر/1971ء تک پیپلز پارٹی مسلسل یہ مطالبہ کرتی چلی آئی کہ جب تک عوام کے نمائندوں کو اقتدار منتقل نہیں کیا جاتا ملک کا سیاسی بحران ختم نہیں ہوسکتا۔ مگر وہ لوگ اور جماعتیں

جنہیں عوام نے مسترد کر دیا تھا اس مطالبے کو ''بھٹو اقتدار کا بھوکا ہے'' کا رنگ دے کر یحییٰ خان کو مسلسل یہ مشورہ دیتی رہتی تھیں کہ بھارت کی طرف سے جنگ کا خطرہ ہے اور مشرقی پاکستان میں حالات خراب ہیں اس لئے فوجی حکومت کو ہی رہنا چاہیے۔ مگر جب بھٹو صاحب بھارتی جارحیت کے خطرے کے پیش نظر چین کے دورے پر گئے تو جماعت اسلامی سے لے کر خان قیوم لیگ تک سات جماعتوں نے اکٹھے ہو کر متحدہ مخلوط پارٹی کا نام دے کر چاہا کہ انہیں اقتدار منتقل کر دیا جائے۔ یہ متحدہ پارٹی کس کے کہنے پر اور کس کے باورچی خانے میں بنی سب جانتے ہیں۔

یہ خان قیوم خان وہی تھے جنہوں نے بھابڑا بازار میں معصوم کسانوں کا قتل عام کیا تھا۔ اور یہ وہی تھے جو تین ہفتے جیل میں رہنے کے بعد اپنی صحت کی خرابی کا بہانہ بنا کر ایوب خان کو تحریری معافی نامہ دے کر اور ان کا شکریہ ادا کر کے رہا ہوئے تھے۔ بھٹو صاحب ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ کبھی ''ڈبل بیرل'' اور کبھی ''بزدل'' کہہ کر۔ مگر پھر یہی خان قیوم خان تھے جو بعد میں بھٹو صاحب کی کابینہ میں وزیر داخلہ تھے۔ وقت کا تقاضا تھا کہ اقتدار عوامی نمائندوں کو منتقل کیا جاتا، تاکہ عوام اپنے محاذ پر اور فوج اپنے محاذ پر جم کر کام کر سکتی۔ مگر یحییٰ خان مغربی بازو میں بھی اقتدار سیاست دانوں کو منتقل کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے نورالامین جس نے انتخابات میں قومی اسمبلی کی صرف ایک نشست حاصل کی تھی اس کو وزیراعظم اور بھٹو صاحب جنہوں نے اس ایوان میں 81 نشستیں حاصل کی تھیں ڈپٹی وزیراعظم اور وزیر خارجہ بنانے کا اعلان کر دیا۔ اور بھٹو صاحب نے اقوام متحدہ میں یحییٰ حکومت کی نمائندگی کی۔

مغربی محاذ بھی کھل گیا

اب با قاعدہ جنگ تھی۔ تمام مفروضے غلط ثابت ہوئے

پھر مغربی محاذ بھی کھل گیا۔ بھارت پاکستان کے مغربی حصے کی سرحدوں میں گھس آیا۔ مغربی محاذ پر جب جنگ شروع ہوئی تو اب یہ با قاعدہ جنگ تھی جو بھارت نے شروع کی تھی۔ یہ جنگ تین دسمبر 1971ء کو شروع ہوئی اور 16 ردسمبر 1971ء تک جاری رہی۔ ان 13 دنوں میں بہت سے کھوکھلے مفروضے غلط ثابت ہوئے۔ مثلاً یہ کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان میں ہے۔ یعنی اگر مشرقی پاکستان پر بھارت نے حملہ کیا تو ہم مغربی سرحدوں پر بھارت کو الجھا کر مشرقی پاکستان کا تحفظ کریں گے۔ اس مفروضے کا کھوکھلا پن پہلے بھی 1965ء کی جنگ میں کھل چکا تھا۔ جس کا بھارت کو بھی اندازہ تھا اور مشرقی پاکستان کے عوام بھی اس کھوکھلے پن کو جانتے تھے۔ مگر ہمارا حکمران طبقہ یہ راگ الاپتا رہا تھا۔

دوسرا مفروضہ جو غلط ثابت ہوا وہ یہ تھا کہ مشرقی اور مغربی حصے کے عوام میں اسلام ایک ایسا مضبوط رشتہ ہے جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے عوام ہم سے کبھی الگ نہیں ہوں گے۔ گویا آپ مذہب کے نام پر ان کا استحصال کرتے چلے جائیں۔ ان کے حقوق سلب کرتے رہیں اور جب کبھی وہ اپنے حقوق کا مطالبہ کریں تو آپ ''اسلام خطرے میں ہے'' کا ڈھول پیٹنا شروع کر دیں اور ان سے توقع رکھیں کہ وہ آپ کے ساتھ رہیں گے۔ حکمران طبقات اور اسلام پسندوں کا یہ غیر منطقی مفروضہ بھی غلط ثابت ہوا۔

تیسرا مفروضہ جو امریکہ پر بھروسہ کرنے کے بارے میں تھا اس کی دوستی اور اس

کی آڑے وقت میں مدد کے بارے میں پراپیگنڈہ کیا جاتا تھا۔ اس سب کا بھانڈا پھوٹا۔ امریکہ کسی حکمران، فرد یا کسی خاص ملک کا دوست نہیں ہوتا وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے اپنے حواری حکمرانوں کو پالتا ہے۔ انہیں نوازتا ہے اور ان کی حکومتوں کو اپنے حق میں استعمال کرتا ہے اور ان حکومتوں کے مشکل وقت میں وہ وہی سلوک کرتا ہے جو اس نے ایران کے شاہ رضا شاہ پہلوی کے ساتھ کیا تھا۔

''جنگ اسلام لڑ رہا ہے'' ''فتح حق کی ہوگی''

جب جنگ شروع ہوئی تو اسلام فروش اندرون پنجاب اور بلوچستان کی طرف بھاگ گئے

جب پاکستان کی مغربی سرحدوں پر یہ جنگ شروع ہوئی تو ہمارے اسلام پسند اور رجعت پسند اخبارات نے بڑی بڑی سرخیاں لگانا شروع کیں کہ ''جنگ اسلام لڑ رہا ہے۔'' ''فتح حق کی ہوگی۔'' میں نے ان میں سے ایک ایڈیٹر سے پوچھا کہ اگر خدانخواستہ پاکستان ہار گیا تو کیا پھر آپ لکھیں گے کہ بھارت حق پر تھا یا یہ کہ اسلام جنگ ہار گیا۔ انہوں نے کہا ''زیدی صاحب سمجھا کرو'' اور مجھے آج تک مذہب کے اس طرح کے استعمال کی سمجھ نہیں آسکی۔ انتہا درجے کی موقع پرستی کی حدیں بھی کہیں جا کر ختم ہو جاتی ہیں۔

ہمارے ان طبقات اور حضرات کے اندر چھوٹے بڑے طالبان ہمیشہ سے موجود تھے اور پل رہے تھے۔ ضیاالحق جیسے لوگ تھے جن کی داڑھیاں باہر نہیں تھیں بلکہ ان کے پیٹوں میں تھیں۔ اسلام کے نام پر یہ لوگ ہمیشہ معصوم انسانوں کے جذبات کے ساتھ کھیلتے رہے ہیں اور اب شریعت کے نفاذ کے نام پر اور اسلام کے نام پر معصوم انسانوں کا قتل عام کر رہے ہیں۔

جب جنگ شروع ہوئی تو لاہور کے عوام نے، ہم نے، آپ نے دیکھا کہ یہ لوگ اپنی گاڑیوں پر ''کرش انڈیا'' ''اسلام کی فتح ہوگی'' ''جنگ اسلام لڑ رہا ہے'' کے بینر

لگائے اپنے سامان اور خاندان سمیت لاہور سے دور اندرونِ پنجاب یا بلوچستان کی طرف بھاگ رہے تھے۔ راوی کے پل پر ہزاروں گاڑیوں کی قطاریں تھیں۔ ہمارا دفتر داتا دربار کے برابر میں تھا۔ ہم ان بھگوڑوں کو ہر روز قطار اندر قطار محفوظ مقامات کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھتے تھے۔ جبکہ پاکستان کے غریب اور محنت کش عوام پاکستان کی فتح کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے، ملک اور قوم پر اس مشکل وقت میں ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے ہمیشہ کی طرح تیار تھے۔

ریڈ کراس سنٹر کے باہر خون کے عطیات دینے کے لئے زندہ دلانِ لاہور کی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ اس سنٹر کے انچارج ہمارے دوست ڈاکٹر اقبال سرہندی کا کہنا تھا کہ ان رضا کاروں کو سنبھالنا مشکل ہوگیا ہے۔ جنگی ترانے اور ملی نغمے قومی جوش و جذبے کو قائم رکھے ہوئے تھے۔ عام فوجی محاذ جنگ پر لڑ رہا تھا۔ جرنیل جنگ سے کترا رہا تھا۔ بھارتی توسیع پسند اور سوشل سامراج، مکتی باہنی اور عوامی لیگ، مغربی بازو کے حکمرانوں کی غلطیوں کی فصل بنگلہ دیش کی شکل میں کاٹ رہے تھے اور امریکہ اس کا بالواسطہ حصے دار تھا۔

سیالکوٹ کے بارڈر پر ٹینکوں کا گھمسان کا رن پڑا۔ ظفر وال سیکٹر پر سعید شفقت کے چھوٹے بھائی میجر حمید شفقت آگے کے مورچوں پر جنگ میں مصروف تھے۔ میں اور سعید شفقت ٹینکوں کی اس جنگ کو دیکھنے ان مورچوں پر پہنچے۔ کئی مورچوں پر ہمارے نوجوانوں کا قبضہ تھا۔ ہندوستانی فوجی جاتے ہوئے اپنے کاغذات اور دیسی ساخت کی وہسکی کی خالی بوتلیں چھوڑ گئے تھے۔ ہم نے ایک رات پاکستانی فوجیوں کے ساتھ کیمپ میں گزاری۔ کچھ نوجوان کیپٹن اور لیفٹیننٹ بھی اس شام ہمارے ساتھ کھانے میں شامل تھے۔ اگلے روز جب ہم واپس لاہور پہنچے تو پتہ چلا کہ ان میں سے ایک افسر طلعت کا ٹینک تباہ ہو کر جل گیا اور اس کے جسم کی راکھ فیصل آباد اس کے گھر بھجوا دی گئی ہے۔ اس کا چہرہ میری نظروں کے سامنے گھوم گیا بعد میں پتہ چلا کہ پاکستان کے لئے جان دینے والا یہ نوجوان افسر احمدی تھا۔

سلامتی کونسل کی خاموشی۔ پولینڈ کی قرارداد کا شاخسانہ

امریکہ نے 3دسمبر کو صورت حال کی سنگینی کے پیش نظر سلامتی کونسل کا ہنگامی اجلاس طلب کیا اور اس میں جنگ بندی کی قرارداد پیش کی تو روس نے اس قرارداد کو مسترد کر دیا۔ چوبیس گھنٹوں میں سلامتی کونسل کا دوسری بار اجلاس ہوا مگر روس نے پھر اس پر اپنا ویٹو کا حق استعمال کیا۔

بھٹو صاحب چار روز تک اپنے وفد کے ہمراہ بطور وزیر خارجہ سلامتی کونسل میں تقاریر کرتے رہے۔ مشرقی پاکستان پر بھارت کے جارحانہ حملے اور قبضے پر سلامتی کونسل خاموش رہی۔ روس اور بھارت اس جنگ کو جاری رکھنا چاہتے تھے تاکہ پاکستان ٹوٹ جائے۔ روس کے اس اقدام کے فوراً بعد مسز گاندھی نے اپنی پارلیمنٹ میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا۔

بھٹو صاحب نے اپنی تقریر کے دوران لکھے ہوئے نوٹس پھاڑ کر پھینکے اور احتجاجاً سلامتی کونسل سے اٹھ کر واپس پاکستان آ گئے۔ وہ تمام افراد اور ادارے جو اس ساری صورت حال میں بوکھلائے ہوئے تھے اور پاکستان توڑنے کی ذمہ داری سے فرار کا راستہ اختیار کئے ہوئے تھے انہوں نے پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ بھٹو صاحب نے پولینڈ کی مسودہ قرارداد پھاڑ دی اس لیے جنگ بندی نہ ہو سکی۔

جو لوگ اقوام متحدہ کے نظام کارکردگی سے واقف ہیں انہیں یہ معلوم ہے کہ کوئی تحریر، تقریر، بیان، مؤقف یا مسودہ قرارداد جو اس پلیٹ فارم پر آتی ہے وہ اس کے ریکارڈ کا حصہ بن جاتی ہے۔ بلکہ مسودہ قرارداد کو تو نمبر بھی الاٹ کیا جاتا ہے۔ میں نے اقوام متحدہ کا ریکارڈ 1971ء پاک بھارت جنگ کے حوالے سے تفصیل سے دیکھا ہے اور پولینڈ کی اس مسودہ قرارداد کو تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے مجھے تو آج تک یہ مسودہ نہیں مل سکا۔ اگر کسی کے علم میں ہو تو براہِ مہربانی اس تاریخی دستاویز کو منظر عام پر لے آئے۔

اے پی پی کے نمائندے افتخار علی جو اس اجلاس کی کاروائی کی رپورٹنگ کر رہے

تھے اور اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بھٹو صاحب نے سلامتی کونسل میں جو کاغذات پھاڑے تھے وہ ان کی تقریر کے نوٹس تھے۔ جب بھٹو صاحب نے سلامتی کونسل کے اجلاس سے واک آؤٹ کیا تو افتخار علی نے بھٹو صاحب سے کہا کہ اگر انہیں ان کی تقریر کا مسودہ مل جائے تو تمام تفصیلات وہ اپنی خبر میں پاکستان بھیج دیں گے۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ انہوں نے تقریر لکھنے کے بجائے ہاتھ سے نوٹس لکھے تھے جو انہوں نے سیکورٹی کونسل کے ہال میں پھاڑ کر پھینک دیئے ہیں۔ اس پر افتخار علی نے سیکورٹی کونسل کے ہال میں جا کر وہ ٹکڑے اٹھائے اور انہیں جوڑ کر پڑھا اور خبر بنا کر بھیج دی۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ یہ نوٹس بھٹو صاحب کے پاکستان پہنچتے پہنچتے پولینڈ کی مسودہ قرارداد کا روپ دھار لیں گے تو وہ ان کو محفوظ کر لیتے۔ افتخار علی آج کل نیویارک میں رہتے ہیں۔

دراصل یحییٰ خان کی فوجی حکومت پاکستان کی شکست کی ذمہ داری ذوالفقار علی بھٹو پر ڈالنا چاہتی تھی۔ پاکستان نے بھارت سے سفارتی تعلقات منقطع کر لیے۔ ملک کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا۔ ہم بالآخر جنگ ہار گئے۔ ملک ٹوٹ گیا۔ چین کے وزیر اعظم نے کہا کہ یہ انجام نہیں آغاز ہے۔

پاکستان ٹوٹ گیا

پاکستانی فوج کو شکست ہوگئی۔ مشرقی پاکستان میں 93 ہزار فوجی اور عام شہری بھارت میں جنگی قیدی بنا لئے گئے۔ ہزاروں میل کا پاکستانی رقبہ بھارت کے قبضے میں چلا گیا اور پاکستان کو ایک شرمناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ مشرقی پاکستان میں جہاں دھان کے کھیت لہلہاتے تھے، جو پٹ سن کے سنہرے ریشوں کا شونا ردیش تھا، جہاں پان کی بیلیں پھیلتی تھیں۔ جھیلوں اور تالابوں میں نیلے رنگ اور کنول کے پھول، بطخیں اور سنگھاڑے ہوتے تھے۔ پہاڑی کی ڈھلانوں پر چائے کے کھیتوں میں قطار اندر قطار رنگ برنگی ساڑھیوں میں ملبوس بڑی بڑی آنکھوں اور لمبے لمبے گھنے بالوں والی سانولی لڑکیاں بلا کسی خوف، چائے کی پتیاں چنتی تھیں، چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں چارخانہ تہمد باندھے ماہی گیر صدیوں سے گائے جانے والے مشہور لوک گیتوں کی دھنیں فضا میں بکھیرتے تھے۔ وہ ہرا بھرا مشرقی پاکستان اب لہولہان تھا۔ وہ سرزمین جس میں بسنے والے ہر فرد کی رگ رگ میں موسیقی تھی، اب نفرتوں کے الاؤ میں جل رہا تھا۔ پھولوں کی رنگت بدل گئی تھی۔ پاکستان کے مغربی اور مشرقی بازو کی طوطے مینا کی کہانی میں سے بنگالے کی مینا اُڑ گئی تھی۔

ملک توڑنے کے ذمے دار یحییٰ خان، جنرل حمید اور جنرل نیازی جیسے افسران کا کورٹ مارشل ہونا چاہیے تھا لیکن نہیں ہوا۔ ملک ٹوٹنے کے فوراً بعد جبکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ ملک ٹوٹنے کے اسباب وعوامل پر ایک بھرپور اور سنجیدہ بحث چھیڑی جاتی، پاکستان میں دیومالائی کہانیوں کے ڈائجسٹوں اور غیر ملکی جنسی رسالوں کی بھرمار کردی گئی۔ ہفت روزہ نصرت کی اس وقت تقریباً ایک لاکھ سرکولیشن تھی جو دو ہفتوں میں گر کر بیس ہزار پر آ گئی۔ یہی

حال دیگر سیاسی مگر سنجیدہ جریدوں کا ہوا۔ کچھ اخبارات ورسائل یحییٰ خان کے عاشقانہ شب و روز کو افسانوی رنگ میں پیش کرنے لگے۔ جنرل رانی، بلیک بیوٹی، نور جہاں کے یحییٰ خان کے ساتھ سکینڈل چھپنے لگے اور ہماری شکست کی وجہ یحییٰ خان کی شراب اور عورت کو ٹھہرایا جانے لگا۔ یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا جا رہا تھا۔

پاکستان ٹوٹ جانے کے بعد بلوچستان سے محمد اکبر خان بگٹی نے کھلے عام بھارت کے ساتھ کنفیڈریشن کا مطالبہ کر دیا۔ سندھ میں مولا بخش سومرو جیسے لوگ اعلان کر رہے تھے کہ پاکستان اتنا غیر فطری تھا کہ خدا بھی اسے چلانے کے قابل نہیں۔ سرحد سے مفتی محمود (مولانا فضل الرحمن کے والد) نے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ تخلیقِ پاکستان میں ان کے ہاتھ لتھڑے ہوئے نہیں۔ پنجاب میں جماعت اسلامی اور اس کے ہم نوا پہلے ہی پاکستان کے خلاف تھے۔

کوئی بھی بنگلہ دیش کی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ بھٹو صاحب سے لے کر مولانا مودودی تک سب ہی بنگلہ دیش نامنظور کے نعرے لگا رہے تھے۔ نوائے وقت جیسے رجعت پسند اخباروں نے جو سرخی لگائی وہ ''سقوط ڈھاکہ'' تھی۔ یعنی پاکستان کا اسقاط ہو گیا۔ دوسرے لفظوں میں پاکستان کے شکم میں جو بچہ تھا وہ اسقاط حمل کی وجہ سے گر گیا۔ سقوط یا اسقاط کا مطلب abortion ہے۔ اتنے بڑے المیے کے باوجود مشرقی پاکستان کے بارے میں پنجابی شاونسٹوں کا تضحیک آمیز رویہ باقی تھا۔ مشرقی پاکستان کے لوگ ہم سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ پاکستان ٹوٹ گیا تھا مگر وہ اس حقیقت کو اسقاط حمل سے تعبیر کر رہے تھے۔ ''سقوط ڈھاکہ'' کی یہ غلط العام اصطلاح آج تک جاری ہے۔

بھٹو صاحب نے 1971ء میں اقتدار میں آ کر شیخ مجیب سے ملاقات کی اور بتایا کہ وہ انہیں رہا کرنے آئے ہیں۔ رہائی سے پہلے بھٹو چاہتے تھے کہ مجیب اس بات کا وعدہ کریں کہ وہ واپس جا کر مشرقی پاکستان کی پاکستان سے مکمل علیحدگی کا اعلان نہیں کریں گے بلکہ ایک ڈھیلی ڈھالی سی کنفیڈریشن کی صورت میں مغربی پاکستان کے ساتھ جڑے رہیں گے۔ بھٹو صاحب کے مطابق اس مطالبے پر شیخ مجیب پہلے تو خاموش رہے پھر اپنی جیب

سے انہوں نے قرآن پاک کا چھوٹا سا نسخہ نکالا اور اس پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ وہ کبھی مشرقی پاکستان کی مکمل علیحدگی کی بات نہیں کریں گے۔ بلکہ اسے متحد رکھنے کی تدابیر کریں گے۔ کیونکہ انہوں نے طالب علمی کے زمانے سے تحریک پاکستان میں حصہ لیا تھا۔ شیخ مجیب لندن گئے پھر مشرقی پاکستان اور انہوں نے پلٹن میدان میں بنگلہ دیش کے قیام کا اعلان کر دیا۔ شاید حالات مجیب کے اختیار سے بھی باہر تھے۔ حتیٰ کہ مولانا بھاشانی جو کہ 11 نکات کی روشنی میں ایک پاکستان میں رہتے ہوئے معاشی استحصال کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے انہیں بھی شیخ مجیب سے دو ہاتھ آگے بڑھ کر آزاد بنگلہ دیش کا نعرہ لگانا پڑا۔

اب شیخ مجیب الرحمن اپنے پیدا کردہ حالات کی قید میں تھے

1970ء کے انتخابات کے بعد اور 1971ء کے آغاز میں مجیب بھٹو مذاکرات کے موقع پر جب ہمارے دوست نامور صحافی حسین نقی مشرقی پاکستان گئے۔ واپسی پر ان کا تبصرہ تھا کہ ''شیخ مجیب نے اپنے لئے خود یہ کردار منتخب کیا ہے کہ وہ مشرقی پاکستان کے اقتدار سے محروم محدود مفاد پرست طبقے کے نمائندہ کی حیثیت سے پاکستان کے مفاد پرست سرمایہ دار، جاگیردار اور حکمران نوکر شاہی جس کا تعلق پیدائشی یا رہائشی اعتبار سے مغربی پاکستان سے ہے، ٹکر لیں اور اس ٹکراؤ کے لئے انہوں نے اپنے گرد سب سے زیادہ وسیع پیمانے پر درمیانہ طبقے کو جو بنیادی طور پر موقع پرست ہوتا ہے جمع کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے اور مشرقی پاکستان کے مفلوک الحال عوام کو جن کی بھوک و افلاس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی نجات کا راستہ یہ بتا رہے ہیں کہ مغربی پاکستان کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد ان کی بھوک و افلاس کا بھی علاج ہو جائے گا۔ انہیں طوفانوں اور سیلابوں سے بھی نجات مل جائے گی اور وہ بے گھر بھی نہیں رہیں گے۔ ان کا علاج بھی ہوگا اور بچے تعلیم بھی حاصل کریں گے۔'' نقی صاحب نے آ کر جو کالم ''نصرت'' کے لئے لکھا اس میں انہوں نے کہا کہ ''کلکتہ اور ڈھاکہ کی سڑکوں پر سیاست سیکھنے والے بنگلہ بندھو یعنی شیخ مجیب الرحمن اس حقیقت سے واقف تھے کہ ان کے چھ نکات مشرقی پاکستان کے عوام کے معدوں کے

راستے ہی ان کے ذہنوں میں داخل ہوسکتے تھے۔ اپنی فقید المثال کامیابی کے بعد اب انہیں اندازہ ہورہا ہے کہ وہ جس آتش فشاں پر آن بیٹھے ہیں اس کے نیچے لاوا کروٹیں لے رہا ہے۔ ایک طرف مشرقی پاکستان کے یہ مفلوک الحال عوام ہیں اور دوسری طرف وہاں کے مفاد پرست نودولتئے اور موقع پرست درمیانہ طبقے کے افراد۔ ان کے لئے ان متضاد توقعات کے درمیان توازن قائم کرنے کا واحد راستہ بغاوت میں ہے اور وہ کسی بھی مفاہمت کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔'' اور بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ ان کا تجزیہ بالکل درست تھا۔

FRANTZ FANAN نوآبادیاتی نظام کے خلاف ایک عظیم مفکر تھا اور وہ انقلابی تھا جس نے فرانس کے خلاف الجیریا کی جنگ آزادی میں خود حصہ لیا تھا۔ اس نے اپنی تحریر میں آزادخیال اشرافیہ کی سیاست وثقافت کے بارے میں لکھا:۔

'' یہ طبقہ نوآبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد میں تو پیش پیش ہوتا ہے مگر جنگ آزادی کے بعد حقیقی جدوجہد میں وہ ساتھ نہیں دیتا کیونکہ وہاں اسے سب کچھ کھونے کا ڈر ہوتا ہے۔ یہ وہی طبقہ ہے جسے جنگ آزادی کے بعد سب سے زیادہ منافع حاصل کرنے کی تمنا ہوتی ہے اور اسے اس میں سب سے زیادہ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ وہ اپنے مفادات کے لئے مذہبی طاقتوں، پاپائیت اور دیہی علاقوں کے بااثر اشخاص کے ساتھ مل کر اس نظام میں پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔''

شیخ مجیب، فارلینڈ، ہارون برادران، جماعت اسلامی، نوابزادہ شیر علی اور یحیٰی خان کے ذریعے امریکہ اپنے نتائج حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ بیرونی طور پر روس اور بھارت تو یہ کام کرہی رہے تھے۔ بھٹو صاحب نے پہلے بنگلہ دیش نامنظور کا اعلان کیا پھر 1974ء میں اسلامی کانفرنس بلانے کے بعد جس میں شیخ مجیب نے بھی شرکت کی بنگلہ دیش کو تسلیم کرلیا۔ پاکستان کی قومی اسمبلی نے ایک قرارداد کے ذریعے بنگلہ دیش کو باضابطہ طور پر تسلیم کرلیا۔ اس موقع پر جماعت اسلامی اور اصغرخان بنگلہ دیش نامنظور کے نعرے لگارہے تھے۔

''اُدھر تم اِدھر ہم'' کی حقیقت

جس طرح دو فقروں میں پاکستان قائم کیا جاتا ہے۔ یہ کہہ کر کہ علامہ اقبال نے ایک خواب دیکھا اور قائداعظم نے اس کی تعبیر کی۔ اسی طرح اخبار کی ایک سرخی ''اُدھر تم اِدھر ہم'' کو بنگلہ دیش کے قیام اور ملک ٹوٹنے کی وجہ قرار دیا جاتا ہے۔

ملک نہ تو ایک دن میں بنتے ہیں اور نہ ہی ایک دن میں ٹوٹتے ہیں اور نہ ہی کسی سیاسی لیڈر کے ایک بیان سے ملک ٹوٹ جاتے ہیں یا بن جاتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی جدلیاتی عمل ہے جو برس ہا برس سے اپنے تضادات کو اپنے اندر لئے آگے بڑھ رہا ہوتا ہے اور یہ تضاد بنیادی طور پر ظالم اور مظلوم کے درمیان ہوتا ہے۔ لینن کے مطابق قومی آزادی کی جنگ دراصل طبقاتی جنگ ہے۔ کبھی کبھی یہ جدوجہد جغرافیائی یا مذہبی یا قومی آزادی کی جدوجہد نظر آتی ہے مگر اصل میں یہ اپنے کردار میں طبقاتی ہوتی ہے۔

جب آپ عوام کی اکثریت کے معاشی، معاشرتی حقوق سلب کرنا شروع کر دیں، جب عوام کی اکثریت کا معاشی استحصال اپنی انتہا کو پہنچ جائے اور آپ اپنے ملک کی مشرقی آبادی کے ان اکثریتی عوام کو، جنہوں نے انگریز سے آزادی کی جنگ لڑی ہو، پاکستان حاصل کرنے میں آپ سے بڑھ کر حصہ لیا، اور قیام پاکستان کے ابتدائی سالوں میں پٹ سن سے کمایا ہوا پاکستان کا تقریباً تمام زرمبادلہ آپ نے کراچی کی تعمیر و ترقی پر صرف کیا ہو، جبکہ ملک کی 56 فی صد آبادی بھی مشرقی پاکستان میں ہو اور آپ ملک کا دارالخلافہ ڈھاکہ کے بجائے کراچی کو بنائیں، 20 فی صد کی زبان اردو کو ان پر مسلط کریں اور ان پر دیسی وائسرائے بن کر اس طرح حکمرانی کریں جس طرح انگریز وائسرائے ہندوستان پر حکمرانی کرتے تھے تو شیخ مجیب کے چھ نکات کا ایک وقت میں آ کر مقبول ہونا لازمی اور فطری نتیجہ تھا۔ اس ہی پس منظر میں 1970ء کے انتخابات میں عوامی لیگ اپنے چھ نکاتی پروگرام کے ساتھ مشرقی پاکستان میں ایک اکثریتی پارٹی بن کر ابھری تھی۔ مغربی پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی نے معاشی استحصالی کے خلاف جدوجہد کر کے اپنے سوشلسٹ معاشی پروگرام کی بنیاد پر اکثریت حاصل کی تھی۔

انہی دنوں لاہور سے روزنامہ آزاد کا اجرا ہوا تھا۔ یہ اخبار 2/نومبر 1970ء سے چھپنا شروع ہوا اور ستمبر 1971ء میں یہ بند ہوگیا۔ اس میں اکثر صحافی روسی سوشل سامراج کے حامی تھے اور پاک چین دوستی کو "سٹالن ازم" کی روشنی میں دیکھتے تھے۔ جبکہ ذوالفقار علی بھٹو بھارتی جارحیت کے خلاف اپنے موقف کے نتیجے میں ایک قومی ہیرو کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ وہ پاک چین دوستی کے معمار تھے اور کشمیر اور فرخا بیراج پر بھارت کے رویے کو پاکستان دشمنی سمجھتے تھے۔

لاہور کے روزنامہ "آزاد" نے اپنے اجراء کے ساتھ ہی پیپلز پارٹی اور بھٹو صاحب کی خبروں اور تصویروں کو روزنامہ مساوات، جوکہ پیپلز پارٹی کا اپنا اخبار تھا، سے بھی بڑھ کر جگہ دینا شروع کی اور اسی بنیاد پر مقبول ہوگیا۔ مگر چند دنوں بعد پیپلز پارٹی کی تنظیمی کمیٹی کے فیصلوں سے لے کر پارٹی کے سیاسی فیصلوں تک کو اس نے اپنے مخصوص زاویے سے چھاپنا شروع کیا۔ اس دوران بھٹو صاحب نے 11/مارچ 1971ء کو نشتر پارک کراچی میں تقریر کی اور بعد میں پریس کانفرنس کی۔ جس میں انہوں نے کہا کہ پیپلز پارٹی عوامی لیگ کے ساتھ افہام و تفہیم کی بنیادوں پر پرامن اقتدار کی منتقلی چاہتی ہے اور یہ کہ وہ اور ان کی پارٹی ایک اور صرف ایک پاکستان چاہتے ہیں۔ پاکستان کے مشرقی حصے میں عوامی لیگ کو عوام نے چنا ہے اور مغربی حصے کے دو صوبوں میں پیپلز پارٹی کو۔ اس بنیاد پر مشرقی پاکستان میں حکومت کا اختیار عوامی لیگ کو ہے جبکہ مغربی حصے میں پیپلز پارٹی کو۔

بھٹو صاحب نے صحافیوں سے بارہا یہ درخواست بھی کی تھی کہ ان کی تقاریر اور بیانات اور بالخصوص ان کے اور شیخ مجیب کے حوالے سے کوئی ایسی بات نہ لکھی جائے جس سے قوم غلط نتائج اخذ کرے۔ روزنامہ "آزاد" نے اگرچہ ان کی تقریر کو مکمل طور پر چھاپا مگر سرخی یہ لگائی۔ "اُدھر تم اِدھر ہم۔" اس سُرخی سے یہ تاثر پھیلا کہ بھٹو صاحب ملک کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کی پوری تقریر میں کہیں بھی یہ بات نہیں کہی گئی تھی۔

افتخار رسول شیخ جو آزاد اخبار میں آرٹ ایڈیٹر اختر کے ساتھ اس روز ڈیوٹی پر تھے وہ مظفر شیخ کے نام اپنی تحریر میں بتاتے ہیں کہ "پرچہ پریس میں جانے کے لئے تیار تھا کہ نیوز

ایڈیٹر شاہ جی (عباس اطہر) زاہد ڈار وغیرہ کے ساتھ حسب معمول ''ٹن'' حالت میں آئے۔ پہلے سے لگی سرخی کو دیکھا اور اس کو ہٹا کر، اُدھر تم، اِدھر ہم سے تبدیل کر دیا۔ اس وقت کے شفٹ انچارج اور نیوز روم میں دیگر صحافی ساتھیوں نے اس پر اعتراض بھی کیا بلکہ حمید اختر مرحوم، عبداللہ ملک مرحوم اور آئی اے رحمان بھی مکمل طور پر اس سے متفق نہیں تھے۔''

مگر ہوا یہ کہ جماعت اسلامی سے لے کر تمام بھٹو مخالف افراد نے بنگلہ دیش کے تاریخی اسباب و وجوہات میں جانے کے بجائے اخبار کی اس سرخی کی بنیاد پر ملک توڑنے کی ذمہ داری بھٹو صاحب پر ڈال دی۔ اخبار کی سرخی کا یہ انداز نیا اندازِ صحافت ضرور تھا مگر نیوز ایڈیٹر کی کارگزاری، وجہ جو بھی رہی ہو، بھٹو صاحب کے گلے پڑ گئی اور بنگلہ دیش کا بننا ان کے سر تھونپ دیا گیا۔ جبکہ بھٹو صاحب ہمیشہ یہ کہتے رہے تھے کہ شیخ مجیب کے ساتھ چھ نکات چھوڑ چھ سو نکات پر بات چیت ہو سکتی ہے۔

1971ء کے اوائل میں بھٹو مجیب مذاکرات شروع ہوئے۔ چھ نکات متنازع بن چکے تھے مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ اسے حل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پھر عوامی لیگ دستور ساز اسمبلی میں سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری تھی۔ آئین کے نفاذ کے بعد مرکز میں حکومت کی تشکیل بھی اسے ہی کرنا تھی۔ یعنی عوامی لیگ کو پورے پاکستان پر حکومت کرنا تھی تو مشرقی پاکستان کی مکمل خودمختاری کا نعرہ یا مطالبہ بے معنی تھا۔ بظاہر پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کے درمیان آئین سازی کے بارے میں مفاہمت کی فضا ہموار ہو رہی تھی۔ فروری 1971ء میں ہم نے ''نصرت'' میں لکھا کہ شیخ صاحب آپ پاکستان کو ایک رکھنا چاہتے ہیں، فیڈریشن بنانا چاہتے ہیں، یہاں سوشلسٹ نظام لانا چاہتے ہیں۔ آیئے پاکستان کے بنیادی ڈھانچے کو قائم رکھتے ہوئے آگے بڑھیں ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ اس ڈھانچے میں رہتے ہوئے آپ چھ چھوڑ چھ سو نکات فٹ کر لیں۔'' اگر پاکستان پیپلز پارٹی یا بھٹو صاحب کا مقصد ملک کو توڑنا ہوتا تو پھر ہم کچھ اور لکھ رہے ہوتے اور ہمارا پرچہ یعنی نصرت جو کہ پارٹی کا ترجمان تھا۔ اس طرح کے خیالات کے لئے زمین ہموار کر رہا ہوتا۔ یا روزنامہ مساوات کے ذریعے اس طرح کے رجحانات مرتب کئے جا رہے ہوتے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔

انتقالِ اقتدار

ملک ٹوٹ چکا تھا مگر یحییٰ خان اب بھی انتقال اقتدار کے لئے تیار نہیں تھا۔ ملک کے مغربی بازو میں موجود مسلح افواج کے درمیان ڈھاکہ میں ہتھیار ڈالنے پر شدید غم وغصہ تھا۔ فوج کے تمام شعبوں میں احساسِ شکست تھا۔ چیف آف جنرل سٹاف گل حسن خاں نے مختلف چھاؤنیوں کا دورہ کیا۔ انہیں اس بات کا اندازہ ہوا کہ فوج میں یحییٰ خان کے خلاف شدید ردعمل ہے۔ انہوں نے ائیر فورس کے چیف ایئر مارشل رحیم خان کو ساتھ ملا کر یحییٰ خان سے اس مسئلے پر بات کی اور اصرار کیا کہ عوامی نمائندوں کو اقتدار منتقل کر دیا جائے۔ یحییٰ خان صدارت چھوڑنے پر رضامند ہو گیا مگر اس بات پر مصر تھا کہ وہ فوج کا کمانڈر ان چیف رہے گا۔

یحییٰ خان نے جنرل حمید کو اس بات پر مامور کیا کہ وہ جنرل ہیڈ کوارٹر جا کر میجر اور ان سے اوپر کے عہدے کے تمام افسروں سے خطاب کرے۔ افسروں نے اس میٹنگ میں جنرل حمید کی تقریر کو سننے سے انکار کر دیا اور یہ میٹنگ افراتفری کا شکار ہو گئی۔ یحییٰ خان کے پاس اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ اقتدار کو چھوڑ دے۔ جنرل گل حسن اور ایئر مارشل رحیم خان نے بھٹو صاحب سے رابطہ کیا۔ وہ 20 دسمبر 1971ء کو راولپنڈی پہنچے۔ یحییٰ خان سے چند گھنٹے ملاقات کی۔ جب وہ باہر نکلے تو ان کی کار پر صدر پاکستان کا جھنڈا الہرا رہا تھا۔ وہ صدر بھی تھے اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی۔ یحییٰ خان کو ''باعزت'' طور پر فوج سے ریٹائر کر دیا گیا۔ اس طرح یحییٰ خان کے 33 ماہ کے المناک اور شرمناک دور کا خاتمہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی جنرل عبدالحمید، جنرل ایم ایم پیرزادہ، جنرل عمر، جنرل خدا داد خان اور جنرل مٹھہ کو بھی ریٹائر کر دیا گیا۔ جنرل گل حسن کو آرمی چیف اور ایئر مارشل رحیم

خان کو ایئر چیف مقرر کیا گیا۔

انتخابات کے ایک سال کے بعد پیپلز پارٹی کو انتقال اقتدار اس وقت میں کیا گیا جب کہ قوم کا انتقال ہونے کو آ گیا۔ یہ اقتدار پیپلز پارٹی کے لئے ایک بہت بڑی ذمہ داری بن کر نازل ہوا تھا۔ یہ بھٹو صاحب کی قائدانہ صلاحیتوں کا ایک کڑا امتحان تھا۔

عوام نے ووٹ کے ذریعے بنیادی انقلاب برپا کرنے کا اختیار بھٹو صاحب کو دے دیا تھا اور عوامی انقلاب کو برپا کرنے کے لئے جن فرسودہ اور عوام دشمن اداروں کو توڑنا پڑتا ہے، 1971ء کی جنگ اور ملک ٹوٹنے کے بعد یا تو کمزور تھے یا ٹوٹے ہوئے تھے۔ سماجی طور پر لوگ برادری ازم، علاقائی عصبیت، لسانی شاونزم سے باہر آ چکے تھے۔ مقننہ موجود نہیں تھی۔ 93 ہزار فوجی اور شہری بھارت کی قید میں تھے۔ انتظامیہ ذہنی طور پر عوامی انقلاب کے خوف سے دوچار تھی۔ جاگیردار اپنی زمینیں بچانے کی فکر میں تھے، سرمایہ داروں پر خوف طاری تھا، اسلام فروش اپنے بلوں میں گھسے ہوئے تھے۔ گویا سوشلسٹ انقلاب برپا کرنے کے لئے فضا پوری طرح تیار تھی اور عوام بھی۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ موقع پہلی بار آیا تھا۔ عوام اپنی اور اپنی آئندہ آنے والی نسلوں کی خوش حالی کے انتظار میں تھے۔ بھٹو صاحب کو ایک مسیحا سمجھ کر وہ ان سے اور پیپلز پارٹی سے مسیحائی کرنے کا یقین اور اعتماد رکھتے تھے۔ معاشرتی ارتقا کی یہ منزل تھی جہاں پر فکر و عمل ایک مثبت صورت اختیار کرتا نظر آ رہا تھا۔ ہمیں ایسا لگا تھا کہ ملک و قوم کی آزادی کا دیرینہ خواب اب حقیقت میں ڈھل جائے گا۔

پاکستان کے چار بنیادی تضادات

قومی تضاد، نوآبادیاتی تضاد، طبقاتی تضاد اور قومیتیوں کا تضاد

ان کا حل تلاش کرنا پیپلز پارٹی کی ذمہ داری تھی

1967ء میں جب پاکستان پیپلز پارٹی معرض وجود میں آئی تھی تو پاکستان میں چار بنیادی تضادات تھے۔ جب انتقال اقتدار ہوا تو یہ چاروں تضاد اپنی شدت کے ساتھ موجود تھے۔

قومی تضاد

پہلا تضاد قومی تضاد تھا جو کہ بھارت کے ساتھ تھا جس نے شروع سے ہی پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اکھنڈ بھارت نہ صرف اس کا نعرہ تھا بلکہ اس کا منصوبہ بھی تھا۔ چونکہ سوویت یونین بھارت کا اتحادی تھا اس لئے پاکستان کے عوام اس کو بھی اپنا دوست نہیں سمجھتے تھے بلکہ پاکستان میں موجود سوویت یونین کے حامی افراد اور جماعتیں بھی عوام کے دلوں میں جگہ نہیں بنا سکی تھیں۔ چین بھارت کے خلاف تھا، پاکستان کا دوست تھا اور عوام اس کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ 1965ء کی جنگ کے بعد اس تضاد نے اولین حیثیت اختیار کر لی تھی۔

نوآبادیاتی تضاد

دوسرا تضاد نوآبادیاتی تضاد تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ کی جگہ امریکہ نے جو کہ اب عالمی سامراج بن چکا تھا لے لی تھی اور برطانوی حکمرانوں سے آزادی حاصل کرنے کے بعد پاکستان کے عوام اپنے آپ کو اب امریکہ کا غلام سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ امریکی سامراج کے شدید مخالف تھے۔ اس تضاد میں شدت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پاکستان کے حکمران امریکہ نواز تھے اور عوام کا ان کے ساتھ طبقاتی تضاد تھا۔ اس دور میں چونکہ سب سے بڑا تضاد بین الاقوامی سامراجیت اور بین الاقوامی انقلابی قوتوں کے درمیان تھا اس لئے پاکستان نہیں دنیا کا ہر ملک اس عالم گیر تضاد کا ایک جزو تھا۔

طبقاتی تضاد

تیسرا تضاد طبقاتی تضاد تھا۔ یعنی اقتصادی نظام میں امیر و غریب کا تضاد، ظالم و مظلوم کا تضاد۔ پاکستان کے ذرائع پیداوار اور معیشت چند جاگیرداروں اور بائیس خاندانوں کے قبضے میں تھی اور ان کو سول اور فوجی نوکر شاہی کی مدد اور سرپرستی حاصل تھی۔

قومیتوں کا تضاد

چوتھا تضاد پاکستان کے اندر آباد قومیتوں کا تضاد تھا۔ حکمرانوں کی اکثریت پنجابی مہاجر شاونسٹوں کی تھی جو پاکستان میں بسنے والی دوسری اقوام کو تحقیر سے دیکھتے تھے اور ان کے سیاسی و معاشی حقوق ان کو نہیں دینا چاہتے تھے۔ بنگالی، سندھی، بلوچ اور پٹھان جب اپنے حقوق کی بات کرتے تو اسلام بھی خطرے میں پڑ جاتا اور پاکستان بھی۔ انہیں غدار اور بھارت کا ایجنٹ قرار دیا جاتا تھا۔

یہ وہ چار اہم اور بنیادی تضادات تھے جن پر 1967ء میں پاکستان پیپلز پارٹی نے ایک واضح موقف اختیار کیا تھا اور اپنی اساسی دستاویز میں، مسلسل تقریروں اور تحریروں میں ان کا حل پیش کیا تھا۔ پاکستان کے عوام کو بھٹو صاحب اور پیپلز پارٹی میں ان

تمام مسائل کا حل نظر آیا تھا۔ بھارت کے ساتھ ایک ہزار سال تک جنگ کا نعرہ 65ء کی جنگ اور معاہدہ تاشقند پر بھٹو صاحب کا ایوب خان سے اختلاف، امریکی سامراج مردہ باد، ایک آزاد خارجہ پالیسی اور سوشلزم ہماری معیشت ہے کا اقتصادی پروگرام، قومیتوں کے تضاد کے معاملے میں ہم یہ سمجھتے تھے کہ طبقاتی تضاد یعنی سوشلسٹ نظام معیشت کو اپنانے میں اس کا حل مضمر ہے۔ بنگالی، سندھی، بلوچ اور پٹھان عوام کی اکثریت کو معاشی استحصال سے اگر آزادی مل جائے تو قومیتوں کے تضاد کو حل کرنے میں مدد مل سکتی تھی۔ ہم قومیتی سوال کو طبقاتی تضاد کے ساتھ جوڑتے تھے۔

مشرقی پاکستان میں مولانا عبدالحمید بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی اور ڈاکٹر طٰحہ کی مارکسسٹ لیننسٹ پارٹی کا موقف بھی یہی تھا۔ اس وقت تک مشرقی پاکستان کے عوام بھی اسی موقف کے حامی تھے۔ طبقاتی تضاد بنیادی تضاد تھا۔ شیخ مجیب الرحمن نے کس طرح قومیتی تضاد کو جو کہ اولین حیثیت میں نہیں تھا اولین تضاد میں تبدیل کیا، سامراج اور حکمرانوں نے کس طرح اس کی مدد کی اس کی تفصیلات پچھلے ابواب میں بیان کی گئی ہیں۔

مشرقی پاکستان کے عوام کو شیخ مجیب نے یہ راہ دکھائی تھی کہ اگر قومیتی سوال کو حل کر لیا جائے، مغربی پاکستان سے آزادی حاصل کر لی جائے تو طبقاتی تضاد عوام کے حق میں خود بخود حل ہو جائے گا۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش تو بن گیا مگر طبقاتی تضاد جوں کا توں موجود ہے۔ موجودہ پاکستان میں قومیتوں کے سوال پر علیحدگی کی بات کرنے والوں کو بنگلہ دیش کی مثال کو سامنے رکھنا چاہیے۔ قومیتوں کے تضاد کو طبقاتی تضاد سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح طبقاتی تضاد کو قومیتی سوال سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ سوویت یونین کے ٹوٹنے میں وہاں کی مختلف قومی اکائیوں کو قومیتی سوال کا حل تو شاید مل گیا ہے مگر ان کا طبقاتی تضاد پہلے سے بھی زیادہ شدت اختیار کر گیا ہے۔ ان چار تضادات کو حل کرنے اور ایک عوامی انقلاب برپا کرنے کا اختیار پاکستان بالخصوص پنجاب اور سندھ کے عوام نے 1970ء کے انتخابات میں بھٹو صاحب کی قیادت میں پیپلز پارٹی کو دے دیا تھا۔ پیپلز پارٹی کو اقتدار مل چکا تھا اور ان چار بنیادی تضادات سے نپٹنا اور ان کا حل تلاش کرنا اب پیپلز پارٹی اور اس کی قیادت کا بہت بڑا امتحان تھا۔

بھٹو نے بطور صدر اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اقتدار سنبھال لیا

پولیس ہڑتال اور فوجی سازش

20 ر دسمبر 1971ء کو بھٹو صاحب نے بطور صدر اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے اقتدار سنبھالا تھا۔ چونکہ ملک میں کوئی دستور نہیں تھا جس کے تحت انتقال اقتدار ہوتا لہٰذا یحییٰ خان نے صدر اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے طور پر ہی بھٹو صاحب کو اقتدار منتقل کیا تھا۔ اور تکنیکی اعتبار سے یہی ایک راستہ تھا۔ 22 ر دسمبر کو انہوں نے وفاقی کابینہ اور گورنروں کا اعلان کیا جو بیک وقت ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی تھے۔ بھٹو صاحب کا خیال تھا کہ مارشل لا کو جاری رکھا جائے جبکہ پیپلز پارٹی کی اکثریت اس موقف کے خلاف تھی۔ کیونکہ مارشل لا کے خلاف عوام نے جدوجہد کی تھی۔ مگر تکنیکی دشواریاں تھیں۔ اس کے باوجود کہ ہم بھٹو صاحب کو سول مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور مارشل لا کو سول مارشل لا لکھ رہے تھے، عوام اس منطق کو سمجھنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

اقتدار میں آنے کے چند دن بعد ہی بھٹو صاحب کے گورنروں کو صوبہ پنجاب اور صوبہ سرحد میں پولیس کی ہڑتال کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ہڑتال کا مقصد ان صوبوں میں بدامنی پیدا کرنا تھا۔ خان حیات محمد خان شیر پاؤ نے سرحد کے معاملات پر تو جلد ہی قابو پالیا مگر پنجاب میں اس ہڑتال نے کافی تشویش ناک صورت حال پیدا کر دی۔ مصطفیٰ کھر نے پولیس کو چوبیس گھنٹے کا نوٹس دینے کے ساتھ کارکنوں کو اختیار دے دیا کہ وہ جائیں اور پولیس کے فرائض انجام دیں۔ چوراہوں پر ٹریفک کنٹرول سے لے کر شہر و دیہات میں

امن و امان کی صورت حال تک کی تمام ذمہ داری پارٹی کے کارکنوں نے اس جذبے کے ساتھ نبھائی کہ جب تک پولیس واپس کام پر نہیں آئی صوبے بھر میں نہ تو کوئی چوری ہوئی اور نہ ہی کہیں پر ڈاکہ پڑا۔ پارٹی کے دفاتر حتیٰ کہ نصرت اور مساوات کے دفاتر میں پارٹی کارکنوں اور عوام کا ایک ہجوم تھا جو اپنی رضا کارانہ خدمات پیش کر رہا تھا۔ ان کے خیال میں ان کا انقلاب آ چکا تھا جس میں انہوں نے ایک کردار ادا کرنا تھا۔

جبکہ احمد رضا قصوری اور مختار رانا جلسوں کے ذریعے یہ اعلان کر رہے تھے کہ پیپلز پارٹی کا انتخابات جیت جانے یا اقتدار میں آ جانے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ عوامی انقلاب آ گیا ہے۔ ان کی بات درست تھی مگر ہم مساوات اور نصرت کے ذریعے بھٹو صاحب کے موقف کو عوام تک پہنچا رہے تھے کہ انقلاب آ چکا ہے۔ بھٹو صاحب کا خیال تھا کہ یا تو احمد رضا قصوری پنجاب کا گورنر بننا چاہتا ہے یا پھر اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ احمد رضا قصوری ہر جگہ بھٹو صاحب کی مخالفت کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ 1973ء کا آئین جس پر تمام جماعتوں کے ممبران اسمبلی کے دستخط ہیں، احمد رضا قصوری کے دستخط نہیں ہیں۔

اس سے پہلے بھی احمد رضا قصوری نے ایک واقعہ پر بہت شور مچایا تھا۔ اس واقعہ کا پس منظر کچھ اس طرح سے ہے کہ جولائی 1971ء میں بھٹو صاحب نے پیپلز پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کا اجلاس تہران میں رکھا اور اپنی پوری سنٹرل کمیٹی کو تہران لے گئے۔ یہ ایک انوکھی بات تھی۔

بھٹو صاحب کی دوستی شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی کے ساتھ تھی اور شہنشاہ کی بہن شہزادی اشرف پہلوی ان کی بہت دلدادہ تھی۔ اس خطے میں شہنشاہ ایران امریکی مفادات کی حفاظت کا ذمہ دار تھا۔ بھٹو صاحب اس کے ذریعے امریکہ کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ وہ امریکہ کے مفادات کے مخالف نہیں ہیں اور سوشلسٹ بلاک کا دائرہ پاکستان تک نہیں پھیلے گا۔ مگر امریکہ کے اپنے تحفظات تھے۔

ان دنوں رچرڈ ہیلم تہران میں امریکی سفیر تھا جو اس سے پہلے سی آئی اے کا سربراہ رہ چکا تھا۔ اس دورے کے دوران ایک رات بھٹو صاحب، شہنشاہ ایران اور رچرڈ

ہیلم کی علیحدہ ملاقات ہوئی جو بعد میں انتقال اقتدار میں مددگار ثابت ہوئی۔ ایران سے واپس آ کر احمد رضا قصوری نے اس بات پر بہت شور مچایا اور مطالبہ کیا کہ بھٹو صاحب کی تہران میں سرگرمیوں کی تحقیقات کرائی جائیں۔ مگر جب پیپلز پارٹی کو انتقال اقتدار کیا گیا تو بھٹو صاحب اور پیپلز پارٹی اپنی مقبولیت کے نقطہ عروج پر تھی۔ احمد رضا قصوری یا مختار رانا کی آواز پر کوئی بھی کان دھرنے کو تیار نہ تھا۔

ابھی پولیس کی ہڑتال پر قابو پایا ہی گیا تھا کہ جنرل گل حسن اور ایئر مارشل رحیم خان جو بھٹو صاحب کے انتقال اقتدار میں اہم کردار تھے اب خود اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ بھٹو صاحب کے خلاف یہ پہلی فوجی سازش تھی۔ ان دونوں سے استعفٰی لیا گیا۔ جنرل ٹکا خان کہیں مل نہیں رہے تھے۔ ڈاکٹر مبشر حسن گورنر مصطفٰی کھر کے ہیلی کاپٹر میں سرحدوں پر ہونے والی مشقوں کے دوران سے جنرل ٹکا خان کو ڈھونڈھ کر لائے اور انہیں فوج کا سربراہ بنا دیا گیا۔ یہ ٹکا خان وہی تھے جنہیں ڈھاکہ میں بنگالیوں کے قتل عام کی وجہ سے ''قصائی'' کہا جاتا تھا۔

مارچ 1973ء میں ایک بار پھر چند جونیئر فوجی افسران نے حکومت کا تختہ الٹنا چاہا۔ یہ سازش بروقت پکڑی گئی۔ وہ ملٹری کورٹ جس نے ان افسران کو سزا دی اس کا سربراہ بریگیڈیئر ضیاالحق تھا۔ اس مقدمے میں بھٹو صاحب کی ذاتی دلچسپی تھی جس کی وجہ سے ضیاالحق کو ان کے قریب ہونے کا موقع ملا۔ وہ نہایت خوشامدی میسنا تھا۔ جب وہ ایک ڈویژن کا کمانڈر تھا تو اس نے بھٹو صاحب کو دعوت دے کر ان کی ملک اور مسلح افواج کے لئے خدمات کو سراہتے ہوئے ایک تلوار پیش کی۔ اس نے ہی بھٹو صاحب کو آرمرڈ کور کے کرنل ان چیف بننے پر رضامند کیا۔ اس کی خوشامد کے کئی قصے ہیں جن کی وجہ سے وہ بھٹو صاحب کا اعتماد حاصل کرتا گیا۔ بھٹو صاحب خوشامد پسند تھے اور کانوں کے کچے بھی۔

اقتدار حاصل کرنے کے فوراً بعد سے ہی مشکلات بڑھتی جا رہی تھیں۔ پارٹی کے اندر عوامی انقلاب برپا کرنے کے لئے جس طرح کی فکری اور تنظیمی تیاری ہونی چاہیے تھی وہ نہیں تھی اور اقتدار ملنے کے بعد تو رہنماؤں کے پاس وقت بھی نہیں تھا۔ وہ حکومت کو سنبھالنے اور چلانے میں مصروف تھے۔

تاریخ کا پہیہ الٹا چل پڑا

پاکستان پیپلز پارٹی کا حلیہ بگڑنے لگا

عوام دشمن ''لاکھوں ساتھیوں سمیت'' پیپلز پارٹی میں گھس گئے

دسمبر 1971ء میں حکومت بننے کے چند ماہ بعد وہ تمام عوام دشمن جو ہمیشہ ہی چمگادڑوں کی طرح دور کھڑے جیتنے والی پارٹی کا انتظار کرتے ہیں گروہ در گروہ ''لاکھوں ساتھیوں سمیت'' پیپلز پارٹی میں شامل ہونے لگے۔ ان میں وہ بھی تھے جنہوں نے اپنے علاقے میں اس جرم میں کہ اگر کسی نے پارٹی کا جھنڈا اپنے گھر پر لگایا تھا اُس کے گھر اور کھڑی فصل کو آگ لگا دی تھی، اس کی عورتوں کو اغوا کر کے بے حرمتی کی تھی، وہ سب صبح، دوپہر شام پیپلز پارٹی میں دھڑا دھڑ شامل ہو رہے تھے۔ میں ہر بار پاکستان کی کل آبادی کو گنتا اور میری گنتی اور پاکستان کی آبادی کے اعداد و شمار ختم ہو جاتے مگر یہ لاکھوں ساتھی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

میں نے اپنی تحریروں میں سوال اٹھانا شروع کیا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ ان کا سیاسی ماضی اور کردار عوام دشمن رہا ہے اور یہ کہ پیپلز پارٹی کی حکومت اس معاشی نظام کی جانب کوئی قدم نہیں اٹھا رہی جس کا وعدہ بھٹو صاحب نے تقریروں میں اور ہم نے نصرت کے ذریعے اپنی تحریروں میں کیا تھا تو بھٹو صاحب کو ناگوار گزرنے لگا۔ حالانکہ میں بھی وہی تھا۔ میری سوچ بھی وہی تھی، میری تحریر بھی وہی تھی جس پر شاباش ملتی تھی۔ فرق صرف یہ تھا

کہ اب بھٹو صاحب اقتدار کی کھڑکی سے چیزوں کو دیکھ رہے تھے۔ ڈانٹ پڑنے لگی اور میری طرح کے ترقی پسند باشعور کارکن، دانشور، صحافی جو پیپلز پارٹی کی پیدائش اور بائیں بازو کے نظریے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے مایوسی کے جنگل میں بھٹکنے لگے۔ تاریخ کا پہیہ الٹا چل پڑا۔ پیپلز پارٹی کا انقلاب دوست کردار تبدیل ہونے لگا۔

دیکھتے ہی دیکھتے بھٹو صاحب کے اردگرد ''لاکھوں ساتھیوں'' والوں کی ریل پیل ہوگئی۔ بھٹو صاحب بھی ان کے درمیان مطمئن نظر آنے لگے۔ حکومت میں آنے سے پہلے تک ان لوگوں کے بارے میں بھٹو صاحب کو تشویش رہتی تھی۔ مگر ان حضرات کے مطیع ہونے کے بعد بھٹو صاحب نے ان کی وفاداری پر یقین کرلیا۔ بھٹو صاحب کے خوشامد پسندانہ مزاج نے اس طرح کے لوگوں کے لئے راستہ آسان کر دیا۔

ضیاالحق کے چناؤ میں بھی امریکہ اور اردن کے شاہ حسین کا دباؤ اپنی جگہ مگر بھٹو صاحب کی خوشامد پسندی کے مزاج کی وجہ سے مردم شناسی کا معاملہ ثانوی تھا۔ جبکہ جنرل ٹکا خان بھٹو صاحب کے اس فیصلے کے خلاف تھے اور بھٹو صاحب کو یہ بھی معلوم تھا کہ جنرل ضیا الحق ستمبر/ 1970ء میں بیس ہزار فلسطینیوں کے خون سے ہولی کھیلنے کے بعد امریکہ کا منظور نظر بن چکا تھا۔ عرب حریت پسندوں یعنی یاسر عرفات کے عسکری بازو الفتح جو کہ اسرائیل کے لئے بہت بڑا خطرہ تھا اس کا قلع قمع کرنے کے لئے امریکہ نے اردنی بادشاہت کی خدمات حاصل کی تھیں اور ضیاالحق نے اس گھناؤنے کام کو سرانجام دے کر وہ لباس فاخرہ بھی حاصل کیا تھا جسے پہن کر وہ پاکستان ٹی وی پر آتا تھا اور جس کی وجہ سے لوگ اس کو بینڈ ماسٹر کہتے تھے۔

بھٹو میں چھپا ہوا جاگیردار باہر آ گیا

بھٹو صاحب کے مزاج کے بہت سے پہلو اُن کی علمیت، ذہانت، قائدانہ صلاحیتوں پر حاوی آجاتے تھے۔ عوام دشمن اور انقلاب دشمن حضرات کا ان کے گرد جمع ہونا ان کی خوشامد پسندی کا نتیجہ تھا مگر ان میں ایک چھپا ہوا جاگیردار بھی موجود تھا۔

ایک شام میں اور غلام مصطفیٰ جتوئی ان کے لندن والے فلیٹ میں بیٹھے تھے۔ جتوئی صاحب کے چھوٹے بھائی امام بخش جتوئی بھی آئے ہوئے تھے۔ ماضی کی باتیں ہو رہی تھیں کہ جتوئی صاحب کے حکومت بننے کے تین ماہ کے اندر اندر ان کے استعفیٰ دینے کی بات چل پڑی۔ جتوئی صاحب بتانے لگے۔

''ہوا یوں کہ قومی اسمبلی کا پہلا سیشن ہونے والا تھا۔ اس میں بھٹو صاحب چاہتے تھے کہ قومی اسمبلی ایک قرارداد کے ذریعے بھٹو صاحب سے یہ درخواست کرے کہ وہ مارشل لا ایڈ منسٹریٹر ہی رہیں اور اسی حیثیت میں حکومت کو چلائیں۔ وفاقی وزرا اور چیف منسٹرز کو کام سونپا گیا کہ وہ قومی اسمبلی کے تمام ممبران سے اس ریزولیوشن پر دستخط حاصل کریں۔

''مخدوم طالب المولیٰ سے لے کر وہ تمام ممبران جن سے دستخط حاصل کرنا میرے ذمے تھا انہوں نے دستخط کر دیئے۔ مگر عبدالحمید جتوئی جو میرے پاس ٹھہرے ہوئے تھے انہوں نے دستخط کرنے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ ہم تو مارشل لا کے خلاف الیکشن لڑ کر آئے ہیں۔ ہماری جدوجہد اور نعرہ ڈکٹیٹر شپ کے خلاف تھا تو ہم کیسے اپنے لیڈر کو مارشل لا ڈکٹیٹر بنائیں اور پھر یہ کونسی جمہوریت ہے۔ پارٹی کے سارے ممبران نے دستخط کئے لیکن عبدالحمید جتوئی، دریا خان کھوسو اور سیالکوٹ کے ممبر پارلیمنٹ محمد سلیمان نے دستخط نہیں کئے اور ووٹ بھی نہیں دیا۔

بھٹو صاحب نے اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ باوجود یکہ میرے پاس اس ریزولیوشن کے حق میں بھاری اکثریت ہے کہ میں چیف مارشل لا ایڈ منسٹریٹر رہوں اور میں چیف مارشل لا ایڈ منسٹریٹر رہ سکتا ہوں لیکن میں CMLA نہیں رہنا چاہتا اور انہوں نے مارشل لا اٹھانے کی تاریخ کا اعلان کیا۔ اسمبلی کے اجلاس کے اختتام پر وہ ان تینوں حضرات پر بہت ناراض ہوئے اور محمد سلیمان کو کہا کہ تمہیں کیسے جرات ہوئی کہ تم میرے خلاف جاؤ، تم بہن .... تو ایک تھانیدار کی مار ہو۔ دوسرے ہی روز دریا خان کھوسو اور محمد سلیمان گرفتار کر لئے گئے اور عبدالحمید جتوئی کی تلاش جاری رہی۔ چونکہ وہ کراچی میں ہمارے گھر میں رہتے تھے تو کراچی پولیس

نے ان کو گرفتار کرنے کے لئے میرے گھر پر چکر لگائے۔ عبدالحمید ہمارے کسی اور گھر پر ٹھہرے ہوئے تھے اور ضمانت قبل از گرفتاری کی کوشش میں تھے۔ پولیس ان کی تلاش میں میرے گھر پر دو تین بار گئی۔ میں نے اس کو اپنی بے عزتی سمجھا اور میں نے اسی روز وفاقی وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ جب استعفیٰ بھٹو صاحب کو ساڑھے چھ سات بجے ملا تو 8 بجے ان کا فون آیا اور کہنے لگے کہ تم کیوں upset ہو اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراضگی نہیں ہوتی۔ میں نے کہا کہ یہ میرے لئے چھوٹی بات نہیں ہے۔ ہم حکومت میں عہدے لینے کے لئے نہیں آئے ہیں۔ ہمارے لئے عزت پہلے ہے۔ میں نے استعفیٰ واپس لینے سے انکار کر دیا۔ ساڑھے آٹھ نو بجے اچانک جناب صدر اپنی اہلیہ بیگم نصرت بھٹو کے ساتھ میرے گھر تشریف لائے اور کہا کہ آپ کی بہن آئی ہے اور دو تین گھنٹے بیٹھے رہے۔ میں نے استعفیٰ واپس لینے کے بجائے خیبر میل سے اپنے گھر واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ ہماری سندھی تہذیب کے مطابق اگر بہن گھر آجائے تو تمام ناراضگیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری یہ غلطی تھی کہ میں نے بیگم صاحبہ کے گھر آنے کے باوجود اپنا ارادہ ترک نہیں کیا۔

''جب خیبر میل صبح کو لاہور پہنچی تو کھر صاحب جو اس وقت پنجاب کے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر تھے میرے سیلون میں داخل ہوئے اور بڑی قربت اور محبت کے ساتھ استعفیٰ واپس لینے کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ جب میں نے انکار کیا تو اپنی گورنری کے انداز میں، لیکن دوستی کے طریقے سے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی سیلون آگے کیسے جاتی ہے۔ میں نے عرض کی کہ آپ میری سیلون کٹوا سکتے ہیں مگر میں تھرڈ کلاس کے ڈبے میں کہیں بھی بیٹھ جاؤں گا۔ ہم کراچی کے لئے روانہ ہو گئے۔

''جب ہم ملتان پہنچے تو پھر کھر صاحب کا فون سٹیشن ماسٹر کے کمرے میں آیا ہوا تھا۔ میں نے انہیں وہی جواب دیا جو میں نے انہیں لاہور میں دیا تھا۔ کراچی پہنچنے سے پہلے گورنر اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر سندھ ممتاز بھٹو نے بھی منانے کی کوشش کی مگر میرا ایک ہی جواب تھا۔ اس وقت تک میڈیا کو پتہ چل چکا تھا۔ جب میں کراچی پہنچا تو وہاں پر صحافیوں کو

میں نے کوئی بیان دینے سے گریز کیا اور کہا کہ اگلے روز گیارہ بجے پریس کانفرنس کروں گا۔ ساڑھے دس بجے کھر صاحب کا پھر فون آیا اور اسی انداز میں منانے کی کوشش کی کہ میں انتہا تک نہ جاؤں۔ میں نے پھر انکار کیا تو اچانک انہوں نے فون صدر صاحب کو دے دیا۔ اس سے ظاہر تھا کہ کھر صاحب کو پنڈی طلب کیا گیا تھا۔

''جناب بھٹو صاحب نے فرمایا کہ مصطفیٰ میں آپ کے پاس آیا اور آپ کی بہن کے ساتھ۔ اس سے زیادہ میں کیا کرسکتا تھا اور پھر پوچھا کہ is this the end of our relationship? جیسا کہ میں نے کہا کہ مجھ سے یہ غلطی ہوئی تھی۔ ہماری روایات کے مطابق مجھے اسلام آباد میں ہی استعفیٰ واپس لینا چاہیے تھا۔ یہ محسوس کرتے ہوئے میں نے کہا کہ Sir میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ جب میرے پاس اسلام آباد آئے تھے مجھے وہاں ہی استعفیٰ واپس لینا چاہیے تھا لیکن اب میں استعفیٰ واپس لے رہا ہوں۔ لیکن میرے لئے بھی تو باعزت طریقہ ہونا چاہیے۔ جو کچھ ہوا سندھ گورنمنٹ کو اس پر معافی مانگنی چاہیے۔ جس پر بھٹو صاحب نے کہا کہ آدھے گھنٹے تک سندھ گورنمنٹ کی طرف سے رابطہ ہوگا۔ اور وہی آدھے گھنٹے کے بعد مسٹر محمد خان جونیجو جو اس وقت ہوم سیکرٹری تھے معافی نامہ لے آئے۔ پریس کانفرنس میں دیر ہو رہی تھی۔ اس خط ملنے کے بعد میں پریس کے سامنے گیا، ہوم سیکرٹری کا خط انہیں دکھایا اور پڑھ کر سنایا اور اپنا استعفیٰ واپس لینے کا اعلان کیا۔''

ان دو بڑوں کے درمیان تو معاملہ طے ہوگیا مگر محمد سلیمان اور اس کے اہل خانہ کے ساتھ جو ظلم ہوا وہ ساری دنیا جانتی ہے۔ بادشاہت اور جاگیردارانہ طرز معاشرت میں اختلاف رائے کا مطلب ذاتی دشمنی ہوتا ہے۔ چونکہ ہم سرمایہ دارانہ طرز معاشرت کے تنقیدی اور خود تنقیدی کے عمل کا حصہ نہیں ہیں اس لئے ہمارے ہاں عام انسان کی زبان سے نکلا ہوا لفظ بھی حرف آخر ہوتا ہے جس سے اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یعنی آپ کے کلمات بھی آپ کی جاگیر ہوتے ہیں اور اس جاگیر پر صرف آپ کا حق ہوتا ہے۔ اختلاف رائے کو ذاتی دشمنی میں بدلتے زیادہ دیر نہیں لگتی۔ بھٹو صاحب کا تعلق بھی اور مزاج بھی اس جاگیردارانہ طبقے اور جاگیردار طرز معاشرت سے تھا۔

عوامی پاکستان نہیں، اسلامی پاکستان بننے لگا

''دنیا بھر کے محنت کشو اکٹھے ہو جاؤ'' کی جگہ ''دنیا بھر کے مسلمان حکمرانوں اکٹھے ہو جاؤ'' نے لے لی۔ 10راپریل 1973ء کو آئین ساز قومی اسمبلی کے مغربی بازو سے منتخب ہونے والوں نے اتفاق رائے سے آئین کو منظور کیا۔ یہ بھٹو صاحب کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ اب ملک کے پاس ایک آئین تھا جس پر تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں کا اتفاق تھا۔ اس آئین کے مطابق پاکستان کو عوامی جمہوریہ پاکستان نہیں بلکہ اسلامی جمہوریہ پاکستان بنایا گیا تھا۔ جبکہ ہم اور بھٹو صاحب ہمیشہ عوامی پاکستان کے قیام کا دعویٰ کرتے آئے تھے۔ بعد میں اس آئین میں کچھ ایسی ترامیم کی گئیں جن کی رو سے قائداعظم کے تصورِ مذہبی رواداری اور سیکولر تصور ریاست کو ختم کر دیا گیا۔ پاکستان کو عوامی نہیں اسلامی بنانے کی داغ بیل ڈال دی گئی جس پر بعد میں ضیاالحق نے ایک بہت بڑی اور نہایت خوفناک عمارت کھڑی کر دی۔

ابتداء میں آئین کا بنیادی ڈھانچہ محمود علی قصوری نے تیار کیا تھا جو وزیر قانون اور پارلیمانی امور تھے۔ انہوں نے لفظ اسلامی استعمال نہیں کیا تھا اور صوبائی خودمختاری بھی کچھ زیادہ ہی رکھ دی تھی جبکہ بھٹو صاحب مضبوط مرکز کے حامی تھے اور مُلّاؤں کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ محمود علی قصوری کی اب ضرورت نہیں تھی۔ ان کی جگہ عبدالحفیظ پیرزادہ کو وزیر قانون و پارلیمانی امور بنا دیا گیا اور انہوں نے اسلام اور مضبوط مرکز کی بنیاد پر 73ء کے آئین کا مسودہ تیار کیا۔

14راگست 1973ء کو آئین عمل پذیر ہوا۔ بھٹو صاحب نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ چودھری فضل الٰہی جو کہ قومی اسمبلی کے سپیکر تھے انہیں صدر مملکت منتخب کیا گیا۔ ان ہی دنوں میں جے اے رحیم کو ہٹا کر ڈاکٹر مبشر حسن کو پارٹی کا سیکرٹری جنرل مقرر کیا گیا۔ 14راگست 1973ء کو بھٹو صاحب وزیراعظم بن گئے۔

22 اور 24رفروری 1974ء کو بھٹو صاحب نے مسلم ممالک کے سربراہوں کی

کانفرنس یعنی اسلامی کانفرنس لاہور میں منعقد کی جس میں تمام مسلم ممالک کے سربراہ بشمول شیخ مجیب الرحمن شریک ہوئے۔ بیت المقدس کو آزاد کروانے سے لے کر اسلام کی ترویج و سربلندی کے لئے ایک مشترکہ فنڈ کے قیام تک کے فیصلے کئے گئے۔ دراصل یہ کانفرنس پنجابی پاکستانیوں سے بنگلہ دیش منظور کروانے کا ایک داؤ تھا۔

عرب ممالک میں عرب امارات کے شیخ زید بن سلطان، سعودی عرب کے شاہ فیصل، لیبیا کے کرنل قذافی، شام کے حافظ الاسد اور پی ایل او کے یاسر عرفات کے ساتھ بھٹو صاحب کی ذاتی دوستی تھی۔ اس کانفرنس کے بعد ان ممالک میں پاکستان کے محنت کشوں کے لئے روزگار کے راستے کھل گئے اور اس کے ساتھ ہی پاکستان میں ''اسلام پسندوں'' کے راستے بھی کھل گئے۔

بھٹو صاحب اب ''دنیا بھر کے محنت کش اکٹھے ہو جاؤ'' کی جگہ ''دنیا بھر کے مسلمان حکمرانوں اکٹھے ہو جاؤ'' کا راستہ اختیار کر رہے تھے۔ وہ مسلم دنیا کا لیڈر بننا چاہتے تھے۔ پاکستان اسلام کا قلعہ بننے جا رہا تھا۔ جمعیت علمائے ہند کی باقیات جمعیت علمائے اسلام اور جماعت اسلامی جیسی جماعتوں کے ساتھ جنہوں نے پاکستان، قائداعظم، پاکستان پیپلز پارٹی اور خود بھٹو صاحب کی مخالفت کی تھی اب محبت کی پینگیں بڑھ رہی تھیں۔

بھٹو صاحب کے شخصی تضادات میں اعتماد کا کمال یہ تھا کہ اس کانفرنس میں شامل ہونے والا یاسر عرفات بھی دوست اور یاسر عرفات کے 20 ہزار فدائین کا قتل عام کرنے والا ضیاالحق بھی منظور نظر، پاکستان کے عوام بھی دوست اور ان کے مخالفین حکمرانی میں بھٹو صاحب کے ساتھ شامل، امریکہ کے مخالف ممالک اور اقوام کے ساتھ بھی دوستی اور پنٹاگان میں بھی راہیں استوار، ان کی اس خود اعتمادی کی سیاست نے آئندہ چل کر ان کو بھی نقصان پہنچایا اور عوام کو بھی۔

یہ معاملہ زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا اور نہ چلا۔ ظالم اور مظلوم کے درمیان، استحصال کرنے اور استحصال کا شکار ہونے والے کے درمیان، سامراج اور سامراج مخالف عوام اور اقوام کے درمیان، مذہبی انتہا پسندوں اور سیکولر عوام کے درمیان، پاکستان دوست اور پاکستان

دشمن کے درمیان موجود تضادات کو واضح کرنے کے بعد، ان کے درمیان خط امتیاز کھینچنے اور اس کا شعور دینے کے بعد تاریخ کے پہیئے کو اپنی مرضی کے مطابق الٹا چلانا اب ناممکن تھا۔

اندرا گاندھی کی شرط تھی کہ پہلے بنگلہ دیش کو منظور کیا جائے اس کے بعد جنگی قیدیوں اور علاقوں کی واپسی شروع ہوگی۔ اس اسلامی کانفرنس میں شیخ مجیب الرحمن کو بلا کر بنگلہ دیش کو منظور کیا گیا اور جنگی قیدیوں اور علاقوں کی واپسی شروع ہوئی۔

بھٹو صاحب نے تیل پیدا کرنے والے عرب ممالک کو مغرب کے خلاف تیل کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا راستہ بھی دکھایا۔ سعودی عرب کے شاہ فیصل نے اس کا استعمال کیا۔ تیل کی سپلائی کم کر دی۔ تیل کی قیمتیں بڑھ گئیں۔ مغرب خوفزدہ ہو گیا۔ تیل پیدا کرنے والے ممالک کی اہمیت اور طاقت کے اس مظاہرے کے بعد مشرق وسطیٰ کے سیاسی نقشے کے بارے میں مغرب نے اپنے لائحہ عمل پر نظر ثانی شروع کر دی۔ شاہ فیصل کو قتل کر دیا گیا۔

بھٹو صاحب پر مغرب کا اعتبار اُٹھتا جا رہا تھا اور پاکستان کے عوام کا بھی۔ بھٹو صاحب ان تمام اداروں کو جن پر عوام نے زد لگائی تھی ان کو جوڑ رہے تھے اور مضبوط کر رہے تھے۔ ایف ایس ایف کی کارروائیوں اور حرکات سے یہ تاثر مل رہا تھا کہ یہ ان کا ذاتی ادارہ ہے جو ان کے سیاسی اور ذاتی مخالفین سے نپٹنے کا کام کر رہا ہے۔ مسعود محمود فیڈرل سیکورٹی فورس کا سربراہ تھا۔

فیڈرل سیکیورٹی فورس

اس کے سربراہ کی گواہی پر بھٹو کو پھانسی دی گئی

بھٹو صاحب کے اقتدار میں آنے کے فوراً بعد مارچ 1972ء میں سرحد اور پنجاب میں پولیس نے ہڑتال کی تھی۔ بھٹو صاحب اس کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ پولیس جو ہمیشہ ملک میں امن وامان قائم کرنے میں ناکام رہی تھی اب خود امن وامان کا مسئلہ پیدا کر رہی تھی۔ ہڑتال پر تو قابو پا لیا گیا مگر بھٹو صاحب نے دوستوں سے مشورے شروع کر

دیئے۔ اس سے پہلے ماضی میں بھی جلسے، جلوس اور ہڑتالوں پر جب پولیس قابو نہیں پا سکتی تھی تو فوج کو طلب کیا جاتا تھا۔ چنانچہ بھٹو صاحب نے مرکزی وزارت داخلہ میں 1972ء میں ہی فیڈرل سیکیورٹی فورس کا ادارہ قائم کیا۔ اس کا کام امن وامان کے قیام میں پولیس کی مدد کرنا تھا۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اس طرح ملک کے اندرونی معاملات میں فوج کی مداخلت کو بھی روکا جاسکے گا۔ چنانچہ ایف ایس ایف قائم کر کے پندرہ ہزار افراد کو بھرتی کیا گیا اور پولیس آفیسر حق نواز ٹوانہ کو اس کا ڈائریکٹر جنرل مقرر کر دیا گیا۔ مگر جلد ہی اس کی جگہ مسعود محمود نے لے لی۔ وہ نہایت چالباز اور خوشامدی انسان تھا۔

ایف ایس ایف کے ذریعے سیاسی پارٹیوں، رہنماؤں اور کارکنوں پر نظر رکھی جانے لگی۔ بھٹو مخالفین ہوں یا پیپلز پارٹی کے رہنما اور کارکن ان کی جاسوسی کرنا اور ان کے بارے میں رپورٹیں تیار کرنا ایف ایس ایف کے فرائض میں شامل ہو گیا۔ سیاست دان اور کارکن سمجھنے لگے کہ اپنے مخالفین سے نپٹنے کے لئے بھٹو صاحب نے گسٹاپو فورس تیار کر لی ہے۔ اکثر اوقات مسعود محمود ''شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار'' ثابت کرنے کے لئے خود ہی ایسے اقدامات کرتا جس کا خمیازہ بھٹو صاحب اور ان کی حکومت کو بھگتنا پڑتا۔ اس کا اندازہ ایک مثال سے لگایا جاسکتا ہے۔

راؤ رشید جو اس وقت آئی جی پنجاب تھے اپنی کتاب ''جو میں نے دیکھا'' کے صفحہ 162 پر مسعود محمود کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''اصغر خان صاحب (ریٹائرڈ ائر مارشل) لاہور دورے پر آئے ہوئے تھے تو A.I.G ریلوے میرے پاس آئے کہ ہم نے آدمی پکڑا ہے۔ بم اس کے پاس تھا۔ وہ ریل گاڑی کے ڈبے میں اس کو چلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کو لوگوں نے دیکھ لیا اور شور مچایا۔ اس کو ہم نے پکڑا ہوا تھا کہ ایف ایس ایف والے ہمارے لوگوں کو دھمکا کے اسے لے گئے۔ چنانچہ پتہ چلا کہ مسعود محمود نے ایک آدمی کی ڈیوٹی لگائی کہ اصغر خان جب ریلوے سٹیشن پر آئیں اور لوگ جمع ہوں تو یہ بم چلا دینا۔ اصغر خان پر چلانے کی تو ہمت پڑی نہیں۔ اس نے یہ کیا کہ ڈبے میں جا کے ایک غسل خانے میں رکھ کے اس کو چلانے کی کوشش کی۔ وہ چلا نہیں۔ وہ آدمی بھاگا اس کو

پکڑ لیا اور بم بھی پکڑا گیا۔''

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ ''میں نے بھٹو صاحب سے وقت مانگا اور ان سے شکایت کی کہ اگر ایف ایس ایف بم چلائے گی تو پھر میں کیسے کنٹرول کر سکوں گا۔ اس سے بڑے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ اگر اس مجمع میں بم چل جاتا، اصغر خان اس سے مر سکتے تھے۔ کچھ لوگ مر سکتے تھے آپ کے لئے اس کا کیا سیاسی فائدہ نکلتا۔ انہوں نے کہا کہ میں پوچھتا ہوں۔ چنانچہ شام کو گورنمنٹ ہاؤس میں استقبالیہ تھا۔ بھٹو صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ اتنے میں مسعود محمود اوپر بھٹو صاحب سے مل کر آیا۔ ہاتھ میں اس کے شراب کا گلاس تھا۔ آنکھیں اس کی غصے میں سرخ تھیں۔ کہنے لگا آپ نے میری شکایت کیوں کی۔ میں نے کہا تم سے کس نے کہا ہے کہ پنجاب میں اس طرح سے دہشت پھیلاؤ۔ کہنے لگا میں تمہیں دیکھ لوں گا اور غصے میں آ کے شراب کا گلاس اس نے پورچ کے پلر پر دے مارا۔'' یہ وہی مسعود محمود تھا جو بھٹو صاحب کے خلاف قتل کیس میں وعدہ معاف گواہ بنا۔

احمد رضا قصوری پر حملہ

11 رنومبر 1974ء کو احمد رضا قصوری پر لاہور میں حملہ کیا گیا۔ احمد رضا قصوری نے بھٹو صاحب کو پریشان کیا ہوا تھا مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ بھٹو صاحب اس کے قتل کے درپے تھے۔ مگر شاہ سے زیادہ شاہ کے وفاداروں کا زمانہ تھا۔ احمد رضا کے والد نواب احمد خان قتل ہو گئے اور بھٹو صاحب کے خلاف لاہور کے تھانے میں ایف آئی آر درج کروائی گئی۔

1974ء میں جسٹس شفیع الرحمن نے نواب احمد خان قتل کیس کی جوڈیشل انکوائری کی یہ رپورٹ 36 سال تک خفیہ رکھے جانے کے بعد اب پبلک کی ہے۔ اس کے مطابق نواب احمد خان کے قتل کیس میں بھٹو صاحب کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ چنانچہ اس کیس کو اس وقت ختم کر دیا گیا۔ اس کیس میں عبدالستار نجم نے بھٹو صاحب کا دفاع کیا تھا۔ جسٹس شفیع کے بھٹو صاحب کے ساتھ نظریاتی اختلافات تھے مگر انہوں نے بھٹو صاحب کو اس کیس

میں بے گناہ قرار دیا تھا۔ اس کیس کو ضیاالحق کے حکم پر دوبارہ 24 ستمبر 1977ء کو کھولا گیا۔

8 اپریل 2011ء کے روزنامہ ڈان میں دیئے گئے انٹرویو میں عبدالستار نجم بتاتے ہیں کہ اس جوڈیشل انکوائری میں گواہوں کے بیانات ریکارڈ اور ثبوت جمع کئے گئے تھے۔ احمد رضا قصوری اس انکوائری سے مطمئن تھے اور اس کی FINDINGS کو اس وقت چیلنج بھی نہیں کیا گیا تھا۔ جب اس کیس کو دوبارہ شروع کیا گیا تو عدالت سے اس کا سارا ریکارڈ غائب کر دیا گیا اور ان کے گھر چھاپے مار کر ان کا ریکارڈ بھی چوری کر لیا گیا۔ ضیاالحق کے زمانے میں عبدالستار نجم کو بھی ملک چھوڑنا پڑا تھا۔ وہ 1988ء میں بے نظیر کے دور میں واپس آئے اور پنجاب حکومت کے اٹارنی بھی رہے۔

ان دنوں بھارت کے ایٹمی دھماکے نے بھٹو صاحب کو پریشان کیا ہوا تھا۔ ان کی تمام تر توجہ اس طرف تھی۔ اس لئے کہ ان کی تمام سیاست کی بنیاد بھارت مخالفت پر تھی۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ وہ پاکستانی قوم پرست تھے، وہ سوشلسٹ نہیں تھے۔ ہم نے ان کو سوشلسٹ سمجھ لیا تھا۔ وہ پاک بھارت جنگ میں، قومی تضاد میں، ایک ہیرو کے طور پر ابھرے تھے۔ یکم دسمبر 1974ء کو ہونے والے بھارتی ایٹمی دھماکے کو بھٹو صاحب نے پاکستان کی بقاء کے لئے ایک خطرہ قرار دے کر نیوکلیئر پروگرام شروع کرنے کا اعلان کر دیا۔ بھارت کے پاس ایٹم بم تھا۔ پاکستان نے بھی ایٹم بم بنانا تھا خواہ گھاس ہی کیوں نہ کھانی پڑے۔ وہ کم سے کم وقت میں ایٹم بم چاہتے تھے۔ ان کی ترجیحات میں احمد رضا قصوری یا ان کے والد کا قتل نہیں تھا۔ وہ پاکستانی قوم کو ایٹم بم دے کر بھارت کے مقابلے میں ایک برابری کا مقام دلوا رہے تھے جبکہ ان کے عدالتی قتل کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔

ضیاالحق کی تقرری

29 فروری 1976ء کو جنرل ٹکا خان کے ریٹائر ہونے پر ضیاالحق کو آرمی چیف مقرر کیا گیا جس نے آگے چل کر بھٹو صاحب کا عدالتی قتل کروایا۔ کئی سینئر جرنیلوں پر ترجیح دے کر اس کی تقرری میں بھٹو صاحب کی خوشامد پسندی اپنی جگہ مگر شاہ حسین جس کی

بادشاہت کو بریگیڈیئر ضیاالحق نے ہزاروں فلسطینیوں کا قتل عام کر کے بچایا تھا اور اسرائیل کو بھی اطمینان کا سانس نصیب ہوا تھا اس کا بڑا ہاتھ تھا۔

جب اس کی تقرری کا فیصلہ کیا گیا تو میرے پرانے دوست جھنگ پیپلز پارٹی کے صدر ظفر عباس قریشی جو پرائم منسٹر ہاؤس میں OSD تھے اور خاتون اول بیگم نصرت بھٹو کے ساتھ ان کی ڈیوٹی تھی وہ اس وقت بھٹو صاحب کے پاس موجود تھے۔ یہ غالباً 80 کی دہائی کے اواخر یا 90 کی دہائی کے شروع کی بات ہے جب وہ برطانیہ آئے ہوئے تھے۔ چند دن کے لئے میرے پاس بھی ٹھہرے۔ ایک روز ضیاالحق کی تقرری پر بات چل نکلی تو انہوں نے بتایا کہ ''بھٹو صاحب صادق حسین قریشی کے وائٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ آرمی چیف کی تقرری کا مسئلہ تھا۔ جنرل ٹکا خان بضد تھے کہ ضیاالحق کو کسی بھی صورت میں آرمی چیف مقرر نہ کیا جائے بلکہ تجویز شدہ فہرست میں سے کسی بھی سینئر جرنیل کو مقرر کیا دیا جائے۔ مگر بھٹو صاحب نے جب اپنا آخری فیصلہ ضیاالحق کے حق میں سنایا تو ٹکا خان یہ کہہ کر اٹھ کر باہر چلے گئے کہ میں اس فیصلے میں شامل نہیں ہوں۔ آپ خود یہ فیصلہ اپنی مرضی سے کر رہے ہیں۔ مجھے بھٹو صاحب نے کہا کہ جاؤ Old Man کو واپس لے کر آؤ۔ انہیں نہیں معلوم کہ مجھ پر کتنا دباؤ ہے اور میں اس دباؤ کے سامنے کچھ نہیں کر سکتا۔ قریشی صاحب بتاتے ہیں کہ جنرل ٹکا خان غصے میں اتنی تیزی سے جا رہے تھے کہ مجھے بھاگ کر ان تک پہنچنا پڑا۔ ''میں بہت مشکل سے انہیں واپس لے کر آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اردن کے شاہ حسین کا فون ہر پانچ منٹ کے بعد آ رہا تھا اور بھٹو صاحب بار بار اس کے فون کو سننے کے لئے اندر جا رہے تھے۔''

چاول چھڑنے کے کارخانے اور آٹا پیسنے کی چکیاں قومیالی گئیں

گھوڑے کو تانگے کے پیچھے باندھ دیا گیا

ضیاالحق کی تقرری کے بعد ایک اور کارنامہ جو بھٹو صاحب سے کروایا گیا وہ یہ کہ 17 رجولائی 1976ء کو ملک میں چاول چھڑنے کے چھوٹے چھوٹے کارخانے اور فلور ملز

یعنی آٹا پیسنے کی چکیاں قومی ملکیت میں لے لی گئیں۔ جاگیردارانہ اور نیم قبائلی معاشرے میں جو کہ سرمایہ داری نظام معیشت میں بھی ابھی داخل نہیں ہوا تھا اس طرح کے اقدام گھوڑے کو تانگے کے پیچھے باندھنے کے مترادف تھے۔ شیخ رشید کی متعارف کی گئی زرعی اصلاحات ناکام ہو چکی تھیں۔ بڑی بڑی زمینداریاں، سرداریاں اور جاگیریں ختم کر کے کسانوں، دہقانوں، کھیت مزدوروں کو معاشی غلامی سے آزاد کروانا وہ بنیادی ہدف تھا جس کے حصول کے بعد بڑی صنعتوں کو اور پھر چھوٹی صنعتوں کو قومیانے کے بعد ایک سوشلسٹ معاشرے کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی اور ''سوشلزم ہماری معیشت ہے'' کا اصول عمل میں ڈھالا جا سکتا تھا۔ مگر یہ نہیں ہو سکا تھا۔ صنعت کاروں کا وہ درمیانہ طبقہ جس نے بھٹو صاحب کا ساتھ دیا تھا وہ بھی اب ان سے ناراض تھا۔ اگرچہ بھٹو صاحب نے وہ اصلاحات کی تھیں جو اس ملک میں اس سے پہلے کبھی نہیں کی گئی تھیں مگر عوام کی اکثریت ان کے ثمرات سے محروم تھی۔ ان کی بنیادی ضرورت روٹی، کپڑا اور مکان انہیں نصیب نہیں ہوا تھا۔

بھٹو نے اپنے قاتل اپنے اردگرد جمع کر لئے

عالمی سامراج کے مفادات کے محافظ اور رجعت پسند عوام دشمن سب ہی ایوان اقتدار میں فیصلہ کرنے والوں میں شامل کر لئے گئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھٹو صاحب کے جان نثار ساتھی، ان کے دوست اور نظریاتی کارکن پیچھے ہٹتے گئے۔ بھٹو صاحب نے مسعود محمود جیسے اپنے قاتل اپنے گرد جمع کرنا شروع کر دیئے تھے۔ مثلاً پرائم منسٹر ہاؤس میں بھٹو صاحب کے قابل اعتماد لوگوں میں افضل سعید جیسے لوگ تھے۔ افضل سعید کی بیگم اور مودودی کی بیگم رشتے دار تھیں۔ 1977ء کے الیکشن کے دوران کی ہر فائل افضل سعید کے علم میں تھی۔ جب بھٹو صاحب کی حکومت کا تختہ الٹا گیا تو سب سے زیادہ معلومات اس کے پاس تھیں۔ یہ افضل سعید ہی تھا جس کے لگائے گئے الزامات کی بنیاد پر بھٹو صاحب کے خلاف قرطاس ابیض تیار کیا گیا تھا۔

سنا گیا کہ بھٹو صاحب کو پھانسی دینے سے ایک روز پہلے ضیاالحق نے جماعت

اسلامی کے مولوی محمد طفیل کے ساتھ ڈیڑھ گھنٹہ تک ملاقات کی۔ ضیاالحق کی بیوی بھی مولوی طفیل کی رشتے دار تھی۔

بھٹو صاحب امریکہ کو خوش کر رہے تھے اور امریکہ مخالفین کو بھی۔ انہوں نے نیوز ویک میں اپنے ایک انٹرویو میں امریکہ کو یہ کہہ کر کہ I have stopped the storm of revolution in the sub continent خوش کرنے کی کوشش کی۔ یہ شمارہ حکومت نے اپنے ذرائع کے ذریعے مارکیٹ سے اٹھوا لیا تھا۔ مگر بعد کے واقعات سے ثابت ہوا کہ امریکی انتظامیہ بالخصوص پینٹا گون بھٹو صاحب پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس سارے عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام اور انگاروں بھرے کارکن جو بھٹو صاحب کی اصل طاقت تھے وقت کے ساتھ ساتھ اُن سے دور ہوتے گئے۔

عام کارکنوں میں سے اکثر نے وزیروں، مشیروں کے دفتروں کے چکر لگانے شروع کر دیئے۔ انہوں نے رقم کے بدلے درخواستیں پکڑنا شروع کر دیں۔ راشن ڈپو اور پلاٹس کے الاٹمنٹوں کے چکر میں انہیں اپنی قربانی کی قیمت ملنے لگی۔ وزیروں اور ممبران پارلیمنٹ نے اوپر تلے شادیاں کرنا یا داشتائیں رکھنا شروع کر دیں۔ حتیٰ کہ بابائے سوشلزم شیخ رشید نے بھی سب کی دیکھا دیکھی ایک نئی شادی رچا ڈالی۔ بھٹو صاحب تو حسنہ شیخ کے گرویدہ تھے ہی۔ مولانا کوثر نیازی نے نکاح پڑھوایا اور مصطفیٰ کھر نے گواہی دی۔ بیگم نصرت بھٹو نے مصطفیٰ کھر کے اس عمل کو کبھی معاف نہیں کیا۔ پارٹی کے سنجیدہ اور فکر مند رہنماؤں کو چھوڑ کر تمام ہی کے لئے ہر روز عید اور ہر رات شب برات تھی۔

بلوچستان میں فوج کشی، مزدوروں پر گولی، جے اے رحیم کی پٹائی، معراج سے لے کر حسین نقی تک سب قید

پھر تاریخ نے یہ دیکھا کہ جب بھٹو صاحب کو ضیا الحق نے احمد رضا قصوری کی جانب سے دائر کردہ قتل کے مقدمے میں پھنسا کر ان کے عدالتی قتل کا راستہ اختیار کیا، ان کی پھانسی کا مرحلہ قریب آتا گیا مگر عوام خاموش رہے اور وہ تمام عوام دشمن عناصر جو" لاکھوں

ساتھیوں سمیت'' پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے تھے نہ صرف غائب تھے بلکہ ضیاالحق کے ساتھ یا تو جوڑ توڑ کر رہے تھے یا اس کے ساتھ شامل ہو رہے تھے۔ میں نے یہ تکلیف دہ منظر کئی بار دیکھا کہ جب بھٹو صاحب کو عدالت میں لایا جاتا تو درجن بھر افراد سے زیادہ لوگ نہیں آتے تھے۔

چند ہی سالوں میں یہ کیسے ہو گیا۔ اس کا سنجیدگی اور ذاتی جذبات اور لگاؤ سے ہٹ کر تجزیہ کرنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے کہ میاں محمود علی قصوری جو ہمیشہ بھٹو صاحب کے قانونی مشیر تھے ان کی گرفتاری سے لے کر ان کے اقتدار میں آنے تک اور آئین کی ابتدائی تیاری تک ساتھ تھے، کیوں ان سے الگ ہو گئے۔ پھر جے اے رحیم جو پارٹی کے نہ صرف سیکرٹری جنرل تھے بلکہ پارٹی قائم کرنے کے محرک تھے، ورنہ بھٹو صاحب تو ممتاز دولتانہ کی کونسل مسلم لیگ میں شامل ہونے پر غور کر رہے تھے، انہوں نے پارٹی کو بنیادی دستاویز دی تھی، پارٹی کا جھنڈا اور اس کا فلسفہ دیا تھا کہ جھنڈے میں سبز رنگ کا کیا مطلب ہے، لال رنگ کس چیز کی علامت ہے اور سیاہ رنگ سے کیا مراد ہے۔ فلاسفی آف دی فلیگ کو ہم نے نصرت میں ترجمہ کر کے چھاپا اور اس کا پمفلٹ بنا کر پارٹی میں تقسیم کیا گیا، نظریاتی جنگ ہو یا فکری محاذ، پارٹی کے اندر سازش ہو یا پارٹی کے باہر، ہر محاذ پر، ہر قدم پر وہ بھٹو صاحب کے لئے ایک ڈھال تھے۔ جب بھٹو صاحب 13 رنومبر 1968ء کو گرفتار ہوئے تو بیگم نصرت بھٹو کو نہیں بلکہ جے۔ اے۔ رحیم کو پارٹی کا چیئرمین بنایا گیا تھا۔ پھر کیا ہوا کہ ایف ایس ایف کے غنڈوں سے ان کی پٹائی کروائی گئی۔ بعد میں وہی ایف ایس ایف جس کا ڈائریکٹر مسعود محمود تھا، بھٹو صاحب کے قتل کیس میں ان کے خلاف وعدہ معاف گواہ تھا۔

پھر وہ معراج محمد خان جس نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ہر مقام پر بھٹو صاحب کا ساتھ دیا تھا۔ جب سانگھڑ میں بھٹو صاحب پر گولی چلی تو معراج ہی تھا جو اپنا سینہ تان کر بھٹو صاحب کے سامنے تھا۔ جس کو بھٹو صاحب نے کراچی کے جلسہ عام میں اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ ان پر ایوب خان اور یحییٰ خان نے اتنا تشدد کیا تھا کہ ان کی ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی تھی۔ پھر کیا ہوا کہ کراچی کے مزدوروں کا ساتھ دینے پر بھٹو صاحب کے تشدد کی وجہ سے ان

کی دوسری آنکھ کی بینائی بھی خطرے میں پڑ گئی۔

پھر وہ طفیل عباس جنہیں استحصالی نظام کی تبدیلی کی جدوجہد کی وجہ سے ہر حاکم وقت نے جیلوں میں رکھا تھا اور پیپلز پارٹی بننے سے قبل ان کا بھٹو صاحب کے ساتھ اصولی اتحاد ہوا تھا اور بھٹو صاحب نے ان کو قومی وصوبائی اسمبلی کی تینتیس (33) سیٹیں بھی پیش کی تھیں۔ تو کیا ہوا کہ ان ہی طفیل عباس کو تیرہ ماہ تک بھٹو صاحب نے جیل میں رکھا اور ماہنامہ منشور جس کو وہ اپنا منشور کہتے تھے اس پر پابندی لگا دی۔ طفیل عباس پی آئی اے ایرویز یونین کے لیڈر تھے۔ بھٹو صاحب نے انہیں یونین سے نکالنے کے لئے ان کی تنخواہ کے گروپ کو ہی یونین سے نکال دیا۔ جس کی وجہ سے انہوں نے بارہ سال پہلے ہی پی آئی اے کی ملازمت چھوڑ دی۔ پھر بھٹو صاحب نے جب جماعت اسلامی کے ساتھ اتحاد کر لیا تو پی آئی اے میں جماعت کی یونین پیاسی کے عہدے داروں کو سرکاری وفد کے طور پر چین بھیجا جانے لگا جہاں پر طفیل عباس کے سیاسی اور تنظیمی رابطے تھے۔ نہ صرف یہ کہ طفیل عباس کی چیئرمین ماؤزے تنگ کے ساتھ ملاقاتیں رہی تھیں بلکہ پیپلز ہال پیکنگ میں ان کی تصویر بھی لگی ہوئی تھی اور بھٹو صاحب اپنے دورہ چین کے دوران یہ تصویر دیکھ کر آ چکے تھے۔

حسین نقی کو انہوں نے جیل میں ڈال دیا۔ خورشید حسن میر کے پیچھے مولانا کوثر نیازی کو لگا دیا گیا۔ بلکہ بھٹو صاحب جس وزیر یا رہنما کو پارٹی سے نکالنا چاہتے تھے اس کی دم پر مولانا کوثر نیازی کا پٹاخہ باندھ دیتے تھے۔ یہی مولانا پھر ضیاالحق کے ساتھ تھے۔ پنجاب میں ارائیں اور جٹ برادری کی دیرینہ عداوت کی سیاست اور دھڑے بندی کو ہوا دی گئی۔ پھر حنیف رامے نکل گئے۔ مصطفیٰ کھر کے ساتھ لڑائی ہو گئی۔ کھر کے ساتھیوں افتخار تاری، چودھری ارشاد اور محمد حنیف کو دلائی کیمپ میں ڈال دیا گیا۔ مختار رانا پر قتل کا مقدمہ چل پڑا اور وہ جیل میں بند کر دیئے گئے۔

پھر وہ صادق حسین قریشی جس نے ایوب خان کے مغربی پاکستان کے گورنر جنرل موسیٰ خان کے پاس سینے پر ہاتھ مار کر کہا تھا کہ ''میں عاشق حسین دا پتر نہ ہوواں جے اگر بھٹو ایس واری ملتان توں خیریت نال واپس چلا جاوے۔'' اور بھٹو صاحب پر قاتلانہ حملہ کروایا

تھا جس میں وہ بال بال بچے تھے۔ اسی صادق حسین کو پہلے بھٹو صاحب نے وزیر بنایا، پھر حنیف رامے کو ہٹا کر وزیراعلیٰ بنایا۔ اس قاتلانہ حملے کے موقع پر رسول بخش تالپور، مصطفیٰ کھر، احمد رضا قصوری جو بھٹو صاحب کے ساتھ تھے اب پیپلز پارٹی سے باہر تھے۔

وہ جسٹس مولوی مشتاق جو ایوب خان کے خلاف تھا۔ جس نے جنوری 1969ء میں بھٹو صاحب کو نظر بندی سے رہائی دی تھی جو بھٹو صاحب کی حمایت اور تعریف کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب کبھی ہم 1968ء کی تحریک کے دوران عبدالرشید شیخ کی ضمانت قبل از گرفتاری کروانے کے لئے لاہور جاتے تو وہ نہ صرف ضمانت کے حق میں فیصلہ دیتا بلکہ اپنی جیب سے راولپنڈی واپسی کا بس کا کرایہ بھی دیتا (اس وقت ایک طرف کا کرایہ آٹھ روپے تھا) ایسا کیا ہوا کہ وہ بھٹو صاحب کا جانی دشمن بن بیٹھا۔

کراچی میں مزدوروں پر گولیاں برسائی گئیں۔ بلوچوں پر فوج کشی کی گئی۔ کارکن آپس میں الجھنے لگے۔ راولپنڈی میں پارٹی کنونشن ہوا تو کارکنوں میں جوتم پیزار ہوئی اور بھٹو صاحب پارٹی کے نظریاتی منہ پھٹ مگر وفادار کارکنوں سے بے زار نظر آنے لگے۔ ناصر رضوی جیسے رجعت پسند جاگیرداری نظام کے مبلغ کو پارٹی کا سیکرٹری جنرل بنا دیا گیا۔ تاج محمد لنگا جو کہ اس وقت پارٹی کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل تھے افراتفری کی اس اندھیری رات میں بھی روشنی تلاش کرتے رہے۔ شیخ رشید یعنی بابائے سوشلزم ہر تنخواہ پر کام کرنے کو تیار تھے اور آخری وقت تک کرتے رہے۔ میں ان کا احترام کرتا ہوں مگر ان کی مصلحت پسندی کا معاملہ میری سمجھ سے ہمیشہ باہر رہا۔

جب کراچی میں مزدوروں پر گولی چلنے کی وجہ سے معراج محمد خان نے وزارت سے استعفیٰ دیا تو شیخ صاحب نے معراج سے کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم استعفیٰ دو میں بھی استعفیٰ دوں گا۔ معراج نے استعفیٰ دے دیا مگر شیخ صاحب وہیں موجود رہے۔ پنجاب میں شیخ صاحب کے دھڑے، مصطفیٰ کھر کے دھڑے اور حنیف رامے کے دھڑے کے درمیان جب دھڑے بندی کا گند پھیلا اور شیخ صاحب کے کارکنوں پر مقدمے بنے یا

زیادتی ہوئی تو وہ خاموش رہے۔ بھٹو صاحب نے شیخ رشید کی تجویز پر بیگم بھٹو کو چیئرپرسن بنایا اور پھر پارٹی خاندانی وراثت میں چلی گئی۔

شیخ رشید کی تجویز پر بیگم بھٹو کو چیئرپرسن بنایا گیا

پارٹی خاندانی وراثت میں چلی گئی

جب ضیاالحق نے بھٹو صاحب پر قتل کا مقدمہ بنا کر ان کو جیل میں ڈالا تو پارٹی کے قائم مقام چیئرمین بنانے کا معاملہ درپیش تھا۔ شیخ صاحب کے بارے میں بھی تجاویز تھیں اور غلام مصطفیٰ جتوئی کے بارے میں بھی سوچا جا رہا تھا۔ جب شیخ رشید صاحب کو لگا کہ پارٹی کی اکثریت جتوئی صاحب کو قائم مقام چیئرمین بنانے کی تجویز کو حتمی شکل دینے والی ہے تو انہوں نے بیگم نصرت بھٹو کو چیئرپرسن بنوانے کے لئے دلیل دی کہ اُن کے چیئرپرسن بننے سے پارٹی میں اتحاد رہے گا۔ بھٹو صاحب نے اس تجویز کو مان لیا۔ اگرچہ جمہوریت کے لئے جدوجہد کرنے والی پیپلز پارٹی میں خود کبھی انتخابات نہیں ہوئے تھے مگر اس فیصلے نے ایک ایسا خطرناک موڑ کاٹا کہ پارٹی میں وراثت کی قیادت کی داغ بیل پڑ گئی۔ مظلوم ومحکوم عوام کی سیاسی جماعت خاندانی وراثت میں چلی گئی۔ ان دنوں شیخ صاحب خود اصغر خان کی تحریک استقلال میں شمولیت کرنے والے تھے۔

عوامی انقلاب کی آندھی، دھول بھری آندھی میں تبدیل ہوگئی

طالب علموں، مزدوروں، کسانوں، غریب شہریوں اور سیاسی کارکنوں کی طاقت کا ایک طوفان 69-1968ء میں اٹھا تھا جس کا نتیجہ 1970ء میں پیپلز پارٹی کی انتخابات میں جیت تھی۔ اس طاقت کو کنارہ بند کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ طاقت روز روز نہیں ابھرتی۔ ایک بار یہ طاقت 1947ء میں ابھری تھی جو الاٹمنٹوں کے گرداب میں گم ہوگئی۔ دوسری بار یہ طاقت 1965ء میں ابھری تھی جسے معاہدہ تاشقند میں ڈبو دیا گیا۔ تیسری بار یہ طاقت 1967ء میں پیپلز پارٹی کے قیام اور 69-1968ء کی تحریک میں ابھری تھی جو پیپلز پارٹی

کے اقتدار میں آنے کے بعد جلد ہی مایوسی کے اندھیرے میں گم ہوگئی۔

انتخاب کے ذریعے انقلاب کا دروازہ کھولنے کا عمل جلد ہی اپنا راستہ کھو بیٹھا اور بہت جلد انقلاب کی آندھی ایک دھول بھری آندھی میں تبدیل ہوگئی۔ عوام کی صدیوں کی زنجیریں نہ کٹ سکیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معاشی استحصال، مذہبی جنونیت اور آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی نئی اور چمکتی ہوئی زنجیریں ان کے پاؤں میں ڈال دی گئیں۔ اب پاکستان اور عوام مکمل طور پر عالمی سامراج اور اس کے گماشتوں کے قبضے میں ہیں۔

بھٹو صاحب نے اقتدار کے حصول کے لئے عوامی طاقت کا راستہ اپنایا اور اقتدار میں رہنے کے لئے جاگیرداروں، سرمایہ داروں، مراعات یافتہ طبقات، سول اور ملٹری بیوروکریسی اور امریکہ کی حمایت کا راستہ اختیار کیا۔ اس راستے کو اپنانے کے نتیجے میں بھٹو صاحب عوام میں غیر مقبول ہوگئے۔ عوام کی وہ طاقت جو انہیں اقتدار میں لائی تھی خاموشی سے ان کے پاؤں تلے سے نکل گئی۔ ایٹمی پروگرام پر امریکہ کے ساتھ جب بھٹو صاحب کے تعلقات میں کشیدگی آئی تو عوام کی طاقت کو ازسرنو حاصل کرنا مشکل تھا۔ بہت دیر ہوچکی تھی۔ عوام ناراض تھے۔

ایٹم بم بنانے کے لئے، امریکہ کو ناراض کرنے کے لئے عوام میں مقبول رہنا، پیپلز پارٹی کو عوامی پارٹی بنائے رکھنا ہی وہ اقدامات تھے اور عوام کی طاقت ہی وہ طاقت تھی جس پر بھروسہ کر کے کسنجر کی دھمکی کا جواب دیا جاسکتا تھا۔

امریکہ کی بالادستی کی زنجیروں کو اگر ایک بار پہن لیا جائے تو ان سے رہائی پانا آسان نہیں ہوتا۔ یہ زنجیریں بہت بوجھل اور جان لیوا ثابت ہوتی ہیں۔ لیاقت علی نے یہ زنجیریں قوم کے گلے میں ڈالی تھیں جنہیں 69-1968ء کی تحریک کے ذریعے پیپلز پارٹی کو 1971ء میں اقتدار میں لاکر عوام نے بمشکل اتارا تھا۔ مگر یہ زنجیریں قوم کو پھر سے پہنا دی گئی تھیں۔

یہی حال بعد میں ہوا۔ کارکنوں نے ضیا الحق کے کوڑے کھا کر، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر کے، پھانسیوں کے تختوں پر چڑھ کر اور یہ سمجھ کر کہ بھٹو صاحب کی

پھانسی میں امریکہ کا ہاتھ ہے، امریکہ کے مفادات کے محافظوں کی مخالفت کی۔ امریکہ کی پاکستان کے اندرونی معاملات اور ملک پر بالادستی کے خلاف جدوجہد کی۔ مگر بے نظیر صاحبہ نے فوجی جرنیلوں اور امریکہ کی تائید و امداد کے ساتھ اقتدار حاصل کیا اور ایک بار پھر غلامی کی وہ زنجیریں جو ابھی تک موجود تھیں زیادہ بوجھل کر دی گئیں۔ جلاوطنی کے دوران بے نظیر صاحبہ کی امریکہ دوستی ہم پر تو بہت جلد یعنی 1984ء میں ہی آشکار ہو چکی تھی۔

یہ ہمارا دوسرا بڑا جلسہ تھا جو گلاسگو میں ہوا۔ اس جلسے کے دوران کراچی کے این ایس ایف کے رہنماؤں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے جاوید اختر نے ''ایشیا سرخ ہے''، ''سوشلزم آوے ای آوے''، ''امریکی سامراج مردہ باد'' وغیرہ کے نعرے لگائے جو کہ ہمیشہ سے پیپلز پارٹی کے نعرے رہے تھے کہ دوسرے روز صبح ناشتے کے دوران بے نظیر صاحبہ نے مجھے کہا کہ ان سب کو سمجھائیں کہ اب یہ نعرے نہیں لگائے جائیں گے۔ میں اور آفتاب گل ان دنوں بے نظیر صاحبہ کے بہت قریب تھے۔ پارٹی کے تنظیمی امور ہوں یا پالیسی معاملات، ہماری مشاورت ہر معاملے میں اہم تھی۔ ہم دونوں کے لئے ان کی اس بات پر یقین کرنا اور ہضم کرنا مشکل تھا۔

گلاسگو کے اس جلسے سے پہلے بھی میں ایک بار چونکا تھا جب 4/اپریل 1984ء کو ہائیڈ پارک میں جمع ہونے والے اجتماع میں ڈاکٹر غلام حسین جو پارٹی کے سیکرٹری جنرل تھے انہوں نے بے نظیر صاحبہ کا پیغام پڑھ کر سنانا تھا۔ بے نظیر صاحبہ ان دنوں کانوں کی تکلیف میں مبتلا تھیں۔ میں نے یہ پیغام لکھ کر جب مکمل کر لیا تو بے نظیر صاحبہ نے اس میں سے وہ تمام فقرے جو امریکہ کے خلاف تھے کٹوا دیئے۔

اسی رات ہم ان کے فلیٹ میں بیٹھے تھے۔ کارل مارکس پر گفتگو شروع ہوئی۔ بے نظیر صاحبہ کہنے لگیں کہ وہ پاگل تھا۔ میں نے استفسار کیا کہ are you serious کہنے لگیں کہ ''ہاں!! یوں بھی سوشلزم کا تصور اب پرانا ہو چکا ہے۔'' میں نے چونک کر کہا کہ اگر وہ پاگل تھا تو پھر 1967ء میں جب پارٹی بنائی گئی تو ہم سب پاگل تھے۔ اگر ایسی بات ہے تو

پھر سوشلزم ہماری معیشت ہے کو پارٹی کے بنیادی چار اصولوں میں سے نکال دینا چاہیے۔ وہ رات میں نے بہت پریشانی میں گزاری۔ آفتاب گل مجھے کئی بار کہہ چکے تھے کہ بے نظیر نے راستہ بدل لیا ہے۔ مگر دل نہیں مانتا تھا۔ ابھی تک ان کے ارد گرد ذاتی وفاداریوں کا حُقہ بھرنے والے مزارعین اور ان کی سالگرہ کا کیک کاٹنے والوں کا اجتماع نہیں ہوا تھا، شروع شروع کے دن تھے۔

ان کی امریکہ دوستی اس وقت کھل کر سامنے آئی جب آفتاب گل نے صفدر ہمدانی، غضنفر شاہ وغیرہ کے ساتھ مل کر ریگن کے خلاف جو ان دنوں دورۂ برطانیہ پر تھا امریکی سفارت خانے کے سامنے بھرپور مظاہرے کا اہتمام کیا۔ ہزاروں پاکستانیوں کے اس اجتماع میں ریگن، امریکہ اور ضیاالحق کے خلاف نعرے لگتے رہے۔ میں نے اور آفتاب گل نے امریکی سفیر کو یادداشت دی۔ محترمہ ان دنوں امریکہ گئی ہوئی تھیں۔ جب واپس لوٹیں تو جواب طلبی ہوئی۔ بہت ناراض تھیں۔ پوچھنے لگیں کہ آپ کو کس نے کہا تھا کہ یہ مظاہرہ کیا جائے۔ آپ میرے لئے مشکلات پیدا کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ!! اس روز میں نے آفتاب سے کہا کہ محترمہ کے ساتھ ہمارا مشترکہ سیاسی جدوجہد کا سفر اب مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

دراصل سوویت یونین نے افغانستان سے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ستمبر 1988ء میں ہونے والی ریگن اور گورباچوف ملاقات سے پہلے پاکستان میں ایک سیاسی اور پائیدار حکومت ریگن اور گورباچوف دونوں کی ضرورت تھی۔ بے نظیر اندرونی طور پر بھی اور پریس کانفرنس کے ذریعے بھی یقین دہانی کروا چکی تھیں کہ وہ امریکہ کی افغان پالیسیوں کو جاری رکھیں گی۔ گورباچوف دسمبر 1988ء میں نیویارک پہنچ کر اقوام متحدہ سے خطاب کرنے والا تھا۔ اس موقع پر گورباچوف اور ریگن میں ایک غیر رسمی ملاقات طے تھی جس میں افغانستان کا مسئلہ زیر غور آنا تھا۔ انہیں اسلام آباد میں ایک مقبول عام حکومت کی ضرورت تھی جو امریکی پالیسی کی حامی ہو۔ امریکہ کو پاکستان میں انتقال اقتدار کی جلدی تھی اور بے نظیر صاحبہ کو اقتدار میں آنے کی۔ وہ ہر قسم کی شرائط کو تسلیم

کرنے کے لئے تیار تھیں۔

ضیا الحق نے بھی ایٹمی پروگرام کو جاری رکھا ہوا تھا اور افغانستان میں امریکی پالیسی کی متعینہ حدود کو پھلانگنا شروع کر دیا تھا۔ بہاولپور کے حادثے میں وہ تمام فوجی افسران اور جرنیل جن پر امریکی افغان پالیسی پر عمل درآمد کی ذمہ داری تھی مارے گئے۔ امریکی پالیسیوں کو قبول کرنا اور پھر انحراف کرنا حکمرانوں یا حکمرانی کے منتظر افراد کو ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے۔ بے نظیر صاحبہ کے قتل کو بھی اسی تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اب نہ تو ''ہفت روزہ نصرت'' کی ضرورت تھی اور نہ ہی نظریاتی سیاست کی، میں نے کنارہ کشی اختیار کر لی

پیپلز پارٹی اقتدار میں تھی۔ بھٹو صاحب اپنی طاقت کے عروج پر تھے۔ پارٹی نے عوامی انقلاب سے منہ موڑ لیا تھا۔ میں ابھی تک نصرت میں تھا۔ ہفت روزہ نصرت نے اس عوامی انقلاب کی راہ دکھائی تھی جس کے لئے انسان کی تاریخ میں پیغمبروں اور عوام دوست رہنماؤں نے جدوجہد کی تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ نصرت کا یہ کردار بھٹو صاحب کے اقتدار میں آنے کے بعد بھی جاری رہتا تاکہ آنے والی نسلیں قطار اندر قطار عوامی انقلاب برپا کرنے اور اس کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لئے تیار کی جاتیں۔ مگر اقتدار میں آنے کے بعد ٹی وی، ریڈیو اور حکومت پاکستان کے تمام سرکاری اخبارات و رسائل اب بھٹو صاحب کی تشہیر کا ذریعہ بن گئے تھے۔ اب بھٹو صاحب کو نہ تو پارٹی کے ترجمان کی ضرورت تھی اور نہ ہی اس پیپلز پارٹی کی جو 1967ء میں قائم ہوئی تھی۔

میں نے نہایت خاموشی سے کنارہ کشی اختیار کر کے اسلام آباد یونیورسٹی میں جو اب قائداعظم یونیورسٹی کہلاتی ہے، پناہ ڈھونڈھ لی۔ پیپلز پارٹی کی نظریاتی سیاست اور جدوجہد کو رقم کرنے کا ایک باب بند ہو گیا۔ مجھ جیسے کئی پیپلز پارٹی کی پیدائش سے جڑے ہوئے انقلابی تصورات سے لیس سرگرم اور باشعور افراد پاکستان اور پاکستانی عوام کی عظمت کے جو شیلے نقیب، اپنی اپنی دنیاؤں میں چلے گئے۔ عوام، جنہوں نے جدوجہد کا

ایک سمندر ابھی عبور کرنا تھا بہت جلد لب دریا ہی ہار کر بیٹھ گئے۔ پیپلز پارٹی کا وہ کارکن جو امریکی سامراج کے خلاف تھا اور ملک میں سوشلزم کو نافذ ہوتے دیکھنا چاہتا تھا، ماضی کے دھندلے، ناقابل یقین، غیر حقیقی کرداروں کا روپ اختیار کر گیا جس کی وقت کے بہتے دریا میں کوئی حیثیت نہیں تھی۔ پیپلز پارٹی کے ساتھ اب میرا جو سفر تھا وہ دھوپ اور چھاؤں جیسا تھا۔ ساتھ بھی تھا اور جدائی تھی۔

''نصرت'' کے بعد اسلام آباد یونیورسٹی

جس کے دروازے عوام پر بند تھے

ایوب خان کے زمانے میں جب اسلام آباد یونیورسٹی قائم کی گئی تو اس کو سفید ہاتھی کہا جاتا تھا۔ ابتدائی طور پر فزکس اور ریاضی اور بعد میں اکنامکس اور کیمسٹری میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کروائی جاتی تھی۔ یونیورسٹی سٹیلائٹ ٹاؤن راولپنڈی میں کرائے کے گھر لے کر شروع کی گئی تھی۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، جن کا تعلق حیدر آباد دکن اور تھیوریٹیکل فزکس سے تھا، وہ وائس چانسلر تھے۔ پروفیسرز اور ملازمین کی تعداد طالب علموں کی تعداد سے کہیں زیادہ تھی۔ جو بھی چند طالب علم تھے وہ اسلامی جمعیت طلبا کے قبضے میں تھے اور ملازمین بھٹو مخالف تھے۔ یونیورسٹی امراء اور بالخصوص سینئر بیوروکریٹس کے بچوں کا ''تعلیمی گہوارہ'' تھی۔

بھٹو صاحب نے رضی الدین صدیقی کو ہٹا کر جب ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف کو وائس چانسلر مقرر کیا تو یونیورسٹی سٹیلائٹ ٹاؤن سے مارگلہ پہاڑیوں کے دامن میں بنائے گئے کیمپس میں منتقل ہو چکی تھی۔ میں ان دنوں '' نصرت'' کو خیر باد کہنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ ڈاکٹر صاحبہ نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا کہ اگر بہت کچھ نہیں تو کم از کم ہم مل کر ایک یونیورسٹی کو مثالی یونیورسٹی بنانے کی کوشش کر سکتے ہیں جو عوام کے مخصوص طبقات کے لئے نہ ہو، جو جدید علوم سے آراستہ ہو اور ترقی پسند بنیادوں پر آگے بڑھ سکے۔

ایک ایسی فضا میں جبکہ عوامی انقلاب سے انحراف نے مایوسی اور الجھنیں پیدا کر

دی تھیں یہ ایک کوشش تھی جس میں امید بھی تھی اور جو کی بھی جا سکتی تھی، میں نے حامی بھر لی۔ سیلیکشن بورڈ اور سنڈیکیٹ کے مراحل طے کرنے کے بعد میں نے ابتدائی طور پر شعبہ تعلقات عامہ اور پھر یونیورسٹی کی پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ بعد میں یونیورسٹی کے باقی انتظامی امور کے محکمے بھی میرے ماتحت کر دیئے گئے۔ اب ہم یونیورسٹی کو National Seat of Learning بنانے میں مصروف ہو گئے۔ یونیورسٹی کا دروازہ ہر طبقے، نظریئے اور قومیت سے تعلق رکھنے والے طالب علم کے لئے کھول دیا گیا۔ ایم ایس سی کی کلاسز کا اجرا کیا گیا۔ پہلے سے موجود مضامین کے ساتھ ساتھ دورِ جدید کے مضامین متعارف کروائے گئے۔ پاکستان میں پہلی بار کمپیوٹر سائنسز، الیکٹرانکس، بایوکیمسٹری، ارتھ سائنسز، ایریا سٹڈیز، پاکستان سٹڈیز، اینتھر وپالوجی اور سٹریٹیجک سٹڈیز جیسے مضامین شروع کئے گئے۔ بیالوجی، ریاضی، فزکس اور کیمسٹری کے علاوہ سوشل سائنسز میں تاریخ اور انٹرنیشنل ریلیشنز کا اضافہ کیا گیا۔ اکنامکس تو پہلے سے موجود تھا۔

کہوٹہ لیبارٹریز یعنی PINSTECH (پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلیئر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی) یونیورسٹی کے ساتھ منسلک تھا۔ ڈاکٹر منیر اس کے چیئرمین تھے۔ جب نیوکلیئر پروگرام شروع ہوا تو یہ ادارہ بھٹو صاحب کی ذاتی نگرانی میں کام کرنے لگا، ڈاکٹر منیر اور یونیورسٹی فزکس ڈیپارٹمنٹ کے پروفیسر ریاض الدین اور پروفیسر فیاض الدین جو کہ جڑواں بھائی تھے اور ڈاکٹر عبدالسلام کے شاگردوں میں سے تھے مل کر نیوکلیئر پروگرام پر کام کر رہے تھے۔ پاکستان کے نیوکلیئر پروگرام کے اہداف کے حصول میں ان حضرات کا اہم کردار ہے۔

میں نے مارچ 1973ء میں جب اسلام آباد یونیورسٹی میں کام شروع کیا تو اسلام آباد ابھی تک چھوٹا اور بیوروکریٹس کا شہر تھا۔ آب پارہ میں دفعہ 30 کے مجسٹریٹ کی ایک عدالت تھی اور غالباً ایک ہی تھانہ۔ گریڈز کی درجہ بندی کا خیال رکھتے ہوئے اکثر بیوروکریٹس ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اس تاثر نے کہ ہم بھٹو صاحب کے قریب ہیں اور بھٹو صاحب صدر ہونے کے ناطے یونیورسٹی کے چانسلر بھی ہیں، میرے بنائے گئے

Short term plans اور Long term plans کو پلاننگ کمیشن اور اکنامک افیئر ڈویژن جیسے محکموں میں موجود روایتی رکاوٹوں اور دشواریوں کا کم سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ نئے نئے ڈیپارٹمنٹ کھلتے گئے، نئی نئی عمارتیں کھڑی ہونے لگیں۔ پاکستان بھر سے اور دنیا بھر سے پاکستان پرست، ترقی پسند سکالرز اور ماہرین کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کیا گیا۔ تعلیم و تحقیق کے لئے لیبارٹریز میں جدید آلات اور کیمیکلز، لائبریریوں میں جرائد و رسائل بھرنے لگے اور شعبہ جات میں اساتذہ، طالب علم اور ملازمین!! یورپ امریکہ اور ساؤتھ ایشیا کی اہم یونیورسٹیوں کے ساتھ تحقیقی اشتراک وتعاون کے پروگرام بننے لگے۔ طالب علموں کے داخلے کے لئے صوبوں کا کوٹہ مقرر کیا گیا۔ اسلام آباد میں غیرملکی آنے والے سرکاری وفود کو فخریہ طور پر اسلام آباد یونیورسٹی دکھائی جانے لگی۔ بھٹو صاحب بھی چاہتے تھے کہ اسلام آباد یونیورسٹی ایک مثالی یونیورسٹی بنے۔ 1976ء میں جب ملک بھر میں قائداعظم کا جشن صد سالہ منایا گیا تو یونیورسٹی میں بھی بین الاقوامی قائداعظم کانفرنس کا اہتمام کیا گیا۔ جس کا افتتاح بھٹو صاحب نے کیا اور یونیورسٹی کا نام اسلام آباد یونیورسٹی سے بدل کر قائداعظم یونیورسٹی رکھ دیا گیا۔

یونیورسٹی ''درخشاں ماضی'' سے نکل کر ترقی پسند مستقبل کی طرف

یونیورسٹی بہت جلد اپنے رجعت پسند ''درخشاں ماضی'' سے نکل کر ترقی پسند مستقبل کی جانب چل پڑی تھی۔ جلد ہی یونیورسٹی بین الاقوامی سطح پر National Seat of Learning کے طور پر پہچانی جانے لگی۔ قائداعظم یونیورسٹی کا آرکیٹیکچرل ڈیزائن ایک امریکی آرکیٹکٹ EDWARD D. STONE کا تیار کردہ تھا۔ ایڈورڈ نے واپڈا ہاؤس لاہور کا ڈیزائن بھی بنایا تھا۔ بقول پروفیسر احمد حسن دانی، یونیورسٹی کی ان بنکر نما عمارتوں کے ڈیزائن کا تصور ایڈورڈ نے اشوک اعظم کے زمانے میں تعمیر کی گئی ٹیکسلا یونیورسٹی سے لیا تھا۔

دانی صاحب نہ صرف سوشل سائنسز فیکلٹی کے ڈین تھے بلکہ دنیا کے صف اول کے مستند آرکیالوجسٹ تھے۔ ان کے خیال اور تحقیق کے مطابق ٹیکسلا یونیورسٹی کے ڈیزائن

کا تصور یہ تھا کہ جب طالب علم عمارت کے اندر داخل ہو رہا ہو تو اس کو یہ معلوم ہو کہ اب اس کا باہر کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں اور جب وہ اندر داخل ہو جائے تو اس کو کھلا آسمان اور روشنی حاصل ہو یعنی باہر کی دنیا سے لاتعلق ہو کر ہی وہ علم کی عمارت کے اندر داخل ہو کر علم کی روشنی حاصل کر سکتا ہے۔ اشوک کے دور میں قائم کی گئی ٹیکسلا یونیورسٹی دنیا کی وہ اولین یونیورسٹی تھی جہاں پر مہا تما بدھ کی تعلیمات کے حصول کے لئے ہزاروں طالب علم ہزاروں میل کا سفر طے کر کے پہنچتے تھے اور باہر کی دنیا سے لاتعلق ہو کر علم کی روشنی حاصل کرتے تھے۔

دفتر کی کھڑکیوں میں سے مرگلہ پہاڑیوں کا وہ سلسلہ جو بلند ہوتے ہوئے ہمالیہ کی چوٹیوں تک پہنچتا ہے، نظر آتا اور فائلوں کے ڈھیر سے نپٹنا آسان ہو جاتا۔ دامن کہسار کی پست و بلند پہاڑیاں، گھاس اور جھاڑیوں سے ڈھکی رہتیں۔ ان کے درمیان سے ہو کر آنے والی بل کھاتی صاف و شفاف ٹھنڈے پانی کی ندی یونیورسٹی کی عمارات کے عقب سے ہو کر اپنے سینے میں عشق و محبت کی کئی داستانیں لئے بہہ رہی ہوتی۔ یونیورسٹی کے سترہ سو ایکڑ رقبے پر ابھی تک کہیں کہیں قدیم آباد کار اپنے مٹی کے گھروں میں آباد تھے۔ مستقبل کی عمارتوں اور سڑکوں کی منصوبہ بندی کا جائزہ لینے کے لئے جب کبھی میں سول انجینئرز اور اپنے پی اے محمد اقبال کے ساتھ اُدھر کا چکر لگاتا تو بھیڑ بکریاں چراتے ہوئے یہ مقامی باشندے ہماری جیپ کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے رک جاتے۔ ان کی آنکھوں میں ایک روشن مستقبل کی امید نظر آتی۔ یونیورسٹی میں روزگار اور ان کے بچوں کی تعلیم کے حصول کی امید۔ ہمیں دیکھ کر ان کے چہروں پر ایک عجیب طرح کی خوشی پھیل جاتی۔

میرے یونیورسٹی آنے پر ''نصرت'' کے زمانے کے وہ دوست جو اب ممبران قومی اسمبلی بھی تھے اور وزیر بھی، بہت خوش تھے کہ اب زیادہ ملاقاتیں رہیں گی۔ بھٹو صاحب کے وزیروں کے اپنے اپنے دھڑے بن رہے تھے۔ خورشید حسن میر کا گروپ، مولوی کوثر نیازی کا گروپ، غلام مصطفیٰ جتوئی کا گروپ، شیخ رشید کا گروپ، پھر ان میں رسہ کشی تھی، بھٹو صاحب کے قریب ہونے کی۔

یونیورسٹی میں میرے آنے کی خبر پر اسلامی جمعیت طلبا نے دھمکی دی ہوئی تھی کہ

اگر علی جعفر زیدی نے یونیورسٹی میں قدم رکھا تو اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔ ڈاکٹر صاحبہ پُرعزم اور بہادر خاتون تھیں۔ میں مقررہ دن یونیورسٹی میں اپنے دفتر تک پہنچ گیا۔ نہ تو اینٹ بجی اور نہ ہی پتھر ہلا۔ میں کچھ حیران بھی تھا۔ جب میں دفتر میں داخل ہوا تو نرگس زمان کیانی جن کا تعلق یونیورسٹی کے ملحقہ گاؤں بارہ کہو سے تھا، اپنے اسلحہ برداروں کے ساتھ براجمان تھے۔ وہ خورشید حسن میر اور کرنل حبیب کے ساتھیوں میں سے تھے اور سینیٹر تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک لمبا چوڑا نوجوان جس کی قلمیں سفید تھیں چند نوجوان طالب علم ساتھیوں کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا۔ ان کی عمر سے دوگنا بڑے نرگس زمان کیانی نے جب اس نوجوان کو چاچا کہہ کر مخاطب کیا تو صفدر ہمدانی نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ کالج کے زمانے سے ہی انہیں چاچا ہمدانی کے نام سے پکارا جاتا ہے اور وہ یونیورسٹی کے طالب علم ہیں۔ خورشید حسن میر نے ڈاکٹر صاحبہ سے کہہ کر ہمدانی کا داخلہ کروایا تھا جس کا تذکرہ وہ میرے ساتھ چندروز پہلے کر چکے تھے۔ یونیورسٹی میں اینٹ سے اینٹ نہ بجنے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

نہایت جذباتی، گرم جوش، دوستیاں اور دشمنیاں بنانے اور نبھانے والے مگر جلد ہی ناراض ہو جانے والے صفدر ہمدانی کا تعلق چکوال سے تھا۔ سوشلزم اور مارکسزم کے علم سے دور مگر خلوص سے بھرا ہوا چاچا ہمدانی عبدالحمید عدم کے شعر کی مکمل تصویر تھا:۔

عدم خلوص کے بندوں میں ایک خامی ہے
ستم ظریف بہت جلد باز ہوتے ہیں

یونیورسٹی میں پہلے سے موجود یا نئے آنے والے ترقی پسند، بھٹو پسند یا سوشلسٹ طالب علم، سب چاچا ہمدانی کی محبت اور دوستی میں جمع رہتے۔ سعید شفقت جو کئی سال پہلے گارڈن کالج راولپنڈی میں صفدر ہمدانی کے کلاس فیلو رہ چکے تھے، اب اس کے استاد تھے۔

دوسری طرف حفیظ اللہ خان نیازی کے آ جانے سے اسلامی جمعیت طلبا میں جان پڑ گئی تھی۔ حفیظ اللہ بھی جذبات اور خلوص سے بھرا ہوا، دوستی اور دشمنیاں بنانے اور نبھانے والا میانوالی کا یہ نڈر خان، چاچا ہمدانی سے کم نہیں تھا۔ ایک روز وہ میرے کمرے میں ایک ''سوشلسٹ کافر'' سے ''نپٹنے'' کے لئے داخل ہوا تو اس میں غم وغصہ بھرا ہوا تھا۔ اپنی اس

پہلی ملاقات کے بعد جب حفیظ اللہ میرے کمرے سے باہر نکلا تو اس طرح کہ آج چالیس سال گزرنے کے بعد بھی ہم دوستی اور محبت کے رشتوں سے باہر نہیں نکلے۔

سیاسی اختلافات اپنی جگہ پر تھے مگر ان سب میں گاڑھی چھنتی تھی۔ حفیظ اللہ نے سٹوڈنٹس یونین کی صدارت کا الیکشن لڑا اور جیتا۔ دن بھر یہ ایک دوسرے کے خلاف نعرے بازی کرتے اور شام کو اکٹھے بیٹھ کر چائے پی رہے ہوتے۔ سیاسی اختلاف کا مطلب ذاتی دشمنی نہیں تھا۔ میرے لئے یہ سب طالب علم تھے، برابر تھے، اور دوست تھے۔ طارق خورشید، محمود عالم، شعیب، صلاح الدین درانی، فاروق گیلانی، رانا واجد، آصف زیدی، سعید علوی، اظہر ملک، محفوظ ملک، سرور باری، فرزانہ باری، طاہر امین، جمیل عمر، خالد اقبال، خالد بیگ، توقیر شاہ، خالد رشید، خالد خان، ارشاد، امین خان، سعید بختیار، مرزا شفیق، تنویر صابر، افتخار انقلابی، خواجہ صدیق اکبر، طیب یزدانی، تنویر صادق، عابد سعید، گل محمد شاہ، ڈاکٹر جاوید اقبال، حسن محمود، مطیع الرحمان، ضیا الرحمان، اسد، فرحت بانو، عذرا باقر، خالدہ، گلِ یاسمین، دُرِ شہوار اور بہت سے activist جن کے نام اب یاد نہیں آرہے، سب کے سب ایک ایسے پاکستان کے لئے کوشاں اور منتظر تھے جہاں پر عوام کی حاکمیت ہو، جمہور معاشی اور سیاسی طور پر آزاد ہوں، مضبوط ہوں اور مل کر ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کرسکیں۔ عمر اصغر بھی اپنے کزن عثمان کے پاس PIDE میں آیا کرتے تھے بعد میں وہ میرے ساتھ زیر زمین سٹڈی سرکلز میں بھی شرکت کرتے رہے۔

ملازمین کی یونین عبدالرشید شیخ کے چھوٹے بھائی شیخ اشرف کے آنے کے بعد ترقی پسندوں کے زیر اثر تھی۔ مجاور شاہ اور اقبال ان میں پیش پیش تھے۔ حفیظ اللہ نیازی کے بعد سٹوڈنٹس یونین بھی ترقی پسندوں کے پاس تھی اور اساتذہ کی ایسوی ایشن بھی ترقی پسندوں کے ہاتھ میں۔ دیکھتے ہی دیکھتے یونیورسٹی ترقی پسندوں کا ایک ایسا مرکز بن گئی کہ ضیا الحق اپنے تمام عرصۂ صدارت کے دوران یونیورسٹی چانسلر ہونے کے باوجود ایک دن بھی کیمپس پر نہ آسکا۔ پروفیسر این مری شمل کو اعزازی ڈگری بھی پریذیڈنٹ ہاؤس میں کانووکیشن منعقد کر کے دی گئی۔

حنیف رامے گئے تو ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف کو ہٹا دیا گیا

بھٹو صاحب نے جو راستہ اختیار کیا تھا اس پر ان کے وہ پرانے دوست اور ساتھی جنہوں نے پیپلز پارٹی بنانے اور انہیں اقتدار تک پہنچانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا، ان کے ساتھ مل کر جدوجہد کی تھی، اس ساری صورت حال سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ یا تو از خود پارٹی سے علیحدگی اختیار کر رہے تھے یا ایسی صورت حال پیدا کی جا رہی تھی کہ وہ چھوڑ کر چلے جائیں۔

جولائی 1975ء میں حنیف رامے کو پنجاب کی وزارت اعلیٰ سے ہٹا کر نواب صادق حسین قریشی کو پنجاب کا وزیر اعلیٰ مقرر کر دیا گیا۔ حنیف رامے بھٹو مخالفت میں مصروف ہو گئے اور پیر صاحب آف پگاڑو کے ساتھ جا بیٹھے۔ اب ڈاکٹر صاحبہ کا قائداعظم یونیورسٹی میں وائس چانسلر رہنا مشکل تھا۔ یونیورسٹی میں چاچا ہمدانی جیسے افراد اور ان پروفیسرز اور افسران کے ذریعے ڈاکٹر صاحبہ کے خلاف تحریک چلوائی گئی جنہیں ڈاکٹر صاحبہ نے اپنا دوست اور ساتھی سمجھ کر یونیورسٹی میں جمع کیا تھا۔

ہمارے خلاف پہلے ایک سو ایک الزامات کا قرطاس ابیض چھپوایا گیا، شورش کاشمیری نے اپنے ہفت روزہ ''چٹان'' میں ان الزامات کی تشہیر کی، بعد میں لاہور ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ جسٹس چودھری صدیق سے ان الزامات کی تحقیقات کروائی گئیں۔ ایک بھی الزام ثابت نہ ہوا مگر ڈاکٹر صاحبہ کو جانا پڑا۔ وزارت تعلیم میں انہیں OSD بنا دیا گیا اور ان کے خلاف یونیورسٹی میں اٹھایا گیا طوفان رک گیا۔

پروفیسر ہاشم خان نئے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ وہ نہایت شریف اور ایماندار انسان تھے۔ چارج لینے کے بعد دوسرے روز انہوں نے مجھے اپنے ساتھ گھر پر چائے پینے کی دعوت دی۔ یونیورسٹی کے حالات اور معاملات پر بات رہی۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ یونیورسٹی سے میری رخصتی کی خبر سنائیں گے اور قانونی مشکلوں میں جانے کے بجائے میرے استعفیٰ کی بات کریں گے جس کے لئے میں تیار تھا۔ مگر انہوں نے کہا کہ تمہارا جانا فیصلے میں

شامل نہیں۔ تمہارے اختیارات وہی رہیں گے مگر تم میرے ساتھ اسی لگن اور محنت کے ساتھ کام کرو گے جس طرح سے اب تک کرتے آئے ہو۔ میں تمہارا خیال رکھوں گا اور تم میرا...... میں پٹھان ہوں اور تم سید...... ہاتھ ملاؤ۔ معاہدہ ہو گیا۔ جس کو ہم دونوں نے نبھایا۔

بھٹو اقتدار کے عروج پر تھے

انہوں نے 1977ء میں انتخابات کروانے کا اعلان کر دیا

بھٹو صاحب عوام سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ انہوں نے لکھا ''سیاست تحریک ہے۔ چنانچہ سیاست دان کو حرکت میں رہنا چاہیے۔ کبھی اس کو دائیں طرف اور کبھی بائیں طرف جھکنا چاہیے۔ اس کو تضادات اور شکوک پیدا کرنے چاہئیں۔ اس کو مسلسل بدلتے رہنا چاہیے۔ چیزوں کا امتحان لینا چاہیے اور مخالفین پر ہر طرف سے حملہ کرنا چاہیے۔ ان کو تنہا کرنے کے لئے ان کی کمزوریوں کو برسر عام کر کے ان پر حملہ کرنا چاہیے۔'' صفحہ 59۔ War and Secession by Sisson Rose ان دنوں بھٹو صاحب اس فلسفے پر عمل پیرا تھے۔

بھٹو صاحب کو جب یہ یقین ہو گیا کہ اب فوج، نوکر شاہی، روایتی جاگیردار اور رجعت پسند سیاست دان ان کے ساتھ ہیں تو انہوں نے 7 رجنوری 1977ء کو قومی اسمبلی توڑنے اور 7 اور 10 رمارچ کو قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کروانے کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ ابھی ان کا حکومت میں ایک سال باقی تھا۔

1967ء میں قائم کی گئی پاکستان پیپلز پارٹی اب ایک بدلی ہوئی پارٹی تھی۔ چند ایک کو چھوڑ کر پارٹی کے امیدوار وہ تھے جو ''لاکھوں ساتھیوں سمیت'' بھٹو صاحب کے اقتدار میں آنے کے بعد پارٹی میں شامل ہوئے تھے، ان میں وہ بھی تھے جنہیں 1970ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کے امیدواروں نے ہرایا تھا۔ بھٹو صاحب کے اس وقت قریبی

حلقوں کا خیال تھا کہ نوکر شاہی، ایف ایس ایف اور فوج کا ساتھ، جاگیرداروں کی پارلیمنٹ اور مُلّاؤں کی خوشنودی ان کو زیادہ عرصے تک اقتدار میں رکھ سکے گی اور ان کی ''کرسی مضبوط'' رہے گی۔ 1976ء میں کسنجر دھمکی دے چکا تھا۔ ایٹم بم بنانے کا جرم امریکہ کے نزدیک ناقابل معافی تھا۔ مگر بھٹو صاحب غرور کی حد تک طاقت کے نشے میں تھے۔ وہ عوام جو ان کی اصل طاقت تھے، اب ان سے دور تھے اور ان کا طریقۂ حکمرانی اور پالیسیوں سے نالاں تھے۔ پارٹی کا کردار بھی بدل چکا تھا۔

بھٹو نے وزراء اعلیٰ سے پوچھا پارٹی کتنی نشستیں حاصل کرے گی

صادق قریشی بولا، ''جیسا آپ حکم کریں''

انتخابات سے متعلق بریفنگ پر وزراء اعلیٰ کا اجلاس بلایا گیا۔ غلام مصطفیٰ جتوئی نے جو اس وقت وزیر اعلیٰ سندھ تھے ایک دن بتایا کہ جب بھٹو صاحب نے سب سے پوچھا کہ ان کے صوبے سے پیپلز پارٹی کتنی نشستیں جیت سکے گی تو ہر ایک نے اپنے اندازے کے مطابق ایک تعداد بتائی۔ جبکہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ صادق حسین قریشی نے کہا کہ جیسا آپ حکم کریں۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ اگر یہی بات ہے تو پھر الیکشن کروانے کی کیا ضرورت ہے۔ ایوب خان کے 1965ء کے انتخابات میں ڈپٹی کمشنر اور پولیس افسران کی یہی زبان تھی کہ ''جیسا آپ حکم فرمائیں اتنی نشستیں مل جائیں گی۔'' صادق حسین آج وہی زبان استعمال کر رہا تھا۔ اصل صورت حال یہ تھی کہ سندھ کے وزیر اعلیٰ غلام مصطفیٰ جتوئی کے علاوہ نہ تو نصر اللہ خان خٹک سرحد سے اور نہ ہی صادق حسین قریشی پنجاب سے اس پوزیشن میں تھے کہ اپنی نشستیں بھی جیت سکیں۔ اس طرح 1977ء کے انتخابات کا دھاندلی کی نظر ہو جانا کچھ اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

بھٹو بلا مقابلہ منتخب ہوئے تو کئی اور بھی اس راستے پر چل نکلے

بھٹو صاحب نے لاڑکانہ سے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ ان کا مخالف امیدوار امیر جماعت اسلامی سندھ جان محمد عباسی تھا۔ 19 رجنوری 1977ء کاغذات نامزدگی کی آخری تاریخ تھی۔ 18 رجنوری کو جان محمد عباسی کو اغوا کرلیا گیا تاکہ وہ اپنے کاغذات نامزدگی داخل نہ کرا سکے۔ بھٹو صاحب بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ حالانکہ وہ مقابلہ کر کے بھی لاڑکانہ سے بآسانی جیت سکتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی سندھ سے دوسرے نومبر بھی بلا مقابلہ منتخب ہو گئے اور صوبوں کے وزراء اعلیٰ بھی۔ بھٹو صاحب کے وزیر بھی ہارنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اکثر کو میں ذاتی طور پر جانتا تھا مثلاً سرگودھا سے حفیظ اللہ چیمہ اور لاہور سے ملک اختر وغیرہ۔ چیمہ اور میں اکٹھے سرگودہا کالج میں ایک ہی زمانے میں پڑھتے رہے تھے۔ ان میں جیتنے کا جذبہ سب سے زیادہ تھا اور دیگر بھی کچھ کم نہیں تھے۔

7 رمارچ 1977ء کو انتخابات ہوئے۔ قومی اسمبلی کے جو نتائج سامنے آئے ان کے مطابق 200 نشستوں میں سے 155 پاکستان پیپلز پارٹی نے حاصل کیں۔ جن میں سے 107 صرف پنجاب سے تھیں۔ 32 سندھ سے، 8 فرنٹیئر سے، 7 بلوچستان سے، ایک اسلام آباد سے۔ جبکہ پی این اے نے پنجاب سے صرف 8، سندھ سے، 11، فرنٹیئر سے 17 نشستیں حاصل کیں۔ آزاد امیدواروں میں سے ایک نے فرنٹیئر سے اور 9 نے قبائلی علاقہ جات سے انتخاب جیتا تھا۔ پنجاب میں پیپلز پارٹی نے جس طرح لاپرواہی اور بغیر کسی تیاری کے اتنی نشستیں جیتیں، ان کے شفاف ہونے کے بارے میں ایک بڑا سوالیہ نشان تھا۔

انتخابات کی تاریخ کا اعلان ہوئے تین ہفتے گزر چکے تھے مگر پنجاب میں انتخابی مہم کا نام ونشان نہیں تھا۔ بھٹو صاحب نے 2 رفروری 1977ء کو صادق حسین قریشی کو اس بارے میں خط لکھا۔ ''پارٹی کی انتخابی مہم تیزی حاصل نہیں کر سکی جو اب تک ہو جانی چاہیے تھی۔ کارکنوں کو متحرک نہیں کیا گیا۔ پارٹی تنظیم صحیح طور پر کام نہیں کر رہی۔ نشرواشاعت نہ ہونے کے برابر ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انتخابات کے لئے نوکرشاہی پر بھروسہ کیا جا رہا ہے۔

تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ انتخابات ایک سیاسی عمل ہے۔اس کو سیاسی طریقے سے لڑکر سیاسی طریقے سے جیتنا چاہیے۔مزید وقت ضائع کرنے کی گنجائش نہیں۔تمہیں چاہیے کہ پیپلز پارٹی کی تنظیم کو صوبائی سطح سے لے کر دیہات کی سطح تک متحرک کرو۔آخر میں، میں اس بات پر زور دوں گا کہ تمہیں مزید انتظار کے بغیر ٹاپ گیئر میں آجانا چاہیے۔'' صادق حسین قریشی کے نام بھٹو صاحب کا خط 2/فروری 1977ء زلفی بھٹو آف پاکستان، سٹینلے والپرٹ صفحہ 278

بھٹو صاحب کی متوقع سیاسی فتح، صادق حسین قریشی کی انتظامی مشینری پر بھروسے اور استعمال کے ذریعے شکست میں تبدیل ہوگئی۔ پنجاب، جو بھٹو صاحب کی سیاسی طاقت کا مرکز تھا اب ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ جو کام نوائے وقت، شورش کاشمیری، جماعت اسلامی اور پنجاب میں بھٹو مخالف جماعتیں اب تک نہیں کرسکی تھیں وہ پارٹی میں ''ہزاروں ساتھیوں سمیت'' شامل ہونے والے صادق قریشیوں نے کردکھایا۔ اگر دھاندلی نہ بھی کی جاتی تب بھی پیپلز پارٹی اکثریت حاصل کرسکتی تھی اور حکومت بناسکتی تھی۔ سنا گیا تھا کہ بھٹو صاحب نے کمشنروں کی ایک میٹنگ بلا کر ہدایات بھی دی تھیں کہ دھاندلی نہیں ہونی چاہیے۔

مگر یہ افواہ بھی گرم تھی کہ بھٹو صاحب صدارتی نظام لانا چاہتے ہیں۔ یہ آئین میں تبدیلی کے ذریعے ہی ممکن تھا جس کے لئے دوتہائی اکثریت درکار تھی۔ سٹینلے والپرٹ اپنی کتاب کے صفحہ 267 میں انکشاف کرتا ہے کہ پاکستان کے آئین کو صدارتی نظام میں تبدیل کرنے کے لئے بھٹو صاحب نے لندن سکول آف اکنامکس کے Prof. Leslie Wolf Phillips کی خدمات حاصل کیں۔ وہ جولائی 1967ء میں پاکستان بھی آیا۔ خالد حسن کے مطابق بھٹو صاحب نے فلپس کو کہا تھا کہ ''انہیں زیادہ اختیارات چاہئیں'' خالد حسن آن لائن، ذوالفقار علی بھٹو 29/اپریل 2003ء

پی این اے کا اتحاد ذوالفقار علی بھٹو کی ذات کے خلاف تھا

بھٹو مخالف تمام افراد اور جماعتوں نے مل کر ان انتخابات میں حصہ لینے کے لئے پاکستان نیشنل الائنس PNA بنایا۔ یہ اتحاد پیپلز پارٹی کے خلاف نہیں تھا بلکہ بھٹو صاحب کی

ذات کے خلاف تھا۔اس میں وہ جماعتیں اور افراد بھی شامل تھے جو ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہے تھے مگر اب اکٹھے تھے۔ 1972ء میں بھی یو۔ڈی۔ایف (متحدہ جمہوری محاذ) کے نام سے ایک اتحاد بنا تھا جو پیپلز پارٹی اور بھٹو صاحب کے خلاف تھا...... اس میں سات جماعتیں شامل تھیں۔ جماعت اسلامی، جمعیت علمائے اسلام، مسلم لیگ، خاکسار تحریک، پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی، نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی اور آزاد جموں و کشمیر مسلم کانفرنس۔ اب ان میں دو جماعتوں تحریک استقلال اور جمعیت علمائے پاکستان کو شامل کر کے نو جماعتوں کا اتحاد قائم کیا گیا تھا۔ان کی حمایت کرنے والے انہیں نو ستارے کہتے تھے۔

ان انتخابات میں مُلّاؤں کے فتووں کی بوچھاڑ تھی۔ ایک مُلّا نے تو یہاں تک فتویٰ دے دیا تھا کہ PNA کو ووٹ دینے کا ثواب ایک لاکھ سال کی نمازوں کے برابر ملے گا۔ PNA اسلام کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کر رہا تھا۔ جبکہ بھٹو صاحب بھی اسلامی نظام حیات کو اپنانے کے نعرے پر انتخاب لڑ رہے تھے۔اسلامائزیشن کے راستے پر ملک کو ڈالنے کا کام انہوں نے شروع سے ہی کر دیا تھا۔مولانا کوثر نیازی اسلامی محاذ پر ان کے فرنٹ مین تھے۔انہوں نے 1972ء میں 90,000 پاکستانیوں کو حج کروایا۔ 1973ء کا آئین پہلے سے زیادہ اسلامی بنایا گیا۔اسلامی نظریاتی کونسل قائم کی گئی۔ جولائی 1973ء میں قومی اسمبلی نے اس بات کو یقینی بنانے کے لئے ایک ایکٹ پاس کیا کہ قرآن پاک کو غلطیوں سے پاک چھاپا جائے گا۔حالانکہ صدیوں سے قرآن پاک غلطیوں سے پاک ہی چھپ رہا تھا۔پہلی بار مذہبی امور کی وزارت قائم کی گئی۔ پرائمری سکول سے لے کر سیکنڈری سکول تک اسلامیات لازمی قرار دی گئی۔1976ء میں اسلامی سیرت کانفرنس منعقد کی گئی۔ جوں جوں بھٹو صاحب اپنی عوامی، ترقی پسند سیاسی زمین چھوڑتے گئے، مُلّا کا مطالبہ Do more بڑھتا گیا۔قرارداد مقاصد کے بعد بھٹو صاحب نے پاکستان کو ایک سیکولر اور سوشلسٹ ریاست بننے کے امکانات سے بہت دور کر دیا۔جب ان کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو وہ سوشلسٹوں اور ترقی پسند خیالات رکھنے والوں سے تقریباً چھٹکارا حاصل کر چکے تھے۔

سوشلزم کے نام پر انتخاب جیتنے والی پیپلز پارٹی اب اسلام کے نفاذ کے لئے انتخاب لڑ رہی تھی

جے۔ اے۔ رحیم کی پٹائی ہو چکی تھی۔ اور انہیں حوالات کی ہوا بھی کھلائی جا چکی تھی۔ معراج محمد خان پر اس جرم میں کہ انہوں نے کراچی میں مزدوروں پر چلائی جانے والی گولی کے خلاف احتجاج کیا تھا، قید میں رکھ کر تشدد کیا جا رہا تھا۔ حبیب جالب بھی جیل میں تھے۔ خورشید حسن میر پارٹی چھوڑ چکے تھے۔ ڈاکٹر مبشر حسن کی جگہ ناصر رضوی جیسے رجعت پسند کو پارٹی سپرد کر دی گئی تھی۔ حنیف رامے بھی باہر تھے اور علی احمد تالپور اور رسول بخش تالپور بھی۔ ولی خان اور بلوچ سردار حیدر آباد جیل میں تھے۔ آئین میں ترامیم کر کے معاشرے کو مشرف بہ اسلام کرنے کا عمل زور و شور سے جاری تھا۔ مولویوں کو حکومت کے خرچ پر حج اور عمرے کروائے جا رہے تھے۔ مولانا کوثر نیازی پیپلز پارٹی کو وہ نقصان پہنچا چکے تھے جو شاید وہ باہر بیٹھ کر یا جماعت اسلامی میں رہ کر بھی نہ کر سکتے۔ اگرچہ 1964ء میں انہوں نے جماعت اسلامی کو چھوڑ دیا تھا مگر وہ پاکستان کی ایجنسیوں کے لئے کام کرتے تھے (راؤ رشید، جو میں نے دیکھا)۔ انہوں نے پہلے تو بھٹو صاحب کی مرضی سے سوشلزم ہماری معیشت کو مساوات محمدی ﷺ میں بدلا۔ پھر نظام مصطفیٰ اور اب اسلامی نظام کا نفاذ۔

پاکستان پیپلز پارٹی جو ایک ترقی پسند عوامی پارٹی کے طور پر قائم ہوئی تھی اب ایک رجعت پسند، جاگیرداروں کی اسلامی پارٹی بن گئی تھی۔ 1977ء کے ان انتخابات میں پی این اے اور بھٹو صاحب کے درمیان مقابلہ اس بات کا تھا کہ ''اسلام کی خدمت'' کون زیادہ کرے گا۔ یعنی اسلام کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے کون زیادہ استعمال کرے گا۔ بھٹو صاحب وعدہ کر رہے تھے کہ وہ چھ ماہ کے اندر اندر ملک کے تمام قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھال دیں گے۔ جبکہ مذہبی جماعتیں جو اسلام کی ٹھیکیدار تھیں یہ کام خود کرنا چاہتی تھیں۔ یہ کتنا بڑا المیہ تھا کہ وہ پیپلز پارٹی جس نے 1970ء کے انتخابات سوشلزم کے

اقتصادی پروگرام پر جیتے تھے اب اسلام کے نفاذ کے لئے انتخاب لڑ رہی تھی۔ بھٹو صاحب مسلم دنیا کا لیڈر بننا چاہتے تھے۔ ایسی فضا میں وہ تمام مذہبی جماعتیں جنہوں نے پاکستان اور قائداعظم کی مخالفت کی تھی۔ دھڑلے سے جھوٹ بول رہی تھیں کہ پاکستان چونکہ اسلام کے نام پر بنا تھا لہٰذا حکمرانی کا حق مذہبی جماعتوں کا ہے۔

چند سال پہلے تک ہفت روزہ نصرت اور اس میں وہ لکھنے والے جو اس طرح کے جھوٹ کے خلاف نہ صرف ایک ڈھال تھے بلکہ عوام کو تاریخی سچائی، منطق اور ترقی پسند خیالات کی دلیل مہیا کرتے تھے، اب نہیں تھے۔ بلکہ معاشرے میں وہ چوکیدار بھی نہیں تھے جو ساری رات ''جاگتے رہنا'' کا ہنکارہ لگا کر خود ساری رات جاگ کر عوام کو سکون کی نیند مہیا کرتے تھے۔ وہ دودھ فروش بھی نہیں تھے جو نئی صبح کی آمد کی خبر دیا کرتے تھے۔ معاشرے میں ایک عجیب قسم کی افراتفری نے جگہ بنالی تھی۔ بھٹو صاحب اور پیپلز پارٹی کو اب ان چوکیداروں اور دودھ فروشوں کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ ایک بار تو انہوں نے برملا اعلان کیا کہ سوشلزم پر لیکچر سننے کے لئے مجھے کسی پولیٹکل انجینئر کی ضرورت نہیں۔ ان کا اشارہ ڈاکٹر مبشر حسن کی طرف تھا۔

بھٹو انتخاب جیت کر بھی ہار گئے

1977ء کے انتخابات تک بھٹو صاحب کی سول حکومت ایوب خان کی حکومت کا چربہ لگتی تھی۔ حیات محمد ٹمن اور خدا بخش بچہ جیسے افراد جو ایوب خان کے ساتھ تھے۔ بھٹو صاحب کے مشیر تھے۔ ایوب خان اور بھٹو صاحب میں فرق صرف یہ تھا کہ بھٹو صاحب نے وردی نہیں پہن رکھی تھی۔ حکومت سنبھالنے سے لے کر اب تک ملک میں بھٹو صاحب نے ایمر جنسی نافذ کئے رکھی۔ دفعہ 144 کا نفاذ رہا۔ پریس پر پابندیاں رہیں۔ سیاسی مخالفین جیل میں تھے۔ کمشنرز، ڈپٹی کمشنرز، پولیس، انٹیلی جنس کی ایجنسیاں، ایف ایس ایف اور فوج ان کے کان اور آنکھیں تھیں۔

انتخابات اعلان شدہ پروگرام کے مطابق ہوئے۔ انتخابات کی نتائج کی رات بھٹو صاحب نے امریکی سفیر HENRY BYROADE کو اپنے یہاں مدعو کیا تا کہ دھاندلی کے بغیر ہونے والے شفاف انتخابات کے نتائج ایک گواہ کے طور پر ان کی موجودگی میں دیکھ سکیں۔ ہنری نے بعد میں ہونے والے اپنے ایک ٹی وی انٹرویو میں بتایا کہ نتائج آنا شروع ہوئے۔ بھٹو کراچی میں ہار رہے تھے۔ پشاور میں ہار رہے تھے کہ پنجاب کے نتائج آنا شروع ہو گئے اور وہ لوگ جو پنجاب میں ہر اعتبار سے ٹھگ گردانے جاتے تھے 99 فی صد جیت رہے تھے۔

''بھٹو صاحب پر ایک خاموشی طاری ہوگئی۔ انہوں نے کافی مقدار میں پینا شروع کر دی۔ انہوں نے لاہور کال کی اور کہا کہ تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو...... میں نے اگلے روز صبح آٹھ بجے پھر بھٹو صاحب سے ملاقات کی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ رات بھر سوئے نہیں

تھے۔ وہ اپنے آپ میں نہیں تھے۔ وہ اداس تھے۔"

ووٹ کی لڑائی گلی محلے کی لڑائی میں تبدیل ہوگئی

PNA نے ان نتائج کو فراڈ قرار دے کر 10 ؍مارچ کو ہونے والے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ چنانچہ 8 ؍مارچ سے ووٹ کی لڑائی گلی محلے کی لڑائی میں تبدیل ہوگئی۔ 11 ؍مارچ جمعہ کا دن تھا۔ مسجدوں سے جلوسوں کی ابتدا ہوگئی جس میں پٹکا مرکنٹائل آگے آگے تھی۔ پٹکا مرکنٹائل کی یہ اصلاح ہم دوستوں نے اُن تاجروں، آڑھتیوں، چھوٹے صنعتکاروں، کمیشن ایجنٹوں اور منڈی کے دوکانداروں کے لئے ایجاد کی جو کندھے پر چار خانہ کا پٹکا ڈالتے ہیں اور مذہبی تنظیموں کی مالی سرپرستی کرتے ہیں۔ 12 ؍مارچ کو بھٹو صاحب نے اعلان کیا کہ وہ PNA کے لیڈروں سے بات چیت کے لئے تیار ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے مفتی محمود کو ایک خط لکھا۔ مفتی محمود PNA کے صدر تھے۔ انہوں نے 14 ؍مارچ کو جواب دیا کہ ہم کسی ایسے مذاکرات کے لئے رضا مند نہیں جس کا کوئی واضح ایجنڈا نہ ہو۔

ادھر یہ ایجی ٹیشن تھا دوسری طرف بھٹو صاحب کو ایک اور بڑا مسئلہ درپیش تھا اور وہ یہ کہ خزانے میں رقم نہیں تھی۔ حکومت چلانے کے لئے رقم درکار تھی۔ انہوں نے 13 ؍مارچ کو شاہ آف ایران سے مدد کی درخواست کی (باوجود اس کے دونوں کے تعلقات میں سرد مہری آچکی تھی) کہ وہ ترجیحی بنیادوں پر اس 300 ملین ڈالر کے قرضے کی ضمانت دے دیں جس کو سٹی بینک نے روک رکھا تھا۔ شاہ آف ایران گارنٹر بننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ کیونکہ امریکہ کے تیور بھٹو صاحب کے بارے میں بدل چکے تھے اور شاہ اس خطے میں امریکہ کے مفادات کا محافظ تھا۔ اس کو یہ بھی یاد تھا کہ ذاتی محفلوں میں بھٹو صاحب اسے لانس نائک کا بیٹا کہہ کر اس کی تضحیک کرتے تھے۔ شاہ نے 22 ؍مارچ کو اس طرح کا جواب بھیجا جس کا مطلب انکار تھا۔

پی این اے کا مطالبہ تھا کہ بھٹو مستعفی ہوں

PNA نے مطالبہ کر دیا کہ بھٹو صاحب استعفیٰ دیں اور فوج اور عدلیہ کے زیرنگرانی دوبارہ انتخابات کروائے جائیں۔ 18 مارچ کو PNA کے چھ سرکردہ رہنماؤں کو گرفتار کرلیا گیا۔ جن میں اصغر خان، میاں محمود علی قصوری اور علی احمد تالپور بھی شامل تھے۔ اگلے روز کراچی میں سخت احتجاج ہوا۔ فوج بلوائی گئی اور کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ لاہور، ملتان، گوجرانوالہ، راولپنڈی بالخصوص پنجاب کے شہروں میں یہ احتجاج بہت تیزی سے پھیل گیا۔ دوبارہ انتخابات کا مطالبہ زور پکڑتا گیا جبکہ بھٹو صاحب انتخابات کروانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ہر آنے والا دن ایک ریت کی طرح ان کی مٹھی سے پھسل رہا تھا۔

21 مارچ کو بھٹو صاحب نے چیف الیکشن کمشنر جسٹس سجاد احمد جان کو خط لکھا کہ اگر کچھ افراد نے دھاندلی کی ہے تو ان کے خلاف کارروائی کی جائے۔ ایک اندازے کے مطابق تیس یا چالیس نشستوں پر دھاندلی ہوئی تھی۔ دوبارہ انتخابات میں بھی پیپلز پارٹی اکثریتی پارٹی ہی رہتی مگر بھٹو صاحب PNA کے مطالبے کو ایکدم تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

دنیا حیران تھی کہ وہ بھٹو جس نے صرف ایک ماہ پہلے تیسری دنیا کا لیڈر بننے کا اعلان کیا تھا اس کی سیاسی بصیرت کو کیا ہو گیا ہے۔ ان ہی دنوں پڑوس میں یعنی بھارت میں بھی مارچ میں انتخابات ہوئے تھے جن میں اندرا گاندھی ہار گئیں اور اقتدار سے علیحدہ ہوگئیں۔ بھٹو صاحب سے بھی یہی توقع کی جا رہی تھی۔ ان دنوں بھارت روس نواز لابی کے پیٹی بورژوا حضرت اپنے ڈرائینگ روموں میں سانس پھلا پھلا کر بھارت میں جمہوریت کی تعریفیں کر رہے تھے۔

پی این اے کے لیڈروں اور کارکنوں کی بڑے پیمانے پر گرفتاریاں کی گئیں۔ 25 مارچ کو مفتی محمود جو پی این کے صدر تھے اور پروفیسر غفور احمد جو جنرل سیکرٹری تھے، انہیں گرفتار کرلیا گیا۔ بھٹو صاحب نے قوم سے بارہا پرامن رہنے کی اپیل کی مگر ان کا کوئی اثر

نہیں تھا۔ مسجدوں سے اذانیں بڑھتی جارہی تھیں۔ 8/اپریل کو پولیس نے لاہور کے جلوس پر فائرنگ کردی جس کے نتیجے میں ایک رپورٹ کے مطابق 8 لوگ مر گئے اور 77 زخمی ہو گئے۔ 11/اپریل کو ہونے والے احتجاج نے پورے ملک کا پہیہ جام کر دیا۔

لاہور ہائی کورٹ بار نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ تمام عہدے دار جو پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر جیت کر آئے ہیں ان کی ممبر شپ ختم کر دی جائے گی۔ جنرل گل حسن اور ایئر مارشل رحیم خان جو بھٹو صاحب کو اقتدار کی منتقلی کا اہم کردار تھے اور جن سے بھٹو صاحب نے استعفٰی لے کر، سفیر بنا کر ملک سے باہر بھیج دیا تھا، انہوں نے بھی 13/اپریل کو احتجاجاً اپنے سفارتی عہدوں سے استعفے دے دیئے۔ الطاف گوہر جو بھٹو صاحب سے مراعات حاصل کرتا رہا تھا، جس کے بھائی تجمل حسین کو بھٹو صاحب نے سفیر بنا کر باہر بھیجا تھا، اب بھٹو صاحب کے خلاف لکھ رہا تھا۔ ہر طرف سے بھٹو صاحب پر دباؤ پڑ رہا تھا۔ مگر بھٹو صاحب دباؤ کے سامنے جھکنے کو تیار نہیں تھے۔ انہوں نے 13/اپریل 1977ء کو بی بی سی کے ذریعے یہ عندیہ دے دیا کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ فوج کو طلب کر سکتے ہیں۔ بھٹو صاحب اور پی این اے اپنی اپنی طاقت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس موقع پر پاکستان پیپلز پارٹی اور ''لاکھوں ساتھیوں'' والے غائب تھے۔ بلکہ کچھ تو پی این اے کے جلوسوں میں بھی نظر آنے لگے تھے۔ وہ صادق قریشی جو اس سارے فساد کی جڑ تھا، خاموش تھا۔

بھٹو مودودی کو منانے اچھرہ پہنچ گئے

16/اپریل 1977ء کو بھٹو صاحب مولانا مودودی کو منانے اچھرہ ان کے گھر پہنچ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ پی این اے کی تحریک کے پیچھے جماعت اسلامی ہے اور یہ خیال کافی حد تک درست بھی تھا۔ مولانا عبید اللہ انور بھی پیش پیش تھے۔ اطلاعات آرہی تھیں کہ تحریک کو جاری رکھنے کے لئے پاکستان میں ایک بڑی تعداد میں ڈالر پھینک دیئے گئے ہیں اور یہ کام جماعت اسلامی کے میاں طفیل محمد کے ذریعے کیا جارہا ہے۔

بھٹو صاحب اپنی کتاب ''اگر مجھے قتل کیا گیا'' میں لکھتے ہیں۔ ''صرف ایک

سیاست دان کو غیر ملکی فنڈز دیئے گئے تھے اور وہ جماعت اسلامی کے میاں طفیل محمد تھے۔ ان خطیر رقوم کو انہوں نے کس طرح اور کن کن میں تقسیم کیا یہ ان کا اور پی این اے کے دیگر افراد کا معاملہ ہے۔ فوج کے ذریعے حکومت کا تختہ الٹائے جانے کے فوراً بعد میاں طفیل محمد نے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو مشورہ دیا کہ ان کے خلاف ثبوت فراہم کرنے والی تمام دستاویزات ضائع کر دی جائیں۔ 23/ جولائی 1977ء کو مجھے مری میں یہ اطلاع ملی کہ اس موضوع سے تعلق رکھنے والی دستاویزات کا ایک انبار 19/ جولائی کو جلایا گیا ہے۔"

مولانا مودودی سے ملاقات کے دو روز بعد بھٹو صاحب نے شراب اور جوئے پر پابندی عائد کر دی۔ اتوار کی جگہ جمعہ کی چھٹی نے لے لی۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ آئندہ چھ ماہ کے اندر اندر ملک کے تمام قوانین کو قرآن اور سنت کی روشنی میں ڈھال دیا جائے گا۔ اسلامی ری پبلک آف پاکستان، اسلامی آئین، اسلامی سربراہ کانفرنس، اسلامی قوانین، اسلامی بم اور ستمبر 1974ء کو آئین میں دوسری ترمیم کے ذریعے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینا، اس سب کے باوجود ملا کا مطالبہ تھا......Do More............

پی این اے نے جو تحریک چلائی وہ برصغیر کی تاریخ میں اس وقت تک کی سب سے بڑی مالی تحریک تھی۔ اس میں ان گنت پیسہ خرچ ہوا۔ اس سے پہلے بھی 1970ء میں جماعت اسلامی کو امریکہ نے بے پناہ رقم فراہم کی تھی۔ ایک چیک کا عکس تو ہم نے بھی اور ہفت روزہ شہاب نے بھی چھاپ دیا تھا۔ یہ چیک امریکی سفیر فارلینڈ نے جماعت کو دیا تھا۔

امریکہ حکومتوں کے تختے الٹوانے میں بے دریغ رقم خرچ کرتا آیا ہے۔ ماضی میں سوئیکارنو کے خلاف مسجومی پارٹی کے ذریعے، مصر میں جمال عبدالناصر کے خلاف اخوان المسلمین کے ذریعے وہ یہ کام کر چکا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے آج کل لیبیا اور شام کے خلاف یہ کام کیا گیا ہے۔ ایک مدت پہلے سی آئی اے کے ایک سابق ڈائریکٹر نے اپنی کتاب غیر مرئی حکومت (The Invisible Government) میں وہ تفصیلات بیان کی تھیں کہ کس طرح سی آئی اے حکومتوں کے تختے الٹتی ہے اور ناپسندیدہ حکمرانوں کے خلاف تحریک چلواتی ہے۔ یہ کتاب ساٹھ کی دہائی میں پاکستان میں بھی چھپی تھی۔

بھٹو صاحب نے 28 اپریل 1977ء کو قومی اسمبلی اور سینیٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کیا اور انکشاف کیا "کیا یہ راز ہے کہ گزشتہ چند ماہ میں کس طرح پاکستان میں غیر ملکی کرنسی کا سیلاب آیا ہے۔ ایسی ریل پیل کی مثال نہیں ملتی۔ اس کے نتیجے میں کراچی میں ڈالر کی قیمت سات روپے سے گر کر چھ روپے ہو گئی ہے۔ فروری سے مئی تک 30 کروڑ روپیہ پی این اے کو دیا گیا ہے۔ یہ رقم لوگوں کو مختلف کام کرنے کے لئے رشوت میں دی گئی ہے۔ انہیں جیل جانے کے لئے رشوت دی گئی ہے۔ انہیں اذانیں دینے کے لئے رشوت دی گئی ہے۔ (ان دنوں بھٹو صاحب کی حکومت کو ہٹانے کے لئے مسجدوں میں سے ہر وقت اذانیں دی جاتی تھیں جیسا کہ کسی عذاب سے بچنے کے لئے دی جا رہی ہوں) بہت سے ڈاکیوں، دودھ والوں اور میٹر ریڈرز کو پی پی مخالفانہ لٹریچر تقسیم کرنے کے لئے رشوتیں دی گئیں۔ ڈالروں کو طشتری میں رکھ کر پیش کیا گیا۔ میری پارٹی کے ارکان میرے نوٹس میں یہ لا رہے تھے مگر میں احتجاج کے لئے باہر نہیں نکلا۔"

ڈالروں کے علاوہ شہروں کے تاجر، چھوٹے صنعت کار، دکاندار اور وہ لوگ جن کی پراسیسنگ، جننگ فیکٹریاں، رائس ملیں بند کر دی گئی تھیں، سب پی این اے کو فنڈز مہیا کر رہے تھے۔ ان دنوں طاہر محمد خان جن کا تعلق بلوچستان سے ہے وہ وزیر اطلاعات تھے۔ میرے دوست تھے اور ان کے کہنے پر یونیورسٹی جانے سے پہلے ہر روز میں ان کے ساتھ وزارت اطلاعات کی بریفنگ میں شامل ہوتا، سیکرٹری اطلاعات سے بحث و مباحثہ ہوتا۔ جو کہ اس کی طبیعت پر گرانی کا باعث بنتا۔ خبروں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ فنڈز والی اطلاعات ٹھیک ہیں۔

28 اپریل والی تقریر میں بھی بھٹو صاحب نے اس تحریک کے بارے میں کہا کہ یہ "دیسی" نہیں بلکہ "غیر ملکی سازش" ہے۔ امریکہ میرے خون کا پیاسا ہے۔ وہ ایسا پاکستان جو آزاد اسلامی ریاست ہو اور جس کے پاس نیوکلیئر پاور ہو، کسی بھی طرح برداشت کرنے پر تیار نہیں۔ انہوں نے اس تقریر میں امریکہ کو سفید ہاتھی کہہ کر مخاطب کیا۔ ہاتھی چیزوں کو آسانی سے نہیں بھولتا۔ ان کی مراد وہ انکار تھا جو انہوں نے نیوکلیئر پروگرام کو ختم

کرنے کے بارے میں کیا تھا۔ ہنری کسنجر نے لاہور میں بھٹو صاحب کا انکار سننے کے بعد دھمکی دی تھی کہ .We will make a horrible example of you (ہم تمہیں ایک عبرتناک مثال بنادیں گے)۔

بھٹو صاحب نے اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار کو پی این کے نائب صدر نصر اللہ خان کے پاس بھیجا تا کہ وہ انہیں قائل کر سکے کہ پی این اے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں حصہ لینے پر رضامند ہو جائے اور اگر پی این اے صوبوں میں اکثریت حاصل کر لے تو قومی اسمبلی کو تحلیل کر کے دوبارہ انتخابات کروائے جائیں گے۔ نصر اللہ خان نے اس تجویز کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ادھر بیگم نسیم ولی خان نے، جنہوں نے خان عبدالولی خان کی چارسدہ والی سیٹ شیر باز مزاری کی مدد سے جیت لی تھی، الٹی میٹم دے دیا کہ اگر 20/اپریل تک بھٹو صاحب نے پی این اے کے مطالبات کو تسلیم نہیں کیا تو وہ بدترین حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ خان عبدالولی خان اور بلوچ سردار ان دنوں حیدرآباد جیل میں تھے۔ اس وجہ سے پی این اے نے بلوچستان میں انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا۔ ان رہنماؤں کے خلاف ملک کو توڑنے کی سازش کا مقدمہ چل رہا تھا جو کہ حیدرآباد ٹربیونل کیس کے نام سے مشہور تھا۔ یہ مقدمہ بھٹو صاحب کی حکومت ختم ہونے کے بعد ختم ہوا۔ اسی تناظر میں بیگم نسیم ولی خان کا رویہ بہت سخت تھا۔

ان ہی دنوں غالباً 25/اپریل کو اصغر خان نے افواج پاکستان کو ایک خط لکھا جو بظاہر مسلح افواج کو ان کی ذمہ داریاں یاد کروانے کے بارے میں تھا مگر اس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ اصغر خان نے مسلح افواج کو نظم و نسق سنبھالنے کی دعوت دی ہے۔ اصغر خان کہتا تھا کہ بھٹو لاڑکانے کا چوہا ہے۔ میں اس کو بل میں بھیج دوں گا۔ پھر اس نے اعلان کیا کہ میں اس کو کوہالہ کے پل پر پھانسی لگاؤں گا۔

نیپ اور خان عبدالولی خان کی سیاست کا پس منظر

خان عبدالولی خان بھارت اور روس نواز تھے۔ قیام پاکستان سے قبل ان کے والد عبدالغفار خان عرف باچا خان (سرحدی گاندھی) سرحد میں انڈین نیشنل کانگرس کے سرگرم لیڈر رہے تھے اور پچھلے کئی سالوں سے کابل میں رہائش پذیر تھے۔ انہیں نومبر 1969ء میں بھارت کے صدر وی وی گری نے نئی دہلی میں منعقدہ تقریب میں ''جواہر لعل نہرو امن انعام'' سے نوازا تھا۔ اس انعام کے ساتھ انہیں ایک لاکھ روپے نقد بھی دیئے گئے تھے۔ خان عبدالقیوم خان، جنہیں بھٹو صاحب ڈبل بیرل خان کہتے تھے مسلم لیگ کے لیڈر تھے۔ پیپلز پارٹی کے قیام سے پہلے سرحد کی سیاست ان دو شخصیات کے گرد گھومتی تھی۔ جمعیت علمائے اسلام بھی اس سیاست میں سرگرم تھی جو پاکستان مخالف تھی کیونکہ جمعیت علمائے ہند نے بھی جماعت اسلامی کی طرح پاکستان اور قائداعظم کی مخالفت کی تھی۔ ایوب خان کو سرحد کے عوام سیاست دان کم اور بادشاہ زیادہ سمجھتے تھے۔ سرحد کی سیاست دو دھڑوں کا محور رہی تھی۔ ایک پاکستان مخالفت کا دھڑا اور دوسرا پاکستان کی حمایت کا دھڑا۔ 1970ء کے انتخابات میں اگرچہ پیپلز پارٹی اور خان حیات محمد خان شیر پاؤ نے سرحد کی سیاست کو تبدیل کیا تھا مگر ولی خان کی نیپ اور جمعیت علمائے اسلام نے اکثریت حاصل کی تھی اور انہوں نے مل کر سرحد میں حکومت بنائی تھی۔

بنگلہ دیش کے قیام کے بعد یعنی پاکستان کے ٹوٹ جانے کے بعد ولی خان اور افغانستان کے سردار داؤد خان پاکستان کی مزید تقسیم اور پختونستان کے قیام کے نعرے لگاتے رہتے تھے۔ یہ ان کی خواہش بھی تھی اور منصوبہ بھی۔ سردار داؤد خان نے جولائی 1973ء میں

اپنے کزن ظاہر شاہ کا تختہ الٹ کر افغانستان کی حکومت پر قبضہ کیا۔ داؤد خان روس نواز تھا اور پاکستان کے سخت خلاف تھا۔ اس نے ڈیورنڈ لائن کو بھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ وہ پختونستان کے منصوبے کا بہت بڑا وکیل تھا۔ اس کے اقتدار میں آ جانے کے بعد ولی خان کا رویہ اور لب و لہجہ سخت ہو گیا۔ ولی خان کے بھٹو مخالف رویے کی ایک اور وجہ بھی تھی اور وہ یہ کہ 1973ء میں عراقی سفارت خانے سے اسلحہ کی برآمدگی کے بعد جب بلوچستان میں ''علیحدگی پسندوں'' کی حکومت کو ختم کر کے اکبر بگٹی کو گورنر مقرر کیا گیا تو ولی خان کی پارٹی اور اس کے اتحادی سرحد حکومت سے مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد ولی خان کا لب و لہجہ بے حد انتقامی تھا۔

28/اکتوبر 1973ء کو عید کے موقع پر ایک اجتماع سے چارسدہ میں خطاب کرتے ہوئے ولی خان نے کہا ''ایک نیا ملک جو سرحد، بلوچستان اور افغانستان پر مشتمل ہوگا معرض وجود میں آئے گا اور اس کی بارڈر لائن طورخم سے اٹک کے پل پر منتقل نہیں کی جائے گی بلکہ یہ مرگلہ پہاڑیوں کے آس پاس راولپنڈی کے نزدیک ہوگی۔'' اس سے پہلے انہوں نے آکسفورڈ کے میگزین راؤنڈ ستمبر 1971ء میں لکھا تھا کہ ''ہندوستان کو تقسیم کر کے برطانیہ نے غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ کیونکہ اس طرح انہوں نے وہ تمام اچھے کام تباہ و برباد کر دیئے جو انہوں نے ایمپائر کے معماروں کی حیثیت سے دو سو سال سے زیادہ عرصے میں کئے تھے۔'' انہوں نے یہ بھی کہا کہ اسے تقسیم کر کے، پختونوں کو دوبارہ متحدہ کر کے، ایک عظیم تر افغانستان حکومت وجود میں آنے والی ہے۔

17/نومبر 1973ء کو ٹانک میں ولی خان نے اپنی تقریر میں بھٹو صاحب کو دھمکی دی ''تمہارا سر بھی گوشت کا بنا ہوا ہے۔ گولی کی بھی آنکھ ہوتی ہے۔ اگر یہ ایک کتے کے سر کو لگ سکتی ہے تو وزیراعظم کے سر کو بھی لگ سکتی ہے۔ اگر صدر کینیڈی اور لیاقت علی خان قتل کئے جا سکتے ہیں تو تم کون ہو جو کہ زندہ چھوڑ دیئے جاؤ۔ ہم طورخم کی زنجیر وہاں سے اتار کر مرگلہ اور چمن سے جیکب آباد تک لگا دیں گے۔'' یہ پختونستان کا تصور تھا جس کے لئے ولی خان اور سردار داؤد مل کر کام کر رہے تھے۔ اس میں روس اور بھارت دونوں کی دلچسپی تھی۔ آج کل دنیا کے بدلے ہوئے حالات میں پاکستان کی تقسیم نہیں بلکہ ایک غیر مستحکم اور کمزور

پاکستان بھارت کے لئے زیادہ قابل عمل ہے۔ اس وقت روس، سرحد اور بلوچستان کے ذریعے گرم پانیوں تک رسائی چاہتا تھا اور شہنشاہ ایران جو امریکہ کا پٹھو تھا، روس اس پر بھی دباؤ رکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ سوویت یونین کی دلچسپی نہ صرف سرحد میں تھی بلکہ بلوچستان میں بھی کہیں زیادہ تھی۔

ولی خان ان چند سیاست دانوں میں سے تھے جنہیں بھٹو صاحب ہم پلہ نہ سہی مگر اہم سیاست دان سمجھتے تھے۔ ولی خان بھٹو صاحب کے خلاف تھے اور بھٹو صاحب انہیں روس اور بھارت کا ایجنٹ قرار دیتے تھے۔ سردار داؤد بھی روس کے ساتھ تھا۔ روس ایک ''کافر ملک'' تھا۔ چنانچہ داؤد کے خلاف ''اسلام کے مجاہد'' ڈھونڈنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ بھٹو صاحب کے دور میں پہلی بار گلبدین حکمت یار اور احمد شاہ مسعود کے نام سنے جانے لگے۔

گریٹر بلوچستان کے لئے استعمال ہونے والا اسلحہ عراقی سفارت خانے سے پکڑا گیا

فروری 1973ء میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے بھٹو صاحب اور پاکستان کی مستقبل کی سیاست کا رخ بدل کر رکھ دیا۔

عراق کا نائب صدر صدام حسین، شاہ آف ایران کے خلاف تھا۔ روس نواز تھا۔ 17 جولائی 1968ء کو عراق میں انقلاب برپا کر کے جنرل احمد حسن البکر نے جب اقتدار سنبھالا تو صدام حسین ان کا ڈپٹی تھا۔ LAURIE MYLROIE جو کہ ہارورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور مشرق وسطیٰ پر ماہر سمجھی جاتی ہیں، ان کی کتاب STUDY OF REVENGE میں وہ تفصیلات موجود ہیں جو صدام حسین کی پاکستان میں علیحدگی پسند بلوچوں کی امداد کے بارے میں ہیں۔ صدام حسین بلوچستان کے علیحدگی پسندوں کی مدد اس لئے کر رہا تھا کہ ''گریٹر بلوچستان'' کی تحریک کو ان سرداروں کی مدد سے ایران تک پھیلایا جا سکے۔ اس نے بغداد میں بلوچستان لبریشن فرنٹ کا دفتر بھی کھلوایا ہوا تھا۔ ایک ریڈیو سٹیشن بھی تھا جہاں سے علاقائی زبانوں میں پاکستان کے خلاف اور گریٹر بلوچستان

کے حق میں پروپیگنڈا کیا جاتا تھا۔ میں اور سعید شفقت بلوچستان جا کر 1972ء میں بلوچستان کے سرداروں سے ملاقات کر چکے تھے۔ ان کے تیور بدلے ہوئے تھے۔

عراق کا ایک آپریشن پاکستان کی ملٹری انٹیلی جنس کے ذریعے منظر عام پر آیا۔ سردار اکبر بگٹی بھٹو صاحب کو اس طرح کی کارروائیوں کے بارے میں آگاہ کرتے رہتے تھے۔ ان دنوں بگٹی، جاموٹ اور زہری قبیلے اکٹھے تھے اور مری قبیلے کے خلاف تھے۔ اکبر بگٹی نے جو معلومات بھٹو صاحب کو فراہم کی تھیں ان کے مطابق غوث بخش بزنجو گورنر بلوچستان، خیر بخش مری اور عطا اللہ مینگل وزیر اعلیٰ بلوچستان مل کر بلوچستان کی علیحدگی کا اعلان کرنے والے ہیں۔ میجر شاہد ترمذی (بعد میں لیفٹنٹ جنرل) نے سراغ لگایا کہ عراقی سفارت خانے میں اسلحہ کی ایک کھیپ جمع کی جا رہی ہے جو خیر بخش مری کے قبیلے میں تقسیم ہونا ہے۔ بلوچستان کے چیف منسٹر جو کہ عطاء اللہ مینگل تھے، ان کی سرپرستی بھی ان علیحدگی پسندوں کو حاصل ہے۔ چنانچہ 9رفروری 1973ء کو عراقی سفارتخانے پر ایک کامیاب آپریشن کیا گیا۔

رات کے 12 بجے SSD ڈویژن نے جن کے ساتھ آرمی کے رینجرز بھی تھے، عراقی سفارت خانے کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ آپریشن کے دوران وہاں سے روسی ساخت کی تین سو مشین گنیں، پچاس ہزار راؤنڈ اور بھاری تعداد میں رقم جو کہ مری قبیلے تک جانی تھی، پکڑی گئی۔ ملٹری پولیس نے عراقی سفیر، ملٹری اٹیچی اور باقی سفارتی عملے کو حراست میں لے لیا۔ بھٹو صاحب بہت ناراض تھے اور غصے میں تھے۔ انہوں نے کوئی وضاحت طلب کئے بغیر عراقی سفیر اور ان کے عملے کو ناپسندیدہ عناصر قرار دے کر ملک سے نکال دیا۔

بلوچستان کی حکومت ختم کر کے آرمی ایکشن شروع کر دیا گیا

اس آپریشن کے بعد بھٹو صاحب نے بلوچستان کی حکومت ختم کر دی۔ اکبر بگٹی کو گورنر مقرر کیا گیا اور جنرل ٹکا خان کے ذریعے بلوچستان میں آرمی ایکشن شروع ہو گیا تھا۔ آرمی کے ذریعے اس ایکشن کی ضرورت نہیں تھی۔ معاملے کو سیاسی طور پر حل کیا جانا چاہیے

تھا۔ سرحد حکومت نے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔ خیر بخش مری کابل چلے گئے۔ انہیں کابل اور بغداد دونوں کی حمایت حاصل تھی۔ ان کے قبیلے کے پچاس ہزار افراد پہاڑیوں میں چلے گئے اور پاکستان آرمی کے خلاف گوریلا لڑائی میں مصروف ہو گئے۔ عطاء اللہ مینگل لندن جلاوطنی میں آ گئے۔ بلوچستان میں جو آرمی ایکشن 1973ء میں شروع ہوا تھا وہ بھٹو صاحب کی حکومت کے خاتمے تک جاری رہا۔ تا آنکہ 1978ء میں عام معافی کا اعلان کیا گیا اور بلوچ پہاڑوں سے نیچے اترے۔ اس دوران ایک اندازے کے مطابق تین ہزار تین سو فوجی مارے گئے جبکہ پانچ ہزار بلوچ مارے گئے۔ شاہ آف ایران بھی پاکستان حکومت کی مدد کرتا رہا۔ گریٹر بلوچستان کے منصوبے کے خاتمے کے لئے اس نے تیس عدد Cobra ہیلی کاپٹرز اور 200 ملین ڈالر کی امداد مہیا کی۔

مزدور کسان پارٹی نے نیپ میں سے جنم لیا

ولی خان کی روس نواز نیپ سے علیحدہ ہو کر افضل بنگش اور میجر اسحاق نے مزدور کسان پارٹی بنالی تھی جو کہ چین نواز تھی۔ افضل بنگش سرحد میں سرگرم تھے جبکہ میجر اسحاق پنجاب میں۔ پنڈی سازش کیس میں میجر صاحب نے کئی سال جیل کاٹی تھی۔ 1968ء میں جب ملک بھر میں ایوب خان کے خلاف جدوجہد نے زور پکڑا تو مزدور کسان پارٹی نے سرحد کے خوانین اور جاگیرداروں کے خلاف کسانوں کی مسلح جدوجہد شروع کر دی۔ اس کا مرکز ہشت نگر تھا۔ ہشت نگر چارسدہ کا وسیع اور زرخیز ترین علاقہ تھا جہاں پر خوانین نے اپنی مسلح فوج رکھی ہوئی تھی جو کسانوں پر ظلم ڈھاتی چلی آئی تھی۔ کسانوں نے ان کے خلاف بندوق اٹھالی۔ میجر اسحاق بھی پنجاب سے آ کر ان کی جدوجہد میں شامل ہو گئے۔ جب سرحد میں نیپ اور جمعیت علمائے اسلام کی متحدہ حکومت بنی تو ''سوشلسٹ'' ولی خان نے ان کسانوں کے خلاف خوانین اور جاگیرداروں کا ساتھ دیا۔ نیپ حکومت نے 8 ہزار پولیس اور ملیشیا فورس کے ذریعے اس تحریک کو لہولہان کر دیا۔ مزدور کسان پارٹی کے نائب صدر مولوی محمد صادق کو قتل کر دیا گیا۔ مگر مسلح کسانوں نے بہادری سے لڑنے کے بعد 200 مربع

میل کا علاقہ خوانین سے آزاد کروالیا۔ یہ لوگ چین کی مسلح جدوجہد اور لانگ مارچ سے متاثر تھے۔ MKP کی کامیابیاں سرحد میں پھیلنے لگیں تو اس کی گونج پنجاب میں بھی سنائی دی جانے لگی۔ بھٹو صاحب سرحد میں MKP کو ولی خان کے خلاف ہر طرح سے مدد فراہم کررہے تھے۔ مگر اس کے اثرات پنجاب میں پھیل جائیں، یہ انہیں قابل قبول نہیں تھا۔

MKP مارکسٹ، لیننسٹ، ماؤئسٹ پارٹی تھی جو انتخابات کے ذریعے نہیں بلکہ مسلح جدوجہد کے ذریعے جاگیردارانہ قبائلی سرداری نظام کا خاتمہ چاہتی تھی۔ اس پارٹی نے مشرقی پاکستان میں آرمی ایکشن کی بھرپور مخالفت کی تھی۔ اس کے سیاسی رابطے ماؤئسٹ تحریکوں کے ساتھ تھے۔ بھارت میں وہ مغربی بنگال کی ماؤئسٹ نکسل باڑی تحریک کی حمایت کرتے تھے۔ میجر اسحاق بھارت اور روس کے خلاف تھے اور برملا اس کا اظہار کرتے تھے جبکہ افضل بنگش اس شدت سے روس کی مخالفت نہیں کرتے تھے۔ سوشلسٹ کہلانے والے ولی خان نے ہشت نگر کی کسان تحریک کو کچل ڈالا۔ بعد میں MKP افضل بنگش اور میجر اسحاق کے دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئی، پھر آہستہ آہستہ تحلیل ہوگئی۔

لیاقت باغ فائرنگ کیس

خان عبدالولی خان بھٹو صاحب کو شروع سے ہی مشکل وقت دے رہے تھے۔ انہوں نے 23 مارچ 1973ء کو راولپنڈی لیاقت باغ میں ایک بہت بڑا جلسہ کیا جو سرخ پوش پختون زلموں کو سرحد سے بسوں میں لا کر کیا گیا تھا۔ افواہ گرم تھی کہ آج راولپنڈی کو فتح کیا جائے گا۔ قتل وغارت اور لوٹ مار کی جائے گی۔ مقصد بھٹو حکومت کو ہلانا تھا۔ اس جلسے میں گولی چلی۔ بہت سے پختون مارے گئے۔ بے شمار زخمی ہوئے۔ ولی خان نے لاشوں اور زخمیوں کو پشاور لے جا کر ایک بہت بڑا جلوس نکالا۔ لیاقت باغ فائرنگ کیس کے نام سے یہ مقدمہ چلا۔ مصطفیٰ کھر اور بھٹو صاحب کا یہ ایک ''کامیاب آپریشن'' تھا۔ پیپلز پارٹی کے کچھ ممبران صوبائی اسمبلی جو اس آپریشن میں شامل بھی نہیں تھے مگر بھٹو صاحب کو اپنی شمولیت کا یقین دلانا چاہتے تھے، انہوں نے بندوقیں ہاتھوں میں پکڑ کر اخبارات میں تصویریں

چھپوائیں۔ جب بھٹو حکومت ختم ہوئی تو یہ تصویریں جو مراعات حاصل کرنے کی غرض سے چھپوائی گئی تھیں ان کے گلے پڑ گئیں اور انہیں لیاقت باغ فائرنگ کیس میں دھر لیا گیا۔

حیدر آباد ٹربیونل کیس

ولی خان اور ان کے ساتھیوں کے خلاف غداری کا مقدمہ

فروری 1975ء میں پشاور یونیورسٹی میں ہونے والے ایک بم دھماکے کے ذریعے خان حیات محمد خان شیر پاؤ کو قتل کیا گیا۔ بھٹو صاحب جب افسوس کے لئے سرحد پہنچے تو انہوں نے کالے رنگ کا چشمہ اپنی آنکھوں پر لگا رکھا تھا جو زندگی میں شاید انہوں نے بہت کم استعمال کیا تھا۔ 1975ء کے یہ وہ دن تھے جب حیات محمد خان شیر پاؤ پیپلز پارٹی سے بدظن ہو چکے تھے اور پارٹی چھوڑنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

ولی خان اور ان کے ساتھیوں پر یہ مقدمہ چلا جس میں وہ بری ہو گئے۔ مگر ملک دشمن سرگرمیوں اور نظریہ پاکستان کی مخالفت کرنے کے جرم میں نیپ پر پابندی لگا دی گئی۔ ولی خان سمیت 52 افراد گرفتار کر لئے گئے جن میں حبیب جالب بھی تھے اور بلوچ انقلابی شاعر میر گل خان نصیر بھی تھے۔ ملک توڑنے کے جرم میں غداری کا یہ مقدمہ حیدر آباد میں چلا اور حیدر آباد ٹربیونل کیس کے نام سے مشہور ہے۔ ان ہی دنوں معراج محمد خان بھی حیدر آباد جیل میں تھے۔ 30 اکتوبر 1975ء کو سپریم کورٹ نے یہ تسلیم کیا کہ نیشنل عوامی پارٹی آزاد پختونستان اور گریٹر بلوچستان کے لئے کام کر رہی تھی۔

جب 1977ء کے انتخابات ہوئے تو ولی خان اس مقدمے کی وجہ سے حیدر آباد جیل میں تھے۔ پاکستان میں غداری کی سزا موت ہے۔ ولی خان پر لٹکتی ہوئی اس تلوار کے پیش نظر پی این اے کی تحریک میں نسیم ولی خان کا سخت رویہ تو سمجھ میں آتا ہے مگر اصغر خان کا بے لچک رویہ سمجھ سے باہر تھا۔ افواہیں گردش کر رہی تھیں کہ امریکہ کی جانب سے اصغر خان کو یہ یقین دلایا گیا ہے کہ وہ آئندہ ملک کے وزیر اعظم ہوں گے۔ چنانچہ بھٹو صاحب کے ساتھ مذاکرات میں بیگم نسیم ولی خان، شیر باز مزاری، اصغر خان اور پروفیسر غفور احمد کوئی رعایت

دینے کو تیار نہیں تھے۔

بھٹو صاحب نے 21 مئی کو قومی اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے فوج کے نام اصغر خان کے خط کا تذکرہ کیا اور دھمکی دی کہ یہ خط ہائی ٹریژن (غداری) کے زمرے میں آتا ہے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ دوبارہ انتخابات ملک کی تباہی کا باعث ہوں گے۔ وہ ابھی تک انتخابات کروانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ جبکہ مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالنے والے بدنام زمانہ جنرل نیازی جیسے لوگ بھی پی این اے کی تحریک میں شامل ہو کر بھٹو مخالفت کر رہے تھے۔

وقت پانی کی طرح سرسراتا نہایت تیزی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ جس طرح تیز رفتار ندیاں، پہاڑوں اور گھاٹیوں میں پہنچ کر تُند رو ہو جاتی ہیں اسی طرح ہر روز بھٹو صاحب کے خلاف پی این اے کی تحریک طاقت ور ہوتی جارہی تھی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ پی این اے کے ساتھ جلد از جلد معاملات کو طے کیا جائے مگر مذاکرات طول پکڑ رہے تھے۔ پی این اے کے رہنما کبھی گرفتار ہو رہے تھے کبھی رہا ہو رہے تھے۔ حکومتی مذاکراتی ٹیم اور پی این اے کی مذاکراتی ٹیم کے درمیان تقریباً روزانہ ملاقات ہوتی۔ حکومتی ٹیم میں بھٹو صاحب، عبدالحفیظ پیرزادہ اور مولانا کوثر نیازی تھے جبکہ پی این اے کی ٹیم میں مفتی محمود، نصر اللہ خان اور پروفیسر غفور احمد تھے۔

بھٹو نے سعودی عرب سے مدد مانگ لی،
سوویت یونین کے سفیر سے ملاقاتوں میں اضافہ کر دیا

بالآخر بھٹو صاحب نے سعودی عرب کے سفیر ریاض الخطیب کو بلا کر مسئلے کو حل کروانے کے لئے سعودی حکومت کی مدد مانگ لی۔ اس کے ساتھ ہی سوویت یونین کے سفیر S.A.AZIMOV کے ساتھ ان کی ملاقاتوں میں اضافہ ہوگیا۔ روسی سفیر نے انہیں مشورہ دیا کہ پاکستان کو اب فوراً CENTO سے باہر آ جانا چاہیے۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ یہ نہایت سنجیدہ معاملہ ہے جس پر ٹھنڈے دل سے غور وفکر کی ضرورت ہے۔ وہ اس مشورے کو ماننے کے لئے اس صورت میں تیار ہو سکتے ہیں جب روس انہیں یہ یقین دہانی کروائے کہ وہ ہماری فوج کی تمام ضروریات کو پورا کرے گا۔ روسی سفیر نے انہیں یہ بھی بتایا کہ ان کے دوست امریکی سفیر BYROADE نے امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو انتخابات سے قبل یہ رپورٹ بھیجی تھی کہ پی این اے کو 60 فی صد ووٹ ملیں گے جبکہ پیپلز پارٹی 40 فی صد ووٹ حاصل کر سکے گی۔

بھٹو صاحب نے خان عبدالقیوم خان کو جو بھٹو صاحب کو چھوڑ چکے تھے، درمیان میں ڈالا اور مفتی محمود کو پیغام بھجوایا کہ وہ نئے انتخابات کے لئے تیار ہیں مگر وزیراعظم رہیں گے۔ جبکہ پی این اے کا اب تک مطالبہ تھا کہ بھٹو صاحب مستعفی ہوں پھر انتخابات کروائے جائیں۔ اب تک تین سو کے قریب لوگ مر چکے تھے۔ ہزاروں جیل میں بند تھے۔ بڑے شہر فوج کے کنٹرول میں تھے۔ پی این اے نے تجویز مان لی۔ سعودی سفیر جو

اب تک کافی سرگرم ہو چکے تھے، انہوں نے بھی 26 رمئی کو بھٹو صاحب کو یہ ''اچھی'' خبر سنائی کہ پی این اے نے ان کی تجویز مان لی ہے۔''

پی این اے نے اپنی تحریک معطل کر دی۔ اس دوران لاہور ہائی کورٹ کے فل بنچ نے فیصلہ سنایا کہ تین بڑے شہروں میں لگایا گیا مارشل لا غیر آئینی ہے۔ اس فیصلے کو بھٹو حکومت نے سپریم کورٹ میں چیلنج کیا مگر پی این اے کے مذاکرات کے بعد 7 رجون کو مارشل لا اٹھالیا گیا۔ حفیظ پیرزادہ اور پروفیسر غفور احمد سمجھوتے کے فارمولے کی تفصیلات طے کرنے میں مصروف ہو گئے۔ 10 رجون کو پھر ڈیڈ لاک پیدا ہو گیا۔ بھٹو صاحب نے اسی شام اسمبلی میں اعلان کر دیا کہ پاکستان CENTO سے علیحدہ ہو جائے گا۔

یہ خبر بھی ضیاالحق کے قریبی ذرائع سے معلوم ہوئی کہ ضیاالحق نے سعودی عرب کے شاہ خالد کو یہ باور کروا دیا ہے کہ بھٹو اس کا تختہ الٹ کر شہزادہ ترکی الفصیل کو تخت پر بٹھانا چاہتے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز کے بیٹوں میں دھڑے بندی تھی۔ شاہ فیصل اور فہد کا تعلق ایک گروپ سے تھا۔ موجودہ شاہ عبداللہ کا تعلق بھی اسی گروپ سے تھا۔ شاہ فیصل نے 1964ء میں اپنے بڑے بھائی شاہ سعود کا تختہ الٹ کر اپنی بادشاہت قائم کی تھی۔

شاہ خالد ایک نااہل حکمران تھا۔ ایک بار مسز تھیچر سے ملاقات کے دوران اس نے کہا کہ وہ فالکن (شکرا) کے بارے میں گفتگو میں ماہر ہے باقی امور پر گفتگو کے لئے فہد ہے۔ چنانچہ ایسے شخص کو یہ یقین دلانا مشکل نہیں رہا ہو گا کہ بھٹو تمہارے خلاف ہے۔

اگر آپ کو یاد ہو کہ جب دنیا بھر کے حکمران بھٹو صاحب کی پھانسی کے خلاف اپیل کر رہے تھے تو سعودی حکمران خاموش تھے۔ پھر ریاض الخطیب کا بیان آیا کہ شاہ خالد اس وقت تک اپیل نہیں کرے گا جب تک اسے یقین نہ کروایا جائے کہ اس کی اپیل کو تسلیم کیا جائے گا۔ مگر آخری دنوں میں اس نے دنیا دکھاوے کے لئے اپیل کی تھی۔

بھٹو دوبارہ انتخابات کروانے کے لئے تیار ہو گئے

بھٹو صاحب اب دوبارہ انتخابات کروانے کے لئے تیار تھے۔ پی این اے کا مطالبہ تھا کہ انتخابات 14 راگست کو یا اکتوبر میں کروائے جائیں اور اکتوبر میں انتخابات کی صورت میں قومی اتحاد کو حکومت میں شامل کیا جائے۔ بھٹو صاحب نے جنرل ضیا الحق اور کور کمانڈروں سے ملاقات کے بعد پی این اے کی ٹیم سے ملاقات کی اور بتایا۔ ''انہوں نے حکومت کی پوزیشن پر غور کیا ہے اور اب وہ اکتوبر میں دوبارہ انتخابات کرنے کو تیار ہیں۔ وہ بہر حال حکومت میں قومی اتحاد کی شمولیت پر آمادہ نہیں تھے۔ اس کے متبادل انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ'' انتخابات کروانے کے لئے ایک معاہدے کے تحت ایک خصوصی کمیٹی تشکیل دی جائے جو صاف ستھرے ماحول میں انتخابات کروا سکے۔'' اصغر خان: ''تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا''، صفحہ 124۔

بھٹو صاحب اپنے سیاسی فیصلوں میں فوج کو شامل کر کے قومی اتحاد کو اور باہر کی دنیا کو یہ تاثر دیتے تھے کہ فوج ان کے ساتھ ہے۔ بلکہ انہوں نے ضیا الحق کو اردن، شام اور مصر کے دورے پر بھی بھیجا جہاں پر ضیا الحق نے ان تمام ممالک کو یقین دلایا کہ فوج بھٹو صاحب کی مکمل حمایت کرتی ہے اور پاکستان میں فوجی انقلاب کا کوئی خطرہ نہیں۔

15 رجون کو دونوں فریقین کے درمیان بنیادی نکات پر سمجھوتہ ہو گیا۔ بھٹو صاحب نے اسی شام کو قومی اسمبلی میں اعلان کر دیا کہ دوبارہ انتخابات اکتوبر میں ہوں گے۔ وہ اس یقین کے ساتھ کہ اب معاہدہ ہو چکا ہے لیبیا، سعودی عرب، کویت، ابو ظہبی، افغانستان اور ایران کے چھ روزہ غیر ملکی دورے پر ملک سے باہر چلے گئے۔ حکومت نے

پریس کانفرنس کر کے قوم کو یہ بتا دیا کہ پی این اے اور حکومت کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ اصغر خان نے اس پریس کانفرنس کو قبل از وقت قرار دے کر اعلان کر دیا کہ ابھی بہت سی تفصیلات طے ہونا باقی ہیں۔ اصغر خان کو یقین تھا کہ وہ وزیر اعظم بنائے جائیں گے۔ جبکہ بھٹو صاحب پی این اے کے بنیادی مطالبات، اکتوبر میں دوبارہ انتخابات، نگران کونسل میں قومی اتحاد کی برابر کی نمائندگی کو تسلیم کر چکے تھے۔ اصغر خان نے نیا شوشہ کھڑا کر دیا کہ نگران کونسل کی تجویز کو آئین میں ترمیم کر کے آئینی حیثیت دی جائے۔ سمجھوتے کو ناکام کرنے کے یہ ہتھکنڈے تھے۔ اصغر خان کو یقین تھا کہ تعطل کے نتیجے میں فوج اقتدار سنبھال لے گی اور وہ وزیر اعظم ہوں گے۔ نسیم ولی خان کو بھی اسی قسم کی یقین دہانی کرائی جا چکی تھی۔ چنانچہ معاہدے پر دستخط کے لئے جب پی۔ این۔ اے کی میٹنگ ہوئی تو مفتی محمود، نصر اللہ خان، مولانا نورانی دستخط کرنے کے لئے تیار تھے۔

شیر باز مزاری نے مفتی محمود کی داڑھی پکڑ لی

مگر نسیم ولی خان بے حد ناراض تھیں۔ شیر باز مزاری بہت تیزی دکھا رہے تھے۔ گرما گرمی میں انہوں نے مفتی محمود کی داڑھی پر ہاتھ ڈالنا چاہا۔ مفتی محمود کو غدار قرار دیا۔ اصغر خان نے انہیں جان سے مارنے کی دھمکی دی۔ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ بھٹو صاحب واپس آئے تو مذاکرات دوبارہ شروع ہوئے۔ یکم جولائی کو مفتی محمود اور بھٹو صاحب کی ملاقات ہوئی۔ مذاکراتی ٹیموں کی یہ میٹنگ آٹھ بجے شام کو شروع ہوئی جو بغیر کسی وقفے کے دوسری صبح ساڑھے چھ بجے تک جاری رہی معاملات طے پا گئے۔

4؍جولائی 1977ء کورات ساڑھے دس بجے بھٹواور پی این اے کے درمیان سمجھوتہ طے ہوگیا تھا

مگر پی این اے کی قیادت پر اصغر خان کا قبضہ تھا۔ بین الاقوامی اخبارات اور مضامین سے یہ تاثر دیا جارہا تھا کہ پیپلز پارٹی اور پی این اے کا معاہدہ نہیں ہوگا۔ مارشل لا لگے گا۔ اصغر خان ملک کا نیا وزیراعظم ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر بھٹو صاحب اور پی این اے کے درمیان سمجھوتہ ہوگیا۔ نوابزادہ نصراللہ خان اور مفتی محمود جو کہ مذاکراتی ٹیم کا حصہ تھے اس معاہدے سے مطمئن تھے صرف دستخط ہونا باقی تھے۔ اس کا اعلان وہ ایک پریس کانفرنس میں کرنے جارہے تھے کہ اصغر خان نے وہاں پہنچ کر ان سب کو برا بھلا کہا اور کہا کہ کوئی معاہدہ نہیں ہوا۔ اس معاہدے کو میں نہیں مانتا۔ آپ بھی اس سے انحراف کردیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ نوے دن کے اندر اندر الیکشن ہوں گے۔ پروفیسر غفور کو ہٹا کر اصغر خان نے پریس کانفرنس کا چارج لے لیا اور اعلان کردیا کہ کوئی معاہدہ نہیں ہوا۔ ہمارے دس نکات اور ہیں جن پر ابھی فیصلہ ہونا باقی ہے۔

بھٹو صاحب اور مفتی محمود کی دوبارہ ملاقات ہوئی اور تمام معاملات طے پا گئے۔ معاہدے پر پانچ تاریخ کو دستخط ہونا تھے۔ نوابزادہ نصراللہ خان نے غلام مصطفیٰ جتوئی کے لندن والے فلیٹ پر ایک شام کھانے کے دوران مجھ سے بات کرتے ہوئے تسلیم کیا کہ 4؍جولائی 1977ء کورات ساڑھے دس بجے معاہدہ طے پا گیا تھا۔ اس معاہدے پر اگلے روز دستخط ہونا تھے میں نے اپنے تمام اعتراضات واپس لے لئے تھے۔

بھٹو صاحب اپنی کتاب ''اگر مجھے قتل کیا گیا'' میں لکھتے ہیں کہ چار جولائی کی رات اندازاً ایک بج کر بیس منٹ یعنی پانچ جولائی کی صبح...... کھانے کے بعد مسٹر حفیظ پیرزادہ نے مجھے کہا ''مبارک ہو'' بحران ختم ہو گیا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ یہ بات کس طرح کہہ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اپوزیشن کی بھاپ نکل چکی ہے۔ میں نے قہقہہ لگایا اور ممتاز بھٹو سے کہا کہ وہ پیرزادہ کی اس منطق کی وضاحت کریں۔ اس کا جواب انہوں نے دیتے ہوئے کہا کہ ایسا کرنے کے لئے پیرزادہ کو سکھر بیراج پر لے جانا ہوگا اور وہ بھی اس وقت جب دریا کا پانی اپنے عروج پر ہو۔ ہم تینوں نے قہقہہ لگایا۔ تین گھنٹے کے بعد ہم نے ایک دوسرا قہقہہ سنا۔''

بھٹو حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا
ضیاالحق نے ملک پر قبضہ کر لیا

یہ 1977ء کی چار اور پانچ جولائی کی درمیانی شب تھی جب بھٹو صاحب کی حکومت کا تختہ الٹا گیا۔ فوج کے اس آپریشن کو ''آپریشن فیئر پلے'' کا نام دیا گیا۔ آپریشن شروع ہونے سے پہلے ضیاالحق، مستقبل کے امیر المومنین نے اپنے دست راست اور راولپنڈی کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ فیض علی چشتی کو ''مشن'' پر روانہ ہونے سے قبل اس کے کان میں کہا ''مرشد مروانہ دینا''۔ اس رات آپریشن فیئر پلے میں تو کوئی نہیں مرا لیکن آنے والے گیارہ سالوں میں ہزاروں سیاسی کارکن مارے گئے اور وہ معاشرہ جو قومی اور طبقاتی تضاد کے حوالے سے اپنے سیاسی شعور کی پختگی کے مراحل سے گزر رہا تھا اس کو ضیاالحق نے اپنی دہشت گردی کے ذریعے غیر سیاسی بنا دیا۔

ضیاالحق کا آپریشن فیئر پلے بظاہر اس لئے تھا کہ دونوں فریقین یعنی PNA اور بھٹو صاحب کی محاذ آرائی ختم کی جائے اور نوے دن کے اندر عام انتخابات کا انعقاد کیا جائے۔ ضیاالحق نے نیوز ویک، بی بی سی اور یو پی آئی کو انٹرویوز میں یہ بھی کہا تھا کہ ''بھٹو صاحب نے بطور وزیر اعظم پوری کوشش کی تھی کہ حزب اختلاف کے ساتھ معاہدہ ہو جائے اور حقیقت یہ ہے کہ بھٹو جس حد تک رضامند ہو گئے تھے اس سے زیادہ کسی سیاست دان سے رضامندی ممکن نہیں۔''

14 جولائی 1977ء پاکستان ٹائمز کے مطابق ''چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر

نے واضح اور پرزور الفاظ میں کہا کہ وزیراعظم نے مارچ 1977ء کے انتخابات میں کوئی دھاندلی نہیں کی۔ انہوں نے کہا کہ فوج کے پاس ثبوت موجود ہیں کہ مسٹر بھٹو اس دھاندلی کے ذمے دار نہیں تھے۔ اس کے علاوہ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ پی پی پی کی فتح دھاندلی کی وجہ سے ہوئی۔''

''آپریشن فیئر پلے'' والے روز یعنی چار جولائی 1977ء کوڈان میں SELIG HARRISON کا مضمون چھپا۔ جس میں اس نے بھٹو صاحب سے امریکہ کی ناراضگی کا تذکرہ کیا۔ ہیریسن کو اس وقت پاکستان پر ماہر سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں یہ شمالی کوریا کا ماہر بن گیا۔

کسنجر کی دھمکی کے بعد بھٹو صاحب کے خلاف جو امریکہ کی سازش تھی اس میں سب سے بڑا شعوری کردار اصغر خان تھا۔ اور غیر شعوری کردار صادق قریشی کا تھا جس نے پنجاب میں انتہا درجے کی دھاندلی کروائی تھی اور جو PNA کی تحریک کی وجہ جواز بنا تھا۔ مگر ضیا الحق نے وہ کردار جو بھٹو صاحب کو ہٹانے اور اصغر خان کو لانے کا تھا، اب اپنے لئے چن لیا۔

آئین معطل، اسمبلیاں ختم، نوے دن میں الیکشن کروانے کا وعدہ

مارشل لا لگ گیا اور ملک ضیا الحق کے قبضے میں چلا گیا۔ جب ملک کو مارشل لا کے اندھیروں میں دھکیلا گیا تو آئین معطل کر دیا گیا۔ قومی اسمبلی، سینیٹ اور صوبائی اسمبلیاں ختم کر دی گئیں۔ چودھری فضل الٰہی کو صدر پاکستان کے طور پر جاری رکھا گیا۔ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے قوم کو بتایا کہ سابق وزیراعظم اور ان کے ساتھیوں کو جن میں ممتاز بھٹو، حفیظ پیرزادہ، کوثر نیازی، راؤ رشید، مسعود محمود اور پی این اے کے لیڈروں کو جن میں اصغر خان، مفتی محمود، غفور احمد وغیرہ شامل ہیں حفاظتی تحویل میں لے لیا گیا ہے اور یہ کہ 90 دن میں دوبارہ انتخابات کروائے جائیں گے۔

چند روز بعد نیوز ویک کے نمائندے Edward Behr نے ایک انٹرویو میں ضیا الحق سے پوچھا کہ حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد اس کا بھٹو صاحب کے بارے میں کیا خیال ہے تو اس نے کہا کہ ''وہ ہمیشہ میرے مہربان رہے ہیں۔ مگر مجھے کوئی افسوس نہیں اور

مجھے ان کے خلاف کوئی VENOM نہیں...... وہ ایک مضبوط ارادوں کے انسان ہیں جن کی تاریخ پر گہری نظر ہے۔ وہ ایک TENACIOUS FIGHTER بھی ہیں اور ایک عظیم سیاست دان بھی۔"

12 جولائی کو ضیاالحق، جنرل چشتی کے ساتھ مری پہنچا جہاں پر بھٹو صاحب کو رکھا گیا تھا۔ دونوں بھٹو صاحب سے علیحدگی میں ملے۔ چشتی اپنی کتاب Betrayals of An other Kind میں صفحہ 18 پر لکھتا ہے کہ جنرل ضیا نے کہا وہ عارضی تحویل میں ہیں۔ سب کچھ دوبارہ بھٹو صاحب کا ہی ہوگا۔ پھر وہ جس طرح چاہیں معاملات کو چلائیں۔ مسٹر بھٹو نے پوچھا وہ کب تک تحویل میں رہیں گے۔ ضیاالحق نے کہا کہ صرف چند دن۔ اس دوران وہ آرام کریں۔

14 جولائی کو ضیاالحق نے اپنی پہلی پریس کانفرنس کی اور اس بات کو دہرایا کہ "میرے ارادے ہمیشہ یہ رہے ہیں کہ ایسی روایات ڈالی جائیں کہ فوج سیاست میں ملوث نہ ہو اور سیاست دان اپنے فیصلے خود کریں...... ہم نے وزیراعظم اور ان کے ساتھیوں کو اور ان کے مخالفین کو نہایت احترام اور آرام کے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ انہیں بہت سوچ بچار کرنا ہے کیونکہ ملک کا مقدر ان کے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے ملک کے مستقبل کو سنبھالنا ہے نہ کہ میں نے۔ میں تو صرف نوے دن تک کے لئے ہوں...... میں ایک نہایت سادہ انسان ہوں۔ یہ کہنا کہ میرے اور وزیراعظم کے درمیان مارشل لا کے اس اقدام کے بارے میں ملی بھگت ہے، بے ہودہ بات ہے۔ کیا ان کی سطح کا آدمی میرے ساتھ پاور شیئر کرسکتا ہے؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ بھٹو کا نہیں بلکہ پی این اے کا آدمی ہے۔ کیونکہ یہ نمازی ہے۔ کیونکہ یہ اسلام کی بات کرتا ہے۔ آپ خود فیصلہ کرسکتے ہیں۔ مگر یہ ایک اتفاق ہے۔"

"ہوسکتا ہے میں غلط ہوں مگر سیاسی جماعتوں میں سے کسی کے بھی منشور کا اولین نکتہ اسلام نہیں ہے۔ "نظام مصطفیٰ ﷺ اور "نظام اسلام" ان کی سیاسی سرگرمیوں کے دوران آیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ عوام کے دباؤ کی وجہ سے لیڈروں نے اس نعرے کو اپنایا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسلامی ریپبلک آف پاکستان میں اسلام ہونا

چاہیے۔ میں ایک مسلمان ہوں۔ عقیدے کے اعتبار سے بھی، پیدائشی اعتبار سے بھی اور اپنے عمل کے اعتبار سے بھی۔" (Pakistan Horizon 30 (third & fourth qtr.) Pages 214,215

ایف ایس ایف کے ڈائریکٹر مسعود محمود کو 5/جولائی سے ہی ایک علیحدہ کمرے میں رکھا گیا تھا اور بھٹو صاحب کے سیکرٹری پبلک افیئرز افضل سعید کو بھی۔ ان کو بہت سے کاغذ اور قلم مہیا کئے گئے تھے کہ وہ ان تمام "غیر قانونی احکامات" کی تفصیل لکھیں جو بھٹو صاحب وقتاً فوقتاً انہیں دیتے رہتے تھے۔

27/جولائی کو ضیاالحق نے پھر قوم سے خطاب کیا۔ اپنے نوے دن کے وعدے کو دہرایا اور عوام کو تاکید کی وہ ان نمائندوں کو ووٹ دیں جو صحیح معنوں میں "پاکستانی" ہوں اور "مومن" ہوں۔ 28/جولائی کو وہ جنرل چشتی کے ہمراہ مری گیا اور بھٹو صاحب کو کہا کہ وہ آزاد ہیں۔ بھٹو صاحب 29/جولائی کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے لاڑکانہ روانہ ہوئے۔ لاڑکانہ پہنچنے پر ان کا ہزاروں افراد نے استقبال کیا۔ اب بھٹو صاحب آزاد تھے۔ کچھ دن بعد وہ 70 کلفٹن کراچی گئے تو ہزاروں کا مجمع وہاں بھی ان کا منتظر تھا۔

ضیاالحق کی نیت شروع سے ہی صاف نہیں تھی۔ اس کو یہ معلوم تھا کہ آئین کی خلاف ورزی کا مطلب سزائے موت ہے۔ بھٹو صاحب کا معاف نہ کرنے والا مزاج بھی اس کے پیش نظر تھا اور شاید اس کو یہ بھی یاد رہا ہو کہ بھٹو صاحب ذاتی محفلوں میں سب کے سامنے اسے بندر سے تشبیہ دیتے تھے اور اس کے دانتوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ یہ بھٹو صاحب کی عادت تھی۔ چند ایک کو چھوڑ کر وہ اپنے قریبی اور مخالفین دونوں کا ہی مذاق بھی اڑاتے تھے اور ان کے تضحیک آمیز نام بھی رکھتے تھے۔

بھٹو صاحب کے خلاف مقدمات قائم کرنے کے لئے ایجنسیاں کام کر رہی تھیں۔ جبکہ ضیاالحق اکتوبر میں انتخابات کروانے کے وعدے کو بار بار دہرا رہا تھا۔ ڈیرہ غازی خان سے جماعت اسلامی کے رکن قومی اسمبلی ڈاکٹر نذیر احمد کو 1972ء میں قتل کیا گیا تھا۔ 15/اگست 1977ء کو ایف آئی اے نے اس ضمن میں جو کیس تیار کیا اس میں اس قتل

کی ذمہ داری براہ راست بھٹو صاحب پر ڈالی گئی۔ 1972ء میں غلام مصطفیٰ کھر پنجاب کے گورنر تھے جو اس کیس میں بھٹو صاحب کے خلاف ایک اہم گواہ یا ایک مجرم ہو سکتے تھے۔ ضیاالحق مصطفیٰ کھر پر مکمل بھروسہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھا چنانچہ جب فیض علی چشتی نے ضیاالحق سے مصطفیٰ کھر کے لندن جانے کی اجازت دینے کی سفارش کی تو اس نے انکار نہیں کیا اور مصطفیٰ کھر اپنا دامن بچا کر لندن روانہ ہو گئے۔

بھٹو کا ایک بار پھر لاہور میں استقبال

مشکل وقت میں عوام بھٹو کے ساتھ تھے

اسی ماہ کے دوران بھٹو صاحب کا لاہور میں ایک تاریخی استقبال ہوا۔ عوام جو اب تک ان سے خفا تھے ان کی حکومت کے خاتمے کے بعد ان کے ساتھ تھے۔ جئے بھٹو، ساڈا بھٹو آوے ای آوے، کی گونج ایک بار پھر سنی جانے لگی۔

جنرل چشتی کی کتاب کے مطابق 28/اگست کو ڈھائی بجے بھٹو صاحب نے جنرل ضیا اور جنرل چشتی کے ساتھ جو اب الیکشن سیل کا انچارج تھا ملاقات کی۔ بھٹو صاحب نے اکتوبر میں ہونے والے انتخابات کے بارے میں استفسار کیا اور الیکشن سیل کی تیاریوں کے بارے میں بھی۔ دو گھنٹوں کی اس ملاقات کے بعد بھٹو صاحب لاڑکانہ واپس چلے گئے۔ 30/اگست کو چار ریٹائرڈ ججوں نے ضیاالحق سے اپیل کر دی کہ انتخابات کروانے سے پہلے ضیاالحق کو چاہیے کہ وہ بھٹو صاحب کی جانب سے کی جانے والی بے قاعدگیوں کی تحقیقات کروائے۔

تین ستمبر 1977ء کی صبح 4 بجے آرمی کمانڈوز نے 70 کلفٹن کا گھیراؤ کیا۔ سامنے کا آہنی دروازہ توڑا۔ بندوقیں تان کر دوڑتے ہوئے اوپر کی منزل پر گئے اور بھٹو صاحب کو ایک کالے رنگ کی کار نامعلوم منزل کی طرف لے گئی۔ دس دن تک وہ حراست میں رہے۔ 13 تاریخ کو لاہور ہائی کورٹ میں ان کے خلاف پنجاب حکومت کی جانب سے دائر کردہ مقدمات کی سماعت شروع ہوئی۔ لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس صمدانی نے بھٹو صاحب کو

ضمانت پر رہا کر دیا۔ بھٹو صاحب اسی شام واپس چلے گئے۔ ضیا الحق نے دوسرے تمام سیاسی رہنماؤں کو راولپنڈی بلایا ملاقات کی اور ایک بار پھر جھانسہ دیا کہ انتخابات 18/اکتوبر 1977ء کو منعقد ہوں گے۔

اب تک ضیا الحق ملٹری لاء کوڈ کے ذریعے چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹنا، کوڑوں کی سزائیں، سنگسار کرنے کی سزائیں، متعارف کروا چکا تھا۔ یہ سزائیں سیاسی مخالفین اور کارکنوں سے ملٹری کورٹس کے ذریعے نپٹنے کے لئے تھیں اور ملک پر خوف کی فضا قائم کرنے کے لئے تھیں۔

پہلے احتساب پھر انتخاب

16 اور 17 ستمبر کی رات کو کمانڈوز دیواریں پھلانگ کر المرتضیٰ میں داخل ہوئے اور ممتاز بھٹو اور بھٹو صاحب کو سکھر جیل لے گئے۔ یکم اکتوبر کو ضیاالحق نے قوم سے خطاب کر کے انتخابات کو اس بنیاد پر ملتوی کر دیا کہ جب تک احتساب نہ ہو جائے انتخابات نہیں ہو سکتے۔ اسی روز مولوی مشتاق نے، جو کہ لاہور ہائی کورٹ کا ایکٹنگ چیف جسٹس تھا، جسٹس صمدانی کو جنہوں نے بھٹو صاحب کو ضمانت پر رہا کیا تھا، لاہور ہائی کورٹ بنچ سے علیحدہ کر دیا۔

مولوی مشتاق بھٹو کا جانی دشمن بن چکا تھا

1971ء میں بھٹو صاحب کی حکومت بننے کے فوراً بعد مولوی مشتاق چاہتا تھا اور توقع بھی رکھتا تھا کہ لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس اسے مقرر کیا جائے گا۔ جبکہ بھٹو صاحب نے سردار اقبال کو چیف جسٹس مقرر کر دیا۔ ان کے بعد جب اسلم ریاض کو لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس مقرر کیا گیا اور مولوی مشتاق کو دوبارہ نظر انداز کیا گیا تو وہ بھٹو صاحب کے بے حد خلاف ہو گیا۔ ضیاالحق کو یہ معلوم تھا کہ مولوی مشتاق، بھٹو صاحب کا دشمن بن چکا ہے۔ چنانچہ اس نے مولوی مشتاق کو نہ صرف ایکٹنگ چیف جسٹس مقرر کیا بلکہ چیف الیکشن کمشنر بھی بنا دیا۔

ان دنوں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس یعقوب علی تھے۔ انہوں نے ضیاالحق کے یکم اکتوبر کے اعلان سے تین روز پہلے بیگم نصرت بھٹو کی درخواست کو جو کہ انہوں نے بھٹو صاحب کی نظر بندی کے خلاف دائر کی تھی سماعت کے لئے منظور کیا تھا۔ ضیاالحق نے جسٹس

یعقوب علی کو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدے سے جبراً ریٹائر کر کے اپنے جالندھر کے دوست شیخ انوار الحق کو سپریم کورٹ کا چیف جسٹس مقرر کر دیا۔ انوار الحق کی کوئی قانونی تربیت نہیں تھی۔ وہ ایک مجسٹریٹ کے طور پر اس شعبے میں داخل ہوا۔ آہستہ آہستہ ہائی کورٹ تک پہنچا اور پھر سپریم کورٹ تک۔ اس کی ترقیاں جسٹس کارنیلیئس کی مرہون منت تھیں جو اس کا مہربان بھی تھا اور دوست بھی۔ اب بھٹو صاحب کے خلاف لاہور ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ دونوں جگہ عدالتی جال تیار تھا۔

کوثر نیازی، غوث بخش رئیسانی، حنیف رامے اور دیگر سیاستدان ضیاالحق کے ساتھ مل گئے

وہ سیاست دان جو بھٹو صاحب کے ساتھ انتخابات میں دھاندلی کی بنیاد پر جھگڑا کر رہے تھے اب فوجی آمر کے ساتھ اقتدار میں شریک ہونے کے لئے بے چین تھے۔ کوثر نیازی ضیاالحق کے ساتھ تھے۔ غوث بخش رئیسانی جو بلوچستان پیپلز پارٹی کا صدر تھا، گورنر بھی رہا، سینئر وزیر بھی رہا، اب مارشل کے کیمپ میں تھا۔ ''لاکھوں ساتھیوں سمیت'' پیپلز پارٹی میں شامل ہو کر اقتدار کا مزہ لوٹنے والے اب ضیاالحق کے آگے پیچھے تھے۔ حتیٰ کہ حنیف رامے بھی ضیاالحق کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ضیاالحق کے ساتھ سمجھوتے کے بعد ان کے خلاف کرپشن کے جو الزامات تھے اور جو انکوائریاں جاری تھیں وہ واپس لے لی گئیں۔ وہ بھٹو صاحب کے خلاف ایک گواہ کے طور پر ہائی کورٹ میں بیان دینے کے لئے بھی تیار تھے۔ سنا گیا کہ وہ اس مقصد کے لئے کئی روز ہائی کورٹ جاتے بھی رہے۔ حنیف رامے جو نظریاتی سیاست کی پیداوار تھے۔ ہم نے مل کر جدوجہد کی تھی۔ پاکستان کی سیاست میں وہ درمیانہ طبقے کے نمائندے کے طور پر ابھرے تھے اور صف اول میں شامل ہو گئے تھے، کبھی مسلم لیگ میں تھے، کبھی ارائیں برادری کا تصور ان پر حاوی تھا، کبھی پنجاب کا لیڈر بننے کی کوشش تھی، کبھی مساوات پارٹی تھی اور اب وہ ضیاالحق کے مشیر تھے۔ ان کی فکر و دانش موقع پرستی کی اس معراج کو چھو لے گی کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

نواب محمد احمد خان قتل کیس تیار، مسعود محمود وعدہ معاف گواہ

بھٹو صاحب کے خلاف فائلوں کی چھان بین جاری تھی۔ پانچ ضخیم جلدوں پر مشتمل وائٹ پیپر تیار کیا گیا جس کو 1978ء میں شائع کیا گیا۔ ڈاکٹر نذیر قتل کیس تو تھا ہی، اب نواب محمد احمد خان قتل کیس تیار کیا جانے لگا۔ اس وقت تک مسعود محمود نے اپنی خدمات پیش کر دی تھیں۔ اس وعدہ معاف گواہ کی موجودگی میں اس قتل کو بھٹو صاحب پر ڈالنا ضیا الحق کے لئے اب آسان تھا۔ چنانچہ احمد رضا قصوری کے باپ کے قتل کا مقدمہ مولوی مشتاق کی عدالت میں چل پڑا۔ اس سے پہلے بیگم بھٹو کی مارشل لا کے خلاف پٹیشن عدالت سے خارج ہو چکی تھی۔ اے۔ کے۔ بروہی اور شریف الدین پیرزادہ نے ضیا الحق کے مارشل لا کو ''نظریہ ضرورت'' کی حفاظتی چھتری مہیا کر دی تھی۔

ضیا الحق ایک ظالم اور سفاک شخص تھا۔ میں نے جب پہلی بار اس کو دیکھا تو مجھے اس کی پتھر جیسی آنکھوں میں موت کے سائے نظر آئے۔ اس کی آنکھوں میں زندگی نہیں تھی۔ ادھر مولوی مشتاق پرانے بدلے چکانے پر تلا ہوا تھا اور وہ امریکہ جس کے تعلقات چین کے ساتھ استوار کروانے میں بھٹو صاحب نے ایک اہم کردار ادا کیا اور جس کے لئے امریکہ ان کا ایک زمانے میں مشکور تھا، اب ان کے خون کا پیاسا تھا۔

انتخابات میں دھاندلی کے بہانے بھٹو صاحب کی حکومت کا خاتمہ کر کے مارشل لا نافذ کرنا سب سے بڑی دھاندلی تھی جس میں جمہوریت کا علمبردار امریکہ برابر کا شریک تھا۔ جمہوریت کا راگ الاپنے والے دیگر مغربی ممالک بھی اب مارشل لا اور فوجی ڈکٹیٹر کی سرپرستی کر رہے تھے اس لئے کہ سوویت یونین کے خلاف ''اسلامی جہاد'' کا باب کھلنے والا تھا اور اب ضیا الحق جو ہزاروں فلسطینیوں کا قتل عام کر کے امریکہ کا آزمودہ اور قابل بھروسہ جرنیل تھا، اس کی ضرورت تھی۔ حالانکہ بھٹو صاحب نے ملک کو اسلامی بنانے کے راستے پر ڈالا تھا مگر پاکستان کے ایٹمی پروگرام پر امریکہ کا حکم نہ مان کر وہ امریکہ کے لئے قابل بھروسہ نہیں تھے۔

مولوی مشتاق نے بھٹو کو پھانسی کی سزا سنادی

اس فیصلے میں جماعت اسلامی کا کردار

مولوی مشتاق کی عدالت میں کیس چل رہا تھا۔ بھٹو صاحب نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے کہ صورت یہ تھی کہ ان کا وکیل یحییٰ بختیار بھی ہائی کورٹ اور پھر سپریم کورٹ میں تیاری کے بغیر آتا تھا۔ اس کیس کی سماعت کے دوران مولوی مشتاق کبھی بھٹو صاحب کو ''شٹ اپ'' اور کبھی یہ کہ ''اس کو باہر لے جاؤ اور اس وقت میرے سامنے لاؤ جب تک اس کا دماغ ٹھیک ہو جائے'' جیسے تضحیک آمیز فقرے استعمال کرتا۔ بالآخر اس نے اور اس کے وفادار بنچ نے مارچ 1978ء میں بھٹو صاحب کو پھانسی کی سزا سنادی۔ مولوی مشتاق کے اس فیصلے میں جماعت اسلامی کا کردار بہت نمایاں ہے۔

جماعت اسلامی کا مولوی طفیل، محمد ضیاالحق کی بیوی مسز شفیقہ ضیا کا ماموں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بھٹو صاحب کے خلاف قتل کیس میں ملوث دو مجرموں کا تعلق اچھرہ سے تھا جہاں پر جماعت اسلامی کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ ان دونوں مجرموں سے اقبالِ جرم کروالیا گیا تھا۔ جب معلوم ہوا کہ وہ اپنے اقبالِ جرم سے منحرف ہونے والے ہیں تو مولوی طفیل اور مولوی مشتاق سپیشل پراسیکیوٹر انوار کے دفتر میں گئے۔ وہاں سے طفیل ان دونوں کو ملنے کوٹ لکھپت گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس نے ان دونوں کو دو دو مربع زرعی زمین اور ایک ایک رشتے دار کو ملازمت دلوانے کے علاوہ اس کیس میں سے بری ہونے کا لالچ دیا۔ مگر جب ضیاالحق ان دونوں مجرموں کو بری کرنے پر رضامند نہ ہوا تو ان ملزمان کے خاندان طفیل کے پاس گئے اور اس کو وعدہ یاد کروایا۔ اس نے ان سے کہا کہ ضیاالحق اس کی بات نہیں مان رہا مگر میں تمہیں دو مربع زمین کی جگہ تین مربع زمین دلوادوں گا۔ ان دنوں بھٹو صاحب نے عدالتی کارروائی کے دوران ان میں سے ایک مجرم جس کا نام خالق تھا، کے رشتے دار کو نوکری کے لالچ کا ذکر بھی کیا تھا۔

سنا جاتا ہے کہ بھٹو صاحب کی پھانسی کا عدالتی فیصلہ جسٹس آفتاب نے لکھا تھا۔ یہ

شخص پکا جماعتی تھا۔ یہ بات بھی اس سے منسوب ہے کہ اس نے لکھا کہ بھٹو صرف نام کا مسلمان ہے۔ یاد رہے کہ بھٹو صاحب کی زندگی کے آخری ایام میں ان کا کموڈ ایک سنتری کے سامنے رکھ دیا گیا تھا جہاں پر سنتری کی ڈیوٹی چوبیس گھنٹے اس بات پر تھی کہ وہ ان کے اعضائے تناسل کو دیکھ کر تصدیق کرے کہ ان کے ختنے ہوئے تھے یا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پھانسی کے بعد ان کے جسم کو ننگا کر کے تصویریں اتاری گئیں جس کی تصدیق کرنل رفیع نے اپنی کتاب اور ٹی وی پر اپنے انٹرویو میں کی ہے۔ جماعت اسلامی بھٹو صاحب کی کردار کشی کرتی رہی تھی اور ان کی والدہ کے بارے میں وہ بارہا اپنے رسالوں میں یہ کیچڑ اچھالتی رہی تھی کہ وہ ہندو تھیں۔

قید، کوڑے، پھانسیاں اور جلاوطنی

زمینِ پاکستان ظلمت کے نقاب میں چلی گئی

معاشرے کے وہ تمام باشعور افراد اور سیاسی کارکن جو مولوی مشتاق کے فیصلے سے ناخوش تھے بالخصوص وہ افراد جن سے آنے والے وقت میں بھٹو صاحب کو دی جانے والی پھانسی پر ردعمل کا خطرہ ہوسکتا تھا، بڑے پیمانے پر گرفتار کئے جانے لگے اور ضیاالحق کی بنائی ہوئی سرسری سماعت کی فوجی عدالتیں نہایت مستعدی سے انہیں قید بامشقت، کوڑوں اور پھانسیوں کی سزائیں سنانے لگیں۔ فوجی عدالتوں کے یہ ''مجرم'' چور، ڈاکو، زانی، لٹیرے نہیں تھے بلکہ یہ پروفیسرز تھے، طالب علم تھے، صحافی تھے، وکیل تھے، تخلیق کار تھے، اداکار تھے، شاعر اور ادیب تھے، سیاسی کارکن تھے اور عام معصوم شہری تھے۔ ملک بھر میں اب قید تھی، کوڑے تھے، پھانسیاں تھیں اور ضیاالحق کی حکمرانی تھی۔

زمین پاکستان ظلمت کے نقاب میں چلی گئی، تیرگیٔ شب کے سوا کچھ نہیں تھا۔ پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی نیندیں حرام تھیں۔ کون کب کس گھر سے اٹھالیا جائے، واپس لاش آئے یا کوڑوں سے ادھڑا ہوا جسم، بے یقینی کے اس ظلمت کدے میں بھاری بھاری بوٹوں کی آوازیں تھیں اور عوام دشمن، وطن فروش مذہبی غنڈوں کے قہقہے۔ بہاروں کے تمنائی عوام مرجھائے ہوئے تھے۔ آمریت مخالف، جمہوریت پسند کارکنوں اور عوام کے مقدس خون سے پاک سرزمین کو ''شادو آباد'' کیا جارہا تھا۔

اس وقت کا خاموش ردعمل سرگوشی کررہا تھا کہ آنے والے عوامی دور میں انہیں

کوڑے لگنے چاہیے جنہوں نے کوڑے لگوائے ہیں اور ان کے خلاف قتل کے مقدمات چلنے چاہئیں جنہوں نے سیاسی کارکنوں کو پھانسی پر لٹکایا ہے۔ مگر آنے والا ''عوامی دور'' سمجھوتوں کا دور تھا۔ قید، کوڑے، پھانسیاں، ان سب پر سمجھوتے بازی کی گئی۔ بے نظیر صاحبہ کے ساتھ اس وقت جب وہ سمجھوتے کر کے لندن سے واپس جارہی تھیں میرے اختلافات کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح مارشل لا لگانے کے اقدام کو آئینی تحفظ نہیں ملنا چاہیے تھا، اسی طرح ان سزاؤں کو بھی آئینی تحفظ نہیں ملنا چاہیے تھا۔ ان تمام افراد کے خلاف مقدمات چلنے چاہئیں تھے جنہوں نے یہ ظالمانہ سزائیں دے کر معاشرے کو ضیاالحق کی آمریت کے خوف میں دھکیلا اور خاندانوں کے خاندان تباہ و برباد کئے۔ آئندہ مارشل لا کو روکنے کا بھی یہی طریقہ تھا۔

ہاشم خان نے کہا ''یہ لوگ بھٹو کو پھانسی دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں''

اسحاق خان، روئیداد خان اور ہاشم خان ان دنوں شام کو اکٹھے چہل قدمی کیا کرتے تھے۔

ایک روز ہاشم خان وائس چانسلر نے میٹنگ کے بعد مجھے روک لیا۔ انہوں نے جب کبھی کوئی اہم بات علیحدگی میں کرنا ہوتی تو ہمیشہ کمرے سے باہر نکل کر کھلی فضا میں کیا کرتے تھے۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، شاید ان کو یہ محاورہ ہمیشہ یاد رہتا۔ کہنے لگے چلو ایک راؤنڈ لگا کر آئیں۔ تھوڑی دور جا کر ملک کی صورت حال پر بات کرتے ہوئے وہ رک گئے۔ ادھر ادھر دیکھا پھر نہایت رازدارانہ لہجے میں کہنے لگے کہ میں تمہیں جو بات کہنے والا ہوں وہ تم صرف بیگم نصرت بھٹو سے کرو گے اور ان کے علاوہ کسی سے بھی اس کا تذکرہ نہیں کرو گے اور وہ بات یہ ہے کہ یہ لوگ بھٹو صاحب کو پھانسی دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ میں ایک لمحے کے لئے ٹھٹھکا۔ اگرچہ مولوی مشتاق کا فیصلہ آچکا تھا مگر واقعتا بھٹو صاحب کو پھانسی دے دی جائے گی اس وقت اس بات کو تسلیم کرنا مشکل تھا۔

مجھے یہ معلوم تھا کہ ان دنوں ہاشم خان، روئیداد خان اور اسحاق خان شام کو اکٹھے چہل قدمی کرتے تھے۔ اسلام آباد میں یہ ایک کھلا راز تھا کہ روئیداد خان اور اسحاق خان ضیاالحق کے بے حد قریب ہیں اور اکثر فیصلے ان کی مشاورت سے ہوتے ہیں۔ روئیداد خان ان دنوں وزیر داخلہ تھا اور اسحاق خان وزیر خزانہ۔ چنانچہ ہاشم خان کی بات محض قیاس آرائی نہیں تھی۔ ایک سنجیدہ اطلاع تھی۔ میں نے بیگم صاحبہ سے ملاقات کی۔ وہ بھی اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھیں مگر انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ بھٹو صاحب تک اس بات کو پہنچائیں گی۔

بھٹو کی پھانسی کو یقینی بنانے کے لئے ضیا نے اسلامی قانونِ قصاص و دیت نافذ نہیں ہونے دیا

اسلام کے نام پر سیاسی کارکنوں اور اپنے مخالفین کے خون سے ہولی کھیلنے والے ضیاالحق نے بھٹو صاحب کی پھانسی کو یقینی بنانے کے لئے ملک میں اس وقت تک اسلام کا قانون قصاص و دیت نافذ نہیں ہونے دیا جب تک کہ بھٹو صاحب کو پھانسی نہیں دے دی گئی۔

ملک پر قبضہ کرنے کے بعد ضیاالحق نے اسلامی نظریاتی کونسل کی ازسرِ نو تشکیل کی تھی اور افضل چیمہ کو اس کا چیئرمین مقرر کیا تھا۔ ان کو یہ ذمہ داری دی گئی تھی کہ ملک کو اسلامی قوانین کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ پہلا کام جو انہیں سونپا گیا، وہ تھا اسلامی تعزیراتی قوانین کی تشکیل۔ یعنی اسلامی سزاؤں پر مبنی قوانین کی تشکیل۔ افضل چیمہ قانونی اور مذہبی حلقوں میں ابن تیمیہ کے نام سے مشہور تھے۔ کٹر وہابی تھے اور آل سعود کے گویئے کے طور پر جانے جاتے تھے۔ انہوں نے اس ضمن میں سعودی عرب اور مصر کے متعدد دورے کئے اور وہابی اسلام کے قوانین مرتب کر کے ضیاالحق کو دے دیئے۔ دراصل یہ قوانین سعودی عرب میں رائج قوانین کا چربہ تھے۔

ڈاکٹر طاہر حیدر واسطی جو آج کل انگلینڈ اینڈ ویلز کی سپریم کورٹ میں پریکٹس کر رہے ہیں اور لندن یونیورسٹی میں اسلامک لاء بھی پڑھا رہے ہیں، اپنی کتاب The Application of Islamic Criminal Law in Pakistan,Shriah in Practice میں افضل چیمہ کے ساتھ ہونے والے اپنے انٹرویو میں کہتے ہیں کہ افضل چیمہ

نے اقرار کیا کہ انہوں نے جو قوانین ضیاالحق کو بنا کر دیئے تھے ان میں قانون قصاص و دیت بھی تھا۔ضیاالحق نے ان کی طرف سے تیار کردہ تمام قوانین نافذ کر دیئے سوائے قانون قصاس و دیت کے۔اس قانون کو اس نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اس پر مزید کام کی ضرورت ہے۔افضل چیمہ نے متعدد بار ترامیم کیں،نئی تجاویز کے ساتھ بار بار بھیجا مگر ضیاالحق نے ہر بار اس کو واپس کر دیا۔افضل چیمہ نے انٹرویو میں اس بات کا اقرار کیا کہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ذوالفقار علی بھٹو کو اسلامی قانون قصاص و دیت کی موجودگی میں پھانسی نہیں دی جاسکتی تھی۔افضل چیمہ نے ڈاکٹر واسطی کے سامنے تسلیم کیا کہ وہ ضیاالحق سے اس طرح کی بددیانتی کی امید نہیں رکھتے تھے۔

مزید تعلیم کے لئے میری پولینڈ روانگی

چند روز بعد ہاشم خان نے مجھے آمادہ کیا کہ میں کچھ عرصے کے لئے ملک چھوڑ دوں۔ پولینڈ سے نیشنل اکنامک پلاننگ میں پوسٹ گریجوایشن کے لئے سکالرشپ آیا ہوا تھا۔ میں نے حامی بھرلی اور وارسا جانے کی تیاری شروع کردی۔ سرد جنگ کے اس زمانے میں سوشلسٹ ممالک کی تعلیم کو مغرب میں اور ان کے حاشیہ بردار پاکستان جیسے ممالک میں خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ وہاں سے حاصل کی گئی ڈگریوں کی مغرب میں کوئی وقعت نہیں تھی اور پھر ان ممالک سے واپسی کے بعد ایک مدت تک ایجنسیاں پیچھا کرتی رہتیں۔ چنانچہ پاکستان سے بہت کم افراد سوشلسٹ ممالک میں تعلیم کی غرض سے جاتے تھے۔

ڈگریاں تو میرے پاس تھیں مگر میں کچھ عرصے کے لئے اس ملکی منظرنامے سے جو کہ نہایت تکلیف دہ اور خوفناک تھا دور جانا چاہتا تھا۔ پاکستان سے وارسا کے لئے براہ راست کوئی پرواز نہیں تھی۔ میں نے فرینکفرٹ سے جہاز تبدیل کیا۔ پولش ایئرلائن LOT کے جہاز میں داخل ہوا تو نظر سیدھی کوپرنیکس کی تصویر پر پڑی۔ ان دنوں LOT کے ہر جہاز میں یہ تصویر پینٹنگ کے طور پر کندہ تھی۔ اندازہ ہوا کہ پولش قوم کو اپنے اس سائنس دان پر کتنا فخر ہے۔

نیکولا کوپرنیکس نے پہلی بار یہ ثابت کیا کہ سورج زمین کے گرد نہیں بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ زمین جامد نہیں ہے بلکہ اپنے axis پر یہ چوبیس گھنٹوں میں چکر مکمل کرتی ہے اور سورج کے گرد اپنے چکر کو سال بھر میں مکمل کرتی ہے۔ تمام سیارے اور ستارے بھی سورج کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ اس سے پہلے تک کا علم اور مذہبی عقیدہ یہ تھا کہ

زمین کائنات کا مرکز ہے اور جامد ہے اور تمام سیارے، ستارے، چاند اور سورج زمین کے گرد گھومتے ہیں۔ اس کی تحقیق نے سائنس کی دنیا میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا کی اور مذہب اور اس وقت کے علوم کے بارے میں انسانی رویہ بدلا۔ اس کی انقلابی تحقیق DE REVOLUTIONIBUS ORBIUM COELESTIUM, 1543ء کے ابتدائی مہینوں میں شائع ہوئی جبکہ اسی سال 24 مئی کو اس کا انتقال ہو گیا اور مذہب کے اجارہ داروں کو یہ موقع نہ مل سکا کہ وہ اس کو کافر اور ملحد قرار دے کر عدالت کے ذریعے یا کسی مذہبی جنونی کے ذریعے اس کا قتل کروا سکتے۔ جیسا کہ ماضی میں ہوتا چلا آیا تھا۔

کوپرنیکس کی پی ایچ ڈی تو CANON LAW پر تھی مگر وہ بہت بڑا ریاضی دان، علم نجوم اور فزکس کا ماہر، علم معاشیات کا ماہر، گورنر اور ڈپلومیٹ تھا۔ اس نے 1517ء میں QUANTITY THEORY OF MONEY پیش کی جس کو آج تک علم معاشیات میں ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

میرا وجود خوف اور جبر کی فضا سے باہر نکلا تو مثبت توانائی نے انگڑائی لی

پاکستان سے فرینکفرٹ اور اب وارسا کی جانب سفر۔ زمین، گاؤں، بستیاں، جھلملاتی روشنیاں، طرح طرح کے انسان، دنیا خوب پھیلی ہوئی نظر آئی۔ جزیرے، سمندر، پہاڑ اور وادیاں، شام کے گہرے سایوں میں ٹھہرا ہوا جہاز۔ مجھے ایسا لگا کہ باہر کے ان مناظر سے میرا ابھی ایک رشتہ ہے، میرا ایک وجود ہے جو اس اُڑان کے نیچے بھی قائم ہے۔

پرندوں کی خوشی اور آزادی، پھولوں کے کھلنے اور مرجھانے کا احساس، باغوں کی مہک ان سب کی تو ایک زبان ہے مگر جہاز کے اندر ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ پولش زبان جو کہ ایک الگ زبان ہے اس کا سیکھنا کس قدر ضروری ہوگا اور یہ اندازہ اس وقت یقین میں بدل گیا جب واندا (ہمارے کورس کی سیکرٹری) ایئرپورٹ سے لے کر مجھے میری لینڈ لیڈی کرسٹینا کے پاس چھوڑ گئی۔ کرسٹینا کو انگریزی کا ایک لفظ نہیں آتا تھا اور پولش میرے

فرشتوں کو بھی نہیں آتی تھی۔ایک دوروز اشاروں کی مضحکہ خیزیت میں گزرے تو کرسٹینا نے پولش انگلش، انگلش پولش ڈکشنری لاکر میرے کمرے میں رکھ دی۔ پڑھائی شروع ہونے میں ابھی چندروز باقی تھے۔میں نے جلد ہی وہ تمام الفاظ رٹ لئے جن کا روزمرہ استعمال ضروری تھا۔بچپن میں سکول میں جورٹا لگوانے کی مشق کروائی گئی تھی وہ یہاں پر خوب کام آئی۔لہجہ، تلفظ اور الفاظ کا برموقع استعمال زبان کے بولنے سے آتا ہے۔ چونکہ کلاس کے علاوہ کہیں بھی انگریزی کا استعمال نہیں تھا اس لئے زبان اور زبان کی تہذیب کو سمجھنا مجبوری بھی تھا اور ضرورت بھی۔لہٰذا جلد ہی ایک روانی سی آگئی۔

دنیا کی ہر زبان میں ایک وسعت ہے، گہرائی ہے، فکر ہے، علم ہے اور علم تو ایک سمندر ہے جس میں غوطہ لگانے کے لئے زبان کا سیکھنا ضروری ہے۔یوں بھی انسان اگر دنیا کا علم اور دوسرے معاشروں اور انسانوں کو جانے بغیر مرجائے تو کس قدر افسوس ناک ہے۔

وارسا میں پڑھائی شروع ہوگئی

ہمارے سکول کا نام SGP-I-S تھا۔

SZKOLA GLOWNA PLONOWANIA-I-STATYSTYKI

(CENTRAL SCHOOL OF PLANNING AND STATISTICS)

سوشلسٹ معاشی نظام کی دنیا میں اس سکول کا وہی مقام تھا جو سرمایہ دارانہ معاشی نظام کی دنیا میں لندن سکول آف اکنامکس کا ہے۔ایم ایس سی، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ہائر ایجوکیشن کا یہ سکول 1906ء میں وارسا سکول آف اکنامکس کے نام سے قائم ہوا۔1933ء میں اس کا نام تبدیل کر کے SZKOLA GLOWNA HANDLOWA (SGH) رکھا گیا۔دوسری عالمی جنگ کے بعد اس کا نام SGPIS تھا۔سوویت یونین کے ٹوٹ جانے کے بعد اس کا نام دوبارہ SGH رکھ دیا گیا۔

سکول کی عمارات پھیلی ہوئی تھیں۔ ہزاروں طالب علم تھے۔ ہماری کلاس کی عمارت راکوویسکا سٹریٹ پر واقع تھی۔بس اور ٹرام کے ذریعے یہاں تک پہنچنے کا کرایہ

پاکستانی آدھے پیسے سے بھی کم تھا اور کیفے ٹیریا میں کھانا بھی چند پیسوں کے برابر تھا۔ ہماری رہائش اور پڑھائی کا خرچہ پولش حکومت کے ذمے تھا اور روزمرہ کے اخراجات کے لئے جو سکالرشپ ملتا تھا وہ ایک طالب علم کی ضرورت سے زیادہ تھا۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس جو محدود سے ڈالر تھے وہ یہاں کے لحاظ سے بے پناہ تھے۔

ہماری کلاس میں شام، یمن، عراق، الجزائر، مصر، ایتھوپیا، سوڈان، تنزانیہ، گھانا سے آئے ہوئے طالب علم بھی تھے اور لاطینی امریکہ سے بھی۔ شام کے طالب علم مصریوں کو سانپ سے تشبیہ دیتے اور ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تو درکنار بات چیت کرنا بھی گوارا نہ کرتے۔ لاطینی امریکہ سے آئے ہوئے طالب علموں کی اکثریت کیوبا، چلی، میکسیکو اور ارجنٹائن سے تھی۔ پاکستان سے آنے والوں میں میرے علاوہ نیاز احمد اور شہزادو شیخ تھے۔ نیاز احمد بہاری تھے اور شہزادو شیخ صاحب کا تعلق لاڑکانہ سندھ سے تھا۔ شیخ صاحب کے ساتھ بہت جلد دوستی ہوگئی۔ ہمارے درمیان دوستی کا یہ رشتہ علمی اختلاف اور ہم آہنگی دونوں کے ساتھ ساتھ آج تک اپنی بھرپور محبتوں کے ساتھ قائم ہے۔

کراچی میں جماعت اسلامی کے رکن نے پولینڈ کے نائب وزیر خارجہ پر گاڑی چڑھا کر مار ڈالا تھا

میری لینڈ لیڈی اور پولش دوست جاننا چاہتے تھے کہ مذکورہ واقع میں پولینڈ کے نائب وزیر خارجہ کا قصور کیا تھا۔ پولینڈ میں دنیا کے دیگر ممالک کی طرح، پاکستان کو امریکہ کا دم چھلا سمجھا جاتا تھا اور انہیں یہ بھی یاد تھا کہ نومبر 1970ء میں کراچی ایئرپورٹ پر پولینڈ کے نائب وزیر خارجہ کو ایک کیٹرنگ وین چڑھا کر قتل کیا گیا تھا۔ اس حادثے میں پاکستانی انٹیلی جنس کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر اور نیوز ایجنسی پی پی آئی کا فوٹو گرافر بھی مارا گیا تھا۔ سوشلسٹ پولینڈ کے اس ''کافر'' کا قتل پی آئی اے میں ملازم جماعت اسلامی کے ایک رکن فیروز عبداللہ نے اسلام کو بچانے اور جنت کو حاصل کرنے کے لئے کیا تھا۔ مگر پولینڈ کے لوگوں کو ابھی تک یہ سمجھ نہیں آسکا تھا کہ ان کے اس نائب وزیر خارجہ کا قصور کیا تھا۔

پولینڈ میں قیام

کلاس کے پہلے روز ہر ایک نے اپنا اور اپنے ملک کا تعارف کروایا اور اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کیا۔ نیاز احمد مرحوم کی باری جلد آ گئی۔ انہوں نے امریکہ اور امریکی امداد کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا کر ہمارے لئے ایک عجیب و غریب صورت حال پیدا کر دی۔ جواباً لاطینی امریکہ کے طالب علموں نے امریکہ اور اس کے عالمی سامراجی کردار پر دھواں دار تقریریں کر ڈالیں۔ سب کے علم میں تھا کہ چلی میں الاندے اور پاکستان میں بھٹو صاحب کی منتخب حکومتوں کو کس طرح ختم کروا کر مارشل لگوایا گیا تھا۔ کمرے کی فضا کافی جذباتی اور بوجھل ہو گئی۔ بھلا ہو اس ترتیب کا کہ جس میں میری اور شیخ صاحب کی باری بعد میں آئی۔ مجھ پر اب یہ لازم تھا کہ اس تاثر کو ختم کروں جو نیاز احمد نے اپنی سادگی میں قائم تو نہیں کیا مگر اس تاثر پر تصدیق کی مہر لگا دی تھی جو پہلے سے پاکستان کے بارے میں موجود تھا۔ وہ زمانے سے بچھڑے ہوئے سیدھے سادھے سے ملازم پیشہ عمر رسیدہ انسان تھے۔

اس وقت کے پاکستان میں عوام کی اکثریت سیکولر تھی۔ سوشلزم کے حق میں ووٹ دے کر، امریکی سامراج مردہ باد اور ایشیا سرخ کے نعرے لگا کر عوام بھٹو صاحب کو اقتدار میں لائے تھے۔ پاکستان وہ نہیں تھا جو سمجھایا جا رہا تھا۔ چنانچہ مارکسزم، سوشلسٹ انقلاب اور عالمی طبقاتی جدوجہد پر میری جانب سے سنجیدہ گفتگو کا ہونا ضروری تھا جو کہ میں نے کی۔ شیخ صاحب نے پولینڈ کی تاریخ اور دوسری عالمی جنگ کے تناظر میں یورپ کے حالات کا احاطہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند روز بعد جب کلاس کی نمائندگی کرنے کے لئے چناؤ ہوا تو ہم نے

یہ الیکشن جیتا۔ ہمارے مقابلے میں ایتھوپیا تھا۔ دیگر تمام سوشلسٹ ممالک نے ہمیں ووٹ دیا۔ حتیٰ کہ مصر کے چھ ووٹ بھی ہمیں انہوں نے اس امید پر دیئے کہ آنے والی بقرعید پر ہم بکرا ذبح کروائیں گے۔ وہ اس حقیقت سے ناواقف تھے کہ یورپ میں بکرا تو کیا ایک چڑیا بھی آپ ذبح نہیں کر سکتے۔

اب حکومتی اداروں میں ملاقاتیں ہوں، مختلف شہروں کے دورے ہوں یا ملک بھر کی طالب علم تنظیموں کی جانب سے بلائی جانے والی مجالس ہوں شیخ صاحب اپنی مونچھوں پر مسلسل تاؤ دیتے ہوئے نپے تلے الفاظ میں کلاس کی نمائندگی کرنے لگے۔ ان کی مونچھیں ممتاز علی بھٹو کی مونچھوں کے ساتھ ملتی جلتی تھیں۔ مارکسزم پر گفتگو کے لئے مجھے آگے کیا جاتا۔ چند ہی دنوں میں پوری کلاس ہماری گرویدہ ہوگئی۔ نیاز صاحب نے بعد میں انکشاف کیا کہ انہیں منسٹری کی جانب سے یہ کہا گیا تھا کہ موقع ملنے پر وہ امریکہ کے حق میں اور سوشلزم کے خلاف گفتگو کریں۔ جس کا انہیں بعد میں افسوس رہا۔

دوسری عالمی جنگ میں پولینڈ پر اپنے قبضے کے دوران ہٹلر نے واقعتاً وارسا کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ یکم ستمبر 1939ء کو ہٹلر نے 15 لاکھ فوج پولینڈ میں داخل کی اور 1945ء میں اپنی شکست اور جنگ کے خاتمے تک نازی فوجیوں نے لاکھوں انسانوں کا قتل عام کیا۔ جب جنوری 1945ء میں سوویت یونین کی ریڈ آرمی وارسا میں داخل ہوئی تو یہ شہر انسانوں کے بغیر ایک مسمار شدہ کھنڈرات کا شہر تھا۔ نازی فوج نے وارسا کی ہر عمارت کو ڈائنامائٹ سے اڑا کر زمین بوس کر دیا تھا۔

ہٹلر کے بیگار کیمپ (Concentration Camps) دیکھ کر میں کئی ہفتے تک پریشان رہا

ADAM ZAMOYSKI کی کتاب کے مطابق جرمن فوج نے اپنے پولینڈ قبضے کے دوران جن چالیس لاکھ انسانوں کا قتل عام کیا ان میں ستائیس لاکھ صرف پولش یہودی تھے۔ ہٹلر نے پورے پولینڈ میں تقریباً دو ہزار بیگار کیمپ (Concentration

Camps) بنائے جہاں پر تمام یورپ کے یہودیوں کو لا کر اذیت دے کر مارا جاتا۔ ان میں سب سے بڑا کیمپ AUSCHWITZ تھا۔ جس کو محفوظ رکھا گیا ہے۔ یہاں پر انسانی ہڈیوں، کھوپڑیوں، جوتوں، بکسوں، بالوں وغیرہ کو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کی شکل میں شیشے کے کمروں میں سیاحوں کو ہٹلر کا ظلم دکھانے کے لئے نمائش کے طور پر سجایا گیا ہے۔ یہ تمام اذیت گاہیں، گیس چیمبرز، انسانوں کو بھوننے والی بھٹیاں ناخن اکھاڑنے والی مشینیں وغیرہ ہر ذی حس انسان کو متاثر کرتی ہیں۔ AUSCHWTIZ کے دورے کے بعد میں بھی ہفتوں پریشان رہا۔

ہٹلر کے خلاف جنگ تو سوویت یونین، امریکہ اور برطانیہ نے مل کر لڑی تھی مگر یہ سوویت یونین کی ریڈ آرمی تھی جس نے اصل میں اس جنگ کو فتح کیا، بالخصوص مشرقی یورپ اور وسطی یورپ کے وہ تمام ممالک آزاد کروائے جو ہٹلر کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ 1945ء میں جب ریڈ آرمی ان ممالک میں داخل ہوئی اور نازی جرمنی نے ہتھیار ڈالے تو سوویت یونین اور ریڈ آرمی کو عوام نے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ سٹالن ان کا ہیرو تھا۔ بعد میں ان ممالک میں سوشلسٹ حکومتیں قائم ہوئیں۔

یہ صورت حال امریکہ اور برطانیہ کے لئے ناقابل قبول تھی۔ چنانچہ اس وقت جبکہ جرمنی نے یورپ میں ہتھیار ڈال دیئے تھے اور جاپان اپنی شکست کے قریب تھا امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم برسا کر نہ صرف اپنے اتحادی سوویت یونین کو اس نئے ہتھیار سے مرعوب کرنا چاہا بلکہ دنیا کو یہ تاثر بھی دیا کہ دراصل جنگ امریکہ نے جیتی ہے اور اب دنیا کا انچارج امریکہ ہے۔

امریکہ اور برطانیہ دونوں نے اپنے اتحادی سوویت یونین کو ایٹمی ہتھیار کے بارے میں بالکل بے خبر رکھا۔ فروری 1945ء میں جب یالٹا میں روز ولٹ، چرچل اور سٹالن کے درمیان جنگ کے مستقبل کے لائحہ عمل کے بارے میں کانفرنس ہوئی، تب بھی سٹالن سے ایٹم بم کے راز کو خفیہ رکھا گیا۔ امریکہ، برطانیہ اور سوویت یونین کے سربراہوں کی دوبارہ ملاقات جولائی 1945ء میں برلن میں پوٹسڈم (POTSDAM) میں ہوئی جو

جرمنی کے ہتھیار ڈالنے کے بعد کی صورت حال کے بارے میں تھی۔ اس کانفرنس میں بھی سٹالن کو ایٹم بم سے بے خبر رکھا گیا۔

اس کانفرنس میں روزولٹ کی جگہ ہیری ٹرومین نے شرکت کی۔ اپریل 1945ء میں روزولٹ کی وفات کے بعد ہیری ٹرومین کو امریکہ کا صدر چنا گیا۔ ٹرومین سٹالن کے بھی خلاف تھا اور سوویت یونین کے بھی۔ اسی طرح برطانیہ کے وزیراعظم ونسٹن چرچل کی جگہ جب ایٹلی کو وزیراعظم بنایا گیا تو آدھی کانفرنس میں چرچل نے، بقایا کانفرنس میں ایٹلی نے شمولیت کی۔ 26/ جولائی 1945ء کو یہ کانفرنس ختم ہوئی اور 6/ اگست 1945ء کو امریکہ نے ہیروشیما پر اور 9/ اگست کو ناگاساکی پر ایٹم بم برسا کر لاکھوں انسانوں کو بھون ڈالا۔ امریکہ نے ایک عالمی سامراج کی جگہ لے لی۔ دنیا دو دنیاؤں میں تقسیم ہوگئی۔

5/ مارچ 1946ء کو ریاست میسوری میں FULTON میں ونسٹن چرچل نے وہ مشہور تقریر کی جس کو آہنی پردہ (IRON CURTAIN) کے نام سے جانا جاتا ہے اور سرد جنگ کی بنیاد تصور کی جاتی ہے۔ اس کی تقریر کا یہ حصہ نہایت اہم ہے۔ ''بالٹک میں سٹیٹن (STETTIN) سے لے کر ایڈریاٹک میں ٹریسٹے (TRIESTE) تک پورے براعظم پر ایک آہنی پردہ (IRON CURTAIN) لٹک گیا ہے جس کے پیچھے مشرقی اور وسطی یورپ کی قدیم ریاستوں کے دارلخلافے ہیں۔ وارسا، برلن، پراگ، وی آنا، بوڈاپسٹ، بلغراد، بخارسٹ اور صوفیہ۔ یہ تمام مشہور شہر اور ان کے گرد کی آبادیاں نہ صرف سوویت اثر میں ہیں بلکہ ماسکو کا ان پر قبضہ بڑھتا جارہا ہے۔'' ان دنوں چرچل مختلف ممالک میں لیکچرز دے کر سوشلزم اور سوویت یونین کے خلاف لوگوں کو بھڑکا رہا تھا۔

مغربی یورپ امریکہ کے زیر اثر تھا اور مشرقی اور وسطی یورپ سوویت یونین کے زیر اثر۔ یہ دونوں دنیائیں سرد جنگ میں داخل ہوگئیں۔ وہ ایٹم بم جس کی طاقت کا مظاہرہ امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم گرا کر سوویت یونین کو اپنے ماتحت رکھنے کے لئے کیا تھا، 1949ء میں سوویت یونین نے بھی اس ایٹم بم کو حاصل کرلیا اور دنیا میں ایک طرح سے طاقت کا توازن قائم ہوگیا۔ پھر دونوں نے ہائیڈروجن بنا لئے۔ اب ایک طرف وارسا پیکٹ

تھااور دوسری طرف نیٹو، ایک طرف سوشلزم تھااور دوسری طرف سرمایہ دارانہ معاشی نظام۔

1949ء میں چین میں بھی سوشلسٹ انقلاب برپا ہوگیا۔ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کے علمبرداروں کو اب ایک بہت بڑے سوشلسٹ بلاک کا سامنا تھا۔ امریکہ کی سربراہی میں سوویت یونین، سٹالن، سوشلزم اور ماؤزے تنگ کے خلاف سازشوں اور پروپیگنڈا کا محاذ کھل گیا۔ دنیا بھر کے مذہب فروش اور وطن فروش، سامراج کی جیب میں تھے اور اُن سب کی جیب میں امریکی ڈالر تھے۔ سعودی عرب کے ریال بعد میں داخل ہوئے۔ یہ سب کے سب اپنے اپنے مذہب اور ملک کو سوشلزم سے بچانے میں مصروف ہوگئے۔ معصوم انسانوں کو سمجھایا جانے لگا کہ ان کے دین کو سوشلزم سے خطرہ ہے۔ سوشلسٹ خدا کو نہیں مانتے وغیرہ وغیرہ۔ سوشلزم سے مذہبی آزادیوں کو، شخصی آزادیوں کو، جمہوریت کو خطرہ ہے۔ اصل میں خطرہ سرمایہ دارانہ نظام کو تھا۔ سوشلسٹ کافر، ملحد اور قابل گردن زدنی قرار دیئے جانے لگے۔ دانشوروں نے سٹالن کی مخالفت میں اور ٹراٹسکی کے حق میں بحث چھیڑ لی۔ وہ سٹالن جس نے دنیا کو نازی ازم اور فاشزم سے بچایا تھا اس کو ایک ظالم ڈکیٹر کے طور پر پیش کیا جانے لگا اور سٹالن ازم کی اصطلاح گھڑ لی گئی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب پاکستان کے وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان نے سوویت یونین کی دعوت کو ٹھکرا کر امریکہ جانا پسند فرمایا اور پاکستان کو امریکہ کی گود میں ڈال دیا۔ بھارت کے وزیراعظم جواہر لعل نہرو نے اگرچہ بھارت کو سوویت یونین کے ساتھ منسلک کیا مگر اس نے مغرب اور امریکہ کے ساتھ تاک جھانک کی کھڑکی کو بھی کھلا رکھا۔ سٹالن نے کبھی نہرو پر اعتبار نہیں کیا۔

جنگ کے بعد نئے وارسا نے نہایت اطمینان اور آسائش کے ساتھ جنم لیا۔ سوشلزم نے عوام کو بہت کچھ دیا

جنگ کے خاتمے کے بعد سٹالن نے 21 رکنی عبوری حکومت پولینڈ میں قائم کی جس کا وزیراعظم EDWARD OSOBKA MORAWSKI تھا۔ برطانیہ میں فوراً ہی ایک پولش گروپ تشکیل دیا گیا جس نے اس عبوری حکومت کی مخالفت شروع کر

دی۔ جنوری 1947ء میں پولینڈ میں انتخابات ہوئے جس میں پولش ورکرز پارٹی جیتی۔ اس کو سوویت یونین کی حمایت حاصل تھی جبکہ امریکہ اور برطانیہ نے مخالف پارٹی PSL کی پشت پر ہاتھ رکھا۔

پولینڈ نے دیگر سوشلسٹ ممالک کی طرح مرکزی معاشی منصوبہ بندی کو اپنایا۔ اس کا جی ڈی پی 7 فی صد تک بڑھ گیا۔ 5/ مارچ 1953ء کو سٹالن کی وفات کے بعد جب سوویت یونین نے ترمیم پسندی اور پھر توسیع پسندی کا راستہ اختیار کیا، سوشلسٹ پارٹیاں بیوروکریسی میں تبدیل ہوئیں تو ترقی کی رفتار کم ہوگئی اور پھر رک کر افراتفری کا شکار ہوگئی۔ پارٹیوں سے فاش غلطیاں ہونے لگیں۔ ایسی فضا بنتی گئی کہ مغرب کا پروپیگنڈا عوام کے دلوں میں راستہ بنانے لگا۔

1945ء کے بعد نئے وارسا نے نہایت اطمینان اور آسائش کے ساتھ جنم لیا۔ خاموش نبض کی طرح سست رفتار بہتے دریائے VISLULA کے اُس پار پرانا وارسا آباد ہے۔ میں جہاں رہتا تھا یہ دریا کے ادھر نئے وارسا کے مضافات میں ایک نئی نیم خوابیدہ آبادی تھی۔ اس کا نام سدیا فوزی تھا۔ نئے فلیٹس تھے اور گھر تھے جو لوگوں کو مرتبے یا عہدے کے اعتبار سے نہیں بلکہ ضرورت کے اعتبار سے دیئے گئے تھے۔ میری لینڈلیڈی کرسٹینا TV ڈائریکٹر کی سیکرٹری تھی۔ اس کو دو بیڈ کا فلیٹ اس لئے ملا تھا کہ اس کا ایک بچہ تھا جبکہ اس کا ڈائریکٹر غیر شادی شدہ اور اکیلا تھا تو اس کو ایک بیڈروم کا فلیٹ مہیا کیا گیا تھا۔ TO EACH ACCORDING TO NEED سوشلزم کے بنیادی اصول کا یہ عملی اطلاق تھا۔

فلیٹس اور گھر حکومت کی ملکیت تھے مگر لوگوں کو فلیٹس اور گھر خریدنے کی اجازت تھی۔ مغربی پروپیگنڈے کے برعکس ذاتی ملکیت کا تصور پولینڈ کے معاشی نظام میں موجود تھا جو گھروں، فلیٹس، چھوٹی چھوٹی دکانوں اور کاروں کی حد تک محدود تھا۔ چھوٹے کاروبار کی بھی اجازت تھی۔ زراعت کوآپریٹو فارمنگ کے ذریعے تھی۔ صنعت اور دیگر ذرائع پیداوار حکومت کی ملکیت تھے اور تقسیم پیداوار بھی حکومت کی ذمہ داری تھی۔ خوراک اور لباس کی

قیمتیں Subsidised تھیں۔ بسوں اور ٹرام کا کرایہ نہ ہونے کے برابر تھا۔

ملک میں سو فی صد ایمپلائمنٹ تھی۔ صلاحیت کے مطابق روزگار فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری تھی۔ ملازمت کرنے کی عمر کے تمام مرد اور عورتیں معاشرے کے پیداواری عمل میں بالواسطہ یا بلاواسطہ شامل تھے۔ وہ افراد جو پیداواری عمل میں براہ راست شامل تھے مثلاً کارخانوں وغیرہ میں کام کرنے والے افراد، اُن کی تنخواہیں ان افراد سے زیادہ تھیں جو غیر پیداواری شعبوں میں کام کرتے تھے۔ مثلاً پولیس، تعلیم، ہسپتال، فوج وغیرہ۔ فوج کا بریگیڈیر ہو، یونیورسٹی کا پروفیسر، وزیر یا کلرک اکثر بسوں میں سفر کرتے نظر آتے۔ کاروں کی ورائٹی نہیں تھی۔ Fiat کار کی صرف دو قسمیں تھیں ایک چھوٹی Fiat اور ایک ذرا بڑی Fiat۔ یہ کاریں انسانوں کی ضرورت کے لئے تھیں۔ ایک دوسرے کو مرعوب کرنے کے لئے نہیں تھیں۔

ایک روز ہم نے ڈپٹی چیئرمین پلاننگ کمیشن کو جو کہ وزیر تھا، اپنے یہاں لیکچر کے لئے مدعو کیا۔ میں اس کا استقبال کرنے کے لئے نیچے کھڑا تھا کہ واندا مجھے ڈھونڈھتی ہوئی، بلانے کے لئے آئی کیونکہ لیکچر شروع ہو چکا تھا۔ نہ کوئی جھنڈے والی کار، نہ ہی کوئی گن مین، نہ ہی کوئی ڈرائیور اور نہ ہی آگے پیچھے کوئی سیکیورٹی۔ وزیر موصوف جو پروفیسر رہ چکے تھے، بس کے ذریعے آئے، اپنے اوورکوٹ اور مفلر کو کھونٹی پر ٹانگا، کلاس میں لیکچر دیا اور واپس۔ نہ کوئی بھاری بھرکم چائے اور نہ ہی کوئی زوردار کھانا۔ سادہ معاشرہ تھا۔ سب سہولتیں میسر تھیں۔ البتہ مغرب جیسی چمک دمک نہیں تھی۔

تعلیمی اور ثقافتی مصروفیات کی آندھی میں میرا وقت گزر رہا تھا۔ پاکستان کے حالات پریشان کن تھے۔ بھٹو صاحب کا کیس سپریم کورٹ میں چل رہا تھا۔ جس کی خبریں شمیم رضا سے ملتی رہتیں۔ وہ چارج ڈی افیئر حسن سرمد کے سیکرٹری تھے۔ پولینڈ میں پاکستان کا سفارت خانہ نہیں تھا بلکہ چانسری تھی۔ شمیم رضا بہت ملنسار اور مہمان نواز انسان تھے۔ میرے گھر کے قریب ہی رہتے تھے۔ ہفتے میں کم از کم ایک بار ضرور وہ اپنے یہاں لے جا کر اپنے ہاتھ کا پکا ہوا پاکستانی کھانا کھلاتے۔ حبیب ولی محمد کے گانے سنتے اور اپنی ہونے

والی بیگم کی تصویر تکیے کے نیچے رکھتے اور سو جاتے۔

وارسا الف لیلوی فضاؤں سے بھرپور تھا۔ کوہ قاف کی پریاں تھیں مگر نہ تو کوئی جن تھا اور نہ ہی شہزادے۔ پولینڈ کی حکومت نے صرف ایک بار سعودی شہزادوں پر اپنے یہاں سیاحت کے دروازے کھولے۔ وہ چارٹرڈ جہازوں میں آئے اور پولینڈ کی لڑکیوں کو حاملہ کر کے چلے گئے۔ سعودی شہزادوں کے ان کرتوتوں کے بعد پولینڈ نے ان پر ہمیشہ کے لئے دروازے بند کر دیئے جو سوویت یونین ٹوٹنے تک بند رہے۔ البتہ سوشلسٹ اور مہذب عرب ممالک کے ساتھ پولینڈ کی دوستی تھی۔ ان ممالک سے ایکسچینج پروگرام کے تحت طالب علم بھی آتے تھے، پروفیسرز، انجینئرز اور ڈاکٹر بھی۔ کاروباری حضرات کا آنا جانا بھی لگا رہتا۔ پوژنان میں ہر سال عالمی صنعتی نمائش لگائی جاتی جس میں دنیا بھر کے نمائندے شرکت کے لئے آتے۔

پولینڈ کی 98 فی صد آبادی کیتھولک تھی۔ چرچ عبادت کے لئے تھے، سیاست کے لئے نہیں۔ یہ وہ پابندی تھی جس پر پوری دنیا میں شور مچایا جاتا تھا کہ مذہبی آزادیاں نہیں ہیں۔ مذہبی آزادی تھی مگر مذہب کے نام پر عوام کے جذبات سے کھیلنے کی مذہبی آزادیاں نہیں تھیں۔ وہ تمام مذہبی مُلّا جو امریکہ کے حاشیہ بردار تھے اور آج مزاروں کو مسمار کرتے ہیں، مسجدوں اور امام بارگاہوں کو بموں سے اڑواتے ہیں، یہ جھوٹا پروپیگنڈا کرتے تھے کہ سوشلسٹ ممالک میں مسجدوں کو مسمار کر دیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگر ایسا ہوتا تو سوویت یونین ٹوٹنے کے بعد یہ مسجدیں اچانک کہاں سے نمودار ہو گئیں جہاں پر آج یہ ''مبلغ'' کمر پر پٹھو باندھ کر، لوٹے لٹکا کر، تبلیغ کے بہانے جاتے ہیں اور چیچن وغیرہ سے دہشت گرد بھرتی کرتے ہیں۔ مذہب کے یہی ٹھیکیدار فیس بک پر فخریہ تصویر ڈال کر لکھتے ہیں۔ ''یہ خوبصورت مسجد روس کے دارالخلافہ ماسکو میں واقع ہے۔'' سوشلزم کے دور میں انہیں یہ مسجدیں نظر نہیں آتی تھیں۔

مذہب عبادت کا تعین کرتا تھا، معیشت اور سیاست کا نہیں۔ مگر حکومت مخالفین اور

سوویت یونین کے خلاف زیرزمین کام کرنے والے گروہوں کو چرچ ہر طرح کی مدد مہیا کرتا۔

سال میں ایک بار پولینڈ کے قبرستان روشنیوں سے جگمگا اٹھتے

سال میں ایک بار پولینڈ کے قبرستان روشنیوں سے جگمگا اٹھتے ہیں۔ ہر شخص اپنے بزرگوں کی قبروں، قومی ہیروز کی یادگاروں پر جا کر پھول چڑھاتا ہے۔ قبروں کو صاف کرتا ہے اور موم بتیاں روشن کرتا ہے۔ فضا دھوئیں کے بادلوں سے اٹ جاتی ہے۔ دور دور تک روشنی کے الاؤ نظر آتے ہیں۔ یہ قومی تہوار ہے جس دن پورے پولینڈ میں چھٹی ہوتی ہے۔ لوگ سینٹس (Saints) یعنی صوفیوں کے مقبروں پر بیٹھ کر عبادت کرتے اور اپنی محنت، کشادگیٔ رزق اور خوشحالی کی دعائیں مانگتے۔ ان کے یہاں ابھی تک عیسائی سلفی پیدا نہیں ہوئے جو ان سینٹس کے مقبروں کی بے حرمتی کریں یا بم سے اُڑائیں اور نہ ہی سعودی عرب کے حکمرانوں اور سلفیوں نے اس طرف ''توجہ'' دی ہے۔

میں کرسٹینا کے ساتھ اس کی ماں کی قبر پر پھول چڑھا کر، موم بتیاں جلا کر واپس لوٹا اور آ کر اپنے کمرے کی کھڑکی کھولی تو گویا کرسٹینا کو بجلی کا ایک کرنٹ سا لگا۔ اس نے بھاگ کر کھڑکی کو بند کیا۔ چونکہ آج کی رات تمام مرنے والوں کی روحوں کو آزاد کیا جاتا ہے اس کو یہ خوف تھا کہ کہیں کوئی بری روح کھڑکی کے راستے گھر میں اگر داخل ہوگئی تو سارا سال مشکل اور پریشانی میں گزرے گا۔ اسی طرح ایک روز ہم ہفتہ وار شاپنگ کے لئے گھر سے نکلے تو کالی بلی نے ہمارا راستہ کاٹ دیا۔ کرسٹینا ہمیں واپس گھر لے آئی۔ اس کے خیال میں اب ہمیں نہ صرف دکانوں سے اشیا نہ ملتیں بلکہ کوئی منحوس واقعہ بھی پیش آسکتا تھا۔ مجھے اپنی اماں یاد آگئیں۔

یہ وہ خدا پرست اور توہم پرست معاشرہ تھا جس کے بارے میں ہمارا مذہب فروش مُلّا گلا پھاڑ پھاڑ کر خطبے دیتا تھا کہ سوشلسٹ خدا پر یقین نہیں رکھتے اور قابل گردن زدنی ہیں۔ اس زمانے میں اس کے نزدیک سوشلسٹ قابل گردن زدنی تھے، اب اس کے نزدیک بریلوی، شیعہ، سنی، ہندو، عیسائی سب کے سب قابل گردن زدنی ہیں۔

پورے پولینڈ میں خوبصورت چرچ تھے۔ کراکوو پولینڈ کا پہلا دارالخلافہ تھا۔ وارسا بعد میں دارالخلافہ بنا۔ ہم اس تاریخی شہر کی سیر کے لئے گئے تو اس چرچ میں بھی گئے جس میں جان پال پوپ منتخب ہونے سے پہلے 1958ء سے 1978ء تک پہلے بشپ اور پھر آرچ بشپ رہا تھا۔ اکتوبر 1978ء میں ایک خاص مقصد کے تحت اس کو پوپ منتخب کر کے پولینڈ کے عوام کا مغرب کے ساتھ ایک مذہبی تعلق بنایا گیا۔ پوپ سوویت یونین کے بھی خلاف تھا اور سوشلزم کے بھی۔ پولینڈ کی حکومت سوویت یونین کی نمائندگی کرتی تھی۔ چنانچہ حکومت کے خلاف جب مزدور رہنما لیخ والینسا Leck Walesa نے زیرزمین کام شروع کیا تو جان پال کی اس کو حمایت اور سرپرستی حاصل تھی۔ مغرب میں جان پال کو دنیا کا سب سے زیادہ مؤثر پوپ سمجھا جاتا ہے جس نے کیمونزم کے خاتمے میں مغرب کی مدد کی۔ پوپ جان پال اور سالیڈیریٹی کا لیخ والینسا دونوں ہی مغرب کے لئے کام کر رہے تھے۔

پولینڈ میں جب اشیا کی قیمتیں بڑھتیں تو ہڑتالیں شروع ہو جاتیں۔ حکومت قیمتوں پر قابو پاتی تو ہڑتالیں ختم ہو جاتیں۔ ساٹھ کی دہائی میں جب گوشت کی قیمتیں بڑھیں تو بڑے پیمانے پر مظاہروں کا سلسلہ چل نکلا۔ یہ احتجاج اتنے زوروں سے ہوئے کہ سوویت یونین کے لیونارڈ بریژنیف کی مرضی سے پولینڈ کی سربراہ حکومت GOMULKA اور پارٹی کی دیگر قیادت کو ہٹایا گیا اور ایڈورڈ گیرک کو حکومت دی گئی۔

گڈانسک میں لیخ والینسا کے ساتھ ملاقات

ہمارے زمانہ طالب علمی میں گیرک اقتدار میں تھا۔ ان دنوں ٹریڈ یونین لیڈر لیخ والینسا حکومت کے خلاف زیرزمین کام کر رہا تھا۔ ایک دن ہم والینسا سے ملاقات کے لئے گڈانسک پہنچ گئے۔ اس کے ساتھ ملاقات کے بعد وہ لٹریچر جو میں اپنے ساتھ لے کر آیا جب کرسٹینا نے دیکھا تو مجھے فوراً گھر سے نکل جانے کا فیصلہ سنا دیا۔ کرسٹینا نہ صرف حکومتی پارٹی کی ممبر تھی بلکہ والینسا کو غیرملکی ایجنٹ سمجھتی تھی۔ اس وعدہ پر کہ آئندہ میں اس سے کبھی نہیں ملوں گا مجھے گھر میں رہنے کی اجازت مل گئی۔

عوام سوویت یونین کے تسلط کے خلاف تھے، سوشلزم کے خلاف نہیں تھے

پولینڈ کے عوام کی اکثریت سوویت یونین کے تسلط کے خلاف تھی، سوشلزم کے خلاف نہیں تھی۔ وہ اپنی معاشی مشکلات کا ذمہ دار سوویت یونین کو ٹھہراتے تھے۔ اس کی معقول وجہ بھی تھی۔ مثلاً پولینڈ کا پیدا کردہ گوشت نہ صرف معیار میں اچھا تھا بلکہ مقدار میں بھی بڑے پیمانے پر پیدا کیا جاتا تھا جو کہ سوویت یونین معمولی روبل کے عوض اٹھا کر لے جاتا۔ دیگر اشیا خوردنی مثلاً آلو، چینی وغیرہ کا بھی یہی حال تھا۔ نتیجتاً اشیا خورد و نوش کی قیمتیں بڑھ جاتیں اور عوام سڑکوں پر نکل آتے۔ مگر ان بڑھتی ہوئی قیمتوں کے باوجود لوگ اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ جمع کرنے کی حیثیت میں تھے۔ اس رقم کو وہ ہالیڈے کرنے، نیا ٹی وی یا فرج خریدنے کی مد میں صرف کرتے۔ کرسٹینا کے گھر میں آسائش کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ کھلا خرچ کرنے کے بعد بھی وہ اپنی آدھی تنخواہ بچا لیتی تھی۔

پولینڈ میں قیام اور تعلیم اپنی جگہ پر ایک بہت بڑا تجربہ تھا۔ بالخصوص مجھ جیسے شخص کے لئے جو سوویت یونین کو سوشل سامراج سمجھتا اور لکھتا رہا تھا، یہ وہ تجربہ تھا جو کتابوں کے ذریعے نہیں بلکہ یہاں رہ کر ہی حاصل ہو سکتا تھا۔ پیر سے جمعہ تک سب لوگ بے پناہ کام کرتے۔ ہفتے کی رات سب کے لئے موسیقی، رقص، بیئر، وائن اور ووڈکا کی رات ہوتی۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں کلبوں میں اور ان کے والدین گھروں میں رات گئے تک باتیں کرتے، موسیقی سنتے، رقص کرتے اور شراب پیتے۔ کلبوں میں اس قدر ہجوم ہوتا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی۔ رات کے دو بجے کے بعد بونی ایم کا گانا راؤ راؤ راسپوٹین سب کو پاگل کرنے کے لئے کافی ہوتا۔ اس گانے پر اشتراکی ممالک میں بظاہر پابندی تھی مگر رات کو دیر گئے ڈی جے اس گانے کو خاموشی سے لگا دیتا اور سارا فلور ناچ اٹھتا۔

زار روس اور راسپوٹین کے خلاف سوشلسٹ انقلاب برپا کرنے والے، مغرب کی تخلیق کردہ اس پاگل کر دینے والی دھن پر، راسپوٹین کی جنسی تعریف میں لکھے گئے اس

گانے پر گھنٹوں ناچتے رہتے۔ پولینڈ بجائے خود موسیقی، ڈرامہ اور فلم میں مغرب سے کہیں آگے تھا مگر مغربی فلموں میں دکھائی جانے والی چمک دمک، رنگ برنگے لباس، بڑی بڑی گاڑیاں، گھر اور اس طرح کی موسیقی، اشتراکی دنیا کے حسرت زدہ نوجوانوں کو سرمایہ دارانہ نظام اور دنیا سے مرعوب کرنے کے لئے کافی تھی۔ وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ مغرب کے معاشی نظام کو اپنا کر ان سب کو بڑی بڑی گاڑیاں، رنگ برنگے لباس، بڑے بڑے گھر، پر تعیش زندگی اور وہ سب کچھ مل جائے گا جو انہیں انگریزی فلموں میں نظر آتا ہے۔ انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کھیل میں ان کے پاس وہ بھی نہیں رہے گا جو اس وقت انہیں میسر ہے۔ وہ دنیا کو مغرب کی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ مغرب کے کانوں سے سن رہے تھے۔ مغرب کی دھنوں پر رقص کرتے ہوئے سمجھ رہے تھے کہ ساری کائنات مدہوش ہو کر ان کے ساتھ ناچ رہی ہے۔ مستقبل ان کے سرمایہ دار بننے کا مستقبل ہے۔ مگر مستقبل تو عالمی سامراج اپنے لئے بنا رہا تھا۔ ان اشتراکی معاشروں میں اکھاڑ پچھاڑ کے پیچھے اس کے اپنے چھپے ہوئے مقاصد تھے۔

کلب کے اندر ایسا لگتا کہ پریاں پہاڑوں پر سے اتر آئی ہیں۔ بادلوں میں سے گزر کر صاف اور شفاف، چاند کی کرنوں پر ناچتی ہوئی، چاہے اور چاہے جانے کی خواہش لئے۔ ان کے نقرئی قہقہوں سے بدن میں ایک بجلی سی کوند جاتی۔ جب ہم رات کے اختتام پر کلب سے باہر نکلتے تو برف کی چاندنی میں وہ تانبے کی گرم لو کی طرح دہک رہی ہوتیں۔ اُن کا حسن اور اپنے اندر کی بے سکونی کا سکون پورا ہفتہ بے چین کئے رکھتا۔

جاڑوں میں قہر کی سردی پڑتی۔ منفی 20 اور تیس درجہ حرارت میں ایسا لگتا کہ منہ سے نکلے ہوئے الفاظ بھی جم جائیں گے۔ دن بھر قدم قدم پر بکنے والی چائے اور کافی کی خوشبو فضا میں سمائے رہتی۔ جمعہ اور ہفتے کی رات کے علاوہ لوگ سر شام ہی گھروں میں بند ہو جاتے۔ سڑکوں پر کپکپاتی روشنی اور بکھراس خاموشی میں کبھی کبھار جب میں دیر سے لوٹتا تو کرسٹینا کو اچھا نہ لگتا۔ اس نے اور اس کے بیٹے ماریوش نے علی الصبح اٹھنا ہوتا تھا جبکہ میں ابھی سو رہا ہوتا۔

چھوٹے شہروں کی جانب جب کبھی میرا جانا ہوتا تو لوگ ایک بار رک کر غور سے ضرور دیکھتے۔ ان میں سے اکثر نے کالے بالوں، کالی آنکھوں اور گندمی رنگ والے شخص کو

پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آہنی پردہ (Iron Curtain) کی وجہ سے نہ تو وہ باہر کی دنیا سے واقف تھے اور نہ ہی باہر کی دنیا کا عام آدمی ان کی حقیقی دنیا سے واقف تھا۔ وہ مجھے چھو کر یقین کرتے کہ وہ جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ ایک حقیقت ہے۔ عباس تابش کے ایک شعر کے مصداق کہ

کیوں نہ اے شخص تجھے ہاتھ لگا کر دیکھوں
تُو میرے وہم سے بڑھ کر بھی تو ہو سکتا ہے

ان کے چہروں پر تجسس اور آنکھوں میں محبت اور پسندیدگی کی چمک ہوتی۔

جب کبھی سائبیریا کی جانب سے برف کی آندھی بلکہ جھکڑ چلتے تو پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے۔ سب لوگ گھروں میں دبک کر بیٹھ جاتے۔ دور پرانے گھروں کی چمنیوں سے اوپر اٹھتی ہوئی باریک، پرسکون اور بھیگی لکیریں بہت خوبصورت لگتیں۔

اس سال تو اتنی برف باری ہوئی کہ پانچ پانچ فٹ کی دیواریں بن گئیں۔ بجلی، پانی، گیس اور ٹیلیفون کا نظام معطل ہو کر رہ گیا۔ کئی روز لوگوں نے کمبلوں، لحافوں کی گرمی اور موم بتی کی روشنی میں بیٹھ کر گزارے۔ پچھلی کئی دہائیوں سے ایسی برف باری نہیں ہوئی تھی۔ نہ صرف پولینڈ بلکہ پورا یورپ برف کی لپیٹ میں تھا۔ انگلش چینل برف سے ڈھک گئی۔ جہاز اور فیریز رک گئیں۔ ریل گاڑیاں کھڑی ہو گئیں۔ آمدورفت کے راستے بند ہو گئے۔ کرسمس کی چھٹیاں تھیں اور میں لندن میں تھا۔ شیخ صاحب اپنے مصری دوستوں کے ہمراہ یورپ کی سیر کو نکلے ہوئے تھے۔ مجھے نیاز صاحب کی فکر تھی۔

وہ نہایت سادہ انسان تھے۔ ایک روز وہ پوچھ بیٹھے کہ پاکستان خط بھیجنے کے لئے لال رنگ کا لیٹر بکس استعمال کروں یا سبز رنگ کا۔ لال رنگ کا لیٹر بکس ملک سے باہر جانے والی ڈاک کے لئے تھا۔ جبکہ سبز رنگ کا لیٹر بکس مقامی ڈاک کے لئے تھا۔ یہ دونوں ساتھ ساتھ نصب ہوتے تھے۔ ہم نے انہیں مذاق سے کہا کہ آج کل کمپیوٹر نے بہت ترقی کر لی ہے آپ خط لال بکس میں ڈالیں اور لفافہ سبز بکس میں۔ کمپیوٹر خود بخود دونوں کو ملا کر آپ کے خط کو پاکستان بھیج دے گا۔ انہوں نے یقین کیا یا نہیں مگر وہ ہمیشہ یہ گلا کرتے رہے کہ ہمارا وہ

خط پاکستان نہیں پہنچا۔ وہ اپنے کسی بہاری چکر سے پولینڈ تک پہنچ گئے تھے مگر انہیں انگلی پکڑ کر چلانا پڑتا تھا۔

میں جب واپس پہنچا تو نیاز صاحب خیریت سے تھے۔ البتہ کرسٹینا بیسا کھیوں پر تھی۔ وہ ایک روز برف سے پھسلی اور اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اس نے کئی مہینے نہایت تکلیف میں گزارے۔ برف تھی کہ پگھلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے برف نے سارے ملک کو ہمیشہ کے لئے نگل لیا ہو۔ خدا خدا کر کے موسم کھلا۔ بہار نے بمشکل، ڈرتے ڈرتے اپنی آمد کا اعلان کیا۔ یہ ہمارا آخری سمسٹر تھا۔

پاکستان واپسی

پڑھائی کا وقت مکمل ہونے کو تھا۔ اب تک پولینڈ کے چھوٹے بڑے شہر، مشرقی یورپ کے مختلف ممالک اور روس کی سیر ہو چکی تھی۔ چھٹیوں میں جرمنی، فرانس اور لندن کے چکر بھی لگ چکے تھے۔ اب امتحان اور واپسی کی تیاریاں تھیں۔ تھیسس (Thesis) مکمل ہوا۔ امتحانات کا نتیجہ آیا۔ سکول کی الوداعی تقریب میں اسناد تقسیم ہوئیں۔ ہم نے امتیازی درجے کے ساتھ امتحان پاس کئے۔ اب دن میں خریداری ہوتی اور شام میں ہنگامہ خیز الوداعی محفلیں، آنکھوں میں ٹھنڈا سا دھندلکا، ناچتے آنسوؤں کے جگمگاتے قطرے، لوٹ کر آنے اور آئندہ رابطے میں رہنے کے وعدے۔ شامیں غمگین اور بوجھل ہو جاتیں۔ بالآخر محبتوں اور حسین یادوں کا سمندر اپنے اندر سمیٹے، غم و خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ہم پاکستان روانہ ہو گئے۔

لیخ والینسا کی 'سالیڈیریٹی'

ہمارے واپس آنے کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد پولینڈ میں ایک بار پھر ہڑتالوں کا لامتناہی سلسلہ چل نکلا۔ بالخصوص گڈانسک اور SZEZEECIN کے شپ یارڈ میں والینسا کی قیادت میں زوردار مظاہرے ہوئے۔

لیخ والینسا گڈانسک کے لینن شپ یارڈ میں الیکٹریشن کے طور پر کام کرتا تھا۔

ابتدا میں وہ حکمران پارٹی کی افسر شاہی کے خلاف تھا، اشتراکیت کے خلاف نہیں تھا۔ جب ہماری اس سے ملاقات ہوئی تو وہ حکومت کے خلاف زیرزمین تنظیم FREE TRADE UNION OF COAST میں سرگرم عمل تھا۔ پھر کبھی جیل میں اور کبھی جیل سے باہر، حکومت کے خلاف مظاہروں میں اس کا قد بڑھتا گیا۔ جب ٹریڈ یونین تنظیم سالیڈیریٹی قائم ہوئی تو وہ اس کا چیئرمین بنایا گیا۔ اس نے لینن شپ یارڈ کے مزدوروں کو ہڑتال کرنے کا حق لے کر دیا۔ اس کی طاقت اور مظاہرے یہاں تک بڑھے کے گیرک کو والینسا کے ساتھ معاہدہ کر کے سالیڈیریٹی کو قانونی حیثیت دینی پڑی۔ گیرک کو اس کے نتیجے میں جانا پڑا۔ اس کی جگہ KANIA کو لایا گیا اور پھر جنرل JARUZELSKI نے ملک میں مارشل لا لگا کر گیرک کو بھی اور والینسا کو بھی جیل میں ڈال دیا۔

1983ء میں والینسا ابھی قید میں تھا کہ اسے نوبل امن انعام دیا گیا جو اس کی بیوی DANUTA نے وصول کیا۔ مغرب نے ٹی وی شوز اور اخبارات کے ذریعے اس کو عالمی شہرت کے معراج پر پہنچا دیا۔ TONY JUDT کی کتاب POSTWAR -A HISTORY OF EUROPE SINCE 1945 کے صفحہ 589 کے مطابق امریکہ نے سالیڈیریٹی اور والینسا پر پچاس ملین ڈالر خرچ کئے۔ اپنے اس عروج کے زمانے میں سالیڈیرٹی کے ممبران کی تعداد ایک کروڑ تک پہنچ گئی۔ جبکہ پولینڈ کی کل آبادی چار کروڑ تھی۔ یعنی ملک کی ایک چوتھائی آبادی سالیڈیریٹی کی ممبر تھی۔ اب والینسا کو کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ ان دنوں سوویت یونین گھٹنوں گھٹنوں تک افغانستان میں پھنسا ہوا تھا۔

سوویت یونین ٹوٹا۔ مشرقی یورپ کے حصے بخرے ہوئے تو والینسا کو 1990ء سے 1995ء تک پولینڈ کا صدر بنایا گیا۔ ملک کرپشن اور مافیا کے قبضے میں چلا گیا۔ والینسا کی حکومت کے دوران ہی سالیڈیریٹی کے ممبران کی تعداد ایک کروڑ یعنی سو لاکھ سے گر کر صرف چار لاکھ پر آ گئی۔ 1995ء کے بعد والینسا کی سیاست بھی ختم ہو گئی۔ مغرب کو اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اب اسامہ کا کھیل تھا۔

جب اشتراکی دنیا کا شیرازہ بکھرا تو اس سارے علاقے میں مدت سے دبی ہوئی

علاقائی رقابتوں، مذہبی نفرتوں، نسلی تعصّبات اس جن کی طرح بوتل سے باہر آ گئے جو واپس بوتل میں نہیں جاتا۔ لاکھوں انسانوں کا منوں خون بہہ گیا۔ کئی ملکوں کی سرحدیں بدل گئیں۔ بالکنائزیشن کی اصطلاح کا استعمال پاکستان کے سیاست دان بھی کرنے لگے۔

پولینڈ کے عوام وہ سب کچھ کھو چکے ہیں جو انہیں سوشلزم میں میسر تھا

پولینڈ کے عوام والینسا کے لائے ہوئے انقلاب کے نتیجے میں آج وہ سب کچھ کھو چکے ہیں جو انہیں برے بھلے اشتراکی دور میں میسر تھا۔ انہوں نے سرمایہ دارانہ نظام کو اپنانے میں کامیابی تو حاصل کر لی مگر انہیں وہ سب کچھ نہیں مل سکا جس کا انہوں نے خواب دیکھا تھا۔ اس بات کا علم انہیں بعد میں ہوا کہ وہ دنیا جو انہیں دکھائی جارہی تھی وہ تو سرمایہ داری نظام کے ایک فی صد کی دنیا ہے۔ 99 فی صد لوگ غربت کی مشکلات میں کس طرح رہتے ہیں انہیں اس کا اندازہ نہیں تھا۔ غربت اور بے روزگاری کی وجہ سے آج یورپ بھر میں پھیلے ہوئے پولش ہر طرح کے جرائم میں سرفہرست سمجھے جاتے ہیں۔

کرسٹینا کا چند سال پہلے جو آخری خط ملا اس سے اندازہ ہوا کہ وہ مہینے میں ایک بار بھی اچھی اور معقول مقدار میں خوراک نہیں خرید سکتی۔ سردیوں میں وہ کوٹ، اوورکوٹ، لحاف اور کمبل اوڑھ کر سوتی ہے۔ اس کے پاس بلوں کی ادائیگی کے لئے پیسے نہیں ہوتے۔ خط پڑھ کر میں کئی روز تک غمگین رہا۔ وہ کرسٹینا جو ہمیشہ ہنستی رہتی تھی اب زندگی کے بوجھ تلے تھی۔ اس کے فلیٹ میں گیت بجتے تھے، روشنیاں رقص کرتی تھیں۔ کالی گھٹا اٹھی، آندھی آئی اور سب کچھ بہا کر لے گئی۔ پولش عوام کے خوابوں کی بستیاں بسنے سے پہلے ہی اجڑ گئیں۔ حماقت اور سمجھ داری کی حدیں اس طرح گڈمڈ ہوئیں کہ اب تک قائم نہیں ہو سکیں۔ البتہ روس ایک بار پھر پوٹین کی سربراہی میں اپنے قدموں پر کھڑا ہو رہا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو قتل کر دیئے گئے تھے

اب پھانسیاں تھیں، قید تھی، جلّاد کا خوف تھا

پولینڈ سے میں پاکستان واپس آ گیا۔ وقت کے پل کے نیچے سے منوں پانی بہہ چکا تھا۔ 6/فروری 1979ء کو کئے گئے تین کے مقابلے میں چار ججوں کے فیصلے کا سہارا لے کر 4/اپریل 1979ء کو بھٹو صاحب کا عدالتی قتل کر دیا گیا تھا۔ مجھے میری اپنی گلیاں اور سڑکیں، محلے اور شہر اجنبی سے لگے۔ پورے ملک پر ایک جلّاد کا خوف طاری تھا۔ تمام دوست غمگین اور اداس تھے۔ اگرچہ واقعات اور لمحات کا تسلسل جاری تھا مگر گزرنے والا ہر لمحہ پتھر کے گھنٹے کی طرح تھا۔ عوام کی اکثریت ایک سکتے کے عالم میں تھی۔ ان کے ضمیر پر ایک طرح کا بوجھ بھی تھا کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کے پھندے سے نہ بچا سکے۔

موت کا سناٹا پورے ملک پر چھایا ہوا تھا۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ موت کے اس سائے میں ہوائیں ابھی تک ادھر سے ادھر پریشان پھر رہی تھیں۔ روٹی، کپڑے اور مکان کے دروازے پر پڑا امید کا پردہ پھڑ پھڑا کر رہ گیا تھا۔ قوم کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ اب پاکستان تھا، ضیاالحق تھا اور مُلّا تھا، ''اسلامی تہذیب'' کے علمبردار مٹھائیاں تقسیم کر رہے تھے۔ ان کے کانوں نے کبھی یہ نہیں سنا تھا کہ ''دشمن مرے تے خوشی نہ کریئے سجناں وی مرجاناں۔''

سرسری سماعت کی فوجی عدالتیں پیپلز پارٹی کے کارکنوں اور ملک کے ترقی پسندوں کو قید، جرمانہ، کوڑے اور پھانسی کی سزائیں دے رہی تھیں۔ وکیلوں اور صحافیوں تک کوئی نہیں بخشا گیا تھا۔ انہیں قید بامشقت کی سزائیں دی گئی تھیں، کوڑے مارے گئے

تھے۔ ان میں کئی میرے پرانے صحافی ساتھی بھی تھے۔ پاکستان ٹائمز راولپنڈی کے محمد الیاس کو نو ماہ قید اور پانچ ہزار روپے جرمانہ، کراچی کے سید اقبال احمد جعفری کو نو ماہ قید، پانچ کوڑے اور تین ہزار روپے جرمانہ، مساوات لاہور کے خاور نعیم ہاشمی کو نو ماہ قید اور تین کوڑے، جنگ کراچی کے عبدالحمید چھاپرا کو چھ ماہ قید اور دو ہزار روپے جرمانہ، پاکستان ٹائمز لاہور کے مسعود اللہ خان کو چھ ماہ قید، اور پانچ کوڑے، مساوات کراچی کے سید محمد صوفی کو چھ ماہ قید اور ایک ہزار روپے جرمانہ، جنگ کراچی کے خواجہ نثار کو چھ ماہ قید ایک ہزار روپے جرمانہ، ڈان کراچی کے فتح محمد کو چھ ماہ قید مساوات لاہور کے نیر اقبال کو تین ماہ قید، کراچی کے محمد اشرف علی کو تین ماہ قید اور نوائے وقت ملتان کے ناصر زیدی کو نو ماہ قید، پانچ کوڑے اور تین ہزار روپے جرمانہ۔

سینئر قانون دان رضا کاظم کو گرفتار کر کے بے پناہ تشدد کیا گیا۔ صرف ایک سال میں ایک رپورٹ کے مطابق چار سو ساٹھ وکلا کو گرفتار کیا گیا۔ پیپلز پارٹی کے ہزاروں کارکن جیلوں میں بند کر دیئے گئے۔ ان صحافیوں کو مئی کی چلچلاتی دھوپ میں صبح آٹھ بجے سے لے کر شام چھ بجے تک فوجی عدالتوں کے سامنے بٹھایا جاتا اور ان کی تضحیک کی جاتی۔ پورا ملک جیل خانہ بنا ہوا تھا۔

کسی کو بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ کئی دہائیاں گزرنے کے بعد بھی پوری قوم سامراج کی قید میں ہوگی۔ جیل خانہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ ضیاالحق مر کر جارج ڈبلیو بش کی شکل میں دوبارہ زندہ ہوگا اور اب کی بار پوری انسانیت ''جمہوریت کے نفاذ'' کے نام پر قربان کر دی جائے گی۔ اس کا کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ لاکھوں انسانوں کا قتل عام ہوگا بالکل اسی طرح جیسے اسلام کے نفاذ کے نام پر پاکستان میں ظلم و بربریت کی گئی ہے، اب کی بار القاعدہ، طالبان، بلیئر اور بش مل کر پورے کرہ ارض کو لہولہان کر دیں گے۔ اس گلوب کا ہر وہ خطہ جو قدرتی وسائل سے مالا مال ہے یا جغرافیائی اعتبار سے عالمی سامراج کے لئے اہم ہے اس کو مقتل گاہ بنا دیا جائے گا۔ القاعدہ، طالبان اور ان جیسی کئی دہشت گرد تنظیمیں ان علاقوں میں امریکہ، اس کے اتحادیوں اور نیٹو کی افواج کی آمد اور ان کی موجودگی کا جواز پیدا کرتی رہیں گی اور مقتل گاہیں، کابل

پشاور، لاہور، کراچی سے ہوتی ہوئی عراق، یمن، بحرین، لیبیا اور شام تک پھیل جائیں گی۔

یہ ''اسلامی دہشت گرد'' اور امریکہ ایک دوسرے کے لئے لازم وملزم بن چکے ہیں۔ سامراج نے جہاں پر اپنی فوجیں اتارنی ہوتی ہیں۔ پہلے وہاں پر القاعدہ یا اس جیسی کوئی تنظیم پیدا کی جاتی ہے۔ پھر کچھ دھماکے اور پھر ''سویلین کو بچانے'' اور ''جمہوریت کا نفاذ'' کرنے کے لئے نیٹو کی افواج کی آمد۔ پاکستان میں یہ کھیل ابھی تک جاری ہے۔ ہمارے ہاتھی دانت کا مینار گر چکا ہے۔ راکھ راکھ خواب اور تمناؤں کے کھنڈر سے اٹھ کر ہم آنکھیں کھول کر اپنے عوام کے لہولہان چہرے دیکھ رہے ہیں۔

مجھے او ایس ڈی بنا کر فیکلٹی آف شریعہ قائم کرنے کی ذمہ داری دے دی گئی

یونیورسٹی سے ہاشم خان جا چکے تھے۔ ان کی جگہ ایک اور شریف النفس پروفیسر محی الدین کو وائس چانسلر مقرر کیا گیا تھا۔ میرے عہدے پر کسی بریگیڈیئر کا بھائی آن بیٹھا تھا۔ مجھے او ایس ڈی بنا دیا گیا۔ میرا عملہ، دفتر، فرنیچر، قالین، پردے سب کی بندر بانٹ ہو چکی تھی۔ چند ہی روز بعد مجھے حکم نامہ ملا کہ مجھے ملک میں شریعت کے نفاذ کے لئے فیکلٹی آف شریعہ قائم کرنی ہے جو آئندہ چل کر اسلامی یونیورسٹی بنے گی۔

ضیاالحق یونیورسٹی کا چانسلر بھی تھا اور امیر المومنین بننے کا جال بھی بچھا رہا تھا۔ اس کا منصوبہ تھا کہ ملک میں شرعی عدالتیں قائم کی جائیں اور اس فیکلٹی سے فارغ التحصیل ہونے والے حضرات کو ان عدالتوں کا قاضی مقرر کیا جائے۔ جو ہاتھ کاٹنے، زندہ سنگسار کرنے، کوڑے مارنے سے لے کر گردنیں اڑانے تک کی سزائیں دے کر، معاشرے کو خوفزدہ کر کے، ''امیر المومنین'' کے قبضے میں دے دیں۔ جمعرات کی روٹیوں پر گزر بسر کرنے والا مولوی سولہویں اور سترویں گریڈ میں بھرتی ہو کر معاشرے سے اپنی صدیوں کی محرومیوں اور ناکامیوں کا انتقام لینے کے لئے تیار تھا۔ میرے علاقے کے لوگوں نے شکایت کی کہ دیہات

کے مولوی نے بچوں کو قرآن پڑھانا بند کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''اب ہم نے قاضی بن کر فیصلے کرنے ہیں۔ اب ہم نہ تو قرآن پڑھائیں گے اور نہ ہی جنازہ۔ اپنا بندوبست کر لیں۔''

جمعے کے خطبے میں ضیاالحق کی ''اسلام پسندی'' اور سادگی کا قصیدہ پڑھ کر مولوی حضرات اس کے ''امیرالمومنین'' بننے اور اپنے قاضی بننے کی راہیں ہموار کر رہے تھے۔ ہر سال حج پر جا کر اپنے گناہوں اور اپنی بے ایمانیوں کو معاف کروانے والے دکان دار سوداگر، یعنی مرکنٹائل طبقہ ضیاالحق کے ساتھ تھا۔ یہ وہ طبقہ ہے جو کارل مارکس اور ماؤزے تنگ کی کتابوں میں نہیں ملے گا بلکہ پاکستان میں ملے گا۔ یہ اپنے کندھے پر چار خانوں والا پٹکا رکھ کر عطر اور تیل لگا کر، باقاعدگی سے جمعہ کی نماز ادا کرتا ہے۔ پھر جمعہ کی نماز کے بعد کبھی حکمرانوں کے حق میں اور کبھی ان کے خلاف ''اسلام کی سربلندی'' کے نام پر جلوس نکالتا ہے۔ تبلیغی اجتماعات کرتا ہے اور مسلمان شہریوں کو مسلمان بناتا ہے۔ یہ طبقہ ضیاالحق کو ''مردمومن'' اور امیرالمومنین بنانے میں مصروف تھا، یہ لوگ گلی محلے میں بیٹھ کر اس کی تعریفیں کرتے۔ پی این اے کی تحریک کے بعد ضیاالحق ان کے دلوں اور گھروں میں ایک وبا کی طرح گھس گیا تھا۔

قائداعظم کے سیکولر پاکستان پر ان عوام دشمنوں کا قبضہ تھا جو پاکستان اور قائداعظم کی مخالفت کرتے چلے آئے تھے۔ وہ ضیاالحق کے ساتھ مل کر پاکستان کو ایک تھیوکریٹک ریاست بنانے کی سازش میں مصروف تھے۔ جارج ڈبلیو بش کی طرح ضیاالحق نے بھی اپنے مشن کا اعلان کیا ہوا تھا۔ ''میرا ایک مشن ہے۔ خدا نے مجھے یہ مشن سونپا ہے کہ میں پاکستان میں اسلامی نظام نافذ کروں۔'' اس کے مشن کی تکمیل کے لئے ہر روز سرکاری محکمے اور ''اسلامی دانشور'' سب کے سب قائداعظم محمد علی جناح کے کلین شیو چہرے پر داڑھی سجانے اور انہیں ٹخنوں سے اونچی شلوار پہنوانے میں مصروف تھے اور آج تک ہیں۔ وزیر اطلاعات محمود اعظم فاروقی، راجہ ظفرالحق اور مرکزی سیکرٹری اطلاعات جنرل مجیب کے ہوتے ہوئے کس میں دم تھا کہ قائداعظم کی گیارہ اگست 47ء والی تقریر کا حوالہ بھی دے سکتا۔

خواتین نیوز ریڈرز کو پاکستان ٹیلی ویژن پر ''اسلامی دوپٹے'' پہنا دیئے گئے تھے۔ ''چادر اور چاردیواری'' کی آڑ میں خواتین کے حقوق سلب کئے جا رہے تھے۔ نشریاتی

اداروں کے ذریعے ایران دشمنی میں ''خدا حافظ'' کی جگہ ''اللہ حافظ'' کی گردان اس طرح کی گئی کہ وہ اصطلاح جو ترکیبی اعتبار سے بھی غلط ہے اب پاکستانیوں کی روزمرہ کی زندگی میں داخل ہو چکی ہے۔ سرکاری سطح پر ان تمام افسروں کو نوازا جارہا تھا جن کے گھروں میں ''درس'' شروع تھے۔ اس رجحان کو دیکھتے ہوئے اسلام آباد میں ہر وہ سرکاری افسر جو ترقی چاہتا تھا یا اپنے جرائم کو چھپانا چاہتا تھا اپنے گھر میں باقاعدگی سے اسلامی درس کی ماہانہ محفل اس انداز سے کرتا کہ بڑے صاحب تک اطلاع پہنچ جائے۔ دفتروں میں ظہر اور عصر کی نماز کی ادائیگی کو سرکاری نوٹیفیکیشن کے ذریعے لازمی قرار دے دیا گیا۔ اچھے بھلے لوگوں نے راتوں رات داڑھیاں بڑھا کر ٹخنوں سے اونچی شلواریں سلوالیں۔

افواج میں بھی بنیاد پرستی نے جڑیں پکڑیں۔ وہ سینئر افسران جنہوں نے انگریز کے سیکولر مزاج کے دوران تربیت حاصل کی تھی، ریٹائر ہو رہے تھے۔ نئے بھرتی ہونے والے نوجوان افسروں کی اکثریت ان گھرانوں، علاقوں اور طبقات سے تھی جہاں پر کم علم مولوی کا بتایا ہوا مذہبی علم ان کا اپنا علم بن جاتا ہے اور اس علم کے مطابق انسان کا چاند پر پہنچنا آج بھی مشکوک ہے۔

فوج میں اسلامی تبدیلی کے حوالے سے اسی دور کے ایک فوجی افسر ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل جاوید اشرف قاضی کا کہنا ہے کہ ''اس دور میں آپ کی شناخت اسلام سے ہوا کرتی تھی نہ کہ پاکستان سے۔ ضیا کے دور میں مولوی کی فوجی یونٹ میں اہمیت بڑھ گئی تھی اور انہوں نے یونٹ کی سماجی زندگی پر فیصلے صادر کرنا شروع کر دیئے تھے۔ ورزش کے دوران نیکر پہننے پر اعتراض، ٹی وی دیکھنے پر اعتراض، تبلیغ پر جانے کی اجازت، نماز کی ادائیگی لازمی، یہ سب کچھ ضیا دور میں ہوا۔''

اسلام فروشوں نے چونکہ پاکستان ٹوٹنے اور بنگلہ دیش کے قیام کا سبب ''یحییٰ خان کی شراب اور عورتوں'' کو گردانا تھا چنانچہ فوج میں بنیاد پرستی اور مذہبی جنونیت کا فروغ آسان تھا۔

یہ وہ فضا تھی جس میں فیکلٹی آف شریعہ قائم کر کے ملک کو تھیوکریٹک ریاست

بنانے کے جرم کی ذمہ داری مجھے سونپ دی گئی۔ جو میرے ساتھ ایک طرح کا مذاق بھی تھا اور عذاب بھی۔ تین افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں میرے علاوہ وزارت قانون کے جوائنٹ سیکرٹری گھانگھر واور بھٹو کے قاتلوں میں شامل مشہور قانون دان اے کے بروہی تھے۔

ملک کا خزانہ خالی تھا۔ قائداعظم یونیورسٹی کے پاس اساتذہ اور سٹاف کو تنخواہیں دینے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ کجا یہ کہ نئی فیکلٹی کھڑی کی جائے۔ جب میں نے منصوبہ بندی شروع کی، سوالات اٹھائے تو معلوم ہوا کہ فیکلٹی کی رقم سعودی عرب سے آئے گی اور اساتذہ جامعہ ازہر سے۔ یعنی ملک کو سلفی تھیوکریٹک ریاست بنانے کی جانب یہ پہلا خطرناک مگر سنجیدہ قدم تھا۔ میرا دوسرا سوال تھا کہ کونسی شریعت نافذ کی جائے گی۔ کیونکہ ملک میں تو مختلف شریعت کے لوگ بستے ہیں اور کسی بھی ایک شریعت کو دوسری پر مسلط نہیں کیا جاسکتا۔ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں ہر فرقے کے عالم تھے۔ اور اس سوال کو حل کرنا آسان نہیں تھا۔ اس کے بعد کا مرحلہ تھا کورسز کا اور داخلے کا۔

فیکلٹی نے ایل ایل ایم یعنی قانون میں ماسٹرز کی ڈگری ایوارڈ کرنا تھی۔ پاکستان میں پہلی بار LLM کی ڈگری متعارف کروائی جارہی تھی وگرنہ اس سے پہلے LLB کی ڈگری ہی تھی۔ طالب علموں کے لئے ماہانہ وظیفہ ایک ہزار روپے رکھا گیا تھا۔ اس زمانے میں 18 گریڈ کے افسر کی تنخواہ ساڑھے سات سو روپے ہوا کرتی تھی۔ داخلے کا اشتہار چھپا اور اکوڑہ خٹک سے لے کر کراچی کے مدرسوں تک سے فارغ التحصیل سند یافتہ چھوٹے چھوٹے مولوی سینکڑوں کی تعداد میں نمودار ہونے لگے۔ ایک ہزار امیدوار تھے جن میں سے صرف دس کا داخلہ ہونا تھا۔

جدید قانون کی ڈگری حاصل کرنے والے یعنی ایل ایل بی والے پریشان تھے کہ ان کا مستقبل مخدوش تھا۔ ایل ایل ایم میں داخلے یا کسی بھی ماسٹرز کورس میں داخلے کی بنیادی شرط ہمیشہ سے کم از کم گریجویشن تک کی تعلیم ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ دینی مدرسوں کی سند کو بی اے کی ڈگری کے برابر قرار دیا گیا تاکہ مولوی ایل ایل ایم کر کے شرعی عدالتوں کا قاضی مقرر ہو سکے۔

میرا اپنا خیال تھا کہ شریعت کی تعلیم کے لئے بھی کم از کم بی اے تک کی انگریزی ضرور آنی چاہیے۔ اور اسی طرح انہیں جدید قانون کا علم بھی ہونا چاہیے۔ چنانچہ سلیکشن کمیٹی نے داخلے کے امتحان کے لئے چار پرچے تیار کئے۔ ایک انگریزی کا، دوسرا شریعت/فقہ کا، تیسرا جدید قانون کا اور چوتھا عربی کا۔ جب نتیجہ سامنے آیا تو ایک ہزار امیدواروں میں سے جن دس نے اولین پوزیشن حاصل کی ان میں سے کوئی بھی مدرسے کا فارغ التحصیل نہیں تھا۔ ان دس میں سے جس نے پہلی پوزیشن حاصل کی اس نے جامعہ الازہر اور قُم دونوں یونیورسٹیوں میں سے فقہ کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی ہوئی تھیں۔ لاء کیا ہوا تھا اور غالباً انگریزی میں ایم اے کیا ہوا تھا۔ باقی نو بھی اسی طرح سے تھے۔ نہ تو کسی کی داڑھی تھی اور نہ ہی ٹخنوں سے اونچی شلوار۔

سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ پہلی پوزیشن حاصل کرنے والے سید ذاکر حسین شاہ پیپلز پارٹی راولپنڈی ڈویژن کے صدر تھے۔ یہ نتیجہ اسلام پسندوں اور شریعت نافذ کرنے والوں کی توقعات کے بالکل برعکس تھا۔ اس روز اسلامی جمعیت طلبا کے لڑکوں نے سٹوڈنٹس یونین کے صدر خلیق کی سربراہی میں میرے دفتر کے سامنے ہنگامہ آرائی کی۔ خلیق ان دنوں ضیاالحق کے بیٹے انوار الحق کا دوست تھا۔ وہ اس کے ذریعے سے ضیاالحق تک پہنچا۔ ادھر پروفیسر غفور احمد جو ضیاالحق کا وزیر پیداوار تھا، جماعت اسلامی کے امیر مولوی طفیل محمد کو ساتھ لے کر ضیاالحق سے ملا۔ لاہور کے ایک اسلام پسند اخبار نے یہ سوال اٹھایا کہ یہ کونسی شریعت ہے جس کا نفاذ علی جعفر زیدی، ایک سوشلسٹ کے ذریعے کیا جا رہا ہے۔ اسی روز مجھ سے چارج لے لیا گیا اور میں نے سکون کا سانس لیا۔

ضیاالحق سائیکل کے کرتب دکھا رہا تھا

امریکی سفارت خانہ جل رہا تھا

اسی دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ضیاالحق کی نوکری کو خطرے میں ڈال دیا۔ 21/نومبر 1979ء کو تمام سول اور ملٹری اسٹیبلشمنٹ حرکت میں آئی۔ محمود و ایاز کے

ایک صف میں کھڑے ہونے کا انتظام ہوا۔

بادشاہ سلامت، مردمومن اور خودساختہ امیر المومنین آج کے دن راولپنڈی کے راجہ بازار میں عوام کے سامنے سائیکل چلانے کا مظاہرہ کرنے والا تھا۔ جس کا مقصد عوام (سفید کپڑوں میں ملبوس ایجنسیوں کے افراد) کے ساتھ گھل مل کر ''اسلامی اخوت و بھائی چارہ'' اور سادہ طرز زندگی کو اپنانے کا پیغام دینا تھا۔ شہر کی سڑکیں چاروں طرف سے بند کر دی گئی تھیں۔ راولپنڈی سے آنے والے ایک طالب علم نے میرے کمرے میں آ کر صورت حال بتائی کہ ہر طرف ٹریفک روک دی گئی ہے۔ چھتوں پر فوجی کمانڈوز متعین ہیں۔ سڑک کے کنارے سینکڑوں فوجی جیپیں اور پولیس کی گاڑیاں اس طرح کھڑی ہیں گویا کہ آج شہر کو فتح کیا جانا ہے۔

موٹر سائیکلوں اور سیکیورٹی کاروں کے جھرمٹ میں ''مردمومن''، ''بینڈ ماسٹر'' کا لباس زیب تن کئے کھلی جیپ میں اگلی سیٹ پر بیٹھا نمودار ہوا۔ اس کھلی جیپ کے پچھلے حصے میں ایک سائیکل اس طرح رکھی گئی تھی کہ ہر شخص اور کیمرے کی آنکھ اسے دور سے دیکھ سکے۔ صبح سے پی ٹی وی اعلان کر رہا تھا کہ تمام حفاظتی انتظامات کو بالائے طاق رکھ کر صدر صاحب آج راولپنڈی کے عوام میں گھل مل کر ان کے سامنے سائیکل چلا کر سادہ زندگی اپنانے کی مثال پیش کریں گے۔

اس سے پہلے کہ اسلامی تاریخ نویس اور کہانی دان اپنے بچوں کے لئے ضیا الحق کے ''درخشندہ دور'' کی اس اسلامی مساوات اور سادگی پر کتابیں لکھنا شروع کرتے کہ میرا پی اے محمد اقبال پریشانی کے عالم میں میرے کمرے میں داخل ہوا اور کہنے لگا کہ خانہ کعبہ پر قبضہ ہو گیا ہے اور خبر میں بتایا گیا ہے کہ اس میں امریکہ کا ہاتھ ہے۔ اسی دوران ٹرانسپورٹ افسر جس کا تعلق پشاور سے تھا، ہانپتا کانپتا پہنچا۔ یونیورسٹی کے طالب علم، ملازمین اور پروفیسر حضرات یونیورسٹی بسوں پر قبضہ کر کے، ڈنڈے، لاٹھیاں، سلاخیں جو کچھ بھی جس کے ہاتھ میں آیا، اٹھا کر امریکی سفارت خانے کی طرف چل دیئے۔ وائس چانسلر ڈاکٹر محی الدین نے انٹرکام پر مجھ سے بات کی۔

امریکی سفارت خانہ یونیورسٹی سے پانچ منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو کہا کہ میں جا کر دیکھتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ ان کو واپس لاسکوں۔

وہاں پر ایک عجیب منظر تھا۔ راولپنڈی، اسلام آباد، اس کے گردونواح، پہاڑوں، ندیوں نالوں، ہر طرف سے غول در غول ہزاروں افراد چلے آرہے تھے۔ یونیورسٹی کے ملازمین، اساتذہ اور طالب علم اپنی سیاست کا دایاں بازو اور بایاں بازو بھلا کر عوام کا ہراول دستہ بنے ہوئے تھے۔ باؤنڈری کی دیوار توڑ دی گئی تھی۔ اتنے میں امریکی بحری فوجی یعنی ''میرین'' سفارت خانہ کی عمارت کی چھت پر نمودار ہوئے۔ ایک نے مشین گن سیدھا کرنا شروع کی کہ کہیں سے گولی آئی اور اس کا کام تمام کر گئی۔ دراصل پولیس اہل کاروں سے ہجوم نے بندوقیں چھین لی تھیں۔

لوگ عمارت میں داخل ہونے کے لئے عمارت کی دیواریں، بلٹ پروف شیشے کی کھڑکیاں اور دروازے اکھاڑنے میں مصروف تھے۔ کوئی کسی کی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ میں واپس لوٹ آیا۔ ڈاکٹر محی الدین اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح پریذیڈنٹ ہاؤس میں اطلاع ہوسکے۔ رابطہ ناممکن تھا کیونکہ تمام عملہ ''سائیکل شو'' میں مصروف تھا۔ بہت مشکل سے ایک آپریٹر سے رابطہ ہو سکا جس نے وائرلیس کے ذریعے ''سائیکل سوار مرد مومن'' کے عملے کو اطلاع دی۔ ''امیر المومنین'' اپنی جان اور نوکری بچانے کے لئے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر قصر صدارت کی طرف بھاگا۔

اب تک ہزاروں افراد سفارت خانے کی عمارت میں داخل ہو کر ٹھنڈی ٹھنڈی بیئر کا مزہ لے رہے تھے اور سفارت خانہ کے سامان پر ہاتھ صاف کر رہے تھے۔ امریکی سفارت خانہ جل رہا تھا۔ عوام میں سے کسی نے بھی اللہ اکبر کا نعرہ نہیں لگایا۔ ابھی تک اسلام آباد اور پاکستان، دہشت گردوں سے پاک تھا۔ لال مسجد بھی صرف عبادت گاہ تھی۔ عوام امریکہ سے اس کی سامراجیت کی وجہ سے نفرت کرتے تھے نہ کہ مذہب کی وجہ سے۔ بلکہ مذہب کے ٹھیکیدار تو امریکہ سے ڈالر بٹور رہے تھے۔ اس دن ملک بھر میں جہاں کہیں بھی امریکی دفاتر تھے وہ عوام کے غیض و غضب کا شکار تھے۔ پسینوں سے شرابور ضیاالحق ٹی وی

اور ریڈیو کے ذریعے مشتعل عوام کو سمجھا رہا تھا کہ خانہ کعبہ پر قبضے میں امریکہ کا ہاتھ نہیں۔ امریکہ کے صدر جمی کارٹر کو جو وضاحتیں اس نے دیں وہ اس کے علاوہ تھیں۔

تقریباً دو بجے امریکی سفارت کار اور پاکستانی سٹاف پر مبنی 140 افراد اور ٹائمز میگزین کی نامہ نگار جو اس وقت عمارت میں تھی THE VAULT میں جمع ہوئے۔ سٹیل کا یہ کمرہ سفارت خانے کی تین منزلہ عمارت کی اوپر والی منزل پر حالت جنگ میں یا ایمرجنسی میں امریکی سفارت کاروں کو محفوظ رکھنے اور مدد پہنچانے کے لئے بنایا گیا تھا۔ ہمارے ایک عزیز بھی جو سفارت خانے میں کام کرتے تھے، ان افراد میں شامل تھے جو اس کمرے میں پناہ لے چکے تھے۔ ان کی بیٹی فرحت جو یونیورسٹی میں ایم فل کر رہی تھی میرے کمرے میں زاروقطار رو رہی تھی۔

27 نومبر 2004ء کے واشنگٹن پوسٹ میں کیمرون بار لکھتا ہے کہ ''میرین ماسٹر سارجنٹ لائیڈ سفارت خانے کی لابی میں کھڑا اپنے میرینز کو ہدایات دے رہا تھا۔ طالب علموں کی بسوں پر بسیں چلی آرہی تھیں۔ کسی نے چیخ کر کہا ''امریکی کتوں کو مار دو'' ملر نے سفارت خانے کی چھت پر دو میرینز کو صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے بھیجا۔ اس نے فائر کی آواز سنی۔ وہ چھت پر گیا تو دیکھا کارپورل سٹیفن جے کراؤلی خون میں لت پت زمین پر پڑا تھا۔ گولی اس کے کان کے پاس لگی تھی۔ وہ بے ہوش سٹیفن کو اٹھا کر عمارت میں لایا۔ تمام عملہ سٹیل کے بنے ہوئے کمرے کی طرف جا رہا تھا جسے THE VAULT کا نام دیا گیا تھا۔

''پچیس برس گزرنے کے بعد تاریخ کا یہ واقعہ سوویت یونین کے افغانستان میں آنے اور ایران میں امریکی یرغمال بنائے جانے کے درمیان گم ہو گیا ہے۔ 21 نومبر 1969ء کا یہ دن پاکستان کے ساتھ ''کارآمد تعلقات'' کی تہوں میں گم کر دیا گیا ہے اور آسانی سے بھلا دیا گیا ہے۔

''سٹیفن کی گرل فرینڈ Beth Rideout جو اس وقت امریکن سکول اسلام آباد میں پڑھ رہی تھی اور جس کا باپ L. Rideout سکول کا ایکٹنگ پرنسپل تھا، کہتی ہے کہ

جب میں واپس آئی تو مجھ پر یہ واضح ہو چکا تھا کہ دوسری اقوام امریکہ سے کس قدر نفرت کرتی ہیں۔ اس کے والد کا کہنا تھا کہ میری سب سے بڑی الجھن یہ ہے کہ امریکہ دوسروں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اپنے اندر دیکھتا ہے۔ امریکہ کے عوام کو یہ ہلکا سا بھی اندازہ نہیں ہے کہ دنیا ان کے بارے میں کیا سوچتی ہے۔ امریکی عوام کی اکثریت اپنا نظریہ قائم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ نہ ہی ان کے پاس صحیح معلومات ہوتی ہیں نہ ہی وہ جاننا چاہتے ہیں اور نہ ہی انہیں اس کی کوئی پرواہ ہے۔

" 23 نومبر کو Beth جمبو جٹ میں ان 400 امریکیوں کے ساتھ، جنہیں امریکہ نے پاکستان سے واپس بلا لیا تھا، واپس جا رہی تھی۔ سٹیفن بھی اس کے ساتھ سفر کر رہا تھا مگر ایک کفن میں۔"

سنا گیا کہ 20 نومبر 1979ء کو خانہ کعبہ پر قبضہ نجد کے انتہا پسند سلفیوں نے کیا تھا جو آلِ سعود سے بھی چار ہاتھ بڑھ کر سلفیت نافذ کرنا چاہتے تھے۔ وہ سعودی شاہی خاندان کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ ان کی اطلاع کے مطابق اس دن سعودی خاندان خانہ کعبہ کو ہر سال کی طرح غسل دینے کی رسم کے لئے خانہ کعبہ میں موجود تھا۔ ایک عرصے تک سعودی حکمرانوں پر اس واقعہ کا خوف طاری رہا۔

سوویت یونین افغانستان میں آیا تو ضیاالحق کی لاٹری نکل آئی

پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان نے 27 راپریل 1978ء کو جب حکومت پر قبضہ کیا تو افغانستان میں قبائلی جنگ شروع ہوگئی۔ دسمبر 1979ء میں سوویت یونین افغانستان میں آ گیا اور ضیاالحق کی لاٹری نکل آئی۔ سوویت یونین بجائے خود افغانستان میں نہیں آیا تھا بلکہ افغان حکومت کی درخواست پر ان کے درمیان پہلے سے موجود دفاعی معاہدے کے تحت آیا تھا۔ مگر افغانستان میں آ کر سوویت یونین پھنس گیا۔ مغربی ممالک بالخصوص امریکہ اور برطانیہ سعودی عرب کی مدد سے مجاہدین پیدا کرنے میں مصروف ہوگئے۔

اسامہ بن لادن کے بڑے بش کے ساتھ گہرے مراسم تھے۔ امریکہ کے مفادات کا تحفظ کرنے کے لئے وہ جماعت اسلامی کی مدد کے ساتھ ضیاالحق کی سرپرستی میں پاکستان میں آن بیٹھا۔ پاکستان کو امریکہ کی فرنٹ لائن ریاست بنا کر سوویت یونین کے خلاف امریکہ کی جنگ کو ''اسلامی جنگ'' بنا کر ملک کو داؤ پر لگا دیا گیا۔ مجرب اور خوب پلے ہوئے دنبے اپنے چہروں پر اسلامی جہاد کا سائن بورڈ لگا کر پہاڑوں میں سے، غاروں میں سے جانور نما انسانوں کو پکڑ پکڑ کر دینی مدرسوں میں بھرتی کرنے لگے۔ ڈالرز کی ریل پیل ہوگئی۔ چیچنیا سے لے کر افریقہ کے جنگلوں تک سے ان ''اسلامی مجاہدین'' کو لا لا کر جمع کیا گیا۔ پنجاب کے شہروں اور دیہات کے غریب بچے بھی ان سے نہ بچ سکے۔ دینی مدرسے مجاہدین پیدا کرنے والی فیکٹریاں بن گئیں جو دن دوگنی رات چوگنی ترقی پر تھیں۔

مسز تھیچر نے جب طورخم کے بارڈر پر بندوق لہراتے ہوئے جہاد کا نعرہ بلند کیا تو

اربوں ڈالرز کا ''اسلامی کھیل'' شروع ہوگیا۔ اسلحہ اور مذہب دونوں ہی بک رہے تھے۔ اس کاروبار کا عالم یہ تھا کہ اسلحہ کی ایک بڑی کھیپ جو افغانستان کے خلاف استعمال ہونا تھی یار لوگوں نے ہمسایہ ملک کو اربوں میں بیچ کر اوجڑی کیمپ کو آگ لگا دی تا کہ ذخیرے کا حساب کتاب جل کر برابر ہو جائے۔ وزیر اعظم جونیجو نے اپنی سادگی میں اس سانحہ کی تحقیقات کروانے کا اعلان کیا تو وزارت عظمٰی سے ہاتھ دھونے پڑے۔ وہ تمام ادارے اور افراد جو اس کھیل میں ملوث ہوئے وہ راتوں رات ارب پتی بن گئے اور ان کی اولاد کا شمار دنیا کے امیر ترین افراد میں ہونے لگا۔

پاکستان کو قرون وسطٰی میں لے جانے کا عمل شروع ہوا تو پاکستان میں سکولوں کے نصاب تک کو تبدیل کر دیا گیا۔ تعلیمی نصاب اور ذرائع ابلاغ کا ہدف ''اسلامی سلطنتوں'' کے پھیلاؤ کی تاریخ تھا۔ جس میں ''مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک سپین پر حکومت کی''، ''ایک ہزار سال تک ہندوستان پر''، ''صدیوں تک عثمانیوں نے مشرقی یورپ کو تابع رکھا'' وغیرہ وغیرہ کو ''اسلامی دانشوروں اور مفکرین'' نے بڑھا چڑھا کر ''اسلامی تاریخ'' بنا کر لکھنا اور پیش کرنا شروع کر دیا حالانکہ یہ مسلمان حکمرانوں کی تاریخ تھی۔ یہ اسلام کی تاریخ نہیں تھی۔

اسلام کا وہ معاشی نظام، انقلابی پیغام جس کے داعی حضرت ابوذر غفاریؓ جیسے جلیل القدر صحابی تھے یا ان سیکولر مسلمان حکمرانوں کا ذکر جن کی انسان پرستی، وسیع القلبی، مذہبی رواداری ان کے کامیاب حکمران ہونے کا راز تھی، اس کا ذکر ان ''اسلامی دانشوروں'' نے کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسلام کی اصل روح جس کو عالموں اور صوفیوں نے بالخصوص برصغیر میں جس طرح روشناس کروایا تھا اس کو دبایا جانے لگا۔ موسیقی، آرٹ، تہذیب، علم و ادب کو ضیا الحق کی آنکھ سے دیکھا جانے لگا (اس کو یہ خوش فہمی تھی کہ اس کی آنکھیں ہیما مالنی سے ملتی ہیں۔ وہ گھنٹوں انڈین فلمیں دیکھا کرتا تھا)۔ پاکستان کو قرون وسطٰی میں لے جانے کا یہ عمل آج تک جاری ہے اور ضیا الحق کے پیدا کردہ سیاسی شعبدہ باز پاکستان کو ''الباکستان'' بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ کل تک وہ جو پٹرول پی کر پچھواڑے سے آگ نکالنے کا کرتب دکھایا کرتے تھے اب ملک کے حکمران ہیں۔

جس طرح ایک عظیم مملکت جس کی بنیاد بابر نے رکھی تھی، اورنگ زیب نے 1707ء تک اس کو مکمل تباہی تک پہنچا دیا تھا اور یہ سب کام اس نے بھی نفاذ شریعت کے نام پر کیا تھا، اسی طرح ضیا الحق نے، جو اپنے وقت کا اورنگ زیب تھا، پاکستان کو تباہی کی گہری اور تاریک وادی میں دھکیل دیا۔

اورنگ زیب نے اپنے مخالفین کا قتل عام، بھائیوں کے ساتھ جنگیں اور ان کا قتل، باپ کی قید تنہائی، ظلم و بربریت اسلامی نظام کے نفاذ کے نام پر کی تھی۔ جنگوں کی وجہ سے خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ ''ٹوپیاں سی کر'' اور ''قرآن پاک کی کتابت'' کر کے گزارہ کرنے والا اورنگ زیب (جیسا کہ ہمیں بچپن میں پڑھایا گیا تھا) دراصل اپنے قتل و غارت گری کے شوق کو جاری رکھنے کے لئے قرآن پاک کی کتابت کر کے اور ٹوپی سی کر دربار میں ان کی نیلامی کرواتا اور اس سے جو رقم اکٹھی ہوتی وہ اپنے مخالفین اور بھائیوں کے ساتھ جنگیں کرنے میں صرف کرتا۔ ضیا الحق بھی اپنے طرز کے اسلامی نظام کے نفاذ کے نام پر اپنے سیاسی مخالفین کو کوڑے مارتا، پھانسی پر چڑھاتا اور سال ہا سال کی قید میں رکھتا۔

اورنگ زیب کے جرائم کی سزا 1947ء میں پنجاب کے مسلمانوں کو برداشت کرنا پڑی۔ سکھوں نے اورنگ زیب کے مظالم کا بدلہ لینے کے لئے لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام کیا اور عورتوں کی عصمتیں لوٹیں۔ ضیا الحق کے جرائم کی سزا معلوم نہیں کتنی نسلوں تک جائے گی۔

سوویت یونین کے خلاف اس جنگ میں پاکستان خود ایک میدان کارزار بن جائے گا ضیا الحق اور اس کے ساتھیوں کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ان میں سے کسی ایک کا بھی گھر برباد نہیں ہوا جبکہ پورا پاکستان برباد ہو کر رہ گیا ہے۔ یوں بھی ان حکمرانوں کے نزدیک کبھی بھی کوئی ایسا قومی المیہ نہیں ہوا جس کو یاد کر کے وہ اداس ہو سکیں۔ نہ تو انہیں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا کبھی غم رہا اور نہ ہی ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے کا۔

ضیا الحق نے جس مذہبی اور لسانی عصبیت کا عفریت کھڑا کیا تھا اس کے ہاتھوں ہمارے معاشرے کے پرسکون محل جل چکے ہیں۔ رواداری کی محل سرائیں جل کر راکھ ہو چکی ہیں۔ پاکستان پرستی کا جنازہ نکل گیا ہے۔ اسلام پرستی چھا گئی ہے۔ تخریب کاری کی نئی نئی

عمارتیں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ معاشرے میں منطقی اندازِ فکر اور معروضی حالات کو سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت مر گئی ہے۔ ترقی پسند کہلائے جانے والے جو پہلے بھی سرخ نہیں، زرد تھے، ''امن کی آشا'' اور ڈرون حملوں کے حق میں انڈو امریکن لابی کہلانے لگے ہیں۔ این جی اوز کا کاروبار بھی کسی مذہبی کاروبار سے کم نہیں۔

عوام نے عوامی جمہوریت، خوش حال، پرسکون اور مضبوط پاکستان کا جو خواب دیکھا تھا ضیا الحق نے کوڑے اور پھانسیوں میں اس خواب کو روند ڈالا۔ آج لوگ ضیا الحق کے مظالم کی شدت کو بھول چکے ہیں۔ مذہبی اور لسانی دہشت گردی کا کلچر، آسانی سے حاصل کردہ دولت کے نشے کا کلچر، بڑے بڑے پھوڑوں کی شکل میں قومی زندگی کے جسم پر نمودار ہو چکا ہے۔ ان پھوڑوں میں سے بدبو دار پیپ اور گندہ خون رس رہا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو کافر کہہ کر، قابل گردن زدنی قرار دے کر جس کو چاہتے ہیں قتل کر دیتے ہیں، زندہ جلا دیتے ہیں۔ اور اب عالم یہ ہے کہ:۔

جانے کب کون کسے مار دے کافر کہہ کے
شہر کا شہر مسلمان ہوا پھرتا ہے

(عابد علی عابد)

توہین مذہب کا قانون تو پہلے سے موجود تھا مگر ضیا الحق نے شاہ خالد بن عبدالعزیز کے مشیر ڈاکٹر معروف دوالبی، شریف الدین پیرزادہ، اے کے بروہی، ڈاکٹر تنزیل الرحمن، جسٹس افضل چیمہ اور مولوی ظفر احمد انصاری وغیرہ کے ذریعے مرتب کردہ حدود اور توہین مذہب کے قوانین کو ایک ایسی دستاویز بنا دیا ہے کہ جس کو کوئی نہیں چھیڑ سکتا۔ پاکستان کا عام شہری یہ سوال کرتا ہے کہ اگر یہ مسودہ اس قدر اہم ہے تو سعودی عرب جو کہ تھیوکریٹک ریاست ہے اس نے ابھی تک اس کو کیوں نہیں اپنایا اور اس کے ''فیض اور برکات'' سے محروم کیوں ہے۔

آج جب احمد پور شرقیہ کے چنی گوٹھ چوک پر ہزاروں لوگ جمع ہو کر ایک مجذوب ملنگ پر تیل چھڑک کر اس کو آگ لگاتے ہیں یا سلمان تاثیر کے قاتل ممتاز قادری کو وکلا

برادری پھولوں کے ہار پہناتی ہے تو ضیاالحق کا جبڑہ مسکراتا ہے۔ جب طالبان گردنیں کاٹ کر سروں کو فٹ بال بنا کر کھیلتے ہیں تو وہ جہنم کی آگ میں سے سر نکال کر قہقہہ بلند کرتا ہے۔ پیپلز پارٹی کا پرانا کارکن جب نعرہ لگاتا ہے ''زندہ ہے بھٹو زندہ ہے'' تو اس کا جواب آتا ہے ''وہ نہیں میں زندہ ہوں۔''

ایک دن اس نے اپنی ناجائز صدارت کو جائز قرار دینے کے لئے ریفرنڈم کروایا اور عوام سے ایک سوال پوچھا کہ ''کیا آپ ملک میں نفاذ شریعت چاہتے ہیں۔ اگر جواب ہاں ہے تو پھر جنرل ضیاالحق اگلے پانچ سال کے لئے پاکستان کے صدر ہیں''۔ اس جعل سازی پر سید محمد تقی کا تبصرہ سب سے عمدہ تھا۔ انہوں نے کہا کہ ''صاحب منطقی اعتبار سے ریفرنڈم والا سوال ایسا ہی ہے جیسے کہ میں آپ سے پوچھوں کہ کیا آپ بینگن کو سبزی مانتے ہیں۔ اگر جواب ہاں ہے تو پھر آج کے بعد سے آم بھی سبزی ہے۔''

الذوالفقار اور طیارے کا اغوا

ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی جان دے کر ایک بار پھر پیپلز پارٹی کو زندہ کر دیا۔ غریبوں کو، اجڑے ہوئے غم خانوں میں بیٹھے مایوس عوام کو ایک بار پھر زندہ رہنے کا حوصلہ ملا۔ وہ غریب کارکن جو کل تک ناراض تھے، آج اپنی جانیں نچھاور کر رہے تھے، والہانہ عشق کے ساتھ قربانی کے جذبے کے ساتھ ضیاالحق کے مظالم کا مقابلہ کر رہے تھے۔ یہ وہ تھے جن کے دل و دماغ کی اقدار نے ابھی زندگی کے گھٹیا پن سے معاہدہ کرنا نہیں سیکھا تھا۔ بےنظیر اور بیگم صاحبہ کو کبھی جیل میں قید اور کبھی گھر میں نظر بند رکھا جاتا۔ میر مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو لندن سے کابل منتقل ہو چکے تھے۔ پیپلز پارٹی کے جان نثار کوڑے پھانسیوں کی پرواہ کئے بغیر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر کابل کا رخ کرتے۔ ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری رہتے۔ ضیاالحق ان سب کو گرفتار کرنے میں مصروف تھا۔ میرا گھر ان سر پھرے انقلابیوں کا گھر تھا۔ ان میں وہ تمام تھے جو خود کو، اپنے نام کو، اپنے وجود کو ایک سوچتے ہوئے ماضی میں داخل کر رہے تھے۔ رات کے اندھیرے میں کابل جاتے ہوئے کبھی کبھار وہ کچھ دیر ستانے کے لئے میرے پاس رک جاتے۔ مجھے ابھی تک انسانیت کی آخری اچھائی اور کامیابی پر اعتماد تھا۔

مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو، دونوں بھائیوں نے لندن قیام کے دوران اپنے والد کی جان کو بچانے کے لئے دنیا بھر کے سربراہان مملکت سے ملاقاتیں کیں، اخبار نکالا، مظاہرے کئے، پریس کانفرنسیں کیں مگر ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔ اب وہ ضیاالحق سے انتقام لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے پیپلز لبریشن آرمی قائم کرنے کا اعلان کیا۔

PLA نام کے اعتبار سے یاسر عرفات کی PLO کے قریب تھی۔ اس کا سربراہ میجر افتخار (آج کل بیرسٹر افتخار) کو بنایا گیا جنہوں نے ضیاالحق کی آمریت کے خلاف بغاوت کر کے فوج سے استعفیٰ دے کر لندن میں جلاوطنی اختیار کر لی تھی۔ وہ مرتضیٰ اور شاہنواز کے قریب اور قابل اعتماد ساتھیوں میں تھے۔ جلاوطنی میں آنے کے بعد میرے اور ان کے درمیان 1983ء سے جو محبت وعزت واحترام کا رشتہ قائم ہوا وہ اپنی تمام توانائیوں کے ساتھ آج تک قائم ہے۔

مئی 1979ء میں مرتضیٰ، شام کے صدر حافظ الاسد سے ملاقات کے لئے دمشق گئے، پھر کرنل قذافی سے ملے اور یاسر عرفات سے ملاقات کی جس نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ یہ تینوں رہنما بھٹو صاحب کے دوستوں میں شمار ہوتے تھے اور مشکل وقت میں ہمیشہ کام آئے تھے۔ مرتضیٰ نے اپنے باپ کے ایک اور دوست متحدہ امارات کے شیخ زید بن سلطان النہیان سے بھی اس ضمن میں ملاقات کی مگر وہ اس منصوبے پر رضامند نہ ہوا۔ اس نے مرتضیٰ کو دس ہزار ڈالر کا تحفہ دے کر مشورہ دیا کہ لندن چلے جاؤ، شادی کرو اور گھر بساؤ۔

افغانستان میں بڑی تبدیلی آچکی تھی۔ مرتضیٰ کابل آگئے۔ شاہنواز بھی کچھ دن لندن میں رہ کر مرتضیٰ کے ساتھ آن ملے۔ بھٹو صاحب نے اپنے آخری خط میں مرتضیٰ کو مشورہ دیا تھا کہ اگر ضرورت پڑے تو کابل چلے جانا۔ وہ پاکستان کے قریب بھی ہے اور تحریک خلافت میں عبیداللہ سندھی سمیت اس تحریک کے رہنماؤں نے انگریز کے خلاف کابل میں ہی جلاوطن حکومت قائم کی تھی۔ بھٹو صاحب کے دادا میر غلام مرتضیٰ نے بھی کابل میں پناہ حاصل کی تھی۔

دونوں بھائیوں اور سہیل سیٹھی نے وزیر اکبر خان روڈ پر چکن سٹریٹ بنگلے میں رہائش اختیار کر لی۔ سہیل سیٹھی مرتضیٰ کا لڑکپن کے زمانے کا دوست تھا۔ تین بیڈروم کا یہ گھر جو محل نمبر 2 کہلاتا تھا۔ جرمن سفارت خانہ کے سامنے تھا۔ لیبیا کا سفارت خانہ اس کے دائیں جانب تھی اور پاکستان کا سفارت خانہ آدھے کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ افغان حکومت نے انہیں ایک گاڑی اور عبدالرحمن ڈرائیور بھی دیا ہوا تھا۔

دونوں بھائیوں نے مل کر اپنی تنظیم کا منشور لکھا اور اس کا نام الذوالفقار رکھا۔
پاکستان سے اکثر طالب علم جن کا تعلق قائداعظم یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی سے تھا وہ اور پیپلز پارٹی کے سیاسی کارکن کابل کا رخ کرنے لگے۔ بہت جلد ان کے گرد تقریباً سو کارکن جمع ہو گئے۔ تنظیم کی تین شاخیں تھیں۔ ملٹری ونگ، پولیٹیکل ونگ اور سیکیورٹی ونگ۔ مرتضیٰ الذوالفقار کے سیکرٹری جنرل اور پولیٹیکل ونگ کے انچارج تھے اور ملٹری اور سیکورٹی ونگ شاہنواز کے ذمے تھے۔ سہیل سیٹھی جو مرتضیٰ اور شاہنواز کے ساتھ رہا ہے، اس نے کابل میں ہونے والی سرگرمیوں اور حالات کی تفصیلات جو فاطمہ بھٹو کو بتائی ہیں، وہ انہوں نے اپنی کتاب Songs of Blood and Sword میں قلمبند کی ہیں۔

سہیل کا کہنا ہے کہ جہاز کے اغوا کے واقعہ سے چند ماہ پیشتر کراچی سے تین لوگ آئے۔ سلام اللہ ٹیپو، اس کا کزن اور ایک دوست۔ سلام اللہ ٹیپو ایک خوبصورت آدمی تھا۔ فوج میں بھی رہ چکا تھا مگر تربیت کے دوران نکال دیا گیا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ کراچی یونیورسٹی میں اس نے اسلامی جمعیت طلبا کے ساتھ کئی لڑائیاں لڑی تھیں۔ مگر وہ پیپلز پارٹی کی صفوں میں سے نہیں آیا تھا اور نہ ہی ہماری تنظیم کا حصہ تھا۔ اپنے بارے میں جو کہانی وہ بتاتا تھا وہ صاف اور واضح نہیں تھی۔ ایک روز ٹیپو نے مرتضیٰ کو مشورہ دیا کہ دنیا کی دیگر تنظیموں کی طرح الذوالفقار کو بھی جہاز اغوا کرنا چاہیے۔ پاکستان کی جیلوں میں کارکن بند ہیں، عدالتوں سے انہیں انصاف میسر نہیں جہاز اغوا کر کے کارکنوں کو رہا کروایا جاسکتا ہے۔ مرتضیٰ نے اس کی تجویز کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمارا مقصد PIA یا کسی بھی ادارے کو نقصان پہنچانا یا پاکستان کے شہریوں کو تکلیف پہنچانا نہیں۔ ہماری مخالفت ضیاالحق اور اس کی آمریت سے ہے۔ اس نے موقع دیکھ کر ایک بار پھر اس تجویز کو دُہرایا تو مرتضیٰ نے اس کو سختی سے منع کر دیا۔ ٹیپو اور اس کے دونوں ساتھی واپس پاکستان چلے گئے۔

ایک شام ساڑھے پانچ بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی۔ فون ملوانے والے نے مرتضیٰ کو کہا کہ سلام اللہ ٹیپو آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ اس نے PIA کا جہاز اغوا کر کے کابل لا کر کھڑا کیا ہے۔ میں کابل ایئرپورٹ کنٹرول ٹاور سے بول رہا ہوں۔ مرتضیٰ کو اس

وقت اندازہ ہوا کہ اس کے نام پر جہاز اغوا کیا گیا ہے۔ یہ مارچ 1981ء کی بات ہے۔

کراچی سے پشاور جانے والی پی آئی اے کی پرواز اندرون ملک پرواز تھی جسے ٹیپو نے اپنے دو ساتھیوں کی مدد سے اغوا کیا تھا۔ جہاز کو پہلے مشرق وسطیٰ لے جانے کا حکم دیا گیا۔ جب پائیلٹ نے بتایا کہ جہاز میں اس قدر ایندھن نہیں تو پھر اسے کابل اتارا گیا۔ سہیل بتاتا ہے کہ ان دنوں ہمارے تعلقات افغان حکومت کے ساتھ ناخوشگوار تھے کہ اس واقعہ نے مزید مشکلات پیدا کر دیں۔ افغان حکومت الذوالفقار پر گہری نظر رکھے ہوئے تھی۔ پاکستان سے آنے والوں میں سے کچھ افغان حکومت کے لئے جاسوسی کر رہے تھے اور کچھ آئی ایس آئی کے لئے۔ جہاز کا اغوا ٹیپو نے کیا مگر مرتضیٰ کے گلے پڑ گیا جسے مرتضیٰ کو اپنانا پڑا۔

ان دنوں یعنی 1981ء میں ایم آر ڈی Movement for the Restoration of Democracy قائم کی گئی تھی جس میں مختلف الخیال سیاسی جماعتیں شامل تھیں مگر قیادت پیپلز پارٹی کے پاس تھی۔ فروری 1981ء میں جمہوریت کی بحالی کے لئے تحریک چلانے کی ابتدا ہوئی تو بہت جلد تحریک نے طاقت پکڑ لی اور پورے ملک میں تحریک پھیل گئی۔ مردوں کے ساتھ خواتین نے بھی اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور کارکنوں نے بے مثال قربانیاں پیش کیں۔ مارچ 1981ء میں ہونے والے طیارے کے اغوا کے واقعہ کے بعد پورے ملک سے پندرہ ہزار افراد کو گرفتار کر لیا گیا اور ایم آر ڈی کی تحریک وقتی طور پر ٹھنڈی پڑ گئی۔ یہ تحریک ضیاالحق کی آمریت کے خلاف تھی۔

طیارے کے اغوا کے موقع پر اکثر پاکستانیوں کا خیال تھا کہ یرغمال مسافروں کی رہائی کے بدلے میں جمہوریت کی بحالی کا مطالبہ کیا جائے گا۔ تمام سیاسی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ ہوگا اور انتخابات کروانے کی تاریخ کے اعلان کا مطالبہ کیا جائے گا۔ مگر جو مطالبہ سامنے آیا وہ 55 افراد کی رہائی کا مطالبہ تھا جن میں سے اکثر اپنی قید کی مدت پورے کر کے رہا ہونے والے تھے۔ کچھ نے مزاحمت کی بلکہ خورشید حسن میر نے جب ملک سے باہر

جانے سے انکار کیا اور انہیں زبردستی لے جایا جانے لگا تو انہوں نے باقاعدہ لڑائی لڑی جسے ٹی وی پر بھی دکھایا گیا۔ وہ ملک سے باہر نہیں گئے۔

اس دوران جبکہ ہائی جیکروں کے ساتھ حکومت کی طرف سے بھیجے گئے نمائندے مذاکرات کر رہے تھے تو ایک مسافر طارق رحیم کو یہ سمجھ کر کہ وہ گورنر بلوچستان جنرل رحیم الدین خان کا بیٹا ہے، گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ کیپٹن طارق رحیم بھٹو صاحب کا اے ڈی سی تھا۔ نہایت مہذب، خوش اخلاق، خوبصورت اور سمارٹ۔ بھٹو صاحب سے ملاقات کے دوران میں دو تین بار اس سے مل چکا تھا۔ میرے گھر میں لٹکی ہوئی تصویر جو کہ میری بھٹو صاحب کے ساتھ ایک یادگار تصویر ہے، طارق رحیم سفید یونیفارم میں ملبوس ان کے پیچھے کھڑا ہے اور پوچھتا ہے کہ میرا قصور کیا تھا۔

دنیا کی یہ طویل ترین ہائی جیکنگ تھی جو تیرہ دن تک جاری رہی۔ کابل سے طیارہ دمشق لے جایا گیا 54 افراد کے بدلے جہاز کے مسافروں کو رہا کیا گیا۔ PIA کا یہ جہاز مسافروں کو عمرہ کرواتا ہوا جب واپس پشاور پہنچا تو ضیاالحق نے مسافروں کا استقبال کیا۔ اس روز بارش ہو رہی تھی۔ مشن مکمل ہو چکا تھا۔ ملک بھر کے سیاسی رہنما اور کارکن جیلوں میں بھر دیئے گئے۔ ایم آر ڈی کی تحریک وقتی طور پر دبا دی گئی۔ بعد میں خبر آئی کہ ٹیپو نے افغان سیکورٹی کے ایک فرد کا قتل کر دیا جس کی وجہ سے وہ افغان قید میں رہا اور 1984ء میں اسے پھانسی دے دی گئی۔

''جمہوری پاکستان'' پمفلٹ کیس، اساتذہ کو قید کر دیا گیا

جمیل عمر سات سال، طارق احسن تین سال اور ڈاکٹر سلیم دو سال

اسی سال نومبر میں قائداعظم یونیورسٹی کے تین اساتذہ پمفلٹ کیس میں گرفتار کر لئے گئے۔ اس زمانے میں ضیاالحق کی بدترین آمریت کے خلاف زیر زمین کام ہو رہا تھا۔ سٹڈی سرکلز چل رہے تھے، پمفلٹ لکھے اور تقسیم کئے جا رہے تھے۔ فیض احمد فیض، حبیب جالب، احمد فراز، استاد دامن اور بہت سے شاعروں، ادیبوں کی اکثریت جبر کے اس دور

میں مزاحمتی ادب تخلیق کر رہے تھے۔ یہ تحریک اپنے عروج پر تھی۔ عوام بھی ضیا اور اس کے حواریوں کے بارے میں نت نئے لطیفے تخلیق کرتے جو نہایت تیزی سے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل جاتے۔ غم و غصے کا لاوا تھا جو عوام میں پک رہا تھا۔ سیاسی کارکن اپنی جسمانی اور روحانی تکلیف کو نہایت خاموشی اور بہادری کی شان کے ساتھ برداشت کر رہے تھے۔

تین نومبر 1981ء کی رات کو جمیل عمر جو کہ کمپیوٹر سائنسز میں لیکچرار تھے اسلام آباد کی مارکیٹ میں بند دوکانوں کے شٹرز کے نیچے سے ''جمہوری پاکستان'' پمفلٹ دکانوں میں ڈال رہے تھے کہ ایک پولیس اہل کار نے گشت کے دوران جمیل عمر کو چور سمجھ کر پکڑا تو اس کے پاس سے پمفلٹ برآمد ہوئے۔ جمیل عمر کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس 50 سی سی ہونڈا موٹر سائیکل کو بھی جو جمیل نے طارق احسن سے مانگ کر استعمال کی تھی۔ طارق احسن جو قائداعظم یونیورسٹی کی جانب سے امریکہ کی کارلٹن یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کی غرض سے گئے تھے ان دنوں چھٹیوں میں اپنے والدین سے ملنے کے لئے آئے ہوئے تھے اور ان کے فرشتوں کے علم میں بھی نہیں تھا کہ جمیل عمر کس مشن پر گئے ہیں۔ صبح کو طارق احسن کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور ان کے ساتھ ہی کیمسٹری کے استاد ڈاکٹر محمد سلیم کو بھی۔ سلیم کے گھر پر چھاپہ مارا گیا اور پمفلٹس اور کتابیں اس طرح قبضے میں لی گئیں گویا کہ ''مجرم کے پاس سے آلہ قتل برآمد کیا گیا ہو۔'' اساتذہ کے گھر سے کتابیں ہی برآمد ہو سکتی ہیں۔ یہ الگ بات کہ بھٹو صاحب کے دور میں استاد دامن کے چھوٹے سے کمرے سے چھاپہ ڈلوانے والوں نے بھاری تعداد میں اسلحہ اور بارود بھی برآمد کروالیا تھا۔ استاد کا کہنا تھا کہ اگر میرا کمرہ ذرا سا بھی بڑا ہوتا تو شاید توپ بھی برآمد ہو سکتی تھی۔ نکالنے والوں نے تو آفتاب گل کے بیڈروم سے بھی میزائل برآمد کئے تھے۔

محمد سلیم کے گھر سے برآمد شدہ کتابوں میں سے ایک کتاب جو اصل میں سٹالن اور سوویت یونین میں سوشلزم کے خلاف تھی۔ ضیا الحق لے کر ٹی وی پر نمودار ہوا اور اعلان کیا کہ قائداعظم یونیورسٹی ''کافروں اور سوشلسٹوں'' کا گڑھ بن چکی ہے۔ اساتذہ کے گھروں

میں سے اس طرح کی کتابیں برآمد ہو رہی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ جن لوگوں نے Alexander Solzhenitsyn کی کتاب Cancer Ward کو پڑھا ہوا تھا وہ ضیاالحق کی جہالت سے یقیناً محظوظ ہوئے ہوں گے۔ قوم سے کئے گئے اپنے اس خطاب میں ضیاالحق نے اس انسپکٹر پولیس کو ترقی دینے اور انعام واکرام سے نوازنے کا اعلان کیا جس نے جمیل عمر کو گرفتار کیا تھا۔ جمیل عمر پر بے پناہ تشدد کیا گیا۔ فوجی عدالت نے جمیل عمر کو سات سال، طارق احسن کو تین سال اور محمد سلیم کو دو سال قید بامشقت کی سزا دی۔ جمیل کو ہمیشہ یہ افسوس رہا کہ اس نے طارق احسن سے موٹر سائیکل کیوں ادھار مانگی۔ ان تینوں کے خاندان تباہ ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ سرور باری وغیرہ بھی گرفتار کئے جاتے وہ ملک چھوڑ کر لندن چلے گئے۔ یہ کوئی جرائم پیشہ افراد نہیں تھے۔ ان کا جرم اتنا ہی تھا کہ ملک میں جمہوریت دیکھنا چاہتے تھے اور ضیاالحق کی ظلمت کے خلاف تھے۔

اساتذہ کے گرفتار ہونے کے باوجود ''جمہوری پاکستان'' پمفلٹ بدستور نکل رہا تھا۔ تفتیشی ایجنسیوں نے یونیورسٹی میں بالخصوص میرے دفتر میں استعمال ہونے والی سائیکلوسٹائل مشین کے پرنٹس کا موازنہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس سارے کام کا سربراہ میں ہوں۔ میرے دفتر کی مشین UNDP کی طرف سے دی ہوئی مشین تھی جو کہ اپنا مخصوص پرنٹ رکھتی تھیں۔ چنانچہ اس کیس میں پھنسانا مشکل تھا۔

ضیاالحق یونیورسٹی سے بے زار تھا۔ وہ کئی بار کہہ چکا تھا کہ میں یونیورسٹی کو ریماؤنٹ ڈپو یعنی خچروں کے اصطبل میں تبدیل کر دوں گا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ یونیورسٹیاں بننے میں صدیاں لگتی ہیں۔ وہ خود کبھی کسی یونیورسٹی میں تعلیم کی غرض سے گیا ہی نہیں تھا۔ یونیورسٹی بائیں بازو کا مرکز تھی۔ ایمپلائز یونین کے صدر شیخ عبدالرشید کے چھوٹے بھائی شیخ اشرف تھے جنہیں 1975ء میں ہی میں یونیورسٹی میں لے آیا تھا۔ سٹوڈنٹس یونین اکثر ہی بائیں بازو کے پاس رہی تھی۔ ان دنوں بھی یونین کے صدر اظہر ملک تھے جو نہ صرف سرگودھا سے تھے بلکہ میرے زیرزمین سٹڈی سرکلز میں بھی باقاعدگی سے آتے تھے۔ اساتذہ کی یونین بھی بائیں بازو کی تھی۔ دراصل یہ تنظیمیں ہی میری طاقت تھیں۔ جب تک ضیاالحق صدر رہا وہ

یونیورسٹی کا چانسلر ہونے کے ناطے ایک بار بھی کیمپس میں ''ہائی رسک'' کی وجہ سے نہ آ سکا۔ بلکہ جرمن پروفیسر این مری شمل کو بھی اعزازی ڈگری پریذیڈنٹ ہاؤس میں کانووکیشن کی تقریب منعقد کر کے دی گئی۔ اس روز ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔

پریذیڈنٹ ہاؤس میں دو روز تک اس تقریب کی ریہرسل ہوتی رہی۔ اس کو ڈین فیکلٹی آف نیچرل سائنسز کیمسٹری کے پروفیسر محبوب نے کنڈکٹ کرنا تھا۔ وہ یوپی کے رہنے والے چھوٹے سے قد کے نہایت ہی مرنجاں مرنج شخصیت کے مالک تھے۔ ہال میں پروسیشن آنے کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ وہ وائس چانسلر کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم سے یہ کام نہیں ہو پائے گا۔ ان کا رنگ زرد تھا اور قریب تھا کہ بے ہوش ہو جائیں۔ کہنے لگے کہ ''ہمارے ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں۔ کلاس میں پڑھانا اور بات ہے مگر یہ ہمارے بس کی بات نہیں''۔ وائس چانسلر شیخ امتیاز علی کافی پھکڑ واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ڈاکٹر محبوب کو اپنے مخصوص انداز میں ''کچھ'' کہا اور مجھے کہنے لگے کہ زیدی مجھے نہیں معلوم تم کیسے کرو گے مگر اب یہ فنکشن تمہارے ذمے ہے۔ دس منٹ کے بعد پروسیشن نے ہال میں داخل ہونا تھا۔ میں نے ڈاکٹر محبوب سے نوٹس لئے اور سٹیج پر جا کھڑا ہوا۔ پروسیشن ہال میں داخل ہوا، میں نے سب سے کھڑے ہونے کی درخواست کی تو ضیاالحق جو ایک قطار کو لیڈ کر رہا تھا اس نے اپنی سرمے سے بھری آنکھوں کیساتھ مجھے غور سے دیکھا اور غالباً غصے کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ دوسری قطار کو پروفیسر این مری شمل لیڈ کر رہی تھیں۔ کانووکیشن ختم ہوئی۔ ڈگری دے دی گئی۔ چائے کے دوران وہ گھومتا گھماتا میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ کالی اچکن کیوں نہیں پہنی۔ میں نے عرض کی کہ اس فنکشن کو کنڈکٹ کرنا میرے ذمے نہیں تھا۔ دوسرا یہ کہ میرے جیسے شخص کے لئے آج کل اچکن پہننا بہت مہنگا کام ہے۔ میرے ذو معنی فقرے کا اس نے جواب نہیں دیا۔ البتہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا کہ آپ آج کل دوسرے کاموں میں جو مصروف ہیں۔

پکا مرکنٹائل کا ''امیر المومنین'' اور علامہ اقبال کا ''مرد مومن'' ملک کے منتخب وزیراعظم کا عدالتی قتل کروانے کے بعد جمہوریت کا مطالبہ کرنے والوں پر کوڑے برسا رہا

تھا اور پھانسی پر لٹکا رہا تھا۔ ''اسلامی'' غنڈے دندناتے پھر رہے تھے۔ قائداعظم کو کافراعظم کہنے والے اس کے ساتھ اقتدار اور مظالم میں شریک تھے۔ کل تک جو گمنام تھے یا جعلی کارناموں میں مصروف رہے تھے وہ مرکزی اور صوبائی وزیر تھے۔ پورے ملک کی قسمت کا فیصلہ ان کے ہاتھوں میں تھا۔ آج تک یہ کسی نہ کسی شکل میں پاکستان کی سیاست پر قابض ہیں۔ ٹارگٹ کلنگ ہو یا دہشت گردی، یہ ہر صبح اپنے اصطبل میں سکونِ قلب کے ساتھ، اطمینان کے ساتھ کھڑے ہنہنا رہے ہوتے ہیں۔ اپنے مخالفین پر چھوڑنے کے لئے انہوں نے کچھ غیر نسلی بھی پال رکھے ہیں جو مختلف ٹی وی پروگراموں میں آ کر ایک دوسرے پر غراتے ہیں اور کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔ حکمرانوں کی اور ''حکمران حزب اختلاف'' کی صبح خوشگوار و دلکش اور رات رنگین و حسین ہے۔ یہ جانے بغیر کہ وقت چیختا ہوا ان کے قریب سے گزر رہا ہے۔

لیبیا سازش کیس

ہم گاؤں گاؤں کے بیلداروں، چوکیداروں، کھیت مزدوروں، شہر کے طالب علموں، ترقی پسند سیاسی کارکنوں، مزدوروں اور محنت کشوں کو ایک لڑی میں پروکر ان کی بکھری ہوئی قوت کو کنارہ بند کرنے میں مصروف تھے۔ انقلابی کارکن چھپتے پھر رہے تھے۔ ہمارے زیرزمین سٹڈی سرکلز جاری تھے۔ عمر اصغر ہوں یا نذیر بلوچ، اقتدار علی شاہ ہوں یا ثریا شہاب، یہ سب ان میں شامل ہوتے۔ پنجاب کے لئے راولپنڈی ان دنوں مرکز تھا۔ راولپنڈی کے علاوہ، لاہور، فیصل آباد حتیٰ کہ چنیوٹ اور قصور جیسے شہروں میں یہ سٹڈی سرکل قائم ہوگئے تھے۔ ہماری ایک کوشش یہ بھی تھی کہ لبرل اور ترقی پسند جماعتیں اور افراد کسی ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوکر متحدہ محاذ بنائیں یا مدغم ہوکر ایک نئی سیاسی جماعت قائم کرلیں۔ اس ضمن میں خورشید حسن میر کی عوامی جمہوری پارٹی، طفیل عباس کا قومی مزدور محاذ، غوث بخش بزنجو کی پی این پی، تاج محمد لنگا کی سرائیکی پارٹی، سندھ اور سرحد کے گروپس اور افراد کے ساتھ کئی ملاقاتیں ہونے کے بعد کم از کم نکات پر اتفاق واتحاد قائم ہوگیا تھا۔

اس کے تنظیمی معاملات طے ہونے کے بعد اس کا اعلان کیا جانا تھا کہ اچانک ایک روز علی الصبح طارق خورشید اور مسز افضل توصیف میرے گھر پہنچے۔ اس وقت شوکت چودھری کچھ معاملات طے کرنے کے سلسلے میں میرے پاس آئے ہوئے تھے۔ افضل توصیف کہنے لگیں کہ ہم لیبیا سے براستہ لندن آرہے ہیں۔ بریگیڈیئر عثمان نے لیبیا میں ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ انہوں نے ایک خط اپنی بہن ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف کے نام دیا ہے جو ہم نے انہیں دینا ہے اور لیبیا میں ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا اس پر ان کے ساتھ

بات کرنی ہے۔ مگر وہ نہ تو ہمارے فون کا جواب دیتی ہیں اور نہ ہی ہم سے ملنے کو تیار ہیں۔ بریگیڈیئر نے انہیں ہمارے خلاف کر دیا ہے۔ اب تم انہیں اپنے گھر بلا کر ہماری ملاقات کراؤ اور ہم اسی وجہ سے تمہارے پاس آئے ہیں۔ انہوں نے لیبیا میں ہونے والے واقعات کی تفصیلات مجھے اس طرح شکایتاً سنانا شروع کیں گویا کہ میں نہ صرف اس کا حصہ ہوں بلکہ اس مہم جوئی کے رہنماؤں میں شامل ہوں۔ جبکہ اس لمحے سے پہلے تک میرے فرشتوں کو بھی اس سارے معاملے کا علم نہیں تھا۔

پہلی بار اس مہم جوئی کی تفصیلات جب میرے سامنے آئیں تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس لئے کہ اگر اتنے قریبی اور پرانے دوست یہ سمجھتے ہیں تو پھر کوئی بھی یہ یقین نہیں کرے گا کہ میں اس کا حصہ نہیں۔ دوسرا یہ کہ وہ تمام سیاسی کام جو اس وقت تک ہم پاکستان میں کر رہے تھے اس پر نہ صرف پانی پھر جائے گا بلکہ تمام دوست، ساتھی اور سیاست دان اس میں گھسیٹ لئے جائیں گے۔ یہ مہم جوئی جس بدنظمی اور غیر محتاط انداز میں کی گئی، گرفتاریاں، مقدمات اور سزائیں اس کا لازمی نتیجہ تھا۔

افضل توصیف اپنی کتاب ''لیبیا سازش کیس'' میں صفحہ 76 پر لکھتی ہیں ''یہ ملاقات جعفر زیدی کے گھر ہوئی۔ اگرچہ محترمہ (ڈاکٹر کنیز فاطمہ) کو اس ملاقات کا علم نہیں تھا۔ وہ تو نجمہ (بریگیڈیئر عثمان کی بیگم) کی بیٹی کا سامان لینے آئی تھیں۔ بھائی کے خطوں سے اسے ہماری خاص کر میری ''بدذاتی'' کا علم ہو گیا تھا کہ میں اس کے بھائی کے پلان کی دھجیاں بکھیر آئی ہوں۔''

یہ وہ افضل توصیف ہیں جو ساٹھ کی دہائی سے ڈاکٹر صاحبہ کی دوست رہی تھیں۔ جب ڈاکٹر کنیز یوسف کوئٹہ کالج کی پرنسپل تھیں تو افضل توصیف وہاں پر لیکچرار تھیں۔ میرے ساتھ ان کی ملاقات ڈاکٹر صاحبہ نے غالباً 70-1969ء میں کروائی تھی اور اس ملاقات کا مقصد یہ تھا کہ افضل توصیف قلمی نام سے ہفت روزہ نصرت میں لکھنا چاہتی تھیں۔ ابتدائی طور پر ان کی تحریریں بہت کھردری اور خام تھیں جنہیں کاٹ چھانٹ کر کے چھپنے کے قابل بنایا جاتا۔ مگر ان کی تحریروں میں ایک کاٹ تھی۔ افضل ارشاد کے نام سے انہوں نے میری

ادارت میں، ڈاکٹر صاحبہ کی سفارش پر لکھنا شروع کیا۔ سنا ہے کہ بعد میں وہ بڑی ادیبہ کہلائی جانے لگی تھیں۔

جب بھٹو صاحب اقتدار میں آئے تو افضل توصیف نے حنیف رامے کے ذریعے جو ان دنوں چیف منسٹر تھے ملازمت میں ترقی حاصل کی، لاہور کے جی او آر میں سرکاری بنگلہ حاصل کیا اور بعد میں جب ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف اسلام آباد یونیورسٹی کی وائس چانسلر بنائی گئیں تو اپنے خاوند کو کمپیوٹر سائنسز میں بھرتی کروایا۔ اب وہ ڈاکٹر صاحبہ کے خلاف تھیں۔ انہوں نے لیبیا سازش کیس کے نام سے جو کتاب لکھی اس میں انہوں نے ان مراعات کا ذکر نہیں کیا جو پیپلز پارٹی یا دوستوں کی وجہ سے انہیں حاصل ہوئیں۔ البتہ ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف، طارق خورشید سے لے کر پیپلز پارٹی اور بے نظیر تک کسی کو بھی اس بنیاد پر نہیں بخشا کہ کسی نے ان کا ''خیال'' نہیں کیا۔

لیبیا سازش کیس میں وہ کبھی گرفتار نہیں ہوئیں۔ وہ اپنی کتاب کے صفحہ 100 پر لکھتی ہیں ''جو ہو سو ہو۔ قید، کوڑے، پھانسی۔ مجھے گرفتاری دے کر باقی سب کی مشکل آسان کر دینا چاہیے۔ اس کا ذکر اعتزاز سے کیا تو اس نے مشورہ دیا کہ گرفتاری کسی اہم جگہ سے اور بہت سے لوگوں کے سامنے ہونی چاہیے۔ طے ہوا کہ اس کے آفس سے گرفتاری دی جائے اور میں صبح سے وہاں جا کر بیٹھ گئی۔ وقت گزرتا رہا۔ اعتزاز کا منشی اور جونیئر مجھے چائے پانی پوچھتے رہے اور میں اس کی لائبریری سے نکال کر کتابیں پڑھتی رہی...... شام ڈھل گئی۔ اعتزاز کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ وہ اپنے دفتر آیا ہی نہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔''

گرفتاری تو افضل توصیف نہ دے سکیں مگر اس کیس میں وہ وعدہ معاف گواہ بن گئیں۔ اور اس کا مقصد وہ یہ بیان کرتی ہیں کہ میں طارق خورشید سمیت تمام ملزموں کو قید اور پھانسی کے پھندے سے بچانا چاہتی تھی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے اپنی گواہی کے ذریعے 13 انسانوں کی رہائی کروائی اور پانچ کی جان بچائی۔

طارق خورشید قائداعظم یونیورسٹی کے ان طالب علموں میں سے تھے جو

مارکسسٹ نظریات وتعلیمات کی روشنی میں انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے اور اسی حوالے سے سیاست میں حصہ لیتے رہتے تھے۔ دوستیاں ان کی صفدر ہمدانی کے ساتھ بھی تھیں اور حفیظ اللہ نیازی کے ساتھ بھی، مگر نظریات پر سمجھوتہ کرنا نہیں جانتے تھے۔ ان دنوں یونیورسٹی میں صفدر ہمدانی ان کے لیڈر تھے جن کا نظریاتی تعلیم کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ہمدانی ترقی پسندوں، سوشلسٹوں اور نظریاتی سیاست کرنے والوں کو اچھا سمجھتے تھے اور ان کا ساتھ ذاتی دوستی میں دیتے تھے۔ بہت جذباتی مگر دیانت دار، انا کو جہاں ٹھیس پہنچی اور دوستی ختم، بلکہ مخالفت شروع۔ مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو کے ساتھ بھی رہے اور بے نظیر کے پرنسپل سیکرٹری بھی مگر لڑ کر علیحدہ ہو گئے۔

بھٹو صاحب کے دور اقتدار میں جب محمد حنیف رامے کو پنجاب کی وزارت عظمٰی سے ہٹایا گیا تو انہوں نے پیپلز پارٹی چھوڑ کر راجہ منور کے ذریعے پیر پگاڑو کی جماعت میں شمولیت اختیار کی تو صفدر ہمدانی نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ڈاکٹر کنیز یوسف کے خلاف تحریک چلائی، ڈاکٹر صاحبہ کو جانا پڑا، وجہ نظریاتی نہیں، ذاتی تھی۔ وہ یونیورسٹی کے پی آر او بننا چاہتے تھے۔ قوانین کے مطابق اس عہدے کے لئے ایم اے کی ڈگری اور پانچ سالہ صحافت کا صف اول کے اخبار کا تجربہ درکار تھا جو ان کے پاس نہیں تھا۔ مگر وہ مصر تھے کہ انہیں عارضی طور پر لگا دیا جائے۔ ان دنوں قوانین کا احترام کیا جاتا تھا اور یہ ایک ایسا غیر قانونی کام تھا جو مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ مگر وہ ناراض ہو گئے۔ لڑ پڑے اور اس لڑائی میں خود بھی زخمی ہوئے اور دوسروں کو بھی لہولہان کیا۔ پھر طارق خورشید اور صفدر ہمدانی کی ڈاکٹر صاحبہ کے ساتھ دوبارہ دوستی ہو گئی۔ اسی دوستی کے نتیجے میں وہ لیبیا پہنچے، ان دنوں میں پولینڈ میں تھا۔

لیبیا سازش کیس پر دوسری کتاب طارق خورشید کی ہے۔ طارق نے لیبیا سازش کیس پر پوری دیانت داری اور تفصیل کے ساتھ جو آپ بیتی کتابی شکل میں تحریر کی اس کا عنوان ہے ''سوئے دار''۔ جیلوں میں، اٹک قلعہ اور لاہور قلعہ جیسے اذیت خانوں میں ان دنوں سیاسی کارکنوں کے ساتھ ضیاالحق نے جو ظلم کیا اس پر یہ کتاب ایسا تکلیف دہ منظرنامہ پیش کرتی ہے جسے پڑھ کر آپ اپنی آنکھوں کو بھیگتا ہوا محسوس کرتے ہیں اور اداسی کی چادر کئی روز تک

آپ کو اپنی لپیٹ میں لئے رکھتی ہے۔ طارق خورشید نے قلم کی امانت میں خیانت نہیں کی۔
طارق اپنی کتاب کے صفحہ 98 پر لکھتے ہیں۔ ''فرخندہ بخاری، افضل توصیف اور صفدر ہمدانی
بھی واپس آ چکے تھے۔ ہم نے آپس میں مشورہ کیا اور طے پایا کہ جس طرح یہ سب ہوا ہے
اسی طرح یقیناً ڈاکٹر کنیز یوسف اس سلسلے کو ابھی جاری رکھیں گی۔ لہٰذا آج سے ایک ماہ بعد یا
ایک سال بعد ہمیں اب گرفتار تو ہر صورت میں ہونا ہے لہٰذا اپنے دوستوں کو بچایا جائے......
اس بات پر بھی میرا، افضل توصیف اور صفدر ہمدانی کا اتفاق تھا کہ ڈاکٹر کنیز یوسف سے
دوٹوک بات کی جائے۔ افضل توصیف واپسی پر عثمان خالد کا ایک خط بھی کنیز یوسف کے نام
لائی تھیں۔ لہٰذا فیصلہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحبہ کو ملا جائے۔ ہم دونوں راولپنڈی آئے اور علی جعفر
زیدی کے گھر ڈاکٹر صاحبہ سے ملاقات ہوئی۔ ہمارا خیال اب تک یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحبہ سے
اپنے بھائی کی سیاسی خواہشات جاننے میں غلطی ہوئی ہے۔

''ڈاکٹر صاحبہ کے آنے سے پہلے علی جعفر زیدی اور شوکت جو ہمارے مشترکہ
دوست ہیں...... ایک عمر انہوں نے نظریات کے میدان میں سیاست کرتے گزار دی ہے۔
انہوں نے ہم پر زبردست تنقید کی اور کہا کہ ہم نے بہت بڑی غلطی کی ہے اور ہم نے جو کچھ
کیا ہے وہ ایڈونچر ازم کے علاوہ کچھ نہیں۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ڈاکٹر صاحبہ آ گئیں
اور شوکت اجازت لے کر چلے گئے۔''

میرے ڈرائنگ روم میں کئی گھنٹے کمرہ بند ہونے کے بعد جب تینوں باہر نکلے تو
دونوں خواتین کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں اور طارق خورشید کے چہرے پر سخت غصہ تھا
جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحبہ کے جانے کے بعد جب انہیں یقین
ہو گیا کہ میرے علم میں واقعتاً کچھ بھی نہیں تو انہوں نے مجھے لیبیا مہم کی تفصیلات بتائیں۔
اس کے بعد یہ جاننا مشکل نہیں تھا کہ اب صرف ہفتوں یا مہینوں کی بات ہے کہ ایجنسیاں اپنا
کام شروع کر دیں گی، یہ سب پکڑے جائیں گے، کچھ وعدہ معاف گواہ بن جائیں گے اور
میرا بچنا بھی مشکل ہے۔

پھر وہی ہوا اور جب افضل توصیف کے بیانات کی روشنی میں ڈپٹی ڈائریکٹر ایف

آئی اے میاں شریف میرے پاس آئے تو ان کا تاثر یہ تھا کہ میں اس گروہ کا وہ سرغنہ ہوں جو ڈاکٹر یوسف کو بھی طلب کر سکتا ہے اور ان سب کے آپس میں اختلاف دور کروانے کے اختیارات بھی میرے پاس ہیں۔ ہماری ایجنسیاں اور شاید دنیا بھر کی ایجنسیاں ایک سرا پکڑ کر چل پڑتی ہیں اور کیس کے آخر تک آپ کو اپنے تحقیقاتی نظام میں جکڑے رکھتی ہیں اور اس عمل میں کئی سال بھی لگ جاتے ہیں۔ اس بات کا یقین دلانا کہ میرا اس کیس سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں، وقت طلب بھی تھا اور مشکل بھی۔

سازش تھی کیا؟

لیبیا سازش تھی کیا؟ اس کیس پر بہت کم لکھا گیا مگر ضیاالحق کے دور کا یہ مشہور کیس ہے جسے عالمی شہرت ملی۔ کیونکہ پاکستان میں پہلی مرتبہ کسی غیر ملکی طاقت کے تعاون سے فوجی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کی گئی تھی اور یہ غیر ملکی طاقت لیبیا کے کرنل معمر قذافی کی حکومت تھی جس کا شمار کچھ عرصہ پہلے تک پاکستان کے انتہائی قریبی دوست ممالک میں ہوتا تھا اور لیبیا نے ہزاروں پاکستانیوں کو روزگار مہیا کر رکھا تھا۔

جب کیس چلا اور جو چارج شیٹ ملزمان کو دی گئی اس میں پہلا الزام یہ تھا کہ ملزموں نے لیبیا حکومت کے ساتھ مل کر اور اس کے تعاون سے پاکستان کی قانونی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کی۔ پاکستان کے صدر اور اس کے ساتھی جرنیلوں کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کے لئے فوجی تربیت حاصل کی۔ طارق خورشید نے اس چارج شیٹ کی کاپی ڈاکٹر صغیر کامران کے ذریعے لیبیا کے سفارت خانے تک پہنچائی جس پر لیبیا کی حکومت نے شدید احتجاج کیا۔ ڈاکٹر صغیر کامران میرے زمانہ ادارت میں نصرت میں بھی لکھتے رہے تھے اور ان دنوں پاک لیبیا برادرہڈ ایسوسی ایشن سے وابستہ تھے۔ اس احتجاج کے بعد یہ چارج شیٹ واپس لے لی گئی۔ اس میں ترمیم کی گئی اور نئی چارج شیٹ میں لیبیا حکومت کی جگہ ایک غیر ملکی طاقت لکھا گیا۔

عالمی سطح پر خفت اُٹھانے کا اسی طرح کا ایک کارنامہ ضیا حکومت نے بھٹو صاحب

کی پھانسی سے پہلے بھی کیا تھا۔ تمام اداروں کے سربراہان۔ بالخصوص یونیورسٹیوں کے وائس چانسلرز کو ایک سرکلر جاری کر کے خبردار کیا گیا تھا کہ بھٹو کے ذاتی دوست اور پی ایل او کے سربراہ یاسر عرفات کی تنظیم کی جانب سے گوریلا کاروائی کا خطرہ ہے۔ امکان ہے کہ یاسر عرفات بھٹو کو راولپنڈی جیل سے گوریلا کاروائی کر کے نکال کر لے جانے کی کوشش کریں۔ اس لئے تمام فلسطینی طلبا اور ان کے قریبی دوستوں پر کڑی نظر رکھی جائے۔

لیبیا سازش کا معاملہ کچھ یوں ہے کہ ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف کے چھوٹے بھائی بریگیڈیئر عثمان خالد کو ترقی دے کر جرنیل نہیں بنایا گیا تھا۔ ریٹائرمنٹ قریب تھی۔ جس پر وہ ناراض تھا۔ وہ علاج کی خاطر لندن گیا اور یہ فیصلہ کر کے گیا کہ لندن جا کر ایک پریس کانفرنس کر کے فوج سے استعفیٰ دے کر افواج پاکستان سے اپیل کرے گا کہ وہ ضیاالحق کی آمریت کے خلاف عوام کا ساتھ دیتے ہوئے بغاوت کر دیں۔ یہ نہایت بچگانہ تصور تھا۔ کوئی بھی ذی شعور انسان یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ایک پریس کانفرنس کے ذریعے فوجی انقلاب برپا ہو جائے گا۔ پاکستانی فوج کے ڈسپلن کا یقیناً عثمان خالد کو اندازہ رہا ہوگا۔ دراصل وہ فوج کی نوکری چھوڑ کر اب سیاست میں آنا چاہتا تھا۔

بھٹو صاحب کو ابھی پھانسی نہیں دی گئی تھی۔ ہمدانی جو اس سے پہلے کابل کا چکر لگا کر مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو سے مل کر آ چکے تھے انہوں نے عثمان خالد کو میر مرتضیٰ کے نام رقعہ دیا تھا۔ ان دنوں میر مرتضیٰ لندن میں تھے۔ جب عثمان لندن پہنچا۔ ان ہی دنوں بھٹو صاحب کو پھانسی دے دی گئی۔ جب عثمان خالد نے میر مرتضیٰ بھٹو سے رابطہ کر کے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو انہوں نے اس کی مخالفت اس وجہ سے کی کہ بھٹو صاحب کی پھانسی سے پہلے تو شاید اس اقدام کا کوئی فائدہ ہوتا مگر اب اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔ انہوں نے مشورہ دیا آپ پاکستان واپس جا کر اپنے ہم خیال فوجی افسروں کو ضیاالحق کے خلاف منظم کریں۔ مگر یہ مشکل بات تھی۔

عثمان خالد تو فوج چھوڑ کر سیاست میں آنا چاہتا تھا اور بضد تھا کہ اس کی پریس کانفرنس کروائی جائے۔ چنانچہ مرتضیٰ بھٹو نے یہ کانفرنس منعقد کروادی۔ اس پریس کانفرنس

میں کرنل الیاس شمیم نے بھی بریگیڈیئر عثمان خالد کے ساتھ فوج سے استعفیٰ دینے کا اعلان کیا اور فوج کے نوجوانوں سے اپیل کی کہ وہ ضیاالحق کا تختہ الٹ دیں۔ کرنل الیاس شمیم بھٹو صاحب کے دور میں فوج کے انٹیلی جنس کے محکمے میں کام کرتے تھے۔ ان کی بیگم اور میری بیگم بچپن سے ایک دوسرے کی سہیلیاں تھیں۔ مگر ان کے ساتھ میری ملاقات لندن میں جلاوطنی میں آنے کے بعد ہوئی۔ مرتضیٰ بھٹو کابل جانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ انہوں نے عثمان خالد کو اپنے ساتھ کابل چلنے کے لئے کہا۔ عثمان خالد نے انکار کر دیا اور اس کے بعد میر مرتضیٰ بھٹو نے کبھی عثمان خالد پر بھروسہ نہیں کیا۔

1979ء کے آخر میں عثمان خالد نے لندن میں پاکستان لبریشن موومنٹ PLM بنانے کا اعلان کیا اور انقلاب نامی پرچہ نکالا جسے فوج کے یونٹس میں بھیجا جاتا تھا۔ اس دوران کرنل الیاس شمیم نے لیبیا کے سفارت خانے کے ذریعے عثمان خالد کی کرنل قذافی سے ملاقات کا اہتمام کروایا اور عثمان خالد لندن سے لیبیا منتقل ہو گیا۔ مگر الیاس شمیم لندن میں ہی رہے۔

کرنل کا رابطہ لیبیا کے سفارت خانے کے ساتھ الطاف عباسی نے کروایا تھا۔ الطاف عباسی بعد میں لاکربی جہاز کے حادثے کے حوالے سے بہت مشہور ہوا۔ ان دنوں گارڈین، ڈیلی ٹیلی گراف غرضیکہ دنیا بھر کے اخبارات کے صفحہ اول پر الطاف عباسی تھا۔ یہ افواہیں بھی گردش کرتی رہیں کہ وہ MI-6 کا ایجنٹ تھا۔ دراصل امریکہ، برطانیہ اور سعودی عرب، کرنل قذافی سے نالاں تھے اور اس کو گھیرنے کے چکر میں تھے۔ وہ اس کو دہشت گرد اور دہشت گردوں کا سرپرست قرار دینا چاہتے تھے۔ اس لئے کہ اس وقت ''کرنل قذافی'' دنیا بھر میں جہاں بھی برطانیہ اور امریکہ کے خلاف مزاحمت ہو رہی تھی وہ رقم اور اسلحہ کے ذریعے ان تحریکوں کی مدد کر رہے تھے۔ خواہ وہ IRA کی جدوجہد تھی یا ساؤتھ افریقہ میں نیلسن منڈیلا کی ANC کی۔ اسرائیل کے خلاف وہ یاسر عرفات کی پی ایل او کی مدد بھی کرتے رہے تھے۔

کرنل الیاس شمیم کا الطاف عباسی کے ساتھ رابطہ کس طرح ہوا اور پھر کرنل نے

عثمان خالد کو قذافی سے کیوں اور کس طرح ملوایا، یہ تحقیق طلب معاملہ ہے۔ مگر پچھلے سال یعنی 2013ء میں جب کرنل الیاس شمیم بہت بیماری کے عالم میں لندن آئے تو انہوں نے مجھ سے اس بات کا ازخود اقرار کیا کہ ان کو بے نظیر اور ہم سب پر جاسوسی کے لئے مامور کیا گیا تھا۔ جلاوطنی کے دوران بشیر ریاض نے بارہا مجھے بھی اور بے نظیر کو بھی خبردار کیا تھا کہ انہیں ضیاالحق کی طرف سے جاسوسی کرنے پر لگایا گیا ہے مگر اس وقت دل نہیں مانتا تھا۔ ان کے اقرار کے بعد مجھے اس سوال کا جواب مل گیا کہ پورے لیبیا سازش کیس میں کہیں بھی ان کا ذکر نہیں تھا۔

ضیاالحق کی حکومت کے خلاف جدوجہد کرنے میں کرنل قذافی نے عثمان خالد کو مدد کی یقین دہانی کروائی تھی جس کے بعد عثمان لیبیا منتقل ہو گیا تھا۔ اب اس کو ضیا کی حکومت کے خلاف فوجی کاروائی کرنے کی صلاحیت اور افرادی قوت کا عملی مظاہرہ کرنا تھا۔ نہ تو اس کو کوئی سیاسی کارکن جانتا تھا اور نہ ہی اس میں یہ صلاحیت تھی کہ لوگوں کو جمع کر سکے۔ البتہ ڈاکٹر صاحبہ نے اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل اور عثمان خالد کی کارکردگی دکھانے کی ضرورت کے پیش نظر جن کو چنا وہ ہمارے مشترکہ اور قابل اعتماد دوست، طارق خورشید، صفدر ہمدانی، افضل توصیف، کامران رضوی، رانا منشا، نذیر بلوچ، اقتدار شاہ وغیرہ تھے جنہوں نے سردار مظہر، فرخندہ بخاری، محبوب احمد خان، ضمیر گیلانی، ملک زوار، نثار صفدر، جہانگیر خان، تنویر زمان اور دوسروں کو اپنے ساتھ شامل کیا۔

ڈاکٹر صاحبہ کا کہنا تھا کہ "میں نے انہیں لیبیا اس لئے بھیجا تھا کہ وہ وہاں کے معاشی و سیاسی نظام کا اور کرنل قذافی کی گرین بک کا مطالعہ کر کے واپس آئیں اور دوسروں کو معاشی انقلاب کے لئے تیار کریں۔ بلکہ کچھ تو نوکریوں کے لالچ میں گئے تھے۔ صفدر ہمدانی کو اس لئے بھیجا تھا کہ وہ عثمان اور میر مرتضٰی کے درمیان صلح کروائے۔ پہلے لیبیا جائے۔ پھر وہاں سے میر مرتضٰی کے پاس کابل چلا جائے۔"

ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس نے کبھی چڑیا بھی ماری ہو کجا یہ کہ ضیاالحق کے خلاف مسلح جدوجہد اور فوجی انقلاب۔ پہلے گروپ میں جانے والے بارہ چودہ افراد ہوں گے جنہیں دس روز تک اسلامی سوشلزم اور گرین بک پر لیکچرز دیئے گئے اور آخری لیکچر

کرنل قذافی نے دیا۔ ان لیکچرز کے دوران افضل توصیف نے عثمان سے پوچھا کہ علی جعفر زیدی، جنہوں نے نصرت کے ذریعے اسلامی سوشلزم کی ترویج واشاعت کی تھی، انہیں یہاں ہونا چاہیے تھا۔ بریگیڈیئر نے کہا وہ جلد آنے والے ہیں۔

ان لیکچرز کے بعد عثمان خالد نے انہیں وردی پہنادی۔ تربیتی کیمپ میں ڈال کر فوجی ٹریننگ جسے وہ کمانڈو ٹریننگ کہتا تھا دینی شروع کر دی۔ وہاں جا کر انہیں بتایا گیا کہ پاکستان سے آنے والوں کی کمانڈو ٹریننگ لیبیا میں وہ خود کرے گا اور ان کی سیاسی تربیت پاکستان میں ڈاکٹر کنیز یوسف کی سربراہی میں ہوگی اور اس کی بنیاد قذافی کی گرین بک ہوگی۔ طارق خورشید نے بتایا کہ یہ کمانڈو ٹریننگ صرف کلاشنکوف کو کھولنے، بند کرنے، لوڈ اور ان لوڈ کرنے کی حد تک تھی اور اس تربیت میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔

اسی طرح کا ایک تربیتی کیمپ بنگلہ دیش کے کرنل رشید اور میجر فاروق نے کھول رکھا تھا جہاں پر بنگلہ دیش سے آنے والے اسی طرح کی تربیت لے رہے تھے جیسا کہ عثمان خالد تربیت دے رہا تھا۔ یہ وہی میجر فاروق تھا جس نے شیخ مجیب کو گولی ماری تھی اور اقتدار پر قبضہ کرنا چاہا تھا مگر بنگلہ دیش پر جب ضیاالرحمن کا قبضہ ہو گیا تو کرنل رشید اور میجر فاروق نے لیبیا میں ضیاالرحمن کی حکومت کا تختہ الٹنے کا کیمپ لگا لیا۔ عثمان خالد، کرنل رشید اور میجر فاروق اکٹھے رہتے تھے۔

افضل توصیف کا خیال تھا، جس کا اظہار انہوں نے اپنی کتاب میں کیا کہ بھٹو فیملی، جام صادق، مصطفیٰ کھر لیبیا جا کر بھٹو دوستی کی قیمت وصول کر چکے ہیں اور اب عثمان اور ڈاکٹر صاحبہ دولت حاصل کر رہے ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ سردار مظہر پیپلز پارٹی سے علیحدہ ہو کر ڈاکٹر یوسف کے ساتھ مل گیا ہے اور ڈاکٹر صاحبہ ان جیسے لوگوں کو ساتھ ملا کر پیپلز پارٹی میں نقب لگا رہی ہیں۔

طارق خورشید اپنی کتاب کے صفحہ 62 پر لکھتے ہیں کہ ''افضل توصیف نے مجھے بتایا کہ عثمان خالد فراڈ ہے اور ہمیں بیچ کر لیبیا والوں سے پیسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔'' وہ لکھتے ہیں کہ ''واپسی پر عثمان خالد نے کہا مجھے گرین سکوائر کے پاس ڈاک خانے جانا ہے۔

وہ اپنی بیوی کو لندن پیسے بھجوانا چاہتا ہے۔ پیسے بھیج کر جب وہ واپس گاڑی میں بیٹھے تو خود ہی کہنے لگے، اصل میں میری تنخواہ کافی عرصے سے رکی ہوئی تھی۔ آپ کے آنے کے بعد اب مجھے ملی ہے۔ میں نے سوچا بیوی کو بھجوا دوں وہ مشکل میں ہوگی۔ میں نے مذاق میں کہا عثمان صاحب یہ تو ہمارے سروں کی قیمت ہوئی نا! اس پر وہ بھڑک اٹھے۔''

اس پہلی کھیپ کو دکھا کر تنخواہ وصول کرنے والے عثمان خالد نے ایک روز ان کے سامنے پاکستان لبریشن موومنٹ کا چارٹر اور ممبر شپ فارم رکھے اور کہنے لگا ''میں نے لندن میں پی ایل ایم کی بنیاد رکھی تھی۔ ضیا الحق کی آمریت کے خاتمے کے لئے پرامن سیاسی سرگرمیاں کافی نہیں۔ ہمیں مسلح جدوجہد کرنی ہوگی۔ آپ اس کی ممبر شپ بھر دیجئے۔ اس کے بعد دوسری باتیں ہوں گی۔ ممبر بننے پر سب سے پہلے صفدر ہمدانی اور فرخندہ بخاری نے اعتراض کیا۔ میں نے بھی کہا کہ ہم پاکستان میں کسی نہ کسی سیاسی جماعت سے وابستہ ہیں جبکہ اکثریت کا تعلق پاکستان پیپلز پارٹی سے ہے۔ ایسے میں ہم اپنی جماعتوں کی مرضی کے بغیر ایک نئی جماعت میں شامل نہیں ہوسکتے۔ اس پر عثمان خالد نے کہا کہ پیپلز پارٹی کی ڈھیلی ڈھالی تنظیم انقلاب نہیں لاسکتی اور مسلح جدوجہد نہیں کرسکتی...... میری بہن نے مجھے بتایا تھا کہ وہ نظریاتی لوگوں کو بھجوا رہی ہیں۔ لہٰذا آپ کو یہ سمجھنے میں دقت نہیں ہونی چاہیے تھی مگر آپ تو پیپلز پارٹی کا قصہ لے بیٹھے...... بھٹو خاندان میں قیادت کرنے والا کون رہ گیا ہے۔ لڑکے ہیں انہیں شراب اور عورت سے فرصت نہیں۔ بیگم صاحبہ ایک کمزور اور بیمار خاتون ہیں وہ کیا قیادت کرسکتی ہیں وغیرہ وغیرہ...... صرف وہ ہی انقلاب برپا کرسکتے ہیں۔ لہٰذا ان سب کو چاہیے کہ وہ ان کا حکم تسلیم کریں۔''

اس طرح کے معاملات پر ابتدا میں ہی ان کے درمیان جھگڑے شروع ہوگئے۔ کبھی کبھار نوبت گالم گلوچ تک پہنچ جاتی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب یہ سب لوگ پکڑے گئے تو فوجی تفتیش کاروں کی کوشش تھی کہ کسی طرح ان میں سے کوئی ایک یہ تسلیم کرلے کہ انہیں بے نظیر بھٹو اور بیگم صاحبہ نے لیبیا بھجوایا تھا۔ اس بیان پر ان کی رہائی ممکن تھی۔ مگر ان میں سے کسی نے بھی اس طرح کا بیان نہ دیا اور تشدد اور سختی کو برداشت کیا۔

لیبیا میں اب سب کا بریگیڈیئر عثمان کے ساتھ جھگڑا ہو گیا۔ دوسری کھیپ میں جو لوگ گئے تھے ان کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ فرخندہ بخاری اور افضل توصیف واپسی پر لندن میں عثمان ہی کے گھر ٹھہریں، خریداری کی، سیر کی اور واپس کراچی پہنچیں۔ فرخندہ بخاری نے کلفٹن جا کر بیگم نصرت بھٹو کو عثمان خالد کا خط دیا۔ افضل توصیف کو ان سے یہ گلہ رہا کہ وہ انہیں ساتھ لے کر نہیں گئیں۔ پھر دونوں لاہور پہنچ گئیں۔ بعد میں طارق خورشید، صفدر ہمدانی سمیت سب ہی لیبیا سے واپس آ گئے۔ صفدر ہمدانی جلد ہی لندن جا کر کابل چلے گئے۔ طارق خورشید اور افضل توصیف دونوں ڈاکٹر صاحبہ کو ملنے کی کوشش کرتے رہے۔ ناکام ہو کر انہوں نے میرا ذریعہ ڈھونڈا اور میرے گھر ان کے درمیان ہونے والی ملاقات کی وجہ سے لیبیا سازش کیس میرے بھی گلے پڑ گیا۔

اس سارے معاملے میں بظاہر تو کچھ بھی نظر نہیں آتا مگر جب یہ گرفتار ہوئے تو اصل کہانی گرفتاری کے بعد شروع ہوتی ہے۔ بقول اطہر ندیم مرحوم جنہوں نے طارق خورشید کی کتاب پر روزنامہ دن میں 7 رجنوری 2005ء کو کالم لکھا ''اس کہانی میں ہزاروں کہانیاں ہیں...... یہ پورے عہد کی کہانی ہے جو کسی غیر کی نہیں ہماری اپنی کہانی ہے۔ ہر کوئی اس میں اپنی داستان پڑھ سکتا ہے پھر بھی ایسے لگتا ہے ہم طلسم ہوشربا کی کوئی داستان پڑھ رہے ہیں جہاں کسی جادوگر کے علم میں گرفتار ہونے والوں کی زنجیروں میں جکڑے درد سے کراہنے والوں کی نہ ختم ہونے والی کہانی ہے۔ ریاستی مشینری اپنے سارے کل پرزوں سمیت اپنی صحیح شکل میں عریاں نظر آتی ہے۔''

طارق خورشید اور ان کے ساتھیوں نے اٹک قلعے کے سیلن زدہ تہہ خانوں میں تفتیش کے دوران ایک بار بھی اس ''جرم'' سے انکار نہیں کیا کہ وہ مارشل لا حکومت کے مخالف ہیں اور اس کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ مگر انہوں نے کہا کہ اس کا خاتمہ جمہوری جدوجہد کے ذریعے چاہتے ہیں، قتل وغارت کے ذریعے نہیں۔

سرکاری مشینری کس طرح حرکت میں آئی اس کی ایک جھلک بریگیڈیئر ترمذی کے عدالتی بیان سے دیکھنے کو ملتی ہے۔

''میں 1976ء سے 1981ء تک آئی ایس آئی ڈائریکٹوریٹ میں رہا۔جس میں میری ذمہ داری حکومت پاکستان اوراس کے اہم ترین افراد کی زندگی کولاحق خطروں کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنا تھا۔بی بی سی سے ہمارے علم میں آیا کہ 20رستمبر 1980ء کو بریگیڈیئر عثمان خالد جو لندن علاج کے لئے گئے ہوئے تھے، نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ حکومت پاکستان کی مخالفت میں اس نے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کیا اور پی ایل ایم کے نام سے ایک تنظیم قائم کی ہے۔جس کے ذریعے موجودہ حکومت کا تختہ الٹا جائے گا۔

''اس اعلان کے منظر عام پر آنے کے بعد ہم نے لندن میں بریگیڈیئر عثمان خالداور پی ایل ایم کی سرگرمیوں پرنظر رکھنی شروع کر دی۔جس سے ہم ایک اور شخص الطاف عباسی تک پہنچے جو عثمان خالد کے بہت قریب تھا۔الطاف عباسی اور بریگیڈیئر عثمان خالد نے لیبیا کا دورہ کیا جہاں وہ لیبیا کی حکومت کے نمائندے سے ملے اور وہاں حکومت کے مہمان کے طور پر چار روز رہے۔نومبر 1980ء میں الطاف عباسی پاکستان آئے۔ یہاں اس کی نگرانی جاری رکھی گئی۔نگرانی سے علم ہوا کہ الطاف عباسی رات کے اندھیرے میں ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف جو بریگیڈیئر عثمان کی بہن ہیں کے گھر گئے۔ لیبیا کے سفارت کاروں سعید السعودی، حسن البرکی اور لیفٹیننٹ کرنل حسین امام البروق کی بھی الطاف عباسی سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔اس کے ساتھ ساتھ پاکستان لیبیا برادرہڈ ایسوسی ایشن کے مری روڈ پر واقع دفتر کی بھی نگرانی شروع کی گئی۔ 12رنومبر 1980ء کو الطاف عباسی اور لیبیا کے سفارت کار حسن البرکی کراچی گئے اور وہاں انہوں نے موٹر بوٹ کے ذریعے کراچی ویسٹ وارف بندرگاہ کا چکر لگایا۔عباسی ایک شخص سے ملا جس سے اس نے زمین کا ایک قطعہ خریدنے کی بات بھی کی۔

''اسی دوران ہم اسلام آباد میں ڈاکٹر کنیز یوسف کی نگرانی کر رہے تھے وہاں سے معلوم ہوا کہ 15رنومبر 1980ء کو ڈاکٹر کنیز یوسف نے تخریب کاری کی تربیت کے لئے کچھ افراد بھجوائے ہیں۔ہم نے الطاف عباسی کو کراچی اس کے ہوٹل سے اٹھایا تا کہ اس کے پاکستان آنے کا مقصد اور لیبیا کے سفارت خانے سے رابطوں کے بارے میں معلوم

کر سکیں۔ گرفتاری کے فوراً بعد الطاف عباسی نے تمام حقائق اگل دیئے۔ اس نے بتایا کہ وہ ان تیرہ افراد میں سے ایک تھا جنہیں لیبیا تخریب کاری کی تربیت کے لئے بھجوایا گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ عثمان خالد کا دایاں بازو ہے اور ان کا منصوبہ یہ تھا کہ پاکستان میں ایسے سیل (Cell) بنائے جائیں جہاں پر لوگوں کو تخریب کاری کی تربیت کے لئے باہر بھجوانے کے لئے تیار کیا جائے تاکہ پاکستان میں لیبیا کی گرین بک کے مطابق انقلاب لایا جائے۔ گرین بک لیبیا کے سربراہ معمر قذافی کی حکومتی خیالات پر مبنی کتاب ہے۔ ان لوگوں کا مقصد حکومت اور فوج کے اعلیٰ افسران کو قتل کرنا بھی تھا۔

''الطاف عباسی نے بتایا کہ پہلے گروپ میں لیبیا جانے والے افراد میں اس سمیت فرخندہ بخاری، پروفیسر افضل توصیف، صفدر ہمدانی، ایڈووکیٹ نثار صفدر، پروفیسر ظہور ملک، ملک زوار حسین، رانا منشا، ریڈیو پاکستان کے پروڈیوسر نذیر بلوچ، منصور شیخ، کامران رضوی، شاہ نواز اور طارق خورشید شامل تھے۔ اس روشنی میں ہم نے مزید لوگوں کو گرفتار کیا اور وزارت خارجہ سے درخواست کی کہ حسن البرکی، لیفٹیننٹ کرنل حسین امام البروق اور مسٹر سعید السعودی کو ناپسندیدہ شخصیت قرار دے دیا جائے۔ نتیجتاً یہ تینوں سفارت کار دسمبر 1980ء میں پاکستان سے چلے گئے جو اور لوگ ہم نے گرفتار کئے ان میں سردار مظہر علی خان، جہانگیر احمد خان، خوشنود پرویز، محمد سعید، سمیع اللہ خان، مبارک اور محمد رمضان شامل تھے۔ انہوں نے بھی بتایا کہ ڈاکٹر کنیز یوسف اور سردار مظہر علی خان نے انہیں تخریب کاری کے لئے لیبیا بھجوایا ہے۔

''ملزمان نے ہمیں بتایا کہ ان کی ٹکٹوں کے پیسے ڈاکٹر کنیز یوسف نے دیئے تھے۔ ملزمان کو ٹریپولی ایئر پورٹ پر ایک بنگالی نے خوش آمدید کہا اور ایک کیمپ میں لے گیا جو صحرا میں واقع تھا۔ دوسرے روز وہ بریگیڈیئر عثمان خالد سے ملے جس نے انہیں پی ایل ایم کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کیا۔ انہیں تربیت کا ایک پروگرام بتایا گیا۔ جس میں جسمانی ورزش، کلاشنکوف رائفل سمیت ہتھیاروں کا استعمال، شب خون مارنے کے طریقے شامل تھے۔ انہیں کہا گیا کہ انہیں فوجی جرنیلوں سمیت حکومت کے افسران کو قتل کر کے

انقلاب لانا ہے۔ جن لوگوں کو قتل کرنا تھا ان میں جنرل ضیا الحق، جنرل سوار خان، جنرل اقبال، جنرل کے ایم عارف، جنرل چشتی اور جنرل لودھی شامل تھے۔ انہیں اسلحہ کے ڈپو اور پاکستان ایئر فورس کی تنصیبات کو تباہ کرنے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی تھی۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ 41 افراد چار مختلف گروپوں کی صورت میں جولائی، اگست اور اکتوبر 1980ء میں لیبیا بھجوائے گئے تھے۔ اس مقام پر ہم نے مناسب سمجھا کہ کیس ایف آئی اے کے حوالے کر دیں۔ کیونکہ کافی مواد مل چکا تھا اور کافی لوگوں کو گرفتار کیا جا چکا تھا۔ لیکن اسی دوران مارچ 1981ء میں پی آئی اے کا طیارہ اغوا کر لیا گیا۔ 15 / مارچ 1981ء کو حکومت کے حکم پر سردار مظہر علی خان، الطاف عباسی اور فرخندہ بخاری کو وزارت داخلہ کے حوالے کر دیا گیا تاکہ وہ طیارہ اغوا کرنے والے کے مطالبے کے طور پر انہیں رہا کر سکے۔"

اس بیان میں یہ تو سچ تھا کہ سب حکومت کے خلاف تھے اور اس سے نجات چاہتے تھے اور مُلّاؤں اور پاکستان دشمنوں کے علاوہ کون نہیں نجات چاہتا تھا، مگر یہ سراسر جھوٹ تھا کہ انہوں نے فوجی تربیت حاصل کی، جنرلوں کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ ان میں سے اکثر تو مکھی مارنے کے اہل بھی نہیں تھے، کہاں کسی جرنیل کا قتل۔ یہ وہ سازش تھی جس کو آئی ایس آئی نے تیار کر کے ایف آئی اے کے حوالے کیا تھا۔

جب میاں شریف جو اس تفتیش کے انچارج تھے میرے دفتر آئے تو ان کے ذہن میں اور کاغذات پر کئی سوالات تھے۔ ان کے بھاری بھرکم بستے میں سب کے بیانات تھے اور ابھی مزید گرفتاریاں جاری تھیں۔ مقدمہ چلنے کے امکانات دور دور بھی نہیں تھے۔ ان کے انداز تفتیش سے اندازہ ہوا کہ وہ سیاسی لوگوں کے ساتھ زندگی گزار چکے ہیں اور محض کارکردگی دکھانے والے افسر نہیں ہیں بلکہ واقعتاً حقائق جاننا چاہتے ہیں۔

مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک شریف آدمی ہیں۔ ان کے اندازِ تفتیش کا اس سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب وہ میرے پاس آئے تو ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ جب حنیف رامے پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے اور انہوں نے اپنے بھانجوں کے علاوہ چند دوستوں کو ریواز گارڈن لاہور میں ایک ایک کنال کے رہائشی پلاٹ الاٹ کئے تو میں نے اپنا پلاٹ یہ

لکھ کر واپس کر دیا تھا کہ ہم نے جس سوشلسٹ انقلاب کا نعرہ لگایا تھا اس میں ذاتی ملکیت کا تصور نہیں تھا۔ اب اقتدار میں آنے کے بعد یہ کیا؟ حالانکہ مجھے لاہور میں رہائش کے لئے پلاٹ کی ضرورت بھی تھی اور سوشلسٹ فلسفے کی عمارت بھی پاکستان پیپلز پارٹی میں ہل گئی تھی، مگر میں ان سے ناراض تھا اور پلاٹ کی واپسی میں فلسفہ کم اور ناراضگی زیادہ تھی۔

میاں شریف یہ جاننے کے لئے گئے تھے کہ میں نے حنیف رامے کے دور وزارت اعلیٰ میں کیا کیا کچھ حاصل کیا ہے تا کہ بھرپور کیس بن سکے۔ مگران کے لئے یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس کی وہ توقع نہیں رکھتے تھے۔ کیونکہ 74-1973ء میں پاکستان پیپلز پارٹی اور بھٹو صاحب اپنی طاقت کے عروج پر تھے اور کارکنوں سے لے کر ممبران اسمبلی تک کی اکثریت راشن ڈپو، پلاٹس، بسوں کی Chessis منظور کروانے کی دوڑ میں تھے۔ اس دور میں انہیں ایک ایسا شخص بھی نظر آیا جس نے اس بہتی گنگا میں ہاتھ نہیں دھوئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ میری ہر بات پر یقین کرنے لگے اور مجھے احتراماً شاہ صاحب کہہ کر مخاطب کرتے۔ کبھی وہ میرے دفتر میں آجاتے اور کبھی گاڑی بھیج کر اسلام آباد میں ایف آئی اے کے ہیڈکوارٹر بلوا لیتے۔ اس دوران ان کے ساتھ سوشلزم، اسلامی سوشلزم پر بھی کبھی کبھی گفتگو رہتی۔ ایک دن انہوں نے آہستگی سے کہا کہ اگر سوشلزم یہ ہے تو آج کے بعد میں بھی سوشلسٹ ہوں۔ انہوں نے اس بات کا یقین بھی دلایا کہ اس کیس میں وہ بلاوجہ کسی کو نہیں گھسیٹیں گے اور نہ ہی زیادتی کریں گے۔

میں نہ تو لیبیا گیا تھا اور نہ ہی قذافی سے ملا تھا۔ مگران کی تفتیش کا تقاضا تھا کہ میرا بیان بھی قلمبند ہو اور جس جس ملزم نے اپنے بیان میں میرا ذکر کیا ہے وہ مجھے اس کے ساتھ Confront کروا کر صداقت حاصل کریں۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ کس نے کیا کہا ہے۔ صرف یہ اندازہ تھا کہ میرے گھر میں ہونے والی طارق خورشید، افضل توصیف کی ڈاکٹر صاحبہ کے ساتھ ملاقات کا ذکر ہوگا اور تفتیش کا رخ اسی جانب رہے گا۔ مگر جس بدنظمی اور غیر ہم آہنگی کا مظاہرہ ان کی اس مہم میں نظر آیا تھا اس کی روشنی میں کچھ بھی ممکن تھا۔

اس کا اندازہ افضل توصیف کی کتاب کے صفحہ 166 سے ہوتا ہے۔ ''کئی مفرور

لڑکے پکڑے گئے ان میں تنویر زمان بھی تھا۔ آگے اس نے ضمیر گیلانی کی نشان دہی کر دی۔ مگر بس اس پر نہیں کی اور کئی انتہائی غیر ذمہ دارانہ بیان بھی دے ڈالے۔ میں نے اس کے بارے میں قطعی لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ مگر اس نے الٹا بیان دے دیا۔ اب میاں شریف کو میرے پاس آنا پڑا۔ اسی تضاد کا جواز جاننے کے لئے۔ میں نے اپنا موقف وہی رکھا۔ دراصل تنویر ایک جذباتی لڑکا تھا۔ اس سے پہلے بھی اس نے اسی طرح کے داغ اپنے دامن پر لگا رکھے تھے۔ اب وہ وعدہ معاف گواہ بننا چاہتا تھا۔ لیکن ایف آئی اے والے ایک کائیاں۔ انہوں نے پہلے تو اس کے جھوٹ نکال لئے اور نئے سرے سے اس کے بارے میں مجھ سے پوچھنے کو آ گئے۔"

افضل توصیف خود بھی کچھ کم نہیں تھی۔ وہ عثمان خالد اور ڈاکٹر صاحبہ کو ڈالرز کے منوں ڈھیر پر بیٹھا دیکھ رہی تھیں اور اپنی جیب میں نوائے وقت کی ایک خبر کاٹ کر لئے پھرتی تھیں جس میں کہا گیا تھا کہ لندن میں دولت کی بانٹ پر پاکستان کے لیڈر آپس میں لڑ پڑے۔ اس میں ہمراز احسن کے ساتھ ڈاکٹر صاحبہ اور بریگیڈیئر عثمان خالد کے نام تھے۔ ہمراز کو تو میں اس کے لڑکپن سے جانتا ہوں۔ وہ ایک درویش منش صوفی انسان ہے جو دوسروں کے لئے ہمیشہ تن من دھن قربان کرتا چلا آیا ہے۔ یہ اتنا بڑا جھوٹ تھا جو نوائے وقت نے چھاپا تھا۔ ان کا جھگڑا ضرور ہوا تھا مگر انقلاب اخبار کی پالیسی اور بریگیڈیئر کی پیپلز پارٹی کی مخالفت پر یہ جھگڑا ہوا تھا جس کے بعد ہمراز احسن نے انقلاب اخبار سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔

مجھے ڈر اس بات کا تھا کہ نذیر بلوچ میرے سٹڈی سرکلز میں آتا رہا تھا اور زیر زمین جو سیاسی، نظریاتی تعلیم و تنظیم کا کام ہو رہا تھا اس سے ایک حد تک واقف تھا۔ بالخصوص راولپنڈی میں کام کرنے والوں سے بھی واقف تھا۔ ڈر یہ تھا کہ اگر اس نے اس حوالے سے کوئی بیان دے دیا تو معاملہ بہت بگڑ جائے گا۔ کئی سیاست دان بھی پکڑے جائیں گے اور سیاسی کارکن بھی۔ بے نظیر اور بیگم صاحبہ کو بھی ملوث کیا جا سکتا تھا۔ طیارہ اغوا ہونے کے بعد کابل سے اسے لیبیا لے جانے کی کوشش کی وجہ سے ایجنسیوں میں بلا کی

پھرتی آ گئی تھی۔ جو سامنے آیا پکڑا گیا کا معاملہ تھا۔

دوسرا خطرناک معاملہ میرا پولینڈ جانے کا ہو سکتا تھا کیونکہ روس افغانستان میں آ چکا تھا اور اس کیس کے ساتھ مجھے جوڑ کر ایک عالمی سازش جس میں سوویت یونین اور سوشلسٹ ''کافر'' ممالک کو ملوث کر کے بہت بڑا ڈرامہ کھڑا کیا جا سکتا تھا۔

میری نگرانی تو ہو رہی تھی مگر کڑی نہیں تھی۔ گھر کے باہر ایک کونے میں دھوپ، بارش، آندھی میں کھڑا شخص سفید کپڑوں میں ڈیوٹی سرانجام دیتا تھا۔ میں نے برآمدے میں اس کے لئے کرسی ڈال کر اس کی مشکل آسان کر دی۔ اس کو گھر کا کھانا اور چائے بھی ملنے لگی۔ محلے والوں نے سمجھا کہ کوئی نیا چوکیدار ہے۔ تفتیش آگے بڑھتی گئی تو معاملات الجھنے لگے۔

میاں شریف کئی گھنٹے اور دن صرف کر کے میرا بیان ریکارڈ کر چکے تھے اس بیان کے قلمبند ہو جانے کے بعد مجھے طارق خورشید کا جیل سے راجہ اسرار عباسی کے بھائی یا کزن راجہ نیاز کے ذریعے پیغام ملا کہ افضل توصیف نے میٹنگ کے بارے میں بتا دیا ہے جبکہ میں نے انکار کر دیا ہے کہ کوئی میٹنگ نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے کہ آپ کے بیانات قلمبند ہوں آپ کسی نہ کسی طرح ملک سے چلے جائیں۔ مگر اب تو دیر ہو چکی تھی۔

میرا پی اے محمد اقبال بے نظیر بھٹو کے پاس جا کر If I am assassinated کا مسودہ ٹائپ کرتا رہا تھا۔ وہ کار کی ڈگی میں چھپ کر جاتا، ٹائپ کرتا اور اسی طرح واپس چلا آتا۔ بے نظیر جب بھٹو صاحب کو ملنے جاتیں تو کچھ اور صفحے لے آتیں اور صفدر ہمدانی محمد اقبال کو کار میں چھپا کر لے جاتا۔ یہ کام اس وقت میں بھی ہوتا رہا تھا جن دنوں میں پولینڈ میں تھا۔ اب جبکہ ضیا الحق کی کوشش تھی کہ بے نظیر بھٹو اور بیگم صاحبہ کو کسی نہ کسی طرح لیبیا والے معاملے میں الجھایا جائے۔ میرے الجھنے کے ساتھ ان کا الجھنا بھی ممکن تھا۔ ایک خوف تھا جو کھائے جا رہا تھا۔

ایک روز ہماری ملازمہ جس کا تعلق علاقہ غیر سے تھا کئی سال بعد اپنے بچوں سے ملنے کے لئے چھٹی پر گئی۔ وہ اپنا سامان گتے کے ان ڈبوں میں رکھ کر لے گئی جن میں میری کتابیں اور سامان پولینڈ سے آیا تھا اور ان بکسوں پر پولش زبان میں مہریں بھی لگی ہوئی تھیں

اور میرا پولینڈ کا ایڈریس بھی تھا۔ ایجنسی والوں نے اس کو پشاور سے آگے کسی مقام پر روک لیا اور گرفتار کرلیا۔ ان کے نزدیک یہ روس کی جاسوسہ تھی۔ مجھ سے فون پر بات کر کے اسے تین چار روز بعد چھوڑ دیا گیا۔ وہ بے چاری روتی دھوتی واپس آ گئی۔ اس کی جمع پونجی بھی کسی نے ہتھیالی۔

ان دنوں مرتضیٰ بھٹو، صفدر ہمدانی وغیرہ کابل میں تھے۔ اس سے پہلے، جب پہلی بار مرتضیٰ کابل آئے تو صفدر ہمدانی کے علاوہ وہاں جانے والوں میں ارشد اعوان، طارق چیمہ، فیصل آباد سے الیاس کے بھائی اعظم اور رانا فاروق خان جو فوٹو گرافر کے نام سے جانے جاتے تھے، ان سے ملنے کابل گئے تھے۔ ان میں سے کچھ پاکستان میں تھے۔ ان سب کا میر مرتضیٰ بھٹو کے ساتھ تعلق، صفدر ہمدانی کا مجھ سے اور لیبیا سازش کیس والوں سے تعلق، پھر پولینڈ اور سوویت یونین۔ آئی ایس آئی کے لئے یہ سب تانے بانے جوڑنے مشکل نہیں تھے۔

چندروز بعد میاں شریف نے مجھے دفتر میں فون کر کے کہا کہ آج آپ کو لاہور جانا ہے۔ آپ ہمارے پاس آجائیں۔ یہاں سے ہم آپ کو لے جائیں گے۔ ملزموں کے بیانات اور آپ کے بیانات میں تضاد ہے۔ صداقت جاننے کے لئے Confront کروانا پڑے گا۔ مگر اب کی بار کرنل صاحب بھی آپ سے بات کریں گے۔ ہم تیار ہیں اور آپ کا انتظار ہے۔ میں تھوڑی دیر کے لئے ٹھٹھکا کہ طارق خورشید، جن سے Confront کروانا ہے وہ تو اٹک قلعہ میں ہیں، مجھے لاہور کیوں لے جایا جا رہا ہے۔ میں نے شیخ اشرف کو، جو کہ 69-68ء تحریک والے شیخ عبدالرشید کے چھوٹے بھائی ہیں اور قائداعظم یونیورسٹی ایمپلائز یونین کے صدر رہتے تھے، انہیں اپنی سرکاری گاڑی میں ساتھ بٹھایا اور تفصیل میں جائے بغیر سرگوشی کرتے ہوئے کہا کہ میرا خیال ہے کہ مجھے لاہور قلعہ لے جایا جا رہا ہے۔ تم گھر جا کر اپنی باجی کو یہ خبر کس طرح دو گے کہ وہ ذہنی طور پر تیار ہو جائیں، یہ میں تم پر چھوڑتا ہوں مگر بچوں کو یہی معلوم ہونا چاہیے کہ بابا کسی کام سے باہر گئے ہیں۔

ذہنی طور پر مجھے اپنے آپ کو تیار کرنا تھا اور لاہور پہنچ کر مجھے اپنی ماں سے ملنا تھا۔

میرے خیال میں ان کے ساتھ شاید یہ آخری ملاقات تھی، میاں شریف کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ صاحبِ فراش تھیں۔ ان پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا۔ میں نے حسن سے کہا کہ انہیں بے خبر رکھنا۔ میں معمول کے مطابق ان سے ملا۔ مگر ان کے چہرے پر ہلکی سی تفتیش تھی۔ ان سے مل کر جب میں باہر نکلا تو شام کے اندھیرے میں مجھے سارا شہر بکھرا ہوا محسوس ہوا۔

لاہور قلعہ میں تین دن تک کسی سے ملاقات نہیں ہوئی۔ غالباً مقصد ٹارچر کیمپ میں ان کوٹھڑیوں کی چہرہ نمائی تھی۔ اعصابی دباؤ کے کھیل کا شاید یہ پہلا حربہ تھا۔ بتایا گیا کہ کرنل صاحب مصروف ہیں۔ آپ کو پھر بلایا جائے گا۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ آئی ایس آئی کی جانب سے کرنل آفتاب اس کیس کی تفتیش کر رہے تھے اور لاہور قلعہ کے سیل کے انچارج کرنل طارق طور تھے۔ مگر جب ان کرنل صاحب سے آمنا سامنا ہوا تو نہ تو وہ کرنل آفتاب تھے اور نہ کرنل طور۔

ڈاکٹر صاحبہ میری اور میری بیگم کی ایم۔ اے کی تعلیم کے دوران استاد رہی تھیں۔ قائداعظم یونیورسٹی میں میرے آنے کی وجہ جواز بھی وہ ہی تھیں۔ پھر پیپلز پارٹی کا بننا، بھٹو صاحب کے ساتھ ملاقات، جمیل عمر، طارق خورشید، صفدر ہمدانی، نصرت کی ادارت، پولینڈ جانا، بیگم صاحبہ اور بے نظیر بھٹو کے ساتھ واسطہ، سیاسی دوستیاں وغیرہ وغیرہ بے شمار سوالات تھے جن کا سامنا تھا۔ اب کبھی میں لاہور قلعہ لایا جاتا اور کبھی مجھے اسلام آباد کے لئے چھوڑ دیا جاتا۔

اسی دوران پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے ضیاالحق پر میزائل کا حملہ کیا۔ لندن میں ایک روز میں نے آفتاب گل سے پوچھا کہ یہ کیسے ممکن ہوا کہ جہاز بچ گیا۔ انہوں نے بتایا کہ جن لڑکوں نے یہ میزائل فائر کرنا تھا ان کی کوئی خاص تربیت نہیں تھی۔ انہوں نے یہ میزائل طیارے کی رینج میں آنے سے چند سیکنڈ پہلے ہی چھوڑ دیا اس لئے طیارہ چند انچ کے فاصلے سے نکل گیا اور ضیا بچ گیا۔ اس کے بعد ضیاالحق ہمیشہ مسافر طیارے سے سفر کرتا تھا۔ اگر یہ میزائل اپنا کام دکھا دیتا تو شاید ضیاالحق کا اندھیرا دور جو ہمارے خون آلود حال اور مستقبل کی بنیاد ہے، جلد ختم ہو جاتا۔

ہم جلاوطن ہوگئے

لیبیا سازش کیس میں گرفتاریاں تو1981ء سے شروع ہوئی تھیں مگر 8رجولائی 1984ء کواس مقدمے کوشروع کیا گیا۔ میری کھینچا تانی میں ایک سال گزر گیا تھا۔ اس دوران مجھ پر دل کا دورہ پڑا۔ مجھے ہسپتال لایا گیا۔ اس دن میں نے اور میری بیگم نے جلاوطن ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس زمانے میں Exit Control List نہیں ہوتی تھی اور برطانیہ کا ویزا ابھی لندن ہیتھرو ایئرپورٹ پر مل جاتا تھا۔ 27رنومبر 1983ء کوہم وطن سے بے وطن ہوگئے۔

میری جلاوطنی کے بارے میں جب اخبارات میں خبریں چھپیں تو وہ تمام دوست جنہوں نے مجھے ملک سے باہر جانے میں مدد کی تھی ان میں محمود علی اوران کے پرائیویٹ سیکرٹری مسعود تھے۔ حکومت کی نگرانی میں آ گئے۔ محمود علی کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا۔ انہوں نے ملک ٹوٹنے کے بعد بنگلہ دیش کونہیں بلکہ پاکستان کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ وہ بھٹو صاحب کے زمانے سے اپنے انتقال تک پاکستان کے وزیر مملکت رہے۔ سب سے زیادہ دباؤ میرے پی اے محمد اقبال پر تھا۔ دفتر کی سینکڑوں فائلوں کی چھان بین کی گئی۔ مجھے مفرور قرار دے کر اخبارات میں اشتہارات دے کر نوکری سے نکال دیا گیا۔

12رجنوری 1985ء کو استغاثے کے اختتامی دلائل کے بعد یہ عدالتی ڈرامہ 15رجنوری 1985ء کوختم ہوا۔ فیصلہ محفوظ کرلیا گیا۔ مقدمہ کسی عدالت نے سنا تھا فیصلہ کسی اورعدالت نے سنایا۔ فیصلہ تھا۔

Found Guilty, Life Imprisonment, Recommended for Mercy.

بریگیڈئیر عثمان خالد اور ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف نے شعلوں کے ساتھ ایک ایسی آنکھ مچولی کھیلی تھی کہ کئی گھرانے جل کر خاک ہوگئے۔ مجھے جلاوطنی اختیار کرنا پڑی۔ کامران رضوی، جوسب سے چھوٹا تھا، کو65 سال قید بامشقت سنائی گئی تھی۔ طارق خورشید

نے اپنی سات سال کی سزا پیروں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہن کر کاٹی۔ اس دوران اس کے والد کو دل کا دورہ پڑا اور وہ انتقال کر گئے۔ طارق خورشید نے اپنے باپ کے جنازے کو جب کندھا دیا تو پوری دنیا کے میڈیا نے دیکھا کہ اس کے پیروں میں بیڑیاں تھیں اور ہاتھ میں ہتھکڑی۔ نذیر بلوچ تشدد کی وجہ سے ذہنی توازن کھو بیٹھا اور اسی حالت میں انتقال کر گیا۔

انسان اپنے اوپر گزرنے والے برسوں کا سفر خود ہی طے کرتا ہے۔ میرے اس سفر میں بچوں کا تعاون اور حوصلہ افزائی کے ساتھ میری ہم سفر اور حوصلہ مند بیگم شمیم جعفر زیدی میرے ساتھ تھیں جو مشکل سے مشکل مصیبت میں بھی ہنستی رہتیں اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتیں۔ یہی نہیں بلکہ ہر مرحلے اور ہر حل طلب معاملے میں مستقل مزاجی کے ساتھ ایک دوست اور صلاح کار کی حیثیت سے میرا ساتھ دیتیں۔ میں مڑ کر دیکھتا تو میرے بچے اور میری بیگم ہر منزل پر میرے ساتھ نظر آتے۔ میں تنہا نہیں تھا۔ ہم اپنی صلیب اٹھا کر خود چل رہے تھے مگر ساتھ ساتھ تھے۔ اگرچہ بامقصد زندگی گزارنے کا سفر مشکل ہے مگر ہے اطمینان بخش۔ میں نے یہ اطمینان مشکل ترین حالات میں بھی اپنی ذات اور اپنے گھر میں ہمیشہ پایا۔

جلاوطنی آسان نہیں ہوتی۔ اس زمانے میں وطن کی مٹی، ماں باپ، بھائی اور دوست ان سب کی ضرورت کتنی بے رحمی سے محسوس ہوتی ہے، اس کا اندازہ جلاوطنی میں رہنے والے کو ہی ہو سکتا ہے۔ کبھی کبھی دل چاہتا کہ اپنے بچپن میں جذب ہو کر چھپ جاؤں یا پھر ماں کی گود میں سر رکھ کر سو جاؤں۔ مگر ماں بہت دور تھیں اور فالج کے دوبارہ شدید حملے کے بعد اب بالکل بھی چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھیں۔ اور بھائی!! ایک ہی شکم میں سب نے تکمیل پائی تھی۔ ایک ہی گھر میں سب بڑھے پلے تھے جیسے ایک ہی پیڑ کی پتیاں، مگر جب شاخ سے ٹوٹ کر یہ پتیاں گریں تو زمانے کی ہوا انہیں دور اڑا کر لے جائے گی، اس کا اندازہ شاید ہم میں سے کسی کو بھی نہیں تھا۔

جلاوطنی میں آنے کے بعد بے نظیر بھٹو کے ساتھ ضیاالحق کی آمریت کے خلاف

اور ملک میں جمہوریت کے قیام کے لئے مشترکہ جدوجہد، پیپلز پارٹی کی قیادت کی کھینچا تانی، بے نظیر بھٹو کے ساتھ اختلاف، سیاسی جلاوطنوں کی مصیبتیں، الجھنیں اور ان کی غمزدہ آنکھوں میں بے شمار سوالات، بے نظیر کے اردگرد نئے نئے وارد ہونے والوں کی لالچ سے بھری چمکتی آنکھیں اور ''روشن مستقبل'' کی جانب پھرتیاں، بے نظیر کے ضیاالحق اور امریکہ کے ساتھ سمجھوتے، عالمی سازشیں اور ان سے منسلک پاکستان کے حالات، بش اور بلیئر کی دنیا پر جنگ اور نیا ورلڈ آرڈر مسلط کرنے کے خلاف 2005ء میں اپنا برطانوی پارلیمنٹ کا انتخاب لڑنے تک کا سفر اتنا طویل اور تفصیل طلب ہے کہ اس کا احاطہ اگر موقع ملا تو دوسری جلد میں کرسکوں گا۔ موجودہ کتاب کو اپنی لندن جلاوطنی میں آنے تک اس دعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ اے اللہ اپنے تمام ''مومنین''، ''مجاہدین''، ''غازی'' مسلمانوں اور ان کے ''سرپرستوں'' کو اپنے پاس جنت میں بلا لے تاکہ یہ خوبصورت دنیا جہنم بننے سے بچ جائے اور اصلی انسان یہاں سکون کے ساتھ رہ سکے۔

مفصلاتِ فکر

دوستو اِن میں نئی بات ہو شاید کم کم
ہیں مضامین پرانے ، ذرا تفصیل کے ساتھ
(سعید قریشی)

دو عالمی جنگیں جنہوں نے پوری دنیا کو بدل کر رکھ دیا

تیسری جنگ سے بچنے کے لئے ان کا مطالعہ ضروری ہے

امریکہ عالمی سامراج کیسے بنا؟ اور دونوں عالمی جنگوں نے کس طرح پوری دنیا کو بدل کر رکھ دیا؟ اس کا مطالعہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ تیسری عالمی جنگ سے بچا جا سکے جس کے لئے آج بالکل اسی طرح کی صف بندی ہو رہی ہے جیسا کہ ان دونوں جنگوں سے پہلے ہوئی تھی۔

پہلی عالمی جنگ کے خاتمے پر دنیا کی چار بڑی سلطنتوں کا خاتمہ ہوا۔ جرمنی، روس، آسٹرو ہنگری اور سلطنت عثمانیہ۔ اسی طرح دوسری عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد بہت سی سلطنتیں ختم ہوئیں، ممالک آزاد ہوئے اور کئی نئے ممالک دنیا کے نقشے پر نمودار ہوئے۔ ان دو جنگوں میں جدید ریاستوں نے ایک دوسرے کو تباہ و برباد کرنے کا ہر حربہ استعمال کیا۔ ہیروشیما، ناگاساکی پر ایٹم بم برسائے جانے کے نتیجے میں تباہی ہو یا ہٹلر کے نازی کیمپس، ان دونوں جنگوں میں بے پناہ خون بہا اور کروڑوں جانیں ضائع ہوئیں۔ یہ دونوں جنگیں سامراجیوں کے آپس میں بڑھتے ہوئے تضادات کی وجہ سے ہوئیں۔

پہلی عالمی جنگ اور اس کے اثرات

جنگ ختم ہوئی تو چار سلطنتیں ختم ہو گئیں، انقلابِ روس برپا ہوا

پہلی عالمی جنگ 1914ء میں شروع ہوئی۔ یورپی ممالک اس کا اندازہ پہلے سے

کئے ہوئے تھے اور پچھلے بیس سال سے لگ رہا تھا کہ یورپی ممالک ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی پر لگے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف اتحاد بن رہے تھے اور ٹوٹ رہے تھے۔ جیسا کہ آج ہورہا ہے۔ روس اور فرانس 1894ء میں اتحادی تھے۔ جرمنی کا اتحاد آسٹریا، ہنگری اور اٹلی کے ساتھ تھا۔ برطانیہ 1907ء میں روس اور فرانس کے ساتھ تیسرے اتحادی کے طور پر شامل ہوگیا۔ 28/جون 1914ء کو ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جنگ کی ابتدا ہوگئی اور پھر جنگ پھیل کر عالمی جنگ بن گئی۔

اس دن بوسنیا کے سرب جو آسٹرو۔ہنگری کی حکمرانی کے خلاف تھے انہوں نے آسٹریا کی بادشاہت کے وارث آرک ڈیوک فرانز فرڈینانڈ (Arch Duke Franz Ferdinand) کو بوسنیا کے دارالحکومت سراژیوو (SARAJEVO) میں قتل کردیا۔ یہ قتل ایک یوگوسلاوین قوم پرست نے کیا تھا۔ آسٹریا اور ہنگری جو سلاوک (SLAVIC) نیشلزم کو دبانا چاہتے تھے انہوں نے اس کی ذمہ داری سربیا پر ڈال دی اور 28/جولائی 1914ء کو سلطنت سربیا کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔ یہاں سے لڑائی پھیلنا شروع ہوئی۔ 30/جولائی کو روس نے سربیا کی مدد کے لیے اپنی فوجوں کو حرکت دی۔ جرمنی نے روس کی فوجوں کے حرکت میں آنے کو اپنے لیے خطرہ محسوس کیا اور ایک عرصے سے جرمنی فوجی لیڈر شپ نے جو شلیفن منصوبہ (Schlieffen Plan) بنائے ہوئی تھی، جس کا مقصد روس اور فرانس کو جنگ میں شکست دے کر ان پر قبضہ کرنے کا تھا، اس موقع کو غنیمت جان کر اس منصوبے پر عمل درآمد کے لیے میدان میں اتر آئی۔

جرمنی کا خیال تھا کہ جب تک روس اپنی بے پناہ فوج کو سُست روی کے ساتھ میدان میں لائے گا، اس وقت تک فرانس پر حملہ کر کے جلدی سے اس پر قبضہ کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ جرمنی نے بلجیم، جو کہ غیر جانبدار تھا، کے راستے فرانس پر حملے کی تیاری کی اور تین اگست 1914ء کو فرانس کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہی بلجیم میں فوجیں داخل کردیں۔ برطانیہ نے جو خود کو بلجیم کا محافظ سمجھتا تھا، 4/اگست کو جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہر قوم پر جنگ کا جنون طاری ہے۔

ہر طرف جنگی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ ہر قوم کے ریزروسویلین طلب کر لیے گئے۔ اعلان جنگ کے ہوتے ہی صرف برطانیہ میں دو ماہ کے اندر اندر 750,000 عام شہری رضا کار جنگ کے لیے بھرتی ہو گئے۔ اگست کے وسط تک یعنی چند ہفتوں میں تقریباً گیارہ ہزار بار چلائی جانے والی ریلوں کے ذریعے چھ ملین یعنی ساٹھ لاکھ جرمن فوجی فرنٹیئرز پر پہنچ گئے۔ اپنے منصوبے کے مطابق جرمن افواج کو کامیابیاں حاصل ہونے لگیں۔ مگر مارنے (MARNE) کے مقام پر فرانس اور برطانیہ کی مشترکہ افواج نے جرمنی افواج کو پسپا کرنا شروع کیا۔ اسی دوران جرمنی کا یہ اندازہ بھی غلط نکلا کہ مشرقی محاذ پر روس کو آنے میں دیر لگے گی۔ روسی افواج بہت جلد شرقی پروشیا (EAST PRUSIA) تک پہنچ گئیں تو جرمنی نے جلدی سے مغربی محاذ سے فوجیں نکال کر مشرقی محاذ پر منتقل کرنا شروع کیں۔ تانن برگ (TANNEN BERG) کے مقام پر روس کو بڑی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس میں تقریباً چالیس ہزار فوجی مارے گئے اور تقریباً ایک لاکھ جنگی قیدی بنائے گئے۔ روسی کمانڈر جنرل الیگزنڈر سامسونوف نے اتنی بڑی شکست کے بعد خودکشی کر لی۔ وہ جنرل نیازی نہیں تھا کہ مشرقی پاکستان میں 93 ہزار فوجیوں کو جنگی قیدی بنوانے کے بعد نہایت بے شرمی سے کراچی میں منوں پھولوں کے ہار پہن کر ملکی سیاست میں داخل ہو کر مغربی پاکستان یعنی موجودہ پاکستان کا حاکم بننے کے خواب دیکھنے لگتا۔ کراچی میں جنرل نیازی کا اتنے بڑے پیمانے پر استقبال بھی ایک بڑا سوالیہ نشان ہے۔

اسی دوران جرمنی کے آسٹرو۔ ہنگری اتحادی آسٹریا کے صوبے گلاکہ (GALACA) میں روسی افواج کے ہاتھوں پسپا ہو رہے تھے اور سربوں (SERBS) پر قابو نہیں پایا جا رہا تھا۔ شدید برفباری اور سردی میں مغربی محاذ پر ہر فریق نے خندقیں کھود کر اپنے آپ کو محفوظ کرنا شروع کیا اور جنگ کے تمام فریقین مدافعتی جنگ میں داخل ہو گئے۔

1915ء میں فوجی افرادی قوت اور جنگی سامان اور ضروریات کی پیداوار کے لیے افرادی بھرتی کی ضرورت تھی جس کے لیے فرانس کی شمالی افریقہ کی نوآبادیات اور برطانیہ کی ایشیا میں نوآبادیات بالخصوص ہندوستان سے بھرتی ہونے لگی۔ ہندوستانی گن پاؤڈر اور

ہندوستانی فوجی سپاہی، برطانوی استعماریت کے لئے ہمیشہ انگریز کی طاقت رہے۔

سلطنت عثمانیہ یعنی ترکی جب جرمنی کا اتحادی بن گیا تو برطانوی انڈیا کی فوجوں نے ترکی کے علاقہ وادئ دجلہ وفرات (MESOPOTAMIA) پر حملہ کر دیا اور یہ جنگ ترکی کے خلاف، انگریز کے ساتھ مل کر لڑی۔ اس عالمی جنگ میں ہندوستان نے انگریز کا ساتھ دیا۔ گاندھی اور کانگرس نے بھی اس جنگ میں انگریز کی پوری مدد کی۔

مارچ 1915ء کو جرمنی کے ہوائی جہازوں نے پیرس پر بمباری شروع کر دی۔ برطانوی پریس کے مطابق پہلی بار جنگ میں زہریلی گیس کا استعمال ہوا جو جرمنی نے کیا۔ مئی 1915ء میں لندن بھی جرمنی کے ہوائی جہازوں کی بمباری کی زد میں آ گیا۔ ادھر اٹلی نے آسٹریا اور ہنگری کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ 1915ء اگست میں جرمنی نے روس کو پولینڈ سے نکال باہر کیا۔ اکتوبر 1915ء کے مہینے میں جرمنی، آسٹریا، ہنگری اور بلغاریہ نے سربیا پر حملہ کر دیا۔ ادھر 1916ء کے جون میں شریف حسین آف مکہ جسے شریف المکہ بھی کہا جاتا ہے، نے ترکی کے خلاف عرب بغاوت کا اعلان کر دیا۔ جولائی 1916ء میں برطانیہ اور فرانس نے سوم (SOMME) پر حملہ کیا اور پہلی بار برطانیہ نے جنگ میں ٹینکوں کا استعمال کیا۔ نومبر میں سوم کی جنگ ختم ہوئی جس میں پانچ لاکھ لوگ مارے گئے۔

فروری 1917ء میں روسی انقلاب کے نتیجے میں زار روس نیکولائی دوئم کی حکومت ختم ہوئی۔ لبرل اور سوشلسٹوں کی عبوری حکومت قائم ہوئی۔ ادھر اپریل 1917ء میں فرانس کی جانب سے نیویلے (NIVELLE) کے آئنسے (AINSE) کے ناکام حملے کے بعد فرانسیسی فوج میں بغاوت ہونے لگی۔ تقریباً تیس ہزار فوجیوں نے لڑنے سے انکار کر دیا۔

اب تک اس جنگ کی مورچہ بندی (Trench-Line) میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی تھی اور وہ جنگ جو بظاہر باقاعدہ منصوبہ بندی سے ہوئی تھی اس کے مستقبل کا کوئی سر پیر نظر نہیں آ رہا تھا کہ امریکی صدر وڈرو ولسن نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اسی دوران برطانیہ نے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔

اکتوبر 1917ء کے انقلاب روس میں بالشویکیوں نے حکومت پر مکمل اختیار

حاصل کرلیا تھا اور جرمنی کے ساتھ برسٹ لٹووسک (Brest-Litovsk) کے مقام پر امن مذاکرات شروع کر دیئے تھے۔ روس کے ساتھ معاہدے نے جرمنی کو روسی سلطنت کے بہت سے حصوں پر اختیار دے دیا اور روسی خود ملک کے سیاسی و معاشی استحکام میں مصروف ہو گئے۔ اس معاہدے کے بعد جرمنی نے مغربی محاذ پر اپنی مکمل توجہ اور طاقت لگا دی جبکہ اگست 1918ء میں جرمنی جنگ بندی کے لیے تیار ہو گیا۔

بظاہر یہ جنگ یورپ میں لڑی گئی مگر اس جنگ نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جنگ ختم ہوئی تو چار بڑی سلطنتیں بھی ختم ہو گئیں۔ جرمنی، روس، آسٹرو ہنگری اور سلطنت عثمانیہ۔ یورپ کا نقشہ دوبارہ سے کھینچا گیا۔ کئی ریاستیں وجود میں آئیں۔ جرمنی اور روس نے اپنے بے شمار علاقے کھو دیے۔ یہی حال مشرق وسطیٰ کا ہوا۔ آئندہ جنگوں کو روکنے کے لیے لیگ آف نیشنز قائم کی گئی۔

جرمن نیشنلزم نے ہٹلر پیدا کیا۔ نازی ازم نے جگہ بنالی

یہ جنگ جو 28/جولائی 1914ء کو شروع ہوئی تھی نومبر 1918ء میں ختم ہو گئی۔ دنیا کا خیال تھا کہ اس جنگ کے خاتمے سے آئندہ ہونے والی جنگوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مگر معاہدۂ ورسائی (Treaty of Versailles) جو 28/جون 1919ء کو جرمنی اور اتحادیوں کے درمیان ہوئی اس میں جرمنی کو بہت سی شرمناک شقوں پر دستخط کرنے پڑے تھے اور اس کا بہت سا علاقہ بھی اس سے چھن گیا تھا۔ جرمنی کو جنگ کا بہت بھاری تاوان ادا کرنے کا پابند کیا گیا تھا اور اس پر پابندی لگا دی گئی تھی کہ وہ بہت مختصر فوج رکھے گا اور ہوائی فوج، بحری فوج، آبدوز کشتیاں اور ٹینک بالکل نہیں رکھے گا۔ اس معاہدے نے جرمن نیشنلزم کو دوبارہ زندہ اور مضبوط کیا اور ہٹلر پیدا ہوا۔ جنگ کے بعد پورا یورپ بے روزگاری کی لپیٹ میں تھا اور افراط زر نے لوگوں کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ لاکھوں فوجی جو چار سال تک مورچوں میں زندگی گزار کر آئے تھے نا امیدی اور کسمپرسی کا شکار تھے۔ جرمنی جسے شکست ہوئی تھی بری طرح سے معاشی اور سیاسی توڑ پھوڑ کا شکار تھا۔ پورا یورپ ہڑتالوں،

مظاہروں اور بغاوتوں کی زد میں تھا۔ جرمنی کے لوگ معاہدۂ ورسائی اور معاشی بدحالی کی وجہ سے شدید کرب میں مبتلا تھے۔ سپارٹائیوں (Spartacists)، انقلابی سوشل ڈیموکریٹک حکومت اور اس کے لیڈروں کو خون میں نہلا دیا گیا تھا۔ روسا لکسمبرگ (ROSA LUXUMBERG) اور کارل لائبنخ (KARL LIEBKNECH) جیسے مارکسسٹ اور سوشلسٹ لیڈروں کو قتل کر دیا گیا تھا۔

1919ء کی ایک شام جبکہ جرمن ورکرز پارٹی DAP کے چند افراد ان مسائل کے حل اور ایک لیڈر کی تلاش میں سر جوڑے بیٹھے تھے کہ ایک پرانا سپاہی جس کا نام ہٹلر تھا نمودار ہوا۔ اس کے خیالات اور شعلہ بیانی کو دیکھ کر ان بوڑھوں نے فیصلہ کر لیا کہ قوم کو ایک لیڈر مل گیا ہے۔ ہٹلر کا عروج یہاں سے شروع ہوتا ہے۔

جرمن ورکرز پارٹی جنگ کے بعد قائم شدہ ری پبلک جمہوری حکومت کے بھی خلاف تھی اور مارکسزم کے بھی خلاف تھی۔ ہٹلر نہ صرف ان دونوں کے خلاف تھا بلکہ یہودیوں سے سخت نفرت کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ جرمنی کی تباہی کے ذمہ دار یہودی تھے۔ 1920ء میں جرمن ورکرز پارٹی کا نام تبدیل کر کے نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز پارٹی (NATIONAL SOZIALISTISCHER) رکھا گیا جو نازی پارٹی کہلائی۔ ہٹلر کی قیادت میں یہ پارٹی اتنی مقبول ہوئی کہ 1933ء میں اقتدار میں آ گئی اور ہٹلر کو چانسلر بنا دیا گیا۔ ہٹلر نے معاہدۂ ورسائی کو پھاڑ کر پھینک دیا اور اپنے کھوئے ہوئے علاقے حاصل کرنا شروع کر دیئے۔ کھوئی ہوئی قومی عزت بھی جرمن قوم کو واپس ملنے لگی تو ہٹلر ان کا قومی ہیرو بن گیا۔ اس نے آسٹریا اور چیکوسلواکیہ (موجودہ چیک ریپبلک اور سلوینیہ) پر حملہ کیا اور ہوائی فوج، بری فوج اور بحری فوج میں اضافہ کرنے لگا۔ جرمنی میں نازی ازم نے جگہ بنا لی۔

میسولینی نے اٹلی کو فاشزم کے راستے پر ڈال دیا

پہلی عالمی جنگ کی تباہی کے نتیجے میں یورپ کے مختلف ممالک میں فاشسٹ گروپ قائم ہونا شروع ہو گئے تھے۔ مارچ 1919ء میں ایک گروپ

(FASCIES DE-COMBATIE MANTO) کے نام سے میسولینی نے اٹلی میں قائم کیا۔ ابتدا میں میسولینی سوشلسٹ تھا بلکہ 1904ء میں جب وہ سوئٹزرلینڈ سے واپس لوٹا تو سوشلسٹ اخبارات کے لیے صحافی کے طور پر کام کرتا رہا۔ مگر جب اٹلی نے پہلی عالمی جنگ میں شرکت کی حمایت کی تو سوشلسٹ مخالف ہوگیا۔ جنگ کے بعد ہزاروں شکست خوردہ سپاہی غربت سے تنگ آئے ہوئے نوجوان اس کی تنظیم میں شامل ہوتے گئے۔ میسولینی کی فاشسٹ پارٹی نے 1921ء تک اٹلی میں قتل و غارت، غنڈہ گردی، بدمعاشی کے ذریعے خوف و ہراس اور دہشت گردی کی ایسی فضا قائم کر لی کہ اس کو مخلوط حکومت میں شامل کرلیا گیا۔

اکتوبر 1922ء میں جب اٹلی میں معاشی اور سیاسی بحران گہرا ہوا تو میسولینی نے اپنے مسلح دستوں، جنہیں بلیک شرٹس کہا جاتا تھا، کو روم میں مارچ کروا کر یہ خوف پیدا کیا کہ ملک کی صورت حال کو اس کے علاوہ کوئی نہیں سنبھال سکتا اور حکومت کی باگ ڈور اس کے حوالے کی جائے۔ چنانچہ اٹلی کے بادشاہ وکٹر ایمونیئل نے میسولینی کو حکومت بنانے کی دعوت دی اور میسولینی نے حکومت بنائی۔

ہٹلر اور میسولینی اپنا ''درخشاں ماضی'' واپس لانا چاہتے تھے

1925ء میں میسولینی نے جمہوری حکومت کو ختم کرکے اپنے آپ کو DUCE کہلوانا شروع کیا یعنی فاشزم کا لیڈر۔ اس نے جلد ہی بادشاہ کے فوج کے اختیارات میں اپنی شمولیت کروانے کے بعد خود کو سلطنت روم کا پہلا مارشل مقرر کردیا۔ میسولینی بھی ہٹلر کی طرح اٹلی کی ماضی کی عظمت کو دوبارہ واپس لانے کا پروگرام پیش کرتا تھا۔ یہ دونوں سرمایہ داروں سے رقم وصول کرتے، سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت سے اپنی تقریروں کا آغاز کرتے اور کمیونسٹ دشمنی پر ختم کرتے۔ جس طرح آج کل پاکستان میں کچھ مذہبی جماعتیں امریکہ کے خلاف نعرے لگاتی ہیں، ''درخشاں ماضی'' کو واپس لانے کے بہانے معاشرے کے ترقی پسند، لبرل، سیکولر اور سوشلسٹ خیال رکھنے والے افراد کو قتل کرتی ہیں یا

قتل کی دھمکیاں دیتی ہیں۔

اٹلی کے فاشسٹ اور جرمنی کے نازی، انقلاب روس کے خلاف تھے، مزدوروں کی حاکمیت کے خلاف تھے اور پارلیمانی طرز جمہوریت کے بھی خلاف تھے۔ جرمنی اور اٹلی نے جہاں آپس میں جنگی معاہدے کرنا شروع کئے، وہاں انہوں نے جاپان کے ساتھ بھی جنگی معاہدے کر لئے۔ جاپان اس وقت چین کے خلاف جنگ کر کے اپنی توسیع پسندی میں مصروف تھا۔

کمیونسٹ انٹرنیشنل (COMINTERN)

پہلی عالمی جنگ کے نتیجے میں جہاں بہت تباہی ہوئی تھی، چار بڑی سلطنتوں کا خاتمہ بھی ہوا تھا، وہاں ایک بہت بڑا انقلاب برپا ہوا تھا اور وہ تھا اکتوبر 1917ء کا بالشویک انقلاب، جس کے نتیجے میں دنیا میں پہلی بار مزدوروں اور کسانوں کی حکومت قائم ہوئی تھی۔ اس کے اثرات پوری دنیا میں بالعموم اور یورپ میں بالخصوص بہت تیزی سے پھیلے۔ دنیا بھر میں معاشی اور قومی آزادی کے حصول کی جدوجہد کرنے والے افراد اور جماعتوں کو ایک نیا ولولہ اور ایک نئی امنگ ملی تھی۔

لینن اور بالشویک کی دیگر قیادت کا خیال یہ تھا کہ دنیا بھر کے محنت کشوں، مزدوروں، کسانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے۔ چنانچہ 21/مارچ 1919ء کو ماسکو میں کمیونسٹ انٹرنیشنل جس کو تھرڈ انٹرنیشنل بھی کہا جاتا ہے، قائم کی گئی۔ یہ ایک بین الاقوامی تنظیم تھی جس کا مقصد بین الاقوامی بورژوازی کے خلاف ہر طرح سے جدوجہد کرتے ہوئے دنیا بھر کے مزدوروں، محکوموں اور مظلوموں کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنا تھا۔

اکتوبر 1917ء کے بالشویک انقلاب روس نے پورے عالمی استعماری اور استحصالی طبقات کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ سرمایہ دارانہ حکومت کی جگہ عوامی جمہوریت، سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام معیشت کی جگہ اشتراکی نظام معیشت میں دنیا بھر کے استحصال زدہ طبقات اور محکوم عوام اپنا روشن مستقبل دیکھنے لگے۔ ان کے دکھوں کا حل سوشلزم میں تھا اور اقتدار میں ان کی شمولیت عوامی جمہوریت کے ذریعے تھی۔

روسی بالشویک ولادی میر لینن کی سربراہی میں یہ یقین رکھتے تھے کہ روس کے

اس سوشلسٹ انقلاب کو روکنے کے لیے دنیا بھر کے سرمایہ دار مل کر طاقت کا استعمال کریں گے جیسا کہ 1871ء میں پیرس کمیون کو فوج کے ذریعے ختم کیا گیا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ دنیا بھر کے مزدور اور محکوم اقوام ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں۔ چنانچہ ماسکو میں 1919ء میں 2/مارچ سے 6/مارچ تک منعقدہ اس عالمی کانگرس میں 34 پارٹیوں کے 52 مندوبین نے شرکت کی اور کمیونسٹ انٹرنیشنل (COMINTERN) قائم ہوئی۔ بورژوا جمہوریت کے خلاف اور پرولتاریہ حاکمیت کے لیے عالمی سطح پر اور عوامی سطح پر نظریاتی اور عملی جدوجہد کے اشتراک کی ابتدا ہوئی۔

اس کانگرس میں جن کمیونسٹ پارٹیوں نے شرکت کی وہ تھیں۔ روسی کمیونسٹ پارٹی، جرمن، جرمن آسٹریا، ہنگری، پولینڈ، فن لینڈ، یوکرین، لیٹویا، لیتھونیا، بیلا روس، استھونیا، آرمینیا، وولگا جرمن کی کمیونسٹ پارٹیاں۔ ان کے علاوہ شریک ہونے والی پارٹیاں تھیں۔ دی سویڈش ڈیموکریٹک لیفٹ پارٹی، بالکن انقلابی عوامی روس، زیمر ورلڈ لیفٹ ونگ آف فرانس، چیک، بلغارین، یوگوسلاویہ، برٹش، فرنچ اور سوئس کمیونسٹ پارٹیاں، دی ڈچ سوشل ڈیموکریٹک گروپ، سوشلسٹ پراپیگنڈہ لیگ اور سوشلسٹ لیبر پارٹی آف امریکہ، سوشلسٹ ورکرز پارٹی آف چائنا، کورین ورکرز یونین، ترکمانستان، ترکش، جارجیا، آذربائیجان، پیروشین اور زیمر ورلڈ کمیشن۔

لینن نے 1902ء میں مارکسزم کی روشنی میں ''کیا کیا جائے؟'' (What is to be done?) لکھ کر انقلاب کی حکمت عملی کی وضاحت کر دی تھی۔ لینن اور کمیونسٹ انٹرنیشنل کا خیال یہ تھا کہ پرولتاری انقلاب برپا کرنے کے لیے تمام ممالک میں کمیونسٹ پارٹیاں قائم ہوں جو جمہوری مرکزیت، بحث و مباحثے اور تبادلہ خیال کی مکمل آزادی اور اجتماعی شرکت عملی میں یقین رکھتے ہوئے عوامی حاکمیت کا راستہ ہموار کریں۔ گویا کمیونسٹ انٹرنیشنل ایک طرح سے دنیا بھر کے انقلاب کا مرکزی دفتر تھا۔

اس کی دوسری کانگرس جولائی، اگست 1920ء میں ہوئی جہاں پر کئی اور فیصلوں کے علاوہ یہ بھی طے پایا کہ نوآبادیاتی دنیا میں پرولتاریہ، کسان، دہقان اور قومی بورژوازی

کے ساتھ متحدہ محاذ بنایا جائے۔تمام کمیونسٹ پارٹیاں ان ممالک میں جہاں جہاں بھی بورژوا جمہوری آزادی کی جدوجہد ہورہی ہے،اس کی حمایت کریں۔بعض مندوبین کا خیال تھا کہ بورژوا قیادت میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں کے بجائے صرف وہاں پر موجود کمیونسٹ پارٹیوں کی مدد کی جائے۔انڈین انقلابی ایم این رائے جنہوں نے اس کانگرس میں کمیونسٹ پارٹی آف میکسیکو کی جانب سے شرکت کی تھی، ان کا بھی یہی خیال تھا۔ چنانچہ بورژوا جمہوری کا لفظ ہٹا دیا گیا۔

1920ء میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی بنیاد تاشقند میں رکھی گئی۔اسی سال کمیونسٹ پارٹی آف سپین قائم ہوئی۔ 1921ء میں کمیونسٹ پارٹی آف اٹلی قائم ہوئی جبکہ میسولینی نے اٹلی کے فاشزم کی بنیاد رکھ دی تھی۔اسی سال کمیونسٹ پارٹی آف بلجیم بھی قائم ہوئی۔غرضیکہ اکتوبر انقلاب روس کی گونج دور دور تک سنائی دینے لگی۔کچھ کمیونسٹ پارٹیوں نے اپنی مسلح تنظیمیں بھی قائم کر لی تھیں۔ 1924ء میں منگولین پیپلز انقلابی پارٹی نے بھی کمیونسٹ انٹرنیشنل میں شمولیت اختیار کر لی۔ہوچی منہ نے ویت نام میں کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی۔وہ بھی کمیونسٹ انٹرنیشنل سے متاثر تھے۔

چین کی کمیونسٹ پارٹی 1921ء میں قائم ہوئی اور اس نے اعلان کیا کہ وہ کمیونسٹ انٹرنیشنل کی ایک شاخ ہے۔اس وقت چین میں ایک بڑی قوم پرست پارٹی تھی،جس کا نام تھا چینی نیشنلسٹ پارٹی (کومن تانگ) جس کی بنیاد ڈالنے والوں میں ڈاکٹر سن یات سن تھے، جو ایک فزیشن تھے۔جب 1912ء میں ری پبلک آف چائنا قائم ہوئی تو وہ اس کے پہلے عارضی صدر بنے۔انہوں نے جاپانی فوج کے قبضے اور جاگیردار مانچو شاہی خاندان کے خلاف قومی آزادی کی جدوجہد بھی شروع کی۔

کمیونسٹ انٹرنیشنل کے قیام کے بعد کومن تانگ نے اس کا ممبر بننے کی درخواست دی مگر یہ اس لیے قبول نہیں کی گئی کہ کومن تانگ کو سامراج دشمن مگر بورژوا پارٹی سمجھا جاتا تھا نہ کہ ایک مارکسسٹ پارٹی۔مگر کمیونسٹ انٹرنیشنل کی ہدایت پر چینی کمیونسٹ پارٹی،جس پر روسی انقلاب کا گہرا اثر تھا،ڈاکٹر سن یات سن کے ساتھ مل کر کام کرتی رہی۔

ڈاکٹر سن یات سن کا 1925ء میں انتقال ہوا تو ان کے جانشین چیانگ کائی شک نے چینی کمیونسٹ پارٹی کی شمالی مہم (Nothern Expedetion)(1926-28)ء کے دوران کمیونسٹوں کا بڑے پیمانے پر قتل عام کیا جس سے ثابت ہوا کہ کمیونسٹ انٹرنیشنل کا کومن تانگ کے بارے میں فیصلہ درست تھا۔ اس قتل عام کو شنگھائی 1927ء کا قتل عام کہا جاتا ہے۔ چیانگ کائی شک کی قیادت میں کومن تانگ کمیونسٹ دشمن پارٹی بن گئی۔

1923ء تک ماؤزے تنگ چینی کمیونسٹ پارٹی کے سربراہ بن چکے تھے۔ وہ ایک متوسط زمیندار کے بیٹے تھے جن کا تعلق صوبہ ہنان کے گاؤں شاؤ شان سے تھا۔ انہوں نے جولائی 1921ء میں ہونے والی چینی کمیونسٹ پارٹی کی پہلی کانگرس میں شرکت کی اور دو سال بعد تیسری کانگرس میں نہ صرف سنٹرل کمیٹی کے ممبر بنے بلکہ پارٹی کی قیادت بھی ان کو سونپ دی گئی۔ 1925ء سے لے کر 1949ء کی آخری فتح تک ماؤزے تنگ کو اندرون ملک کومن تانگ اور باہر کی سامراجی طاقتوں بالخصوص جاپانیوں کے خلاف یعنی دو محاذوں پر نظریاتی جدوجہد اور مسلح جدوجہد کرنا پڑی۔

کمیونسٹ انٹرنیشنل کی ابھی چار کانگرسیں ہی ہوئی تھیں کہ 1924ء میں لینن کا انتقال ہو گیا اور 1925ء میں سٹالن نے ''سوشلزم ایک ملک میں'' پر عمل کرتے ہوئے سوویت یونین میں سوشلزم کو مضبوط کرنا شروع کیا۔ جنوری 1926ء کے سٹالن کے مضمون On the issues of Leninism کے بعد ''سوشلزم پہلے ایک ملک میں'' مستحکم کیا جائے کی پالیسی کو ریاستی سطح پر اختیار کیا گیا۔

چھٹی عالمی کانگرس میں نوآبادیاتی دنیا کے بارے میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کی متحدہ محاذ کی پالیسی پر نظر ثانی کی گئی کیونکہ چین میں کومن تانگ نے 1927ء میں چینی کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ محاذ آرائی شروع کر دی تھی۔ اس وقت تک کمیونسٹ انٹرنیشنل کی کومن تانگ کے ساتھ متحدہ محاذ کی پالیسی تھی۔ اسی کانگرس میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کو برطانوی سامراج اور ہندوستانی بورژوازی کے تضاد سے فائدہ اٹھانے کی پالیسی کو اپنانے کا مشورہ دیا گیا۔ کمیونسٹ انٹرنیشنل کی آخری کانگرس 25/ جولائی 1935ء کو شروع ہو کر 12/ اگست

1935ء کوختم ہوئی۔ اس میں تقریباً 65 کمیونسٹ پارٹیوں نے شرکت کی۔ کانگرس نے فاشزم کے خلاف ان پارٹیوں کے ساتھ پاپولر فرنٹ (Popular Front) بنانے پر زور دیا جومزدوروں اور کسانوں میں کام کررہی تھیں۔

چین میں تین سال سے ماؤزے تنگ کی لانگ مارچ جاری تھی۔ عوام اور ریڈ آرمی مل کرمشکل ترین حالات کے باوجود علاقہ پر علاقہ فتح کر رہے تھے کہ 1937ء میں جاپان نے چین پر حملہ کر دیا۔ اب ماؤزے تنگ کوچین کی سا لمیت کی جنگ بھی لڑنا تھی اور چین میں چیانگ کائی شک کی حکومت کا خاتمہ کر کے عوامی حاکمیت قائم کرنے کی جنگ بھی لڑنا تھی۔ ماؤزے تنگ نے اس تضاد میں قومی سا لمیت کی جنگ کومقدم تضاد سمجھ کر جاپان کے خلاف چیانگ کائی شک کے ساتھ مل کر متحدہ محاذ بنایا اور قومی آزادی کی یہ جنگ جیتی۔ مگر ماؤزے تنگ کی چیانگ کائی شک کے خلاف اور عوامی حاکمیت کے قیام کے لیے جنگ جاری رہی۔ حتیٰ کہ 1949ء میں کومن تانگ حکومت یعنی چیانگ کائی شک کی حکومت کوشکست ہوئی اور چین میں عوامی حکومت قائم ہوئی جس کے سربراہ ماؤزے تنگ اور وزیراعظم چو۔این۔ لائی تھے۔ کومن تانگ کی تمام قیادت بشمول چیانگ کائی شک نے بھاگ کر امریکہ کی مدد سے تائیوان میں پناہ لی اور وہاں پر سامراج کی پٹھوحکومت قائم کر لی۔

لانگ مارچ کے دوران ماؤزے تنگ اور چو۔این۔لائی اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ کمیونسٹ انٹرنیشنل کے مشورے اور تجزیئے چین کے اندر جاری ان کی جدوجہد اور چین کے معروضی حالات سے مطابقت نہیں رکھتے۔ چنانچہ چین کی کمیونسٹ پارٹی نے اپنے حالات کے مطابق اپنے فیصلے خود کرنا شروع کر دیے اور چین کی کمیونسٹ پارٹی، کمیونسٹ انٹرنیشنل کے اثر سے باہر آ گئی مگر کمیونسٹ انٹرنیشنل پھر بھی مشورے اور ہدایات جاری کرتی رہتی تھی۔ اکثر اوقات ان ہدایات پر عمل نہیں ہوتا تھا۔ اب چین کی کمیونسٹ پارٹی خالصتاً چینی جماعت تھی بالکل اسی طرح جیسا کہ بالشویک پارٹی خالصتاً روسی پارٹی تھی۔

دوسری عالمی جنگ کے شروع میں کمیونسٹ انٹرنیشنل نے غیر مداخلتی پالیسی کو اپنایا۔ مگر جون 1941ء میں جب سوویت یونین پر حملہ کیا گیا تو اس نے اپنی پالیسی کو

تبدیل کیا اور سوویت یونین اتحادیوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔

دنیا کے حالات بہت تیزی سے بدل رہے تھے۔ ہر ملک کی کمیونسٹ پارٹی کو اپنے اپنے ملک کے معروضی حالات کا سامنا تھا جو کہ ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ 1919ء میں کمیونسٹ انٹرنیشنل نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا وہ ان حالات میں ممکن نہیں تھا۔ دنیا دوسری عالمی جنگ کی لپیٹ میں آ چکی تھی۔ چنانچہ 15 رمئی 1943ء کو کمیونسٹ انٹرنیشنل کو ختم کر دیا گیا۔

کمیونسٹ انٹرنیشنل کے خاتمے کے بعد ستمبر 1947ء کی پیرس کانفرنس میں سٹالن نے یورپ کی اہم کمیونسٹ پارٹیوں پر مشتمل کمیونسٹ انفارمیشن بیورو قائم کیا جو بلغاریہ، چیکو سلواکیہ، ہنگری، اٹلی، پولینڈ، رومانیہ، یوگوسلاویہ، اور سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹیوں کے درمیان رابطہ کا ایک ذریعہ تھا۔ 1953ء میں سٹالن کی موت کے بعد اس کو بھی 1956ء میں ختم کر دیا گیا۔ کمیونسٹ پارٹیوں کی اب عالمی سطح پر کوئی باقاعدہ تنظیم تو نہیں تھی مگر ان کے درمیان ایفرو ایشین پیپلز سالیڈیریٹی جیسی مختلف سیاسی، علمی، ادبی، تنظیموں کے ذریعے رابطہ برقرار تھا۔ اس کے وقتاً فوقتاً اجلاس ہوتے تھے۔ سوویت یونین کے زیر اثر کمیونسٹ پارٹیوں کا ورلڈ مارکسسٹ ریویو ایک ایسا مشترکہ جریدہ تھا جو سوویت یونین کے خاتمے تک ان پارٹیوں کے درمیان ایک رابطے کا کام انجام دیتا رہا۔

لینن، سٹالن اور ٹراٹسکی

کمیونسٹ انٹرنیشنل ختم ہوگئی۔ لینن کے بعد سٹالن نے اقتدار سنبھالا مگر لینن کی وفات کے بعد پارٹی کی قیادت نہ ملنے اور سٹالن کے ساتھ ذاتی چپقلش کی وجہ سے ملک بدر ہونے کے بعد ٹراٹسکی نے سٹالن اور استحکام انقلاب روس کی شدومد کے ساتھ مخالفت شروع کردی۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ ٹراٹسکی نے بالشویک انقلاب اکتوبر کو بچانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

ٹراٹسکی 1879ء میں یوکرین میں یانووکا (YANOVKA) کے ایک امیر یہودی زمیندار کے گھر پیدا ہوا اور لڑکپن سے ہی زیرزمین سرگرمیوں میں مصروف ہوگیا۔ پکڑا گیا، جیل گیا، اور سائبیریا میں جلاوطن کردیا گیا جہاں پر اس نے سوشل ڈیموکریٹک لیبر پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی۔ سائبیریا سے بھاگنے میں وہ کامیاب ہوا اور اس نے آئندہ 15 برس امریکہ اور مغربی یورپ بشمول لندن میں گزارے۔

روسی مارکسزم کی ابتدا 1898ء میں ہوئی۔ جب روسی سوشل ڈیموکریٹک لیبر پارٹی (RSDLP) قائم ہوئی جو مختلف چھوٹے چھوٹے گروپس پر مبنی تھی۔ مگر بیسویں صدی کے ابتدا میں ہی RSDLP روس کی سب سے بڑی مارکسسٹ پارٹی بن کر ابھری۔ پارٹی کے نزدیک پرولتاریہ (یعنی صنعتی مزدور) انقلاب کا بنیادی ذریعہ اور ہر اول دستہ تھا۔ جبکہ روس کی بادشاہت اور جاگیرداری نظام میں صنعتی مزدور کی تعداد بے حد کم تھی اس لئے کہ صنعت تھی ہی نہیں۔ چنانچہ کئی نسلوں بلکہ صدیوں تک سوشلسٹ انقلاب کا دور دور بھی امکان نہیں تھا۔ اس مارکسی دقیانوسیت کو ولادیمیر لینن نے 1902ء میں اپنے

کتابچے What is to be done، ''کیا کیا جانا چاہیے'' کے ذریعے چیلنج کیا۔ RSDLP میں اس پر بحثیں ہوئیں۔ جولئس مارٹوف Julius Martov جو مینشوک کا لیڈر بنا، اس کا خیال تھا کہ پارٹی کو یورپین ممالک کی سوشلسٹ پارٹیوں بالخصوص برطانوی لیبر پارٹی کی طرح کام کرنا چاہیے جبکہ لینن کے خیال میں روس میں اور زار روس کے جبر کے دور میں جہاں سوشلسٹ پارٹی کا قیام بھی غیر قانونی تھا وہاں پر یورپین ممالک کی سوشلسٹ پارٹیوں کی طرز پر کام نہیں ہوسکتا تھا۔ روس کے معروضی حالات مختلف تھے۔

بالآخر اگست 1903ء میں جب روسی سوشل ڈیموکریٹک لیبر پارٹی کی دوسری کانگرس لندن میں منعقد ہوئی تو اختلاف رائے پر رائے زنی ہوئی اور پارٹی دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئی۔ مینشوک (اقلیتی Menshevik) بالشویک (اکثریتی Bolshevik)، مارٹوف نے 23 ووٹ حاصل کئے چنانچہ وہ اور اس کے حامی (اقلیتی) مینشوک کہلائے۔ جبکہ لینن نے 28 ووٹ حاصل کئے اور وہ (اکثریتی) بالشویک کہلائے۔ سٹالن نے لینن یعنی بالشویک کا ساتھ دیا جبکہ ٹراٹسکی نے لینن کی مخالفت کی اور مارٹوف یعنی مینشوک کا ساتھ دیا اور اس کے ساتھ رہا۔

ٹراٹسکی نے مارچ 1917ء کے انقلاب میں بھی کوئی کردار ادا نہیں کیا بلکہ لینن کی مخالفت کرتا رہا۔ مگر جب انقلابیوں نے عارضی حکومت قائم کی تو وہ مئی 1917ء میں روس واپس آ گیا اور مینشویک کو چھوڑ کر بالشویک میں شمولیت اختیار کر لی۔

ٹراٹسکی بہت جلد اپنی صلاحیتوں کو منوانے میں کامیاب ہوگیا۔ جس کے نتیجے میں اس کو وزیر خارجہ (Foreign Commissar) مقرر کیا گیا جہاں پر اس نے اہم کامیابیاں حاصل کیں بالخصوص جرمنی کے ساتھ امن معاہدہ۔

ابھی تک روس پر بالشویک کا مکمل قبضہ نہیں ہوا تھا اور کہیں کہیں خانہ جنگی جاری تھی۔ لینن نے ٹراٹسکی کو وزیر دفاع (Commissar of War) بنا کر ریڈ آرمی کا اسے اختیار دے دیا مگر خود اس کی نگرانی اور قیادت کی۔ ریڈ آرمی نے نہ صرف خانہ جنگی کا مقابلہ کیا بلکہ مکمل فتح حاصل کر کے بالشویک انقلاب کو بچایا۔

ٹراٹسکی نہایت متکبر اور مغرور انسان تھا، اپنے آپ کو بہت بڑا دانشور سمجھتا تھا اور دوسروں کو حقارت سے دیکھتا تھا۔ جس کے نتیجے میں اس کے دوست کم اور مخالفین زیادہ تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ لینن کے بعد پارٹی کی قیادت اس کا حق ہے اور اپنے تیئں وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ لینن کا جانشین ہے۔ جبکہ ہوا یہ کہ لینن کے بعد جوزف سٹالن نے پارٹی کی قیادت سنبھال لی۔

جوزف سٹالن جارجیا میں گوری (GORI) کے مقام پر 21/دسمبر 1879ء کو ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ جوتے بناتا تھا اور ماں کپڑے دھوتی تھی۔ سٹالن نے نہ صرف خود غریبی میں آنکھ کھولی بلکہ دیہات میں کسانوں کی بدترین غریبی بھی دیکھی۔ ایک بار اس کے گاؤں میں چیچک کی وباء پھیلی جو سات سال کی عمر میں سٹالن کے چہرے کو داغدار کر گئی جس کی وجہ سے سکول میں وہ بچوں کے مذاق کا نشانہ بنتا تھا۔

جوزف کی ماں ہر غریب فرد کی طرح بہت مذہبی تھی۔ اس نے کوشش کر کے جوزف کو عیسائی مذہبی سکول میں مذہبی مُلّا بننے کے لیے داخل کروایا۔ یہاں پر اس نے طفلس کے روحانی سکول کا وظیفہ بھی حاصل کیا۔ مگر اس دوران اس نے ایک خفیہ تنظیم MESSAME DASSY میں شمولیت اختیار کر لی جو جارجیا کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی تھی۔ یہ تنظیم جارجیا کو روس سے آزاد کروانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ یہاں پر پہلی بار وہ کارل مارکس کے خیالات سے روشناس ہوا۔ ممنوعہ کتابیں پڑھنے، باغیانہ اور خطرناک خیالات رکھنے اور مدرسے کے طالب علموں میں کارل مارکس کے خیالات کو پھیلانے کے جرم میں جوزف کو 1899ء میں مذہبی مدرسہ سے نکال دیا گیا۔ کچھ عرصہ بے کار رہنے کے بعد اس نے درمیانہ طبقے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کی۔ بعد ازاں جارجیا کے سوشلسٹ اخبار میں لکھنا شروع کیا۔

1901ء میں سٹالن نے سوشل ڈیموکریٹک لیبر پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ اس وقت اس پارٹی کی تقریباً تمام اعلیٰ قیادت جلاوطنی میں تھی۔ سٹالن نے روس میں رہ کر مزدوروں میں کام شروع کیا۔ 1902ء میں مزدوروں کی ہڑتال کی وجہ سے اس کو گرفتار کر لیا گیا اور 18 ماہ کی قید کے بعد اس کو سائبیریا میں جلاوطن کر دیا گیا۔ 1904ء میں سٹالن

سائبیریا سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا اور واپس روس پہنچ کر دوبارہ مزدوروں اور کسانوں میں کام کرنے لگا۔لینن اس سے بے حد متاثر تھا۔آنے والے سالوں میں سٹالن کئی بار گرفتار ہوا، سائبیریا جلاوطن کیا جاتا رہا مگر ہر بار وہ فرار ہوکر واپس پہنچ جاتا اور زیر زمین کام میں مصروف ہوجاتا۔

22/جنوری 1905ء کے خون سے بھرے اتوار کے دن روس کے 1917ء کے انقلاب کی بنیاد رکھی گئی۔اس دن ہزاروں مزدوروں نے زار کے سرمائی محل کے سامنے جمع ہوکر ایک عرض داشت زار کو دینا چاہی جس میں شہری آزادیوں، بہتر تنخواہ، زمین پر کسانوں کے حقوق اور دستور ساز اسمبلی کا برابری کی سطح پر قیام جیسے مطالبات تھے۔اس اجتماع کی قیادت اس دن گوپان (GOPAN) نامی ایک پادری کر رہا تھا اور مزدوروں نے صلیب کے نشان اور حضرت عیسیٰ کی مورتیاں اٹھا رکھی تھیں کہ زار کے سپاہیوں نے ہزاروں مزدوروں کا قتل عام کرڈالا اور ہزاروں مزدوروں کو زخمی کیا۔اس کے نتیجے میں زار مخالفت تحریک ملک کے ہر دیہات اور شہر کے کسانوں اور مزدوروں میں پھیل گئی۔پھر فوج اور نیوی میں ہڑتالیں ہوئیں اور جنوری 1905ء میں احتجاجی مزدوروں کی تعداد جو چوبیس ہزار تھی وہ اکتوبر 1905ء میں پانچ لاکھ تک پہنچ گئی۔یہ محنت کشوں کی جدوجہد تھی جس کی رہنمائی بالشویک کررہے تھے۔سٹالن آگے آگے تھا۔پرولتاریہ انقلاب کی جدوجہد نہایت تیزی سے منظم ہوتی گئی۔سٹالن 1911ء میں سینٹ پیٹرزبرگ منتقل ہوگیا اور Pravda کا ایڈیٹر مقرر ہوکر نظریاتی سطح پر لینن کی ہدایت کی روشنی میں مزدوروں کسانوں کو منظم کرتا رہا۔1913ء میں اسے پھر گرفتار کرلیا گیا اور اب کی بار اس کو عمر بھر کی جلاوطنی کی سزا دے کر سائبیریا بھیج دیا گیا۔

فروری 1917ء میں جب زار روس نیکولائی دوئم کا تختہ الٹا دیا گیا اور روس میں بادشاہت کا خاتمہ ہوا تو عبوری حکومت کے قیام کے بعد عبوری وزیراعظم الیگزانڈر کرینسکی نے تمام سیاسی قیدیوں کو واپس گھروں کو جانے کی اجازت دے دی۔سٹالن بھی واپس آکر پھر سے پراودا کی مجلس ادارت میں شامل ہوگیا۔

ابھی تک بالشویک اس عبوری حکومت کے مخالف نہیں تھے بلکہ اس کی حمایت کرتے تھے۔ 3/اپریل 1917ء کو جب لینن واپس روس پہنچا تو اس نے اس پالیسی کو ترک کر کے اعلان کیا کہ انقلابیوں کو عبوری حکومت کی حمایت کے بجائے اقتدار حاصل کرنے کی پالیسی کو اپنانا چاہیے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو سوشلزم کے ساتھ غداری ہوگی۔

لینن کے اس ''نظریۂ اپریل'' نے پارٹی لائن تبدیل کر دی۔ مگر پارٹی میں کچھ لوگ اس خیال کے حامی تھے کہ روس ابھی سوشلسٹ انقلاب کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے ہمیں عبوری حکومت کو چلنے دینا چاہیے۔ سٹالن کے لیے اب دو راستے تھے۔ یا تو لینن سے بغاوت کر کے پارٹی کی قیادت سنبھالتا یا لینن کے نظریئے کا ساتھ دیتا۔ اس نے دس دن تک سوچ بچار کی اور پراودا میں ایک تفصیلی مضمون لکھ کر عبوری حکومت کی مخالفت کرتے ہوئے لینن کے فیصلے کا ساتھ دیا اور لینن کے ساتھ مل کر سوشلسٹ انقلاب کا راستہ اپنایا۔

اکتوبر انقلاب کی کامیابی کے بعد لینن نے سٹالن کو قومیتوں کا وزیر (COMISSAR OF NATIONALITIES) مقرر کیا۔ سٹالن جو خود جارجین ہونے کے ناطے غیر روسی تھا اور قومی اقلیت میں تھا، اس کے لیے یہ ایک عظیم موقع بھی تھا اور اس کی صلاحیتوں کا امتحان بھی۔ اس کے ذمے ساڑھے چھ کروڑ یوکرینیئن، جارجین، بیلا روسیئن، تاجکس، بوریس اور یاکوتس قوموں کے افراد کی ذمہ داری تھی۔ اس لیے بھی یہ ذمہ داری اہم تھی کہ بالشویک، روس میں موجود تمام قومیتوں کو حق خود ارادیت دینے کا وعدہ کرتے چلے آئے تھے۔

سٹالن، ٹراٹسکی کی طرح کوئی بہت بڑا دانشور نہیں تھا۔ مگر 1917ء سے پہلے اور انقلاب کے بعد 1921ء تک سٹالن کا واسطہ کروڑوں مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ تھا۔ وہ فلسفیانہ اندازِ گفتگو کی بجائے اُن کی زبان میں بات کرتا تھا اور وہ سب اس کو اپنا رول ماڈل سمجھتے تھے۔ جبکہ دیگر رہنما عملاً پرولتاریہ سے دور تھے۔ سٹالن کی قوت مزدور اور کسان تھے۔ مغرب کے دانشور جب سٹالن اور ٹراٹسکی کا موازنہ کرتے ہیں تو اس پہلو کو بھول جاتے ہیں کہ سٹالن کی جڑیں مزدوروں اور کسانوں میں تھیں۔ ٹراٹسکی ریڈ آرمی میں یقیناً

ہردلعزیز رہا ہوگا۔ مگر انقلاب روس کی اور بالشویک پارٹی کی اصل طاقت مزدور اور کسان تھے۔ پھر اس مشکل وقت میں بھی جب کہ زار کے زمانے میں پارٹی کی تمام قیادت روس سے باہر تھی یا سائبیریا میں تھی، سٹالن ہی تھا جو روس میں موجود تھا اور کارکنوں میں کام کر رہا تھا اور پارٹی کو اکٹھا رکھے ہوئے تھا۔

ٹراٹسکی کا خیال تھا کہ انقلاب روس کو یورپ کے جدید صنعتی ممالک میں سوشلسٹ انقلاب برپا کر کے ہی محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ سٹالن کا خیال تھا کہ روس کی جغرافیائی سرحدوں کے اندر سوشلسٹ انقلاب کو مضبوط کر کے، روس میں مزدوروں اور کسانوں کی پرولتاریہ حاکمیت کو مضبوط کر کے ہی انقلاب اکتوبر کو بچایا جا سکتا ہے۔ ٹراٹسکی کے خیالات پر ابھی تک مینشویک ماضی کا اثر تھا۔

ابتدائی طور پر دونوں میں جو معمولی چپقلش رہتی تھی وہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ ادھر لینن کی ''نئی معاشی پالیسی'' جس میں کسانوں کو اپنی پیداوار کھلی مارکیٹ میں بیچنے، اندرونی تجارت کی کچھ آزادیاں، پرائیویٹ کاروبار اور بینکوں کے قیام اور تمام فیکٹریاں جہاں بیس افراد سے کم کام کرتے ہیں، انہیں نہ قومیانے بلکہ ان کے پرانے مالکان کو واپس دینے کی پالیسی پر لے دے ہو رہی تھی۔ سٹالن، لینن کی اس نئی معاشی پالیسی کے حق میں تھا۔ جبکہ لینن اپنی اس نئی معاشی پالیسی، مضبوط مرکز کے ساتھ منسلک قومی حق خودارادیت کی تھکا دینے والی بحثوں میں الجھا ہوا تھا اور اپنے اوپر کیے گئے قاتلانہ حملے سے ابھی تک صحت یاب نہیں ہوا تھا۔ اگست 1918ء میں ڈورا کپلن (DORA KAPLAN) نامی ایک لڑکی نے ریوالور سے لینن پر حملہ کیا تھا اور ایک گولی ابھی تک اس کے جسم میں تھی۔

لینن نے ان حالات میں فیصلہ کیا کہ پارٹی کو چلانے کے لیے اسے ایک بااعتماد مددگار چاہیے۔ سٹالن ہمیشہ اس کا وفادار اور قابل بھروسہ کامریڈ رہا تھا۔ چنانچہ لینن نے اپریل 1922ء میں ہونے والی کانفرنس میں تجویز دی کہ پارٹی میں جنرل سیکرٹری کے عہدے کا اضافہ کیا جائے۔ سٹالن کو پارٹی کا پہلا جنرل سیکرٹری چنا گیا۔ سٹالن کے انتخاب

کے بعد لینن ہسپتال میں داخل ہوا تاکہ اس کے جسم سے گولی کو باہر نکالا جا سکے جواب کافی تکلیف کا باعث تھی۔ خیال کیا جارہا تھا کہ اس اپریشن کے بعد لینن کی صحت سنبھل جائے گی مگر اس کا نتیجہ لینن کے دائیں حصہ پر فالج کی صورت میں نکلا۔ کافی وقت تک وہ بات چیت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس دوران سٹالن نے پارٹی کو سنبھالا اور جنرل سیکرٹری کے طور پر اپنے اختیارات کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے طاقتور ہوتا گیا۔

پارٹی کانفرنس میں اس کو مکمل اختیار دے دیا گیا تھا کہ وہ ہر غیر اطمینان بخش ممبر کو پارٹی سے نکال سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے ٹراٹسکی کے ساتھیوں کو آہستہ آہستہ نکالنا شروع کیا اور پولیٹ بیورو میں بھی سٹالن کے مطابق فیصلے ہونے لگے۔ یوں بھی ٹراٹسکی کے تصور ''مستقل انقلاب'' کے مقابلے میں سٹالن کا نظریہ ''سوشلزم ایک ملک میں'' (Socialism in one Country) کہیں زیادہ مقبول تھا۔

ٹراٹسکی اور سٹالن کا تضاد بڑھتا گیا۔ سٹالن کے ساتھی سمجھتے تھے کہ پارٹی قیادت پر ان کارکنوں کا زیادہ حق ہے جنہوں نے شروع سے پارٹی کا ساتھ دیا اور مار کھائی ہے۔ جبکہ ٹراٹسکی اور اس کے ساتھی سٹالن کو ڈکٹیٹر کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ 1924ء میں لینن کے انتقال کے بعد سٹالن نے بھی اختیارات اپنی ذات میں مرکوز کر لیے تھے اور اپنے مخالفین سے بھی ظلم کی حد تک سختی سے نپٹتا تھا۔ پارٹی میں تقسیم ہو رہی تھی۔ 1925ء میں ٹراٹسکی کو حکومت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس کا یورپین انقلاب کا تصور پیچھے چلا گیا اور سٹالن کے سوویت یونین میں سوشلزم کو مضبوط کرنے کے نظریے پر عمل ہونے لگا۔

اکتوبر 1917ء کے انقلاب کے بعد سے ملک میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی تھی۔ سٹالن نے ملک کی معیشت کو جدید بنیادوں پر استوار کرنا شروع کیا۔ چنانچہ 1928ء میں پہلا پنجسالہ منصوبہ متعارف کرایا گیا جس میں لوہے اور سٹیل کی صنعت، مشین ٹولز، الیکٹرک پاور اور ٹرانسپورٹ کو اولیت دی گئی۔ سٹالن نے ان پانچ سالوں کے لیے جو ہدف رکھتے تھے وہ بے حد مشکل تھے۔ مثلاً اس کو کوئلہ کی صنعت میں 110% اضافہ چاہیے تھا، لوہے کی صنعت میں 200 فیصد، بجلی کی صنعت میں 335 فیصد۔ اس کا خیال تھا

کہ اگر سوویت یونین کو جلد از جلد مضبوط صنعتی معیشت پر نہ کھڑا کیا گیا تو مغربی یورپ کے سرمایہ دار ممالک کے حملے سے ملک کو اور سوشلزم کو بچانا ممکن نہ ہوگا۔ اس کے راستے میں جو کوئی بھی رکاوٹ ڈالتا نظر آتا یا سٹالن کو اندازہ ہوتا کہ اسکے پروگرام کو ناکام بنانے کی کوشش کی جارہی ہے وہ ان کے ساتھ سختی سے پیش آتا۔ مغرب میں اس کی اس سختی کو سٹالن ازم کا نام دیا جاتا ہے۔

سٹالن کے خلاف ٹراٹسکی اپنی کارروائیوں اور جوڑ توڑ کرنے میں مصروف تھا اور خدشہ تھا کہ پارٹی تقسیم نہ ہو جائے۔ ٹراٹسکی جسے 1927ء میں پارٹی سے نکال دیا گیا تھا، اب اسے 1929ء میں روس سے بھی نکال دیا گیا تھا۔ وہ پہلے ترکی گیا پھر کچھ عرصہ فرانس میں رہ کر 1936ء میں میکسیکو چلا گیا۔ مگر باہر بیٹھ کر بھی وہ سٹالن کے خلاف اپنی مہم کو جاری رکھے ہوئے تھا۔ 1936ء میں نیکولائی بوخارین اور اس کے پانچ ساتھیوں کو سٹالن کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش اور ٹراٹسکی کا ساتھ دینے کے جرم میں سزائے موت دی گئی۔ سیاسی مخالفین کی پکڑ دھکڑ سٹالن کے زمانے میں جاری رہی اور ان کو سخت سزائیں بھی دی گئیں۔ اس کے بارے میں یہ ایک مضبوط تصور موجود ہے کہ اگر وہ انقلاب دشمن عناصر کے ساتھ سختی سے پیش نہ آتا تو وہ انقلاب جو ایک عرصے کی جدوجہد کے بعد لینن کی سربراہی میں برپا ہوا تھا، بہت جلد ردانقلاب کا شکار ہو کر ختم ہو جاتا۔ مزدوروں کسانوں کی حکومت کو بچانے کے لیے اس کا ظلم اور سختی شاید اس کی اور وقت کی ضرورت تھی۔

20 رمارچ 1940ء کو ٹراٹسکی کو میکسیکو میں قتل کر دیا گیا۔ مغرب کا کہنا ہے کہ یہ قتل سٹالن نے کروایا تھا۔ مغرب میں ٹراٹسکی کا مرثیہ پڑھا جانے لگا۔ روس کے سوشلسٹ انقلاب اور سٹالن کی مخالفت کرنے کے لیے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں اب ٹراٹسکی پر ہونے والا ظلم تھا۔ میں نے کئی بار ان مجالس میں شرکت کی ہے جہاں پر ہر سال 20 رمارچ کو ٹراٹسکی کی تصویر کے سامنے موم بتیاں رکھ کر آنسو بہائے جاتے ہیں اور اس کے حق میں اور سٹالن کو برا بھلا کہنے کے لیے سیمینار ہوتے ہیں۔ مغرب کا ترقی پسند دانشور اور لندن سکول آف اکنامکس کے تعلیم یافتہ ''بائیں بازو'' کی اکثریت کا تصور ٹراٹسکی دوستی اور سٹالن

مخالفت کے ساتھ جڑا ہوا ہے مگر برطانیہ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی پارٹیاں ہیں جو مارکس، لینن اور سٹالن کے نظریئے کے ساتھ اپنے سیاسی کام کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مگر غریب دنیا میں اب سٹالنسٹ پارٹیاں بہت تیزی سے قائم ہو رہی ہیں۔

مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کو اور حکمران طبقات کو روس کے انقلاب سے بے حد خطرہ تھا۔ کارل مارکس کے مطابق عوامی سوشلسٹ انقلاب اٹلی، فرانس یا برطانیہ سے شروع ہونا چاہیے تھا جہاں پر مزدور تنظیمیں بہت مضبوط تھیں مگر انقلاب کا یہ سورج مشرق سے طلوع ہوا۔ مغرب کے حکمران ہر قیمت پر اس کو ناکام کرنا چاہتے تھے۔ جرمنی نے سٹالن کے خلاف ریڈ آرمی میں فوجی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی مگر جون 1937ء میں یہ سازش پکڑی گئی اور میخائل طوخاچیوسکی کے ساتھ سات دیگر کمانڈروں کو سزائے موت دی گئی۔ اس کے علاوہ سینکڑوں دیگر فوجیوں کو بھی گولی سے اڑا دیا گیا۔

سٹالن کو یقین تھا کہ جرمنی اور سرمایہ دار مغربی ممالک بہت جلد روس پر حملہ کریں گے جس کا مقابلہ ملک کو جدید صنعتی بنیادوں پر کھڑا کر کے ہی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ نہ صرف وہ اپنے اندرونی دشمنوں سے نپٹ رہا تھا بلکہ وہ ملک کو نہایت تیزی سے صنعتی ترقی کے راستے پر ڈال رہا تھا۔ لینن نے انقلاب روس کے موقع پر کہا تھا ''یا تو ہم ختم ہو جائیں یا پھر بڑھتے ہوئے ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک سے آگے نکل جائیں۔'' سٹالن کو بھی اس کا اندازہ تھا کہ سوویت یونین ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک سے پچاس سے سو سال تک پیچھے ہے۔ چنانچہ وہ اس فاصلے اور فرق کو دس سال میں پورا کرنا چاہتا تھا۔ 1930ء کا روسی دہقان جس نے کبھی ٹریکٹر یا کسی مشین کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا کس طرح سے جنگ میں اپنا کردار ادا کر سکتا تھا۔ اجتماعی زرعی کاشتکاری اور پورے ملک میں ٹریکٹر اور مشین کے پھیلاؤ کی وجہ سے وہ دہقان اس قابل ہوا کہ جنگ میں مشینی اسلحہ استعمال کر سکے۔ سٹالن کے تین پنجسالہ منصوبوں کے نتیجے میں روس معاشی اور فوجی اعتبار سے ایک ایسا مضبوط صنعتی ملک بن گیا کہ جس کے پاس لڑنے کے لیے جدید ہتھیار بھی تھے اور عوام کے پاس روٹی، کپڑا اور مکان بھی۔ روس ایک خوش حال اور ترقی یافتہ ملک بن چکا تھا۔

دوسری عالمی جنگ اور اس کے بعد

یورپ پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے۔ ہٹلر زور وشور کے ساتھ جنگی تیاریوں میں مصروف تھا۔ سٹالن چاہتا تھا کہ ہٹلر کے ساتھ مقابلے کے لیے مغرب میں ہٹلر مخالف اتحاد بنایا جائے مگر برطانوی وزیر اعظم نیول چمبر لین (Neville Chamber Lane)، سٹالن کے ساتھ اتحاد قائم کرنے میں سرد مہری دکھا رہا تھا۔ بلکہ اس سے پہلے جون 1935ء میں اینگلو جرمن نیول معاہدہ بھی طے پا چکا تھا۔ دراصل برطانیہ خود جرمنی کے ساتھ مل کر روس کے خلاف محاذ بنانا چاہتا تھا اور ستمبر 1938ء میں چیمبر لین اور ہٹلر کی میونخ میں ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ چیمبر لین ہٹلر کو اس بات پر آمادہ کر رہا تھا کہ وہ جنگ کا محاذ مغرب کے بجائے مشرق میں کھولے۔ مگر اس تمام عرصے میں چرچل برطانوی خارجہ پالیسی پر تنقید کرتا رہا۔ وہ اس حق میں تھا کہ سٹالن کے ساتھ جرمنی کے خلاف معاہدہ کیا جائے۔

سٹالن کو جنگی تیاریوں کے لیے وقت درکار تھا اور اس کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ جرمنی کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا جائے اور اگر ہٹلر نے جنگ لڑنی ہے تو مغرب میں لڑے۔ اس کے خیال میں جرمنی اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ وہ بیک وقت مشرق اور مغرب یعنی دو محاذوں پر جنگ کی ابتدا کرے۔ چنانچہ 3 رمئی 1939ء کو سٹالن نے اپنے خارجی معاملات کے عبوری وزیر میکسم لتوینوف (Maxim Litvinov) کو ہٹا کر مولوٹوف کو اس کی جگہ تعینات کیا اور 28 راگست 1939ء کو ماسکو میں نازی۔ سوویت معاہدہ پر دستخط ہو گئے۔ یہ ایک دوسرے پر بیس سال تک حملہ نہ کرنے کا معاہدہ تھا۔ مگر ہٹلر اندر ہی اندر سوویت یونین پر حملے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ اس معاہدے سے سٹالن کو دو سال کا

نہایت قیمتی وقت اپنی طاقت کو مضبوط کرنے کے لیے مل گیا۔

سٹالن نے اس معاہدے کے فوراً بعد ریڈ آرمی پولینڈ میں داخل کر دی اور اپنا وہ کھویا ہوا علاقہ واپس لے لیا جو 1918ء میں برسٹ لٹوسک معاہدہ کے تحت اس سے چھن گیا تھا۔ اس وقت اس معاہدہ کا سوویت یونین کو ایک اور نقصان ہوا تھا اور وہ فن لینڈ کا اس سے چھن جانا تھا۔ فن لینڈ سے لینن گراڈ صرف 32 میل کے فاصلے پر تھا۔ سٹالن نے فن لینڈ واپس حاصل کرنے کے لیے اپنی فوجوں کو متحرک کیا اور فن لینڈ سے مذاکرات کیے جو ناکام رہے۔ سٹالن نے بھاری تعداد میں فن لینڈ کے خلاف اپنی افواج کو بالٹک دفاعی بندوبست (BALTIC DEFENCES) میں جمع کیا تو فن لینڈ کی حکومت سٹالن کی شرائط ماننے پر تیار ہوگئی اور اس طرح سٹالن نے جنگی حکمت عملی اور جغرافیائی ضرورت کے مطابق اپنے حق میں ایک اور ہدف حاصل کر لیا۔ ہٹلر کے اپنے عزائم بھی فن لینڈ کے بارے میں تھے مگر وہ خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سٹالن اپنی کامیابیوں اور معاہدوں کی روشنی میں سمجھ رہا تھا کہ ہٹلر برطانیہ فرانس کو فتح کرنے کے بعد سوویت یونین پر حملہ کرے گا۔

یکم ستمبر 1939ء کو جب ہٹلر نے پولینڈ کے شہر وارسا کی اینٹ سے اینٹ بجا کر عالمی جنگ کی ابتدا کی تو برطانیہ اور فرانس نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ 1939ء سے لے کر 1941ء تک یعنی روس پر حملے سے قبل جرمنی یورپ اور وسطی یورپ کا مالک بن چکا تھا۔

10رمئی 1940ء کو برطانیہ میں چمبرلین کی حکومت ختم ہونے کے بعد ونسٹن چرچل برطانیہ کا وزیر اعظم بنا۔ (چرچل برطانیہ کا دوبار وزیر اعظم رہا 1940ء سے 1945ء تک اور 1951ء سے 1955ء تک) اس نے اپریل 1941ء میں سٹالن کو اپنے ایک ذاتی پیغام کے ذریعے یہ اطلاع بھجوائی کہ ہٹلر سوویت یونین پر حملہ کرنے والا ہے۔ لیکن سٹالن کو ابھی تک یقین نہیں تھا۔ اس کے اپنے اندازے کے مطابق ہٹلر نے اگر روس پر حملہ کرنا تھا تو وہ 1942ء میں تھا۔ مگر جنگ نہ کرنے کے معاہدے کے باوجود 21رجون 1941ء کو ہٹلر نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا۔

ہٹلر، میسولینی اور ہیرو ہیٹو دنیا پر قبضہ کرنا چاہتے تھے

اس سے پہلے انسانی تاریخ میں کوئی بھی جنگ اتنے بڑے پیمانے پر نہیں لڑی گئی۔ اس جنگ میں ایک طرف تین ممالک اور ان کے لیڈر تھے۔ سوویت یونین کے جوزف سٹالن، امریکہ کے فرینکلن ڈی روز ویلٹ اور برطانیہ کے ونسٹن چرچل۔ ان تینوں کو اتحادی (Allies) کہا جارہا تھا۔ دوسری طرف تین ممالک اور ان کے سربراہ تھے۔ جرمنی کے ایڈولف ہٹلر، اٹلی کے بینٹو میسولینی اور جاپان کے شہنشاہ ہیرو ہیٹو، ان تینوں کو طاقت کا محور (Axis of Power) کہا جارہا تھا۔ ان تینوں کے توسیع پسندانہ عزائم تھے اور یہ تینوں جنگیں مسلط کر کے دنیا پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔

جاپان نے چین کے صوبہ منچوریا پر قبضہ کرلیا تھا اور 1932ء میں شنگھائی پر بمباری کردی تھی اور چین پر باقاعدہ جنگ مسلط کی ہوئی تھی۔ پھر اس نے بحرالکاہل میں امریکہ اور یورپ کے مقبوضہ علاقوں پر حملہ کر کے ان کے بہت سے حصوں پر قبضہ کرلیا۔ 25/اکتوبر 1936ء میں جاپان نے جرمنی کے ساتھ ANTI-COMINTERN معاہدہ کیا تھا۔ یہ معاہدہ کمیونسٹ انٹرنیشنل کے خلاف تھا۔ 6/نومبر 1937ء کو اٹلی بھی اس معاہدے میں شامل ہوگیا اور تینوں ''طاقت کا محور'' بن گئے۔ ان کو دیگر صنعتی ترقی یافتہ ممالک سے خطرہ نہیں تھا۔ وہ کمیونسٹ انقلاب اور مزدور کسان کی ابھرتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ تھے۔ اس سے پہلے کہ دنیا سوشلسٹ انقلاب کی لپیٹ میں آجائے، وہ دنیا پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔

''طاقت کا محور'' کی اصطلاح کو جارج ڈبلیو بش نے 9/11 کے بعد عراق، ایران اور شمالی کوریا کے خلاف ''بدی کا محور'' کے طور پر استعمال کیا۔ حالانکہ وہ خود بہت بڑا بدمعاش (Evil) تھا اور ان تینوں ممالک پر فوج کشی کرنا چاہتا تھا۔ عراق پر حملہ کر کے اس نے اس کی ابتدا بھی کردی تھی۔

''طاقت کا محور'' کے کمیونسٹ مخالف معاہدے میں ان تینوں ممالک کے علاوہ بعد میں ہنگری، سپین، فن لینڈ، رومانیہ، بلغاریہ، کروایشیاء ڈنمارک، سلوواکیہ بھی شامل ہوگئے۔

اس کمیونسٹ مخالف اتحاد میں ترکی بھی ایک مبصر کے طور پر شامل ہو گیا۔ ترکی میں مصطفیٰ کمال اتاترک نے 1922ء میں جمہوریہ ترکیہ (Turkish Republic) قائم کرنے کے بعد اپنی سرحدوں کو جنگیں کر کے دوبارہ قائم کرنا شروع کیا ہوا تھا۔ شروع میں ہٹلر نے پولینڈ کو بھی یہ لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی تھی کہ وہ پولینڈ جرمنی سرحدی تنازعے کو پولینڈ کے حق میں طے کر دے گا۔ مگر پولینڈ ہٹلر کے ساتھ شامل نہیں ہوا۔ ہٹلر نے یکم ستمبر 1939ء کو پولینڈ پر حملہ کر کے ہی اپنی عالمی جنگ کی ابتدا کی تھی۔

لیگ آف نیشنز جنگ نہ روک سکی اور ختم ہو گئی

1933ء میں جب ہٹلر جرمنی کا چانسلر بنا تھا تو اس نے جرمنی کو لیگ آف نیشنز سے باہر نکال لیا تھا۔ اس کے عزائم اس وقت سے ہی جنگ کرنے کے تھے۔ چین اور جاپان بھی لیگ آف نیشنز سے باہر نکل گئے تھے۔ لیگ آف نیشنز جو پہلی عالمی جنگ کے بعد مستقبل میں ہونے والی جنگوں کو روکنے کے لیے قائم ہوئی تھی، اس جنگ کو روکنے میں ناکام ہو گئی اور اپنے اختتام کو پہنچی۔ اب کوئی قانونی یا اخلاقی ادارہ ایسا نہیں تھا جو جنگ کو روک سکتا۔

آج کل تو عالمی سامراج دنیا میں جنگ کو روکنے کے لیے قائم شدہ اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل جیسے قانونی اور اخلاقی اداروں کا سہارا لے کر دنیا پر جنگیں مسلط کرتا ہے۔ حال ہی میں سلامتی کونسل کی قرارداد نمبر 1973 کے ذریعے لیبیا پر جنگ مسلط کی گئی اور کرنل قذافی کی حکومت کا خاتمہ کیا تھا۔

ہٹلر نے جب 22 رجون 1941ء کو صبح ساڑھے تین بجے آپریشن بار بار وسا (Operation Barbarossa) کے نام سے روس پر حملہ کیا اور جرمن فوجیں روس میں داخل ہوئیں تو مغربی بورژوا سیاست دان اور فوجی ماہرین کا خیال تھا کہ صرف چھ ہفتے میں جرمنی کی فوجیں سوویت یونین پر قابض ہو جائیں گی۔ اس قیاس آرائی کی وجہ پولینڈ اور فرانس کے حالات تھے جہاں پر صرف دو ہفتے میں جرمن افواج نے اپنا قبضہ جمایا تھا اور

برطانوی فوج کو بھی براعظم یورپ سے مئی 1940ء میں بے دخل کر دیا تھا۔

ہٹلر اپنے نسلی نظریے کی روشنی میں یہ یقین رکھتا تھا اور جرمن قوم کو یہ یقین دلاتا تھا کہ صرف جرمن زبان بولنے والے اور نسلی طور پر نجیب الطرفین جرمن ہی ایک انمول قوم ہیں جنہیں دنیا کی تمام قوموں پر حکومت کرنے کا حق ہے۔ اسی طرح چرچل بھی سمجھتا تھا کہ انسانی تہذیب کی اجارہ داری صرف انگریزی بولنے والی قوموں بالخصوص امریکہ، کینیڈا اور برطانیہ کے پاس ہے اور صرف وہ ہی دنیا پر حکمرانی کا حق رکھتے ہیں۔ یہ دونوں سوشلسٹ دشمن تھے اور نسل پرست بھی۔ مگر چرچل جو مستقل سوویت یونین کے خلاف سازشوں میں لگا ہوا تھا سوویت یونین کا اتحادی بن کر سوویت یونین کو ہٹلر سے اور ہٹلر کو سوویت یونین سے لڑوانا چاہتا تھا۔

ہٹلر نے سوویت یونین کے خلاف اپنی جنگ کا آغاز اس منصوبے سے کیا تھا کہ فوج کا بڑا حصہ ماسکو پر حملہ کرے گا اور فوج کے دو چھوٹے حصے لینن گراڈ اور سٹالن گراڈ پر حملہ کریں گے۔ ماسکو کو چند ہفتوں میں فتح کر کے یہ بڑی فوج لینن گراڈ اور سٹالن گراڈ پہنچ کر ان شہروں پر قبضہ کر لے گی اور ان تین شہروں پر قبضہ ہونے کے بعد پورا ملک جرمن فوج کے سامنے ہتھیار پھینک کر اپنی شکست کو تسلیم کر لے گا۔ ہٹلر کے خیال میں روسی فوج ایک ایسی بے کار فوج تھی جس کے پاس نہ تو جدید اسلحہ تھا اور نہ ہی جنگی تربیت۔ اس کو اندازہ نہیں تھا کہ عوام نہتے بھی ہوں اور وطن کو بچانا چاہیں تو بہت بڑی طاقت ہوتے ہیں۔

ہٹلر نے 30 لاکھ فوجی، تین ہزار پانچ سو اسی ٹینک، سات ہزار ایک سو اکاسی آرٹلری توپیں، ایک ہزار آٹھ سو تیس جنگی جہاز اور سات لاکھ پچاس ہزار گھوڑے اور خچر روس کے محاذ میں جھونک دیئے۔

30ر ستمبر 1941ء کو ماسکو پر حملہ کیا گیا۔ ہٹلر کو ہر اعتبار سے برتری حاصل تھی۔ جرمن افواج شہر پر شہر فتح کرتی گئیں اور دو ہفتوں میں انہوں نے چھ لاکھ اٹھاسی ہزار روسی فوجی قیدی بنا لیے۔ 28ر نومبر 1941ء تک جرمن افواج ماسکو کے نزدیک دریائے وولگا کو عبور کر چکی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ماسکو پر چند ہی روز میں جرمنی کا قبضہ ہو جائے گا کہ 5ر دسمبر کو

جرمنی کی پیش قدمی روک دی گئی۔ روسی افواج نے جرمن افواج کو پسپا کر کے اپنے علاقے اور فوجی رہا کروانا شروع کئے۔ جنوری 1942ء تک انہوں نے اپنے تمام علاقے واپس لے لیے اور جرمن افواج سردی کے شدید موسم میں بری طرح پھنس گئیں۔ دسمبر میں درجہ حرارت منفی چالیس سے بھی نیچے چلا گیا۔ہٹلر کا خیال تھا کہ سردیاں شروع ہونے سے پہلے ہی ماسکو پر قبضہ ہو جائے گا۔ موسم کی اس شدت کے لیے ہٹلر کی فوج تیار نہیں تھی اور نہ ہی جرمن فوج اس طرح کے موسم سے مانوس تھی۔ جرمن فوجی سردی کی شدت سے ٹھٹھر کر مرنے لگے۔ٹینکوں میں ڈیزل جم گیا۔خوراک اور سامان جنگ کا پہنچنا ناممکن ہو گیا۔

سوویت یونین کے عوام نے جو جنگ لڑی اسکی مثال پورے یورپ کی تاریخ میں نہیں ملتی

ادھر لینن گراڈ پر جرمن افواج نے حملہ کر کے 8 ستمبر 1941ء سے شہر کو محاصرے میں لے رکھا تھا۔ ان کا یہ محاصرہ ستمبر 1941ء سے لے کر جنوری 1944ء تک یعنی 900 دن تک جاری رہا۔مگر لینن گراڈ کے شہریوں نے شکست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ مقابلہ کرتے رہے انہوں نے محاصرے کی سختیاں برداشت کیں۔ خوراک اور تیل اور روزمرہ کے استعمال کی اشیا ناپید ہو گئیں۔ پانی نہیں تھا۔ بجلی نہیں تھی۔ 1942ء کے صرف دو مہینوں، جنوری اور فروری میں لینن گراڈ میں دو لاکھ شہری اس محاصرے کی وجہ سے، خوراک کے نہ ہونے اور سردی کی شدت کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ مگر شہر نے ہار نہ مانی۔ حتیٰ کہ 1943ء میں روسی افواج اس محاصرے کو ایک حد تک توڑنے میں کامیاب ہوئیں جبکہ شہر کا مکمل محاصرہ 27 جنوری 1944ء کو ختم ہوا۔ اس تمام عرصے میں تقریباً 8 لاکھ افراد دم توڑ گئے۔ ان کو اجتماعی قبروں میں دفن کیا گیا۔ تقریباً پانچ لاکھ Piskariovskoye Memorial Cemetery میں دفن ہیں۔ میں نے 1996ء میں اپنے دورہ روس کے دوران اس قبرستان میں ان کی عظمت و بہادری کو سلام کرنے کے لیے حاضری دی۔

سوویت یونین کے عوام نے جو لڑائی سٹالن گراڈ میں لڑی اور جس جذبے سے لڑی، اس کی مثال یورپ کی ماضی قریب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ دشمن سے لڑنے کا یہ جذبہ مجھے پاکستان میں 1965ء کی ستمبر جنگ میں نظر آیا تھا، جب لاہور کے شہری بھارت کی جانب سے مسلط کی گئی اس جنگ کے اعلان کے ساتھ ہی ڈنڈوں، لاٹھیوں، ہاکیوں، سلاخوں غرضیکہ جو بھی ان کے ہاتھ میں آیا لے کر واہگہ بارڈر کی طرف چل پڑے تھے۔

سٹالن گراڈ کی یہ جنگ 43-1942ء کی سردیوں میں لڑی گئی۔ ستمبر 1942ء کے شروع ہی میں جرمن افواج نے سٹالن گراڈ کی طرف بھاری تعداد میں پیش قدمی کی۔ سٹالن کے نام پر یہ شہر نہ صرف اس شہر کے باسیوں کے لیے عزت وشان کی نشانی تھا بلکہ کاکیشیا (Caucasus) کے تیل کے ذخائر تک جرمن افواج کا پہنچنا روس کی مکمل تباہی کی وجہ بن سکتا تھا۔

یہ جنگ وہ ہے جو سٹالن گراڈ کے گلی محلے اور گھر گھر میں دو بدو لڑی گئی۔ لاکھوں مزدور اور کسان بندوق، پستول، ڈنڈے، لاٹھی غرضیکہ جو کچھ بھی جس کے پاس تھا لے کر گلیوں اور محلوں میں جرمن افواج کے خلاف لڑتے رہے۔ جرمن دن بھر میں جو علاقہ یا محلہ یا گلی اپنے قبضے میں کرتے، روسی عوام رات کو اسے لڑ کر واپس لے لیتے۔ ستمبر سے نومبر تک یہ جنگ روسی عوام نے اسی طرح لڑی۔ حتیٰ کہ نومبر 1942ء میں روسی افواج اس قابل ہو سکیں کہ جرمن افواج پر بھرپور حملہ کر سکیں۔

سردی کی شدت، خوراک اور اسلحہ کی ترسیل میں دشواری، جرمن فوج کی ہلاکت کا سبب تھی۔ مگر اس محاذ کے جنرل فریڈرک پاؤلس (Friedrich Paulus) کو ہٹلر کا یہ حکم تھا کہ آخری فوجی اور آخری گولی تک لڑا جائے۔ جنرل پاؤلس کو ترقی دے کر فیلڈ مارشل بھی بنایا گیا مگر سٹالن گراڈ کے بہادر عوام نے اپنی فوج کے ساتھ مل کر جرمن افواج کو شرمناک شکست سے دوچار کیا۔ صرف اس محاذ پر 91 ہزار جرمن فوجیوں کو گرفتار کیا گیا۔ بے شمار اسلحہ، ٹینک اور بارود اور اتنی بڑی تعداد میں فوجی ضائع کرنے کے بعد ہٹلر میں اب اتنی طاقت باقی نہیں تھی کہ وہ روس میں اپنی پیش قدمی کو جاری رکھ سکتا۔ جرمن افواج کے لیے

اب ایک ہی راستہ تھا اور وہ راستہ جرمنی واپس جانے کا راستہ تھا۔ ہٹلر نے اس شکست کا سوگ منانے کے لیے پورے ملک میں تعطیل کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ''جنگ کا دیوتا اب دشمن کے ساتھ مل گیا ہے۔''

یہ دوسری عالمی جنگ بھی پہلی جنگ کی طرح سامراجیوں کے آپس میں بڑھتے ہوئے تضادات کی وجہ سے ہوئی تھی۔ تمام سامراجی طاقتیں روس کے اکتوبر انقلاب سے خوفزدہ تھیں اور اس انقلاب کو ختم کرنا چاہتی تھیں۔ مگر ان طاقتوں کے آپس کے مفادات کے ٹکراؤ نے ان کو ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا اور جب جرمنی نے روس پر حملہ کیا تو یہ جنگ فاشزم کے خلاف جنگ میں تبدیل ہوگئی۔ یہ جنگ روس کے عوام نے دنیا کے عوام کے ساتھ مل کر لڑی۔ روسی عوام نے کمیونسٹ پارٹی کے تحت، سٹالن کی رہنمائی میں 27 ملین افراد کی قربانی دے کر دنیا کو نازی ازم اور فاشزم سے بچایا۔ نہ صرف اپنے نظام کی برتری کو منوایا بلکہ برلن تک نازیوں کو بھگایا اور راستے میں ہر ملک کو آزادی دلوائی۔

اس جنگ میں دنیا بھر سے پچاس ملین افراد مارے گئے۔ 12 ملین بیگار کیمپوں (Concentration Camps) میں ہلاک ہوئے۔ 95 ملین لوگ معذور ہوگئے جبکہ امریکہ کے صرف 3 لاکھ فوجی ہلاک ہوئے اور برطانیہ کے ساڑھے تین لاکھ افراد ہلاک ہوئے جن میں دو لاکھ چوبیس ہزار فوجی تھے۔

سٹالن نے جنگ جیت کر پوری دنیا کو نازی ازم اور فاشزم سے بچایا امریکہ نے فتح کا سہرا اپنے سر پر باندھنے اور سٹالن کو خوفزدہ کرنے کے لئے ایٹم بم کا استعمال کیا

پوری دنیا نے سوویت یونین کو نجات دہندہ کا درجہ دیا۔ حتیٰ کہ چرچل جیسا سوشلسٹ دشمن بھی 4 رفروری 1945ء کو سوویت افواج کے دن کے موقع پر یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ ''سرخ افواج اپنی ستائیسویں سالگرہ ایک فاتحانہ انداز میں منا رہی ہیں اور اس کے

اتحادی اس کو زبردست مبارک پیش کر رہے ہیں جس کی وجہ سے جرمن فوجی اکثریت کو شکست فاش ہوئی۔ آنے والی نسلیں سرخ فوج کے اس قرضے کو مانتی رہیں گی۔''

اس دوران یورپ کے سات ممالک پولینڈ، چیکوسلواکیہ، یوگوسلاویہ، بلغاریہ، ہنگری، رومانیہ اور البانیہ سوشلسٹ نظام معیشت کو اپنا چکے تھے۔ جرمنی کا بہت سا مشرقی حصہ اشتراکیت کے حلقے میں داخل ہو چکا تھا۔ مغرب کے عوام بھی سوویت یونین اور اس کے اشتراکی نظام سے بے حد متاثر تھے۔ دنیا میں آزادی کی تحریکیں اپنی کامیابی کے آخری مراحل میں تھیں۔ چین کی کمیونسٹ پارٹی دس کروڑ عوام کے علاقے پر مکمل کنٹرول حاصل کر چکی تھی۔ دنیا بھر میں سوشلزم اور کمیونسٹ پارٹیاں اپنی مقبولیت کے عروج پر تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اشتراکیت پورے کرۂ ارض پر پھیل جائے گی کہ امریکہ نے سوویت یونین اور سوشلزم کی اس شاندار کامیابی کو اپنے حق میں تبدیل کرنے کے لیے 16 راگست 1945ء کو صبح پونے نو بجے جاپان کے شہر ہیروشیما پر ایٹم بم گرا کر قیامت خیز تباہی مچادی۔ 62 ہزار عمارتیں زمین بوس ہو گئیں۔ تقریباً 80 ہزار افراد مر گئے اور اتنے ہی زخمی ہو گئے۔ امریکی صدر ٹرومین نے فاتحانہ انداز میں اعلان کیا کہ ''دنیا کا پہلا ایٹم بم ایک امریکی جہاز نے ہیروشیما پر گرایا ہے۔'' اس کی طاقت بیس ہزار ٹن سے زیادہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی برطانیہ کے وزیراعظم ایٹلی نے بیان جاری کر کے بتایا کہ ایٹم بم کی تیاری میں برطانیہ نے کیا کردار ادا کیا۔ اس کے تین روز بعد 9 راگست 1945ء کو امریکہ نے ناگاساکی پر ایک اور ایٹم بم گرا کر ہیروشیما جیسی تباہی مچادی۔ 10 راگست 1945ء کو جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے اور دوسری عالمی جنگ اپنے اختتام کو پہنچی۔

ایک ایسے وقت میں جبکہ 8 رمئی 1945ء کو جرمنی کے ہتھیار ڈالنے کے بعد جاپان کی ہوائی اور بحری فوج بالکل تباہ ہو چکی تھی اور اس کی بری فوج ہر محاذ پر پسپا ہو رہی تھی، یالٹا معاہدے کے مطابق جس میں طے پایا تھا کہ جرمن افواج کے ہتھیار ڈالنے کے تین ماہ بعد یعنی 8 راگست 1945ء کو روس جاپان پر حملہ کرے گا اور روس یہ حملہ کرنے والا تھا، تو پھر امریکیوں نے جاپان کے دو شہروں کے بے گناہ عوام کے خلاف اتنا مہلک ہتھیار

کیوں استعمال کیا؟ اس کا جواب برطانوی رکن پارلیمنٹ ولیم وار بے کے انکشاف سے ملتا ہے۔ ''جاپان میں ایٹم بم کی ہلاکت خیزی کا تجربہ کرنے کا فیصلہ جولائی کے آخری ہفتے میں پوٹسڈم کانفرنس کے دوران کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں سٹالن بھی موجود تھا لیکن اس کو نئے ہتھیار کے متعلق سرسری اطلاع دی گئی تھی اور اسے ایٹم بم کی نوعیت سے بالکل بے خبر رکھا گیا تھا اور اسے یہ بھی نہیں بتایا گیا تھا کہ اس کا استعمال کس وقت اور کہاں کہاں کیا جائے گا۔ یہ فیصلہ ٹرومین نے کیا تھا اور اس سلسلے میں چرچل سے مشورہ خفیہ میٹنگ میں کیا گیا تھا۔ چرچل نے اس میٹنگ میں امریکی صدر ٹرومین کو قائل کرلیا تھا کہ جرمنی کی فوجی طاقت کی مکمل تباہی کے بعد یورپ کو اشتراکی انقلاب کا فوری خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ اس کی رائے یہ تھی کہ ایٹم بم یورپ میں استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ سوویت یونین کو اس تباہ کن بم کی موجودگی سے مرعوب کرنے کے لیے اسے کسی ایسی جگہ استعمال ہونا چاہیے جہاں یورپی اور امریکی عوام کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے جاپان کا انتخاب کیا گیا۔'' ولیم وار بے نے یہ انکشاف اپنی کتاب Vietnam: the Truth کے صفحہ نمبر 25 اور 26 پر کیا ہے۔

پاکستان کے وہ سیاست دان جو چرچل کی تعریف کرتے نہیں تھکتے، یہ بھول جاتے ہیں کہ ہیروشیما اور ناگاساکی کے معصوم انسانوں کا خون چرچل کے ہاتھوں پر بھی ہے۔ وہ نہایت نسل پرست، جنگ باز اور اشتراکیت دشمن تھا۔ سنا ہے پیپلز پارٹی کے ایک عہدے دار نے تو اپنی کتاب میں ذوالفقار علی بھٹو کو چرچل کے برابر لا کھڑا کیا ہے۔ بھٹو صاحب کو میں نے قریب سے دیکھا ہے وہ کم از کم نسل پرست نہیں تھے۔

بم گرانے کے بعد 9 راگست 1945ء کو امریکی صدر ٹرومین نے اعلان کیا کہ ''اس جنگ میں ہم دنیا کی سب سے طاقتور قوم بلکہ شاید تاریخ میں سب سے طاقتور قوم کی حیثیت سے ابھرے ہیں۔'' ایٹم بم کے استعمال کے ساتھ ہی اینگلو امریکی سامراج نے سوویت یونین اور سوشلزم کے خلاف پرچار شروع کردیا۔ مشرقی یورپ میں قائم ہونے والی اشتراکی حکومتوں پر نکتہ چینی شروع کردی گئی اور ''انگریزی بولنے والی جمہوریتوں'' یعنی امریکہ، کینیڈا اور برطانیہ کی تعریف اور سوویت یونین میں سٹالن کی سربراہی میں سوشلسٹ حکومت کے ظلم و

جبر کا پروپیگنڈا چل پڑا۔ ٹراٹسکی کے حق میں ''دانشور'' پیدا کئے گئے، گروہ اور جماعتیں کھڑی کی گئیں۔ پاکستان جیسے ممالک میں ''انگریزی بولنے والی تنظیموں'' اور مذہبی جماعتوں کا کاروبار بھی چل پڑا۔ سنا ہے آج کل ٹراٹسکی کو پاکستان میں پھینکا گیا ہے اور کئی شعبدہ بازوں کا کاروبار چل نکلا ہے۔

سوشلسٹ چھا گئے

امریکہ اور اس کے حواریوں نے سوشلزم اور سوویت یونین کے خلاف لنگوٹا کس لیا

سٹالن کی قیادت میں سوویت یونین جو دنیا میں قدرومنزلت کے ساتھ اور سوشلزم ایک مضبوط نظام معیشت کے طور پر ابھرا تھا، امریکی سامراج نے اس کے خلاف ایک محاذ قائم کرلیا جس میں برطانیہ پیش پیش تھا۔ چرچل اور ٹرومین کی پریشانی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد نہ صرف سوویت یونین ایک طاقتور قوت کے طور پر ابھرا تھا بلکہ ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں اس کے اثرات پھیل گئے تھے اور بیشتر اقوام جن کی آزادی کی تحریکیں کامیابی سے ہمکنار ہونے والی تھیں، ان کی اکثریت سوشلسٹ نظام معیشت کو اپنانے جارہی تھی اور سوویت یونین کی طرح دیگر اقوام نے بھی ''انگریزی بولنے والوں'' کے ایٹم بم کا رعب قبول نہیں کیا تھا۔

مغربی یورپ میں جنگ کے بعد 46-1945ء میں جتنے انتخابات ہوئے ان میں کمیونسٹوں کو غیر معمولی کامیابیاں ہوئیں۔ اکتوبر 1945ء میں فرانس میں کمیونسٹ پارٹی نے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کئے۔ اسی مہینے ناروے کے انتخابات میں کمیونسٹ گیارہ نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے جبکہ ماضی میں انہیں ایک نشست بھی نہیں ملتی تھی۔ فروری 1946ء میں بلجیم کے انتخابات میں کمیونسٹوں نے اٹھاون نشستیں حاصل کیں جبکہ 1936ء میں انہیں اٹھائیس نشستیں ملی تھیں۔ اٹلی کی فاشسٹ افواج نے ہٹلر کے شانہ

بشانہ سوویت یونین پر یلغار کی تھی۔ جب جون میں یہاں انتخابات ہوئے تو کمیونسٹوں کو ایک سوسات نشستیں ملیں۔ علاوہ ازیں سویڈن، ڈنمارک، لگسمبرگ، آئس لینڈ، ہالینڈ میں بھی کمیونسٹوں کو خاطر خواہ کامیابیاں ہوئیں۔ 9رجون 1946ء کو نیویارک ٹائمز نے یورپ کا نقشہ شائع کیا تو سرخی لگائی ''کمیونسٹ چھا گئے۔''

یہ صورت حال سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے علمبردار اینگلو امریکی سامراج کے لیے بے حد پریشان کن تھی۔ جگہ جگہ چرچل کا استقبال ''چرچل جنگ چاہتا ہے۔ ہم امن چاہتے ہیں'' جیسے چرچل مخالف پلے کارڈ سے ہوتا تھا۔ چرچل نے سوویت یونین اور سوشلزم کے خلاف یورپی اتحاد کی تحریک چلائی ہوئی تھی اس کا کہنا تھا کہ ''اے یورپیو فوراً متحد ہو جاؤ اور اپنے دفاع کا بندوبست کرو۔ وقت بہت تھوڑا ہے۔ اگر اس وقت ہوش میں نہ آئے تو برباد ہو جاؤ گے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ سارے ملک متحد ہو کر روسی جارحیت کا مقابلہ کریں۔'' اس کا کہنا تھا کہ ''روسیوں کو الٹی میٹم دینا چاہیے کہ وہ اپنے علاقے میں واپس چلا جائے ورنہ اس کو ایٹم بم سے اڑا دیا جائے گا۔ یہ کارروائی فوراً کی جائے۔ اگر دیر ہوئی تو وہ (یعنی روس) بھی ایٹم بم بنالیں گے اور ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔'' (مزید تفصیلات دیکھنے کے لیے زاہد چوہدری اور حسن جعفر زیدی کی تحقیق ''پاکستان کیسے بنا؟'' کی پہلی جلد کا مطالعہ کریں)۔

یہ وہ سوویت یونین دشمنی تھی جس نے دنیا کو اینگلو امریکہ بلاک اور سوشلسٹ بلاک میں تقسیم کر دیا۔ مغربی عوام کو سوشلزم سے خوفزدہ کیا جانے لگا۔

لیاقت علی خان کا نظریہ ''اسلامستان''

امریکہ کے حاشیہ بردار اپنی اپنی جگہ سوشلزم کے خلاف، سوویت یونین اور سٹالن کے خلاف لنگوٹا باندھ کر اکھاڑے میں اتر آئے۔ لیاقت علی خان بھی ان میں سے ایک تھا جو پاکستان کو امریکہ کی گود میں ڈال چکا تھا۔ اس نے چوہدری خلیق الزمان کو تمام عرب ممالک کے سربراہان کے پاس یہ تصور دے کر بھیجا کہ ہم سب کو مل کر ''اسلامستان'' بنانا چاہیے جس کا مرکز پاکستان میں ہو۔ تاکہ سوشلزم کا مقابلہ کیا جا سکے ورنہ اسلام کو بہت بڑا

خطرہ درپیش ہوگا۔عرب ممالک نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ان کے خیال میں اگر یہ کام ہونا تھا تو عرب ممالک کے ذریعے اور عرب ممالک میں مرکز بنا کر ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ اپنی ناکامی کے بعد جب خلیق الزمان نے لندن میں پریس کانفرنس کی تو اس نے یہ بھانڈا پھوڑ دیا کہ اس تصور کے پیچھے برطانیہ کا ہاتھ تھا۔

چرچل اور خلیق الزماں کام تو ایک ہی کر رہے تھے۔مگر چرچل ''انگریزی بولنے والی اقوام'' اور ان کی تہذیبوں کو سوشلزم سے خوف دلا رہا تھا اور خلیق الزمان اور امریکہ کی پالتو سیاسی اور مذہبی جماعتیں اسلام کو سوشلزم سے بچا رہی تھیں۔ان میں سے ایک یعنی چرچل، بہت بڑا شاطر تھا اور خلیق الزماں نہایت احمق!!

دنیا دو دنیاؤں میں تقسیم ہوگئی

دوسری عالمی جنگ کے بعد نئے آزاد ممالک یا تو سوشلزم کے ساتھ جڑ گئے یا امریکہ کی گود میں جا بیٹھے۔ دنیا دو دنیاؤں میں تقسیم ہوگئی، سوشلسٹ بلاک اور امریکی بلاک۔ سوشلسٹ بلاک کے اپنے اندر بھی تضادات تھے اور امریکی بلاک کے اندر بھی تضادات تھے۔ مگر ایک دوسرے کے خلاف سب متحد تھے۔

مسئلہ فلسطین

اس جنگ کے بعد جہاں اور بہت کچھ ہوا اس میں فلسطین اور کشمیر خون کے بہتے ہوئے وہ دو تحائف ہیں جو برطانیہ نے دنیا کو دیئے۔ 1937ء میں چرچل نے فلسطینیوں کے بارے میں کہا کہ ''میں یہ نہیں مانتا کہ وہ کتا جو سب کے ساتھ مل کر کھانے کے ڈھیر پر ہو اس ڈھیر پر اس کا آخری حق ہے خواہ وہ اس ڈھیر پر ایک لمبے عرصے سے ہی کیوں نہ بیٹھا رہا ہو۔ میں اس حق کو تسلیم نہیں کرتا۔ مثلاً میں یہ نہیں مانتا کہ امریکہ کے ریڈ انڈیئنز کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے یا آسٹریلیا میں ابورجینز کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ میں نہیں مانتا کہ فلسطینیوں کے ساتھ ان لوگوں نے، جو ان سے زیادہ مضبوط اور بہتر نسل کی قوم ہیں اور ان سے زیادہ ذہین ہیں، یہاں پر آ کر ان کے علاقوں پر اگر قبضہ کر لیا ہے تو یہ کوئی غلط کام کیا ہے۔'' یہ اقتباس New Left Review-10 series جولائی۔ اگست 2001ء کے اداریے Scurring Towards Bathleham سے لیا گیا ہے۔

یہ رویہ تھا جو فلسطینیوں کے بارے میں اپنایا گیا تھا۔ 1969ء میں اسرائیل کی

وزیر اعظم گولڈا میئر نے کہا کہ فلسطینیوں کا کوئی وجود نہیں۔ اس کے بعد وزیر اعظم لیوی اشکول نے کہا۔ فلسطینی کہاں ہیں؟ میں جب یہاں آیا تو دو لاکھ پچاس ہزار غیر یہودی جو کہ عرب بدو تھے، یہاں آباد تھے اور یہ ایک صحرا تھا۔ وزیر اعظم مینا ہم بیگن انہیں دو ٹانگوں والے حیوان کے نام سے پکارتا تھا۔ وزیر اعظم یزہاک شمیر ان کو ایسا چھلانگیں مارتا ہوا ٹڈا سمجھتا تھا جسے آسانی سے کچلا جاسکتا ہے۔" Farsoun & Zacharia کی کتاب "فلسطین اور فلسطینی" میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔ فلسطینیوں کے بارے میں چرچل اور اسرائیلی حکمرانوں کا جو نفرت انگیز اور تضحیک انگیز رویہ تھا وہ آج تک اسی طرح سے قائم ہے۔

فلسطینیوں کے خلاف منصوبہ بندی میں عبدالعزیز ابن سعود بھی برابر کا شریک تھا۔ 14 رفروری 1945ء کو نہر سویز میں موجود جنگی جہاز QUINCY کے ڈیک پر روز ویلٹ اور ابن سعود کی ملاقات کے دوران جو معاہدہ طے پایا تھا اس میں ابن سعود نے یہ ضمانت دی تھی کہ فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری میں ابن سعود ان کی مدد کرے گا۔

1947ء میں اقوام متحدہ نے صیہونیوں کو 55% زمین دے کر فلسطین کو تقسیم کر دیا جنہوں نے بعد میں 77% زمین پر قبضہ کر لیا اور 14 رمئی 1948ء کو اسرائیلی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ اس اعلان کے ہوتے ہی امریکہ نے اس کو تسلیم کر لیا۔ دریائے اردن کے مغربی کنارے کے علاقے کو اردن کے ساتھ جوڑ دیا گیا اور غزہ کی پٹی مصر کی فوج کے زیر اثر دے دی گئی۔ فلسطین کا خاتمہ ہو گیا اور لاکھوں فلسطینی بے گھر اور بے وطن ہوئے جو آج تک خون میں نہائے ہوئے ہیں اور اپنے وطن کے حصول کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ یہی حال کشمیریوں کا ہے (ان کی تفصیلات کتاب کے پچھلے حصے میں بیان کی گئی ہیں) امریکہ نے ہر سال کئی بلین ڈالرز دے کر اسرائیل کو مضبوط کرنا شروع کیا۔ جدید ٹیکنالوجی، اسلحہ اور تربیت اس کے علاوہ تھا۔ اسرائیل نے سینکڑوں ایٹم بم بنا کر جمع کر لیے۔

کیا جنگ کے بعد امن قائم ہوا؟

دنیا کو بتایا گیا تھا کہ دوسری عالمی جنگ دنیا میں امن قائم کرنے کے لیے لڑی گئی

تھی اور ایٹم بم ایک ''امن کا ہتھیار'' تھا۔ کیا دوسری جنگ کے بعد امن قائم ہوا؟ یورپ اور امریکہ میں تو امن ضرور قائم ہوا۔ مگر امریکہ نے ایشیاء افریقہ اور لاطینی امریکہ میں کسی نہ کسی ملک پر بالواسطہ یا بلاواسطہ جنگ مسلط کئے رکھی۔ کوریا، گرانا ڈا، گوئٹے مالا، السلواڈور، نکارا گوا، کیوبا، لاؤس، کمبوڈیا، ویت نام، عراق، صومالیہ، سوڈان، لیبیا، ایران، یوگوسلاویہ اور افغانستان اور اب شام۔ اس کے علاوہ امریکہ نے دنیا میں حکومتوں کے تختے الٹوائے۔ پاکستان میں ضیاالحق اور چلی میں جنرل پینشے جیسے ڈکٹیٹر حکمران پالے اوران کے ذریعے ان معصوم انسانوں کا قتل عام کروایا جو سیاسی اور معاشی آزادی حاصل کر کے عزت نفس کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے تھے۔

مارچ 1947ء میں امریکی صدر ٹرومین نے کہا کہ جو ممالک جنگ میں تباہ ہو گئے ہیں اگر ان کو اپنے حلقہ اثر میں لاکر مالی مدد نہ کی گئی تو وہ لامحالہ روسی بلاک میں چلے جائیں گے۔ اس سلسلے میں فوری طور پر یونان اور ترکی کی فوجی اور معاشی امداد کے لیے 40 کروڑ ڈالر کا اعلان کیا گیا تا کہ وہاں پر کمیونسٹ حکومتوں کے قیام کے خطرے کو روکا جا سکے۔

یورپ تیزی سے سوشلزم کی طرف جا رہا تھا کہ اس کی معاشی بحالی کے لیے سترہ ارب ڈالر کا پروگرام تیار کیا گیا جسے مارشل پلان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ پلان امریکی وزیر خارجہ جارج مارشل نے بنایا تھا۔ اس پلان کے مطابق امداد کے مستحق وہ لوگ تھے جو ''جمہوری اداروں کے فروغ''، ''آزاد تجارت'' اور امریکی نقطہ نظر سے متفق تھے۔ یعنی سوویت یونین جس کی تباہی سب سے زیادہ ہوئی تھی وہ اس امداد کا مستحق نہیں تھا۔ بلکہ یہ امداد ان ملکوں کے لیے تھی جو سوویت یونین کے خلاف امریکی اتحاد کا حصہ بن رہے تھے۔

نیٹو

اس پلان کے فوجی پہلو بھی تھے جو اس وقت نمایاں ہوئے جب اس پلان نے ایک معاہدے North Atlantic Treaty Organization کی شکل اختیار کر لی جو NATO کے نام سے مشہور ہوا۔ امریکہ اور کینیڈا سمیت چودہ ممالک نے 1949ء میں

روس کے خلاف اس سیاسی اور دفاعی معاہدے پر دستخط کئے۔ اس کا فوجی ہیڈ کوارٹر پیرس میں قائم ہوا اور امریکی افواج کا چیف آف سٹاف آئزن ہاور اس کا پہلا سربراہ مقرر ہوا جو بعد میں امریکہ کا صدر بنا۔ اس گٹھ جوڑ میں امریکہ، برطانیہ، کینیڈا، ہالینڈ، بلجیم، لکسمبرگ، اٹلی، ڈنمارک، ناروے، آئس لینڈ، پرتگال، ترکی، یونان اور جرمنی تھے۔

سینٹو

1953ء میں سینٹو (CENTO) یعنی Central Treaty Organization کا معاہدہ ہوا جس کا مقصد بھی روسی اور اب چینی سوشلزم (کہ چین میں سوشلسٹ انقلاب آ چکا تھا) کے اثرات سے اس معاہدے میں شامل ممالک کو سوشلزم کے خلاف تیار کرنا تھا۔ ترکی، عراق، ایران، برطانیہ اور پاکستان اس معاہدے کا حصہ تھے۔ پھر پاکستان سیٹو (SEATO) یعنی South East Asia Treaty Organization میں شامل ہو گیا۔ یہ معاہدہ جنوب مشرقی ایشیاء میں سوشلزم کے پھیلاؤ کے خلاف تھا۔ بالخصوص فلپائن اور جنوبی کوریا کو چین کے اثر سے بچانے کے لیے تھا۔ اس معاہدے میں امریکہ، برطانیہ، تھائی لینڈ، فلپائن، نیوزی لینڈ، فرانس، آسٹریلیا اور پاکستان شامل ہوئے۔ اس معاہدے اور اسی طرح کے دیگر معاہدوں کا، جو تائیوان اور جاپان کے ساتھ کئے گئے، مقصد امریکہ کی سربراہی میں روس اور چین کے گرد وسیع گھیراڈالنا تھا۔ اس پالیسی کو ''کمیونزم لپیٹنے'' کی پالیسی کا نام دیا گیا۔

سامراج نے کمیونزم کا خوف پیدا کرنا شروع کیا اور پسماندہ ممالک کو قرضوں میں جکڑنا شروع کیا۔ ''کمیونزم کو لپیٹنے'' کے لیے مذہب کا کارڈ تو استعمال ہو ہی رہا تھا۔ امریکی صحافی فل برائٹ لکھتا ہے کہ ٹرومین کی طرف سے مارچ 1947ء میں کمیونزم کے خلاف جہاد کی ابتداء ترکی اور یونان کی امداد کے اعلان کو نظریاتی زبان میں پیش کرنے سے ہوئی تھی۔ ٹرومین کے اعلان ''کمیونزم اور انسانی آزادی کے درمیان جنگ'' کے نیم مذہبی نظریئے کو داخلی سیاست کی ایک چال کے طور پر اپنایا گیا۔ بعد میں اس چال نے ایک ایسا

نازک موڑ اختیار کرلیا کہ امریکہ نے روس کے ہر اقدام کو اپنی ''جمہوری اور مذہبی تہذیب'' پر ایک حملے کی حیثیت دے دی۔

پہلے کمیونزم کا خوف، اب اسلامی دہشت گردوں کا خوف

سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام کو اپنی بقا کے لئے ایک دشمن چاہیے

سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد ''کمیونزم اور انسانی آزادی کی جنگ'' کو ختم ہو جانا چاہیے تھا مگر اس کی جگہ ''تہذیبوں کے ٹکراؤ'' نے لے لی اور عالمی سامراج نے ''اسلام سے خطرہ'' کا ڈھول پیٹنا شروع کر دیا۔ تہذیبیں نہیں ٹکراتیں سامراجی مفادت ٹکراتے ہیں۔ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے سیموئیل ہنٹنگٹن کے نظریہ ''تہذیبوں کا ٹکراؤ'' کو اپناتے ہوئے پہلے نائن الیون کیا گیا، پھر اپنی ہی پیدا کردہ القاعدہ اور طالبان جیسی جہادی تنظیمیں ایک ہوگی کے طور پر کھڑی کی گئیں۔

سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام کو اپنے لوٹ کھسوٹ کے کاروبار کو زندہ اور جاری رکھنے کے لیے اپنے عوام کو خوفزدہ رکھنے کے لیے ایک دشمن چاہیے ہوتا ہے۔ پہلے کمیونزم تھا۔ سرد جنگ اور سوویت یونین کے خاتمے کے بعد، اسامہ بن لادن، القاعدہ، طالبان اور اسی قسم کی مذہبی جنونی جماعتیں اور دہشت گرد، پیدا کر کے اور اسلام جو کہ امن اور عالمی انسانیت کا مذہب ہے اس کو انسان دشمن اور بربریت پر مبنی مذہب بنا کر پیش کیا گیا۔ تہذیبوں کا ٹکراؤ شروع کیا گیا اور سامراجی سرمایہ دارانہ نظام کو محفوظ کر لیا گیا۔

پاکستان جیسے ممالک میں عوام کو یہ یقین دلوایا گیا ہے کہ امریکہ اور القاعدہ الگ الگ ہیں۔ القاعدہ کے خلاف امریکہ کا ساتھ دینا چاہیے۔ اس طرح وہ عوام جو ''امریکی سامراج مردہ باد'' کے نعرے لگاتے رہے ان کے دلوں میں امریکہ کے حق میں نرم گوشہ پیدا کیا گیا ہے۔ انڈو سوویت لابی تو اب ویسے ہی انڈو امریکن لابی بن چکی ہے۔

پاکستان میں یہ کام پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کے دورہ امریکہ

سے شروع ہو چکا تھا۔ موصوف نے مئی 1950ء میں اپنے دورہ امریکہ کے دوران امریکی انتظامیہ، تاجروں اور صحافیوں کو یقین دلایا تھا کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ جارحیت کا مقابلہ کرنے کا عزم کر چکے ہیں، اس کام میں آپ پاکستان کو اپنا دوست پائیں گے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے فوراً بعد سرد جنگ شروع ہو چکی تھی۔ اس وقت کی کمیونسٹ پارٹیاں یا کمیونسٹ ممالک اتنی طاقت نہیں رکھتے تھے کہ کسی بھی طرح کی جارحیت کر سکتے۔ یہ جارحیت کا مقابلہ نہیں تھا بلکہ کمیونسٹ بلاک کے گرد گھیرا ڈالنا تھا۔ اس کام کے لیے پاکستان میں مذہبی جماعتوں کی سرپرستی کی گئی۔ سوشلسٹوں کو جیلوں میں ڈالا گیا۔ ترقی پسندوں کی زندگی اجیرن کر دی گئی۔ روٹی، روزگار کے مواقع بند کر دیئے گئے۔ جو سرگرم رہے انہیں صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔ حسن ناصر کو لاہور قلعے میں تشدد کر کے قتل کیا گیا اور ترقی پسندوں پر پہرے بٹھا دیئے گئے۔ حتیٰ کہ نجی محفلوں میں کی جانے والی گفتگو کی بنیاد پر انہیں اٹھایا جانے لگا۔ جماعت اسلامی کے ڈنڈا بردار اور پیشہ ور افراد طالب علم کا روپ دھار کر تعلیمی اداروں کو اپنے قبضے میں لینے لگے۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور بالخصوص ان کے زیر اثر چلی گئی۔

پاکستان کی جغرافیائی اہمیت قیام پاکستان کے وقت سے ہی امریکہ اور برطانیہ پر واضح تھی۔ چین، روس اور تیل پیدا کرنے والے ممالک کے ہمسایہ میں ہونے کی وجہ سے پاکستان پر امریکہ کی نظریں کب سے لگی ہوئی تھیں، اس کا اندازہ 25رجنوری 1951ء کی امریکی صدر ٹرومین کی اس تقریر سے ہوتا ہے۔ ''پاکستان میں کراچی، راولپنڈی اور لاہور جیسے مقامات پر فضائی اڈے ایشیا یا مشرق قریب کے کسی اور دستیاب مقام کے مقابلے میں سوویت علاقے کے نزدیک تر ہیں''۔ ہنری۔ ایس ٹرومین 1951ء دی پبلک پیپرز آف پریذیڈنٹس آف یو ایس اے

لیاقت علی نے امریکہ کا مسئلہ آسان کر دیا تھا۔ اس کے دورے کے نتیجے میں دسمبر 1950ء میں امریکہ کے ساتھ فوجی اسلحہ خریدنے کے لیے ایک معاہدے پر دستخط ہوئے۔ دو ماہ بعد پاکستان کے لئے امریکہ نے 5 لاکھ ڈالر کی تکنیکی امداد منظور کی۔ 1952ء میں کئی امدادی معاہدوں پر دستخط ہوئے اور پاکستان ایک محتاج ریاست بننے لگا۔ یہ

حقیقت تو اب دنیا پر واضح ہو چکی ہے کہ تکنیکی امداد یا کسی بھی طرح کی امداد بظاہر لگتا ہے کہ اس ملک کی ضرورت پورا کرنے کے لیے دی جا رہی ہے مگر حقیقت میں یہ امداد بغیر غرض کے نہیں ہوتی۔ انہیں اپنا غلام بنانے کے لئے ہوتی ہے۔

ایوب خان کی آمریت کا زمانہ پاکستان میں امریکی اثر و نفوذ کے پھلنے پھولنے کا بہترین زمانہ ہے جس میں امریکی شہریوں کی ایک بڑی تعداد پاکستان آ کر ہماری سیاسی، معاشرتی، ثقافتی، علمی اور معاشرتی زندگی میں داخل ہو گئی۔ پاکستان کا پہلا پانچ سالہ منصوبہ (1955-60)ء ہارورڈ گروپ نے تیار کیا۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لیے امریکہ نے 66 کروڑ ڈالر کی امداد دی۔ اسی دوران ایوب خان نے امریکہ کے دورے سے واپسی پر ملک میں فوجی آمریت قائم کر دی تھی اور امریکہ کو خفیہ فوجی اڈے فراہم کئے تھے۔ اس نے پہلے سے قائم شدہ پلاننگ بورڈ کو پلاننگ کمیشن کا نام دیا اور امریکی مشیروں کے اختیارات میں بے حد اضافہ کیا۔

پاکستان کی معاشی منصوبہ بندی ان لوگوں کے قبضے میں چلی گئی جو عالمی اقتصادی اداروں کا حصہ تھے۔ ایوبی دور میں محمد شعیب وزیر خزانہ تھے جو عالمی بینک کے اعلیٰ افسر تھے اور اپنے عہدے سے مستعفی ہوئے بغیر ہی پاکستان کے وزیر خزانہ بنے رہے۔ ڈاکٹر محبوب الحق چیف اکانومسٹ تھے جو ضیا الحق کا ساتھ دینے اور پاکستان کو معاشی طور پر غلام رکھنے کے لیے عالمی بینک سے آئے تھے۔ پھر معین قریشی بھی عالمی بینک سے وارد ہوئے اور پھر شوکت عزیز سٹی بینک سے ارسال کئے گئے۔ عزیز احمد جو آئی ایم ایف کے مسلسل ملازم تھے پاکستان میں کئی عہدوں پر فائز رہے۔ پاکستانی معیشت سامراجی مفادات کی غلام بنی رہی۔

پاکستانی معیشت کو زراعت پر جامد رکھ کر صنعتی ممالک کی مصنوعات کے لیے پاکستان کو ایک منڈی کی حیثیت دی گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت پاکستان کے دیہی علاقوں میں جو امداد دی جا رہی تھی وہ ''ملیریا اریڈی کیشن'' جیسے منصوبوں کے لئے تھی۔ مچھروں کو مار کر ہمیں دنیا کے صنعتی ممالک کی صف میں کھڑا ہونے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ کسی بھی ملک کو ''زراعتی'' قرار دے دینا اور زراعتی ہی بنائے رکھنا، اس ملک کی

صنعتی ترقی کو روکنے کے لیے ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا مقصد سائنسی ذہن کی نشوونما کو روکنا ہوتا ہے۔ سرد جنگ کے اس دور میں ہمارے جیسے ممالک میں سائنسی اندازِ فکر جس میں کیوں اور کیسے جیسے سوال اٹھتے ہیں، دلیل اور منطق فکر کی بنیاد بنتی ہے، سامراج کے لیے خطرے کا باعث تھا بلکہ آج تک ہے۔ یہ خطرہ ہمارے معاشرے کے قبائلی سردار اور جاگیردار کے لیے بھی ہمیشہ سے رہا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سائنسی ایجادات اور فکر چونکہ صنعتی نظام سرمایہ داری کے لیے اہم ہوتے ہیں۔ اس لیے سامراج اپنے یہاں ان پر قدغن نہیں لگاتا۔ غریب ممالک کو گمراہ کر کے اور جاہل رکھ کر اپنے کاروبارِ سامراجیت کو جاری رکھتا ہے۔

پاکستان میں بیرونی قرضوں یا امداد کی شروع ہونے والی کہانی دراصل ڈالروں کے ذریعے سیاسی وفاداریاں خریدنے کی کہانی ہے۔ جنوبی کوریا جیسے ممالک نے سیاسی خودمختاری بیچ کر قومی اقتصادی ترقی خریدی مگر ہمارے حکمرانوں نے سیاسی اور قومی خودمختاری کو بیچ کر ذاتی اقتصادی ترقی حاصل کی اور اس کاروبار میں حاصل شدہ رقوم کو بھی ملک سے باہر رکھا۔

عالمی جنگ کے بعد پاکستان اور بھارت چونکہ انقلابی جماعتوں کی قیادت میں ہونے والی انقلابی جدوجہد کے نتیجے میں آزاد نہیں ہوئے تھے بلکہ اصلاح پسند جماعتوں کے ذریعے یہ آزادی ملی تھی۔ اس لیے پاکستان کو امریکہ کی گود میں جانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ بھارت بھی روس اور امریکہ کے زیرِ اثر چلا گیا۔

اس وقت میں جبکہ انگریز کے خلاف بغاوت اور انقلابی جدوجہد جاری تھی گاندھی جیسے لیڈروں نے آگ اور خون سے بھری آزادی کی انقلابی جدوجہد کا رخ مرن برت اور چرخے کاتنے کے ٹھنڈے راستے پر ڈالا۔ آج بھی یورپ اور امریکہ گاندھی اور اس کے فلسفے کا پروموٹر ہے۔ سبھاش چندر بوس کا ذکر آپ کو کہیں نہیں ملتا۔ ہندوستان کی تاریخ میں حالانکہ بھگت سنگھ کی مقبولیت گاندھی کے برابر نظر آتی ہے مگر گاندھی نے انگریز نوازی کرتے ہوئے کبھی بھگت سنگھ کی رہائی کی بات تک نہیں کی تھی۔

لاکھوں انسانوں نے ہندوستان کی آزادی کی خاطر لڑ کر اپنی جانیں قربان کیں۔

منوں خون بہا، ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ عظیم ناموں، کارناموں اور انقلابی جدوجہد سے بھری پڑی ہے جسے اسرار مصلحت کے اندھیروں میں دھکیل دیا گیا ہے۔ انگریز کو ہندوستان سے نکالنے میں یا نکلنے میں ایک لمبا عرصہ لگا اور وقفے وقفے سے ایک لمبی لڑائی لڑی گئی جس میں مسلح جدوجہد بھی شامل ہے اور سیاسی وقانونی جدوجہد بھی۔

پاکستان میں حصول آزادی کی تاریخ کے لئے ایک فقرہ ہے۔ ''علامہ اقبال نے ایک خواب دیکھا اور قائداعظم نے اس کی تکمیل کردی۔'' بھارت میں بھی ایک ہی فقرہ ہے۔ ''گاندھی نے مرن برت رکھا، چرخہ کاتا اور نہرو اور پٹیل کے ساتھ مل کر انگریز کو بھگا دیا۔'' ہندوستان کی آزادی کے حصول کی تاریخ کو اتنا آسان بنا کر پیش کیا گیا ہے کہ اگر آزادی نہ بھی رہے تو کوئی غم نہیں۔ ہم خواب دیکھ کر، چرخہ کات کر جب چاہیں آزادی حاصل کرلیں گے۔

کم وبیش دوسو سال کی مزاحمت اور جدوجہد آزادی کے بعد بالآخر 14؍اگست 1947ء کو ہندوستان کی آزادی عمل میں آئی۔ دو ملک قائم ہوئے مگر عوام آزاد ہو کر بھی آزاد نہ ہوسکے۔ ایک لمبی تاریک رات کے بعد سویرا ہوا مگر بے نور سویرا۔ بقول فیض ؎

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

ہندوستان میں انگریز کی آمد

جب انگریز آیا تو ہندوستان سونے کی چڑیا تھا۔ جب انگریز گیا تو نہ سونا تھا اور نہ چڑیا۔ سیاسی عدم استحکام تھا اور معاشی و معاشرتی بدحالی غلامی کی جدید چمکتی ہوئی زنجیریں تھیں جو عوام کی اکثریت کو پہنا دی گئیں۔

یہ کیسے ہوا؟ اس کا سمجھنا ہماری ضرورت ہے۔ کل جو گزر کر تاریخ میں ڈھل چکا ہے اس میں جو کچھ ہوا ہم اس کا حصہ نہیں تھے اور نہ ہی ذمہ دار۔ مگر آج، جو تاریخ بننے جا رہا ہے ہم اس تاریخ کے ذمہ دار ہوں گے، اس کا حصہ ہوں گے۔ ہندوستان کی تاریخ آزادی کی جدوجہد کا وہ اتھاہ سمندر جس میں ہم آج مچھلیوں کی طرح تیر رہے ہیں اپنے اندر سراج الدولہ، سنیاسیوں اور فقیروں کی بغاوت، حیدر علی، ٹیپو سلطان، منگل پانڈے، بیگم حضرت محل، جھانسی کی رانی، سبھاش چندر بوس، بھگت سنگھ اور لاکھوں آزادی کے متوالوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

ہندوستان میں انگریز تجارت کی غرض سے آئے۔ شہنشاہ جہانگیر کے دور (1605-1627)ء میں انہوں نے سورت میں ایک تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت حاصل کی اور آہستہ آہستہ پورے ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ انسانی تاریخ میں شاید یہ پہلی بار ہوا کہ ایک تجارتی کمپنی نے تجارت کی غرض سے آ کر ایک وسیع و عریض سلطنت پر قبضہ کر لیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی ایک تجارتی کمپنی تھی جو ملکہ الزبتھ کے شاہی فرمان پر لندن میں 1600 میں قائم ہوئی۔ سورت میں قدم جمانے سے لے کر 1857ء کی جنگ آزادی تک کمپنی نے ہندوستان کے زیادہ تر علاقہ پر کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ اس جنگ آزادی کے

نتیجے میں کمپنی کی حکومت تو ختم ہوگئی مگر تاج برطانیہ نے براہ راست ہندوستان پر اپنا راج قائم کرلیا جو اگست 1947ء تک جاری رہا۔ اس تمام عرصے میں جہاں ہندوستان محلاتی سازشوں، اقتدار کی رسہ کشی، غداریوں، انگریز کی شاطرانہ اور عیارانہ چالوں کا شکار رہا وہاں انگریز راج کے خلاف مزاحمت بھی ہوتی رہی۔ آزادی کی کئی جنگیں لڑی گئیں۔

گزرے ہوئے کل کی اس تاریخ کو سمجھ کر، اس گزرتے ہوئے آج میں غلام انسانوں کی سر اٹھا کر زندہ رہنے کی آرزو کی تکمیل کے لئے، عالمی استعمار اور اس کی پیدا کردہ دہشت گردی کے خاتمے کے لئے ایک شعوری اور اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہے۔

ایک تجارتی کوٹھی، پھر پورے ہندوستان پر قبضہ

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت

1588ء میں سپین کے آرمیڈا کو انگریز نے شکست دی تو لندن کے تاجروں نے ملکہ الزبتھ سے بحر ہند جانے کی اجازت مانگی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب انگریز قزاق امریکہ سے سپین جانے والے جہازوں کو لوٹتے تھے کیونکہ ان میں سونا اور چاندی ہوتا تھا۔ برطانیہ کی معیشت اور تاج برطانیہ کا یہ حال تھا کہ ملکہ الزبتھ ان قزاقوں سے اپنا حصہ وصول کرتی تھی۔ جب سپین کے بادشاہ نے ان لٹیروں کے خلاف ملکہ سے شکایت کی تو اس نے برطانوی قزاقوں کے سردار فرانسس ڈریک کو سر کا خطاب دے کر سپین کے بادشاہ کو جواب دیا۔ بعد میں سپین کی بحری طاقت کو شکست دے کر انگلستان نے یورپ کے سمندروں پر برتری حاصل کرلی اور لندن کے تاجروں کو بحر ہند جانے کی اجازت مل گئی۔

1601ء میں سر جیمز لنکاسٹر کی سربراہی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کی جانب اپنا پہلا سفر کیا۔ 1604ء میں سر ہنری میڈلٹن کی سربراہی میں دوسرا بحری بیڑہ کامیابی سے بحر ہند پہنچا۔ اس وقت تک پرتگیزی اور ولندیزی ایسٹ انڈیز پہنچ کر اپنے قدم جما چکے تھے اور تجارت پر چھائے ہوئے تھے۔ انہوں نے انگریزوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ انگریزوں کے لئے اس تجارتی منڈی میں داخل ہونا آسان نہیں تھا۔ بحر ہند

میں ان کی جھڑ پیں ہوتی رہیں جنہیں تجارتی جنگیں (Trade Wars) کہا جاتا ہے۔ انگریزوں نے بالآخر 1612ء میں جنگ سوالی (Battle of Swally) میں پرتگیزیوں کوشکست دینے کے بعد ہندوستان کے ساحل پر اپنا مستقل ٹھکانا بنانا چاہا۔اس وقت مغلیہ سلطنت، جس کی بنیاد ظہیر الدین بابر نے 1528ء میں پانی پت کے مقام پر ابراہیم لودھی کوشکست دینے کے بعد قائم کی تھی، مشرق میں بنگال سے لے کر مغرب میں کابل اور سندھ تک اور شمال میں کشمیر اور جنوب میں دریائے کاویری یعنی کرناٹک، تامل ناڈو، کیرالا، پانڈی چری تک 3.2 ملین مربع کلومیٹر پر پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سلطنت اکبر کے سنہری دور کے ثمرات سے مالا مال تھی۔ ایک رپورٹ کے مطابق اکبر کے دور میں ہندوستان کا GROSS DOMESTIC PRODUCT (GDP) دنیا میں سرفہرست تھا۔

اکبر کے بعد نور الدین سلیم جہانگیر اس مضبوط اور مستحکم سلطنت کا شہنشاہ بنا۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں قدم رکھنا چاہ رہی تھی اس وقت ہندوستان کا شہنشاہ جہانگیر (1605-1627)ء تھا۔ انگریز تاجروں کی اس کمپنی کو ملکہ الزبتھ نے پندرہ سال کے لئے ہندوستان سے تجارت کا اجازت نامہ دیا ہوا تھا۔ ملکہ الزبتھ کے بعد برطانیہ کے بادشاہ جیمز اول نے اس کمپنی کو مکمل اجارہ داری دے دی۔ کوئی دوسرا برطانوی تاجر ہندوستان سے تجارت نہیں کرسکتا تھا۔ کمپنی کے جہازوں نے پرتگیزیوں کوشکست دے دی تھی اور یہ ساری صورت حال جہانگیر کے پیش نظر تھی۔

جیمز اول نے 1612ء میں، سرتھامس روکو اپنا سفیر بنا کر شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں بھیجا جو تین سال تک ہندوستان میں رہا اور جہانگیر سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے جنوبی ہندوستان میں سورت کے مقام پر نہ صرف فیکٹری یعنی تجارتی کوٹھی قائم کرنے کا اجازت نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا بلکہ جہانگیر سے انگلستان کے بادشاہ کے نام شکریے کا خط حاصل کر کے ایک طرح سے سفارتی تعلقات کی بنیاد بھی ڈال دی۔ اس اجازت نامے میں اس کوٹھی کے اردگرد فصیل بنانے کی اجازت بھی شامل تھی۔ ایک دوسرے شاہی فرمان کی رو

سے جہانگیر نے کمپنی کو اپنی پوری سلطنت میں تجارت کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ چنانچہ اسی زمانے میں آگرہ، اجمیر، احمد آباد اور بھوج میں انگریزوں کی تجارتی کوٹھیاں قائم ہوگئیں۔ بعد میں کمپنی کو اپنی فوج رکھنے کا اختیار بھی حاصل ہوگیا۔

کمپنی کے قدم ہندوستان کی سرزمین میں جمتے چلے گئے اور چارلس اول اور چارلس دوئم کے دور میں کمپنی نے خوب دولت پیدا کی۔ چارلس دوئم نے ایک پرتگیزی شہزادی سے شادی کی۔ یہ شہزادی، اپنے ساتھ جہیز میں ایک جزیرہ بھی لائی۔ یہ جزیرہ شہر بمبئی تھا۔ اس دوران ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1639ء میں اپنے لئے ایک نیا شہر مدراس بھی آباد کرلیا جہاں پر اپنے دفاع کے لئے کمپنی نے 1644ء میں قلعہ سینٹ جارج تعمیر کیا پھر 1696ء میں کلکتہ میں دریائے ہگلی کے کنارے قلعہ فورٹ ولیم تعمیر کیا گیا۔

انگریز طبقاتی کاسٹ سسٹم اور نسلی تعصب کا علمبردار تھا۔ اس نے مدراس کو بلیک ٹاؤن، یوریشین ٹاؤن اور وائٹ ٹاؤن میں تقسیم کر کے سفید اور سیاہ کی نسلی تفریق کی بنیاد ڈالی۔ نسلی تفریق کے اس شہر میں بلیک اور یوریشین، وائٹ ٹاؤن کے قریب نہیں پھٹک سکتے تھے۔ یہ امتیاز اس نے بعد میں پورے ہندوستان میں روا رکھا۔ اپنی چھاؤنی، اپنے رہائشی علاقوں، اپنے تہذیب کو برتر اور افضل قرار دے کر ہندوستانیوں کو اچھوت قرار دے دیا۔

فرانسیسیوں نے بھی ہندوستان پہنچ کر پانڈی چری، چندرنگر، ماہی، کاریکل اور دوسری بندرگاہوں پر اپنی تجارتی کوٹھیاں بنالیں۔ ان کی کمپنی کا نام فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی تھا۔ انہیں بھی اپنی فوج رکھنے کی اجازت تھی۔

جہانگیر کی 1627ء میں وفات کے بعد شاہ جہاں نے عنانِ سلطنت سنبھالا۔ اس کا نام شہاب الدین محمد خرم تھا۔ اس کا دور مغل فن تعمیر کا بہترین دور گردانا جاتا ہے۔ مغلیہ سلطنت کی سرحدیں اس کے دور میں دور دور تک پھیلیں اور امارت اپنے عروج کو چھونے لگی۔ اس کے خزانے میں صرف لینڈ ریونیو سے 20.75 ملین پونڈز جمع ہوتے تھے اور اس کی اپنی پوشاک کی قیمت جو ہیرے اور جواہرات سے مزین تھی 6.5 ملین پونڈز کے برابر تھی۔

اورنگ زیب، اپنے دور کا ضیا الحق، مغلیہ سلطنت کو لے ڈوبا

1657ء میں شاہ جہاں بیمار ہوا تو اس کے بڑے بیٹے دارا شکوہ نے کاروبار سلطنت کو سنبھالا جس کے خلاف اورنگ زیب نے باقی دو بھائیوں شجاع اور مراد کو ساتھ ملا کر لشکر کشی کی، شکست دی اور سلطنت پر قبضہ کر کے اپنے باپ شاہ جہاں کو آگرہ کے قلعے میں اس جگہ پر قید کر دیا جہاں سے وہ تاج محل کو دیکھ سکتا تھا۔ اورنگ زیب نے ایک ایک کر کے اپنے بھائیوں کو قتل کر ڈالا۔

اس وقت یورپ میں دنیا بدل رہی تھی۔ انگلستان میں درمیانہ طبقہ قوت حاصل کر رہا تھا۔ اپنے بادشاہ کو قتل کر چکا تھا۔ کرامویل نے جمہوریت کا راستہ دکھا دیا تھا۔ چارلس دوئم کی بادشاہت قائم ہو کر ختم ہو چکی تھی۔ جیمز دوئم بھی فرار کی راہ اختیار کر چکا تھا۔ پارلیمنٹ میں تجارتی طبقے کا اثر بڑھ گیا تھا۔ بادشاہ کا اثر ختم ہو کر اقتدار پارلیمنٹ کے پاس آچکا تھا یعنی انگلستان میں سیاسی انقلاب آچکا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی دولت آرہی تھی۔ فرانس میں لوئی چہاردھم کا عہد حکومت جاری تھا اور لوئی آنے والے انقلاب کا بیج ڈال چکا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اورنگزیب بھائیوں کو قتل کر کے، باپ کو قید میں ڈال کر اپنی مذہبی جنونیت کے مریض ذہن کے ساتھ مغلیہ تخت پر بیٹھا تھا۔ اپنے دور کے اس ضیا الحق نے اپنے اردگرد مذہبی جنونی جمع کر لئے جو امام ابن تیمیہؒ کی طرز کا احیائے اسلام چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک صوفیوں، ولیوں کو ماننے والے مسلمان واجب القتل تھے۔ اس کے برعکس دارا شکوہ خود بھی ایک صوفی تھا اور اپنے اردگرد اولیاء کرام اور صوفیائے کرام کا اجتماع رکھتا تھا۔ وہ اکبر اور جہانگیر کی طرح ایک ایسے معاشرے میں یقین رکھتا تھا۔ جس میں بین المذاہب ہم آہنگی اور رواداری ہو۔ بابر سے لے کر شاہجہاں تک جو وسیع و عریض مغلیہ سلطنت قائم ہوئی تھی وہ سیکولر تھی۔ اس میں ہر عقیدہ، مذہب، رنگ و نسل کے لوگ آباد تھے ان پر مذہبی جنونیت کے ذریعے حکمرانی نہیں کی جا سکتی تھی۔

اورنگ زیب نے ان تمام غیر مسلموں پر، جو مسلمان ہونے کو تیار نہیں تھے، جزیہ

لگا دیا۔غیر مسلموں کو اس ٹیکس سے ہمیشہ نفرت رہی تھی۔اس نے کئی مندر ڈھا دیئے جس کے نتیجے میں وہ راجپوت جو اب تک مغلیہ سلطنت کا ستون تھے انہوں نے تلوار اٹھالی۔کشمیری پنڈتوں نے بغاوت کر دی۔سکھ جو اب تک پر امن طریقہ زندگی اپنائے ہوئے تھے ان کو بھڑکا یا گیا۔حتیٰ کہ ان کے گورو تیغ بہادر کو قتل کر ڈالا جس کو آج تک سکھوں نے معاف نہیں کیا۔ادھر جاٹ کسانوں نے بغاوت کر ڈالی۔دکن میں مسلمانوں نے بغاوت کر دی جن کے ساتھ اس کا اپنا تیسرا بیٹا اکبر بھی شامل ہوگیا۔سرحد میں صافی قبیلے کی عورتوں کی عصمت دری کی گئی تو شاعر، دانشور اور سپہ سالار خوش حال خان خٹک نے علم بغاوت بلند کر دیا۔یہ بغاوت پورے سرحد میں پھیل گئی۔پٹھان عوام کے غم و غصہ کا عالم یہ تھا کہ جب اورنگ زیب نے اس بغاوت کو دبانے کے لئے امیر خان کی قیادت میں فوج بھیجی تو انہوں نے اس تمام لشکر کا صفایا کر دیا۔اس بغاوت سے نپٹنے کے لئے اس کو خود اپنی فوجوں سمیت اٹک میں بیٹھنا پڑا۔مرہٹوں کے ساتھ اس کی اتنی جنگیں ہوئیں کہ وہ اس کے لئے ایک دہشت بن گئے۔ان کے ساتھ 27 سالہ جنگوں میں ایک چوتھائی مغل فوج ماری گئی۔

مرہٹوں میں ایک بہادر سپہ سالار پیدا ہو چکا تھا جس کا نام شیواجی تھا۔اس نے مرہٹوں کے جذبۂ قوم پرستی کو اجاگر کیا، انہیں متحد کیا اور ایک مضبوط لڑنے والی قوم بنا دیا۔ اتنا مضبوط کہ شیواجی کے 1680ء میں انتقال کے بعد بھی مرہٹوں کی طاقت بڑھتی رہی یہاں تک کہ وہ پورے ہندوستان پر چھا گئے۔1759ء میں انہوں نے دلی پر قبضہ کرلیا۔ ایک وقت میں ایسا لگتا تھا کہ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے بعد مرہٹہ سلطنت قائم ہو جائے گی۔اگر 1761ء میں احمد شاہ ابدلی پانی پت کی جنگوں میں انہیں شکست نہ دیتا تو ان کی سلطنت کا قیام یقینی تھا۔اس کے باوجود وہ پھر سے ابھرے اور انہوں نے بہت سی آزاد ریاستیں قائم کرلیں۔ان سب ریاستوں کا سردار پیشوا کہلاتا تھا۔

اورنگ زیب جب 1707ء میں مرا تو بھائیوں کے ساتھ، سلطنت میں دیگر قوموں کے ساتھ، مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ، مرہٹوں کے ساتھ جنگیں کر کے اس نے خزانہ خالی کر دیا تھا۔آخری دنوں میں اپنی جنگوں کو جاری رکھنے کے لئے کبھی وہ

ٹوپیاں سی کر اور کبھی قرآنی آیات کی کتابت کر کے انہیں دربار میں نیلام کرواتا، رقم جمع کرتا اور جنگیں کرتا۔ اپنے سکول کے زمانے میں ہمیں پڑھایا گیا تھا کہ اورنگ زیب ٹوپیاں سی کر اپنا گزارہ کرتا تھا۔ جب تاریخ کا مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ تاریخ کے نام پر بہت بڑا جھوٹ تھا جو ہمیں پڑھایا گیا تھا اور شاید آج تک پڑھایا جارہا ہے۔ اورنگ زیب نے نہ صرف مغلیہ سلطنت کا خاتمہ کیا بلکہ ہندوستان میں بسنے والی مختلف اقوام اور مذاہب کے درمیان جو رواداری اور ہم آہنگی اکبر سے لے کر باقی تمام مغل شہنشاہ اپنے تدبر اور فراست سے پیدا کر چکے تھے اس کو تباہ کر دیا۔ مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ تمام مغل سلطنت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگئی۔ اورنگ زیب کا اڑتالیس سالہ دور ہندوستان کی تاریخ میں جنگ و جدال کا بدترین دور ہے۔ انگریزوں نے اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں جب فرانسیسیوں اور انگریزوں کے ایک دوسرے کے ساتھ سیاسی و معاشی مفادات ٹکرائے تو دوسری جگہوں کے علاوہ ہندوستان میں بھی انگریز اور فرانسیسی آپس میں لڑنے لگے۔ چھوٹی بڑی ریاستیں قائم ہو چکی تھیں۔ نوابوں، راجاؤں، مہاراجاؤں کے درمیان ہونے والی لڑائیوں میں انگریز ایک کا ساتھ دیتے تو فرانسیسی دوسرے کا۔ چونکہ ان کمپنیوں کو اپنی فوجیں رکھنے کی اجازت تھی اس لئے یہ اپنی فوجوں کے ساتھ ان لڑائیوں میں شامل ہوتے۔ مثلاً 1750 میں جب ناصر جنگ اور مظفر جنگ کے درمیان جنگ ہوئی تو ناصر جنگ کی فوج میں دس ہزار مرہٹوں کے علاوہ چھ سو انگریز بھی تھے، جبکہ مظفر جنگ کی فوج میں تقریباً دو ہزار فرانسیسی فوجی اور افسر شامل تھے۔

کرناٹک کی تین لڑائیوں میں بالآخر انگریز غالب آ گیا اور فرانسیسیوں کا زور ختم ہو گیا۔ انگریز نے ان لڑائیوں کے بعد سیاسی اور فوجی اعتبار سے ہندوستان میں مضبوطی سے قدم جما لئے۔ وہ اب ہندوستان کے حکمران بنانے اور ہٹانے لگا اور اس کے بدلے ریاستی خزانوں پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ کرناٹک کی لڑائیوں میں رابرٹ کلائیو جو ایک کلرک (بک کیپر) تھا ابھرا اور لیفٹننٹ کرنل کے عہدے تک پہنچ گیا۔ اس کو 1756 میں قلعہ سینٹ ڈیوڈ کا گورنر اور سپہ سالار مقرر کر دیا گیا۔ فوجی اہمیت کا یہ قلعہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1690 میں مرہٹوں سے

خریدا تھا۔ نہ صرف قلعہ بلکہ اس کے اردگرد کے گاؤں بھی کمپنی نے اس طرح خریدے تھے کہ قلعہ سے اس کے چاروں طرف توپ کے گولے پھینکے گئے اور جہاں جہاں تک یہ گولے پہنچے وہ تمام علاقے اور گاؤں کمپنی کی ملکیت بن گئے۔ ان دنوں مرہٹوں کو بھی اورنگ زیب کے خلاف جنگوں کے لئے رقم درکار تھی۔ ایک زمانے میں جنوبی ہندوستان کا کمپنی ہیڈ کوارٹر یہ قلعہ تھا جسے فرانسیسیوں نے بھی فتح کیا۔ یہ پھر انگریزوں کے پاس آ گیا۔ فرانسیسیوں نے اس پر پھر قبضہ کیا مگر 1785 میں یہ انگریزوں کے قبضے میں آیا اور پھر ان کے پاس ہی رہا۔

کمپنی کے خلاف سراج الدولہ کی جنگیں

اب رابرٹ کلائیو نے بنگال پر قبضہ کرنا چاہا۔ بنگال کا نواب سراج الدولہ تھا جسے علی وردی نے مرتے وقت کہا تھا۔ ''فرنگیوں نے شہنشاہ کے ملک اور رعایا کی دولت کے آپس میں حصے بخرے کر دیئے ہیں۔ ان کی طاقت زبردست ہے۔ ان کو قلعے اور فوجیں نہ حاصل کرنے دینا ورنہ ملک ان کا ہو جائے گا۔''

سراج الدولہ نے جب کلکتہ فتح کیا تو انگریز کے عہد نامے پر اعتبار کرتے ہوئے ان کو معاف کر دیا۔ پھر انگریز نے ہگلی میں قتل و غارت گری مچائی تو سراج الدولہ نے لکھا ''تم نے میری رعایا کو تاراج کیا ہے۔ تم اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہو۔ اگر تم اب بھی محض تاجروں کی طرح رہنے پر اکتفا کرو تو میں تمہاری ساری مراعات واپس کر دوں گا کیونکہ جنگ تباہ کن ہے۔ تم مجھ سے امن کے معاہدے کرتے ہو اور پھر حملہ کر دیتے ہو۔ مرہٹے جن کو مقدس انجیل کا واسطہ نہیں، اپنے معاہدوں پر قائم ہیں اور تم خدا اور عیسیٰؑ کی قسمیں کھاتے ہو اور اپنے وعدوں کو توڑتے ہو۔'' کمپنی کی حکومت، باری علیگ۔

نواب سراج الدولہ انگریزوں سے برسرِ پیکار تھا اور انہیں لڑ کر ہندوستان سے بھگانا چاہتا تھا جبکہ دلی میں آٹھ بیویوں کا خاوند شہنشاہ عالمگیر ثانی چندا بائی کا رقص دیکھنے اور استاد تان رس خان سے خیال چندرکونس بلمپت سننے میں مصروف تھا۔ سراج الدولہ کی جنگوں نے کمپنی کے قدم ہندوستان سے اکھاڑ دیئے تھے کہ کلائیو نے جنگ پلاسی میں میر جعفر جیسے

غداروں کو ساتھ ملا کر نواب کو شکست دی، گرفتار کیا اور میر جعفر کے بیٹے میرن نے آزادی کے اس عظیم سپہ سالار کو قتل کر ڈالا۔ ہندوستان کی آزادی کی یہ کرن غداری کے اندھیرے میں ڈوب گئی۔ بنگال، اڑیسہ، بہار، انگریز کے قبضے میں چلے گئے۔

اپنے زمانہ طالب علمی کے دوران جب میں ڈیمونٹ مورنسی کالج سرگودہا کی ڈرامیٹک سوسائٹی کا سیکرٹری تھا تو سوسائٹی کے صدر پروفیسر محمد طفیل ناز اور پرنسپل عبدالعلی خان کی سرپرستی میں غالباً 1961ء میں ہم نے ''نواب سراج الدولہ، آخری کرن'' کے نام سے سالانہ ڈرامہ سٹیج کیا تھا جس میں مرکزی کردار میں نے خود ادا کیا تھا۔ انگریزوں کے پروردہ جاگیرداروں کے شہر سرگودھا کے عوام میں یہ ڈرامہ اس قدر مقبول ہوا کہ سات دن کی بجائے اسے پندرہ روز تک جاری رکھنا پڑا۔ تین گھنٹے کے اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو جاتا مگر ناظرین اپنی کرسیوں پر بیٹھے رہتے۔ ہال کے سناٹے میں سسکیوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ عوام برطانوی سامراج کے خلاف تھے اور قوم پرست تھے۔

1757ء میں جنگ پلاسی کے بعد نواب سراج الدولہ کی جگہ میر جعفر کو نواب بنایا گیا تو برطانوی افسروں نے 1238575 پونڈ کی رقم نواب میر جعفر کو تخت پر بٹھانے کے عوض وصول کی۔ کمپنی نے اب یہ کھیل کھل کر کھیلنا شروع کر دیا۔ اپنی فوجی طاقت اور نوابوں کی آپس کی رسہ کشی کی بنیاد پر کمپنی ایک نواب کو ہٹا کر دوسرے نواب کو مسند نشین کرتی اور اس کے عوض بھاری رقوم وصول کرتی۔

پلاسی کی جنگ کے بعد بنگال میں ٹیکس جمع کرنے کا اختیار بھی کمپنی کو حاصل ہو گیا۔ جس کے خلاف سنیاسیوں اور فقیروں نے بغاوت کی۔ انگریز کے خلاف اس بغاوت میں ہندو سنیاسی اور مسلمان صوفی درویش دونوں شامل تھے۔ 1771 میں 150 صوفیوں اور سنیاسیوں کو جب انگریزوں نے قتل کیا تو اس تحریک میں مزید شدت آئی جو 1802ء تک جاری رہی۔

کمپنی نوابوں کو تخت پر بٹھانے اور اتارنے کا کام کرتی رہی۔ ایک نواب کے خزانے پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد اسے مسند سے اس وقت علیحدہ کر دیا جاتا جب اس کے

پاس کمپنی کو دینے کے لئے مزید رقم نہ ہوتی۔ نیا نواب اس کو از سرنو زر و دولت مہیا کرتا۔ ریاست کمپنی کی مقروض ہوتی چلی جاتی۔غنڈہ گردی کی اس رقم میں سے کمپنی کے افسر بھی اپنا حصہ وصول کرتے۔ کلائیو نے جسے بعد میں لارڈ بنا دیا گیا، میر جعفر سے وصول شدہ رقم میں سے اپنے لئے 31500 پونڈ وصول کئے اور بنگال میں ایک جاگیر بھی وصول کی۔ میر جعفر کے بعد میر قاسم کو 1760ء میں بنگال کی مسند پر بٹھایا گیا تو کمپنی کے افسروں نے نذرانے کے طور پر 500269 پونڈ وصول کئے۔ 1765ء میں نجم الدولہ کو میر قاسم کی جگہ نواب بنایا گیا تو اس نے کمپنی کو شکرانے کے طور پر جو رقم پیش کی وہ 230356 پونڈ تھی۔ ان نو سالوں میں جو دیگر رقوم وصول کی گئیں وہ 32770833 پونڈ تھیں۔ جب لارڈ کلائیو کے خلاف انکوائری ہوئی تو 1772ء میں برطانوی دارالعوام کی کمیٹی کے سامنے ان رقوم کا وصول کیا جانا تسلیم کیا جا چکا تھا۔ یہ تو صرف ایک ریاست اور نو سال کے عرصے کی بات ہے۔ پورے ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے آنے سے لیکر 1947ء تک کیا کچھ ہوا ہوگا اس کا اندازہ بیان کی گئی بنگال کی اس مثال سے لگایا جا سکتا ہے۔

لارڈ کلائیو نے برطانیہ کے تاجروں کی جماعت ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان کی سیاست میں اس قدر اہم بنا دیا کہ ہندوستان میں انگریز راج کی بنیاد پڑ گئی۔ لارڈ کلائیو کا اپنا کردار لالچ، فریب اور مکاری سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے ذاتی مال جمع کرنے اور بھتہ وصول کرنے کا جو راستہ اختیار کیا تھا اس پر کمپنی کے دیگر افسر اور سپاہی بھی چل پڑے۔ آج کل کے کراچی میں بھتہ خوروں کی طرح لوٹ مار کا ایک ایسا بازار گرم ہوا کہ بنگال، بہار اور اڑیسہ کے عوام بری طرح مصیبتوں اور ان کے مظالم میں پھنس گئے۔ کلائیو جب انگلستان واپس پہنچا تو وہ ٹوری جماعت کا ممبر پارلیمنٹ تھا۔ پارلیمنٹ میں اس کی ذاتی دولت کے بارے میں 1772ء میں بحث ہوئی۔ وہ بیمار ہو چکا تھا۔ اس بحث کے بعد اتنا دل برداشتہ ہوا کہ اس نے 22 نومبر 1774ء کو خودکشی کر لی۔ کلائیو کے بعد وارن ہیسٹنگز بنگال کا پہلا گورنر جنرل (1773-1785)ء ہوا۔ اسے بھی بدعنوانیوں کے الزام میں برطرف کیا گیا۔ اس پر برطانیہ واپسی پر سات سال تک مقدمہ چلا مگر بالآخر وہ بری ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

ہندوستان کی دولت کے زور پر صنعتی انقلاب

ہندوستان کی دولت جو انگلستان میں آ رہی تھی اس نے یہاں کے صنعتی انقلاب میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ انگریز نے آج کے عربوں کی طرح دولت کو محض عیاشی میں صرف نہیں کیا بلکہ ہر روز نت نئی ایجادات ہوئیں اور صنعتی انقلاب نے دنیا کو ترقی کے اگلے مرحلے میں داخل کیا۔ برطانیہ کے عوام کو بھی اس لوٹ مار کا فائدہ پہنچا۔ سر ولیم ڈگبی کے الفاظ میں ''انگلستان کو صنعتی اقتدار صرف اس وجہ سے نصیب ہوا کہ بنگال اور کرناٹک کے خزانے استعمال کرنے کا اسے موقع مل گیا۔ ورنہ اس سے پہلے ہماری صنعت زوال پذیر تھی۔ لنکاشائر میں کاتنے اور بننے کا کام صفر کے برابر تھا...... ہندوستان کی دولت کا انگلستان میں آنا اور اس کا ایک صنعتی ملک بن جانا کوئی اتفاقی امر نہیں بلکہ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔''
(کمپنی کی حکومت، باری علیگ)

کرناٹک اور بنگال کی لوٹ نے انگلستان کے صنعتی انقلاب کو برپا کرنے میں مدد کی۔ پلاسی کی جنگ 1757ء میں لڑی گئی اور اس کے بعد انگلستان میں ایجادات کا سلسلہ نہایت تیزی سے شروع ہو گیا۔ 1760ء میں فلائنگ شٹل ایجاد ہوئی۔ دھات کو پگھلانے کے لئے لکڑی کی جگہ کوئلے نے لے لی۔ 1764ء میں ہارگریوز نے کاتنے والی کل ''جینی'' کو ایجاد کیا۔ 1768ء میں واٹ نے دخانی انجن کو مکمل کیا۔ 1776ء میں ایک اور کاتنے والی کل ''میول'' کو ایجاد کیا گیا۔ 1785ء میں کارٹ رایٹ نے مکینیکل طاقت سے چلنے والے کرگھے کا حق محفوظ کروایا۔ ہندوستان کی دولت انگلستان آتی گئی اور مشینوں پر مشینیں ایجاد ہوتی چلی گئیں۔ یہ مشینیں زمانے کی تیز رفتاری کا مظہر تھیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے انگلستان میں اس قدر دولت آ رہی تھی کہ تاج برطانیہ اور پارلیمنٹ ہندوستان کے معاملات میں اب براہ راست دلچسپی لینے لگے۔ ان کی نظریں مال و دولت پر بھی تھیں اور زوال پذیر مغلیہ سلطنت پر بھی۔ چنانچہ 1773ء میں ریگولیٹنگ ایکٹ منظور کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی کو برطانوی پارلیمنٹ کے ماتحت کر دیا گیا۔

نئے ایکٹ کے مطابق مدراس اور بمبئی کی حکومتیں گورنر جنرل کی مرضی کے بغیر دیسی ریاستوں کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتی تھیں۔

کمپنی کے خلاف حیدر علی کی جنگیں

اس دوران ہندوستان میں ایک اور بہادر وطن پرست، انگریز دشمن سپہ سالار نے جنم لیا۔ یہ میسور کی فوج کا سپہ سالار حیدر علی تھا۔ اس نے بہت سے شہروں کو انگریز سے لڑ کر واپس لینا شروع کیا۔ اس نے کرناٹک کو فتح کیا اور مدراس پر حملہ کیا۔ انگریز گورنر مدراس کو حیدر علی کی شرائط پر سمجھوتہ کرنا پڑا۔ یہ میسور کی پہلی لڑائی تھی۔ حیدر علی کی بہادری، جوانمردی اور فتوحات سے انگریز پریشان بھی تھا اور خوفزدہ بھی۔ 1761ء میں حیدر علی میسور کا سلطان بنا۔ وہ نہ صرف جنوبی ہندوستان کا ہر دلعزیز رہنما تھا بلکہ پورے ہندوستان میں اس کے کارناموں کی گونج تھی۔ اس نے 1779ء میں نظام دکن اور تمام مرہٹوں (گائیکواڑ کے علاوہ) کو ساتھ ملا کر انگریز کو ہندوستان سے نکالنے کا متحدہ محاذ بنایا۔ انگریزوں کو جگہ جگہ شکست ہونے لگی۔ مرہٹوں کے پیشوا نانا فرنویس نے کوشش کی کہ شہنشاہ دہلی کو بھی اس اتحاد میں شامل کر سکے۔ انگریز نے مرہٹوں سے صلح کر لی اور مرہٹوں کو وہ تمام رقبہ واپس کر دیا جس پر کمپنی نے قبضہ کیا تھا۔ گورنر جنرل وارن ھیسٹنگز نے نہایت عیاری کے ساتھ مرہٹوں اور نظام دکن کو حیدر علی سے علیحدہ کروا دیا۔ لیکن حیدر علی نے انگریز کے خلاف اپنی لڑائی کو جاری رکھا۔ اس نے انگریزوں کے خلاف فرانسیسیوں سے مدد حاصل کی۔ اس وقت انگریز اور فرانسیسی یورپ میں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ یہ میسور کی دوسری لڑائی تھی جو 1780ء سے 1784ء تک جاری رہی۔ 1782ء میں حیدر علی کینسر کی وجہ سے انتقال کر گیا اور ٹیپو سلطان جو حیدر علی کا بڑا بیٹا تھا اس نے عنانِ سلطنت سنبھال کر اس جنگ کو جاری رکھا۔ جب حیدر علی کا انتقال ہوا تو اس کی حکومت شمال میں دریائے کرشنا، مشرق میں مشرقی گھاٹ اور مغرب میں بحر ہند تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ نہایت رحم دل، غیر متعصب اور بہادر جرنیل تھا۔ وہ واحد ہندوستانی حکمران تھا جس نے ہندوستان

میں بحری طاقت قائم کی۔

اس کے بارے میں ایک مؤرخ لکھتا ہے ''انگریزوں کو اپنی سلطنت قائم کرنے کے لئے ہندوؤں، مرہٹوں، جاٹوں، گورکھوں اور سکھوں سے کئی جنگیں لڑنا پڑیں لیکن انہیں سب سے طاقتور دشمن حیدرعلی ملا جسے انگریز شکست نہ دے سکے۔'' 1767ء کی پہلی جنگ میسور سے 1782ء کی دوسری جنگ میسور تک اس نے اپنی بہادری کا خوف انگریزوں پر طاری کر دیا تھا۔ مدراس پر اس کا مشہور دھاوا ایک ایسا تاریخی اور جنگی کارنامہ ہے جس کو انگریز کبھی بھی نہیں بھلا سکا۔ حیدرعلی کی موت میسور اور مہاراشٹر کے لئے بہت بڑا نقصان ثابت ہوئی۔ اس کی موت کی خبر سن کر اس کے باقی اتحادی مرہٹوں نے ہتھیار ڈال کر انگریز سے اس کی پیش کردہ شرائط پر سالبئی کے مقام پر صلح کر لی۔ 1783ء میں معاہدہ وارسائی کی رو سے انگریزوں اور فرانسیسیوں میں صلح ہوگئی اور فرانسیسیوں نے حیدرعلی کے بیٹے ٹیپو سلطان کی مدد سے ہاتھ اٹھا لیا جو کہ انگریز کے ساتھ جنگ کو جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس کے باوجود سلطان نے انگریز کو اس بری طرح شکست دی کہ کمپنی نے ٹیپو سلطان کے سامنے صلح کی شرطیں پیش کر دیں جنہیں سلطان نے مان لیا۔ اس طرح ''معاہدہ منگلور'' نے 1784ء میں میسور کی دوسری لڑائی کو ختم کر دیا۔

ٹیپو سلطان، ہندوستان کا سنہرا اور انگریز کا ڈراؤنا خواب

ٹیپو سلطان کو میسور کے ٹائیگر کے نام سے جانا جاتا ہے جس نے اعلان کیا تھا کہ گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔ وہ ایک سکالر تھا، بہادر سپہ سالار تھا، شاعر تھا جس کو عربی، فارسی کناڈا، سنسکرت، اردو، فرانسیسی اور انگریزی پر مکمل عبور حاصل تھا۔ اس کی توپیں اپنے دور کی جدید ترین توپیں تھیں۔ اس نے جنگی راکٹ ایجاد کیا جس کو بعد میں جدید شکل دی گئی۔ بھارت کے سائنس دان اور صدر ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام نے نومبر 1991ء میں بنگلور میں منعقدہ ٹیپو سلطان شہید میموریل لیکچرز میں یہ ثابت کیا کہ دنیا کا پہلا جنگی راکٹ ٹیپو سلطان نے ایجاد کیا تھا۔ انگریز نے ان میں سے دو کو جو

اس نے سرنگاپٹم کی جنگ میں پکڑے تھے لندن لاکر رائل آرٹلری میوزیم میں رکھا ہوا ہے۔ ہندوستان میں ہر سال اس عظیم حکمران کا دن منایا جاتا ہے۔

ٹیپو سلطان ایک سیکولر حکمران تھا جس نے مسجدیں بھی بنوائیں، چرچ بھی اور مندر بھی۔ اُس نے قمر شمسی (Lunisolar) کیلنڈر بھی جاری کیا اور میسوری ریشم کی صنعت کو فروغ دیا۔ مگر آج کا پیشہ ور مُلاّ ٹیپو سلطان کا ذکر نہیں کرتا۔ عالمی سامراج کی پروردہ اس ''مخلوق'' کو محمد بن قاسم اور اورنگ زیب کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔

سلطان نے فرانسیسیوں کی مدد سے اوزان اور پیمائش کے پیمانے بھی تیار کروائے۔ کرشنا راجہ ساگر ڈیم کی بنیاد رکھی۔ سڑکیں، عمارات، بندرگاہیں تعمیر کیں۔ اس کے دور میں سری لنکا، اومان، درانیوں کا افغانستان، ایران، سلطنت عثمانیہ اور فرانس کے ساتھ سفارتی اور تجارتی تعلقات مضبوط ہوئے اور میسور کی سلطنت پھیل گئی۔ حیدر علی کی افواج اور ٹیپو سلطان کی تربیت خود حیدر علی نے اور فرانسیسی فوجی ماہرین نے کی تھی۔ ٹیپو سلطان نے پندرہ سال کی عمر میں میسور کی پہلی جنگ میں اپنے باپ کے ساتھ حصہ لیا۔ سولہ سال کی عمر میں اس نے کرناٹک پر حملے کے دوران کیولری کی کمانڈ کی۔ میسور کی دوسری جنگ میں اس نے کرنل بیلی کو شکست دے کر سینکڑوں انگریز افسروں اور ہزاروں سپاہیوں کو قید کیا۔ پھر کرنل بریتھ ویٹ (Braithwaite) کو انا گودی کے مقام پر بری طرح سے ہرایا۔ 1782ء تک وہ انگریز کو شکست پر شکست دے کر چیتوڑ پر قبضہ کر چکا تھا جب 6 دسمبر 1782ء کو اس کے باپ حیدر علی کا انتقال ہوا۔ یہ یکم محرم کا دن تھا۔ ٹیپو سلطان کو 20 محرم کو نہایت سادہ تقریب میں میسور کا سلطان بنایا گیا۔ 1784ء میں جب میسور کی دوسری جنگ ہوئی تو انگریز کو بری طرح شکست ہو چکی تھی۔ اس جنگ میں مرہٹے اور نظام دکن ٹیپو سلطان کے ساتھ تھے۔

ہندوستان میں یہ پہلی فتح ہے جس میں کسی ہندوستانی حکمران کی شرائط پر انگریز نے ہتھیار ڈالے ہوں۔ اس ''معاہدہ منگلور'' کے بعد انگریز نے ٹیپو کو تنہا کرنے کے لئے مرہٹوں اور نظام دکن پر کام کرنا شروع کر دیا کیونکہ میسور کی پہلی اور دوسری جنگوں کے نتیجے میں انگریزوں کی اس دھاک سے ہوا نکل گئی تھی کہ انگریز ناقابل تسخیر ہے۔ ان فتوحات

کے نتیجے میں ہندوستانی عوام کے حوصلے بلند ہوئے اور ٹیپو سلطان ان کا ہیرو بن گیا۔

برطانوی حکومت امریکہ کی جنگ آزادی کو دبانے میں بھی ناکام ہوچکی تھی چنانچہ اس نے اپنی تمام تر توجہ ہندوستان پر مرکوز کردی۔ کارنوالس جو امریکہ سے ناکام لوٹا تھا اس کو ستمبر 1786ء میں ہندوستان کا گورنر جنرل بنا کر بھیجا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی مشکلات کا شکار تھی، اس کی فوجی اور معاشی حالت کمزور تھی۔ ٹیپو سلطان اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ کارنوالس نے چارج سنبھالتے ہی مرہٹوں اور نظام دکن پر کام کرنا شروع کیا اور انہیں ٹیپو کے خلاف یہ لالچ دے کر اپنے ساتھ ملایا کہ آئندہ مفتوحہ علاقوں میں انہیں برابری کا حصہ ملے گا۔ ٹیپو کو ختم کرنے کے لئے انگریز، نظام اور مرہٹے سب اکٹھے ہو گئے۔ حکومت برطانیہ نے بھی کمپنی کو لاکھوں پونڈ کا قرض دیا۔

میسور کی تیسری جنگ ہوئی۔ ٹیپو کو اس جنگ میں بھاری نقصان پہنچا۔ بنگلور اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور انگریز اس کے دو بیٹوں کو یرغمال بنا کر لے گئے۔ انہوں نے اس اغوا برائے تاوان کی قیمت تین کروڑ تیس لاکھ روپے رکھی جو کہ ٹیپو نے دو قسطوں میں ادا کر کے اپنے بیٹوں کو انگریز سے آزاد کروایا۔

نظامِ دکن اور مرہٹے انگریز کے ساتھ مل چکے تھے۔ ٹیپو سلطان نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف دیگر ممالک سے مدد حاصل کرنا چاہی۔ اس نے سلطنت عثمانیہ کے خلیفہ عبدالحمید اول سے مدد مانگی جس نے ٹیپو کے سفیر کو تحفے تحائف دے کر رخصت کیا اور کوئی مدد نہ کی۔ اس وقت خلافت کو انگریز کی مدد درکار تھی۔ یہ وہی خلافت ہے جسے پہلی عالمی جنگ میں جب انگریز اس کو ختم کر رہا تھا تو ہندوستان کے مسلمان رہنما اس کو بچانے کے چکر میں تھے۔

افغانستان کا بادشاہ زمان شاہ درانی ٹیپو کی مدد کے لئے اپنا لشکر لے کر چل پڑا۔ 1797ء میں اس نے لاہور پہنچ کر اعلان کیا کہ وہ انگریزوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن لڑائی لڑنا چاہتا ہے چنانچہ سکھ سرداروں نے بھی اس کے ساتھ اتحاد کرلیا۔ وہ ابھی دلی کا رخ کر رہا تھا کہ اس کے بھائی محمود نے جو ایران میں پناہ گزین تھا ایران کی مدد سے ہرات پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ لارڈ ولزلے کے اشاروں پر ہوا تھا۔ شاہ زمان کو اپنی فوجیں لے کر واپس جانا

پڑا۔انگریز کی شاطرانہ چالیں نہ اس وقت مسلمان حکمرانوں کو سمجھ میں آئیں اور نہ ہی آج آتی ہیں۔آپس میں ''لڑواؤ اور حکمرانی کرو'' کے اصول پر انگریز آج بھی عمل پیرا ہے۔

فرانس کی مدد ٹیپو کو حاصل تھی۔ایراج امینی (IRADJ AMINI) کی کتاب NAPOLEON and PERSIA صفحہ 12 کے مطابق نپولین نے فرانسیسیوں کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ مصر کو فتح کرنے کے فوراً بعد وہ ٹیپو کے ساتھ مل کر انگریزوں کا صفایا کر دے گا۔ چارلس ٹیلی رینڈ (Charles Talleyrand) کی 13رفروری 1798ء کی رپورٹ کے مطابق ''مصر پر قبضہ کرنے کے فوراً بعد ہم 15 ہزار سپاہی نہر سویز کے ذریعے ٹیپو سلطان کی مدد کے لئے ہندوستان بھیجیں گے تاکہ انگریز کو وہاں سے نکالا جاسکے۔'' نپولین نے اپنی حکمت عملی کے بارے میں یہ خط جو ٹیپو سلطان کو بھیجا وہ اس تک پہنچنے کی بجائے مسقط میں موجود انگریز جاسوس کے ذریعے انگریز حکومت تک پہنچ گیا۔ٹیپو نپولین اتحاد کی تفصیلات جب جنرل سر رچرڈ ولزلے، جو کہ لارڈ ولزلے (WELLESLEY) کے نام سے مشہور ہے، تک پہنچیں تو اس نے ٹیپو سلطان کے خلاف ایک بھرپور جنگ کی تیاری شروع کردی۔ ولزلے نے مختلف بہانوں سے پرانے معاہدے کو توڑتے ہوئے جب ٹیپو پر جنگ مسلط کی تو سلطان نئے معاہدے کے لئے تیار تھا۔

اس طرح کے معاہدے پچھلی تین جنگوں میں ہو چکے تھے جب انگریز شکست خوردہ تھے، کمزور تھے ٹیپو نے اپنی شرائط پر ان کے ساتھ معاہدے کئے تھے۔اب ٹیپو مقابلتاً کمزور تھا اور معاہدے کے لئے تیار تھا مگر ولزلے ٹیپو کو کمزور دیکھ کر اسے ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے درپے تھا۔اس کے ہوتے ہوئے انگریز کا ہندوستان پر مکمل قبضے کا خواب پورا نہیں ہوسکتا تھا۔نظام اور مرہٹوں کو انگریز اپنے ساتھ ملا چکا تھا اور 1798ء میں نپولین بونا پارٹ کو مصر میں شکست ہوگئی تھی۔میسور کی چوتھی اور آخری لڑائی جب شروع ہوئی تو ٹیپو سلطان تنہا تھا اور اس کے اردگرد انگریزوں کے جاسوس اور غدار جمع ہو چکے تھے۔

اس جنگ میں ٹیپو کے خلاف ایسٹ انڈیا کمپنی کی 26 ہزار فوج تھی جس میں چار ہزار انگریز تھے باقی 22 ہزار ہندوستانی تھے۔اس کے علاوہ نظام دکن کی 10 بٹالین فوج اور

1600 کیولری تھی۔ مرہٹوں کے ہزاروں فوجی اس کے علاوہ تھے۔کل ملا کر جنرل آرتھر ولزلے، جو بعد میں ڈیوک آف ولنگٹن بنا، کی کمان میں پچاس ہزار سے زائد فوج تھی جبکہ ٹیپو سلطان کے پاس تیس ہزار فوج تھی۔ یہ وہی آرتھر ولزلے ہے جس نے بعد میں نپولین کو واٹرلو کی جنگ میں شکست دی۔ 27 ر مارچ کو ٹیپو نے ملادی کے مقام پر ولزلے کی فوج کو روکنا چاہا مگر اسے پسپا ہونا پڑا اور وہ واپس اپنے دار الخلافہ سرنگا پٹم آ گیا۔ آرتھر ولزلے کی فوجوں نے دریائے کاویری کے کنارے واقع سرنگا پٹم کو محاصرے میں لے لیا۔ یہ محاصرہ 16 ر اپریل 1799ء کو شروع ہوا اور چار مئی کو ختم ہو گیا۔ وہ ٹیپو سلطان جس کو 1767ء کی پہلی جنگِ میسور جو اُس نے اپنے والد حیدر علی کی معیت میں لڑی تھی، تب سے 1799ء تک کے 32 سالوں میں میسور کی تین بڑی جنگوں میں انگریز شکست نہ دے سکا، یہ کیسے ہو گیا کہ اٹھارہ دنوں کے محاصرے میں ٹیپو سلطان کو شکست ہو گئی۔ اس کی بڑی وجہ اس کے وزیر اعظم اور خزانے کے انچارج میر صادق کی غداری تھی جس کے سبب انگریز کی فوج بغیر کسی مزاحمت کے سرنگا پٹم میں داخل ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً آٹھ ہزار فوجیوں کو قتل کر ڈالا۔ اس حملے سے بے خبر یہ فوجی میر صادق کے پاس جمع تھے جس نے انہیں حفاظتی مقامات سے ہٹا کر تنخواہیں دینے کے بہانے بلایا ہوا تھا۔

میر صادق دکن کا رہنے والا تھا اور ٹیپو سلطان کے والد حیدر علی کی فوج میں ایک سپاہی تھا۔ اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے وہ ترقی کرتا گیا اور اس نے اس قدر اعتماد حاصل کر لیا کہ ٹیپو سلطان نے اس کو اپنا دیوان یعنی وزیر اعظم اور خزانے کا انچارج بنا دیا۔ میسور کی تیسری جنگ کے بعد انگریزوں نے میر صادق کو یہ لالچ دے کر کہ سلطان کو شکست دینے کے بعد اسے میسور کا سلطان بنا دیا جائے گا اپنے ساتھ ملا لیا اور وہ انگریزوں کے لئے کام کرتا رہا۔ ایک بار ٹیپو کو اس پر شک گزرا تو اسے قید کر لیا گیا اور قریب تھا کہ اسے مار دیا جاتا کہ میر صادق نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر اپنی وفاداری کا یقین دلا کر رہائی حاصل کر لی۔ ٹیپو سلطان نے نہ صرف اس کی جان بخشی کی بلکہ اس پر پھر سے بھروسہ کرنے لگا۔

محاصرے کے دوران انگریز فوجوں نے کئی بار سرنگا پٹم میں داخل ہونے کی

کوشش کی مگر ہر بار ناکام رہیں۔ ٹیپو سلطان کا خیال تھا کہ انگریز فوجیں رات کے وقت قلعہ میں داخل ہونے کی کوشش کریں گی۔ میر صادق نے یہ جانتے ہوئے اس کے برعکس منصوبہ بنایا۔ اس نے فصیلوں، دروازے اور اہم مقامات پر مامور حفاظتی فوجی دستوں کو یہ پیغام دے کر بلوایا کہ سلطان نے ان کی تنخواہوں میں اضافہ کیا ہے اور اس کا حکم ہے کہ تمام فوجی آئیں اور اپنی تنخواہیں وصول کریں۔ ہزاروں فوجی جب اہم مقامات سے ہٹ گئے تو اس نے پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت فضا میں سفید کپڑا لہرا کر انگریز فوجوں کو مطلع کیا کہ میدان صاف ہے۔ ولزلے کی افواج جو بانس کی سیڑھیاں لئے اس اشارے کی منتظر تھیں، ہزاروں کی تعداد میں قلعہ میں داخل ہوگئیں اور قلعہ پر برطانیہ کا جھنڈا لہرا دیا۔ سلطان اور سلطان کی فوج اس صورت حال کے لئے تیار نہیں تھی۔ سلطان اس وقت دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق اس ابتدائی حملے میں سلطان کے آٹھ ہزار فوجی مارے گئے۔ اس کا سپہ سالار سید غفور لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اس جنگ میں سیدوں کی بڑی تعداد نے ٹیپو کا ساتھ دیا اور لڑتے ہوئے مارے گئے۔

حفاظتی حکمت عملی کے پیش نظر قلعہ کے اندر تمام فوجی ٹیپو سے ملتا جلتا لباس پہنتے تھے تاکہ لڑائی کے دوران سلطان کی پہچان نہ ہو سکے۔ میر صادق نے جو ساز باز کی تھی اس کے مطابق طے تھا کہ جس شخص کے سامنے میر صادق سر جھکا کر سلام کرے گا انگریز فوجی پہچان لیں گے کہ یہ ٹیپو سلطان ہے۔ سلطان نے اپنی فوج کے ساتھ مل کر بے جگری کے ساتھ، بہادری کے ساتھ یہ لڑائی لڑی۔ ایک مقام پر جب اسے ہتھیار ڈال کر اپنے آپ کو لیفٹیننٹ جنرل جارج ہیرس کے حوالے کرنے کی پیش کش کی گئی تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار سال کی زندگی سے بہتر ہے۔'' میسور کے ٹائیگر نے 4رمئی 1799ء کو ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑتے ہوئے اپنی جان قربان کر دی۔ میر صادق کی غداری کی وجہ سے ہندوستان غلامی کے تاریک اور طویل دور میں داخل ہوگیا۔

میر صادق وہ غدار تھا جسے ٹیپو سلطان نے ایک سپاہی سے اٹھا کر اپنا دیوان بنایا۔ سارا خزانہ اس کے حوالے کیا۔ اس کی سازش اور انگریز کے ساتھ ساز باز کے جرم کو معاف

کر کے جاں بخشی کی مگر اپنے دور کے اس ضیاالحق نے نہ صرف اپنے محسن کا قتل کروایا بلکہ اس طویل جدوجہد کا قتل کیا جو انگریز کے ہندوستان پر تسلط کے خلاف سراج الدولہ نے شروع کی تھی اور حیدر علی نے برسوں تک جس کو پروان چڑھایا تھا۔

اپنے جاں نثاروں کے ساتھ لاشوں کے ڈھیر میں دبے ہوئے سلطان کو اس کے ذاتی ملازم راجہ خان نے جو اس ڈھیر میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا اور زندہ تھا، پہچانا۔ 5 رمئی کی سہ پہر کو جب سلطان کو دفنایا جا رہا تھا تو یکا یک ایک طوفان اٹھا۔ آسمان پر اندھیرا چھا گیا اور موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ اس کی موت پر آسمان بھی رو رہا تھا۔ برٹش بارھویں رجمنٹ کا لیفٹیننٹ رچرڈ بیلی لکھتا ہے کہ ”میں نے اپنی زندگی میں بے شمار Hurricanes اور Typhoons آندھی اور طوفان دیکھے ہیں مگر ایسا طوفان نہ میں نے پہلے کبھی دیکھا تھا اور نہ ہی سنا تھا۔“

"Description of The Burial of Tipu During a Severe Thunderstorm" Macquarie University Library

ٹیپو سلطان کے فوجیوں اور سرنگا پٹم کے عوام نے میر صادق کو اس وقت پکڑ کر قتل کر دیا جب وہ انگریزوں کی پناہ میں جا رہا تھا۔ انگریزوں نے اس کی لاش کو دفنایا مگر لوگوں نے اس کو قبر سے نکال کر اس کی لاش پر اس قدر گندگی اور انسانی غلاظت پھینکی کہ اس کی لاش کو پہچاننا مشکل تھا۔ انگریزوں نے اس کی لاش کو دوبارہ دفن کیا۔ آج جب سرنگا پٹم، ٹیپو سلطان کا محل اور مقبرہ دیکھنے کے لئے سیاح جاتے ہیں تو میر صادق کی قبر پر نفرت سے تھوکتے ہیں اور پتھر مارتے ہیں۔ تاریخ میں میر صادق وہ عبرتناک شخص بن گیا کہ آج سینکڑوں سال گزر جانے کے باوجود برصغیر پاک و ہند میں احسان فراموش افراد اور غداروں کو میر جعفر اور میر صادق کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

جعفر از بنگال، صادق از دکن
ننگِ ملت، ننگِ دیں، ننگِ وطن

(علامہ اقبال)

ٹیپو کے بعد

سندھ اور پنجاب کے علاوہ پورے ہندوستان پر کمپنی کی حکومت قائم ہو گئی

ٹیپو کو قتل کرنے کے بعد ولزلے سرنگا پٹم میں مقیم ہو گیا۔ سرنگا پٹم کمپنی کے قبضے میں آ گیا اور ٹیپو کی اولاد اور خاندان کو کلکتہ بھجوا دیا گیا تا کہ سرنگا پٹم میں بغاوت کا خطرہ پیدا نہ ہو سکے۔

میر صادق کے ساتھ اس کا نائب وزیر اعظم پرُنیا بھی ٹیپو کے خلاف غداری میں برابر کا شریک تھا چنانچہ ٹیپو اور میر صادق کے قتل کے بعد جب ہندو خاندان کے ایک چار سالہ بچے کے سر پر میسور کی سلطنت کا تاج رکھا گیا تو پرُنیا کو اس کا سرپرست بنا کر حکومت اس وقت تک کے لئے اس کے حوالے کر دی گئی جب تک کرشنا راجہ ودی یار سولہ سال کا نہیں ہو جاتا۔ اس طرح 1811ء تک پرُنیا نے میسور کی سلطنت پر حکمرانی کی۔

پرُنیا برہمن خاندان کا ایک یتیم لڑکا تھا جو ایک دکان پر حساب کتاب رکھنے کی ملازمت کرتا تھا۔ اس کا مالک آنند نا سیتی، حیدر علی کے محل اور فوجوں کو روزمرہ استعمال کا سامان فروخت کرتا تھا اور سامان کی سپلائی کے ساتھ اکثر پرُنیا حساب کتاب کے لئے محل جایا کرتا تھا۔ حیدر علی نے اس لڑکے کی خوش خطی اور اکاؤنٹنگ سے متاثر ہو کر اسے اپنے محکمہ مالیات میں نوکری دے دی۔ آہستہ آہستہ اس نے ترقی کی اور وہ مالیات کے محکمے کا انچارج بن گیا۔ میر صادق بھی ان دنوں حیدر علی کا بااعتماد اہلکار بن چکا تھا۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد جب ٹیپو سلطان نے میر صادق کو وزیر اعظم بنایا تو پرُنیا کو نائب وزیر اعظم اور محکمہ مالیات کا دیوان مقرر کیا۔ ٹیپو سلطان سے غداری کے عوض میر صادق کو میسور کا سلطان بنایا جانا تھا اور پرُنیا کو وزیر اعظم۔ مگر میر صادق کے قتل کے بعد پرُنیا کو میسور کی سلطنت کا مالک بنا دیا گیا۔ پرُنیا نے کرشنا راجہ ودی یار کی سولہ سال تک سرپرستی بھی کی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی خدمت بھی۔

انگریز نے ٹیپو کے خلاف پراپیگنڈہ پر مبنی کتابیں لکھوائیں جو بعد میں متعصب

محققین کے لئے ''تحقیق'' کا مواد بن گئیں۔ بالخصوص ایچ۔ڈی شرما جیسے چند متعصب ہندو تاریخ دانوں نے ان کو خوب اچھالا۔ WILKS اور KIRK PATRICK کی تحریروں میں ٹیپو سلطان کو ایک ایسا ظالم اور جابر تنگ نظر اور متعصب مسلمان بنا کر پیش کیا گیا جس نے ہندوؤں اور عیسائیوں پر مظالم ڈھائے اور ولزلے نے آ کر ان کی مدد کی اور ٹیپو کے ظلم و ستم سے انہیں آزاد کروایا۔ یہ وہ تاریخ ہے جو انگریز نے حقائق کو مسخ کر کے ہندوستان کی آزادی کو سلب کرنے کے جواز کے طور پر لکھوائی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ٹیپو کا نائب وزیراعظم پُرنیا ایک ہندو تھا جسے میر آصف کا خطاب دیا گیا تھا۔ اس کے خزانے کا انچارج کرشنا راؤ تھا۔ شامیا ایانگر اس کا وزیر محکمہ ڈاک اور محکمہ پولیس تھا۔ رانگا ایانگر اس کا اہم افسر تھا۔ مول چند اور سوجن رائے مغل دربار میں اس کے سفیر تھے۔ اس کا چیف پیش کار سوبھا راؤ تھا۔ لالہ مہتاب رائے اس کا ذاتی منشی تھا۔ ہری سنگھ اس کی ایک کیولری کا انچارج تھا۔ راما راؤ اس کی کیولری بریگیڈ کا انچارج تھا، سری نواس راؤ اور اپا جی اس کے سفارتی ایلچی بن کر دوسرے ممالک کے حکمرانوں کے پاس جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کی فوج میں ہزاروں ہندو، سکھ اور عیسائی فوجی تھے جو اس کے شانہ بشانہ لڑے اور اپنی جان قربان کی۔

ہندو پنڈتوں کے حساب کے مطابق 4 رمئی کی دوپہر ٹیپو کے لئے منحوس اور بہت خطرناک گھڑی تھی۔ 4 رمئی کو پنڈتوں نے روزہ رکھ کر صبح سے اس مشکل گھڑی کے ٹل جانے کے لئے عبادت کی۔ 5 رمئی کو جب اس کا جنازہ اٹھا تو کئی ہندو عورتوں نے خودکشی کر لی۔

اس کے ساتھ ہندو عوام کی محبت کی کئی وجوہات تھیں۔ سرنگا پٹم میں رواج تھا کہ ہندو عورتیں ایک وقت میں چار یا اس سے زیادہ خاوند رکھ سکتی تھیں۔ اس رسم پر اس نے پابندی لگائی۔ مالابار کی عورتیں بازاروں میں صرف اپنا ستر چھپا کر اوپر سے ننگی پھرتی تھیں جس پر اس نے ممانعت عائد کی۔ کچھ مندر ایسے تھے مثلاً میسور کا کالی دیوی کا مندر جہاں پر دیوی کو خوش کرنے کے لئے انسانوں کی قربانی دی جاتی تھی۔ اس پر اس نے سختی سے پابندی عائد کی۔ ہندو عورتوں کو مویشیوں کی طرح منڈی میں لا کر نیلام کیا جاتا تھا اس کاروبار کو اس نے ختم کیا۔ ان کے یہاں ایک رواج تھا کہ بھائیوں میں صرف بڑا بھائی شادی کرتا

تھا اور اس کی بیوی سب بھائیوں کی بیوی ہوتی تھی۔ اس رواج کو اس نے ختم کیا۔

قبائلی دور کی رسوم و رواج کو ختم کر کے اس نے سرنگا پٹم کو اپنے دور کی ترقی یافتہ جدید ریاست بنایا تھا۔ جس کے نتیجے میں رعایا خوش حال بھی تھی اور پرامن بھی۔ گاندھی اور نہرو کے نزدیک وہ ہندوستان کی آزادی کا ہیرو اور اس کے لئے جنگیں لڑنے والا آخری سلطان تھا۔ دو سو پانچ سالوں کے بعد 2004 میں وجے ملیا (VIJAY MALLYA) ایک ہندو صنعت کار سیاست دان نے لندن میں ٹیپو سلطان کی تلوار کو ڈیڑھ کروڑ میں خریدا اور واپس لے جا کر میوزیم میں ہندوستان کی ایک فخریہ یادگار کے طور پر رکھوایا۔ یہ تلوار WALLACK COLLECTION مانچسٹر سکوائر لندن میں رکھی ہوئی تھی۔

انگریز کے خلاف ٹیپو سلطان کی جنگوں کا باب ختم ہوا تو ہندوستان پر انگریز کے قبضے کا دروازہ کھل گیا۔ ولزلے نے نظام اور مرہٹوں کے ساتھ جو وعدے کئے تھے وہ پورے نہ کئے بلکہ چھیاسی ہزار مربع میل پر پھیلی ہوئی دکن کی ریاست نظام سے نکل کر کمپنی کے زیر اثر آ گئی۔ اودھ کو بھی کمپنی کے ماتحت کر لیا گیا۔ مرہٹے البتہ لڑتے رہے مگر آپس میں تقسیم ہونے کی وجہ سے ہارتے رہے۔ بالآخر مرہٹوں کا پیشوا بھی کمپنی کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا۔ مرہٹوں کے بالاجی راؤ دوئم کی مملکت پر 1819ء میں قبضہ کرنے کے بعد سندھ اور پنجاب کے علاوہ تقریباً پورے ہندوستان پر کمپنی کی حکومت قائم ہو گئی۔

ولزلے نے ہندوستان میں فرانس کے اثر و رسوخ کو بھی ختم کر دیا۔ ولزلے کے بعد لارڈ کارنوالس کو اس کا جانشین مقرر کیا گیا۔ اس کی وفات کے بعد سر جارج بارلو کو عارضی گورنر جنرل بنایا گیا۔ اس کے دور میں دیسی سپاہیوں نے بغاوت کی۔ ایک سو تیرہ انگریز سپاہیوں اور چودہ انگریز افسروں کو قتل کیا گیا۔ تحقیقاتی کمیشن نے اس بغاوت کی ذمہ داری انگریز فوجی افسروں کی بدعنوانی اور ظلم کو قرار دیا۔ دراصل سیاسی اور فوجی فتوحات کے بعد کمپنی نے ہندوستان کے عوام کے ساتھ نہایت ذلت آمیز اور انسانیت سوز سلوک شروع کر دیا تھا۔ عوام کمپنی راج سے تنگ تھے۔ نوابوں اور راجوں، مہاراجوں میں چند تھے جو انگریز کے خیر خواہ تھے۔ البتہ کاروباری طبقہ انگریزی مال کی کھپت کے لئے دکانیں کھول رہا تھا اور

ہر دور کے پیٹی بورژوا طبقے کی طرح حکمرانوں یعنی کمپنی کا وفادار تھا۔

جارج بارلو کو کمیشن رپورٹ کے بعد جانا پڑا اور اس کی جگہ لارڈ منٹو کو تعینات کیا گیا۔ لارڈ منٹو نے سندھ کے حکمرانوں کے ساتھ، پنجاب میں راجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ اور کابل میں شاہ شجاع کے ساتھ معاہدے کئے۔ اپنے جاسوس اور سفیر ان علاقوں میں بھیجے۔ اب کمپنی کی نظریں ان علاقوں پر تھیں۔ ان دنوں ملتان کابل کا حصہ تھا۔ اس کے سفیروں نے ان ممالک کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنا شروع کیں جو کہ کتابوں کی شکل میں شائع ہوئیں۔ الفنسٹن کی ''تاریخ کابل'' کرنل میلکم کی ''تاریخ ایران'' اور ہنری پوٹن جر کی ''تاریخ بلوچستان'' منٹو کی سفارتی سرگرمیوں کے دوران تیار کی گئیں۔

لارڈ منٹو 1807ء میں آیا اور 1813ء میں واپس چلا گیا۔ اس کے بعد 1813ء سے 1823ء تک لارڈ فرانسس ہیسٹنگز کا زمانہ ہے۔ اس نے نیپال پر قبضہ کیا اور اس جنگ میں جو کچھ خرچ ہوا وہ اودھ کے غازی الدین کو بادشاہ کا خطاب دے کر وصول کیا گیا۔ نیپال کی لڑائی بھی انگریزوں کے لئے مشکل لڑائی تھی جس میں کئی بار ان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

سندھ پر کمپنی کا قبضہ

ایک عرصے سے انگریز کی نظریں دریائے سندھ پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ سندھ جس کے بارے میں ہندوؤں کی مقدس کتاب رگ وَید میں نہایت احترام کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ ''سندھو تمام دریاؤں سے زیادہ تیز رفتار ہے۔ اس کا پانی چمکتا ہے اور چھلکتا ہے۔ سندھو اس بہادر جنگجو کے گھوڑے کی طرح ہے۔ اس کو کون روک سکتا ہے۔ یہ بجلی کی کوند کی طرح تیز رفتار ہے۔ زمینوں کو سیراب کرتا ہوا سندھ زندگی اور پھل عطا کرتا ہے۔'' سندھ کے کنارے آباد شہروں کے راجہ اور حکمران راجہ بھاویہ اور اس کے خاندان کی طرح دریائے سندھ کو تحفے تحائف اور قربانیاں پیش کرتے تھے۔ یہ وہ دور ہے جب انسان دریاؤں کے کنارے آباد ہو کر کھیتی باڑی کے دور میں داخل ہو رہا تھا اور بستیاں آباد کر رہا تھا۔

سندھ ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں کی زد میں رہا۔ ہزار سال قبل از مسیح آریا آئے اور اپنے ساتھ تین وید، سواستیکا کا نشان اور سنسکرت زبان لے کر آئے۔ 500 قبل از مسیح میں ایرانیوں نے حملہ کیا۔ ڈیڑھ سو سال قبل از مسیح کابل کے بادشاہ نے حملہ کیا۔ کشان (KUSHAN) اور سیتھیان (SETHIANS) حملہ آور ہوئے۔ 20 سے 500 سن عیسوی تک ترک حملہ کرتے رہے۔ 500 سن عیسوی میں ہن حملہ آور ہوئے۔ تیسری صدی عیسوی میں وسط ایشیا کے ساسانیوں نے حملہ کیا۔ پھر 712ء میں عرب حملہ آور ہوئے۔ 1500ء میں ارغون حملہ آور ہوئے پھر سولہویں صدی کے آخر میں مغل آئے اور اب انگریز سندھ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ انگریز کے سندھ کے ساتھ تجارتی تعلقات کی ابتدا تو 1613ء میں ہوئی مگر انگریز تجارتی وفد یہاں ناکام رہا۔ اس کے بعد 1809ء تک سندھ اور انگریز تقریباً دو سو سال تک ایک دوسرے سے دور رہے۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں سندھ کے حکمران بلوچ میر تھے۔ خیر پور، میر پور اور حیدر آباد کے میر عملاً تمام سندھ کے حکمران تھے۔ لارڈ منٹو نے 1809ء میں امیران سندھ کے ساتھ دریائے سندھ کے استعمال کا معاہدہ کیا۔ پہلی اینگلو افغان جنگ کے دوران جو 1839ء میں شروع ہوئی انگریز نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ ایک سید جو دریا کے کنارے بیٹھا تھا جب اس نے انگریز کی کشتیاں دریائے سندھ میں دیکھیں تو اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا کہ اب انگریز کا سندھ پر قبضہ ہو گیا۔

افغان جنگ کے دوران انگریز اپنی فوج اور سامان کی سپلائی دریائے سندھ کے راستے کر رہا تھا۔ جس پر اکثر حملے ہوتے تھے۔ 1841ء میں افغانستان میں انگریزوں کی فوج کو مکمل تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریز دوبارہ افغانستان پر حملے کا منصوبہ رکھتا تھا مگر اس سے پہلے وہ سندھ پر قبضہ کر کے اپنے لئے سندھ کو محفوظ بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ سر چارلس نیپئر نے 1842ء میں پہلے تو حیدر آباد، خیر پور اور میر پور کے حکمرانوں سے گفت و شنید کے ذریعے سندھ پر قبضے کی کوشش کی مگر جب اسے کامیابی نہ ہوئی تو اس نے جنوری 1843ء میں حیدر آباد کی طرف اپنی فوج بھیجی جہاں پر میروں کے بلوچ لشکر نے انگریزوں کی

ریذیڈینسی کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ 17 رفروری کو حیدر آباد سے تقریباً پانچ میل دور میانی کے مقام پر بلوچوں اور نیپیئر کی فوجوں کا تصادم ہوا۔ انگریز کے پاس جدید اسلحہ، بارود اور بندوق تھی۔ جبکہ بلوچ تلواروں، کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے لڑ رہے تھے۔ نتیجتاً انگریز کو فتح ہوئی اور اس لڑائی میں تقریباً پانچ ہزار بلوچ مارے گئے۔ جبکہ انگریز ہلاک شدگان کی تعداد 257 بتائی جاتی ہے۔ 22 رمارچ 1843ء کو انگریزوں نے میر پور خاص کے حکمران شیر محمد کے لشکر کو حیدر آباد کے قریب دوبو کے مقام پر شکست دے کر اگست 1843ء تک پورے سندھ پر قبضہ کر لیا۔

جمعرات 6 راپریل 1843ء کو برطانیہ کے اخبار ٹائمز کے صفحہ چار پر جو چھپا وہ یہ تھا۔ ''سر چارلس نیپیئر نے صرف دو ہزار سات سو فوجیوں سے بلوچوں کی 22 ہزار فوج پر فتح حاصل کر لی...... یہ فرق ہے راجہ کی باغی فوج میں اور انگریز افسروں کی تربیت یافتہ شریف اور منظم سپاہیوں میں''۔ انگریز فوجوں نے حیدر آباد میں جو لوٹ مار کی اس میں سے چارلس نیپئر نے ستر ہزار پونڈ اپنے لئے رکھے۔ وہ سندھ کی تسخیر پر لکھتا ہے ''ہمیں کوئی حق حاصل نہیں کہ ہم سندھ پر قابض ہوں مگر اس کے باوجود ہم ایسا ہی کریں گے۔'' سندھ کے حکمرانوں کو پونا، کلکتہ اور ہزاری باغ میں قید کر دیا گیا۔ اکثر میر جلا وطن کر دیئے گئے۔ دس سال کی قید کے دوران جو بچ گئے انہیں سندھ جانے کی اجازت ملی۔ جنگ افغانستان کے دوران نہ صرف دریائے سندھ کا استعمال ہوا بلکہ سندھ کی دولت کو بھی بے دردی کے ساتھ لوٹا گیا۔ سندھ کو کمپنی کی مقبوضات کے ساتھ ملحق کرنے کے بعد سر چارلس نیپیئر کو سندھ کا گورنر مقرر کیا گیا جس نے کراچی کو سندھ کا دار الخلافہ بنایا۔

1839ء میں کمپنی کے ساتھ تالپوروں کے معاہدے کے تحت کراچی انگریزوں کے زیر تسلط آ گیا تھا۔ کراچی ایک بڑا سا گاؤں یا چھوٹا سا شہر تھا جس میں انگریز نے اپنی فوجوں اور اپنی رہائش کے لئے کینٹونمنٹ کا علاقہ تعمیر کیا جو صرف گوروں کے لئے تھا۔ یہاں پر ہندوستانیوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ کراچی کا شمال مغرب ہندوستانیوں کے لئے اور جنوب مشرق انگریز کے لئے۔ مچھیروں کی بستیاں گھٹتی گئیں۔ کراچی بڑھتا گیا۔ تجارتی

بندرگاہ بنی، بازار بنے، تاجر طبقہ تیزی سے آباد ہوا اور کراچی ایک بڑا شہر بننے لگا۔

نپیئر کے مستعفی ہونے کے بعد 1847ء میں سندھ کو بمبئی میں شامل کر کے اسے کمشنر کے ماتحت کر دیا گیا۔ مگر سندھ کے عوام، بالخصوص حر، بغاوت کرتے رہے۔ 1846ء میں تھر میں بغاوت ہوئی، حیدرآباد اور شکارپور کی چھاؤنی میں بغاوت ہوئی۔ ان بغاوتوں پر انگریز نے قابو پالیا۔ ایٹکن (AITKEN) کے مطابق صرف حروں کا ایک قبیلہ تھا جو تسلسل کے ساتھ تشدد کی کارروائیاں کرتا رہتا تھا۔ انگریز اپنے خلاف جدوجہد کرنے والوں کو باغی یا ڈاکو کا ''لقب'' دیتا تھا۔ حُروں کو بھی جرائم پیشہ قرار دے کر حُر ایکٹ پاس کیا گیا جس کے مطابق کسی بھی حُر کو دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم دے دیا گیا۔ حُروں کی بغاوت سو سال تک جاری رہی حتیٰ کہ پیر پگاڑہ سید صبغت اللہ دوئم کو 20 مارچ 1943ء کو پھانسی دے دی گئی جس کے بعد حُروں کی بغاوت میں مزید شدت آئی جو کہ قیام پاکستان تک جاری رہی۔ 1843ء تک سندھ پر مکمل قبضہ کرنے کے بعد اب کمپنی کی نظریں پنجاب پر تھیں۔ سرحد پنجاب کا حصہ تھا۔

پنجاب پر کمپنی کا قبضہ

سندھ اور پنجاب کو اپنے قبضے میں کرنا انگریز کی ضرورت بن گیا تھا۔ نپولین کی شکست کے بعد روس کے توسیع پسندانہ عزائم تھے۔ وہ کابل اور ایران کے ذریعے ہندوستان میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ انگریز اپنے سونے کی چڑیا کے علاقوں یعنی مدراس، کلکتہ، بمبئی، بنگال وغیرہ کو سندھ اور پنجاب کا بفرزون بنا کر بچانا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سندھ اور پنجاب میں بیٹھ کر موقع ملنے پر وسطی ایشیا کے تجارتی علاقوں پر قبضہ کرنا بھی اس کے منصوبوں میں شامل تھا۔ اس سے پہلے کہ انگریز مزید آگے بڑھتا، روس اس کو افغانستان اور ایران میں ہی روکنا چاہتا تھا اور موقع ملنے پر انگریز کے مقبوضہ علاقوں میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ بلکہ جنرل پیروسکی (PEROVSKI) وسطی ایشیا میں فتوحات حاصل کرتے ہوئے KHIVA تک پہنچ گیا تھا۔ ان دنوں پنجاب پر رنجیت سنگھ کی حکومت تھی۔

رنجیت سنگھ نے 1799ء میں جب لاہور پر قبضہ کیا تو پنجاب کا بیشتر حصہ جنگی سرداروں میں بٹا ہوا تھا۔ 1820ء تک مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ایک ایک کر کے پنجاب کے تقریباً سارے طالع آزما جنگی سرداروں کی قوت کو توڑ دیا۔ سیالکوٹ، ملتان پر قبضے کے بعد مہاراجہ نے ڈیرہ جات، ہزارہ اور پھر کشمیر پر بھی قبضہ کر لیا۔ 1823ء میں اس نے پشاور پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کی مملکت دریائے ستلج سے لے کر دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی جس کے جنوب میں کمپنی کی حکومت تھی اور شمال میں افغانستان کی حکومت تھی۔ کابل کا امیر دوست محمد خان روس کی مدد سے رنجیت سنگھ کو شکست دے کر پشاور واپس حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریز نے افغانستان کے خلاف رنجیت سنگھ کی حمایت کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ ملا لیا۔ مگر رنجیت سنگھ کی دم پر سید احمد بریلوی کا پٹاخہ بھی باندھ دیا۔

سید احمد نے رنجیت سنگھ کو کمزور کر کے انگریزوں کی مدد کی

یوپی کے رہنے والے سید احمد جب دو سال تک (حالیہ) سعودی عرب میں محمد بن عبدالوہاب کی تعلیمات حاصل کرنے کے بعد بحری جہاز کے ذریعے واپس آئے تو بنگال میں رک کر بنگالیوں کو جو کہ انگریز کے ظلم وستم کا شکار تھے جہاد کے لئے تیار کرنے لگے۔ ان کا یہ جہاد جو انگریز کے خلاف ہونا چاہیے تھا، نہیں تھا بلکہ رنجیت سنگھ کے خلاف تھا۔ انہوں نے بنگالیوں کو بھرتی کر کے ہزاروں کی تعداد میں پشاور بھیجنا شروع کیا جو اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کے چکر میں آ کر جہادی بن گئے اور سب کے سب مارے گئے۔ وہ خود بھی بالاکوٹ کے مقام پر مارے گئے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ مقامی قبائلی ان کی "اسلامی حکومت" کے جبر سے تنگ آ گئے تھے۔ اُن کی مخبری پر سکھ فوج نے گھات لگا کر حملہ کیا اور سید احمد، شاہ اسمٰعیل اور ان کے ساتھیوں کو ایک گھاٹی میں گھیر کر مار دیا گیا۔ البتہ رنجیت سنگھ کئی سال تک ان سرحدی لڑائیوں میں مصروف رہا اور اس کی مملکت کمزور ہوتی گئی۔

1839ء میں رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد انگریزوں نے پنجاب پر قبضے کے

بارے میں تدبیریں شروع کر دیں۔ سکھ سلطنت میں خونریز طوائف الملوکی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ 1839ء میں پنجاب کی سرحد پر انگریز کی فوج صرف ڈھائی ہزار تھی جبکہ رنجیت سنگھ کی موت کے بعد کمپنی کی فوج کی تعداد بتیس ہزار ہوگئی۔ رنجیت سنگھ کی بیگم رانی جنداں اور وزیر اعظم لال سنگھ نے ستلج پار کر کے انگریزوں کے ساتھ لڑائی لڑی۔ یہ پنجاب کی انگریزوں کے ساتھ پہلی لڑائی تھی جو دسمبر 1845ء میں لڑی گئی۔ یہ جنگ سردار ہار گئے۔ 10رفروری 1846ء کو قصور میں سکھوں کے نوعمر راجہ دلیپ سنگھ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ایک معاہدے کے تحت بیاس اور ستلج تک کا علاقہ انگریزوں کی تحویل میں چلا گیا۔ لارڈ ہارڈنگ نے جو معاہدہ کیا اس کے تحت 15 لاکھ پونڈ تاوان مقرر ہوا اور سر ہنری لارنس کو لاہور کا ریذیڈنٹ مقرر کر دیا گیا۔ دلیپ سنگھ کا خزانہ خالی تھا۔ اس کے وزیر اعظم گلاب سنگھ نے 15 لاکھ پونڈ تاوان کی ادائیگی کی جس کے عوض اسے وادیٔ کشمیر کا علاقہ دے دیا گیا۔ ریذیڈنٹ کی تقرری نو ماہ کے لئے ہوئی تھی۔ جب یہ مدت ختم ہونے کو آئی تو بعض درباریوں سے یہ درخواست کروانی مشکل نہیں تھی کہ ''حضور پُرنور ابھی تھوڑی مدت لاہور میں مزید قیام فرمائیں کیونکہ آپ کے چلے جانے کے بعد نقص امن کا اندیشہ ہے۔'' چنانچہ یہی ہوا۔ لارڈ ہارڈنگ نے ان درباریوں کی درخواست مان لی۔ انتظامی امور کے لئے سر لارنس کی سربراہی میں ایک کونسل قائم کی گئی اور رانی جنداں کے اختیارات ختم کر دیئے گئے۔ سر ہنری لارنس اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھا جب تک کہ اس نے رانی جنداں کو شیخوپورہ میں نظر بند نہیں کر دیا۔

ملتان کا صوبے دار دیوان مول راج دربارِ لاہور اور ریذیڈنٹ کے احکامات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا چلا آ رہا تھا۔ چنانچہ لاہور دربار نے مول راج کو اس کے عہدے سے سبکدوش کرتے ہوئے کاہن سنگھ مان کو اس عہدے کا چارج لینے کے لئے ملتان روانہ کیا۔ اس کے ساتھ دو انگریز افسر بھی تھے۔ چارج لینے کے بعد یہ دونوں افسر اور کاہن سنگھ اپنے محافظ دستے کے ساتھ ملتان قلعے سے باہر آ رہے تھے کہ ملتان کے عوام نے ان پر حملہ کر دیا۔ عیدگاہ میں تصادم ہوا۔ دونوں انگریز قتل کر دیئے گئے۔ کاہن سنگھ بری طرح زخمی ہوا۔

لارڈ ڈلہوزی، جس کا تقرر مارچ 1848 میں ہارڈنگ کے واپس انگلستان جانے کے بعد ہوا تھا، اس نے پنجاب کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ سردار شیر سنگھ نے بہادری سے انگریز فوج کا مقابلہ کیا۔ جنوری 1849ء میں چلیانوالہ کے مقام پر انگریز فوج کو اس نے شکست دی۔ واپسی پر شیر سنگھ کی فوجوں کو گجرات کے قریب روک دیا گیا۔ 27/جنوری 1849ء کو جنرل گلبرٹ اور سردار شیر سنگھ کے درمیان جنگ ہوئی۔ 12/مارچ 1849ء کو شیر سنگھ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ 29/مارچ کو مہاراجہ دلیپ سنگھ نے شکست تسلیم کر لی۔ سرحد اور پنجاب مکمل طور پر کمپنی کے قبضے میں چلے گئے۔ اب پورے ہندوستان پر کمپنی کی حکومت تھی۔

1857ء کی جنگ آزادی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمہ

لارڈ ڈلہوزی کے بعد جب 1856ء میں لارڈ کیننگ کو ہندوستان کا گورنر جنرل بنایا گیا تو اس وقت تک ہندوستان ایک سرے سے دوسرے سرے تک کمپنی کے قبضے میں تھا۔ لارڈ کلائیو سے لے کر لارڈ کیننگ تک کی مدت میں کمپنی کے افسران نے لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کئے رکھا۔ ظلم و تشدد اور ذلت آمیز سلوک سے غریب عوام اور کمپنی کی فوج میں دیسی سپاہی سب انگریزوں سے بدظن تھے۔ بغاوت کے آثار ہر طرف نظر آ رہے تھے۔ مگر کمپنی کی آنکھیں بند تھیں۔ لارڈ ڈلہوزی کے زمانے سے ہی دیسی سپاہیوں نے انگریز افسروں کا حکم ماننا ترک کر دیا تھا۔

22/جنوری 1857ء کو ڈم ڈم میں مقیم سپاہیوں نے اپنے انگریز افسر سے شکایت کی کہ رائفلوں کے لئے جو کارتوس بنائے جا رہے ہیں ان میں گائے اور سُور کی چربی ہے۔ ان کارتوسوں کو چلانے سے پہلے دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا۔ انگریز افسر نے کمپنی کی حکومت ہند کو اس بات سے آگاہ کیا۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح دیسی سپاہیوں میں پھیل گئی۔ 19/فروری کو بہرام پور کی انیسویں رجمنٹ نے مظاہرہ شروع کر دیا۔ کرنل مچل نے مظاہرے کی وجہ پوچھی تو فوجیوں نے جواب دیا کہ سرکار ہمارے دین میں دخل انداز ہو رہی ہے۔ ادھر بیرک پور کی 34 ویں رجمنٹ کے فوجیوں نے پریڈ کے دوران ''دین،

دین'' کا نعرہ لگایا اور سارجنٹ میجر پر منگل پانڈے نے گولی چلادی۔

بیرک پور کی خبریں میرٹھ چھاؤنی میں پہنچیں جہاں پر دیسی سپاہیوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ جب 6 مئی کو پریڈ ہوئی تو 85 سواروں نے کارتوس لینے سے انکار کر دیا۔ جنرل نے انہیں گرفتار کر کے بغاوت کے جرم میں مقدمہ چلا کر بعض کو چھ سال اور بعض کو دس سال کی قید بامشقت کی سزائیں سنا دیں۔ 9 مئی کو ساری فوج کے سامنے ان کی وردیاں اتاری گئیں۔ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر انہیں شہر میں سے گزار کر جیل تک پیدل لے جایا گیا۔ دیسی سپاہیوں میں غصے اور نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ انہوں نے 10 مئی کو فوجی بیرکوں میں آگ لگا دی۔ کرنل فینی کو گولی مار دی اور جو انگریز افسر بھی سامنے بڑھا وہ مارا گیا۔ باغیوں نے ان انگریز عورتوں اور بچوں کو بھی قتل کر ڈالا جو گرجا گھر سے واپس آرہے تھے۔ پوری چھاؤنی کو آگ لگا دی گئی۔ متعدد انگریز افسروں کو قتل کر دیا گیا اور جیل توڑ کر ان 85 سپاہیوں کو جیل سے باہر نکالا گیا۔ ان سپاہیوں کے علاوہ دوسرے بارہ سو قیدی بھی رہا ہو کر ان باغیوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ باغیوں کی یہ فوج اب میرٹھ سے دلی کی طرف چل پڑی۔ وہ باغی جو زخمی ہو گئے تھے اور دلی کی طرف نہیں جا سکتے تھے انہیں انگریزوں نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ چودہ گھنٹوں کے بعد باغی سپاہی میرٹھ سے دلی پہنچ گئے۔ دلی نے باغیوں پر اپنے دروازے کھول دیئے۔ یہاں کے دیسی سپاہیوں نے بھی باغیوں کے ساتھ مل کر انگریز افسروں کا قتل عام کیا۔ لال قلعہ میں داخل ہو کر باغیوں نے انگریزوں کا قتل عام کرنے کے بعد بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

تمام دیسی فوج بغاوت کر چکی تھی۔ دلی انگریزوں کا قبرستان بن گیا۔ کچھ نے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔ 11 مئی شام تک ساری دلی پر دیسی فوج کا قبضہ تھا۔ اس فوج کی قیادت مرزا فضل اور بخت خان کر رہے تھے۔ میرٹھ اور دلی کے واقعات نے پورے ہندوستان میں انگریز کے خلاف نفرت و غصے کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ سر ولیم ہنٹر لکھتا ہے۔ ''فوجیوں کی یہ بغاوت اودھ میں پہنچ کر فوجی جنگ کی صورت اختیار کر گئی۔'' اودھ کی ساری آبادی باغی ہو چکی تھی۔ چھاؤنیوں میں دیسی سپاہیوں سے ہتھیار چھین لئے گئے۔ مگر

وہ لڑتے رہے۔ لاہور میں جب 30 ر جولائی کو پرکاش سنگھ نے اپنی تلوار سے میجر سپنسر کو قتل کر دیا تو سینکڑوں باغیوں کو گرفتار کر کے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی گئی۔

پنجاب، یوپی، مدراس، بنگال، اڑیسہ، بنارس، بمبئی، الہ آباد، کانپور، گوالیار، لکھنؤ، روہیل کھنڈ، بریلی، بہار، ناگ پور، بندھیل کھنڈ غرضیکہ پورے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف مسلح جنگ شروع ہوگئی۔ آزادی کے متوالوں کا نعرہ تھا ''انگریزوں کو نکال دو۔'' اس جنگ آزادی میں ایک اندازے کے مطابق پچاس ہزار دیسی فوجی لڑ رہے تھے۔ اس کے علاوہ نانا صاحب اپنے دس ہزار فوجیوں کے ساتھ اس جنگ میں شامل تھا۔ جھانسی کی رانی لکشمی بائی نے اپنی فوج کے ہمراہ بے جگری کے ساتھ انگریزوں کے ساتھ جنگ کی اور لڑتی ہوئی شہید ہوئی۔ اودھ میں نواب واجد علی شاہ کی گرفتاری کے بعد اس کی بیگم حضرت محل نے اقتدار سنبھالہ ہوا تھا اس نے انگریزوں کے خلاف مزاحمت کو جاری رکھا مگر پسپا ہوتے ہوئے بالآخر کھٹمنڈو (نیپال) میں جا کر مقیم ہوگئی۔

14 ر ستمبر 1857ء تک دلی پر باغیوں کا قبضہ رہا اور ملک بھر میں انگریز قتل کئے جاتے رہے۔ جنرل نکلسن نے دلی پر قبضہ کرنے کی بارہا کوشش کی مگر ناکام رہا۔ بالآخر 14 ر ستمبر کو جب وہ دلی میں داخل ہوا تو چار دن تک گلی کوچوں میں دست بدست جنگ ہوئی۔ 19 ر ستمبر کو انگریزی فوج نے جب دلی پر قبضہ کیا تو شہر میں لاشوں کے انبار تھے۔ لارڈ رابرٹس جو اس وقت لیفٹیننٹ تھا لکھتا ہے ''ہم لاہوری دروازے سے ہوتے ہوئے چاندنی چوک گئے تو ہمیں دلی مردوں کا شہر دکھائی دیا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں سے یہ خاموشی ٹوٹتی تھی۔ ہم کسی زندہ انسان کی صورت نہ دیکھ سکے۔ ہر طرف مردے ہی مردے تھے۔ زمین مردوں کا بچھونا بنی ہوئی تھی۔ چلتے وقت ہم آہستہ آہستہ باتیں کرتے۔ ڈر تھا کہ ہماری آواز سے مردے چونک نہ جائیں۔ ایک طرف لاشوں کو کتے کھا رہے تھے تو دوسری طرف گدھ نوچ رہے تھے۔''

بخت خان، بہادر شاہ ظفر کو لال قلعہ سے نکال کر ہمایوں کے مقبرے میں لے گیا اور چاہتا تھا کہ بہادر شاہ کو کسی دوسرے شہر لے جا کر بادشاہ کے گرد فوج جمع کر کے دربار پر

بھر پور حملہ کرے۔ بہادر شاہ نے جسمانی کمزوری کا بہانہ بنا کر بخت خان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ بخت خان اپنی فوج کے ساتھ چلا گیا۔ دلی پر قبضہ ہو جانے کے بعد انگریز فوجی سپاہیوں کو تین دن تک لوٹ مار کرنے کی اجازت دی گئی اور دلی تین دن تک لٹتی رہی۔

میجر ہڈسن نے لال قلعے کے اندر زینت محل کے مکان میں بہادر شاہ کو قید کر دیا۔ اس کے تین بیٹوں کو گرفتار کر کے قتل کیا گیا اور ان کی لاشیں چوبیس گھنٹے تک کوتوالی پر لٹکتی رہیں۔ ان کے سر کاٹ کر بہادر شاہ کے سامنے رکھے گئے۔ بہادر شاہ ظفر پہ مقدمہ چلایا گیا اور جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا جہاں پر وہ 1862ء تک شاہی قیدی کی حیثیت سے زندہ رہا۔ وفات کے بعد اس کو وہیں دفن کیا گیا۔

کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

(بہادر شاہ ظفرؔ)

اس جنگ آزادی میں ہر مذہب اور قوم سے تعلق رکھنے والے ہندوستانیوں نے حصہ لیا۔ ان میں سید بھی تھے اور مغل بھی، افغان بھی تھے اور سکھ بھی، راجپوت بھی اور روہیل بھی، مرہٹے بھی اور نواب اور راجہ اور مہاراجہ بھی۔ پنجاب کے چند خاندانوں نے غداری کی اور انگریزوں کا ساتھ دیا۔ جنہیں بعد میں انگریز نے بہت نوازا۔ حتیٰ کہ ان کی اولادیں پاکستان کی زمین اور سیاست پر قابض رہیں اور آج تک ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد انگریز کے وفادار تھے وہ اب امریکہ کے وفادار ہیں۔

1858ء تک انگریز نے اپنی فوجی طاقت اور غداروں کے ساتھ مل کر اس جنگ پر مکمل طور سے قابو پانے کے بعد آزادی کے ان متوالوں اور ان کے خاندانوں کو بری طرح سے کچلا۔ 1857ء کی جنگ آزادی تو کامیاب نہ ہو سکی مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ یکم نومبر 1858ء کو ملکہ وکٹوریہ نے ہندوستان کو کمپنی کی حکومت سے نکال کر اسے تاج برطانیہ کے ماتحت کر دیا۔ لارڈ کیننگ جو کمپنی کے دور میں آخری گورنر جنرل تھا اسے تاج برطانیہ کے تحت ہندوستان کا پہلا وائسرائے مقرر کر دیا گیا۔

تاج برطانیہ کا ہندوستان پر قبضہ اور اس کے خلاف جدوجہد

1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد ہندوستان پر تاریکی چھا گئی۔ عوام خوف کے اندھیروں میں چلے گئے۔ ان پر برطانوی راج کا ظلم بڑھ گیا۔ حتیٰ کہ انگریز کی موجودگی میں چھتری کا کھولنا بھی جرم قرار دے دیا گیا۔ مگر انگریز کے خلاف بغاوت کی چنگاری سلگتی رہی۔ 1897ء میں چیپ کر (Chapekar) برادرز نامی تین بھائیوں نے پونا میں دو انگریز پلیگ کمشنرز کو قتل کر دیا اور پھانسی پر چڑھ گئے۔ ان دنوں ہندوستان میں پلیگ کی بیماری پھیلی ہوئی تھی۔

تاج برطانیہ نے جنگوں کی جگہ شاطرانہ سیاست کا استعمال کیا۔ اپنے خلاف باغیوں کو کچلنے کے ساتھ ساتھ اپنا نیا وفادار طبقہ پیدا کرنا شروع کیا۔ مہاجن، ٹوانے، نگیانے، قریشی، گیلانی وغیرہ پیدا کئے گئے۔ وطن پرستوں کے خلاف غداروں کی بھرتی شروع ہوگئی۔ دفتری زبان فارسی سے انگریزی بن گئی۔ طریقہ حکمرانی بدل گیا۔ جاگیردار پیدا کئے گئے۔ صنعتی انقلاب کے بعد بالخصوص اپنی ٹیکسٹائل انڈسٹری کے لئے خام مال کی بڑے پیمانے پر پیداوار کے لئے نہروں اور اس کی منتقلی کے لئے ریلوں کا جال بچھایا گیا۔ ریل کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ فوجوں اور سامانِ جنگ کو منتقل کرنا محفوظ بھی تھا اور آسان بھی۔ اپنے نظام کو مستعدی سے چلانا انگریز کی ضرورت تھا۔ چنانچہ متعدد بابو پیدا کئے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ تقسیم کرو اور حکمرانی کرو کے فارمولے کو اپناتے ہوئے انگریز نے ہندوستان میں

صدیوں سے موجود علاقائی، لسانی، مذہبی، طبقاتی اور نسلی تضادات کو ابھار کر اس مشترکہ جذبۂ قوم پرستی اور انگریز مخالفت کو تقسیم کرنا شروع کیا جس کا مظاہرہ 1857ء کی جنگ آزادی میں اس کو نظر آیا تھا۔ بالخصوص بنگال میں ہندو مسلم تضاد کا بھرپور فائدہ اٹھایا گیا۔

انگریز مختلف قوموں کو ایک دوسرے کے خلاف ابھارتا، پھر ان میں توازن قائم کرتا، قبائلی احساس کو ابھارتا، مذہبی اور لسانی فرقہ واریت کو فروغ دیتا، ہر فرقے کے مخصوص نعروں کی حوصلہ افزائی کرتا اور پھر تصادم کے مقام سے پہلے ان میں توازن قائم کرتا۔

1857ء کی جدوجہد آزادی کو کچلنے کے بعد انگریز نے آزادی کے متوالوں، بالخصوص مسلمانوں پر سختیاں شروع کر دیں۔ مسلمانوں کا دہلی کی سلطنت کو نئے سرے سے زندہ کرنے کا خواب ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا اور وہ ایک سناٹے میں چلے گئے۔ انہیں اپنے آپ پر بھروسہ نہ رہا تو درخشاں ماضی میں زندہ رہنے لگے۔ وہ پرانے نظام کو دوبارہ قائم کرنے کے خواب دیکھتے اور مغربی تعلیم و تہذیب سے دور بھاگتے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر تک مسلمان بحیثیت مجموعی بالخصوص بنگال اور شمالی ہند میں نہ صرف انگریزی تعلیم سے دور تھے بلکہ انہوں نے صنعتی ترقی میں بھی کوئی حصہ نہیں لیا۔ تجارت اور ملازمتوں پر بھی ہندوؤں کا قبضہ بڑھ گیا۔ حالات بدل چکے تھے مگر مسلمان ان بدلے ہوئے حالات کو تسلیم کرنے سے انکاری تھے۔ برطانوی حکومت کی پالیسی بھی ہندوؤں کے موافق اور مسلمانوں کے خلاف تھی جس کی وجہ سے ہندوؤں کو آگے بڑھنے کا موقع ملا جس کا انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور آگے بڑھتے گئے۔

لاہور، راجکوٹ، اندور اور اجمیر جیسی جگہوں پر انڈین پرنس اور چیفس کے بچوں کے لئے یعنی لڑکوں کے لئے، انگریز نے چیفس کالج قائم کر دیے تھے۔ یہاں پر لڑکا دس گیارہ سال کی عمر میں داخل ہوتا اور 18 سے بیس سال کی عمر میں باہر نکلتا۔ اس تمام عرصے میں ان کے ذاتی ملازم، مصاحب (جو ان کے کپڑوں سے لے کر ذاتی اخراجات کا حساب کتاب رکھتا تھا)، گھوڑے اور بگیاں ان کے ساتھ رہتے۔ ایچی سن کالج لاہور ہو یا راجکمار کالج راجکوٹ یا پھر میو کالج اجمیر ان سب میں سے فارغ التحصیل ہونے والے طالب علم

نسل در نسل انگریز کے وفادار رہے اور بعد میں آج تک امریکہ کے وفادار ہیں۔ چرچ نے بھی جگہ جگہ عیسائی مشنری سکول کھول لئے۔ اچھوت اور غریب طبقات کے لوگ عیسائیت کو قبول کرنے لگے۔

ان حالات میں سرسید احمد خان نے بڑی مشکل سے مسلمانوں کو اس خول سے باہر نکالا جس میں وہ زندہ تھے۔ بدلے ہوئے حالات کے تقاضوں کو سمجھایا اور مُلّاؤں کے فتووں کے باوجود ان کے ذہن کو انگریزی تعلیم کی طرف مائل کیا۔ علی گڑھ میں 1875ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد رکھی جو علی گڑھ یونیورسٹی بنی۔ سرسید کے خیال میں ہندوستان وہ خوبصورت دوشیزہ تھی جس کی ایک آنکھ ہندو تھی اور دوسری مسلمان۔ مگر احیائے ہندومت کی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ جب متعصب ہندو رہنماؤں نے مسلمانوں کو دوبارہ سے ہندو بنانے کی تحریک چلائی، اردو زبان کی جگہ ہندی زبان کا مطالبہ کیا اور اردو ہندی زبان کا فساد کھڑا ہوا تو سرسید کو کہنا پڑا کہ ہندوستان میں دو قومیں بستی ہیں۔ مولانا حالی اپنی کتاب حیات جاوداں میں لکھتے ہیں کہ سرسید ایک روز شیکسپیئر کے ساتھ جو کہ بنارس کا کمشنر تھا مسلمانوں کے تعلیمی معاملات کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ شیکسپیئر نے پوچھا کہ آپ تمام ہندوستانیوں کے تعلیمی حالات کے بارے میں فکر مند رہتے تھے اب صرف مسلمان کیوں؟ اس پر سرسید نے کہا کہ مجھے اب یقین ہو چلا ہے کہ ہندو اور مسلمان کسی بھی معاملے میں اتفاق نہیں کر سکیں گے۔ الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، ڈاکٹر نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ دہلوی، منشی کرامت علی وغیرہ سرسید کا ساتھ دے رہے تھے۔ جبکہ سید چراغ علی اور نواب محسن الملک ان کے دست و بازو تھے۔

منافرت پر مبنی ہندو مسلم مذہبی تحریکیں

آریہ سماج تحریک

1875ء میں سوامی دایا نند اسرسوتی نے آریہ سماجی تحریک شروع کی۔ وہ خود گجرات کا رہنے والا تھا مگر اس کی تحریک نے بنگال، مدراس اور پنجاب کے ہندوؤں میں مقبولیت حاصل کی۔ یہ وہابی انداز کا ہندو تھا جو ہندومت کو ویدوں کے زمانے میں واپس لے جانا چاہتا تھا اور ویدوں کے زمانے کے بعد سے آریائی عقائد میں وقت کے ساتھ جو تبدیلیاں ہوئیں ان کو بیک قلم مسترد کرتا تھا۔ وحدت الوجود کا مرکزی تصور جو کہ ہندوستان میں تمام مذاہب کا مشترکہ نکتۂ اتحاد تھا، وہ اس کے خلاف تھا۔ آریہ سماج تحریک اس صوفی طرزِ فکر کے خلاف تحریک تھی جس نے پورے ہندوستانی معاشرے کو مذہبی ہم آہنگی اور پر امن بقائے باہمی کی بنیاد فراہم کی تھی۔ وہ انگریزوں کے بھی خلاف تھا۔ مسلمانوں کے بھی اور ہندوستانی عیسائیوں کے بھی۔ اس کی آریہ سماج نے شُدھی تحریک شروع کی جس کا مقصد مسلمانوں اور عیسائیوں کو دوبارہ سے ہندو بنانا تھا۔ اس مقصد کے لئے ہندو مشنری بھی تیار کئے گئے۔ جنہیں دوسرے ممالک میں تبلیغی جماعت کی طرز پر تبلیغ کے لئے بھیجا جاتا۔ ہندو احیا کی تحریکوں نے زور پکڑا تو بہت سے شاعر اور ادیب بھی اس راہ پر چل نکلے۔ ہندو احیا پرستی کے نزدیک مسلمان اور انگریز دونوں بیرونی حملہ آور تھے چنانچہ ہندوستان کی آزادی کا واحد مطلب اور مقصد تھا ''ہندوستان ہندوؤں کا''۔ ''بندے ماترم'' کا نعرہ بھی اسی دوران گھڑا گیا جو خالصتاً مذہبی بنیاد پر مسلمانوں کے خلاف تھا۔

وہابی تحریک

اسی طرح کی مذہبی تحریک محمد بن عبدالوہاب کے پیروکاروں نے شروع کر رکھی تھی۔ یہ لوگ مسلمانوں کو محمد بن عبدالوہاب کی تعلیمات کے مطابق دوبارہ سے مسلمان بنانے کا کام کر رہے تھے۔ یہ لوگ صوفیا اور اولیا کرام کے خلاف تھے۔ ہندوستان میں یہ کام اورنگ زیب نے شروع کیا تھا جس کو شاہ ولی اللہ نے جاری رکھا۔ اورنگ زیب کی وفات سے چار سال پہلے وہ 1703ء میں پیدا ہوئے۔ ہندوستان میں وہ اسلام جو صوفیوں اور ولیوں کے ذریعے پھیلا اور جس کی جڑیں ہندوستانی ثقافتی زمین میں تھیں شاہ ولی اللہ اس کو عربی طرز معاشرت کے تابع کرنا چاہتے تھے۔ اورنگ زیب اُن کا آئیڈل تھا۔ وہ اپنے آپ کو حضرت عمرؓ کی اولاد کہلواتے تھے اور ایک ایسا اسلام ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان دیکھنا چاہتے تھے جو خالصتاً عربی ثقافت و سیاست کا مظہر ہو۔

شاہ ولی اللہ اور محمد بن عبدالوہاب ہم مدرسہ بھی تھے۔ شاہ ولی اللہ وہابی طرز اسلام کو اسلام کی خالص روح قرار دیتے تھے۔ وہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا سبب بھی حکمرانوں کی اسلام سے دوری قرار دیتے تھے۔ جس طرح آج کل پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ پاکستان کی تمام مصیبتوں کی وجہ عوام کی سعودی طرز اسلام سے دوری ہے۔ یعنی ٹخنوں سے اونچی شلوار کا نہ پہننا، وہابی شریعت کا ملک میں نفاذ نہ کرنا وغیرہ وغیرہ پاکستان کے مسائل کی اصل وجہ ہے۔

1857ء کی جدوجہد آزادی سے پہلے بھی ایک مذہبی تحریک وہابی تحریک کے نام سے چلائی گئی تھی۔ اس کے قائد سید احمد بریلوی تھے (1786-1831ء) یو۔ پی کے شہر بریلی کے رہنے والے یہ مولوی صاحب جب 1821ء میں حج کرنے گئے اور دو سال کے بعد 1823ء میں محمد بن عبدالوہاب کی ''تعلیمات'' سے متاثر ہو کر، جہادی بن کر ہندوستان واپس لوٹے تو ان کو اپنی بھرتی کے لئے سب سے زرخیز علاقہ بنگال ملا۔ جہاں پر بنگالی مسلمان کسان، ہندو زمینداروں اور انگریزوں کے ساتھ برسرپیکار تھے۔ سید احمد

نے ان کو بھرتی کیا اور انگریزوں کے خلاف جہاد کے بجائے ان کو رنجیت سنگھ کے خلاف لڑوانا شروع کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب انگریز پورے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد پنجاب اور شمال مغربی علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتا تھا جہاں پر رنجیت سنگھ کی حکمرانی تھی۔ سید احمد نے رنجیت سنگھ کے خلاف اپنے اس ''جہاد'' کے ذریعے انگریز کی بالواسطہ مدد کی۔ ہزاروں بنگالی پشاور پہنچ گئے۔ سید احمد کا یہ جہاد بالآخر بری طرح ناکام ہوا۔ تمام جہادی مارے گئے اور وہ خود بھی بالاکوٹ کے مقام پر مارے گئے۔ ان کے پیروکاروں نے ان کو شہید کا نام دے دیا اور وہ سید احمد شہید کے نام سے مشہور ہوئے۔ اسی طرح کی ایک اور تحریک جو اپنے اندر مذہبی رنگ لئے ہوئے تھی۔ وہ ''فرائضی تحریک'' تھی۔

فرائضی تحریک، جو مذہبی رنگ لئے ہوئے تھی

بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو مالی انتظام نافذ کیا تھا اس کے نتیجے میں ہندو مسلمان تضاد میں شدت آئی تھی۔ ''بندوبست دوامی'' جو لارڈ کارنوالس نے 1793ء میں متعارف کروایا تھا اس کے ذریعے بیشتر اراضی مسلمان مالکان سے نکل کر ہندو ٹھیکیداروں کے قبضے میں چلی گئی تھیں اور مسلمان زمینداری اور ریونیو جمع کرنے کے کام سے باہر ہوتے چلے گئے تھے۔ ولیم ہنٹر لکھتا ہے کہ ''ہم نے مسلمانوں سے ان کا وہ منصب چھین لیا جس کی بدولت وہ مالیہ وصول کرتے تھے اور اصل اہل کاروں اور حکومت کے درمیان رابطہ بنے ہوئے تھے...... اس سے مسلمان خاندانوں کو بڑا دھچکا لگا۔ بندوبست دوامی میں یہ رجحان غالب تھا کہ وہ ماتحت ہندو عامل جو کسان سے براہ راست وصولی کا کام کرتے تھے باقاعدہ زمیندار بن جائیں۔'' (ولیم ہنٹر دی انڈین مسلمان صفحہ نمبر 137)

بندوبست دوامی کے نتیجے میں انگریز ہندو اشتراک بنگال میں غالب آ گیا اور نئے ہندو زمینداروں نے مسلمان کسانوں سے ساڑھے پانچ سو سال پرانے بدلے لینا شروع کئے۔ مسلمان ظلم و استحصال کے بدترین دور میں داخل ہو گئے۔ جس کے نتیجے میں مختلف تحریکوں نے جنم لیا۔ جن میں سے ایک تحریک مسلمان کسانوں کی تحریکِ فرائضی بھی

تھی۔ یہ تحریک ہندو زمینداروں اور انگریزوں کے خلاف تھی جو انیسویں صدی کے شروع میں چلی۔ اس تحریک کے علمبردار حاجی شریعت اللہ، دودو میاں اور تیتو میر تھے۔ وہ یہ پرچار کیا کرتے تھے کہ مسلمانوں نے چونکہ ہندو ورسم ورواج کو اختیار کرلیا ہے اس لئے وہ مصائب کا شکار ہیں۔ حالانکہ معاملہ سیدھا سادھا معاشی اور طبقاتی تھا۔

اس مسلح تحریک میں ہندو زمینداروں اور انگریز تاجروں کو قتل کیا گیا اور ان کی املاک لوٹی گئیں۔ ہندوؤں کے مندروں کو جلایا گیا۔ یہ تحریک 1860ء میں دودو میاں کی موت کے بعد ختم ہو گئی۔ مگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دوریاں بڑھ گئیں۔ ہندومت اور اسلام کی احیا پرستی کی لہر نے 1857ء کے مشترکہ جذبہ قوم پرستی کو نقصان پہنچایا۔ مذہبی منافرت کا جو بیج بویا گیا تھا انگریز نے اس کی آبیاری کی اور اس کی فصل کو کاٹا۔ 1905ء میں جب بنگال کو ایک انتظامی سہولت کے پیش نظر تقسیم کیا گیا اور اس سے مشرقی بنگال کی مسلم اکثریت کو فائدہ ہوا تھا تو ہندو بنگالیوں نے اس تقسیم کے خاتمہ کے لئے پرتشدد ایجی ٹیشن شروع کیا۔ اس طرح ہندو مسلم تضاد نے مضبوط جڑیں پکڑلیں اور تقسیم بنگال نے تقسیم ہندوستان کی بنیاد رکھ دی۔

1905ء کی تقسیم بنگال اور ہندو مسلم تضاد
معاملہ مذہبی نہیں، معاشی تھا

ہندوستان دو قوموں میں تقسیم کردیا گیا

تقسیم بنگال کا اعلان جولائی 1905ء میں ہوا اور اسی سال اکتوبر میں لارڈ کرزن نے بنگال کو تقسیم کردیا۔ تقسیم کا فیصلہ برطانوی پارلیمنٹ میں لائے بغیر سیکرٹری آف سٹیٹ سے منظور کروالیا گیا تھا۔ بظاہر یہ تقسیم انتظامی سہولت کے لئے کی گئی تھی مگر اس کا نتیجہ ہندو مسلم تقسیم کی شکل میں برآمد ہوا اور بعد میں انڈین نیشنل کانگرس بھی اس مسئلے پر دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئی۔ آنے والے سات سال ہندوستان میں افراتفری اور ہندو انتہا پسندی کے سال تھے۔

ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کا دارالخلافہ کلکتہ تھا جو کہ مغربی بنگال میں ہے۔ دارالخلافہ ہونے کے ناطے ہندوستان کی سیاسی و اقتصادی سرگرمیوں کا مرکز بھی کلکتہ تھا۔ 1857ء کی جدوجہد آزادی کے بعد انگریز نے مسلمانوں کو مسلسل دبایا اور ہندوؤں کو ابھارا جس کا انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ نتیجتاً بنگال کی ترقی کے مرکز کلکتہ کا زیادہ تر فائدہ ہندو تاجروں، زمینداروں اور مہاجنوں کو ہوا۔ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ وہ کسان تھے اور مغربی بنگال کے ہندو زمینداروں کے لئے کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے۔ کلکتہ کی تمام فیکٹریوں کا خام مال مشرقی بنگال کے مسلمان پیدا کرتے تھے۔ سیاسی و معاشی اعتبار سے ان کے زیر اثر تھے اور بے حد پسماندہ تھے۔ ان میں احساس محرومی بھی تھا اور

بے چینی بھی۔ جب سوامی دایانند اسرسوتی جیسے مذہبی رہنماؤں نے آریہ سماج کے ذریعے انگریزوں اور مسلمانوں کے خلاف تحریک شروع کی اور انگریزوں کو قتل کیا تو انگریز نے مسلمانوں پر توجہ کی۔

489500 مربع کلومیٹر اور 80 ملین سے زیادہ کی آبادی کے صوبۂ بنگال کو مغربی بنگال اور مشرقی بنگال میں تقسیم کردیا گیا۔ مغربی بنگال، اڑیسہ اور بہار ایک طرف تھے اور مشرقی بنگال اور آسام دوسری طرف، مشرقی بنگال کا دارالخلافہ ڈھاکہ کو بنایا گیا۔ ڈھاکہ تیزی سے معیشت کا مرکز بننے لگا۔ تعلیمی ادارے قائم ہونے لگے۔ مُلاؤں کی مخالفت کے باوجود انگریزی تعلیم کا رجحان بڑھا۔ نوکری کے مواقع بڑھے، خوشحالی آئی اور مشرقی بنگال کے عوام مغربی بنگال کے ہندو تاجروں، صنعت کاروں اور زمینداروں کے معاشی استحصال اور سیاسی تسلط سے آزاد ہوئے۔ چونکہ مسلمانوں کو اس تقسیم سے فائدہ پہنچا تھا چنانچہ وہ اس تقسیم کی حمایت میں تھے۔ جبکہ مغربی بنگال کا ہندو زمیندار اور بورژوا اس تقسیم کے خلاف تھا۔ اس نے اپنی مالی طاقت کے زور پر ہندو مذہبی انتہا پسند تنظیمیں کھڑی کر کے اور انگریزی اشیاء کے بائیکاٹ کی سودیشی تحریک چلا کر تقسیم بنگال کی زور شور کے ساتھ مخالفت شروع کر دی۔ سودیشی تحریک ان لوگوں کا بائیکاٹ بھی کرتی تھی جو بدیشی اشیاء خریدتے تھے۔

بنگال کی تقسیم کو ختم کروانے کے لئے ہندو بورژوازی کی جدوجہد

پہلے ہندو نیشنلزم، پھر بنگالی نیشنلزم

جولائی 1905ء میں تقسیم بنگال کے اعلان کے ساتھ ہی 13 رجولائی کو کلکتہ کے ہفت روزہ Sanjivani نے انگریزی اشیاء کے بائیکاٹ کا مشورہ دیا۔ اس مشورے پر بنگال کے بڑے چھوٹے شہروں، قصبوں اور دیہات میں سینکڑوں جلسے کئے گئے۔ 28 رستمبر کو دُرگا پوجا کے قومی تہوار کے دن پچاس ہزار ہندو کالی گھاٹ کے کالی کے مندر میں جمع ہوئے اور عہد کیا کہ وہ نہ تو انگریزی اشیا خریدیں گے اور نہ ہی غیر ملکیوں کو ملازمتیں دیں گے۔ ان

کے نزدیک تمام عیسائی اور مسلمان ہندوستانی باشندے بھی غیر ملکی تھے۔ 16 ر اکتوبر کو جب بنگال تقسیم کیا گیا تو ہزاروں ہندوؤں نے مقدس گنگا میں اشنان کرنے کے بعد عہد کیا کہ وہ بدیشی اشیا کا بائیکاٹ کریں گے۔ اس جلسے کی صدارت آنندا موہن بوس نے کرنی تھی مگر علیل ہونے کی وجہ سے ان کا خطبہ صدارت رابندر ناتھ ٹیگور نے پڑھ کر سنایا اور بعد میں آنندا موہن بوس کے گھر میٹنگ ہوئی۔ صرف اس ایک میٹنگ میں ستر ہزار روپے سودیشی تحریک چلانے کے لئے جمع کئے گئے۔ آنند بوس نے کانگرس کے قیام سے نو سال پہلے سریندر ناتھ بینر جی کے ساتھ مل کر 1876ء میں انڈین ایسوسی ایشن قائم کی تھی جس کے بطن سے انڈین نیشنل کانگرس نے جنم لیا تھا۔ وہ نہایت کٹر قسم کے برہما سماج کے پرچارک تھے۔ اس سودیشی تحریک میں سریندر ناتھ بینر جی اور رابندر ناتھ ٹیگور پیش پیش نظر آتے ہیں۔

یہ وہی سودیشی تحریک ہے جسے بعد میں گاندھی نے بھی جاری رکھا۔ اس تحریک کا مقصد ہندو بورژوازی کے طبقاتی مفادات کا تحفظ کرنا تھا۔ تقسیم بنگال کے خلاف اس تحریک میں جو بنگالی نیشنلزم نظر آتا ہے وہ اپنے اندر مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے خلاف مذہبی منافرت لئے ہوئے تھا۔ ہندو نیشنلزم اور بنگالی نیشنلزم کی یہ تحریکیں ہندو بورژوازی کے معاشی مفادات کو بچانے کی تحریکیں تھیں۔ وگرنہ نہ تو ہندو مت کو خطرہ تھا اور نہ ہی بنگال کو خطرہ تھا۔ خطرہ ہندو بورژوازی کو تھا۔ جس نے نہایت چالاکی سے ہندو عوام پر مذہب کی عینک چڑھا کر ان کے گلے میں بنگالی نیشنلزم کا ڈھول ڈال دیا تھا۔ یہ صورت حال انگریز حکمرانوں کی پیدا کردہ تھی اور "تقسیم کرو اور حکمرانی کرو" کے عین مطابق تھی اور ان کے حق میں تھی۔

اب تک وائسرائے ڈفرن نے A.O. Hume کے ذریعے دسمبر 1885ء میں آل انڈین نیشنل کانگرس بنوالی تھی۔ یہ جماعت انگریز کے وفادار پڑھے لکھے سرمایہ داروں کی جماعت تھی۔ اس میں مسلمان بھی تھے مگر اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ کانگرس جب قائم ہوئی تو اس کا کوئی واضح نظریہ نہیں تھا۔ یہ ایک سوشل سوسائٹی تھی جو ہر سال جمع ہو کر برطانوی راج کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتی اور ایسی قراردادیں منظور کرتی جن کا مقصد مراعات حاصل کرنا ہوتا۔ یہ کہلاتی تو آل انڈیا کانگرس تھی مگر شہری اشرافیہ کی نمائندگی کرتی تھی۔

1900ء میں جا کر یہ ایک سیاسی جماعت بنی مگر اس نے ابھی تک مسلمانوں کی اکثریت کو اپنی جانب متوجہ نہیں کیا تھا۔ متعصب ہندو تحریکوں نے مسلمانوں کو خوفزدہ کر رکھا تھا۔

کانگرس کی بنیاد رکھنے والوں میں دادا بھائی نوروجی، سر فیروز شاہ مہتا اور گوپال کرشنا گوکھلے جیسے رہنماؤں کا سماجی تعلق برطانوی حکمرانوں اور اشرافیہ کے ساتھ کافی گہرا تھا۔ دادا بھائی نوروجی پارسی تھے۔ وہ 1886ء، 1893ء اور 1906ء میں کانگرس کے صدر رہے اور پہلے ہندوستانی تھے جنہوں نے لندن کے علاقے سنٹرل فنز بری سے برطانوی پارلیمنٹ کا انتخاب، لبرل پارٹی کے ٹکٹ پر لڑا اور جیت کر پارلیمنٹ کے ممبر بنے۔ وہ 1892ء سے 1895ء تک پارلیمنٹ کے ممبر رہے۔ محمد علی جناح جو 1892ء میں لندن آ چکے تھے ان سے متاثر بھی تھے اور ان کے قریب بھی۔ محمد علی جناح پہلے ہندوستانی ہیں جو 19 سال کی عمر میں 1895ء میں لنکز ان سے بیرسٹر بنے۔ 1892ء سے 1895ء تک وہ دادا بھائی کی لندن میں معاونت کرتے رہے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد 1904ء میں انہوں نے انڈین نیشنل کانگرس میں شمولیت اختیار کر لی۔ یہ سب لوگ قانونی اور آئینی راستے کو اپناتے ہوئے تمام ہندوستانیوں کے حقوق کا تحفظ کرنا چاہتے تھے اور مذاکرات کے ذریعے اور بلا امتیاز مذہب وملت تمام ہندوستانیوں کے لئے آزادی چاہتے تھے۔

انڈین نیشنل کانگرس ایک بورژوا جماعت تھی

نیشنل انڈین کانگرس ایک بورژوا جماعت تھی اور اس کی قیادت بھی بورژوا طبقے کے پاس تھی۔ جب بنگال تقسیم ہوا تو کانگرس بھی دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ یہ دو دھڑے اعتدال پسند (Maval Matavadi) اور (Jahal Matavadi) انتہا پسند کہلائے۔ گوکھلے، دادا بھائی اور جناح کا تعلق اعتدال پسند دھڑے سے تھا۔ جبکہ بال گنگا دھر تلک، اینی بسنٹ (Annie - Basant) اور ان کے ساتھیوں نے انتہا پسندی کا راستہ اختیار کر کے بنگال میں چندرا پال بپن اور پنجاب میں لالہ لاجپت رائے کے ذریعے ہندو بنگالی نیشنلزم کی تحریک نہایت زور و شور کے ساتھ شروع کر دی جو کہ پورے

ہندوستان میں پھیلا دی گئی۔ حتیٰ کہ اس کی گونج لندن میں بھی سنائی دینے لگی۔ یہ تحریک بنگال کی تقسیم کے خلاف تھی۔

دسمبر 1905ء میں بنارس میں ہونے والے اجلاس میں 758 مندوبین نے گوکھلے کو کانگرس کا صدر منتخب کیا تو گوکھلے نے پہلی بار برطانوی سلطنت میں رہتے ہوئے ہندوستان میں سوراج یعنی خود حکمرانی Self Govt. Rule کا تصور دیا اور لیجسلیٹو کونسلوں کی اصلاح پر زور دیا۔

سیلف گورنمنٹ رول کا مطلب پرولتاریہ کی حکمرانی نہیں تھا بلکہ ہندوستانی بورژوازی کی حکمرانی اس کا مقصد تھا۔ دنیا میں سوشلزم کی آواز گونج اٹھی تھی۔ ہندوستان میں طبقاتی تضاد عوام کو سوشلزم کا راستہ دکھا سکتا تھا۔ چنانچہ طبقاتی تضاد کو مذہبی تضاد میں دبا کر ہندوستان کا بورژوازی بھی محفوظ تھا اور سلطنت برطانیہ بھی۔ بال گنگا دھر تلک اور اس کے ساتھی فرقہ واریت کی آگ بھڑکا کر اس مقصد کو حاصل کر رہے تھے۔

1905ء میں پنڈت شیام جی کرشنا ورما نے لندن میں انڈین ہوم رول سوسائٹی قائم کی۔ اس نے ہندوستانی طالب علموں کے لئے لندن میں انڈیا ہاؤس بھی قائم کیا اور ''انڈین سوشیالوجسٹ'' کے نام سے ایک رسالے کا اجرا بھی کیا۔ پنڈت شیام جی ورما اور دیگر ہندو بورژوازی ان ہندو طالب علموں کو وظیفہ دیتے تھے جو یورپ میں جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس مالی امداد کی بنیادی شرط یہ تھی کہ واپس آ کر یہ طالب علم حکومت برطانیہ کی ملازمت نہیں کریں گے بلکہ ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد کریں گے۔ تقسیم بنگال کے بعد انڈیا ہاؤس جوان طالب علموں کا ہاسٹل تھا باغیوں کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ شیام جی اور انڈیا ہاؤس کی کڑی نگرانی شروع ہوئی تو شیام جی نے انڈیا ہاؤس وی ڈی ساورکر (Vinayak Damodar Savarkar) کے حوالے کیا اور خود پیرس چلا گیا۔ ساورکر بال گنگا دھر تلک کا پیروکار تھا۔ اگرچہ شروع شروع میں سوشلزم کا حامی بھی رہا تھا۔

چونکہ اس تقسیم کا فائدہ مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو ہوا تھا اس لئے تقسیم بنگال کو ختم کروانے کی اس تحریک سے برصغیر کے مسلمان بالخصوص پنجاب کے مسلمان لاتعلق

رہے۔ پنجاب میں لالہ لاجپت رائے تقسیم بنگال کے خلاف بڑھ چڑھ کر مظاہروں میں حصہ لے رہا تھا جبکہ پنجاب کا مسلمان دانشور، مولوی، سیاست دان حتیٰ کہ علامہ اقبال سب کے سب خاموش تھے۔

16 اکتوبر 1906ء کو تقسیم بنگال کا جب ایک سال مکمل ہوا تو ہندو بورژوا تنظیموں نے جلوس نکال کر یوم سوگ منایا جبکہ مسلمانوں نے اس کا جشن سالگرہ منایا۔ مسلمانوں کے ڈھاکہ کے جلسے میں 20 ہزار، میمن سنگھ کے جلسے میں دس ہزار، فرید پور میں 6 ہزار اور سلہٹ میں ایک ہزار افراد نے شرکت کی۔ جلسوں میں تقسیم بنگال کو برقرار رکھنے اور مسلمانوں کو سیاسی، معاشی حقوق دینے کے حق میں تقریریں ہوئیں۔ 30 دسمبر 1906ء کو ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ نے وجود میں آتے ہی پہلی قرارداد تقسیم بنگال کے حق میں منظور کی۔ جبکہ کلکتہ میں کانگرس کا اجلاس ہوا جس میں تقسیم بنگال کو ختم کرنے کا مطالبہ دہرایا گیا اور سودیشی تحریک کو وسیع تر کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔

آل انڈیا مسلم لیگ نوابوں اور امراء کی جماعت تھی

1906ء میں وائسرائے لارڈ منٹو کی تحریک پر آل انڈیا مسلم لیگ بنوائی گئی۔ یہ نوابوں اور امراء کی جماعت تھی۔ 30 دسمبر 1906ء کو آل انڈیا ایجوکیشن کانفرنس میں نواب سلیم اللہ خان نے اس کے قیام کی تجویز دی اور مولانا ظفر علی، مولانا محمد علی اور حکیم اجمل خان نے تائید کی۔ سر آغا خان کو کمیٹی کا صدر بنایا گیا۔ سید حسن بلگرامی سیکرٹری مقرر ہوئے۔ نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک جائنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ چھ نائب صدور تھے اور چالیس ممبر پر مشتمل وہ کمیٹی تھی جس نے مسلم لیگ کا آئین بنا کر اسے قائم کیا۔ مسلم لیگ نے تین نکات پر اپنی جماعت کی بنیاد رکھی۔

برطانوی حکومت کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری کو استوار کرنا اور مسلمانوں کے بارے میں برطانوی حکومت میں موجود شکوک وشبہات اور غلط فہمیوں کو دور کرنا، مسلمانوں کے سیاسی حقوق کا تحفظ فراہم کرنا، دوسری کمیونٹیز کے بارے میں مسلمانوں میں موجود

تعصّبات کو دور کرنا۔ ایک سال کے بعد 29 دسمبر 1907ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا پہلا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا جس کی صدارت آدم جی پیر بھائی نے کی۔ 1908ء میں سید امیر علی نے لندن کے کیکسٹن ہال میں جلسہ کر کے مسلم لیگ کی برطانیہ میں شاخ قائم کی۔

دسمبر 1906ء سے پہلے یکم اکتوبر 1906ء کو سر سلطان محمد شاہ آغا خان کی سربراہی میں پینتیس افراد پر مشتمل ایک وفد وائسرائے لارڈ منٹو سے شملہ میں ملا تھا جس میں نواب محسن الملک، حکیم اجمل خان، سر علی امام، سر مزمل خان، سر رفیق الدین احمد، سر محمد شفیع، سر عبدالرحیم، نواب سر سلیم اللہ، جسٹس شاہ دین وغیرہ شامل تھے۔ اس ملاقات کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ قائم کی گئی تھی۔ نوابین کے اس وفد کے بارے میں محمد علی جناح نے اخبار ''گجراتی'' کے مدیر کو ایک خط لکھا جس میں یہ سوال اٹھایا کہ مسلمانوں کی نمائندگی کرنے والے اس وفد کو مسلمانوں نے اپنی نمائندگی کرنے کا نہ تو اختیار دیا ہے اور نہ ہی انہیں چنا ہے۔ ان لوگوں نے خود ہی اپنے آپ کو ہندوستانی مسلمانوں کا نمائندہ مقرر کر لیا ہے۔ محمد علی جناح کانگرس میں تھے اور ہندو مسلم اتحاد کی سیاست کر رہے تھے۔ تقسیم بنگال کے بعد قائم ہونے والی مسلم لیگ نوابوں اور سر کا خطاب رکھنے والوں کی جماعت تھی۔ جبکہ کانگرس انڈین بورژوازی کی جماعت تھی۔

بندے ماترم کے نعرے، دیسی ساخت کے بم
انگریز بھی مارے جانے لگے

تقسیم بنگال کو منسوخ کروانے کے لئے، ہندو بورژوازی کے مفادات کا تحفظ کرنے کے لئے، بال گنگا دھر تلک اور اس کے ساتھیوں نے مذہبی انتہا پسندی کا جو راستہ اختیار کیا تھا اس میں وہ افراد اور جماعتیں جو انگریز کے خلاف انقلابی سرگرمیوں کی حامی تھیں وہ شامل ہونے لگیں۔ آروبندو گھوش، اس کا بھائی بارن گھوش، بھوپندر ناتھ وغیرہ نے جو تلک کے حامیوں میں تھے، 1906ء میں جوگنتر پارٹی قائم کی جو کہ پہلے سے موجود انوشلین سمتی (Anushilan Samti) پارٹی کا انقلابی بازو بن گئی۔ ایک بنگالی ہفت

روزنہ ''جوگنتر'' بھی نکالا گیا۔ یہ پارٹی بہت تیزی کے ساتھ ہندوستان بالخصوص بنگال میں پھیلی۔ اس کی 116 شاخیں قائم ہوگئیں اور ممبران کی تعداد 8400 تک پہنچ گئی۔

مذہبی منافرت اور فرقہ واراریت کو ہوا دینے کے لئے کئی رسالے چھپنے لگے۔ انگریزی روزنامہ ''بندے ماترم'' ہزاروں کی تعداد میں تقسیم ہونے لگا۔ جلسے جلسوں میں بندے ماترم کا نعرہ مسلمانوں کو مشتعل کرنے کے لئے لگایا جانے لگا۔ ہندو مسلم فسادات ہونے لگے۔ انگریز بھی مارے جانے لگے۔ بارن گھوش اور اس کے ساتھی دیسی ساخت کے بم بناتے اور انگریز کے خلاف کاروائی کرتے۔ ہیم چندر داس کو پیرس بھیجا گیا تھا جہاں پر اس نے روسی انقلابی نکولاسفرانسکی سے جو خود فرانس میں جلاوطنی میں رہ رہا تھا بم بنانے کا گر سیکھا۔

دسمبر 1907ء کو انہوں نے اس ریل گاڑی پر حملہ کیا جس میں بنگال کا لیفٹیننٹ گورنر سر اینڈریو فریزر سفر کر رہا تھا۔ چند دن کے بعد انہوں نے ڈھاکہ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ایلن کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ 30 اپریل 1908ء کو کھودی رام بوس اور پرفولہ چکی نے چیف ریذیڈنسی ڈی۔ ایچ۔ کنگسفورڈ کو قتل کرنے کی کوشش کی جس میں دو انگریز عورتیں ماری گئیں۔ بوس پکڑا گیا اور چکی نے گرفتاری کے موقع پر خود کو گولی مار کر ہلاک کرلیا۔ کھودی رام ''بندے ماترم'' کا نعرہ لگاتا ہوا مظفر پور جیل میں پھانسی پر چڑھ گیا۔ نندالعل بینرجی جس نے بوس کو گرفتار کیا تھا اس کو بھی قتل کر دیا گیا۔ بائرن دتہ گپتا نے محکمہ پولیس کے ملازم شمس العالم کو قتل کر دیا۔ چارو بیسین نے پراسیکیوٹر آشوتوش بسواس (Ashutosh Biswas) کو عدالت کے سامنے قتل کر ڈالا۔ مقدمے کے دوران کنہیا لعل دت اور ستیان بوس نے نارے گوسیان (Nare Gosian) کو قتل کر دیا۔ جس کی مخبری کی وجہ سے یہ گرفتاریاں ہوئی تھیں۔ ان دونوں کو پھانسی دے دی گئی۔

جب گھوش فیملی کے گھر پر چھاپہ مارا گیا تو بہت سا اسلحہ، بم اور لٹریچر برآمد ہوا تھا اور آروبندو گھوش کو بھی گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کیس میں جسے علی پور سازش کیس کہا جاتا ہے لگ بھگ چونتیس افراد کو سزائیں ہوئیں۔ بارن گھوش کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ ان میں سے اکثر کو کالا پانی بھیج دیا گیا۔ 1909ء میں آروبندو گھوش معافی مانگ کر رہا ہوا اور یہ کہہ کر

سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی کہ اسے ''بھگوان'' نے حکم دیا ہے کہ فرانسیسی کالونی پانڈی چری میں ہجرت کر جائے۔ اس نے اپنی باقی زندگی وہاں پر یوگا کی تعلیم وتربیت اور مذہبی تبلیغ کرنے میں گزار دی۔

جتندرا گرفتار ہونے سے بچ گیا تھا۔ اس نے سندر بن کے جنگلوں میں پناہ لے کر باقی ساتھیوں کو جمع کر کے گوریلا کاروائیوں کو جاری رکھا۔ یہ لوگ ڈاکے ڈال کر رقم جمع کرتے اور اسلحہ خرید کر اپنی کاروائیاں جاری رکھتے۔ یہ بھی پکڑے جانے لگے۔ علی پور سازش کیس کے بعد تین کیس اور چلے جو ہورا سازش کیس، کھلنا سازش کیس اور ڈھاکہ سازش کیس کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

گنگا دھر تلک کو بھی 1908ء میں گرفتار کرلیا گیا اور چھ سال کی سزا دی گئی جو اس نے مانڈلے جیل برما میں کاٹی۔ اس سے پہلے بھی تلک کو 1897ء میں اٹھارہ ماہ کی سزا ہوئی تھی۔ جرم یہ تھا کہ اس کے اشتعال انگیز مضامین کی وجہ سے چیپ کر (Chapekar) برادرز نے 22 رجون 1897ء کو دو انگریز افسروں کو قتل کر دیا تھا۔ 1908ء میں جب تلک کو گرفتار کیا گیا تو اس کے انگریزی روزنامہ ''بندے ماترم'' اور بنگالی ہفت روزہ ''جوگنتر'' پر بھی پابندی عائد کر دی گئی۔ انوشلین پارٹی کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا اور سڑکوں پر ''بندے ماترم'' کا اشتعال انگیز نعرہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ مگر زیر زمین پمفلٹ چھپتے رہے اور تقسیم ہوتے رہے۔

انڈیا ہاؤس اور ساورکر

ادھر لندن میں 1909ء میں انڈین ہاؤس کے ممبر طالب علم مدن لعل ڈھانگرے نے سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا یعنی وزیر ہند کے اے ڈی سی، ولیم ہٹ کرزن وائلی (William Hutt Curzon Wylie) کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ گرفتار ہونے کے بعد جب اس پر مقدمہ چلا تو ڈھانگرے نے عدالت میں کہا کہ ''جس طرح جرمنی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ انگلستان پر قبضہ کرے اسی طرح تاج برطانیہ کو ہندوستان پر

قبضے کا کوئی حق نہیں۔ چنانچہ انگریزوں کا قتل ہم پر جائز ہے۔ وہ ہماری مقدس زمین کو پلید کر رہے ہیں۔'' انڈین سوشیالوجسٹ پیرس 1909ء

وائلی (Wylie) کے قتل کے بعد انڈیا ہاؤس بند کر دیا گیا۔ اکثر طالب علم جرمنی اور فرانس چلے گئے۔ دمودر ساورکر بھی پیرس میں تھا۔ اس کی تلاش جاری تھی کہ ہندوستان میں لارڈ منٹو پر بم پھینکا گیا اور ساورکر کے بھائی کو اس جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ ساورکر واپس لندن آیا۔ گرفتار ہوا اور اس کو بمبئی بھیج دیا گیا۔ اس نے فرانس کے ساحل پر بحری جہاز سے چھلانگ مار کر بھاگنے کی کوشش کی مگر پکڑا گیا۔ بمبئی میں اس پر کیس چلا اور اس کو پچاس سال قید کی سزا دی گئی۔ 1910ء میں سزا پانے والا ساورکر جب 1928ء میں معافی نامے پر دستخط کر کے رہا ہوا تو انقلابی سیاست کی جگہ ہندو مہا سبھا جیسی جماعت کی فرقہ وارانہ سیاست کرنے لگا۔

1910ء میں الہ آباد میں آل انڈیا ہندو کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس کے نتیجے میں ہندو مہا سبھا وجود میں آئی جس نے صرف ہندوؤں کے حقوق کا تحفظ کرنے کا بیڑہ اٹھا لیا۔ یہ جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کے جواب میں بنائی گئی تھی۔ ہندو مہا سبھا، مسلم لیگ کے بھی خلاف تھی اور کانگرس کے بھی۔ اس کی قیادت زیادہ تر ہندو برہمنوں کے پاس تھی۔ ہندو مہا سبھا ہندوستان کو ہندو راشٹرا (Hindu-Rashtra) یعنی ہندو قوم کی ملکیت سمجھتی تھی۔ اس کے مطابق سکھ، جین اور بدھ اصل میں ہندومت سے ہی نکلے تھے۔ جبکہ اسلام اور عیسائیت غیر ہندوستانی مذاہب تھے جو باہر سے آئے تھے اور ہندوؤں کو مسلمان اور عیسائی بنایا تھا۔ آریہ سماج کی شودھی تحریک کی طرح اس کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ اگر مسلمانوں اور عیسائیوں نے ہندوستان میں رہنا ہے تو انہیں دوبارہ ہندو بننا پڑے گا۔

ہندو مہا سبھا مغربی تہذیب اور طریقہ رہن سہن کے خلاف تھی۔ مگر انگریز حکمرانی کے خلاف کسی قسم کی تحریک نہیں چاہتی تھی۔ یہ جماعت سوشلزم اور سیکولرازم کے بھی خلاف تھی۔ ساورکر نے اپنی قید کے دوران ہندوتوا (Hindutva) کی اصلاح بھی ایجاد کی۔ یہ وہی جماعت ہے جس کے ممبر نتھورام گودسی (Nathuram Godse) نے

30 رجنوری 1948ء کو گاندھی کو تین گولیاں مار کر ہلاک کیا تھا کیونکہ گاندھی 1947ء کے فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف بیانات دے رہا تھا۔ گودسی کا ساتھ دینے والے ڈگامبر بیج (Digambar Badge)، گوپال گودسی (Gopal Godse)، نارائن آپتی (Narayan Apte)، وشنو کرکری (Vishoru Karkare) اور مدن لعل پاہوا (Madan Lal Pahwa) گاندھی کے قتل سے چند روز قبل تر ساور کر کے ساتھ تھے اور ان کو اس کا اشیر باد حاصل تھا۔ مگر ساور کر کو گاندھی قتل کیس میں تکنیکی بنیادوں پر رہائی مل گئی۔ بعد میں 1967ء کے کپور کمیشن نے یہ ثابت کر دیا کہ قتل کا منصوبہ بنانے والے ساور کر کے ساتھ تھے۔ اور ہندو مہا سبھا کے سرکردہ ممبر تھے۔ گاندھی کے اس قتل کے بعد مہا سبھا کے خلاف ملک بھر میں غم و غصہ کی لہر پھیل گئی۔ اس کے رہنما شیاما پرشاد مکر جی (Shyama Parshad Mookerjee) نے مہا سبھا سے علیحدہ ہو کر بھارتیہ جن سنگھ بنالی جو بعد میں بھارتیا جنتا پارٹی بن گئی۔ آج کل بھارت کی سیاست میں BJP بہت اہم پارٹی ہے اور حال ہی میں اس نے بھارت میں حکومت بنائی ہے۔

ہندو بورژوازی نے پورے زور شور کے ساتھ، دہشت گردی اور گوریلا کاروائیوں کے ساتھ، انگریز سے ہندوستان کو آزاد کروانے کے لئے نہیں بلکہ بنگال کی تقسیم کو ختم کروانے کے لئے جو تحریک 1905ء میں شروع کی تھی وہ 1912ء تک جاری رہی۔ ہندو مسلم فرقہ واریت میں شدت آئی اور فسادات ہوئے۔ 1909ء میں ہندو اور مسلمان جداگانہ انتخابات کے فیصلے نے بھی نفرت کی اس خلیج کو وسیع کیا۔ اُس وقت ہندوستان کے مُلّا اور علما بنگال کے مسلمانوں کے ساتھ یک جہتی دکھانے کے بجائے ترکی میں خلافت کو بچانے کے لئے زیادہ فکر مند تھے۔

عالمی جنگ کے بادل یورپ میں منڈلا رہے تھے۔ شہنشاہ جارج پنجم اور ملکہ میری نے دسمبر 1911ء میں ہندوستان کا دورہ کیا اور تقسیم بنگال کو منسوخ کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی کلکتہ کے بجائے نئی دلی کو دارالخلافہ بنا دیا گیا۔ ہندو مسلم جداگانہ انتخابات کا فیصلہ برقرار رہا۔ ہندوستان سیاسی اعتبار سے دو قوموں میں تقسیم ہو گیا۔ دلچسپ

بات یہ ہے کہ وہی ہندو بورژوا جو 1905ء میں تقسیم بنگال کے خلاف تھا، 1947ء میں بنگال کی تقسیم چاہتا تھا۔ جبکہ محمد علی جناح بنگال کی 1947ء کی تقسیم کے خلاف تھے۔ بلکہ انہوں نے تو ماؤنٹ بیٹن سے بھی یہ کہا تھا کہ کلکتہ کے بغیر مشرقی بنگال کے حصول سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا بھی اس تقسیم کے خلاف تھی۔ انگریز بھی یہ تقسیم نہیں چاہتا تھا۔ حتیٰ کہ گاندھی بھی اس تقسیم کے خلاف تھا۔ مگر ولبھ بھائی پٹیل اور نہرو اس تقسیم کے آلہ کار بنے۔ (تفصیلات کے لئے پاکستان کی سیاسی تاریخ جلد نمبر 9 از زاہد چودھری اور حسن جعفر زیدی کا مطالعہ کیجئے۔)

محمد علی جناح ہندو مسلم اتحاد کی سیاست کر رہے تھے

اب ایک طرف مسلم لیگ تھی جو مسلمانوں کے لئے انگریز سے رعایات طلب کرتی تھی اور دوسری طرف ہندو مہاسبھا جیسی ہندو تنظیمیں تھیں جو صرف ہندوؤں کے حقوق کی بات کرتی تھیں۔ محمد علی جناح کانگرس میں تھے جو ابھی تک ہندو مسلم حقوق کے تحفظ کی دعویدار تھی۔ جناح، ہندو مسلم اتحاد کی سیاست کر رہے تھے۔ آج کل پاکستان میں ترقی پسندی کا دعویٰ کرنے والے وہ دانشور جو محمد علی جناح پر الزام لگاتے ہیں کہ انگریز نے مسلم لیگ بنا کر ان کے حوالے کر دی تھی تا کہ ہندو مسلم تضاد کی بنیاد پر فرقہ وارانہ سیاست کر کے جناح ہندوستان کو تقسیم کروا سکیں یا تو تاریخ سے ناواقف ہیں یا پھر بے ایمان ہیں۔ محمد علی جناح 1904ء سے 1920ء تک کانگرس کے ممبر تھے۔ انہوں نے 1912ء میں جب مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس سے خطاب کیا تو وہ کانگرس کے ممبر تھے۔ اپریل 1913ء میں وہ اور گوکھلے کانگرس کی نمائندگی کرتے ہوئے برطانوی حکومت کے نمائندوں سے ملے تھے۔ گوکھلے نے ان کے بارے میں کہا ہے "He has true stuff in him and that freedom from all sectarian prejudice which will make him the best ambassador of Hindu- Muslim unity." Wolpert page 34-35

کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان ہونے والا 1916ء کا لکھنؤ پیکٹ بھی ان کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

ہندو بورژوا مشرقی بنگال کے مسلمان پرولتاریہ کو اپنے تابع رکھنا چاہتا تھا۔ بنگال کا مسلمان، ہندو بورژوازی سے اپنی معاشی آزادی کے حصول کی جدوجہد کر رہا تھا جبکہ اس کی یہ طبقاتی جدوجہد ہندو مسلم فرقہ وارانہ تضاد میں تبدیل کر دی گئی تھی۔ آگے چل کر ہندوؤں کا یہ جذبۂ ایمانی ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں مسلسل کارفرما نظر آتا ہے۔ ''ہندوستان ہندوؤں کا'' یہ نعرہ بلند کرنے والے اور ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کو اس رخ پر ڈالنے والے اصل میں تقسیم ہندوستان کے ذمہ دار ہیں۔ جبکہ ہندوستانی عوام کی اکثریت ایک ایسا آزاد ہندوستان چاہتی تھی جس میں وہ سب مل کر مذہب، فرقہ واریت، برادری، ذات پات اور طبقوں کے قید خانوں سے نکل کر برابری کی بنیاد پر ایک آزاد ہندوستانی قوم کا حصہ بن کر رہ سکیں۔ مگر ''سیاسی پنڈت'' اور مذہبی بازی گر ان کو ان قید خانوں میں قید رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے سیاسی، معاشی، ثقافتی حقوق اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے تھے۔ اس فرقہ وارانہ سیاست کا اظہار کانگرس میں بھی ہونے لگا تھا اور اس قدر واضح ہو گیا تھا کہ وہ محمد علی جناح جو ہندو مسلم اتحاد کی سیاست کر رہے تھے۔ جن کی وجہ سے 1916ء کا لکھنؤ پیکٹ ہوا تھا انہیں 1920ء میں کانگرس سے استعفیٰ دینا پڑا۔

یہ وہ وقت ہے جب بہت سی چھوٹی چھوٹی مسلمان جماعتیں قائم ہو چکی تھیں جن کے آپس میں بھی اختلافات تھے۔ ان کا کام اسمبلیوں اور ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے خاص رعائتیں اور تحفظات مانگنے کے علاوہ کچھ نہیں تھا اور ہندو بورژوازی مسلمانوں کو کوئی رعایت دینے کو تیار نہیں تھی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب محمد علی جناح ہندوستان کی سیاست سے علیحدگی اختیار کر کے انگلستان آ گئے۔ انہوں نے Hampstead میں گھر خریدا اور وکالت شروع کر دی۔

1930ء سے 1934ء تک وہ انگلستان رہے۔ والپرٹ (Wolpert) کا کہنا ہے کہ اگر انہیں برطانیہ میں Law Lord بنا دیا جاتا تو شاید وہ واپس ہندوستان نہ

جاتے۔ جبکہ ہیکٹر بولیتھو (Hector Bolitho) کے مطابق جناح کا مقصدِ سیاست برطانیہ کی پارلیمنٹ میں جانا نہیں تھا۔ جسونت سنگھ کا تجزیہ ٹھیک ہے کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے ہندوستان کی سیاست سے چھٹی پر چلے گئے تھے۔

واپس ہندوستان جا کر جب انہوں نے دوبارہ سیاست شروع کی تو حالات اس قدر خراب تھے اور مسلمانوں کو ایک کونے میں اس طرح لگا دیا گیا تھا کہ 1940ء میں انہیں برٹش انڈیا میں مسلمانوں کی آزاد اور خود مختار ریاستوں کا مطالبہ کرنا پڑا۔ جب 1933ء میں چودھری رحمت علی نے اپنے کتابچے ''پاکستان ڈیکلریشن'' میں لفظ پاکستان تجویز کیا تو محمد علی جناح ہندو مسلم اتحاد کی سیاست پر گامزن تھے۔ وہ برٹش انڈیا میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ چاہتے تھے۔ جبکہ کانگرس ہندوستان میں ہندوؤں کی بالادستی کے راستے پر چل رہی تھی۔ تقسیم ہند کا ذمہ دار وہ ہندو تعصب ہے جو مسلمانوں کے خلاف رہا جس نے مسلمانوں کو ایک الگ ملک حاصل کرنے پر مجبور کیا۔

بھارت کے سکولوں میں، درسی کتب میں ہندوستان کی تقسیم کا ذمہ دار محمد علی جناح کو ٹھہرا کر گاندھی، نہرو اور پٹیل کے جرائم کو چھپایا جاتا ہے۔ پہلی بار جب جسونت سنگھ نے تاریخی حقائق کو بھارتی عوام کے سامنے رکھا اور انہیں پہلی بار معلوم ہوا کہ تقسیم کے اصل ذمہ دار گاندھی، پٹیل اور نہرو تھے تو جسونت سنگھ کو بی۔ جے۔ پی سے نکال دیا گیا۔ جسونت سنگھ نہ صرف تیس سال پہلے بی۔ جے۔ پی کی بنیاد رکھنے والوں میں سے تھے بلکہ وہ بھارت کے وزیر خارجہ اور وزیر خزانہ بھی رہ چکے ہیں۔ لالہ لاجپت رائے تو بہت پہلے یہ مطالبہ کر چکے تھے کہ ہندوستان کو دو ملکوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک کا نام ہندو انڈیا اور دوسرے کا نام مسلم انڈیا۔

مارچ 1940ء کو محمد علی جناح نے ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں میں انہیں حکومت کرنے کے حق کا مطالبہ کیا تھا۔ اگرچہ 1940ء سے 1946ء تک مسلم لیگ ایک سیاسی قوت بن چکی تھی، اس کی انتخابی قوت میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا مگر کانگرس مسلم لیگ کے مطالبات پر توجہ دینے کے لئے بالکل تیار نہیں تھی۔ کانگرسی قیادت کے اقدامات اور رویے نہ صرف غیر منطقی تھے بلکہ

حکمت علمی سے بھی خالی تھے۔

قائداعظم ہندوستان کو ایک وفاق کے طور پر چلانا چاہتے تھے جبکہ کانگرس ہندوستان پر ایک یونٹ کے طور پر حکومت کرنا چاہتی تھی۔ مسلم لیگ کے قومی حق خود ارادیت کے مطالبے کو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی حمایت بھی حاصل تھی۔ 1909ء میں منٹو مارلے کی آئینی اصلاحات میں مسلمانوں کے جداگانہ انتخابات کے اصول کو تسلیم کرلیا گیا تھا مگر اب اصول سے انحراف کر کے کانگرس تقسیم چاہتی تھی۔ نہرو کو بھی جلدی تھی اور انگریز کو بھی۔

اگر نہرو کیبنٹ مشن پلان کے معاملے پر جلد بازی نہ کرتے تو ہوسکتا ہے تقسیم نہ ہوتی۔ بدقسمتی سے جو کچھ بھارت میں پڑھایا جاتا ہے۔ وہی کچھ پاکستان میں موجود انڈو امریکن لابی بھی پڑھتی ہے اور یقین کرتی ہے۔ تاریخ کی تفصیلات اور جزئیات ان کو بور کر دیتی ہیں۔ رجعت پسند تو معاملے کو اور بھی آسان کر دیتے ہیں یہ کہہ کر کہ ''علامہ اقبال نے خواب دیکھا، قائداعظم نے اس کی تعبیر کر دی'' اور اس طرح پاکستان بن گیا۔ انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ چودھری رحمت علی کے لفظ پاکستان میں مسلمانوں کا اکثریتی علاقہ بنگال تھا ہی نہیں اور علامہ کے 1930ء کے خطبہ الہ آباد میں بھی نہیں تھا جسے ان کا ''تصور پاکستان'' قرار دیا جاتا ہے۔ بنگالی مسلمانوں کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔ علامہ اقبال نے جو خواب دیکھا اس میں برصغیر کے مسلمانوں کا سب سے بڑا صوبہ غائب تھا۔

ہندوستانی مسلمانوں کا آخری قلعہ، سلطنت عثمانیہ

1857ء کی جدوجہد میں ناکامی کا ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اس جدوجہد کو جاری رکھنے کے بجائے ترکی کی سلطنت کو جہاں پر خلافت قائم تھی اپنا آخری قلعہ سمجھنا شروع کر دیا۔ بالخصوص مسلمان متوسط طبقے نے بغداد، سپین، قسطنطنیہ، وسطی ایشیا کے فاتحانہ دور میں اپنی تہذیبی بنیادوں کی تلاش شروع کر دی۔ حالانکہ ریت میں اپنی گردن چھپانے والے ان شتر مرغوں کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ دہلی کے مسلمان بادشاہوں نے کبھی بھی خلافت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ مغل بادشاہ کسی شخص کو خلیفہ نہیں مانتے تھے۔ یہ تو مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد اور انیسویں صدی کے آغاز کی بات ہے کہ جب ہندوستان کی مساجد میں خطبے کے دوران ترکی کے خلیفہ کا نام لیا جانے لگا۔ 1857ء کے بعد ہندوستان کے مسلمان ایک نفسیاتی کشمکش کا شکار تھے۔ مغلیہ سلطنت ختم ہو چکی تھی۔ وہ اپنے عہدِ رفتہ کی تسکین سلطنت عثمانیہ میں دیکھنے لگے۔ ہندوستانی وطن پرستی کی جگہ ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' کے خیالی تصور میں گم ہو گئے۔

ٹی ای لارنس اور ابن سعود کا کردار

جب پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی تو ہندوستان کے مسلمانوں میں ترکی کے ساتھ ہمدردی کی ایک حیرت انگیز لہر اٹھی۔ ترکی برطانیہ کے خلاف تھا۔ برطانیہ ترکی کو ختم کرنے کے درپے تھا حتیٰ کہ مکہ اور مدینہ جو سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھے ان پر بھی برطانیہ قبضہ کرنا چاہتا تھا جبکہ محمد بن عبدالوہاب کا پیروکار عبدالعزیز ابن سعود، لارنس آف عریبیہ کے ساتھ مل کر سلطنت عثمانیہ یعنی خلافت کے خاتمے کے لئے انگریز کی مدد کر رہا تھا۔

1914ء میں جب پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی تو برطانوی فارن آفس کا عرب بیورو اس حکمت عملی پر کام کر رہا تھا کہ عرب قبائل کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف کھڑا کر کے خلیفہ کو اندر سے شکست دی جائے۔ شریف المکہ ابھی تک ترکوں کے ساتھ تھا۔ Sir Percey Zachariahh Cox جو کہ خلیج فارس میں برطانیہ کا چیف پولیٹکل آفیسر تھا اور ہندوستان میں رہ چکا تھا اس نے نجد کے ابن سعود کے ساتھ تعلقات استوار کر کے اس کو خلافت عثمانیہ کے خلاف تیار کر لیا تھا۔ پرسی عبدالعزیز ابن سعود کا سرپرست اور سیاسی استاد تھا۔ عربوں کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ ''عرب اونٹ کی مانند ہیں انہیں نکیل ڈال کر چلانا پڑتا ہے۔'' چنانچہ ٹی ای لارنس جو کہ لارنس آف عریبیہ کے نام سے مشہور ہے اس کے ہاتھ میں ابن سعود کی نکیل کی رسی تھما دی گئی۔ اس سے پہلے ٹی ای لارنس شام، عراق، اردن اور فلسطین میں ایک سویلین فوجی جاسوس کے طور پر کام کر چکا تھا۔ وہ ہم جنس پرست تھا اور اپنی اس علت کی وجہ سے عربوں میں بے حد مقبول تھا۔

ٹی ای لارنس کو اس کام کے لئے چنا گیا کہ وہ حجاز کے عرب قبیلوں کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف تیار کرے۔ مکہ اور مدینہ بھی خلافت کے زیر اثر تھے۔ حجاز ریلوے لائن جو 820 میل لمبی تھی، مدینہ کو دمشق سے ملاتی تھی۔ ترکی فوجوں اور سامان رسد کی یہ سپلائی لائن تھی جس پر ابن سعود اور ٹی۔ای۔ لارنس مل کر حملے کرتے۔ ریلوے لائن کی پٹریاں اکھاڑتے، گوریلا کاروائیاں کرتے اور انگریز افواج کی مدد کرتے۔

آج دنیا میں دہشت گردی کے ذریعے خلافت رائج کرنے کا منصوبہ رکھنے والے سلفی/ وہابی کل اسلامی خلافت کو ختم کر رہے تھے۔ کیونکہ اسلامی خلافت کا خاتمہ اس وقت انگریز کی ضرورت تھی مگر اسلامی خلافت کو قائم کرنا آج امریکہ کی ضرورت ہے۔ تہذیبوں کے ٹکراؤ کے تصور کو جاری رکھ کر ہی سرمایہ دارانہ نظام کو بچایا جا رہا ہے۔ سامراجی ممالک کے استحصالی نظام کے خلاف دنیا بھر کے مظلوم عوام متحد ہو کر جدوجہد کرنے کی بجائے ان دہشت گردوں سے خوفزدہ ہو کر اپنے حکمرانوں کو اپنا محافظ سمجھتے رہے ہیں اور ان حکمرانوں کا لوٹ مار کا نظام اور کام چل رہا ہے۔ بادشاہتیں بھی محفوظ

اور کارپوریٹ دنیا بھی محفوظ۔ پہلے ابن سعود عالمی سامراج کے ہاتھ مضبوط کر رہا تھا اب آل سعود یہ کام کررہی ہے۔

ابن سعود۔روزویلٹ معاہدہ

پہلی عالمی جنگ ختم ہوئی تو سلطنت عثمانیہ بھی ختم ہوگئی۔ جب عرب دنیا کی بندر بانٹ کی گئی تو ابن سعود کو مکہ اور مدینہ دے دیا گیا۔ بعد میں دمام کے قریب امریکی سروے ٹیم نے تیل کے ذخیرے کی دریافت کی تو ابن سعود کی اہمیت بڑھ گئی۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران سعودی روزویلٹ معاہد ہوا۔ یالٹا کانفرنس، جو کہ سٹالن، روزویلٹ اور چرچل کے درمیان ہوئی اس کے فوراً بعد 14رفروری 1945ء کو امریکی صدر روزویلٹ مصر پہنچا جہاں پر نہر سویز میں موجود جنگی جہاز Quiency کے ڈیک پر روزویلٹ اور ابن سعود کی ملاقات ہوئی۔ ابن سعود کے ساتھ ملاقات کے لئے جہاز کے ڈیک پرٹینٹ یعنی خیمہ لگایا گیا۔ اس کی رفع حاجت کے لئے بھی کھلے آسمان تلے ریت بچھائی گئی اورڈھیلوں کا ڈھیر رکھا گیا۔

ابن سعود اسی طرح کی طرز معاشرت کا عادی تھا۔ اس ملاقات میں ان دونوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ طے پایا جس کی رو سے سعودی خاندان کی عرب، یعنی سعودی عرب پر حکمرانی کی ضمانت امریکہ نے دی اور امریکہ کو مستقل تیل کی سپلائی کی ضمانت ابن سعود نے دی۔ اس معاہدہ پر ابھی تک عمل درآمد ہورہا ہے۔ اس ملاقات میں یہ بھی طے پایا کہ فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری میں ابن سعود ان کی مدد اور معاونت کرے گا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد برطانوی سامراج کی جگہ امریکی سامراج نے لے لی تو سعودی عرب مکمل طور پر آل سعود کی تحویل میں آ کر عرب دنیا میں امریکہ کی ایک طفیلی ریاست کے طور پر کام کرنے لگا۔ دہران میں امریکی فوج کے لئے اڈہ مہیا کیا گیا۔ مشرق وسطیٰ میں امریکی مفادات کا نگہبان دوسرا ملک اسرائیل 1949ء میں معرض وجود میں آیا۔ سعودی عرب اور اسرائیل ایک مالک کی سرپرستی میں کام کرنے لگے۔ شاہ فیصل نے جب تھوڑا سا آزاد ہونا چاہا تو اس کو قتل کروادیا گیا۔

خلافت بچانے کے لئے تحریک ہجرت

1914ء میں جب عالمی جنگ شروع ہوئی اور علمائے دیوبند نے انگریزوں کی مخالفت شروع کی تو مدرسہ دیوبند کے پرنسپل مولانا محمود الحسن اور مدرسے سے وابستہ عبیداللہ سندھی نے امیر افغانستان حبیب اللہ سے ملاقات کی اور راجہ مہندر پرتاپ کے منصوبہ انقلاب میں شمولیت اختیار کی۔ مہندر پرتاپ انگریزوں کے خلاف جرمنی کی مدد سے ہندوستان میں فوجی انقلاب برپا کرنا چاہتا تھا۔ برصغیر کے علما، مُلّا، علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد وغیرہ پان اسلام ازم کی تحریک چلائے ہوئے تھے۔ وہ مسلمانوں کے فاتحانہ دور کی تہذیبی بنیادوں کو تلاش کر رہے تھے اور احیائے اسلام چاہتے تھے۔ دوسرے معنوں میں دنیا پر اسلامی غلبہ چاہتے تھے۔ ہمارے ترقی پسند دوست جب علمائے دیوبند کی انگریز مخالفت کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی انگریز مخالفت عوام کے انسانی، سیاسی، معاشی حقوق کی سربلندی کے لئے نہیں بلکہ ان کے طرز اسلام کی سربلندی کے لئے تھی، عوام کو اپنی طرز کی شریعت کے تابع کرنے کے لئے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کے مدرسے دہشت گردوں کی آماجگاہ ہیں جو واقعتاً سمجھتے ہیں کہ اپنی شریعت کے نفاذ کی راہ میں ان تمام مسلمانوں کو مار کر وہ جنت میں جائیں گے جو ان کی بنائی گئی یا بتائی گئی شریعت کو تسلیم نہیں کرتے۔

کابل میں ہندوستان کی جلاوطن حکومت قائم کی گئی

دیوبند کے ان علمانے افغانستان کے امیر حبیب اللہ کو تجویز دی کہ وہ کابل کا محاذ کھول کر انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دے۔ محمود الحسن نے جو اپنے آپ کو شیخ الہند

کہلاتے تھے ترکی اور جرمنی کے کئی چکر لگائے اور انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ کابل سے محاذ جنگ کھولا جائے۔ 1915ء میں حبیب اللہ کے محل ''باغ بابر'' میں جرمنی، ترکی اور برلن کمیٹی کے نمائندوں کی موجودگی میں ہندوستان کی جلاوطن حکومت قائم کی گئی۔ راجہ مہندر پرتاپ اس حکومت کے صدر بنے۔ مولوی برکت اللہ وزیر اعظم، دیوبند کا ایک اور مولوی بشیر وزیر جنگ، اقبال شیدائی نائب وزیر جنگ و ہندوستانی امور، عبیداللہ سندھی وزیر داخلہ و ہندوستانی امور، محمود الحسن شیخ الہند فوج کے کمانڈر ان چیف اور برلن کمیٹی کے نمائندے چمپا کارن پیلائی وزیر خارجہ۔ زار روس، چین اور جاپان نے اس حکومت کو تسلیم کر لیا۔ روس میں 1917ء کے فروری انقلاب کے موقع پر راجہ پرتاپ پیٹر گراڈ میں ٹراٹسکی سے ملے۔ اس حکومت کی حزب اللہ (خدائی فوج) کا ہیڈ کوارٹر مدینہ قرار پایا اور کابل اس کا فوجی اڈہ۔ ہندوستان کو دارالحرب قرار دے دیا گیا۔ کیونکہ کافروں کی اس سرزمین پر غیر اسلامی حکومت تھی چنانچہ دارالحرب میں رہنا حرام تھا۔ افغانستان کو دارالسلام قرار دے دیا گیا۔ برصغیر کے مسلمانوں کو کہا گیا کہ وہ دارالحرب سے دارالسلام ہجرت کر جائیں۔

تحریک ہجرت اور ایک انقلابی کی سرگزشت

ڈاکٹر اقبال شیدائی جنہیں کابل میں قائم کی گئی جلاوطن حکومت میں نائب وزیر جنگ و ہندوستانی امور مقرر کیا گیا تھا اور جنہیں کمیونسٹ سمجھا جاتا تھا، غدر پارٹی، برلن کمیٹی، کمیونسٹ پارٹی، تحریک ہجرت، تحریک خلافت کے درمیان ایک اہم رابطہ تھے۔ میں نے ایک سال تک ہفتہ وار تواتر کے ساتھ ان کی سرگزشت ہفت روزہ نصرت میں چھاپی۔ ہفتے کا ایک پورا دن میں نے ان کے لئے مخصوص کیا ہوا تھا۔ وہ میرے ساتھ یہ دن میرے دفتر میں گزارتے۔ تحریک ہجرت اور تحریک خلافت کے نہ صرف وہ چشم دید گواہ تھے بلکہ اس کا حصہ رہے تھے۔ یہ 1971ء اور 1972ء کی بات ہے۔

اکتوبر 1917ء کے انقلاب روس سے لے کر دوسری عالمی جنگ کے خاتمے تک کے بے شمار ایسے قیمتی راز ان کے ذہن میں محفوظ تھے جو انہوں نے فاش کئے اور میں

نے انہیں کاغذ پر محفوظ کیا۔ لینن، ٹراٹسکی ، ایم این رائے، افغانستان کا حبیب اللہ خان، امان اللہ خان، نادر خان، گاندھی، نہرو، قائداعظم، علامہ اقبال، لالہ لاجپت رائے، محمود الحسن، شوکت عثمانی، غرضیکہ کون نہیں تھا جس سے ان کی ملاقاتیں نہ رہی ہوں۔ کابل قیام کے بعد وہ روس پھر جرمنی، انگلینڈ اور اٹلی میں رہے اور اپنی وفات سے چند سال پہلے پاکستان لوٹ آئے۔ ان کی سرگزشت کے اہم اوراق کو کتابی شکل میں محفوظ ہو جانا چاہیے تھا۔ یہ کام ہوا یا نہیں مگر ہفت روزہ نصرت لاہور کے 1971ء اور 1972ء کے شماروں میں ان کی آپ بیتی محفوظ ہے۔

مذہبی جنونیت کے زیر اثر آج کے افغانستان اور پاکستان کے سرحدی علاقوں کے حالات کو سمجھنے کے لئے ان کی سرگزشت بہت اہم ہے۔ اس وقت یہ ''اسلامی کام'' جرمنی اور روس کر رہا تھا۔ اب امریکہ اور اس کے اتحادی کر رہے ہیں۔ اپنے جغرافیائی محل وقوع کی اہمیت کی وجہ سے یہ علاقہ ہمیشہ بڑی طاقتوں کی رسہ کشی کا شکار رہا ہے۔ اس وقت بھی یہ علاقہ مذہب، خلافت وغیرہ کے نام پر استعمال ہوا اور آج بھی ''مذہبی دہشت گردی'' کا شکار ہے۔

ڈاکٹر اقبال شیدائی بتاتے ہیں کہ ''31 ردسمبر کو خلافت کا امرتسر میں جلسہ ہوا۔ سٹیج پر گاندھی جی، موتی لعل نہرو، پنڈت مالویہ، ڈاکٹر کچلو، مولانا عبدالباری، مولانا حسرت موہانی، حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری تشریف فرما تھے۔ میں بھی علی برادران کے ساتھ سٹیج پر بیٹھا تھا۔ اس جلسے میں ستر ہزار سے زائد افراد تھے۔ مولانا محمد علی نے تقریر کے دوران جوش میں آ کر یہاں تک کہہ دیا کہ ''ہم مسلمانان ہند افغانستان کی طرف ہجرت کر جائیں گے۔ اپنا سامان، اپنی مساجد، اپنی جائیدادیں سب کچھ ہندوؤں کے حوالے کر جائیں گے اور جب فاتح ہو کر ہندوستان میں واپس آئیں گے تو ہندوؤں سے اپنا سب کچھ واپس لے لیں گے۔ مولانا کے ان الفاظ نے پنڈال میں ہلچل پیدا کر دی۔ ہر طرف سے پرزور نعروں کی آواز سنائی دے رہی تھی کہ ''ہم ہجرت کر جائیں گے۔'' اور مولانا محمد علی کا یہ حال تھا کہ وہ روتے جاتے اور تقریر کرتے جاتے۔ مسلمانوں پر تو اس تقریر کا ردعمل یہ ہوا

کہ انہوں نے خوب نعرے لگائے لیکن ان الفاظ نے ہندولیڈروں کو بری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا۔ کیونکہ ہندولیڈر ہر مسئلے کو قومی نقطہ نظر کے مطابق حل کرنے کے خواہش مند تھے۔ وہ باہر سے کسی فاتحانہ حل کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ پنڈت مالویہ اور تلک جیسے رہنماؤوں کی تو نہ جانے کب تک راتوں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔''

''پھر لاہور میں علی برادران نے خطاب کیا۔ حالانکہ علامہ اقبال کہہ چکے تھے کہ ہم ان کے جلسے کا انتظام نہیں کر سکتے۔ مگر وہ بضد تھے'' اقبال شیدائی نے جا کر اس جلسے کا بندوبست کیا جس میں ہجرت کی تحریک کا پھر سے اعلان کیا گیا جس نے پورے ہندوستان میں بالخصوص، پنجاب، سندھ اور سرحد میں لوگوں کو مضطرب کر دیا۔ اقبال شیدائی کہتے ہیں ''علی برادران خود تو چلے گئے لیکن پنجاب میں ہجرت کی آگ بھڑکا گئے۔ جدھر دیکھئے ہجرت کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ تحریک ہجرت نے برصغیر کی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کئے اور مسلم انڈیا نے اپنی سیاست کے لئے ایک نیا میدان منتخب کر لیا جس نے ہندو اور مسلمانوں میں دوریاں پیدا کر دیں۔''

ہفت روزہ نصرت لاہور شمارہ 34، 6/فروری -13/فروری 1972ء

''ہجرت کی تحریک کو امان اللہ خان کے اعلانات سے اور بھی ہوا ملی۔ یہ اعلانات مولانا عبید اللہ سندھی اور امان اللہ کے خسر محمود بیگ طرزی کے دماغوں کی ایجاد تھے۔ ان اعلانات میں کہا گیا تھا کہ افغانستان کے دروازے ہندوستانی مسلمانوں پر کھلے ہیں۔ ان اعلانات کے ذریعے افغانستان برطانیہ پر دباؤ ڈال رہا تھا'' ہجرت کے اس کھیل میں ایک اندازے کے مطابق اٹھارہ ہزار سادہ لوح ہندوستانی مسلمان جن میں سے اکثریت کا تعلق سندھ، پنجاب اور سرحدی علاقوں سے تھا اپنی زمین، جائیداد، مال مویشی، گھر بار، بیچ کر ''دارالحرب ہندوستان'' سے ''دارالسلام کابل'' کی طرف ہجرت کر گئے۔

انگریز کے خلاف کابل کا محاذ تو نہ کھل سکا البتہ برطانیہ کا دباؤ بڑھنے پر جب امیر افغانستان نے اس جلاوطن حکومت کا بستر بوریا لپیٹ دیا تو یہ ہزاروں معصوم غریب مسلمان، شمع خلافت کے پروانے اپنے جذبۂ اسلامی میں گھر سے بے گھر ہو گئے۔ ہزاروں فاقہ کشی

اور بیماری کے ہاتھوں مارے گئے۔ ڈاکٹر اقبال شیدائی بتاتے ہیں ''ہم چمرکنڈ پہنچے۔ رئیس المجاہدین مولانا عبدالکریم ہمیں دیکھ کر بہت مسرور ہوئے۔ انہوں نے بتایا کہ ہمیں بتایا گیا تھا کہ اقبال آ رہا ہے۔ ہم یہ سمجھے کہ علامہ اقبال آ رہے ہیں۔ چنانچہ انہیں لینے کے لئے ہم نے ایک گھوڑا اور دو مجاہد بھیجے تھے۔ چمرکنڈ میں مجاہدین کا کام صرف نماز پڑھنا، قرآن پاک کی تلاوت کرنا اور فارغ وقت میں جوئیں مارنا تھا۔ رئیس المجاہدین نے چھ دن کے بعد مجھے طلب کیا اور کہا کہ تھوڑی دیر ہوئی مجھے جنرل نادر خان کا پیغام ملا ہے جس سے میں تمہیں آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کہہ کر انہوں نے یہ خط مجھے دکھایا جو ظفر احسن ایبک کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ ایبک صاحب ان دنوں جنرل نادر خان کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ اس خط میں لکھا تھا کہ خدا کے لئے ہجرت بند کروائیں ورنہ افغانستان اور ہندوستان کے مسلمان تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ اگر افغانستان کوئی آئے بھی تو وہ ڈاکٹر، انجینئر یا ماہر تعلیم ہو۔ عام لوگوں کی ہجرت خطرناک ہے۔ افغانستان کی مالی و اقتصادی حالت اس قابل نہیں کہ وہ مہاجرین کی مدد کر سکیں۔ دریں اثنا افغانستان کی طرف سے یہ اعلان بالکل غلط ہے کہ افغانستان کے دروازے سب پر کھلے ہوئے ہیں۔''

ہفت روزہ نصرت شمارہ35، 13رفروری 1972ء

معاملہ ریشمی رومال کا

کابل کی یہ جلاوطن حکومت اپنے پیغامات ریشمی رومالوں کے ذریعے بھیجتی تھی۔ اس لئے اس کو ریشمی رومال تحریک بھی کہتے ہیں۔ 1916ء میں یہ رومال پکڑے گئے۔ گرفتاریاں ہوئیں، امیر افغانستان حبیب اللہ نے ساتھ نہ دیا اور تحریک اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ سر مائیکل اوڈوائر (O'Dwyer) گورنر پنجاب، جس کے حکم پر جلیانوالہ باغ میں قتل عام کیا گیا تھا اپنی یادداشتوں کی خودنوشت India As I knew It میں لکھتا ہے۔

''ریشمی رومال منصوبے کی اطلاع ہمیں اگست 1916ء میں ملی اور ہم اس قابل ہو گئے کہ آغاز میں ہی اسے کچل ڈالیں۔ اس منصوبے کی بنیاد 16-1915ء میں کابل میں

رکھی گئی۔ طے پایا کہ ایک طرف ترک اور عرب شریف مکہ کی سربراہی میں متحد ہو جائیں اور دوسری طرف افغان، سرحدی قبائل اور ہندوستانی مسلمان ایکا کرلیں اور اس طرح اسلام کی تمام طاقتیں برطانوی حکومت کے خلاف ایک نقطے پر آجائیں۔ اس لائحہ عمل کو عملی شکل دینا آسان تھا۔ وہ اس طرح کہ سرحدی قبائل ''ہندوستانی جنونیوں'' کے اکسانے پر حملہ کردیتے، ادھرانہیں ہندوستان میں باغی مسلمانوں کی عمومی حمایت مل جاتی۔ یہ بھی امید کی جارہی تھی کہ انقلاب پسند ہندو اور امریکا پلٹ سکھ بھی باہم مل کر فوراً ان کے ساتھ ہو جائیں گے۔

''سازش بڑی مہارت سے تیار کی گئی۔ پھر اس سازش کو ہندوستان، وسطی ایشیا، حجاز اور میسوپوٹیمیا میں دھکیلا گیا۔ اس پر عمل درآمد کے لئے تمام روایتی مشرقی طریقہ ہائے کار استعمال کئے گئے۔ مختلف ممالک میں ایلچی اور سفیر روانہ کیے گئے، ان کے پاس سے کوڈ ورڈز میں لکھے گئے خطوط اور پیغامات برآمد ہوئے۔ اس مرحلہ پر سارے پر اسرار معاملے کی کلید یعنی سلک لیٹرز (ریشمی خطوط) حیران کن طریقے سے میرے ہاتھ لگ گئے۔

''جو نوجوان بھاگ کر کابل گئے، ان میں سے دو ایک عمدہ مسلمان فوجی کے بیٹے تھے۔ وہ خان میرا پرانا دوست تھا۔ اس کے اصرار پر میں نے امیر (کابل) کو پیغام بھجوائے کہ ان نوجوانوں کو واپس آنے کی اجازت دے دی جائے، ان سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی اور انہیں معاف کردیا جائے گا۔ یہ طریقہ ناکام رہا۔ ان دونوں کا ایک خاندانی ملازم بھی ان کے ہمراہ کابل میں تھا۔ انہوں نے اسے اپنے باپ کے لئے ایک پیغام دے کر ہندوستان بھجوایا۔ اس ملازم کی آمد و رفت دیکھ کر بوڑھے باپ کو کچھ شک گزرا۔ جب اس کے ساتھ سختی کی گئی تو ملازم مان گیا کہ کابل سے وہ کچھ اور بھی لایا تھا۔ یہ وہی مشہور و معروف ''سلک لیٹرز'' تھے، وہ فارسی میں زرد ریشمی کپڑے پر لمبائی کے رخ لکھے گئے خطوط تھے۔ لکھنے والے کا خط اچھا تھا اور اس کپڑے کو کوٹ کی لائننگ کی اندرونی جانب سی دیا گیا تھا۔ وہ کوٹ حفاظتی نقطہ نظر سے ایک مقامی ریاست میں رکھا گیا تھا۔ خان کی دھمکیاں کارگر ثابت ہوئیں اور وہ کوٹ پیش کردیا گیا۔ خان نے وہ ''سلک لیٹرز'' کاٹ لئے، کیونکہ وہ زیادہ فارسی نہیں جانتا تھا، لہٰذا ان کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ تاہم اسے یقین تھا کہ

''سلک لیٹرز'' کچھ نہ کچھ خفیہ معانی ضرور رکھتے تھے، کمشنر نے وہ مجھے بھجوا دیا اور ساتھ یہ بھی کہلا بھیجا کہ اس کے خیال میں وہ الفاظ بالکل بے معنی اور نا قابل فہم تھے۔

''میں ابتدا میں ان کا پورا مفہوم نہ سمجھ سکا لیکن اتنا جان گیا کہ وہ کسی وسیع منصوبے کے بارے میں تھے۔ میں نے وہ سی آئی ڈی والوں کو بھجوا دیے، جہاں سر چارلس کلیولینڈ نے معمہ بہت جلد حل کر لیا۔ وہ عبید اللہ اور انصاری (مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا منصور انصاری) نام کے دو مولویوں کی طرف سے لکھے گئے تھے، جن کا تعلق دیو بند (یو پی) مکتب فکر سے تھا۔ وہ انہوں نے وہاں اور دہلی میں بیٹھ کر تبلیغ جہاد کے لئے لکھے تھے۔ 1915ء میں کابل جاتے ہوئے انہوں نے ''ہندوستانی جنونیوں'' سے بھی ملاقات کی تھی۔ وہاں ان کا پر جوش خیر مقدم کیا گیا۔ ترکی اور جرمنی کے مشن سے ان کا رابطہ ہوا۔ علاوہ ازیں ہندوستانی انقلاب پسندوں یعنی مہندرا پرتاپ اور برکت اللہ سے بھی ان کی ملاقات کرائی گئی۔ اس طرح انہوں نے اپنے رابطوں کو فعال بنا لیا، انصاری پہلے ہی عرب جا چکا تھا۔ اور واپس کابل بھی پہنچ گیا تھا۔ سلک لیٹرز پر 9؍جولائی 1916ء کی تاریخ درج تھی۔ سندھ میں ایک قابل بھروسا ایجنٹ مکتوب الیہ تھا۔ اسے تاکید کی گئی تھی کہ یا تو وہ خود لے جائے یا کسی قابل اعتماد پیغام رساں کے ہاتھ محمود الحسن (شیخ الہند) نام کے ایک مسلمان مذہبی راہ نما کے پاس پہنچا دے، جو پہلے ہی سازش کے فروغ کے لئے دیو بند سے مکہ جا چکا تھا۔ کابل اور ہندوستان میں تحریک میں ہونے والی پیش رفت، جرمن اور ترک مشنوں کی آمد، جرمن مشن کی روانگی، ہنگامی حکومت کی تشکیل اور طلبہ کی سرگرمیوں کے بارے میں تفصیلات ان خطوط کے اندر موجود تھیں۔ ایک ''خدائی لشکر'' (جند باللہ) کی تشکیل کے خدوخال بھی اس میں درج تھے۔ بتایا گیا تھا کہ تمام اسلامی حکمران متحد ہو کر برطانویوں کو نکال باہر کریں گے۔

''اس سے قبل 1916ء میں بھی ''ہنگامی حکومت'' اس حد تک چلی گئی کہ ترکستان میں روسی گورنر جنرل کے پاس ایک مشن بھجوا دیا گیا۔ مشن اپنے ہمراہ جو خط لے کر گیا اس پر مہندر پرتاپ کے دستخط تھے۔ ایک خط زار روس کو بھی بھیجا گیا، جو سونے کی ایک پلیٹ پر

کندہ تھا۔ دونوں خطوط میں لکھا گیا کہ روس برطانیہ کے ساتھ اتحاد ختم کرنے اور ہندوستان پر حملہ کرنے میں ان کے ساتھ تعاون پر غور کرے۔ روس کی شاہی حکومت نے تو مشن کو واپس لوٹا دیا لیکن 1917ء میں جب بالشویک (کمیونسٹ) برسراقتدار آئے تو انہیں یک دم اس مشن کی اہمیت کا ادراک ہوا۔ مقصد برطانیہ کی پشت میں خنجر گھونپنا تھا۔ وہ اس طرز عمل پر مستقل مزاجی اور تھوڑی بہت کامیابی کے ساتھ قائم بھی رہے۔

''اس سے پہلے بھی ہندوستانی غداروں پر مشتمل ماہر اور مشاق اسٹاف کے تعاون سے اس طرح کے خطوط اچھی اور خوبصورت اردو میں تحریر کرائے گئے تھے۔ ان خطوط کی تہیں لگا کے اور انہیں لفافوں میں ملفوف کرتے وقت انتہائی نفاست کو پیش نظر رکھا گیا۔ ان پر امپیریل چانسلر وان بالو یگ کے دستخط موجود تھے، ہندوستانی شہزادگان اور امراء و روساء کو خاص طور پر مخاطب کیا گیا تھا، ان خطوط میں ان سے وعدہ کیا گیا کہ اگر وہ برطانوی غلامی کا طوق اتار پھینکیں تو انہیں انتہائی شان دار مراعات سے نوازا جائے گا۔ لیکن وہ خطوط لے جانے والے جرمن مشن کو ہم نے شمالی ایران میں پکڑ لیا اور خطوط برآمد کر لئے۔ وہ خطوط آج بھی ''انڈین فارن آفس'' میں دلچسپ تاریخی دستاویز کے طور پر محفوظ ہیں۔ ان سازشوں سے پتا چلتا ہے کہ کابل میں ''ہنگامی حکومت'' اور ان کے اتحادیوں نے ''خدائی لشکر'' کی راہ ہموار کرنے میں کس قدر سرتوڑ کاوشیں کیں۔

''مکہ میں مقیم جس ہندوستانی مولوی (شیخ الہند مولانا محمود الحسن) کے نام ''سلک لیٹرز'' لکھے گئے، وہ حجاز میں موجود ترک جرنیل غالب پاشا کے ساتھ رابطہ کر چکا تھا، جنرل پاشا جب مصر میں ہمارا جنگی قیدی بنا تو اس نے تسلیم کیا کہ مذکورہ ہندوستانی مولوی نے اس سے برطانویوں کے خلاف ''اعلان جہاد'' پر دستخط کرائے تھے۔ ''غالب نامہ'' کے نام سے موسوم اس ''اعلان جہاد'' کی نقول ہندوستان اور سرحدی قبائل میں تقسیم کی جا چکی تھیں۔ ''سلک لیٹرز'' نے مولوی کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اس تحریک کو ایک قدم آگے بڑھائے، اس نے چاہا کہ ترک حکومت اور شریف مکہ کا فعال تعاون اسے حاصل ہو جائے، کیونکہ جب خطوط تحریر کئے گئے، اس وقت انہوں نے (شریف مکہ نے) ترکوں

کے خلاف بغاوت نہیں کی تھی۔ اسکیم کے اس حصے کا تانا بانا ذہانت سے بنا گیا تھا اور اس دور کے حالات میں اس پر عمل درآمد کسی طرح بھی ناممکن نہیں تھا۔ خط میں آگے جا کر ''خدائی لشکر'' کی تشکیل کی جو تفصیلات ملیں، وہ غیر حقیقی اور تخیلاتی تھیں۔ خط میں بتایا گیا تھا کہ مذکورہ لشکر کا صدر دفتر مدینہ میں ہوگا اور اس کا سپہ سالار وہی عظیم مولوی (شیخ الہند) ہوگا۔ قسطنطنیہ، تہران اور کابل میں علیحدہ مگر ماتحت کمانیں تجویز کی گئی تھیں، کابل کی کمان خط کے مصنف اور بڑے منصوبہ ساز عبیداللہ (مولانا سندھی) کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا گیا، خطوط میں تین سرپرستوں اور 12 فیلڈ مارشلوں کے نام بھی درج تھے، جن میں ایک شریف مکہ تھا۔ ان کے علاوہ متعدد کمانڈروں کے نام بھی موجود تھے۔ لاہور سے بھاگ کر کابل پہنچنے والے طلبہ کو بھی فراموش نہیں کیا گیا تھا، ایک کو میجر جنرل، ایک کو کرنل اور 6 کو لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے دیے گئے تھے۔ اسکیم کا یہ پورا حصہ صرف کاغذ پر موجود تھا۔ تاہم اس کے ذریعے ہمیں ہندوستان میں ان کے ہمدردوں اور بہی خواہوں کے بارے میں قابل قدر معلومات حاصل ہوگئیں اور ہم اس قابل ہوگئے کہ ان کے خلاف ضروری امتناعی اقدامات کر سکیں۔ پنجاب میں یہ اقدامات کم و بیش نصف درجن افراد کی جلاوطنی سے آگے نہ بڑھے، جو ان کے فعال ترین ترک نواز ساتھی تھے۔

''پنجاب میں مسلمانوں کی تحریکوں کا بیان مکمل ہوا چاہتا ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ یہ ہندوؤں اور سکھوں کی انقلابی تحریکوں سے یکسر مختلف تھیں، البتہ کابل میں صورت حال مختلف تھی، کیونکہ وہاں مسلمانوں کے روابط ان انقلاب پسند ہندوؤں کے ساتھ استوار تھے، جو برلن اور ہندوستان دونوں سے متاثر تھے۔ یوں سینکڑوں لوگ سازشوں میں ملوث تھے اور انہیں سزائیں بھی سنائی گئیں، ان میں سے مسلمان بمشکل ایک یا دو تھے۔

''جنگ کے دوران امیر حبیب اللہ (والئ افغانستان) نے ہمارے ساتھ اپنے معاہدے کی جو پاسداری کی، وہ ہمارے لئے بہت بڑا اثاثہ ثابت ہوئی۔ اس کے جو سردار اور حکام اسے جرمنی اور ترکی کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑا کرنا چاہتے تھے، وہ کھل کر ان کی

مخالفت نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے ایجنٹ دارالحکومت میں بھی موجود تھے، جو اعلان جہاد کر سکتے تھے اور سرحدی قبائل اور ہندوستان میں چھوٹے، مگر مضبوط مسلمان باغی طبقے کو افغانستان کے اندر بلا سکتے تھے، اس نے وقت کی ضرورت کے مطابق زمانہ سازی سے کام لیا اور مبینہ طور پر بڑی چابک دستی سے ترکی اور جرمنی کے مشنوں سے کہا کہ جس دن وہ اسے ہرات میں ایک لاکھ افراد پر مشتمل فوج دکھا دیں گے، وہ سمجھے گا کہ وہ واقعی کچھ کر گزرنا چاہتے ہیں۔ یہی مرحلہ تھا جب جرمن مایوسی اور غصے کے عالم میں کابل سے نکل گئے۔ دراصل وہ کچھ کر کے نہ دکھا سکے۔"

تحریک ہجرت ناکام ہوگئی۔ ہزاروں معصوم لوگوں کو سلطنت عثمانیہ کو بچانے اور اسلام کے احیاء کے نام پر تباہ و برباد کر کے عبیداللہ سندھی نے کابل میں سکونت اختیار کر لی اور شیخ الہند محمود الحسن سالار جنگ نے مکہ میں۔ بعد میں محمود الحسن گرفتار کر لیے گئے اور انہیں مالٹا میں قید کر دیا گیا۔ شوکت عثمانی اور برکت اللہ کے ساتھ دیگر مہاجرین تاشقند اور پھر ماسکو چلے گئے اور کیمونسٹ تحریک کا حصہ بن گئے۔

سلطنت عثمانیہ ختم ہوگئی

پہلی عالمی جنگ ختم ہوئی تو سلطنت عثمانیہ ختم ہوگئی۔ فرانس میں سیورے (S'evres) کے مقام پر ترکی کے خلیفہ اور اتحادیوں کے درمیان معاہدہ ہوا جس کی رو سے خلیفہ کو ترکی تک محدود کر دیا گیا اور تقریباً سولہ لاکھ مربع کلومیٹر پر پھیلی ہوئی سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کر دیئے گئے۔ حالانکہ برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ ترکی کو تقسیم نہیں کیا جائے گا۔ مگر اپنے اعلان سے انحراف کرتے ہوئے برطانیہ اور فرانس نے عراق، فلسطین، شام، لبنان اور مصر کو آپس میں بانٹ لیا۔ مکہ اور مدینہ پہلے تو شریف حسین آف مکہ کے سپرد کئے گئے۔ لیکن بعد میں اسے معزول کر کے ابن سعود کی تحویل میں دے دیا گیا۔ آرمینیا پر امریکہ نے قبضہ کر لیا۔ معاہدہ سیورے جرمنی کے خلاف کئے جانے والے معاہدۂ ورسائی سے بھی زیادہ شرمناک اور

تضحیک آمیز تھا جس پر شکست خوردہ ترکی کے عوام کو نہایت رنج اور غصہ تھا۔ اس سے پہلے کہ ترکی کو مزید تقسیم کیا جاتا نوجوانانِ ترک (Young Turks) نے کمال اتاترک کی قیادت میں لڑ کر ترکی کو محفوظ کیا۔ پرانے گلے سڑے نظام کی جگہ ترکی کو جمہوریت اور جدید ریاستی نظام کی راہ پر ڈالا، ملک کو مُلاّؤں سے پاک کیا اور ترک قوم اپنے قدموں پر کھڑی ہو گئی۔ جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو ہندوستان کے مُلاّ ہندوستان کو انگریز سے آزاد کروانے کے بجائے ترکی میں خلافت اور خلیفہ کو بچا رہے تھے۔ انہوں نے ترکی سے باہر بیٹھ کر ایک ایسی تحریک شروع کی جس میں ترک عوام کی مرضی بھی شامل نہیں تھی، دلچسپ بات یہ ہے کہ 1905ء سے لے کر 1912ء تک تقسیم بنگال کو ختم کروانے کی جو تحریک اور مسلح کاروائی ہندو بورژوازی اور ہندو انتہا پسند مذہبی تنظیموں نے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے خلاف جاری رکھی ان مُلاّؤں نے اس تمام عرصے میں چپ سادھے رکھی۔

سر سید احمد خان اپنی تحریروں میں اس بات پر زور دیتے رہے کہ ہندوستانیوں کو ترکی کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔ یہ وہی سلطنت عثمانیہ تھی جس نے ماضی میں انگریزوں کا ساتھ دیتے ہوئے ٹیپو سلطان کی انگریزوں کے خلاف جنگوں میں ٹیپو کی مدد کرنے سے انکار کیا تھا۔

آل انڈیا خلافت کمیٹی

علی برادران کو 1919ء میں رہا کر دیا گیا تو انہوں نے ستمبر 1919ء میں آل انڈیا خلافت کمیٹی قائم کر لی۔ اس کمیٹی کے تین مطالبات تھے۔ سلطنت عثمانیہ کو قائم رکھا جائے۔ حرمین شریفین کو ترکی حکومت کی تحویل میں رکھا جائے اور خلافت اور خلیفہ کو باقی رکھا جائے۔ علی برادران کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، حکیم اجمل خان، جان محمد جونیجو، عطاءاللہ شاہ بخاری وغیرہ شامل تھے۔

1912ء میں ہندوستان میں دو مشہور ہفت روزہ اخبارات جاری ہوئے۔ ایک ''الہلال'' اردو میں اور دوسرا ''کامریڈ'' انگریزی میں۔ یہ دونوں اخبار سلطنت عثمانیہ

کے ہمدرد تھے۔ الہلال کے ایڈیٹر ابوالکلام آزاد تھے۔ 1914ء میں حکومت نے الہلال اخبار کو بند کر دیا تو انہوں نے 'البلاغ' کے نام سے دوسرا ہفت روزہ شروع کر لیا مگر یہ بھی 1916ء میں بند کر دیا گیا اور ابوالکلام کو قید کر دیا گیا۔ ابوالکلام جو 1906ء سے مسلم لیگ میں تھے جب رہا ہو کر باہر نکلے تو کانگرس میں شامل ہو گئے۔

1916ء میں انگریزی ہفت روزہ 'کامریڈ' کی ادارت مولانا محمد علی جوہر کر رہے تھے۔ ان کے بڑے بھائی شوکت علی تھے۔ محمد علی اسلامی تعلیمات اور آکسفورڈ کی جدید تعلیم کا مرکب تھے۔ انہوں نے ترکی کے حق میں بہت پر جوش مضامین لکھے۔ ان کا مشہور مضمون ''ترکی کا انتخاب'' تھا جس کی وجہ سے اخبار بند ہو گیا اور دونوں بھائیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ قید میں رہے۔ اس دوران ان کی والدہ ''بی اماں'' نے جن کا نام عابدی بانو بیگم تھا تحریک خلافت کو جاری رکھا۔ وہ بڑے بڑے جلسوں سے برقعہ پہن کر خطاب کرتیں اور ان کے خطاب سے پہلے پورا مجمع گاتا ''بولی اماں محمد علی کی۔ جان بیٹا خلافت پہ دے دو۔'' بی اماں چھبیس برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھیں اور دونوں بچوں کی تعلیم و تربیت انہوں نے بہت محنت سے کی تھی۔ پورا خاندان بچوں کی انگریزی تعلیم یعنی کافرانہ تعلیم کے خلاف تھا مگر انہوں نے دونوں بھائیوں کو اعلیٰ مغربی تعلیم سے آراستہ کیا۔ سرکاری مُلّاؤں نے ''بی اماں'' کے خلاف یہ فتویٰ دیا کہ ان کا جلسوں سے خطاب کرنا حرام ہے۔ حالانکہ علی برادران اسلامی خلافت کو بچانے اور ''اسلام کی سربلندی'' کے لئے کام کر رہے تھے مگر ان کا کام چونکہ اس وقت انگریز کے خلاف تھا اس لئے سرکاری مُلّا ان کے خلاف تھا۔

مُلّا نے ہندوستان کی سیاست میں مرکزی مقام حاصل کر لیا

آل انڈیا خلافت کمیٹی قائم کرنے کے بعد ہندوستان میں جو خلافت بچانے کی تحریک چلائی گئی اس کا ایک خطرناک نتیجہ یہ نکلا کہ مُلّاؤں نے سیاست میں مرکزی مقام حاصل کر لیا۔ جمعیت علمائے ہند بھی خلافت کانفرنس میں 1919ء میں قائم کی گئی۔ اس سے پہلے ہندوستان میں اتنے بڑے پیمانے پر مُلّا کو یہ مقامِ سیاست کبھی حاصل نہیں ہوا

تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کی آزادی کی جدوجہد کو اسلامی بنا دیا اور تقسیم ہند کے بعد بھی مُلاّئیت بالخصوص پاکستان میں سیاست کا حصہ بن گئی۔

تحریک خلافت کا اجلاس جب ستمبر 1920ء میں ناگپور میں ہوا تو گاندھی بھی اس کی مرکزی کمیٹی کا ممبر بن گیا۔ حالانکہ محمد علی جناح نے گاندھی کو منع کیا کہ اس طرح ہندوستان میں مذہبی انتہا پسندی کی تحریک کو تقویت ملے گی۔ مگر گاندھی تازہ تازہ جنوبی افریقہ سے آیا تھا اور اپنی سیاسی دکان چمکانے کی جستجو میں تھا۔ ابوالکلام آزاد، علی برادران اور گاندھی کو تحریک خلافت سے پہلے ہندوستان کی سیاست میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ تحریک خلافت نے ان سب کو صف اول کے سیاسی رہنماؤں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ پھر خلافتی مُلاّ گاندھی کے گرد جمع ہو گئے اور اس کی ستیہ گرہ کی تحریک میں بھرپور حصہ لینے لگے۔ اس کی یہ تحریک نہ تو آئینی یا قانونی جدوجہد کا حصہ تھی اور نہ ہی مسلح جدوجہد کا۔ اس کا مقصد محض سیاسی افراتفری پھیلانا تھا۔ جبکہ مسلم لیگ اور کانگرس دونوں ہی ہندوستانیوں کے حقوق اور آزادی کے لئے قانونی جدوجہد کر رہی تھیں۔

محمد علی جوہر کو گھر میں بدھو میاں کہا جاتا تھا۔ اکبر الہ آبادی نے ان ہی کے بارے میں کہا تھا:

گو مُشتِ خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں
بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں

گاندھی خلافتی پلیٹ فارم پر جا کھڑا ہوا

خلافتی مُلاّ گاندھی کے گرد جمع ہو گئے

گاندھی خلافتی مُلاّؤں کے پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ اس کے لئے مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ اس نے علی برادران کے ساتھ پنجاب، سندھ، مدراس اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں دورے شروع کر کے خلافت کمیٹیاں قائم کرنا

شروع کر دیں۔ جلسوں میں جب ''مہاتما گاندھی کی جئے'' ''محمد علی شوکت کی جئے'' کے نعرے لگے تو اس نے انہیں سختی سے روک دیا۔ وہ انہیں تین نعرے لگانے پر زور دیتا۔ ''اللہ اکبر'' ''بندے ماترم'' اور ''ہندو۔ مسلم کی جئے۔'' بظاہر یہ ہندو مسلم یک جہتی کی بات نظر آتی ہے مگر یہ مذہبی نعرے تھے جنہوں نے ہندوستان کی سیاست میں مذہبی بنیادوں کو مزید گہرا کیا۔ 1916ء میں ہندو مسلم ہم آہنگی کا وہ مظاہرہ جو محمد علی جناح کی کوششوں سے مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان معاہدہ لکھنؤ کی شکل میں نظر آیا تھا تحریک خلافت نے اس کا گلا گھونٹ دیا۔

خلافتی مُلّا اور گاندھی زیادہ دیر ساتھ نہ چل سکے۔ ہندو مسلم تضاد نے شدت اختیار کر لی۔ 1924ء میں جب ترکی ری پبلک بن گیا تو تحریک خلافت بھی ختم ہوگئی۔ بی اماں کا بھی اسی سال انتقال ہوگیا۔ ابوالکلام آزاد جو گاندھی کو خلافت کا لیڈر اس لیے ماننے کو تیار نہیں تھا کہ وہ کافر ہے، کانگرس میں گاندھی کے ساتھ جا بیٹھا۔ شوکت علی جس نے قائداعظم پر جسمانی حملہ کرنے کی کوشش کی تھی، اپنے بھائی محمد علی کے ساتھ مسلم لیگ میں شامل ہو گیا۔ حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ کانگرس میں چلے گئے۔ عطاء اللہ شاہ بخاری نے مجلس احرار اسلام بنا کر محمد علی جناح کی مخالفت شروع کر دی۔

ترکی کی خلافت اور اس کا خلیفہ جس کے بہتر شہزادے، شہزادیاں اور سترہ بیویاں تھیں نہ بچ سکے مگر ہندوستان کے مسلمانوں کو مذہبی انتہا پسندی کے اندھیروں میں دھکیل دیا گیا۔ وہ ایک بار پھر 1857ء کے بعد کے احساس شکست خوردگی میں مبتلا ہو گئے۔ ہندوستانی عوام کی سیاست اسلامی اور ہندو مذہب پرستی میں تقسیم ہوگئی۔

ریلوے سٹیشنوں پر ہندو پانی اور مسلم پانی کے الگ الگ گھڑے رکھ دیے گئے۔ اب مذہب کے نام پر ہندوستان میں فسادات کروانے آسان تھے۔ مسجد میں سُور کا سر رکھ دیا جاتا یا مندر میں گائے کا گوشت اور پورا شہر ہندو مسلم فسادات کی لپیٹ میں آ جاتا۔ طبقاتی جدوجہد اور ہندوستانی قوم پرستی پر مذہبی منافرت غالب آ گئی۔ انگریز کبھی ہندو کا ساتھ دیتا اور کبھی مسلمانوں کا۔ گاندھی نے خلافت کو چھوڑ کر پہلے کانگرس کی پالیسی پر قبضہ کر

لیا پھر کانگرس پر، اور کانگرس بتدریج ہندوؤں کے مفادات کی نگہبان جماعت بن گئی۔

مسلمانوں کو یہ اندازہ ہونے لگا کہ ہندو اکثریت ریاست میں ان کے حقوق محفوظ نہیں ہوں گے اور جب کانگرس نے کئی سیاسی پینترے بدلے تو ان کا اندازہ یقین میں بدل گیا۔ ہندو سرمایہ دار اور ساہوکار مسلمانوں کی اقلیت کو کسی بھی طرح کی سیاسی و اقتصادی رعایت دینے کو تیار نہیں تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب علامہ اقبال اور دیگر مسلمان اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمان اور ہندو کبھی بھی ایک ساتھ نہیں رہ سکیں گے۔

مذہبی ٹکراؤ، چرخہ کاتنے، کھدر پہننے اور عدم تعاون جیسی ٹھنڈی سیاست انگریز حکمرانوں کے حق میں تھی۔ کیونکہ دنیا بھر میں قومی آزادی کی تحریکیں جنم لے رہی تھیں۔ مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار کیا جا رہا تھا۔ اکتوبر 1917ء کے انقلاب روس کی روشنی دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی پھیل رہی تھی۔ دنیا بادشاہت سے، سلاطین سے نکل کر جاگیرداری نظام کا خاتمہ کر کے، سرمایہ داری کا راستہ اختیار کرنے کے بعد سوشلزم کا انقلاب برپا کر رہی تھی جب کہ ہندوستان کے علی برادران اور ابوالکلام آزاد جیسے رہنما خلافت کے نام پر ایک زوال پذیر دقیانوسی سلطنت کو بچانے کی فکر میں تھے۔

یہ غالباً 1975ء کی بات ہے کہ ایک شام میں جوش ملیح آبادی کے ساتھ تھا جو ان دنوں سٹیلائٹ ٹاؤن راولپنڈی میں اپنی نواسیوں کے پاس رہتے تھے کہ علی برادران پر گفتگو چل نکلی۔ انہوں نے کہا ”علی برادران کے پاس سب کچھ تھا صرف عقل کی کمی تھی۔“

موہن داس کرم چند گاندھی کون تھا اور ہندوستان کیوں لایا گیا؟

گاندھی ہندوستانی مرکنٹائل طبقے کا نمائندہ تھا۔ گوکھلے نے 1912ء میں جنوبی افریقہ (South Africa) جا کر گاندھی کو ہندوستان کی سیاست کے لئے تیار کیا تھا۔ اس وقت تک گاندھی نے جنوبی افریقہ میں بوئر کی جنگوں (Boer Wars) میں انگریزوں کی مدد کر کے، ان کی فوج میں شامل ہو کر، ان جنگوں میں حصہ لے کر انگریزوں کی توجہ حاصل کر لی تھی۔

سلطنت برطانیہ ایک عرصے سے ولندیزی آباد کاروں اور زولو قبائل (Zulus) کی دو ریاستوں ٹرانسوال ری پبلک (Transvaal Republic) اور Orange Free State پر نظریں لگائے ہوئے تھی۔ ٹرانسوال میں سونے کے ذخائر تھے اور اورنج فری سٹیٹ میں ہیرے کی کانیں تھیں۔ ولندیزی آباد کاروں اور زولو قبائل نے اپنی آزادی کی یہ جنگیں انگریز کے خلاف بہت بہادری سے لڑیں۔ Afrikans یا Boer کی دوسری جنگ اگست 1899ء سے مئی 1902ء تک لڑی گئی جس میں انگریزوں نے فتح حاصل کی اور ان دونوں ریاستوں کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ اس جنگ میں ہٹلر کے مرگ انبوہ (Holocaust) کی طرح انگریز نے بیگار کیمپ (Concentration Camps) بنائے جن میں عورتوں اور بچوں کو اذیت دے کر اور بھوکا رکھ کر مارا گیا۔ ان کی اپنی رپورٹ کے مطابق ان عورتوں اور بچوں کی تعداد تقریباً 28ہزار بتائی جاتی ہے۔ جبکہ کالے افریکان مردوں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے،

جنہیں قتل کیا گیا۔ یہ دونوں ریاستیں یونین آف ساؤتھ افریقہ (Union of South Africa) کا حصہ بن کر سلطنت برطانیہ کے ڈومین میں آگئیں۔ جنوبی افریقہ کے ان معدنی ذخائر پر اور عوام پر، سفید فاموں کا قبضہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ وہاں کے لوگوں نے نیلسن منڈیلا کی قیادت میں جدوجہد کر کے مکمل آزادی حاصل نہیں کر لی۔

چونکہ ہندو بورژوازی کا مفاد انگریز کے ساتھ وابستہ تھا چنانچہ انہوں نے بوئر کی جنگوں (Boer Wars) میں انگریز کا ساتھ دیا اور گاندھی نے 1899ء میں فوج میں بھرتی ہو کر کالوں کے خلاف محاذ جنگ پر انگریزوں کا ساتھ دیا۔ جب بیگار کیمپوں (Concentration Camps) میں عورتوں اور بچوں کو مارا جا رہا تھا اور کالوں کا قتل عام ہو رہا تھا تو گاندھی انگریز کے ساتھ تھا۔ گاندھی کو اس کی خدمات کے عوض زولو میڈل، بوئر میڈل اور گولڈن میڈل آف قیصر ہند سے نوازا گیا تھا۔

اس کا ٹرین سے اتارے جانے کا واقعہ جس کا اکثر چرچا ہوتا ہے 1893ء کا ہے۔ اس کے بعد اس نے اپنی خدمات انگریز کے حوالے کر دی تھیں۔ 1903ء میں اس نے جوہانسبرگ میں وکالت شروع کر دی اور ٹرانسوال سپریم کورٹ نے اس کو اٹارنی کا اجازت نامہ جاری کیا۔ جنگ کے بعد وہ ہندو بورژوا جو ٹرانسوال کی سونے کی کانوں پر نظریں جمائے بیٹھا تھا اور توقع کر رہا تھا کہ انگریز جنگ میں اس طبقے کی خدمات کے عوض اسے مراعات عنایت فرمائے گا، اس وقت بہت ناراض ہوا جب انگریزوں نے کسی بھی انڈین کا ٹرانسوال میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا۔ انگریز بلا شرکت غیرے سونے کے ان ذخائر کو اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا تھا۔ حالانکہ گاندھی نے اس بورژوازی کے نمائندے کے طور پر محاذ جنگ پر انگریز کے شانہ بشانہ لڑائی بھی لڑی تھی مگر وہ ہندو بورژوازی کے مفادات کو نہیں بچا سکا۔

چنانچہ 1906ء میں اس نے جنوبی افریقہ میں احتجاج شروع کیا اور اس کو ستیہ گرہ کا نام دیا۔ یعنی عدم تعاون کا ایسا احتجاج جس میں تشدد شامل نہ ہو۔ جس دن اس نے اس بارے میں جلسہ کیا تو تین ہزار ہندو کاروباری حضرات اس کے ممبر بن گئے۔ گاندھی اور تین ہزار کاروباری قطعاً اس قابل نہیں تھے کہ مسلح جدوجہد یا پرتشدد احتجاج کر سکتے۔ چنانچہ

ستیہ گرہ کا راستہ ہی وہ راستہ تھا جسے وہ اختیار کر سکتے تھے۔ ستیہ گرہ کا معاملہ 1906ء میں شروع ہوا مگر 1907ء میں انگریز نے آرڈی نینس نافذ کر کے ہندوستانیوں کے ٹرانسوال میں داخلے پر مکمل پابندی لگا کر گاندھی کو جیل بھیج دیا۔ گاندھی نے رہا ہو کر احتجاجاً مغربی لباس ترک کر دیا اور لنگوٹی باندھ لی، پھل کھانے لگا اور بکری کا دودھ پینے لگا۔

گاندھی نے احیائے ہندوازم کو فروغ دیا

گوکھلے جو کہ گاندھی کا سیاسی سرپرست تھا، 1912ء میں جنوبی افریقہ گیا اور گاندھی کو ہندوستان کی سیاست کے لئے تیار کیا۔ 1915ء میں گاندھی ہندوستان آیا تو اس نے ہندو ثقافت کو اپنی سیاست کی بنیاد بنایا۔ اس کے نظریۂ ستیہ گرہ کی بنیاد ہندوازم پر تھی۔ اس کے فلسفے کی زبان گیتا کی زبان تھی۔ وہ ہندوستان کی آزادی کو رام راج سے تشبیہ دیتا تھا اور جدوجہد کو دھرما یودھ (ہندوؤں کی مذہبی جنگیں) سے تعبیر کرتا تھا۔ وہ سیکولرازم کے خلاف تھا۔ حکومت میں سب کو برابر کا حق نہیں دیتا تھا بلکہ اکثریت یعنی ہندوؤں کو تلقین کرتا تھا کہ اقلیت کے لئے نرم گوشہ رکھے اور بھائی چارے کا پرچار کرتا تھا مگر حکمرانی کا حق اکثریت کا تھا، یعنی ہندوستان ہندوؤں کا۔

ان تمام وجوہات کی بنا پر وہ ہندوستان کے مسلمانوں میں مقبولیت نہیں حاصل کر سکا۔ بلکہ اچھوتوں کے دلتِ رہنما بی آر امبیدکر اس کو ذات پات کے نظام کا محافظ سمجھتے تھے جس نے محنت کش اچھوتوں کی ترقی کی راہ میں کانٹے بچھائے۔ رجنی پالمے دت کے مطابق گاندھی عوامی سوشلسٹ انقلاب کی راہ میں رکاوٹ تھا اور بورژوازی کا نمائندہ تھا۔ بلکہ جیوڈتھ براؤن کی Yale یونیورسٹی سے 1990ء میں شائع ہونے والی کتاب M.Gandhi Prisoner of Hope سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کی سیاست میں انگریزوں کا ایجنٹ تھا۔

جب گاندھی نے جس کا پورا نام موہن داس کرم چند گاندھی تھا ہندوستان کی سیاست میں قدم رکھا تو گوکھلے، نوروجی، محمد علی جناح، فیروز مہتا، موتی لعل نہرو، بال گنگا دھر

تلک، اینی بسنٹ وغیرہ ہندوستان کی سیاست پر چھائے ہوئے تھے۔ اور 1912ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ کے بعد کانگرس جو اس مسئلے پر 1907ء میں تقسیم ہو گئی تھی، ایک بار پھر متحد ہو چکی تھی۔ سلطنت برطانیہ نے 1914ء میں عالمی جنگ کے شروع ہوتے ہی ہندوستان کے سیاسی قیدیوں کو عام معافی دے دی۔ جس کے نتیجے میں بال گنگا دھر تلک وغیرہ مانڈلے جیل برما سے رہا ہو کر دوبارہ کانگرس میں شامل ہو گئے۔ بلکہ تلک نے تو شہنشاہ برطانیہ کو خط لکھ کر اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے بعد اپنی خدمات پیش کر دیں اور جنگ میں انگریز کی مدد کے لئے ہندوستانی فوجی بھرتی کرنا شروع کر دیے۔ اس جنگ میں گاندھی سمیت ہندوستان کی تمام بورژوازی تاج برطانیہ کے ساتھ تھی۔

1916ء میں اینی بسنٹ اور محمد علی جناح نے آل انڈیا ہوم رول لیگ قائم کر کے ہندوستان میں خود حکمرانی کی تحریک چلائی ہوئی تھی جس میں تلک بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ لیگ کا مطالبہ تھا کہ جس طرح سلطنت برطانیہ میں رہتے ہوئے جنوبی افریقہ، نیوزی لینڈ، کینیڈا اور آسٹریلیا کے عوام کو حق خود حکمرانی ہے، اسی طرز پر ہندوستان میں بھی حق خود حکمرانی دیا جائے۔ آئرلینڈ کو بھی 1920ء میں ہوم رول کا اختیار دیا گیا۔ محمد علی جناح نے جو 1923ء میں بمبئی سے مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر بنے، اپنی اس مکمل خود حکمرانی کی قانونی جدوجہد کو جاری رکھا۔ ونسٹن چرچل اس تصور کے خلاف تھا۔

محمد علی جناح کے مطابق ''یہ گاندھی ہی تھا جس نے کانگرس کے نصب العین کو تباہ کیا تھا۔ صرف اس شخص نے کانگرس کو ہندوازم کے احیا کے لئے آلہ کار بنایا تھا۔ اس کا نصب العین ملک میں ہندو مذہب کا احیا اور ہندو راج کا قیام تھا اور وہ اس کے لئے کانگرس کو استعمال کر رہا تھا...... اس نے 12 مئی 1920ء کو لکھا تھا کہ ''میرے نزدیک مذہب کے سوا کوئی سیاست نہیں ہے۔ سیاست کا مقصد مذہب کی خدمت کرنا ہے۔ میں نے بطور سیاست دان کبھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ اگر میں سیاست میں حصہ لیتا ہوں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ سیاست ایک سانپ کی طرح ہم سے لپٹی ہوئی ہے۔ ہم جتنی کوشش کریں اس کے شکنجے سے باہر نہیں جا سکتے۔ میں اس سانپ سے لڑنے کے لئے سیاست میں مذہب کو شامل

کر کے اپنے ساتھ اور اپنے دوستوں کے ساتھ تجربات کرتا ہوں......اور پھر اس نے ناگپور سیشن میں کانگرس پر پوری طرح غلبہ حاصل کرنے کے لئے 12را کتوبر 1921ء کو یہ لکھا کہ ''میں اپنے آپ کو سناتنی (قدامت پسند) ہندو کہتا ہوں کیونکہ اول تو میں ویدوں، اپنیشدوں، پوراناؤں اور ہندوؤں کے سارے اشلوکوں پر عقیدہ رکھتا ہوں اور اسی بنا پر اوتاروں اور آواگون کو بھی مانتا ہوں۔ دوئم میں ورتا شرما دھرما (ذات پات کے قوانین) کو اسی طرح مانتا ہوں جیسا کہ ویدوں میں لکھا ہے۔ سوئم میں گئور کھشا کو اپنے دھرم کا ایک جزو سمجھتا ہوں اور چہارم بت پرستی کے خلاف نہیں ہوں۔''

Some recent speeches and writings of Mr. Jinnah collected and edited by Jamil-ud-din Ahmad, Sh. Mohammad Ashraf Lahore, 1943, PP.70-71, 458-459

موپلہ کی بغاوت

مالابار اور مدراس کی پریذیڈنسی میں انگریز کے خلاف اور برہمن زمیندار مالکان کے خلاف کسانوں کی مسلح جدوجہد جاری تھی۔ اس میں ''خلافتی'' مجاہدین بھی شامل ہو گئے۔ یہ وہ جہادی تھے جو نہ تو کابل جا سکے تھے اور نہ ہی ترکی پہنچ سکے تھے۔ موپلہ کی اس تحریک میں شامل ہو کر یہ ہندوؤں پر چڑھ دوڑے۔ 1921ء کی اس موپلہ بغاوت کو جسے Moplah Rebellion کہا جاتا ہے انگریز نے سختی سے کچلا۔ اس میں دس ہزار انسانوں کی جانیں گئیں۔ ایک لاکھ سے زائد افراد زخمی ہوئے۔ 50 ہزار گرفتار ہوئے جن میں سے 20 ہزار کو سزائیں دے کر کالا پانی بھیجا گیا۔ دس ہزار آج تک لاپتہ ہیں۔ جن 20 ہزار پر مقدمہ چلایا گیا ان میں 678 کے خلاف اس بنیاد پر مقدمہ چلایا گیا کہ انہوں نے 2500 ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنایا تھا۔ چنانچہ وہ تحریک جو خالصتاً طبقاتی تھی، انگریز راج کے خلاف تھی، زمینداروں کے ظلم کے خلاف تھی، ان 678 خلافتی ''جذبہ جہاد سے سرشاروں'' کی وجہ سے اس کو مذہبی انتہاپسندی کی تحریک قرار دے دیا گیا۔ چند سال پیشتر تک یہی کچھ لکھا جاتا رہا تا آنکہ

کیرالہ کی حکومت نے حال ہی میں تحقیقات کی بنیاد پر اس کو طبقاتی جدوجہد کا نام دیا ہے۔

چوری چورا کا واقعہ

5رفروری 1922ء کو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے گاندھی کی سیاست اور اس کی عدم تعاون سیتہ گرہ کی تحریک کو بے نقاب کر دیا۔ یوپی کے ضلع گورکھپور میں چوری چورا کے مقام پر کسانوں کی جدوجہد کو کچلنے کا پولیس آپریشن ہوا جس میں بہت سے افراد مارے گئے۔ جلوس کے شرکاء نے جواباً پولیس کا گھیراؤ کر کے پولیس سٹیشن کو آگ لگا دی جن میں تقریباً 23 سپاہی مارے گئے۔ اس واقعہ کے فوراً بعد گاندھی نے انگریز کے خلاف اپنی ستیہ گرہ کی تحریک کو ختم کرنے کا اعلان کر کے پانچ دن کا مرن برت رکھ لیا۔ پھر وہ تحریک خلافت سے بھی علیحدہ ہو گیا۔ ابوالکلام آزاد جیسے خلافتی مُلّا اس کے گرویدہ ہو گئے حالانکہ گاندھی نے ینگ انڈیا جون 1921ء کے شمارے میں اپنے ایک مضمون ''کھلا دروازہ'' میں واضح طور پر اعلان کیا تھا کہ ''میں چاہتا ہوں کہ میرے گھر کے دروازے ہر ملک کی تہذیب کے لئے کھلے ہوں۔ لیکن میں کسی بھی اثر یا دباؤ میں آ کر اپنی تہذیب (یعنی ہندو تہذیب) کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں اپنے گھر میں گستاخ قوم یا مذہب کو برداشت نہیں کر سکتا۔'' گستاخ قوم اور مذہب سے مراد تھی باہر سے آنے والے انگریز اور مسلمان، عیسائیت اور اسلام۔ وہ خلافتی مُلّا جو اسلامی سلطنت کو بچانے کے لئے بے چین تھے نہ صرف گاندھی کے اس نظریاتی بیان پر خاموش رہے بلکہ اس کی تحریک ستیہ گرہ میں اس کے ساتھ تھے۔ تحریک خلافت سے علیحدگی اختیار کر کے گاندھی اب کانگرس کی قیادت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کانگرس میں احیائے ہندوازم کو فروغ دینا شروع کیا۔

ایک طرف اسلام اور ہندومت کے مذہبی احیا کی تحریکیں تھیں اور دوسری طرف ہندوستان میں مسلح جدوجہد منظم ہو رہی تھی جو سیکولر بھی تھی، قوم پرست بھی اور اپنے نظریے میں سوشلسٹ بھی۔ کینیڈا اور امریکہ میں 1913ء میں قائم ہونے والی سیکولر اور سوشلسٹ غدر پارٹی اپنی صفیں مضبوط کر رہی تھی۔ 1920ء میں تاشقند میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا

کی بنیاد ڈال دی گئی تھی جس میں مولوی برکت اللہ اور شوکت عثمانی جیسے تحریک ہجرت کے رہنما مشرف بہ کمیونزم ہو کر پیش پیش تھے۔ اس ساری فضا کو جو ہندوستان کی مکمل سیاسی ومعاشی آزادی کے لئے ہموار ہو رہی تھی، انگریز کے خلاف لڑ کر آزادی حاصل کرنے اور سوشلسٹ انقلاب برپا کرنے لئے تیار ہو رہی تھی، گاندھی مذہبی منافرت، چرخہ کاتنے اور مرن برت رکھنے جیسے ٹھنڈے راستے پر ڈال رہا تھا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب مہتا اور گوکھلے کی وفات کے بعد محمد علی جناح کانگرس میں تنہا ہو گئے تھے۔ نوروجی بھی لندن میں تھے۔ 1917ء میں وہ انتقال کر گئے۔ 1920ء میں جب کانگرس کا اجلاس ہوا اور کانگرس نے محمد علی جناح کے مقابلے میں گاندھی کا ساتھ دیا تو انہوں نے کانگرس سے استعفیٰ دے دیا مگر آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل رہے۔ جناح 1913ء میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔ مہتا، گوکھلے، نوروجی اور محمد علی جناح کی کانگرس میں غیر موجودگی کی وجہ سے گاندھی کو کانگرس میں پھلنے پھولنے کا موقع ملا اور بالآخر وہ 1924ء میں کانگرس کا صدر بن گیا۔ کانگرس پر مذہبی رنگ چڑھ چکا تھا۔ وہ خالصتاً ہندوؤں کے مفادات کا تحفظ کرنے والی جماعت بن گئی اور مسلمانوں سمیت تمام اقلیتوں کو یہ یقین ہونے لگا کہ ان کے مفادات کا تحفظ اب کانگرس میں ممکن نہیں۔ احیائے ہندومت واحیائے اسلام کی تحریکوں نے ہندوستان کی سیاست میں اپنا رنگ دکھایا۔ اب ایک طرف ہندو مسلم مذہبی انتہا پسندی کی سیاست تھی تو دوسری طرف مذہبی جنونیت سے بالاتر ہو کر محمد علی جناح جیسے سیکولر رہنماؤں کی آئینی وقانونی جدوجہد تھی جو سب ہندوستانیوں کے لئے تھی۔ اس کے علاوہ انقلابی مسلح جدوجہد تھی جو سیکولر تھی۔ سوشلزم کے لئے تھی اور ہندوستان کے تمام عوام کی سیاسی ومعاشی آزادی کی جدوجہد تھی۔

آئینی اور قانونی جدوجہد کی تفصیلات زاہد چودھری اور حسن جعفر زیدی کی بارہ جلدوں پر مشتمل ''پاکستان کی سیاسی تاریخ'' میں موجود ہیں۔ ہم یہاں پر ان انقلابی مسلح تحریکوں کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں جن کو فراموش کر دیا گیا ہے مگر جن کی وجہ سے کانگرس اور مسلم لیگ جیسی اصلاح پسند جماعتوں کی آئینی وقانونی جدوجہد آگے بڑھ سکی۔

انگریز کے خلاف مسلح انقلابی جدوجہد
انڈین نیشنلزم کا ایک بار پھر فروغ

وہ مسلح جدوجہد جو ہندو بورژوازی نے 1905ء کی تقسیم بنگال کی وجہ سے شروع کی تھی اور اپنے اندر ہندو قوم پرستی کا رنگ لئے ہوئے تھی جب 1912ء میں تقسیم بنگال کے فیصلے کو منسوخ کر دیا گیا تو یہ جدوجہد بھی ختم ہو گئی۔ 1912ء میں جوگنتر (JUGANTAR) پارٹی کے راش بہاری بوس نے اس وقت کے وائسرائے آف انڈیا چارلس ہارڈنگ (CHARLES HARDING) کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جو پکڑا گیا۔ اسے دہلی لاہور سازش کیس کہا جاتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد بنگال میں اور پنجاب میں بہت پکڑ دھکڑ ہوئی۔ سزائیں اور پھانسیاں ہوئیں اور ایسا لگا کہ انگریز کے خلاف مسلح جدوجہد بظاہر ختم ہو گئی ہے۔ مگر عالمی جنگ کی جب 1914ء میں ابتدا ہوئی تو انقلابی جدوجہد پھر سے شروع ہوئی جس کی بنیاد مذہب پرستی نہیں بلکہ ہندوستانی قوم پرستی تھی۔ 1913ء میں غدر پارٹی قائم ہوئی اور 1915ء میں برلن کمیٹی جنہوں نے آگے چل کر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اور آزاد ہند فوج کی عمارت کو بنیاد فراہم کی۔ مسلح جدوجہد کرنے والے افراد، گروہ اور پارٹیاں اس عالمی جنگ کے موقع کو غنیمت سمجھ کر جرمنی کا ساتھ دے کر انگریز کو مار بھگانا چاہتی تھی۔

غدر پارٹی۔ ایک سیکولر، سوشلسٹ پارٹی

سیاسی و معاشی مشکلات کی وجہ سے انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں ہندوستان سے لوگ ہجرت کر کے دیگر ممالک میں جانے لگے۔ پنجاب، مہاراشٹرا اور آندھرا

پردیش سے امریکہ اور کینیڈا میں نقل مکانی ہوئی۔ حکومتِ کینیڈا نے جنوبی ایشیا سے آنے والوں پر پابندیاں عائد کرنا شروع کیں تو لوگ امریکہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ ان مہاجرین کی اکثریت کا تعلق پنجاب سے تھا۔ انہوں نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے PACIFIC COAST HINDUSTAN ASSOCIATION قائم کی جو غدر پارٹی کی بنیاد بنی۔

انگریز نے 1857ء کی جنگ آزادی کو ''غدر'' کا نام دے کر ہندوستانیوں کے ولولۂ آزادی کی تضحیک کی تھی۔ اس پس منظر اور جذبۂ انتقام میں پارٹی کا نام ''غدر پارٹی'' رکھا گیا۔ اب ایک اور ''غدر'' کی ضرورت تھی۔ امریکہ، کینیڈا اور برطانیہ میں اپنے ساتھ ہونے والے تضحیک آمیز سلوک نے ان کے اندر انگریز کے خلاف سلگتی ہوئی نفرت کی آگ کو مزید بھڑکایا اور ان کی منزل ایک ایسا ''غدر'' ٹھہرا جس کے ذریعے، انگریز سے مکمل آزادی حاصل کی جا سکے۔ سوہن سنگھ بھاکنا نے پارٹی کا ترانہ لکھا جس کا نام تھا ''غدر دی گونج۔'' انہوں نے اپنی پارٹی کے ترجمان کا نام بھی غدر رکھا جس کا پہلا شمارہ سان فرانسسکو سے یکم نومبر 1913ء کو شائع ہوا۔ کرتار سنگھ سرابھا جو کہ پارٹی کا بنیادی ممبر تھا اس نے پہلے شمارے میں لکھا کہ آج غیر ملکی سرزمین میں غدر شروع ہوتا ہے مگر ہماری زبان میں یہ برطانوی راج کے خلاف اعلان جنگ ہے۔

ہمارا نام کیا ہے، غدر

ہمارا کام کیا ہے، غدر

انقلاب کہاں آئے گا، ہندوستان میں

جلد ہی قلم اور سیاہی کی جگہ بندوق اور خون ہوگا

گورمکھی، گجراتی اور اردو میں شائع ہونے والے اس ہفت روزہ کی پیشانی پر لکھا ہوتا تھا ''انگریز راج کا دشمن ہفت روزہ ''غدر''۔ اس پارٹی میں برکلے یونیورسٹی کے ہندوستانی طالب علم بھی تھے اور امریکہ اور کینیڈا میں موجود ہندوستانی محنت کش بھی۔ پارٹی کا ہیڈ کوارٹر سان فرانسسکو میں تھا۔ پارٹی نے اپنے سامراج دشمن نظریات کی نشر و اشاعت

کے لئے ایک پریس بھی لگایا تھا۔ اس پریس سے ''غدر'' کے علاوہ دیگر کتابچے بھی شائع کئے جاتے۔ جن میں سے غدر دی گونج (پنجابی) اعلان جنگ (اردو) نیا زمانہ (اردو) دی بیلنس شیٹ آف برٹش رول آف انڈیا (انگریزی) قابل ذکر ہیں۔ پمفلٹ اور کتابچے بڑی تعداد میں شائع کر کے چوری چھپے ہندوستان پہنچائے جاتے۔ برطانوی حکمرانوں نے ایک طرف تو انقلابی لٹریچر کی ہندوستان میں برآمد پر کڑی پابندی عائد کر رکھی تھی دوسری طرف امریکہ اور کینیڈا کی حکومتوں پر دباؤ ڈال رکھا تھا کہ وہ غدر پارٹی کو کچلنے کی کوشش کریں۔ کینیڈا کی حکومت نے ہندوستان سے آنے والوں پر پابندی عائد کر دی۔

اس مسئلے کا حل بابا گرودت سنگھ نے یہ نکالا کہ ایک جاپانی جہاز ''گوما گاٹا مارو'' کو چارٹر کیا جو تین سو پچاس ہندوستانیوں جن میں 21 مسلمان بھی تھے، مگر اکثریت سکھوں کی تھی، کو لے کر ونکوور کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ مگر امیگریشن حکام نے انہیں کینیڈا کی سرزمین پر اترنے کی اجازت نہ دی اور جہاز کو واپس جانے پر مجبور کیا۔ جب تک جہاز ہندوستان واپس پہنچا اس وقت تک ہندوستان میں 5 ستمبر 1914ء کو ایک آرڈیننس جاری ہو چکا تھا جس کے تحت برطانوی ہند میں داخل ہونے والے ہر شخص کی جانچ پڑتال ضروری اور سخت کر دی گئی تھی۔ بعد میں اسی آرڈی نینس کی بنیاد پر رسوائے زمانہ 1915ء کا ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ وضع کیا گیا۔

جب گوما گاٹا مارو کینیڈا سے واپسی پر دریائے ہگلی میں داخل ہوا تو اسے پولیس نے اپنے محاصرے میں لے کر مسافروں کو ایک خصوصی ٹرین کے ذریعے پنجاب واپس بھیجنے کا بندوبست کیا۔ مسافروں نے جہاز سے اترتے ہی احتجاج کیا۔ پولیس نے اندھا دھند فائرنگ کر کے اکیس افراد کو ہلاک کر ڈالا۔ بہت سے زخمی ہوئے۔ ان زخمیوں کو بقیہ مسافروں کے ساتھ پیروں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر پنجاب بھیج دیا گیا۔ جب اس سانحہ کی اطلاع غدر پارٹی کے انقلابیوں کو امریکہ اور کینیڈا میں ملی تو انہوں نے مختلف جہازوں سے ہندوستان پہنچنا شروع کر دیا۔ غدر پارٹی کے دیگر رہنماؤں کے علاوہ بابا سوہن سنگھ بھاکنا کو جہاز سے اترتے ہی گرفتار کر لیا گیا۔

غدر پارٹی کے رہنماؤں میں کرتار سنگھ سرابھا، سوہن سنگھ بھاکنا، لالہ ہردیال، بابا وساکھا سنگھ، برنام سنگھ، بابا بھگوان سنگھ، کریم بخش، ہری کشن تلوار کے علاوہ مولوی برکت اللہ، ترک ناتھ داس اور وی جے پنگل جیسے کئی رہنما تھے۔ بعد میں راش بہاری بوس بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ غدر پارٹی جو اشتہار چھاپتی اور تقسیم کرتی اس میں وہ اعلان کرتی، ''بہادر سپاہی درکار ہیں تا کہ ہندوستان میں انقلاب برپا کیا جا سکے۔ تنخواہ موت، قیمت شہادت، پنشن آزادی، میدان جنگ ہندوستان۔ ہم سکھ یا پنجابی نہیں۔ ہمارا مذہب وطن پرستی ہے ہمیں نہ تو پنڈت چاہئیں اور نہ ملّا۔''

یہ ایک سیکولر، سوشلسٹ پارٹی تھی جو ہندوستان بالخصوص پنجاب میں بہت تیزی کے ساتھ مقبول ہوئی اور بیرون ہندوستان بھی اس کے کارکن بہت تیزی کے ساتھ پھیل گئے۔ جب عالمی جنگ شروع ہوئی تو غدر پارٹی نے انگریز کے خلاف جرمنی کے ساتھ اتحاد کیا اور ہندوستان میں مسلح جدوجہد شروع کی۔ اس کے بہت سے ممبر جو برطانوی فوج میں رہ چکے تھے۔ واپس آئے اور انقلابی جدوجہد میں شامل ہوئے۔

1915ء میں جرمنی میں قائم ہونے والی برلن کمیٹی جو بعد میں انڈین انڈی پینڈنس کمیٹی کہلائی جس میں ہردیال اور مولوی برکت اللہ بہت سرگرم تھے، جرمنی حکومت اور غدر پارٹی کے درمیان رابطے کا کام کرتی تھی۔ یہ وہی مولوی برکت اللہ تھے جنہیں کابل میں قائم ہونے والی ہندوستان کی جلاوطن حکومت کا وزیراعظم مقرر کیا گیا تھا۔

غدر پارٹی کی سامراج دشمن تحریک کو حریت پسند عوام اور غریب کسانوں کی ہمدردیاں حاصل تھیں۔ فوجی جوانوں کا عملی تعاون اسے حاصل تھا کیونکہ وہ خود بھی کسان تھے اور اپنے کھیت کھلیان چھوڑ کر عام طور پر جبری بھرتی کے تحت انگریزوں کی فوج میں شامل ہوئے تھے۔ 21رفروری 1915ء کو لاہور چھاؤنی پر حملے کے منصوبے میں 23ویں گھڑسوار پلٹن اور اسی روز فیروز پور چھاؤنی پر حملے کے منصوبے میں 26ویں پنجاب رجمنٹ کے فوجی جوان شامل تھے۔ شمالی ہندوستان کی تمام فوجی چھاؤنیوں سے غدر پارٹی کے رہنماؤں کا قریبی رابطہ تھا۔ فوجی چھاؤنیوں میں فیصلہ کن مسلح بغاوت کا منصوبہ نہایت

اہم تھا جسکی مخبری کرپال سنگھ نے کی اور غدر پارٹی کے سرکردہ رہنما گرفتار کر لئے گئے۔ راش بہاری اور دیگر رہنماؤں کے گھروں سے اسلحہ اور دیگر سامان پکڑا گیا۔ تمام چھاؤنیوں کے گرد سخت پہرہ لگا دیا گیا اور ہندوستانی فوجیوں سے اسلحہ واپس لے لیا گیا۔ اسی (80) کے قریب انقلابیوں کے خلاف 17/اپریل 1915ء کو سنٹرل جیل لاہور میں مقدمہ چلا۔ سات کو سزائے موت دی گئی۔ 16/نومبر 1915ء کو تختہ دار پر چڑھنے والا سب سے کم سن کرتار سنگھ سرابھا تھا۔ جب اس کو اپیل کرنے کے لئے کہا گیا تو اس کا جواب تھا کہ مجھے جتنی زندگیاں دی جائیں میں ان سب کو اپنے وطن کی آزادی کی جدوجہد میں قربان کر دوں گا۔ بھگت سنگھ جو 28/ستمبر 1907ء کو جڑانوالہ میں پیدا ہوا اس وقت آٹھ سال کا تھا۔ اس وقت سے ہی کرتار سنگھ سرابھا اس کا ہیرو بن گیا۔ ہندوستان میں ایک بار پھر انڈین نیشنلزم فروغ پا چکا تھا اور انگریز کے خلاف قومی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔

جلیانوالہ باغ میں قتل عام

غدر پارٹی کی جدوجہد کے اثرات پورے پنجاب پر تھے۔ ان کو کچلنے کے لئے 10/مارچ 1919ء کو رولٹ ایکٹ (ROWLAT ACT) پاس کیا گیا جس کا سہارا لے کر بریگیڈیئر جنرل رگنلڈ ڈائر (REGINALD DYRE) نے 13/اپریل 1919ء کو 15000 معصوم انسانوں پر جو امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں جمع تھے، گولیاں چلا کر 1600 افراد کو قتل کر ڈالا۔ دو سو افراد نے کنویں میں چھلانگیں لگا دی اور مر گئے۔ ہزاروں زخمی کر دیئے گئے۔ ان میں بچے بھی شامل تھے۔ عورتیں بھی اور بوڑھے بھی۔ ہر مذہب اور عقیدے کے لوگ بیساکھی کے تہوار کو منانے کے لئے یہاں جمع ہوئے تھے۔ ڈائر نے ان پر اس وقت تک اندھا دھند گولیاں چلوائیں جب تک کہ اس کا اسلحہ ختم نہیں ہو گیا۔ ملک بھر میں اس پر شدید ردعمل ہوا۔ جنرل ڈائر کو ریٹائر کر کے واپس بلا لیا گیا۔ انگلستان میں عام انگریز نے جنرل ڈائر کی کاروائی پر جشن منائے۔ چرچل نے ابتدا میں اس واقعہ کی مذمت کی۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے اس قتل عام پر احتجاج کرتے ہوئے مئی 1919ء

میں اپنا سر کا خطاب واپس کر دیا۔ علامہ اقبال یہ جرأت پیدا نہیں کر سکے۔ جنہیں اس واقعہ کے 3 سال بعد 1922ء میں سر کے خطاب سے نوازا گیا جسے انہوں نے بخوشی قبول کیا۔ حالانکہ جلیانوالہ باغ میں بہت سے مسلمان بھی مارے گئے تھے۔ قتل عام کے اس واقعہ کے خلاف ملک بھر میں مظاہرے ہوئے جن پر گولیاں برسا کر مزید لوگوں کو ہلاک کیا گیا۔ 15/نومبر 1919ء کو گوجرانوالہ میں ہونے والے مظاہرے پر گولیاں برسا کر مزید 12 افراد کو مار دیا گیا اور تیس کے قریب زخمی کر دیئے گئے۔ جنرل ڈائر 1927ء میں مر گیا۔ پھر اس قتل عام کا بدلہ اودھم سنگھ نے 1940ء میں لیا۔

13/مارچ 1940ء کو کیکسٹن ہال (CAXTON HALL) لندن میں اودھم سنگھ نے لیفٹیننٹ گورنر آف پنجاب، مائیکل اوڈوائر کو قتل کر دیا جس نے جنرل ڈائر کو جلیانوالہ باغ کے قتل عام کے منصوبے کی منظوری دی تھی۔ اودھم سنگھ نے جلیانوالہ باغ کا بھیانک منظر نہ صرف دیکھا تھا بلکہ اس میں وہ خود بھی زخمی ہوا تھا۔ اس نے پوری قوم کا سربلند کر دیا۔ جبکہ گاندھی نے اودھم سنگھ کے خلاف بیانات دیئے۔ جب اودھم سنگھ پر مقدمہ چلا اور اس سے اس کا نام پوچھا گیا تو اس نے کہا۔ ''رام محمد سنگھ آزاد'' 31/جولائی 1940ء کو اودھم سنگھ کو پھانسی دے دی گئی۔

تاشقند میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا قیام

اکتوبر 1917ء کے انقلاب روس کے بعد مارچ 1919ء میں کمیونسٹ انٹرنیشنل قائم ہوئی جس میں یہ طے پایا کہ تمام ممکنہ وسائل و ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے بین الاقوامی بورژوازیوں اور حکومتوں کے خلاف جدوجہد بشمول مسلح جدوجہد کی جائے۔ ہندوستان کی وہ تمام انقلابی تحریکیں جو انگریز راج کے خلاف جدوجہد کر رہی تھیں انقلاب روس ان کے لئے ایک نشانِ منزل تھا۔ ایک قطبی ستارہ تھا جو رات کی تاریکی میں ان کے راستے کا تعین کر سکتا تھا۔

انقلابیوں کی برلن کمیٹی، غدر پارٹی، حتیٰ کہ کابل میں جلاوطن حکومت، تحریک

ہجرت اور تحریک خلافت کے مہاجرین نے اور دیگر حریت پسند اور سامراج دشمن تحریکوں نے اپنی جدو جہد آزادی کو بین الاقوامی سطح پر منظم کرنے کے لئے سوویت یونین کا رخ کیا۔

17 راکتوبر 1920ء کو تاشقند میں ہندوستانی انقلابیوں کا جلسہ ہوا جس میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا قیام عمل میں آیا۔ تریمل اچاریہ نے چیئر مین کی حیثیت سے اس جلسے کی صدارت کی اور ایم این رائے نے سیکرٹری کے فرائض انجام دیئے اور جلسے کی کاروائی قلمبند کی۔ یہ کاروائی ایک تاریخی دستاویز کے طور پر تاشقند کمیونسٹ پارٹی کے محافظ خانے میں محفوظ ہے۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے ہندوستان کی جدو جہد آزادی میں بھر پور کردار ادا کیا۔

پارٹی کے بنیادی ممبران میں ایم این رائے اور ان کی بیگم ایویلین ٹرنٹ رائے، مکھر جی اور ان کی بیگم روز افیٹنگف، محمد علی (احمد حسن)، محمد شفیق صدیقی اور ایم پی ٹی اچاریہ تھے۔ بعد میں شوکت عثمانی کو بھی پارٹی کا ممبر بنایا گیا۔ 15 ردسمبر 1920ء کو پارٹی کی میٹنگ ہوئی جس میں ایم این رائے، محمد شفیق اور اچاریہ کو مجلس عاملہ کا ممبر چنا گیا۔ محمد شفیق کو سیکرٹری اور اچاریہ کو چیئر مین منتخب کیا گیا۔ یہ بھی طے پایا کہ پارٹی کو ترکمانستان میں رجسٹر کرایا جائے۔ ایم این رائے کمیونسٹ انٹرنیشنل میں ہندوستان کے ساتھ ساتھ میکسیکو کی نمائندگی بھی کیا کرتے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی آف میکسیکو بھی معرض وجود میں آچکی تھی۔

پارٹی کے پہلے سیکرٹری جنرل محمد شفیق تھے جن کا تعلق اکوڑہ خٹک ضلع پشاور سے تھا۔ ان کے والد کا نام عبدالحمید تھا۔ 1919ء میں جب رولٹ ایکٹ کے خلاف ہندوستان میں ایجی ٹیشن شروع ہوا اور جلیانوالہ باغ کا قتل عام ہوا تو محمد شفیق پر اس کا شدید ردعمل ہوا۔ وہ سرکاری ملازمت چھوڑ کر، انگریز کے خلاف جدو جہد کرنے کی غرض سے کابل پہنچے۔ ان کی ملاقات 1919ء میں مولانا عبیدالا سندھی سے اور لاہور کے مہاجر طلبا سے ہوئی۔ انہوں نے جلاوطن عبوری حکومت کی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا اور یہاں پر ہی ان کی ملاقات عبدالرب، تریمل، اچاریہ، خوشی محمد اور رحمت علی ذکریا وغیرہ سے ہوئی۔

پہلے تاشقند سکول پھر محنت کشوں کی مشرقی یونیورسٹی

جب افغانستان نے جلاوطن حکومت ہند کی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی تو اکثر مہاجرین نے کابل سے تاشقند کا رخ کیا۔ ان کی نظریاتی اور فوجی تربیت کے لئے ہندوستانی فوجی سکول (انڈسکی کرس) تاشقند میں قائم کیا گیا۔ ایم این رائے کا خیال تھا کہ جب چند سو افراد پر مشتمل تربیت یافتہ فوج تیار ہو جائے تو اسے افغانستان کے راستے قبائلی علاقے میں پہنچایا جائے اور انگریز دشمن جنگجو قبائل کے تعاون سے صوبہ سرحد میں ایک آزاد علاقہ قائم کیا جائے جو ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں فوجی ہیڈ کوارٹر کا کام دے۔ رائے کا خیال تھا کہ چونکہ اس وقت ہندوستان میں عدم تعاون کی تحریک زوروں پر تھی لہٰذا انہیں جلد ہی ہندوستانی عوام کا تعاون حاصل ہو جائے گا۔

رائے کے اس منصوبۂ جنگ سے لینن نے اتفاق نہیں کیا مگر سوویت حکومت اسلحہ فراہم کرنے پر رضامند ہو گئی۔ ایم این رائے دو ٹرینوں میں اسلحہ اور فوجی تربیت دینے والے ماہرین کو لے کر جب تاشقند پہنچا تو حکومت افغانستان نے کسی بھی قسم کا تعاون کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس طرح رائے کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔ مئی 1921ء میں تاشقند کا فوجی سکول بند کر دیا گیا۔ بعض مہاجرین واپس چلے گئے۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا ہیڈ کوارٹر بھی تاشقند سے ماسکو منتقل کر دیا گیا۔ پارٹی تاشقند میں اپنے قیام کے دو ماہ بعد ہی کومن ٹرن کے ساتھ وابستہ ہو گئی تھی چنانچہ ماسکو میں بھی پارٹی کومن ٹرن کے زیر اہتمام ہی کام کرتی رہی۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا، ہندوستان کی انقلابی تحریکوں کے ساتھ جڑی ہوئی تھی اور ان سے ہٹ کر اپنا کوئی وجود نہیں رکھتی تھی۔ بنیادی طور پر یہ ہندوستانی عوام کی جدوجہد آزادی کا حصہ تھی۔ برلن کمیٹی، جلاوطن حکومت، غدر پارٹی اور دیگر انقلابی تنظیمیں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے جڑی ہوئی تھیں۔ تاشقند فوجی سکول بند کرنے کے بعد ماسکو میں ''محنت کشوں کی مشرقی یونیورسٹی'' کی بنیاد رکھی گئی۔ ہندوستان، چین، جاپان، ایران، ترکی اور دیگر ایشیائی ممالک کے طلبا جو اس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنا

چاہتے انہیں تیسری انٹرنیشنل کی سفارش پر داخلہ دیا جاتا۔ فارغ التحصیل ہونے والے یہ طلبا واپس اپنے وطن میں جا کر جدوجہد آزادی کے متوالوں کی نظریاتی تربیت کرتے۔ ان طلبا میں بیشتر کا تعلق مسلمان ممالک سے تھا۔

تحریک ہجرت اور تحریک خلافت کے مہاجرین سوشلسٹ انقلاب کے راستے پر گامزن

تحریک ہجرت اور تحریک خلافت کے مہاجرین میں مولانا برکت اللہ بھی سوویت یونین آ گئے۔ ماسکو میں اپنے قیام کے دوران مولانا برکت اللہ نے ''بالشوزم اور اسلامی اقوام'' کے عنوان سے فارسی زبان میں اپنا مشہور پمفلٹ لکھا جس کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ دراصل ترک عوام کی جنگ آزادی میں سوویت یونین نے جس بے غرضی کے ساتھ ان کی مدد کی تھی اس نے ہندوستانی مہاجرین جو خلافت بچانے چلے تھے اور ان کے رہنماؤں کے دلوں میں سوویت یونین کے عوام اور ان کے رہنماؤں کے بارے میں عقیدت اور محبت کے بے پناہ جذبات موجزن کر دیئے تھے۔ تحریک ہجرت اور تحریک خلافت کے وہ مذہبی رہنما جو واپس ہندوستان آنے کے بجائے سوویت یونین چلے گئے اور کمیونسٹ تحریک کا حصہ بنے، مشرقی یونیورسٹی میں جدید علوم کی تعلیم اور اس کے انقلابی ماحول نے ان کی فکر میں بنیادی انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں اور ان کا سیاسی شعور بلند کیا، انہوں نے سوشلسٹ انقلابی نظریات سے خود کو لیس کیا، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی رکنیت اختیار کی اور قومی جدوجہد آزادی کے لئے تیار ہوئے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''خدا کا قہر نازل ہو غدار شریف مکہ پر جس نے 1336ء ہجری کو شعبان کے مہینے میں خلافت عثمانیہ کے خلاف، انگریزوں سے مل کر سازش کی۔ اس نے خطرناک منصوبے بنائے اور انگریزوں اور ان کے اتحادیوں کے ساتھ ساز باز کر کے خلافت کے قلب اور مرکز میں تنگ نظر اور قدامت پسند جماعت ''اتلاف'' سے خفیہ رابطہ قائم کیا۔ اس طرح اس نے ان دوسرے مسلمان حکمرانوں سے بھی جن کا مذہب ملت فروشی رہا ہے، ساز باز کر کے

دنیائے اسلام کی اس آخری شمع کوگل کر دیا۔ فرانسیسی اور اطالوی حکومتوں نے اپنی غارت گری اور لوٹ مار کے منصوبوں میں شمالی امریکہ کو آلہ کار کے طور پر استعمال کیا اور امریکی فوجوں کی کمک پر اور بلغاریہ کی قوموں کی غداری سے ترکی پر غلبہ حاصل کیا۔ امریکی جمہوریہ کے صدر ولسن کی اس یقین دہانی کی بنیاد پر کہ تمام قوموں کے حق خود ارادی کے اصول کو، عالمی امن کی بنیادی شرط قرار دیا جائے گا حکومت عثمانیہ نے صلح نامہ پر دستخط کر دیئے۔ مگر امریکی صدر نے تمام یقین دہانیوں اور اصولوں کی نہایت بے شرمی سے دھجیاں اڑاتے ہوئے اپنے کسی عہد اور کسی قول کا مطلق لحاظ نہ کیا۔

''آج کوئی بھی آزاد اور خود مختار اسلامی ملک باقی نہیں رہا۔ مگر ترک شہدا کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ روسی شہنشاہیت کی مطلق العنانی کا جہاز بھی سلطنت ترکی کو تباہ کرنے کی کوشش میں غرق ہو گیا۔ نا امید ہونے کی ضرورت نہیں۔ زار شاہی مطلق العنانی کی طویل اور تاریک رات کے خاتمے کے ساتھ افقِ روس پر انسانی آزادی کی ایک نئی صبح طلوع ہوئی ہے۔ جس میں لینن کی شخصیت، سورج کی مانند درخشاں ہے۔ یہ صبح نو، انسانی خوشی اور شادمانی کو منور اور روشن کر رہی ہے۔''

1922ء تک مولانا برکت اللہ سوویت یونین میں رہے۔ اس کے بعد وہ برلن آ گئے اور چٹو پادھیہ کے ساتھ انقلابی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ برلن سے وہ ''الاصلاح'' نام سے عربی زبان میں ایک اخبار بھی نکالتے تھے جو جولائی 1925ء تک جاری رہا۔ فروری 1927ء میں جب چٹو پادھیہ نے ''سامراج دشمن لیگ'' کی پہلی کانگرس، برسلز میں منعقد کی تو اس کی تیاری میں مولانا نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ 1927ء میں مولانا برلن سے ایک جہاز کے ذریعے مہندر پرتاپ کے ساتھ نیویارک پہنچے۔ راجہ مہندر پرتاپ اپنی سرگزشت میں بیان کرتے ہیں کہ مولانا اور وہ نیویارک سے سان فرانسسکو جا رہے تھے تو مولانا اچانک سخت بیمار پڑ گئے۔ اس بیماری سے وہ جانبر نہ ہو سکے اور 27 ستمبر 1927ء کو نہایت بے بسی کے عالم میں دیار غیر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے غم میں آنسو بہانے والے اس وقت صرف غدر پارٹی کے چند کارکن اور مولانا کے پرانے انقلابی دوست رفیق تھے۔

1921ء میں شری پد امریت ڈانگے جو مہاراشٹر میں بال گنگا دھر تلک کے ساتھ مل کر کام کر رہے تھے اور گاندھی کے چرخہ کاتنے کے فلسفے کو عجیب وغریب سمجھتے تھے انہوں نے GANDHI VS LENIN ایک پمفلٹ لکھ کر تقسیم کیا اور لینن کی نہایت تعریف کی۔ ایم این رائے نے ان سے ملاقات کی اور برصغیر کا پہلا مارکسسٹ نظریات پر مبنی انگریزی زبان میں ہفت روزہ ''سوشلسٹ''، ڈانگے کی ادارت میں رانچو داس لوٹ والا کی مالی مدد سے 1922ء میں شروع ہوا۔ LOTVALA بمبئی کا ایک امیر کارخانہ دار تھا جو انقلاب روس سے متاثر تھا۔ مارکسزم کو برصغیر میں پھیلانا چاہتا تھا۔ اس نے ڈانگے کے ساتھ مل کر مارکسسٹ نظریات پر مبنی کتابیں اور لٹریچر جمع کر کے ایک بہت بڑی لائبریری قائم کی اور انقلابی کلاسیک کے ترجمے کروا کر برصغیر میں تقسیم کئے۔

پشاور سازش کیس، ماسکو سازش کیس، کانپور بالشویک سازش کیس

تاج برطانیہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے لئے مارکسزم کا پھیلاؤ ایک جان لیوا خطرہ تھا۔ چنانچہ انقلابی نظریات رکھنے والے افراد پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔ یا تو وہ زیر حراست رہتے یا پھر سازش کے مقدمات میں انہیں عدالتوں میں گھسیٹا جاتا۔ بنگال میں مظفر احمد، بمبئی میں ایس اے ڈانگے۔ مدراس میں سنگرارا ویلو چیتیار (SINGRARAVELU CHETTIAR)، یوپی میں شوکت عثمانی اور پنجاب میں غلام حسین کے کمیونسٹ سرکلز تھے۔ صرف شوکت عثمانی تھے جنہیں کمیونسٹ پارٹی کی مکمل ممبر شپ ملی تھی۔ کمیونسٹوں اور ان کے سیاسی کام پر پابندی عائد تھی۔ چنانچہ اس فضا میں کمیونسٹ پارٹی کا پورے ہندوستان میں تیزی سے پھیل جانا ممکن نہیں تھا۔

1921 سے 1924ء تک کمیونسٹوں پر تاج برطانیہ کے خلاف سازش کے تین مقدمات چلے۔ پہلا پشاور سازش کیس تھا جس میں روس سے آئے ہوئے کامریڈز کو ملوث کیا گیا تھا۔ دوسرا ماسکو سازش کیس تھا اور تیسرا کانپور بالشویک سازش کیس تھا۔ روس جا کر واپس لوٹنے والوں پر یہ مقدمات چلائے گئے۔ کانپور کا مقدمہ ہندوستان کے عوام کی توجہ کا

مرکز بنا جس میں ایم این رائے، ایس اے ڈانگے، مظفر احمد، نیلانی گپتا، شوکت عثمانی، سنگرارا چتیار، غلام حسین اور آر سی شرما پر مقدمہ چلایا گیا۔ ان پر الزام تھا:

"To deprive The King Emperor of his Sovereignty of British India by complete separation of India from Imperialistic Britain by a violent revolution."

اس مقدمے کی کارروائی شہ سرخیوں کے ساتھ پورے ہندوستان میں چھپتی رہی جس کی وجہ سے ہندوستان کے عوام کو کمیونزم، روس کے اکتوبر 1917ء کے انقلاب، مارکسزم اور کمیونسٹ انٹرنیشنل کے بارے میں تفصیلات کے ساتھ آگاہی ہوئی۔ سنگرارا کو بیماری کی وجہ سے رہا کر دیا گیا۔ ایم این رائے جرمنی میں تھے اور آر سی شرما فرانسیسی کالونی پانڈی چری میں تھے۔ چنانچہ گرفتار ہونے سے بچ گئے۔ غلام حسین وعدہ معاف گواہ بن گیا۔ مظفر احمد، نیلانی گپتا، شوکت عثمانی اور ڈانگے کو قید کی سخت سزائیں دی گئیں۔

آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگرس جو 1920ء میں قائم ہوئی تھی اس مقدمے کے بعد اس کے مزدوروں میں مارکسزم سے دلچسپی بڑھی۔ ڈانگے نے رہائی کے بعد مزدوروں میں بہت کام کیا اور ٹریڈ یونین، جو اب تک آل انڈیا کانگرس کے زیر اثر تھی، اس کے اثر سے نکل کر مارکسزم کے راستے پر چل نکلی۔

ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کا قیام

25 ستمبر 1925ء کو کانپور میں کمیونسٹ کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں پانچ سو مندوبین نے شرکت کی اور ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا قائم کی گئی۔ کامریڈ مظفر احمد نے اپنی انگریزی تصنیف ''دی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اینڈ اِٹس فارمیشن'' میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ تاشقند میں قائم ہونے والی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا ہی دراصل کمیونسٹ پارٹی تھی جو بعد میں ہندوستان میں قائم ہوئی اور یہ دونوں ناقابل تقسیم ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا پہلے ملک سے باہر قائم ہوئی پھر اسے

ہندوستان میں قائم کیا گیا۔

1926ء 1927ء میں برطانوی کمیونسٹ پارٹی نے کومن ٹرن کی منظوری سے تین کمیونسٹوں فلپ سپراٹ، بریڈلے اور بنجمن فرانسس (Phillip Spratt, Bradley Benjamin Francis) کو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی مدد اور کلکتہ اور بمبئی میں مزدوروں میں کام کرنے کے لئے بھیجا۔ مزدوروں کسانوں کی تنظیمیں بڑھتی گئیں اور جب 1928-29 میں مزدوروں کی تحریک نے ہندوستان میں مکمل پہیہ جام کر دیا تو انگریز پریشانی کی حد تک ہل گیا۔ چنانچہ 20/مارچ 1929ء کو فلپ سپراٹ، ڈانگے، مظفر حسن اور شوکت عثمانی سمیت 33 کمیونسٹ رہنماؤں کو گرفتار کر کے میرٹھ سازش کیس چلا دیا گیا۔ یہ مقدمہ ساڑھے چار سال تک چلا۔ اس کی خوب تشہیر ہوئی جس کی وجہ سے برصغیر میں کمیونسٹ تحریک مزید مضبوط ہوئی۔ آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگرس بھی کمیونسٹوں کے اثر میں آ گئی۔

پنڈت جواہر لال نہرو اس صورتحال سے پریشان تھے۔ انہوں نے 1927ء میں سوویت یونین کا چکر لگانے کے بعد اعلان کر دیا کہ انڈین نیشنل کانگرس ہندوستانی بورژوازی کی جماعت ہے۔ اگر پارٹی میں انقلابی تبدیلیاں نہ کی گئیں اور مزدور کسان اس سے الگ رہے تو بالآخر یہ جماعت سامراج کی آلہ کار جماعت بن جائے گی۔ GENESIS AND GROWTH OF NEHRUISM VOL.I By SITA RAM GOEL

1928ء میں جب چھٹی کمیونسٹ انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی تو اس میں طے پایا کہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی، انڈین نیشنل کانگرس اور گاندھی جیسے اصلاح پسندوں کا مقابلہ کرے اور سوراج جیسے تصورات اور گاندھی کی سیاست کو بے نقاب کرے۔ مزید یہ کہ قومی بورژوازی اور برطانوی سامراج کے درمیان تضادات کا فائدہ اٹھائے۔ مسلم لیگ کسی کھاتے میں ہی نہیں تھی۔ نہ تو اس کا عوام سے کوئی رابطہ تھا اور نہ ہی عوام کی سیاست سے کوئی رابطہ۔ کانگرس بھی ایک ایسی رجعت پسند جماعت تھی جس پر گاندھی کے احیائے ہندومت اور شاونزم کے خیالات چھائے ہوئے تھے۔

جبکہ پورا ہندوستان ایک انقلابی لہر کی لپیٹ میں تھا اور سوشلسٹ عوامی انقلاب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کمیونسٹوں پر 1921ء سے 1924ء تک تین سازش کیس چل چکے تھے۔ ہندوستان ریپبلکن ایسوسی ایشن اور غدر پارٹی مسلح جدوجہد کر رہی تھی۔ اس کے سات رہنماؤں کو پھانسی دی جا چکی تھی۔ جلیانوالہ باغ کا خون آشام واقعہ ہو چکا تھا۔ موپلہ کی بغاوت، چوراچوری کے واقعات میں ہزاروں محنت کش عوام نے جانیں قربان کر دی تھیں۔ انقلابی نوجوانوں کے پاس مارکسسٹ نظریہ بھی تھا اور مسلح جدوجہد کا راستہ بھی۔ جب کاکوری کیس میں رام پرشاد بسمل، اشفاق اللہ خان، ٹھاکر روشن سنگھ اور راجندر ہیری کو پھانسی دی گئی تو انگریز کے خلاف انتقام کی آگ مزید بھڑک اٹھی۔

کاکوری ٹرین ڈاکہ (Kakori Train Robbery)

1922ء میں چوری چورا کے واقعہ کے بعد گاندھی نے، جو 1919ء کے جلیانوالہ باغ کے قتل عام پر بھی خاموش رہا تھا، انگریز کے خلاف اپنی عدم تعاون کی تحریک کو ختم کر دیا تھا۔ یعنی اس کا ''انگریز تعاون'' کے برملا اعلان کا دور شروع ہوا تھا جس کی 1922ء کے گیا (Gaya) کے اجلاس میں زبردست مخالفت کی گئی۔ اس میں پنڈت رام پرشاد بسمل، اشفاق اللہ خان اور ان کے دیگر نوجوان ساتھیوں نے گاندھی کے خلاف شدید احتجاج کیا اور کانگرس اس معاملے پر تقسیم ہو گئی۔ چترانجن داس (CHITTARANJAN DAS) نے کانگرس کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور موتی لعل نہرو نے بھی کانگرس کو چھوڑ دیا۔ انہوں نے سوراج (SAWARAJ) پارٹی قائم کر لی۔ نوجوانوں نے بسمل کی قیادت میں غدر پارٹی کے لالہ ہردیال کے مشورے سے ہندوستان ریپبلکن ایسوسی ایشن قائم کروائی۔ بسمل نے جو کہ شاعر بھی تھا، شعلہ بیان مقرر بھی تھا اور جنگجو بھی، اس کا منشور لکھا۔ یہ منشور ییلو پیپر (Yellow Paper) کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا عنوان تھا THE REVOLUTIONARY

سچندر ناتھ سنیال کو اس پارٹی کا قومی آرگنائزر چنا گیا اور جوگیش چندرا چیٹر جی کو کوارڈینیٹر مقرر کیا گیا جبکہ بسمل کو (یوپی آگرہ اور اودھ کا) صوبائی صدر چنا گیا۔ آرمز ڈویژن

کے چیف کی ذمہ داری بھی بسمل کو سونپی گئی۔ چار صفحے پر مشتمل یہ منشور سوشلسٹ نظریات پر مبنی تھا۔ انگریز سے آزادی کے بعد ہندوستان کو فیڈرل ریپبلک آف دی یونائیٹڈ سٹیٹس آف انڈیا کا نام دیا گیا تھا۔ اس میں گاندھی پر بھی بہت تنقید کی گئی تھی۔ اس منشور پر یکم جون 1925ء کی تاریخ درج تھی اور وجے کمار کے فرضی نام سے چھاپ کر پورے ہندوستان میں تقسیم کیا گیا تھا۔ کانگرس پر گاندھی کے قبضے کے بعد کانگرس کا کردار اور حلیہ بگڑ گیا تھا۔ آزادی کے متوالے نوجوان کانگرس سے مایوس ہو کر ہندوستان ریپبلکن ایسوسی ایشن میں شامل ہونے لگے۔ بسمل ان کا لیڈر تھا۔ یوپی کا رہنے والا یہ نوجوان جس پر 1918ء میں مائن پوری (MAINPURI) سازش کیس چل چکا تھا اپنی انقلابی کارروائیاں جاری رکھے ہوئے تھا۔ اپنی کارروائیوں کے لئے ان نوجوانوں کو ہمیشہ رقم کی کمی کا سامنا رہتا۔

ایک روز شاہجہان پور سے ریل کے ذریعے لکھنؤ سفر کے دوران بسمل نے دیکھا کہ ریلوے سٹیشن پر سٹیشن ماسٹر رقوم کے تھیلے گاڑی کے گارڈ کے حوالے کرتا ہے جو کہ سرکار کے خزانے میں جمع کروانے کے لئے لکھنؤ کے سٹیشن سپرنٹنڈنٹ تک پہنچائے جاتے ہیں۔ اس دن بسمل نے اس خزانے کو لوٹنے کا منصوبہ بنایا۔ 9/اگست 1925ء کو یہ خزانہ کاکوری کے مقام پر ریل کو روک کر لوٹا گیا۔

کاکوری لکھنؤ کے پاس ایک گاؤں ہے۔ سہارن پور سے لکھنؤ جانے والی اس ریل کے ذریعے آٹھ ہزار روپے کی رقم سرکاری خزانے کے لئے بھیجی جا رہی تھی۔ جن دس انقلابیوں نے یہ کام کیا اس میں رام پرشاد بسمل، اشفاق اللہ خان، ٹھاکر روشن سنگھ، راجندر روہیری، چندر شیکھر آزاد، سچند رابخشی، کشیاب چکراورتی، من ماتھ ناتھ گپتا، بنواری لعل، موکوندی لعل تھے۔ بغاوت کے جرم میں ہندوستان بھر سے چالیس افراد کو گرفتار کیا گیا۔ چندر شیکھر آزاد گرفتار ہونے سے بچ گیا۔ چیٹر جی اور سنیال پہلے سے گرفتار تھے۔

تاج برطانیہ کے خلاف بغاوت کا یہ مقدمہ دو سال تک چلا۔ جس کی وجہ سے مسلح جدوجہد کو عالمی شہرت اور تقویت ملی۔ رام پرشاد بسمل، اشفاق اللہ خان، راجندر لاہیری اور روشن سنگھ کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ باقیوں کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ کچھ کو کالا پانی بھیج دیا گیا۔

ملک بھر سے سیاسی رہنماؤں نے ان سزاؤں کے خلاف اپیلیں کیں۔ لیجسلٹیو
اسمبلی کے ممبران نے وائسرائے سے مطالبہ کیا کہ پھانسی کی سزا کو عمر قید میں بدل دیا
جائے۔ گاندھی خاموش رہا۔ 18 دسمبر 1927ء کو راجندر الاہیری کو، 19 دسمبر کو رام
پرشاد بسمل اور اشفاق اللہ خان کو اور 20 دسمبر کو ٹھاکر روشن سنگھ کو پھانسی دی گئی۔ بھگت سنگھ
اس وقت بیس سال کا تھا۔

بھگت سنگھ

بھگت سنگھ 28 ستمبر 1907ء کو سردار بسمل کشن سنگھ اور ودیاتی کے گھر چک
نمبر 105 قصبہ بانگا تحصیل جڑانوالہ ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) صوبہ پنجاب میں پیدا
ہوا۔ سردار کشن اور اس کے دو بھائی سردار اجیت سنگھ اور سردار سورن سنگھ اپنی حب الوطنی اور
انگریز راج کے خلاف جدوجہد کی وجہ سے پنجاب بھر میں مشہور تھے۔ بھگت سنگھ کے دادا
ارجن سنگھ کی بڑی زمینداری تھی۔ اس کے بزرگوں نے رنجیت سنگھ کی سلطنت کے پھیلاؤ اور
قیام میں اس کی مدد کی تھی۔ بھگت سنگھ کے چچا اجیت سنگھ نے لالہ لاجپت رائے کو سیاست
میں آنے کے لئے آمادہ کیا تھا۔ اجیت سنگھ اور لالہ لاجپت رائے کو ایک سال تک برما میں
بغیر کوئی مقدمہ چلائے جیل میں رکھا گیا اور سردار کشن سنگھ اور سورن سنگھ کو پنجاب جیل میں۔
سورن سنگھ 28 سال کا تھا جب جیل میں اس کا انتقال ہوا اور اسی دن بھگت سنگھ پیدا ہوا۔
بھگت سنگھ کا ایک بڑا بھائی جگت سنگھ تھا جو 11 سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ اس کے بعد سردار
کشن سنگھ اپنے کنبے کو لے کر نواں کوٹ لاہور میں آ گئے۔ یہاں پر بھی ان کی زمینداری
تھی۔ بھگت سنگھ کو خالصہ سکول کے بجائے ڈی اے وی سکول لاہور میں داخل کرایا گیا اور
دسویں جماعت کے بعد وہ ڈی اے وی کالج میں ہی رہا مگر یہاں سے وہ جلد ہی لالہ لاجپت
رائے کے نیشنل کالج میں منتقل ہو گیا۔

بھگت سنگھ کے دل و دماغ پر ابھی تک غدر پارٹی کے کرتار سنگھ سرابھا کی پھانسی کا اثر
تھا کہ جنرل ڈائر نے 1919ء میں جلیانوالہ باغ میں معصوم انسانوں کا بے دردی سے قتل عام کر

ڈالا۔ بھگت سنگھ اس وقت بارہ سال کا تھا جب وہ امرتسر گیا اور شہیدوں کے خون سے بھری مٹی کو اپنے ساتھ لے کر واپس لوٹا۔ سر مائیکل اوڈوائر اپنی کتاب India as I Knew It میں ذکر کرتا ہے کہ "سردار کشن سنگھ ہزاروں دوسرے انقلابیوں کو رقم فراہم کرتا تھا۔" بھگت سنگھ نے اس ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ وہ ایک بے پناہ پڑھنے والا، سوشلسٹ دانشور بن کر جوان ہوا۔ اس نے داس کیپٹال، کمیونسٹ مینی فیسٹو اور انقلاب اکتوبر 1917ء کا بھرپور مطالعہ کیا۔ بالشویک پارٹی اور اس کی قیادت کے زیر اہتمام سوویت یونین میں کئے جانے والے سوشلسٹ اقتصادی نظام کے تجربے پر اس کی گہری نظر تھی۔ اس نے فکشن کو بھی خوب پڑھا تھا مگر وہ فکشن جس کا تعلق سیاست اور معیشت کے ساتھ تھا۔ حکمران طبقات کی نمائندگی کرنے والے ناول اس کے لئے بے کار تھے۔

کروپوٹکنز (KROPOTKINS) کی یادداشتوں نے اس کی شخصیت پر گہرا اثر چھوڑا تھا مگر میخائل باکونن (MICHAIL BAKUNIN) نے اس کی زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی پیدا کی اور خدا کا وجود اس کے لئے ایک سوالیہ نشان بن گیا۔

بھگت سنگھ کی خودنوشت WHY I AM ATHIEST ایک اہم تحریر ہے۔ اس کی زندگی کے بہت سے اہم پہلو جتندر سنیال کی کتاب "سردار بھگت سنگھ" میں محفوظ ہیں۔ جتندر سنیال لاہور سازش کیس میں اس کے ساتھ جیل میں رہا۔ وہ بھگت سنگھ کا قریبی ساتھی تھا۔ ثبوت نہ ملنے کی بنا پر جتندر کو 1930ء میں 7/ اکتوبر کو جب رہائی ملی تو اس نے بھگت سنگھ کی زندگی کے بارے میں کتاب لکھی جو مئی 1931ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کو نہ صرف ضبط کر لیا گیا بلکہ جتندر سنیال کو اس جرم میں قید کر لیا گیا۔ شہید بھگت سنگھ ریسرچ کمیٹی اب اس کتاب کو منظر عام پر لائی ہے۔

بھگت سنگھ خوبصورت نوجوان تھا۔ اس کی آواز بہت سریلی تھی۔ اس کا جذبات سے بھرا دل وطن کی آزادی اور غریب عوام کی معاشی غلامی سے آزادی کے لئے دھڑکتا تھا۔ اس نے امرتسر سے نکلنے والے اردو اور پنجابی اخباروں کے لئے لکھنا شروع کیا۔ اخباروں کی ادارت کی۔ "کرتی" جو کہ کرتی کسان پارٹی (مزدور کسان پارٹی) کا رسالہ تھا اس

کے لئے اس نے باقاعدگی سے لکھا۔ کچھ عرصہ اس نے ''ارجن دہلی'' اور پرتاپ (کانپور) کے لئے بھی بلونت سنگھ کے فرضی نام سے لکھا۔

بھگت سنگھ نے لاہور میں نوجوان بھارت سبھا قائم کی اور اس کا رابطہ سکھ دیو، یشپال اور بھگاوتی جیسے انقلابیوں سے ہوا۔ چندر شیکھر آزاد، بی کے دت، سریندر ناتھ پانڈیا، چرن، جتندر ناتھ بوس اور دیگر انقلابیوں سے اس کے رابطے بنے۔ ان میں سے دت کو معلوم تھا کہ دستی ساخت کا بم کس طرح بنایا جاتا ہے۔ 1926ء میں چندر شیکھر آزاد، کندن لعل اور بھگت سنگھ نے کاکوری کیس میں قید انقلابیوں کو چھڑوانے کا منصوبہ بنایا جو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

25/اکتوبر 1926ء کو لاہور میں دسہرہ کے موقع پر ایک بم پھٹا جس میں بھگت سنگھ کو گرفتار کرلیا گیا۔ 60 ہزار روپے کی ضمانت پر اس کی رہائی ہوئی۔ جب لاہور میں پکڑ دھکڑ نے زور پکڑا تو بھگت سنگھ کانپور چلا آیا اور ہندوستان ریپبلکن ایسوسی ایشن کے ساتھ منسلک ہوگیا۔ اس کے نزدیک کانگرس زمینداروں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور امیر وکلا کی جماعت تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ مکمل آزادی کے لئے گاندھی کی انسانی ہمدردی کی سیاست کی نہیں بلکہ سائنسی سماجی قوتِ محرکہ (DYNAMIC SCIENTIFIC SOCIAL FORCE) کی ضرورت ہے۔

اس کا ایمان تھا کہ مکمل آزادی سوویت یونین کے بالشویک انقلاب کی طرح ہندوستان میں بالشویک انقلاب برپا کر کے ہی ممکن ہے۔ اس کا یہ بھی یقین تھا کہ نوجوانوں کو آزادی کی ترغیب دینے، تیار کرنے، متوجہ کرنے کے لئے تختۂ دار سے آواز دینا ہوگی۔ اس نے پہلی بار ہندوستان میں انقلاب زندہ باد کا نعرہ متعارف کروایا۔ اس کا کہنا تھا کہ ''ہمیں ایسی آزادی نہیں چاہیے جہاں انگریز کی جگہ مقامی اشرافیہ لے لے۔ ہمیں ایسی آزادی نہیں چاہیے جس میں غلامی اور استحصال پر مبنی یہ بوسیدہ نظام قائم رہے۔ ہماری لڑائی ایسی آزادی کے لئے ہے جو اس ظالمانہ نظام کو بدل کر رکھ دے۔'' اس نے اپنی قید کے دوران ان جان نثاروں کی تفصیلات اور اقوال کو ایک جگہ جمع کیا جو انسانی آزادی اور

عظمت کے لئے سولی پر چڑھ گئے۔ قید کے دوران ہی اس نے ہندوستان میں انقلابی تحریکوں کے بارے میں ضخیم مواد جمع کیا۔ اس عرصے میں اس نے بنگالی زبان بھی سیکھی۔ اس نے جیل میں رہتے ہوئے ہی فلاسفی آف دی بم بھی لکھی اور سولی پر چڑھنے سے پہلے اس نے ینگ پولیٹیکل ورکر کے نام سے اپنا بیان بھی لکھا جو اس کی آخری تحریر تھا۔

جب کارکوری کیس میں اس کے کامریڈ ساتھیوں کو پھانسی دی گئی اور باقیوں کو لمبی قید کی سزائیں دی گئیں تو اس نے اور وجے سہنا نے چندر شیکھر کی سربراہی میں پنجاب، یوپی اور بہار کا دورہ کیا اور بکھرے ہوئے ساتھیوں کو پھر سے جمع کیا۔ چندر شیکھر آزاد کاکوری کیس میں مطلوب تھا اور روپوش تھا۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا قائم ہو چکی تھی۔ بھگت سنگھ نہ صرف کمیونسٹ اور سوشلسٹ انقلاب کے بارے میں لکھتا بلکہ زیر زمین سٹڈی سرکل بھی چلاتا۔ اس کے لیکچرز نے بھی بہت شہرت حاصل کی۔

ستمبر 1928ء میں ہندوستان ریپبلکن ایسوسی ایشن کے بکھرے ہوئے نوجوان اور دیگر انقلابی پرانا قلعہ دہلی میں جمع ہوئے۔ ان میں کرتی کسان پارٹی بھی شامل تھی۔ دہلی، پنجاب اور راجپوتانہ سے آئے مندوبین کی یہ دو روزہ کانفرنس 18 اور 19 ستمبر کو منعقد ہوئی جس میں ہندوستان ریپبلکن ایسوسی ایشن کا نام تبدیل کر کے ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن رکھا گیا۔ اب نوجوانوں کے پاس مارکسسٹ نظریہ بھی تھا اور مسلح جدوجہد کا راستہ بھی۔

اس تنظیم کے مسلح بازو کو ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن آرمی کا نام دیا گیا اور چندر شیکھر آزاد کو اس کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ اسی اجلاس میں پارٹی کی مرکزی کمیٹی قائم کی گئی جس کا سیکرٹری بھگت سنگھ کو بنایا گیا۔ یہ ایک سیکولر سوشلسٹ پارٹی تھی۔ بھگت سنگھ نے اپنے بال اور داڑھی کٹوا دی۔ پارٹی کا ہیڈ کوارٹر جھانسی تھا مگر بعد میں اسے آگرہ منتقل کر دیا گیا۔ اسی اجلاس میں یہ بھی طے پایا کہ انقلابی سرگرمیوں میں حصہ لینے والے کارکن اپنے گھر والوں سے رابطہ نہیں رکھیں گے اور زیر زمین کام کریں گے۔ اس کام کے لئے دو گھر کرایے پر لئے گئے جو کل وقتی انقلابیوں کی سرگرمیوں کا مرکز تھے۔ یہاں پر نہایت غربت اور

نامساعد حالات میں یہ انقلابی کام کرنے لگے۔ بعض اوقات تین تین دن تک یہ صرف چائے پر گزارہ کرتے اور دو تین کمبلوں میں آٹھ نو افراد سردی کا مقابلہ کرتے۔

انقلابی جدوجہد شدت اختیار کر رہی تھی جس کا جائزہ لینے کے لئے سرکار برطانیہ نے سرجون سائمن کی سربراہی میں سات رکنی کمیشن قائم کیا جس میں ایک بھی ہندوستانی نہیں تھا۔ یہ کمیشن 1928ء میں ہندوستان آیا تو جگہ جگہ اس کا استقبال کالی جھنڈیوں اور سائمن واپس جاؤ کے نعروں سے کیا گیا۔ 30/اکتوبر 1928ء کو لاہور میں بھی ایک بہت بڑا جلوس نکالا گیا جس کی قیادت لالہ لاجپت رائے کر رہے تھے۔ لاہور کے سپرنٹنڈنٹ پولیس جے اے سکاٹ نے جلوس پر لاٹھی چارج کروایا، لالہ لاجپت رائے پر اس نے خود تشدد کیا، وہ بہت زخمی ہوئے اور 17/نومبر 1928ء کو انتقال کر گئے۔ پورے ملک میں غم و غصے کی لہر پھیل گئی۔

17/دسمبر کو اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس جے پی سانڈرز اپنے دفتر سے باہر نکلا تو اسے جے اے سکاٹ سمجھ کر گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ بھگت سنگھ اور شیورام، راج گرو کے تعاقب میں جب ہیڈ کانسٹیبل جین سنگھ بھاگا تو چندر شیکھر آزاد نے اس کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ یہ تینوں ڈی اے وی کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں گئے۔ کافی دیر تک جب پولیس نہ آئی تو یہ تینوں سائیکلوں پر سوار ہو کر اپنی پناہ گاہ میں چلے گئے۔ دوسرے روز سارے لاہور شہر میں دیواروں پر ہاتھ سے لکھے ہوئے پوسٹر چسپاں تھے۔ جن میں کہا گیا تھا کہ سانڈرز مر گیا۔ لالہ لاجپت رائے کا بدلہ لے لیا گیا۔ جگہ جگہ پر پولیس کا پہرہ تھا۔ سارے شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی۔ لاہور سے باہر جانے والے ہر نوجوان کی تلاشی لی جانے لگی۔ کامریڈ بھگت وتی چرن ووہرا کی بیوی درگا بھابھی (سب انہیں اسی نام سے پکارتے تھے) اپنے شیر خوار بچے کے ساتھ بھگت سنگھ، جس نے مغربی لباس میں ایک بڑے افسر کا روپ دھار رکھا تھا، کے ساتھ ایک جوڑے کی شکل میں لاہور سٹیشن سے کلکتہ جانے والی ٹرین کے فرسٹ کلاس ڈبے میں سوار ہو گئے۔ راج گرو نے ان کے ملازم کا روپ دھار کر ان کا سامان سر پر اٹھا رکھا تھا اور ہاتھ میں ٹفن تھا۔ یہ سب لاہور سے نکل جانے میں کامیاب ہو گئے۔

چندر شیکھر آزاد بھی متھرا جانے والے زائرین کا برہمن پنڈت بن کر لاہور سے

نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر بھگت سنگھ کچھ دن بعد واپس لاہور آ گیا۔ اس نے مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی کے ہال میں بم پھینکنے کا منصوبہ بنایا۔ HSRA نے ابتدا میں یہ طے کیا کہ سکھ دیو اور باتو کیشور دت اسمبلی میں بم پھینکیں گے اور بھگت سنگھ سوویت یونین کی جانب روانہ ہو جائے گا۔ مگر منصوبہ بدل گیا۔ بھگت سنگھ اور دت نے 18 اپریل 1929ء کو اسمبلی کی وزیٹر گیلری سے اسمبلی ہال میں دو بم پھینکے۔ ہال دھوئیں سے بھر گیا۔ بھگت سنگھ اور دت نے انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند کئے اور انقلابی پمفلٹ ہال میں پھینکے۔ ان میں یہ بھی درج تھا کہ بہرے کو بات سنانے کے لئے اونچی آواز کی ضرورت ہوتی ہے۔

ان کا مقصد کسی کی جان لینا نہیں بلکہ دنیا کو ہندوستان میں انقلابی جدوجہد کی طرف متوجہ کروانا تھا۔ اس واقعہ میں کسی کی موت واقع نہیں ہوئی۔ بھگت سنگھ اور دت نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا۔ گاندھی نے بھگت سنگھ اور انقلابی کاروائیوں کی سخت الفاظ میں مذمت کی۔

بھگت سنگھ اور دت پر 7 مئی 1929ء کو ارادۂ قتل کا مقدمہ شروع کر دیا گیا۔ سوبھا سنگھ اس مقدمے میں سرکاری گواہ تھا جسے بعد میں سرکاری خطابات سے نوازا گیا۔ مجسٹریٹ لیونارڈ مڈلٹن (LEONARD MIDDLETON) کی عدالت میں یہ مقدمہ چلا۔ دت کا کیس آصف علی خان نے لڑا جبکہ بھگت سنگھ نے اپنا کیس خود لڑا۔ انہیں 14 سال قید کی سزا سنادی گئی۔

اسی دوران لاہور میں بم فیکٹری پکڑی گئی اور ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن کے بہت سے انقلابی کارکن پکڑے گئے۔ ان میں سے سات مخبر نکلے جن کی وجہ سے بھگت سنگھ، راج گرو، سکھ دیو سمیت 27 افراد پر سانڈرز اور چنن سنگھ کے قتل کا مقدمہ چل پڑا۔ بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو میانوالی جیل منتقل کر دیا گیا جہاں پر انہوں نے جیل میں ہونے والی زیادتیوں، امتیازی سلوک اور بے رحمانہ غیر انسانی برتاؤ کے خلاف بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ ان دنوں سیاسی قیدیوں کو جیل میں رکھ کر اتنی اذیت دی جاتی تھی کہ یا تو وہ مر جاتے تھے یا پھر پاگل ہو جاتے تھے۔ 1916ء کے بنارس سازش کیس

میں 11 میں سے تین جیل میں مر گئے تھے اور ایک پاگل ہو گیا تھا۔

محمد علی جناح نے اسمبلی میں اس بھوک ہڑتال کے حق میں تقریر کی۔ جواہر لال نہرو میانوالی جیل میں ان سے ملا اور ان کے حق میں بیان دیا۔ بہت جلد یہ بھوک ہڑتال قومی سطح پر بحث کا حصہ بن گئی۔ 15 ر مارچ 1929ء کو میرٹھ سازش کیس بھی شروع ہو چکا تھا جس میں 31 کمیونسٹوں کو گرفتار کیا گیا تھا۔ یہ بھی اس بھوک ہڑتال میں شامل ہو گئے۔ برطانیہ میں بھی بھوک ہڑتال کی خبریں پہنچ گئیں۔

کامریڈ اجے گھوش جو بھگت سنگھ کے ساتھیوں میں تھا اور اس کے ساتھ ہی لاہور سازش کیس میں پکڑا گیا تھا اپنی کتاب BHAGAT SINGH AND HIS COMRADES میں لکھتا ہے کہ ''بھوک ہڑتال کے ایک واقعہ نے ہم سب پر بہت گہرا اثر چھوڑا۔ بابا سوہن سنگھ باکھنا جو غدر پارٹی کے بانی تھے اور 16-1915ء کے لاہور سازش کیس کے ہیرو تھے اور چند ماہ میں چودہ سال قید بامشقت کاٹ کر رہا ہونے والے تھے کہ انہوں نے ہماری بھوک ہڑتال کے حق میں بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس وجہ سے ان کی رہائی ممکن نہیں رہے گی انہوں نے اپنی بھوک ہڑتال ہمارے ساتھ جاری رکھی۔ اس پاداش میں انہیں مزید ایک سال کے لئے قید کاٹنی پڑی۔

''جب میں جیل سے باہر آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ بھگت سنگھ اس وقت تک قوم کا عظیم ہیرو بن چکا ہے۔ پورے ہندوستان میں بھگت سنگھ زندہ باد کے نعرے گونج رہے ہیں۔ ''بندے ماترم'' کے مذہبی نعرے کی جگہ ''انقلاب زندہ باد'' نے لے لی ہے۔ کروڑوں کی زبان پر اس کا نام ہے۔ ہر نوجوان کا دل اس کے لئے دھڑک رہا ہے۔ یہ دیکھ کر بھگت سنگھ کے ساتھ اپنی رفاقت پر میرا سینہ فخر سے پھول اٹھا۔''

بھوک ہڑتال کے معاملے نے ایسی سنجیدہ صورتحال پیدا کر دی کہ وائسرائے لارڈ اروِن کو شملہ میں اپنی تعطیلات کو ختم کر کے جیل حکام کے پاس آنا پڑا۔ بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو لاہور جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ ان کی بھوک ہڑتال ابھی تک جاری تھی۔ بھگت سنگھ کا وزن کافی گر چکا تھا، وہ بے حد کمزور تھا، اسے ہتھکڑیاں پہنا کر سٹریچر پر ڈال کر

عدالت میں لایا جاتا۔ اس دوران جتندر کی حالت بھوک ہڑتال کی وجہ سے نازک ہوگئی اور 13 ر ستمبر 1929ء کو وہ 63 دن کی بھوک ہڑتال کے بعد چل بسا۔ پورے ملک میں غم وغصہ تھا۔ گاندھی کے علاوہ ملک بھر کے سب سیاسی رہنماؤں نے جتندر داس کی عظمت کو سلام پیش کیا۔ پنجاب لیجسلٹیو اسمبلی سے محمد عالم اور گوپی چند بھرگا دا نے اپنی ممبر شپ سے استعفیٰ دے دیا۔ موتی لعل نہرو نے مرکزی لیجسلٹیو اسمبلی میں قرارداد پیش کی۔ بھگت سنگھ نے اپنے باپ اور سیاسی رہنماؤں کے مجبور کرنے پر 116 دن کے بعد 15 ر اکتوبر 1929ء کو بھوک ہڑتال ختم کردی۔

بھگت سنگھ کا سیاسی قد گاندھی سے کہیں زیادہ بلند ہوگیا تھا۔ حکمرانوں کے لئے یہ صورتحال تشویش کا باعث تھی۔ سانڈرز قتل کیس جواب لاہور سازش کیس کہلانے لگا ترجیحی بنیادوں پر تیز رفتاری سے چلایا جارہا تھا۔ آٹھ وکلاء پر مشتمل ٹیم اس مقدمے کا دفاع کررہی تھی۔ ایک روز جب ان سب کے غدار جے گوپال کو ان کے خلاف گواہی دینے کے لئے عدالت میں لایا گیا تو پریم دت جو کہ تمام قیدیوں میں سب سے چھوٹا تھا اس نے گوپال پر اپنا سلیپر دے مارا۔ اس کے بعد مجسٹریٹ نے حکم دیا کہ حکومتی گواہوں کے علاوہ سب ملزموں کو ہتھکڑیاں لگادی جائیں جس پر بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے مزاحمت کی۔ ان پر عدالت میں تشدد کیا گیا۔ انہوں نے آئندہ عدالت کے سامنے پیش ہونے سے انکار کردیا۔ اب مقدمہ ان کی غیر موجودگی میں چلنے لگا۔ وہ شہرت جو انہیں ہر روز کی اخباروں میں چھپنے والی کارروائی سے حاصل ہورہی تھی وہ رک گئی۔

وائسرائے لارڈ اروِن نے یکم مئی 1930ء کو ایک آرڈیننس کے ذریعے تین ججوں پر مشتمل ایک سپیشل ٹریبونل قائم کیا جس کو یہ اختیار دیا گیا کہ ملزموں کی غیر حاضری کی پرواہ کئے بغیر مقدمے کو چلایا جائے Lahore Consipiracy Case Ordinance No. 3, 1930 کے بعد مقدمہ تین رکنی خصوصی ٹریبونل میں منتقل کردیا گیا۔ جسٹس جے کولڈسٹریم (Justice J.Coldstream)، جسٹس جی سی ہلٹن، جسٹس آغا حیدر اس کے ممبر تھے۔ ابھی کارروائی شروع ہوئی تھی کہ جسٹس کولڈسٹریم اور جسٹس آغا

حیدر کو ہٹا کر جسٹس بلٹن کو صدر، جسٹس جے۔ کے۔ ٹیپ اور جسٹس سر عبدالقادر کو ممبر مقرر کر دیا گیا۔ قانونی طریقہ اختیار کئے بغیر نئے ججوں کی اتنی جلدی تبدیلی اور تقرری وائسرائے کے اختیار میں نہیں تھی مگر یہ غیر قانونی عدالت قائم کی گئی۔ پی این گھوش، ہنس راج وو ہرا اور جے گو پال وہ سرکاری گواہ تھے جو HSRA میں بھگت سنگھ کے قریبی ساتھی رہے تھے۔

10 ر جولائی 1930ء کو پندرہ افراد پر فرد جرم عائد کی گئی۔ باقی کو چھوڑ دیا گیا۔ جس آرڈی نینس کے ذریعے یہ ٹربیونل قائم کیا گیا تھا اس کی مدت 31 ر اکتوبر 1930ء کو ختم ہونا تھی چنانچہ 300 صفحات پر مشتمل فیصلہ سنایا گیا جس میں بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کو پھانسی کے ذریعے سزائے موت کی سزا دی گئی۔ 7 ر اکتوبر کو عدالت کا یہ فیصلہ جیل میں ملزموں کو سنایا گیا۔ کیونکہ انہوں نے اس ٹربیونل کا بائیکاٹ کیا ہوا تھا۔ 8 ر اکتوبر کو اخبارات نے خصوصی ایڈیشن چھاپے اور پورے ہندوستان میں بالخصوص لاہور میں طالب علم، مرد اور عورتیں سڑکوں پہ نکل آئے۔ بھگت سنگھ زندہ باد، راج گرو زندہ باد، سکھ دیو زندہ باد، انقلاب زندہ باد کے نعروں سے لاہور کی سڑکیں اور گلیاں گونج اٹھیں۔ احتجاجی مظاہرے شروع ہو گئے۔ جلوسوں پر لاٹھی چارج کیا گیا۔ ڈی اے وی کالج کے پروفیسروں اور طالب علموں سمیت سینکڑوں افراد زخمی ہوئے۔ اسی شام 12 ہزار مظاہرین لاہور میں موچی گیٹ کے باہر جمع ہوئے جن سے لالہ لاجپت رائے کی بیٹی شری متی پربتی دیوی نے خطاب کیا۔ امرتسر، دہلی، بمبئی، کان پور، الہ باد، بنارس، کلکتہ غرضیکہ ہندوستان کے تمام بڑے چھوٹے شہروں میں جلسوں اور ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ وہ وقت ہے جب پورا ہندوستان گاندھی کے ''بندے ماترم'' کے نعرے کی بجائے ''انقلاب زندہ باد'' کے نعروں سے گونج رہا تھا اور گاندھی نہیں، بھگت سنگھ ان کا ہیرو تھا۔

برطانیہ کی پریوی کونسل (Privy Council) میں اپیل کی گئی کہ وہ آرڈی نینس جس کے تحت ٹربیونل قائم کیا گیا تھا، غیر قانونی تھا۔ مگر جج وائی کاؤنٹ ڈنیڈن (VISCOUNT DUNEDIN) نے یہ اپیل خارج کر دی۔ اس کے بعد 14 ر فروری 1931ء کو کانگرس کے صدر مدن موہن مالویا نے لارڈ ارون سے رحم کی اپیل کی

اور گاندھی پر بھی مداخلت کرنے کے لئے عوامی دباؤ پڑا۔ مگر گاندھی خاموش رہا۔ کیونکہ بھگت سنگھ ہندوستان کی آزادی کا ہیرو بن گیا تھا اور گاندھی کے مفاد میں تھا کہ بھگت سنگھ کو پھانسی دے کر اس کی آواز برائے انقلاب کو ختم کر دیا جائے۔ تاج برطانیہ کی بھی یہی مرضی تھی۔ بورژوازی طبقہ، جاگیردار اشرافیہ، مذہبی اجارہ دار، انگریز کے پالتو افراد اور خاندان ان سب کو ایک سیکولر سوشلسٹ عوامی ہندوستان سے خطرہ تھا۔

19 / مارچ 1931ء کے ایک نوٹ میں لارڈ اروِن لکھتا ہے "واپسی پر گاندھی نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا بھگت سنگھ کے معاملے پر بات کی جائے کیونکہ اخباری اطلاعات ہیں کہ 24 / مارچ کو اسے پھانسی دی جائے گی۔ اگر اس دن پھانسی دی گئی تو ہمارے لئے بہت مشکل ہوگی کیونکہ کانگرس کے نئے صدر نے اسی دن کراچی کانفرنس میں پہنچنا ہے اور اس موضوع پر بہت تلخ بحث کا امکان ہے۔ میں نے اس کو کہا کہ میں نے یہ فیصلہ بہت غور و خوض کے بعد کیا ہے۔ مجھے ایسے لگا کہ میرے اس جواب میں اسے کافی وزن نظر آیا۔"

گاندھی نے اروِن کے ساتھ سمجھوتے میں کانگرسی قیدی رہا کروا لئے تھے اور کسی بھی انقلابی قیدی کی رہائی کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ گاندھی کی خواہش کو سامنے رکھتے ہوئے 24 / مارچ کی تاریخ تبدیل کر کے 23 / مارچ کر دی گئی مگر آخر وقت تک اس کو صیغۂ راز میں رکھا گیا۔ اس دوران پنجاب کے گورنر جیفری منٹگمری پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ ہری سنگھ تلوار نے پنجاب یونیورسٹی کانووکیشن کے موقع پر اسے گولی ماری جو کہ اس کے بازو میں لگی اور وہ زندہ بچ گیا۔ اسی طرح سپرنٹنڈنٹ پولیس شیخ عبدالعزیز پر بھی قاتلانہ حملہ ہوا۔ بھگت سنگھ کے وہ انقلابی ساتھی جو باہر تھے انہوں نے بھگت سنگھ اور اس کے ساتھوں کو جیل سے چھڑانے کا منصوبہ بنایا۔ دُرگا بھابھی کا خاوند بھگوتی چرن ووہرا اس مقصد کے لئے بم بنا رہا تھا کہ ان میں سے ایک بم پھٹا اور وہ جاں بحق ہوگیا۔ گرفتاریاں ہوئیں اور منصوبہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ البتہ جیل کے چاروں طرف فوجی پہرہ بٹھا دیا گیا۔ بھگت سنگھ کی پھانسی سے انتظامیہ کے تمام افسر خوفزدہ تھے۔

ہندوستان کے عوام بیدار تھے۔ انگلستان میں بھی لوگوں کی ہمدردیاں بھوک

ہڑتال اور جتندر داس کی موت کے حوالے سے ان کے ساتھ تھیں۔ پھانسی سے چند روز پہلے لاہور میں دفعہ 144 لگا دی گئی۔ پولیس کی بھاری نفری کی موجودگی میں سول اور پولیس افسران نے جیل کے باہر کیمپ لگا رکھے تھے مگر اندر سے ان سب کی حالت خراب تھی۔ انقلابیوں کے خوف سے ایک عرصے تک ان ناموں کو خفیہ رکھا تھا جو پھانسی کے موقع پر جیل کے اندر تھے یا باہر تھے۔ ایک ہندوستانی سول سرونٹ R.KUSHIK نے 19 ر اکتوبر 2011ء کے ہندوستان ٹائمز میں ان میں سے کچھ ناموں کا انکشاف کیا ہے۔ اس کے مطابق جیل کے باہر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور شیخ عبدالحمید، سٹی مجسٹریٹ لالہ نتھو رام، ڈی ایس پی شان سنگھ، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس لاہور جے۔ آر۔ مورس تھے۔ جبکہ جیل کے اندر بیکر سٹیڈ (BAKER STEAD)، رابرٹ، ہارڈنگ اور ڈپٹی سپرٹنڈنٹ جیل خان صاحب محمد اکبر موجود تھے۔

اس وقت کے قانون کے مطابق پھانسی دیئے جانے تک کی تمام کارروائی مجسٹریٹ کی نگرانی میں ہوتی تھی۔ یعنی پھانسی گھاٹ پر پہنچنے سے لے کر تختۂ دار پر لاش کے لٹکنے تک کی تمام کارروائی مجسٹریٹ کی نگرانی میں ہوتی تھی۔ بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی سیاسی وعوامی قوت کا عالم یہ تھا کہ کوئی مجسٹریٹ یہ کام کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ چنانچہ قصور سے ایک اعزازی مجسٹریٹ نواب محمد احمد خان جو اس کام کے لئے تیار تھا اسے لایا گیا۔ ہارون خالد جن کی تاریخ پر اور بالخصوص لاہور کی تاریخ پر گہری نظر بھی ہے اور تحقیق بھی، وہ 30 ر مئی کے THE NEWS میں لکھتے ہیں بھگت سنگھ کی پھانسی کے حوالے سے ایک دلچسپ کہانی یہ ہے کہ قصور سے اعزازی مجسٹریٹ نواب محمد احمد خان کو اس کام کے لئے تعینات کیا گیا۔ اس نے ان تینوں کی پھانسی کی نگرانی کی۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ اس اعزازی مجسٹریٹ کو جو کہ احمد رضا خان قصوری کا باپ تھا، بھٹو صاحب کے دور میں اسی جگہ پر گولی لگی جہاں پر سنٹرل جیل لاہور کا پھانسی گھاٹ تھا (یعنی شادمان) اور جہاں پر اس کی نگرانی میں بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو پھانسی دی گئی تھی۔ آج ستلج کے اس پار ان تینوں شہیدوں کی سمادھی ہے اور اس طرف نواب محمد احمد خان کی قبر ہے۔

پھانسی گھاٹ پر پہنچ کر تینوں نے کالا نقاب پہننے سے انکار کیا، ایک دوسرے سے گلے ملے۔ انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند کئے اور 23 مارچ 1931ء کو شام سات بج کر تیس منٹ پر بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کو پھانسی دے دی گئی۔ پھانسی دینے سے پہلے اور کئی گھنٹے بعد تک پوری سنٹرل جیل کے قیدی ''انقلاب زندہ باد''، ''بھگت سنگھ زندہ باد''، ''راج گرو زندہ باد''، ''سکھ دیو زندہ باد'' کے نعرے لگاتے رہے۔

سنا گیا ہے کہ 22 اور 23 مارچ کی درمیانی رات کو لاہور میں جو آندھی اور طوفان آیا اس سے پہلے لاہور والوں نے ایسا طوفان کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر پورے ہندوستان میں اٹھے ہوئے انگاروں بھرے عوامی انقلاب کو کچھ ہی عرصے میں اصلاح کار سیاست دانوں نے ٹھنڈے راستے پر ڈال دیا۔ مسلم لیگ کی غیر عوامی، موقع پرستانہ سیاست سے دل برداشتہ ہو کر محمد علی جناح ہندوستان چھوڑ کر واپس انگلستان آ بسے۔

بھگت سنگھ نے اپنے آخری خط میں لکھا۔

Dear Frirends, the days of my life have come to an end, Like a flame of candle in the morning, I disappear before the light of the dawn. Our faith and our ideas will stir the whole world like a spark of lighting. What harm if this handful of dust is destroyed.

تختہ دار پر ایک گھنٹے تک لاشیں لٹکتی رہیں۔ سنٹرل جیل کی عقبی دیوار کو توڑ کر رات کے اندھیرے میں ان تینوں کی لاشوں کو گنڈا سنگھ والا دیہات میں لے جا کر جلایا گیا اور راکھ کو فیروز پور سے دس میل دور دریائے ستلج میں بہا دیا گیا۔

24 مارچ کو جب کانگرس کا سالانہ اجلاس کراچی میں شروع ہوا تو سینکڑوں طالب علموں اور عوام نے کالی جھنڈیوں سے گاندھی کا استقبال کیا اور ''گاندھی مردہ باد'' کے نعرے لگائے۔ ہندوستان کے تمام شہروں میں شدید احتجاج ہوا۔ جس پر سختی سے قابو پایا گیا۔ ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو سر ہوریس ولیم سن (Sir Horace Williamson) پھانسی

کے چار سال بعد لکھتا ہے کہ ''بھگت سنگھ کی تصویر ہر شہر قصبے اور گاؤں میں جس طرح بک رہی تھی، لگتا تھا کہ گاندھی پر بھگت سنگھ کی شہرت حاوی آ چکی ہے۔'' ان انقلابیوں نے اس یقین کے ساتھ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا کہ اس زمین میں امن ومحبت کے پھول کھلیں گے۔ سیاسی ومعاشی غلامی کی لمبی اور سیاہ رات ختم ہوگی اور عوام ایک آزاد، سیکولر سوشلسٹ متحدہ ہندوستان میں سر اٹھا کر جئیں گے۔ استحصال سے پاک ایک ایسا ہندوستان جو سب کے لئے ہوگا، معرض وجود میں آئے گا۔

پولیس چندر شیکھر آزاد کو گرفتار کرنے میں ناکام رہی تھی۔ 27 رفروری 1931ء کو جب پولیس نے گھیرا تنگ کر کے چندر شیکھر کو گرفتار کرنا چاہا تو پہلے اس نے مقابلہ کیا اور پھر خود کو گولی مار کر ہلاک کر لیا۔ 1931ء تک ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن کے رہنما یا تو مار دیئے گئے یا پھر جیل میں تھے۔ آزاد کی موت اور بھگت سنگھ اور ساتھیوں کی پھانسی کے بعد HSRA کی مرکزی قیادت ختم ہوگئی۔ اگرچہ سرکاری افسروں پر حملے ہوتے رہے اور بم بھی مارے جاتے رہے مگر مرکزی رہنمائی کے بغیر پارٹی بکھرنے لگی۔ میرٹھ میں دسمبر 1931ء میں ایک بار کوشش کی گئی کہ HSRA کو کھڑا کیا جا سکے مگر یشپال اور دریاؤ سنگھ کی 1932ء میں گرفتاری کے بعد یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ پارٹی علاقائی حصوں میں بٹ گئی اور 1936ء تک تقریباً ختم ہوگئی۔

ہندوستان کی درسی کتابوں میں گاندھی، ولبھ بھائی پٹیل، نہرو اور کانگرس کے کارناموں کے علاوہ کسی انقلابی وطن پرست کی جدوجہد کا ذکر نہیں ملتا۔ یہی حال ہماری درسی کتابوں کا ہے۔ بھگت سنگھ اور منگل پانڈے کو بھی عوامی سطح پر ٹی وی اور فلموں کے ذریعے ہندوستان میں پہچان ملی۔ اس سے پہلے تک انہیں فراموش کیا گیا۔ پاکستان میں مذہبی انتہا پسندوں کے دباؤ کے باوجود ترقی پسندوں کی جرأت مند کوششوں کے نتیجے میں پنجاب حکومت نے صوبائی اسمبلی کی منظوری کے بعد شادمان چوک، جہاں پر بھگت سنگھ کو پھانسی دی گئی تھی، کا نام تبدیل کر کے بھگت سنگھ چوک رکھ دیا ہے۔ یہ چوک اور اس کے اردگرد کا علاقہ لاہور کی سنٹرل جیل ہوا کرتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ضیاالحق کے دور میں جن سیاسی کارکنوں کو کوڑے

مارے گئے، پھانسی پر لٹکایا گیا، خاندان تباہ کئے گئے، ان کی یادگاریں بھی ضرور تعمیر ہوں گی اور مذہبی انتہا پسندوں کے شکار ہونے والے معصوم انسانوں کا خون بھی اپنا حساب لے گا۔

میرٹھ سازش کیس

بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو پھانسی دے دی گئی۔ کمیونسٹوں پر ابھی تک میرٹھ سازش کیس کا مقدمہ چل رہا تھا۔ یہ مقدمہ جو مارچ 1929ء میں شروع ہوا 1933ء میں جا کر ختم ہوا۔ ہندوستان کی اس وقت تک کی تاریخ میں یہ سب سے زیادہ طویل مقدمہ ہے۔ جب اپریل 1929ء میں بھگت سنگھ نے اسمبلی میں بم پھینکے تو میرٹھ سازش کیس شروع ہو چکا تھا۔ 20/مارچ 1929ء کو جن 31 سرکردہ کمیونسٹوں کو گرفتار کیا گیا ان میں شوکت عثمانی، مظفر احمد، ایس اے ڈانگے، بی ایف بریڈلے، فلپ سپراٹ، کے این سہگل، اے پرشاد، جی آدھی کاری، آر مترا، گوپن چکرا ورتی، کشور لعل گھوش، کے ایل قدم، ڈی آر تھنڈی گوراشنکر، ایس بینر جی، کے این جوگلکار، بی ایس موشی، ایم جی ڈیسائی، جی گوسوامی، آر ایس نمبکار، ایس ایس میراجکار، جی وی رگھیٹ، ایس ایس جوش اور گوپال باسک شامل تھے۔

ایچ۔ ایل۔ ہچنسن (H.L.HUTCHINSON) جو ایک صحافی تھا اور انڈین ڈیلی میں کام کرتا تھا اسے بھی بعد میں گرفتار کیا گیا۔ اس روز ہندوستان بھر میں بڑے پیمانے پر ٹریڈ یونین کارکن اور ''شرپسند'' عناصر گرفتار کئے گئے۔ میرٹھ سازش میں ملوث 32 افراد پر الزام یہ تھا کہ 1921ء میں شوکت عثمانی، مظفر احمد اور ڈانگے نے سازش کر کے جن میں برطانیہ سے آئے ہوئے فلپ سپراٹ، بنجمن فرانسس اور بریڈلے بھی شامل تھے ہندوستان میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کی شاخ قائم کی اور ان سب نے برطانوی ہندوستان میں شہنشاہ کی حکمرانی کو ختم کرنے کے لئے سازش کی۔

زار روس کے خاتمے اور 17/اکتوبر 1917ء کے انقلاب روس کی وجہ سے دنیا بھر کے جاگیردار، بورژوازی، سرمایہ دار، بادشاہ اور شہنشاہ فکرمند تھے۔ کیونکہ یورپ

امریکہ اور ایشیا میں بہت تیزی سے کمیونسٹ نظریات پروان چڑھ رہے تھے۔ مزدو تحریکیں جنم لے رہی تھیں، کمیونسٹ پارٹیاں قائم ہو رہی تھیں جن کی رہنمائی کمیونسٹ انٹرنیشنل کر رہی تھی۔ حکومت برطانیہ اپنی سلطنت میں، بالخصوص ہندوستان میں، مزدور تحریک اور کمیونسٹ تحریک کو سختی سے دبانا چاہتی تھی۔ 1921ء سے اب تک ہندوستانی کمیونسٹوں پر پشاور سازش کیس، ماسکو سازش کیس اور کانپور سازش کیس چل چکے تھے۔ کانپور کیس میں انہیں سزائیں ہو چکی تھی کہ میرٹھ سازش کیس چل نکلا تھا۔ شوکت عثمانی جنہیں کانپور کیس میں 16 سال قید کی سزا ہوئی تھی اور ابھی جیل میں ہی تھے کہ اس کیس میں ملوث کر لئے گئے تھے۔

انہوں نے جیل میں اپنی قید کے دوران 1929ء میں برطانوی پارلیمنٹ کا انتخاب SPEN VALLEY سے لڑا۔ یہ انتخاب انہوں نے کمیونسٹ پارٹی آف گریٹ بریٹین کے ٹکٹ پر لڑا۔ ان کی غیر موجودگی میں BILLY BRAIN کی سرکردگی میں ان کی انتخابی مہم چلائی گئی۔ 1931ء میں انہوں نے دوبارہ کمیونسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر SOUTH EAST St. PANCRAS کی پارلیمنٹ کی نشست کے لئے انتخاب لڑا۔ ان کے مقابلے میں SIR ALFRED LANE BEIT تھا جو جنوبی افریقہ میں سونے کی کانوں کا مالک تھا۔ شوکت عثمانی وہ واحد ہندوستانی شہری تھے جنہوں نے ہندوستان سے برطانوی پارلیمنٹ کا انتخاب لڑا۔ ان کے دونوں بار انتخابی مہم میں حصہ لینے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ برطانیہ میں میرٹھ سازش کیس اور ہندوستان میں ہونے والی جدوجہد آزادی کو شہرت ملی۔

جنوری 1933ء میں 27 افراد کو قید کی سزائیں سنائی گئیں جن میں مظفر احمد کو عمر قید، ڈانگے، جوگلکار، گھیٹ، سپراٹ اور نمبکار کو بارہ سال کی قید اور شوکت عثمانی کو دس سال کی قید دی گئی۔ اگست 1933ء میں چیف جسٹس الہ آباد سر شاہجہاں سلیمان کی عدالت میں اس فیصلے کے خلاف اپیل کی گئی اور ان سزاؤں میں کمی کی گئی۔ 1934ء تک تقریباً سب ہی کمیونسٹ رہا ہو گئے۔ کمیونسٹ پارٹی ختم ہونے کے بجائے مضبوط ہو کر ابھری، اپنا مینیفیسٹو دیا اور کمیونسٹ انٹرنیشنل کے ساتھ وابستہ ہو گئی۔

تاشقند ماسکو کیڈر یعنی شوکت عثمانی، ڈانگے وغیرہ کے کیڈر سے نکل کر مقامی قیادت کے ہاتھ میں آ گئی۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا چونکہ برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی سے احکامات لیتی تھی اس وجہ سے آزادانہ انقلابی کردار ادا نہ کر سکی۔ ہندوستان کے معروضی حالات اس بات کے متقاضی تھے کے ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی آزادانہ کردار ادا کرتی۔ 1934ء میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد کر دی گئی۔

1935ء میں جب کمیونسٹ انٹرنیشنل کی پالیسوں میں تبدیلی آئی تو کیمونسٹوں کو کانگرس کے ساتھ تعاون کرنے کی ہدایات دی گئیں۔ دوسری عالمی جنگ کے شروع میں کومن ٹرن کی پالیسی اس جنگ کے بارے میں عدم مداخلت کی تھی۔ کیونکہ سوویت یونین ابھی تک اتحاد سے باہر تھا۔ اس وقت یہ کہا جاتا تھا کہ یہ جنگ ایک سامراجی جنگ ہے جو مختلف قوموں کے حکمران طبقات کے درمیان سامراجی عزائم ومفادات کی جنگ ہے۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کانگرس کا ساتھ دے رہی تھی۔ ڈنکر مہتا، سجاد ظہیر، نمبو دری پد اور سولی باٹلی والا جیسے کمیونسٹ کانگرس سوشلسٹ پارٹی کی قومی مجلس عاملہ کے ممبر بن گئے۔ 1939ء میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا پر پھر سے پابندی لگا دی گئی مگر 22 رجون 1941ء کو جب سوویت یونین پر حملہ ہوا اور وہ ہٹلر کے خلاف امریکہ اور برطانیہ کا اتحادی بنا تو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کو قانونی حیثیت دے دی گئی۔

سوویت یونین کے اتحادی بننے کے بعد یہ جنگ جو ''سامراجی'' تھی اب ''عوامی جنگ'' کہلانے لگی۔ اگرچہ 1943ء میں سٹالن نے کومن ٹرن کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا مگر کومن ٹرن کی پالیسی نے نہ صرف کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کو الجھاؤ کا شکار کیا بلکہ جب گاندھی نے ''انڈیا چھوڑ دو'' کا نعرہ لگایا تو عوام اصلاح پسند جماعتوں کے ساتھ جڑنے لگے۔

جب 1920ء میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا قائم کی گئی تھی تو سٹالن نے مشورہ دیا تھا کہ ہندوستان کی اس پارٹی کا نام لیبر پارٹی رکھا جائے مگر اس کا نام کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا رکھا گیا۔ جس کا نقصان یہ ہوا کہ کمیونزم کے خلاف پروپیگنڈا کی وجہ سے مسلمان اور ہندو عوام اور کسانوں کی اکثریت اس میں شامل ہونے سے ہچکچانے لگی۔ مذہب کے نام پر

کمیونزم کے خلاف معصوم انسانوں کو الجھانا سامراج کے لئے پہلے بھی آسان تھا اور آج بھی آسان ہے۔ چنانچہ کمیونسٹ پارٹی نے اپنا کردار تو بھرپور ادا کیا مگر جدوجہد آزادی کی انقلابی تحریک نہ بن سکی اور نہ ہی کمیونسٹ پارٹی اس جدوجہد کی قیادت کر سکی۔

انجمن ترقی پسند مصنفین

ان کا مقصد ادبی شان دکھانا نہیں بلکہ زندگی کی تعمیر تھا

میرٹھ سازش کیس نے انگریز کے خلاف جدوجہد کو نیا ولولہ دیا۔ کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ 1934ء سے 1938ء تک کی اس پابندی کے دوران 1935ء میں ترقی پسندوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین قائم کی اور کمیونسٹوں نے اس پلیٹ فارم کے ذریعے کام کو جاری رکھا۔ اس کی پہلی میٹنگ بھی لندن میں ہوئی اور اس کا منشور بھی لندن میں تیار کیا گیا۔ اب یہ جدوجہد قلم کے ذریعے تھی۔

ترقی پسندوں نے بلا امتیاز رنگ ونسل ومذہب انقلابی نظریے کا اظہار اردو ادب کے ذریعے اس طرح کیا کہ اردو ادب میں بھی ایک انقلاب برپا ہوا۔ انہوں نے گل وبلبل سے نکل کر، ادب برائے ادب سے نکل کر ادب برائے زندگی کی شمع روشن کی اور قلم کے ذریعے ایک ایسے معاشرے کے قیام کے لئے جدوجہد کی جس میں عوام کی حاکمیت ہو، لوٹ کھسوٹ کے معاشی نظام کو ختم کر کے سوشلسٹ معاشرہ قائم کیا جائے۔ جس میں ذرائع پیداوار اور مسائل عوام کے قبضے میں ہوں۔ اشتراک کی بنیاد پر دولت کی پیداوار اور اس کی تقسیم ہو۔

انجمن ترقی پسند مصنفین ہی کے زیر سایہ مخدوم محی الدین کی قیادت میں چلنے والی تلنگانہ تحریک کسانوں کی ایک اہم اور طاقتور تحریک ثابت ہوئی جسے آزادی کے بعد سوشلسٹ کہلائے جانے والے پنڈت نہرو نے ریاستی جبر کے ذریعے ختم کیا۔

انقلاب روس کے بعد ہندوستان میں خیالات تو موجود تھے مگر 1935ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد یہ خیالات غیر معمولی تیزی کے ساتھ پھیلے۔

دانشوروں میں ایک سیاسی اور معاشرتی ہیجان کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اور وہ بورژوا طبقے کی طرز فکر اور طریقہ عمل کو ترک کر کے مزدوروں اور کسانوں کی تحریکوں میں حصہ لینے لگے۔

1937ء میں جب پنجاب کسان کمیٹی کا سالانہ اجلاس امرتسر میں ہوا تو ترقی پسندوں نے بھی اسی موقع پر اپنی کانفرنس امرتسر میں کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے مہتمم فیض احمد فیض تھے۔ اس کانفرنس میں سجاد ظہیر، چراغ حسن حسرت، رگھونش کمار، رگھوپتی چوپڑا، پروفیسر سنت سنگھ، ڈاکٹر اشرف، ظہیر کاشمیری اور کرشن چندر نے شرکت کی۔ ان ہی دنوں سجاد ظہیر کی ملاقات علامہ اقبال سے ہوئی۔ وہ اپنی کتاب ''روشنائی'' میں لکھتے ہیں۔

''امرتسر سے ڈاکٹر اشرف اور میں لاہور آئے۔ میاں افتخار الدین کے یہاں ٹھہرے۔ میاں صاحب نے علامہ اقبال سے ہمارے ملنے کا وقت مقرر کیا۔ ہم تیسرے پہر چائے کے بعد ان کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ گرمیوں کے دن تھے اور اقبال اپنی کوٹھی کے باہر ایک کھردری بان کی چار پائی پر نیم دراز بستر کا تکیہ لگائے بیٹھے تھے اور حقہ پی رہے تھے۔ ان کے پلنگ کے گرد جو تین چار مونڈھے رکھے گئے تھے ہم ان پر بیٹھ گئے...... ہمارے ساتھ علامہ اقبال کا التفات وعنایت کا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ مجھے جرأت ہوئی کہ سب سے پہلے ان سے ہمیں جو اختلاف اور شکایتیں تھیں، وہی ان کے سامنے پیش کروں اور محض عقیدت مندی کی باتیں نہ کروں۔

''سوشلزم کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی اور شاید میں نے کہا کہ ہماری نظر میں قوم کی غلامی، بین الاقوامی جنگ، محنت کشوں کے ظالمانہ استحصال کا علاج موجودہ دور میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے لیکن انہوں نے بعض مقامات پر اپنے کلام میں اشتراکی نظریے پر غلط نکتہ چینی کی ہے۔ خود ان کی آزادی خواہی اور انسان نوازی کی منطق ہمیں سوشلزم کی طرف لے جاتی ہے اور ہماری نظر میں نوع انسانی کی موجودہ ارتقاء کی منزل وہی ہے۔ میں نے کہا کہ نوجوان ترقی پسند ادیبوں کا گروہ اس نئے نظریے سے کافی متاثر ہے۔ وہ بڑی توجہ اور سنجیدگی سے میری باتیں سنتے رہے۔ بلکہ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس طرح کی باتوں کے لئے میری ہمت افزائی فرما رہے ہیں۔ پھر انہوں نے کہا، تاثیر نے مجھ سے

ترقی پسند تحریک کے متعلق دوایک بار باتیں کی تھیں اور مجھے اس سے بڑی دلچسپی ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ سوشلزم کے سمجھنے میں مجھ سے غلطی ہوئی ہو...... بات یہ ہے کہ میں نے اس کے متعلق بہت پڑھا بھی نہیں ہے۔ میں نے تاثیر سے کہا تھا کہ وہ اس موضوع پر مجھے مستند کتابیں دیں۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا لیکن ابھی تک پورا نہیں کیا...... میرا نکتۂ نظر آپ جانتے ہیں۔ ظاہر ہے مجھے ترقی پسند ادب یا سوشلزم کی تحریک کے ساتھ ہمدردی ہے۔ آپ لوگ مجھ سے ملتے رہیے۔'' علامہ اقبال کا جلد ہی انتقال ہوگیا۔

ترقی پسند مصنفین کے تمام افراد اپنی دھن میں پکے اور عقیدے کے سچے تھے۔ ان کے نظریات بھی تھے اور عمل بھی تھا۔ ان کا مقصد ادبی شان دکھانا نہیں تھا بلکہ زندگی کی تعمیر تھی۔ ترقی پسند ادیبوں نے زوال پذیر جاگیردارانہ تہذیب، بیرونی سامراج اور اس کی پروردہ استحصالی سوچ سے نوجوان نسل کو باہر نکالا۔ ان ترقی پسندوں نے بقول سجاد ظہیر ''لاہور کی ادب پرور سرزمین پر ایسا اثر چھوڑا کہ اردو ادب کے کھلیانوں میں سنہرے خوشوں کا قیمتی انبار لگ گیا۔ فیض احمد فیض، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیب، ظہیر کاشمیری، ساحر لدھیانوی، اپندر ناتھ اشک جیسے شاعروں اور ادیبوں نے ترقی پسند ادب کے علَم کو اتنا اونچا کیا کہ اس کی درخشاں بلندیاں ہمارے وطن کے دوسرے حصے کے ادیبوں کے لئے قابل رشک بن گئیں۔''

آزاد ہند فوج

روس کے انقلاب اکتوبر نے غلام اقوام کے جذبۂ جدوجہدِ آزادی کو قوت بخشی۔ دوسری عالمی جنگ میں سوویت یونین کی مزاحمت اور بہادری نے تاریخ عالم میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ جرمن فوجی مہینوں تک محاصرہ جاری رکھنے کے باوجود نہ تو ماسکو میں داخل ہو سکے اور نہ ہی لینن گراڈ کے 9 مہینے کے محاصرے کے بعد شہر کو فتح کر سکے۔ پھر سٹالن گراڈ میں وہ عظیم معرکہ ہوا جس میں سوویت یونین کی سرخ فوج نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا اور جرمن فوجوں کی پسپائی شروع ہوگئی۔ سرخ فوج ان کو دھکیلتی ہوئی برلن تک لے گئی جہاں پر

جرمنی نے ہتھیار ڈال دیئے۔ سرخ فوج نے یورپ کو آزاد کروانا شروع کیا تو غلام ملکوں میں آزادی کی تحریکوں نے زور پکڑا۔ ایٹم بم کے خوف کے باوجود کوریائی عوام نے جدوجہد کی اور کم ال سنگ کی حکومت قائم ہوئی۔ چین کی کمیونسٹ پارٹی کی مسلح جدوجہد کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ ویت نامی قوم پرست کمیونسٹوں نے آزادی کا اعلان کیا اور ہوچی منہ کی حکومت قائم ہوئی۔ انڈونیشیا کے حریت پسندوں نے آزادی کا اعلان کیا اور سوئیکارنو کی حکومت قائم ہوئی۔ ملایا کی کمیونسٹ پارٹی نے آزادی کی جدوجہد کرتے ہوئے مقامی حکمرانوں پر مشتمل وفاق قائم کیا۔ ملائیشیا قائم ہوا۔ برما کی کمیونسٹ پارٹی نے جدوجہد کی اور اعتدال پسندوں کی قیادت میں آزاد ڈومینین قائم کیا۔ عرب قوم پرستی کی لہر اٹھی اور برطانوی فرانسیسی اور امریکی سامراجوں کے خلاف مسلح جدوجہد ہوئی۔ مصر میں برطانوی فوجوں کے انخلا کے لئے عرب قوم پرستوں نے جدوجہد کی۔ ایران میں تودہ پارٹی کی قیادت میں برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد ہوئی۔ ہندوستان میں برطانیہ کے شہنشاہ معظم کے خلاف مسلح جدوجہد ہوتی رہی۔ مگر یہ جدوجہد بالآخر اصلاح کار سیاست دانوں کے غلبے میں آ گئی۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران آزاد ہند فوج نے جنم لیا۔ اسی فوج کے قیام نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں ایک مسلح منظم فوج کے ذریعے ہندوستان کو آزاد کروانے کا عملی قدم اٹھایا۔ جب کانگرس نے دوسری عالمی جنگ میں انگریز کا ساتھ دیا تو کانگرس کے مشہور قوم پرست رہنما سبھاش چندر بوس جو کانگرس کی صدارت کی کرسی پر دوبار 1936 اور 1939 میں فائز رہے تھے انہوں نے کانگرس سے استعفیٰ دے کر آل انڈیا فارورڈ بلاک بنا لیا۔ انگریز نے انہیں کلکتہ میں نظر بند کر دیا جہاں سے وہ خفیہ طور پر 1941ء میں کابل سے ہوتے ہوئے جرمنی پہنچے اور دوسری عالمی جنگ کے دوران انگریز کے خلاف جرمنی کے ساتھ مل کر متحدہ محاذ قائم کیا۔ وہاں سے وہ جرمنی اور جاپانی آبدوز کشتیوں کے ذریعے 8/فروری 1943ء کو چل کر ایک طویل سمندری راستہ طے کر کے 13/جون 1943ء کو ٹوکیو پہنچے۔ یہاں پر ان کی ملاقات جاپان کے وزیر اعظم جنرل ٹوجو (TOJO) سے ہوئی۔

انگریز کے خلاف جنوب مشرقی ایشیا میں آباد ہندوستانیوں نے بنکاک میں

15 رجون 1942ء کو انڈین انڈیپنڈنٹ لیگ راش بہاری بوس اور موہن سنگھ کی قیادت میں قائم کی تھی۔ جواب انتشار کا شکار تھی۔ راش بہاری بوس اس کے صدر تھے۔ انہوں نے 2رجولائی 1943ء کو سبھاش چندر بوس کا سنگاپور میں ہزاروں افراد کے ساتھ استقبال کیا اور انڈین انڈیپنڈنٹ لیگ کی سربراہی نیتاجی (سبھاس چندر بوس کو نیتاجی کہا جاتا تھا) کو سونپ کر خود سبکدوش ہو گئے۔ نیتاجی نے دوسرے ہی روز آزاد ہند فوج کے قیام کا اعلان کر کے ''چلو دہلی'' کا نعرہ بلند کر دیا۔

21راکتوبر 1943ء کو سنگاپور میں آزاد ہند کی عارضی حکومت قائم کی گئی اور برطانیہ اور امریکہ کے خلاف کھلا اعلان جنگ کر دیا گیا۔ چند ہی روز میں اس حکومت کو جاپان، جرمنی، اٹلی، کروشیا، برما، تھائی لینڈ، نیشنلسٹ چین، فلپائن اور منچوریا نے تسلیم کر لیا۔ آزاد ہند فوج PAN-SOUTH-ASIAN تھی اور متحدہ ہندوستان چاہتی تھی جس میں سری لنکا بھی اس کا حصہ تھا۔

جاپان نے جنگ میں شامل ہونے کے بعد برطانوی مقبوضات پر فتح حاصل کی جہاں پر ہتھیار ڈالنے والی انگریزی فوج جس میں اکثریت ہندوستانیوں کی تھی، جاپانی کیمپوں میں جنگی قیدی کی حیثیت میں تھی۔ ان جنگی قیدیوں کو سبھاش چندر بوس نے وطن پرستی کے نام پر انگریز کے خلاف جنگ آزادی میں شامل ہونے کی دعوت دی اور وہ آزاد ہند فوج میں شامل ہو گئے۔ آزاد ہند فوج کی تعداد 43 ہزار بتائی جاتی ہے جن میں 20 ہزار ہندوستانی تجربہ کار فوجی افسر اور جوان تھے۔ اس فوج میں ایک خواتین کی بھی رجمنٹ تھی جس کا نام رانی آف جھانسی رجمنٹ تھا۔ آزاد ہند فوج کا موٹو تھا۔

Unity, Faith and Sacrifice (اتحاد، یقین اور قربانی)

میجر جنرل شاہنواز خان، حبیب الرحمٰن، کرنل پریم کمار سہگل، کرنل شوکت ملک، کیپٹن عبدالرشید، کیپٹن برہان الدین، لیفٹیننٹ گربخش سنگھ ڈھلوں وغیرہ آزاد ہند فوج کے قابل ذکر نام ہیں۔ کمانڈر انچیف سبھاش چندر بوس کے ADC کپتان عابد علی تھے۔ آزاد ہند فوج جذبۂ حب الوطنی سے سرشار برما فرنٹ پر ڈیڑھ سال تک بے سروسامانی کی حالت میں

دنیا کی سب سے بڑی طاقت کے ساتھ لڑتی رہی۔ سبھاش چندر بوس کا ہیڈ کوارٹر رنگون تھا۔

جس طرح برطانوی فوج کی قوت انڈین گن پوڈر رہا تھا اسی طرح ہندوستانی فوجیوں کی تعداد اور ان کی وفاداری بھی اس کی قوت تھی۔ دوسری عالمی جنگ میں برطانوی راج کو بچانے کے لئے 25 لاکھ ہندوستانی فوجیوں نے حصہ لیا۔ ہندوستانی فوجیوں کو معمولی تنخواہ کے عوض بھرتی کر کے حکومت برطانیہ ان کو جہاں چاہے اور جس تعداد میں چاہے بھیج دیتی تھی۔ ایتھوپیا (اس وقت ابی سینیا) کے TEWODROS II کو سبق سکھانا ہو، برما ہو، چین کی باکسر وارز ہوں یا مکہ مدینہ پر چڑھائی، کرایے کے سپاہی انگریز کے لئے ہمہ وقت تیار تھے۔ بی بی سی۔ ہسٹری۔ ورلڈ وارز۔ کالونیز۔ کلونیئل اینڈ ورلڈ وارٹو کے مطابق اس جنگ میں بھی ہندوستان کی پانچویں ڈویژن سوڈان میں اٹلی کے خلاف اور پھر لیبیا میں جرمنی کے خلاف، پھر اس کو عراق میں تیل کے کنوؤں کی حفاظت کے لئے بھیج دیا گیا۔ برما فرنٹ پر ہندوستان کی آٹھ ڈویژن فوج لڑ رہی تھی۔ چوتھی انڈین ڈویژن نے شمالی افریقہ، شام، فلسطین، قبرص اور پھر اٹلی میں برطانوی راج کو بچانے کی جنگ لڑی۔ ہندوستان نہ صرف انگریز فوج کی تربیت گاہ تھا بلکہ اس کا وسیع وعریض زرعی رقبہ خوراک اور دیگر اشیا بھی مہیا کرتا تھا۔ دوسری عالمی جنگ میں لڑنے والے 25 لاکھ فوجیوں اور انگریز افسروں کا خرچہ بھی ہندوستان کی معیشت پر تھا۔

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریز نے بنگال، بہار اور یوپی سے ہندوستانی فوجی بھرتی کرنے بند کر دیئے تھے۔ اور بھرتی کا یہ علاقہ پنجاب، پوٹھوار اور شمال مغربی سرحدی علاقوں میں منتقل کر دیا تھا۔ وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وفاداری کے ان حصوں سے بھرتی کئے گئے فوجی سپاہی اور افسر انگریز کے خلاف جنگ کریں گے مگر آزاد ہند فوج میں وہ پیش پیش تھے۔

15/اگست 1945ء کو جاپان نے دوسری عالمی جنگ میں باقاعدہ طور پر اپنی شکست کا اعتراف کر لیا۔ اس کے تین دن بعد یعنی 18/اگست کو آزاد ہند فوج کے کمانڈر ان چیف سبھاش چندر بوس ایک بمبار طیارے میں ٹوکیو جا رہے تھے کہ جہاز میں آگ لگ گئی اور

وہ اس میں ہلاک ہو گئے۔ آزاد ہند فوج کے قیام اور انگریز کے خلاف جنگ نے ہندوستان کے عوام کو یقین کی اس منزل پر لا کر کھڑا کیا تھا کہ آزاد ہند فوج انہیں انگریز کی غلامی سے لڑ کر نجات دلائے گی اس لئے سبھاش چندر بوس کی موت کا انہیں یقین نہیں آیا اور ایک عرصے تک وہ امید کرتے رہے کہ نیتا جی ایک روز پھر ایک نئی قوت کے ساتھ نمودار ہوں گے۔

آزاد ہند فوج کے فوجیوں کو قید کر کے انگریز نے انتقاماً بے پناہ تشدد کیا اور اکثر کو پھانسی دے دی۔ ان پر ہونے والے مظالم پر پردہ پڑا رہا۔ بالآخر ایک اخبار کے ایڈیٹر نے بڑی جرأت سے چھپتے چھپاتے برما اور سیام پہنچ کر ان مظالم کو منظر عام پر لانے کا کام سرانجام دیا۔ آزاد ہند فوج کے سپاہیوں اور افسران کے خلاف جنگ میں شرکت، غداری اور قتل کے جو مقدمات درج ہوئے ان کے دفاع کے لئے جو ڈیفنس کمیٹی بنی اس میں جواہر لال نہرو، سر تیج بہادر سپرو، اور مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کے علاوہ مسلمان قانون دان بھی شامل تھے۔ لال قلعہ دہلی میں جب یہ مقدمات چلے تو پورے ہندوستان میں ہنگامے برپا ہوئے۔ جن میں ہندو مسلم سکھ عیسائی سب ہی شریک تھے۔ ایک بار پھر 1857ء کی جنگ آزادی کی یاد تازہ ہو گئی۔ عوام کا غم و غصہ اپنی انتہا پر تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ آزاد ہند فوج کے افسروں کو آزاد کیا جائے اور ویت نام، ملایا، انڈونیشیا وغیرہ سے ہندوستانی فوجوں کو واپس بلایا جائے۔ دہلی، لاہور، کلکتہ، مدراس، غرضیکہ ہر شہر میں فسادات ہوئے، لوٹ مار ہوئی، پولیس نے گولیاں چلائیں، بے شمار لوگ مارے گئے، ہزاروں زخمی ہوئے۔ بدامنی کا سلسلہ کئی مہینے جاری رہا، حتیٰ کے 3 رجنوری 1946ء کو جب مقدموں کے فیصلے سنائے گئے تو ملک کارزار جنگ بن گیا۔ بالآخر کمانڈر انچیف کو یہ سزائیں معاف کر کے تمام ملزموں کو رہا کرنا پڑا۔ اس تمام عرصے میں عدم تشدد کا چیمپیئن گاندھی، بالخصوص کلکتہ میں جہاں پر بوس کے حامی بنگالی قوم پرستوں نے مشتعل ہو کر اتنے پر تشدد مظاہرے کئے تھے کہ فوج کو طلب کرنا پڑا تھا، لوگوں کو ٹھنڈا کرنے میں مصروف رہا۔ کانگرس کے لیڈروں کا آزاد ہند فوج کے وطن پرستوں کے بارے میں رویہ یہ تھا کہ ایک کانگرسی رہنما اور صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان نے جو کہ غفار خان کا بڑا بھائی تھا، گورنر سرحد جارج کنگھم سے کہا "اگر رنگون یا

سنگاپور ہی میں ان کو گولی سے اڑا دیا جاتا تو ہر شخص خوش ہوتا۔"

THE VICEROY JOURNAL-LORD WAVELL PAGE 188

مگر آزاد ہند فوج کے افسروں کے خلاف مقدمات کے ردعمل میں شدید احتجاج اور عوامی لہر کو ہندو بورژوا کی نمائندہ جماعت کانگرس نے اپنے انتخابی مقاصد کے لئے استعمال کیا اور پھر عدم تشدد کی راہ پر ڈال دیا۔

رائل انڈین نیوی کی بغاوت

آزاد ہند فوج کی مسلح جدوجہد نے رائل انڈین نیوی کو بغاوت کا راستہ دکھایا۔ یہ بغاوت 18رفروری 1946ء کو شروع ہوئی اور بمبئی، کراچی، کلکتہ، غرضیکہ تمام بندرگاہوں میں موجود 78 نیوی کے جہازوں تک پھیل گئی۔ 20 ہزار سیلرز کی اس بغاوت کو انگریز نے سختی سے کچلا۔ کانگرس اور مسلم لیگ نے انگریز کا ساتھ دیا اور اس بغاوت کی مخالفت کی جبکہ کمیونسٹ پارٹی نے بغاوت کا ساتھ دیا۔

ہندوستان آزاد ہوا۔ دو ملک وجود میں آ گئے

مگر یہ وہ سحر تو نہیں تھی جس کا انتظار تھا۔ ایک بے نور سویرا تھا

ہندوستان کی آزادی میں لاکھوں انقلابیوں، مسلح جدوجہد کرنے والوں کا خون، ان کے خاندانوں کی آہیں، سسکیاں اور آنسو شامل ہیں۔ ان کو پھانسیاں دی گئیں، کالا پانی بھیجا گیا، عمر قید دی گئی، جائیدادیں ضبط کی گئیں اور ان کی نسلوں پر حصولِ معاش کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ ہندوستان کی آزادی محض آئینی و قانونی جدوجہد یا چرخہ کات کر یا مرن برت رکھ کر حاصل نہیں ہوئی۔ یہ آزادی لاکھوں، کروڑوں اور کئی نسلوں کی جانی و مالی قربانیوں کی مرہونِ منت ہے۔ برطانوی سامراج کے خلاف یہ مسلح جدوجہد ہی تھی جس نے انگریز کو اصلاح پسند جماعتیں کھڑی کرنے اور پھر بعد میں ان کے رہنماؤں کے ساتھ معاملات کو طے کرنے پر مجبور کیا۔ ورنہ پورا ہندوستان مسلح جدوجہد کرتا ہوا ایک عوامی متحدہ سوشلسٹ ہندوستان کے راستے پر گامزن تھا۔

اصلاح پسند جماعتوں کے ذریعے ہندوستان کو آزادی دی گئی۔ چنانچہ تقسیم کے بعد دونوں ممالک میں جو حکومتیں قائم ہوئیں وہ عوامی انقلابی حکومتیں نہیں تھیں۔ پاکستان کو امریکہ کے دائرہ میں جانے میں دشواری نہیں ہوئی اور نہ ہی بھارت کو، جو سوویت یونین کا حامی سمجھا جاتا تھا، برطانیہ اور امریکہ کے ساتھ اندرون خانہ گٹھ جوڑ کرنے میں کوئی قباحت ہوئی۔ بھارت اصلاح پسندوں اور پاکستان رجعت پسندوں کے ہاتھ چڑھ گیا۔ پاکستان تو رجعت پسند تھا ہی، بھارت بھی اپنے عمل میں نہ تو سوشلسٹ تھا اور نہ ہی سیکولر۔ جب ضرورت پڑتی وہ چین کے خلاف امریکہ کی مدد حاصل کرتا اور جہاں ضرورت پڑتی وہ

سوویت یونین کو چین اور پاکستان کے خلاف استعمال کرتا۔

نتیجتاً آج دونوں ممالک کے عوام کے باہر جنگل ہے اور اندر آگ۔ اگر انقلابی جدوجہد کے ذریعے آزادی حاصل کر کے پورا ہندوستان ایک عوامی متحدہ سوشلسٹ ہندوستان معرض وجود میں آتا تو شاید دنیا کی تاریخ مختلف ہوتی۔ مگر تاریخ میں اگر اور مگر نہیں ہوتا۔ جو ہو چکا ہے وہی تاریخ کہلاتا ہے اور یہی ہماری تاریخ ہے۔

کتابیات

Abraham Eraly: *The First Spring: The Golden Age of India*

Abdul Sattar Anjum: *Dawn April 8, 2011*

Adam Zamoyski: *Poland*

Adnan A. Musallam: *From Secularism to Jihad-Sayyid Qutb and the Foundation of Radical Islamism*

Agha Humayun Amin, Majar (R): *Grand Slam - A Battle of Lost Opportunities*

Amjad Ali Chaudhry, Brigadier (R): *SEP 65, Before and After*

Anthony Frank: *Britain's Betrayal in India*

Antony Bevor: *Stalingrad: The Fateful Seige 1942-43*

Amiya Sen: *Hindu Revivalism in Bengal (1872-1905)*

Ayesha Jalal: *The State of Martial Law*

Ibid. *The Sole Spokesman: Jinnah, The Muslim League, and the Demand for Pakistan*

Aziz, K.K: *The Murder of History*

Bahadur, Kalim: *Democracy in Pakistan: Crisis and Conflicts*

Baladouni Vahe: *Accounting in the Early Years of the East India Company*

Banerji, Debashish: *Sri Aurobindo and the Bengali Renaissance*

Baxter, C: *Bangladesh, From a Nation to a State*

Bertrand Russell: *New Hopes for a Changing World*

Bhutto, Benazer: *Daughter of East*

Bipan Chandre Lal: *History of Modern India*

Ibid. *Freedom Struggle*

Ibid. *The Making of Modern India: From Marx to Gandhi*

Bowen, H.V: *Business of Empire - The East India Company and Imperial Britain 1756-1833*

Brenner, Robert: *Merchants and Revolution*

Carr, E.H: *The Russian Revolution from Lenin to Stalin 1917-1929*

Ibid. *A History of Soviet Russia*

Charles Rappoport: *What is Socialism*

Christopher W. Blackwell: *The Development of Ahenian Democracy*

Country Studies. U.S Library of Congress: *The War of Bangaladeshi Independence*

Cohen, Stephen. P: *The Idea of Pakistan*

Communism and Economic Development: American Political Science Review Vol. 62 No. 1968

Craig Baxter: *Diaries of Field Marshal Mohammad Ayub Khan 1966-1972*

Creed, J.L: *The Philosophy of Aristotle*

David Van Biema and Jaff Chu: *Does God Want You To Be Rich?*

Duncan Hallas: *The Commintern*

De Vore, Irven: *Man the Hunter*

Denovo, John A: *American Interests and Politics in the Middle East 1900-1939*

Faiz Ali Chishti, Gen. (R): *Betrayals of Another Kind*

Farsoun and Zacharia: *Palestine and Palistenians*

Fatima Jinnah: *My Brother*

Fatima Bhutto: *Songs of Blood and Sword*

Fitz Patrick, S: *The Russian Revolution 1917-1932*

Frantz Fanon: *A Dying Colonialision*

Fraser J.Harbutt: Yalta 1945: *Europe and America at the cross Roads*

Frederick Engels: *The Origin of the Family, Private Property and the State*

Ibid: *The Part Played by Labour in Transition From Ape to Man*

Ibid: *Socialism Upotian and Scientific*

Furber, Holden: *Rival Empires of Trade in Orient*

Gandhi, Mohandas: *An Auto Biography: The Story of My Experiment with Truth*

Gankovsky, Yu.V: *A History of Afghanistan*

Gauhar, Altaf: *Ayub Khan, Pakistan's First Military Ruler*

Gardner, Brian: *The East India Company*

Gail Minault: *The Khilafat Movement; Religious Symbolism and Political Mobilization in India.*

Galileo Galilei: *Discourse on the Tides*

Grenier, Richard: *The Gandhi; Nobody Knows (Commentary march 1983)*

Gul Hassan Khan, Lt. Gen. (R): *Memoirs, London Observer Apil, 1994*

Gupta, A.C.: *First Spark of Revolution*

Hadley, Guy: CENTO: *The Forgotten Alliance*

Hardy, Peter: *The Muslims of British India*

Hassan Abbas: *Pakistan's Drift into Extremism - Allah, The Army and Amerian War on Terror*

Hassan Zaheer: *The Times and Trials of the Rawalpindi Conspiracy 1951. The First Coup Attempt in Pakistan*

Heehs, Peter: *India's Freedom Struggle, A Short History*

Huq, Fazlul: *Saint or Sinner: (Dalit Salitya Akademy)*

Hector Bolitho: *Jinnah Creator of Pakistan*

Henig, Ruth Beatrice: *The Origins of The Second World War 1933-41*

Ian Talbot: *Pakistan, A Modern History*

Iqbal, Muhammad: *The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam*

Ibid. *Presidential Address in Annaul Session of Muslim League at Allah Abad, 1930*

Imperial Gazetteer of India (1908-1981)

Iradj Amini: *Napolean and Persia*

Ilahi Baksh, Col. (R): *With The Quaid-i-Azam During His Last Days*

Ispahani, M.A: *The Quaid, as I Know Him*

Jaffrelot, Christophe: *A History of Pakistan and it's Origins*

James, C.L.R: *World Revolution; 1917-1936, The Rise and Fall of the Communist International*

James Harrington: *The Common Wealth of Oceana*

Jaswant Lal Mehta: *Advanced Study in the History of Modern India*

Joad. C.M: *The Present and Future of Religion*

Ibid. *The Philosophy of Federal Union*

Ibid. *An Old Country Side of new people*

John R.Pilger: *Hidden Agendas*

Ibid: *The New Rulers of The World*

John M. Cooper: *Plato; Complete Works*

Jone, Owen Bennett: *Pakistan An Eye of Storm*

Jonathan Barnes: *Complet Works of Arisotle*

Judith Brown: *M. Gandhi, Prisoner of Hope*

Karl Marx: *Critioque of Hegel's Philosophy of Right*

Ibid. *Das Kapital*

Ibid. *The Poverty of Philosophy*

Ibid. *Theories of Surplus Value*

Karl Marx-Engels *Correspondence 1890*

Karl Marx and Engels: *On Historical Materialism*

Ibid. *The Communist Manifesto*

Ibid. *Selected Works*

Keay, John: *The Honourable Company, A History of the English East India Company*

Keene, H.G: *The Fall of The Moghul Empire of Hindustan*

Khalid Hassan: *Zulfiqar Ali Bhutto on Line, April 29th, 2003*

Kerala District Gazetteers: Vol 4

Lamb, Alastair: *A Disputed Legacy 1846-1990*

Lafeber, Walter: *America, Russia, and the Cold War*

Lanky Ahmad, Wing Commander (R): *A Lucky Pilot*

Laurie Mylroie: *Study of the Revenge*

T.E.Lawrence: *Seven Pillars of Wisdom*

Ibid. *Revolt in Desert*

Lenin,V.I: *What is to be Done?*

Ibid. *Imerialism, The Highest Stage of Capitalism*

Ibid. *The State and Revolution*

Ibid. *April Thesis*

Lepel Griffen, Sir: *The Punjab Chiefs*

Ibid. *Ranjit Singh (Ruler of India Series)*

Lewis Henry Morgan: *Ancient Society*

Mack. John E: *A Prince of our Disorder: The Life of T.E. Lawrence*

Mahaur Bhagwandas: *Kakori, Shaheed Smriti*

Majumdar R.C: *The History of Bangal*

Ibid. *History of Freedom Movement in India*

Martin Gilbert: *The Second World War*

Mc. Dermott, Kevin, and J.Agnew: *The Comintern: A History of International Communism from Lenin to Stalin*

Michael O'Dwyer, Sir: *India as I Know*

Miscambe, Wilson D: *From Roosevelt to Truman: Potsdam, Hiroshima, and the Cold War*

Mohammad Ayub Khan: *Friends not Masters*

Ibid. The Pakistan - American Alliance, *Foreign Affairs*, January, 1964

Mubashir Hasan, Dr.: *The Mirage of Power 1971-77*

Mushirul Hassan: *Regionalizing Pan-Islamism: Documents on The Khilafat Movement*

Muhammad Musa Khan, Gen. (R): *My Version; Indo Pak War 1965*

Naeem Qureshi: *Pan-Islam in British India: The Politics of Khilafat Movement 1918 - 1924*

Navaratna Srinivasa Rajaram: *Gandhi, Khilafat and the National Movement: A Revisionist View Based on Neglected Sources*

Nicolaus Copernicus: *De Revolutionibas Orbium Coelestium*

Nixon, Richard: *Memoirs* (*Meeting with Mrs. Gandhi)*

Noam Chomsky: *Hopes and Prospects*

Ibid. *The Shock Doctrime, The Rise of Disaster Capitalism*

Norman Pereira: Stalin and the Communist Party in the 1920's *History Today,* Vol. 42 Issue 8, 1992

Official Report 1947 Debates of Constituent Assembly, Pakistan, Vol. 1 No. 1

Phillip Spratt: *Blowing up India*

Piloo Mody: *Zulfi my Friend*

Plato: *The Republic*

Plokhii, Serhii: *Yalta: The Price of Peace*

Praval, K.C, Maj. (R): *Indian Army After Independence*

Prem Nath Bazaz: *The History of Struggle for Freedom in Kashmir*

Rajani Palme Dutt: *The Crisis of Britain and The British Empire*

Ramsey Clark: *Covert Action, Quarterly Magazine, Fall 1998*

Rawalpindi Conspiracy (Special Tribunal) Act 1951

Reedhara Menon, A.S: *A Short Survey of Kerala*

Rentz, George: *Wahhabism and Saudi Arabia*

Richard Overy: *Russia's War*

Riddick, John F: *The History of British India A Chronology*

Rihani, Ameen: *Ibn Saoud of Arabia*

Robert Service: *Stalin, Biography*

Robins, Nick: *The Corporation That Changed the World*

Roger D. Long: *Dear Mr. Jinnah, Selected Corespondence and Speaches of Liaqat Ali Khan 1937-47*

Ronald Miller: *The Encyclopaedia of Islam* Vol. 6

Rosa Luxemburg: *An Introduction to Economics*

Rowlatt Report

Roy, M.N: *Documents of the History of Communist Party of India*

Sailen Debnath: *Secularism Western and Indian*

Samuel P.Huntington: *Clash of Civilizations*

Selected Documents of all the Seven Congresses of Communist International

Selig Harrison: *Dawn, July 4, 1977*

Shahid Riaz: *Reassessing Liaqat Ali Khan's Role, The Daily Times Feb. 15, 2010*

Sharma Vidyarna: *Yug Ke Devta: Bismil Aur Ashfaq*

Singh, G.B. Col. (R): *Gandhi Behind the Mask of Divinty*

Singh, Jaswant: *Jinnah: India, Partition, Independece*

Sita Ram Goel: *Genesis and Growth of Nehrusim* Vol. 1

Sission and Rose: *War and Succession*

Stalin, J.V: *Problems of Leninism, The October Revolution*

Ibid. *Marxism and National Question*

Ibid. *Trotskyism or Leninisim*

Ibid. *Our Disagreements*

Ibid. *Dialectical and Historical Materialism*

Ibid. *The History of the Communist Party of the Soviet Union*

Ibid. *Works,* Vols. 1-13

Ibid. *The Question of Leninism*

Sims, L: *Primitive Communism, Barbarism and Origins of Class Society*

Stanley Wolpert: *Jinnah of Pakistan*

Ibid. *Tilak and Gokhale*

Ibid. *Zulfi, Bhutto of Pakistan*

Ibid. *Shameful Flight: The Last Years of British Empire in India*

Sutton, Jean: *Lords of The East, East India and its Ships*

Suther Land, Lucy S: *The East India Company in Eighteenth, Century Politics*

Stein, Burton: *A History of India*

Syed Ahmad Khan, Sir: *Reasons for the India Revolt of 1857*

Syed Ehtisham: *Across Three Continents*

Tariq Ali: *Street Fighting Years; An Auto Biography of Sixties*

Tayyab Siddique: *The News, August 14, 2010*

The Kissinger Tilt: *Time,* Jan. 17, 1972

The Communist, International Journal of the Commintern, Marxist, Internet Archive

The War for Bangladeshi Independence 1971: Country Studies, U.S Library of Congress

The Socialist Party of Great Britain: *From Primitive Communism to Class Society*

Tinker, Hugh: *Men Who Over Turned Empires*

Tony Judt: *Post War - A History of Europe Since 1945*

Trotsky, Leon: *The History of the Russian Revolution*

Tucker, R.C: *Stalin as Revolutionary*

US-Pakistan Relations: An Unhappy Alliance, *Los Angeles Times,* May 7, 2011

Van Gosse: *The Movements of the New Left 1950-1975*

Warden, Phillip: Liaquat Ali Arrives for Good Will Tour: *Chicago*

Weiner, Tim: *Legacy of Ashes: The History of the CIA*

William Hunter: *The Indian Musalmans*

William L. Shirer: *The Rise and Fall of the Third Reich*

Yev Geny Preo Brazhensky: *Primitive Socialist Accumulation*

Z.A. Bhutto: *If I am Assisinated*

Ziring, Lawrence: *Pakistan In the Twenth Century: a Political History*

اصغر خان۔ تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا

ایضاً۔ سیاست اور افواج پاکستان

افضل توصیف۔ لیبیا سازش کیس

الطاف گوہر۔ پاکستان کا پہلا فوجی حکمران

انوار الحق۔ مضامین عزیز الحق

ایوب مرزا، ڈاکٹر۔ ہم کہ ٹھہرے اجنبی

باری علیگ۔ کمپنی کی حکومت

بائیبل

بھگوت گیتا

پطرس بخاری۔ لاہور کا جغرافیہ

جمال الدین افغانی۔ ردِ نیچریت

جواہر لال نہرو۔ تلاش ہند

حالی، الطاف حسین، مولانا۔ حیاتِ جاوداں

خلیفہ عبدالحکیم۔ اقبال اور مُلّا

رفیع الدین، کرنل۔ بھٹو کے آخری 323 دن

راؤ رشید۔ جو میں نے دیکھا

سجاد ظہیر۔ روشنائی

شہاب، قدرت اللہ۔ شہاب نامہ

طارق خورشید۔ سوئے دار

طفیل عباس۔ صبح کی لگن

ظفر اللہ پوشی۔ زندگی زندہ دلی کا نام ہے

عقیل عباس جعفری۔ پاکستان کے سیاسی وڈیرے

عقیل یوسف زئی۔ طالبانائزیشن

فیض القدیر شرح الصغیر جلد چھ

قیوم نظامی۔ جو دیکھا جو سنا

کوثر نیازی۔ اور لائن کٹ گئی

میاں محمد طفیل۔ ہفت روزہ ایشیا 14 ردسمبر 1969ء

اخبارات وجرائد

Dawn, 12 August 1947

Far Eastern Economic Review Nov. 20, 1971

Ibid. Dec. 11, 1971

New York Times, Jan. 27, 1976

Pakistan Horizon 30, 3rd and 4th

Sunday Times, May 2, 1971

Time, Sep 10, 2006

Tribune, May 4, 1950

The Pakistan Times, Lahore, July 15, 1947

Ibid. April 8, 1971

Ibid. July 14, 1977

The Washigton Post, Nov. 27, 2004

لیل ونہار 19/اپریل 1970ء

ہفت روزہ نصرت۔ فائلیں۔ 1969 تا 1973ء

روزنامہ جاوداں ڈھاکہ 5/مارچ 1971ء

ضمیمہ جات

ضمیمہ: 1

شیخ مجیب الرحمن کے
چھ نکاتی فارمولے
کے بارے میں پاکستان پیپلز پارٹی کا موقف

(پچھلے چند دنوں میں شیخ مجیب الرحمن ہمارے سیاسی منظر پر ایک نمایاں شخصیت کی حیثیت میں اُبھرے ہیں۔ ان کے چھ نکاتی فارمولے کے خلاف جو پر تشدد رویہ اختیار کیا گیا، اگرتلہ کیس کی واپسی کی صورت میں حکومت نے اس پر اپنی ندامت اور شکست کا اعتراف کرلیا ہے۔ حکومت کے علاوہ تحریک جمہوریت کے جن رہنماؤں نے کسی زمانے میں اس فارمولے کو جمہوری بحث وتمحیص کے لئے بھی قبول کرنے سے انکار کردیا تھا، آج وہ بھی شیخ صاحب کی عوامی مقبولیت سے اپنے سیاسی ایوانوں کو منور کرنے کی فکر میں ہیں۔ پیپلز پارٹی کا موقف ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ سیاسی مسائل کا تصفیہ ڈرائنگ روموں اور قید خانوں کے بجائے عوامی رائے کے پلیٹ فارم پر ہونا چاہیے۔ چنانچہ عوام کی رہنمائی کے لئے پارٹی کی جانب سے چھ نکاتی فارمولے کا باقاعدہ تجزیہ کیا گیا اور اس سلسلے میں تاسیسی اجلاس منعقدہ نومبر 1967ء میں مندرجہ ذیل دستاویز منظور کی گئی۔)

عوامی لیگ کے صدر اور چھ نکاتی فارمولا کے مصنف شیخ مجیب الرحمن کو قید کی صعوبتیں سہتے ہوئے ڈیڑھ سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ ایک انسان کو تو جیل میں ڈالا جاسکتا ہے لیکن خیالات کو کالی کوٹھڑیوں میں بند نہیں کیا جاسکتا! شیخ صاحب اگرچہ اپنی آزادی سے محروم کردیئے گئے ہیں لیکن ان کے ذہن کی پیداوار ہر کس وناکس کے علم میں

ہے اور اُن کے اس اعلان کے محرک جذبے میں ہماری قوم کے کروڑوں افراد برابر کے شریک ہیں۔ پس ضروری ہے کہ ان کے خیالات کو جانچا جائے۔ ان پر سوچ بچار کی جائے اور بحث کی جائے۔ خواہ شیخ صاحب کو اپنے نقادوں کو جواب دینے کا موقع نہ ہی ملے۔ بہتر اور مناسب تو یہ تھا کہ شیخ صاحب اپنے عقائد کا آزادانہ طور پر دفاع اور وضاحت کرنے کے قابل ہوتے۔ اس سے نہ صرف ان کے متعلق ظاہر کئے گئے خدشات کی تردید ہو جاتی بلکہ یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ باہمی تبادلہ خیالات کے بعد وہ اپنے سابقہ موقف میں کہاں تک اور کن پہلوؤں سے ردو بدل پر تیار ہیں۔ موجودہ حالات میں چونکہ شیخ صاحب سے استفسار کرنا اور ان کی رائے لینا ممکن نہیں اس لئے ہم اپنی موجودہ بحث کا موضوع ان کے پمفلٹ بعنوان چھ نکاتی فارمولا، ہمارا حق زیست مؤرخہ 23/مارچ 1966ء کو بناتے ہیں۔

بیس صفحات کی معمولی ضخامت پر مشتمل یہ کتابچہ چھ نکاتی پروگرام پر شیخ صاحب کا اپنا تبصرہ ہے اس لئے یہ کہنا مناسب نہ ہوگا کہ جو کچھ اس کتابچے میں لکھا گیا ہے ان کے اپنے نظریات کی صحیح عکاسی ہے اور وہ خود فارمولے کو اسی طور دوسروں کے مطالعے کے لئے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ شیخ صاحب کو اپنے اس موقف کے اعلان کرنے کا حق حاصل ہے کہ اگر ان کی تجاویز پر عمل کیا جائے تو ملک کو درپیش بیشتر مسائل سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے اور یہ اقدامات قومی اتحاد کو نقصان پہنچانے کے بجائے اس کے استحکام کا باعث بنیں گے۔ ماضی میں جو خدمات شیخ صاحب نے ملک کے لئے سرانجام دی ہیں ان کے پیش نظر ان کی ایمانداری پر شبہ کرنا نامناسب بات ہوگی اور مزید برآں جن مسائل کی انہوں نے نشاندہی کی ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بنیادی طور پر حل طلب ہیں۔ گو شیخ صاحب کے تجویز کردہ اقدامات ان مسائل کا مناسب ترین حل نہیں۔ اس ضمن میں خواہ ان کا موقف خام بھی ثابت ہو جائے پھر بھی اُن کے خلوصِ نیت پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

اپنے چھ نکاتی پروگرام کے متعلق شیخ صاحب کی طرف سے پیش کی جانے والی وضاحت انتہائی قابل احترام ہے کیونکہ اس کا تعلق شیخ صاحب کے نکات کے مفہوم اور مقاصد سے ہے لیکن اگر اس چھ "نکاتی فارمولا" کے ممکنہ عملی اثرات کا جائزہ لیا جائے تو معاملہ

مختلف ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ضروری نہیں کہ نتائج کسی شخص کی پیش کردہ رائے سے ہمیشہ مطابقت رکھتے ہوں۔ چنانچہ اس رائے پر کہ شیخ صاحب کی تجاویز وہی نتائج پیدا کریں گی جن کے بارے میں شیخ صاحب ہمیں یقین دلاتے ہیں، مکمل انحصار نہیں کیا جاسکتا۔ پہلے جو نسخہ ایک بیماری کے لئے انتہائی کارگر سمجھا جاتا تھا آج جدید علم اور ریسرچ نے اُسی نسخے کو اُسی بیماری کے لئے غیر مؤثر ثابت کر دکھایا ہے۔ جس طرح بیماری کے لئے صحیح ترین دوائی تجویز کرنے کی ضرورت ہے اسی طرح قومی مسائل کے حل کے لئے بھی صحیح اقدامات کی ضرورت ہے۔ ایسے اقدامات جو سیاست، تجربہ اور چھان بین کی خوبیوں سے آراستہ ہوں۔

اصلاحِ احوال کی کسی بھی تجویز کے تمام ممکنہ نتائج کا پہلے سے اندازہ لگا لینا آسان بات نہیں ہے لیکن بہر حال سب سے پہلے اس امر کا تیقن ضروری ہے کہ کیا اس سے پیش نظر مقصد کو حاصل کرنے میں مدد ملے گی؟ علاوہ ازیں تجویز کے ضمنی اثرات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے کیونکہ ہر تجویز میں اچھے اور برے دونوں پہلے موجود ہوتے ہیں۔ معاشیات اور سیاسیات میں ہر اہم تجویز ضمنی اثرات رکھتی ہے اور چھ نکاتی فارمولا ایسی آئینی اور انتظامی تبدیلی کا خواہاں ہے جس پر عملدرآمد سے ریاست کا موجودہ ڈھانچہ ہی بدل جاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ تجاویز کے اس مجموعے کا نہایت دقیق نظر سے جائزہ لیا جائے۔ چونکہ فارمولے کی تہہ میں کارفرما مقصد واضح ہے اس لئے چھان پھٹک میں دقت پیش نہیں آئے گی۔ مقصد صرف یہ ہے کہ قوم کے ایک حصے سے جب سے بے اعتنائی اور ناانصافی برتی جائے تو ایسی صورتِ حال کی اصلاح انتہائی ضروری ہے۔

(2)

تلخ حقائق سے چشم پوشی اختیار کر لینا قومی خدمت نہیں ہے۔ ملک کو درپیش معاشی اور معاشرتی مسئلے خوبصورت لفظوں، نعروں یا بہانہ سازی جیسے ہتھکنڈوں سے حل نہیں ہوسکتے۔ اس سے صرف یہی ظاہر ہوگا کہ ارباب اختیار زیادتیوں کے خلاف انصاف پر آمادہ نہیں۔ آیئے ہم دیکھیں کہ وہ کون سی صورتِ حال ہے جس کے نتیجے میں شیخ مجیب

الرحمن کے چھ نکاتی فارمولے جیسے پروگرام نے جنم لیا۔ اگر اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو بہت سے مسئلوں کا حل نکل آتا ہے۔ دونوں صوبوں کے عوام چونکہ ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی کرنا کسی لحاظ سے بھی سودمند نہیں ہوگا۔ ہر ایسی صورت میں جہاں معاشی استحصال سیاسی اسباب سے مربوط ہو، اصل مسئلے کی جڑ مخصوص طبقوں کے نجی مفادات ہوتے ہیں اور عوام خواہ ان کا تعلق کسی بھی علاقے سے ہو استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔

تقسیم کے وقت پاکستان کے دونوں حصوں میں معاشی عدم مساوات کا کوئی وجود نہیں تھا۔ دونوں حصوں میں صنعتیں برائے نام تھیں۔ اس لئے ہر صوبے کو اس میدان میں شروع سے کوشش کرنی پڑی۔ دونوں صوبوں میں مشرقی پاکستان کی پیداوار ہی زرمبادلہ کمانے کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔ پٹ سن اس معاملے میں سرفہرست تھا۔ جب کہ مغربی پاکستان میں کاشت ہونے والی کپاس کہیں نیچے دوسرے نمبر پر آتی تھی۔ اگرچہ کوریا کی جنگ کے مختصر عرصے میں کپاس، پٹ سن کے برابر پہنچ گئی تھی۔ بیشتر دوسرے پس ماندہ ممالک کی طرح پاکستان بھی بین الاقوامی مارکیٹ میں خام اشیا مہیا کرتا تھا۔ صنعتوں کا قیام جس پر ملکی خوشحالی کا دارومدار تھا ان خام اشیا کی برآمد سے حاصل ہونے والی دولت سے ممکن ہوا۔ چونکہ پٹ سن زرمبادلہ کمانے کا سب سے بڑا ذریعہ تھا اس لئے ملکی درآمدات کی بیشتر ادائیگی مشرقی پاکستان کی پیداوار سے کی گئی۔ درآمدات کے زمرے میں نقد ادائیگی کے بدلے منگوائی جانے والی ہر چیز شامل ہے مثلاً صنعتی مال، دفاعی سامان، رولنگ سٹاک، تیل اور روزمرہ کے استعمال کی چیزیں وغیرہ وغیرہ۔ اس زرمبادلہ کی بدولت بیرونی ممالک میں تعلیم حاصل کرنے والے پاکستانی طلبا کا خرچ، سفارتی عملے کے اخراجات، فوجی ماہرین کی بیرونی ممالک میں تربیت کا خرچ اور بین الاقوامی انجمنوں کو چندہ بھی ادا کیا جاتا رہا۔

شروع میں دفاعی افواج میں مشرقی پاکستان کے لوگ نہ ہونے کے برابر تھے۔ سول سروس کے اعلیٰ عہدوں پر فائز اشخاص میں مشرقی پاکستان کے لوگوں کی نہایت قلیل تعداد تھی اور مرکزی ملازمتوں کے نچلے درجوں میں ان کی نمائندگی نہایت کم تھی۔ چنانچہ

مشرقی پاکستان کے مفاد کے سراسر خلاف روپے کے خرچ میں عدم توازن قائم تھا۔ پاکستان کی تاریخ کے بیس سالہ دور میں اس عدم مساوات کو دور کرنے کی کوئی صورت نکالی جاسکتی تھی اور وسیع صنعتی ترقی کے پیش نظر اس مسئلے کا حل اور بھی آسان ہوسکتا تھا۔ بشرطیکہ مخصوص مفادات کے حامل حلقوں کی ناجائز حوصلہ افزائی نہ کی جاتی۔ برطانوی سامراج سے ورثے میں حاصل ہونے والے نوآبادیاتی تعصّبات سے بھی نجات حاصل کرنا ضروری تھا۔ اگر دوسری جنگ عظیم میں جاپان کا عملی مظاہرہ ناکافی ہے تو موجودہ دور میں ویت نامیوں کی جدوجہد سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ چاول کھانے والے لوگ کسی بھی لحاظ سے گندم کھانے والوں سے کم جنگجو نہیں ہیں۔

ملازمتوں میں عدم مساوات کا مسئلہ ایسا نہیں تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ خود بخود سنگین شکل اختیار کرلیتا اس کے برعکس یہ عدم مساوات پہلے مرحلوں میں آہستہ اور پھر تیزی سے غائب ہوجاتی اگر شروع سے ہی مشرقی پاکستان میں تعلیمی معیار کی طرف توجہ دی جاتی جو بلند ہونے کی بجائے گرتا چلا گیا، اس کے مقابلے میں مغربی پاکستان میں اعلیٰ تعلیم کے اداروں کے قیام پر توجہ دی گئی۔ نتیجہ سامنے ہے مشرقی پاکستان میں تعلیمی معیار جو بلند ہونے کی بجائے گرتا چلا گیا۔ اس کے مقابلے میں مغربی پاکستان میں تعلیم پر زیادہ توجہ دی گئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حکومت کی اقتصادی پالیسیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نئے امیر خاندانوں کے بیٹوں کو بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کے مواقع بھی میسر آنے لگے۔ حکومت کی معاشی پالیسی اور تعلیم کے بارے میں مشرقی پاکستان سے مکمل بے اعتنائی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی عدم مساوات دونوں صوبوں میں منافرت کا سب سے بڑا سبب ہے۔

اصل برائی تو غلط معاشی پالیسی کو اپنانے سے پیدا ہوئی ہے۔ بھاری صنعتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی جو ملک کو صنعتی میدان میں خود کفیل بننے میں مدد دے سکتی تھیں۔ اگر اس سلسلے میں کوشش کی جاتی تو کثیر سرکاری سرمایہ کا خرچ ہونا لازمی بات تھی، کیونکہ ایسی صنعتیں قلیل مدت میں زیادہ نفع پیدا نہیں کرتیں۔ سارا زور جلد نفع دینے والی نجی ملکیتوں کی صنعتوں پر صرف کیا گیا اور انہیں مارکیٹ میں مقابلے کے خلاف اتنا تحفظ دیا گیا کہ

صارفین کو بدترین استحصال کا سامنا کرنا پڑا۔ جو سرمایہ دار اس میدان میں سامنے آئے ان کی تمام تر پونجی بینکوں سے لئے گئے قرض پر مشتمل ہوتی تھی۔ ان صنعتوں سے جنہیں سرکاری تحفظ حاصل تھا، اس تیزی سے دولت حاصل ہوئی کہ سرمایہ دار کے سرمائے میں ایک دو سال کے اندر کئی گنا اضافہ ہوا۔ حکومت بھی آئی۔ ڈی۔ سی کے ذریعے صنعتیں قائم کررہی تھی لیکن انہیں عوام کے مفاد کے لئے چلانے کی بجائے بالآخر سرمایہ داروں کے حوالے کرنے کے لئے تیار کیا جارہا تھا۔ لوٹ کھسوٹ کے اس نظام میں جس شخص نے بھی سرمایہ لگایا (اکثر اوقات بینک کی مدد سے) اُسے اپنی دولت میں بے پناہ اضافہ کرنے کے خوب مواقع میسر آئے اور یہ چہیتے لوگ زیادہ تر مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے۔ جس حساب سے ان کی دولت میں اضافہ ہوا اسی حساب سے دونوں صوبوں میں عدم مساوات بھی بڑھتی گئی۔ ان لوگوں نے مشرقی پاکستان میں بھی صنعتوں پر قبضہ جمالیا۔ چنانچہ وہ بڑی آسانی سے مشرقی پاکستان میں کمائی ہوئی دولت کو مغربی پاکستان میں منتقل کرنے لگے۔ دولت کو پیدا کرنے والا مشرقی پاکستان بذات خود ایک دیہی غربت خانہ بن کر رہ گیا۔ یہ صرف ایک خود غرض نظام سرمایہ داری کی ہی کارگزاری ہے کہ دولت کا فرق کم ہونے کی بجائے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ امیر، امیر تر ہوتا جارہا ہے اور غریب غریب تر ہورہا ہے۔ مشرقی پاکستان کی نسبتاً پسماندگی کی دو وجوہات ہیں۔ ایسا معاشی نظام جس کا لازمی نتیجہ عوام کا استحصال ہے اور تعلیم کے سلسلے میں مشرقی پاکستان سے مجرمانہ بے اعتنائی۔

اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مشرقی پاکستان کو درپیش موجودہ مسائل کے متعلق شیخ مجیب الرحمن کی تشویش جائز اور مبنی برحق ہے۔ اب ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ کیا ان کے پیش کردہ چھ نکات اس صورت حال کا صحیح حل ہیں؟

(3)

چھ نکاتی فارمولے کے پہلے نکتہ کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں۔

<u>آئین میں پاکستان کی صحیح وفاقی حکومت قائم ہونی چاہیے۔ یہ وفاقی قرارداد</u>

پاکستان منعقدہ لاہور کے مطابق پارلیمانی طرزِ حکومت کی بنیاد پر قائم ہو اور اس میں بالغ رائے دہی پر منتخب مقننہ کو بالادستی حاصل ہو۔

آئین کے متعلق ہمارے ملک کی غالب اکثریت موجودہ دستور کی جگہ کسی اور بہتر حقیقی جمہوری آئین کو نافذ کرنے کے حق میں ہے۔ یہ آئین ایسا ہونا چاہیے جس میں نہ صرف عوام کے شہری حقوق کی ضمانت ہو بلکہ ریاست میں شامل مختلف علاقوں کے مفادات کو بھی تحفظ حاصل ہو۔ وفاق کے سوال پر رائے مختلف ہو سکتی ہے لیکن پھر بھی موجودہ ڈھانچا صحیح وفاق نہیں ہے اور اسے موجودہ آئین کے مصنفوں نے بھی نیم وفاق کا نام دیا ہے۔

ایک طرف تو ہمارے ملک میں پارلیمانی طرز حکومت کا تجربہ مایوس کن رہا ہے۔ اس کی مذمت میں یہی کہنا کافی ہے کہ اس کی خامیاں موجودہ حکومت کے قیام کا سبب بنیں جو کہ اپنی بدترین معاشی اور معاشرتی پالیسیوں کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے۔ دوسری طرف موجودہ حکمرانوں کے صدارتی طرزِ حکومت کے تجربے نے خوفناک نتائج پیدا کئے ہیں کیونکہ اس کے نتیجے میں لوگوں کو اپنی شہری آزادیوں سے ہاتھ دھونے پڑے، چند خاندانوں کو ملک کی دولت سمیٹنے کی عام اجازت دے دی گئی اور روزمرہ زندگی میں بدعنوانی کا دخل اتنا بڑھ گیا کہ رشوت خوری، دھوکے بازی، ناجائز لین دین غرضیکہ ہر قسم کی بددیانتی کے دفاع کے لئے سرکاری بیانات جاری کئے جاتے ہیں اور یہ سب کچھ جمہوریت کے نام پر ہو رہا ہے۔ حکومت جسے چاہتی ہے ہراساں کرنے کے لئے تشدد اختیار کرتی ہے۔ ہر شخص کے سر پر اس وقت بلاوجہ گرفتاری، قید اور روزگار کے ذرائع سے محرومی کا خطرہ سوار ہے۔ کوئی بھی جمہوریت پسند شخص ایسے صدارتی طرزِ حکومت کے جاری رہنے کی حمایت نہیں کر سکتا، جس کے پنجوں میں آج پاکستان سسک رہا ہے۔

پہلے نکتے کے جواب میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ تجویز کردہ حل متبادل صورتوں کے ممکنہ فائدوں کا جائزہ لئے بغیر اپنایا نہیں جا سکتا۔ نئے آئین کے مجموعی مسئلے پر عام بحث ہونی چاہیے اور پھر اسے پاکستانی عوام کی منظوری کے لئے پیش کر دینا چاہیے۔

(4)

دوسرا نکتہ اس طرح بیان کیا گیا ہے: وفاقی حکومت کا اختیار صرف دو شعبوں تک محدود ہوگا، دفاع اور خارجی تعلقات اور تمام باقی ماندہ محکمے وفاق کے رکن صوبوں کو حاصل ہوں گے۔

وفاق کی کئی قسمیں ہوسکتی ہیں لیکن ان سب پر ایک شرط عائد ہوتی ہے کہ وفاقی اختیارات قومی وحدت میں اضافہ کریں اور اسے مستحکم بنائیں۔ نقطہ نمبر 2 کی تجویز دراصل دو خودمختار ریاستوں کے باہمی اتحاد کے مترادف ہے جو صرف دو شعبوں یعنی دفاع اور خارجہ تعلقات سے محروم ہیں۔ اس صورت میں وفاقی قانون ساز اسمبلی کی حیثیت بالکل سطحی ہوگی کیونکہ اس کے لئے کام کرنے کو کچھ نہیں ہوگا۔ اس صورت میں مرکزی امور کیسے چل سکتے ہیں۔ اس کا واحد منطقی انتظام تو وفاق میں شامل ریاستوں کی ایک کونسل کا قیام ہی ہوسکتا ہے۔

اس قسم کا وفاق خواہ اس میں بیرونی حملے یا مداخلت سہنے کی صلاحیت موجود بھی ہو، جلد انتشار کا شکار ہو جائے گا۔ اگر وفاق میں صرف دو صوبے شامل ہیں تو نفاق بہت جلد ہی رونما ہوسکتا ہے کیونکہ داخلی معاملات میں کسی مشترکہ پالیسی کی عدم موجودگی میں معمولی سے معمولی اختلاف بھی کسی بڑے بحران کا سبب بن سکتا ہے۔ کسی وفاق کا اتحاد ایک جیسے معاشی نظام اور بنیادی قوانین کی بنیادوں پر ہی استوار ہوسکتا ہے۔ ایک سوشلسٹ اور ایک سرمایہ دار ریاستوں میں وفاق ممکن نہیں کیونکہ ان کے مابین اتحاد کی بنیاد مفقود ہے۔

شیخ مجیب الرحمن نے اپنی دلیل کے حق میں 1946ء کے کیبنٹ مشن پلان کا حوالہ دیا ہے جس میں تجویز کی گئی تھی کہ مرکز کے پاس صرف تین محکمے رہیں گے۔ دفاع، خارجہ امور اور مواصلات۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سکیم کو مسلم لیگ نے منظور کر لیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ نے اسے ایک سیاسی داؤ کے طور پر قبول کیا تھا کیونکہ اس کو تسلیم کرنے کا لازمی نتیجہ تقسیم کی صورت میں ظاہر ہوتا۔ کانگرس نے بھی اس کے مضمرات کو سمجھ کر فی الواقع اسے مسترد کر دیا تھا۔

نکتہ نمبر 2 قومی اتحاد کے خواہشمند کسی بھی پاکستانی کے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ پاکستان کو درپیش مشکلات کا حل صرف ایسے نظام کے نفاذ میں ہے جو معاشی استحصال کو ختم کردے۔

(5)

نکتہ نمبر 3 کے الفاظ ہیں۔ (الف) دو علیحدہ لیکن آسانی سے تبدیل ہو جانے والی کرنسیوں کا اجرا ہونا چاہیے یا (ب) سارے ملک کے لئے ایک ہی کرنسی رکھی جاسکتی ہے۔ اس صورت میں مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کو سرمائے کے انتقال کو روکنے کے لئے مؤثر آئینی دفعات ہونی چاہئیں۔ مشرقی پاکستان کے لئے علیحدہ بینک ریزرو اور علیحدہ مالی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔

حصہ الف کا جواب واضح ہے کہ ایک ملک کی دو مختلف کرنسیاں نہیں ہوسکتیں۔ دونوں صوبوں کی معیشتیں ایک دوسرے سے کٹ جائیں گی۔ یہ صورت حال ایسی ہوگی جیسے شیخ صاحب اپنی خواہش اور مقصد کے مطابق مشرقی پاکستان کا استحصال روکنے کی آخری کوشش کے طور پر قبول کرلیں۔ لیکن اس تجویز سے نہ صرف معیشت انتشار کا شکار ہوگی بلکہ ملک کا شیرازہ بھی بکھر جائے گا اور دونوں صوبے خودمختار بننے کے لئے علیحدگی اختیار کرتے چلے جائیں گے۔ اس مسئلے کا حل صرف یہ ہے کہ دونوں صوبوں میں استحصال کو روکنے کے لئے سوشلسٹ نظام قائم کیا جائے۔ اس صورت میں استحصالی نظام کے پیچھے چھوڑے ہوئے اثرات کو مٹانے کے لئے خصوصی توجہ دینی پڑے گی۔

جہاں تک (ب) کا تعلق ہے یہ تجویز ایسے فنی پہلو رکھتی ہے جن کو ایک ماہر معاشیات ہی جانچ سکتا ہے۔ مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کو منتقل ہونے والے سرمائے کو روکنے کے لئے کیا کیا اقدامات ہوسکتے ہیں۔ شیخ مجیب الرحمن نے اس کی وضاحت نہیں کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ صاحب نے نوآبادیاتی نظام کے استحصالی ہتھکنڈوں کو اچھی طرح نہیں سمجھا۔ شیخ صاحب کی تجاویز سے سرمایہ دارانہ نظام جوں کا توں قائم رہتا

ہے۔ بے شک ان کے نزدیک مغربی پاکستانیوں کی بجائے دوسرے سرمایہ کار، اغلباً امریکی سرمایہ کار، قابل قبول ہوں گے جو کہ مشرقی پاکستان کی صنعتی ترقی میں مدد دیں گے۔ اس طور وہ بیرونی سرمایہ کاروں کو اپنے منافع اور کچھ سالوں بعد اپنے سرمائے ملک سے باہر لے جانے کی اجازت دینے پر آمادہ ہو جائیں گے لیکن اسی قسم کی رعایت مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے سرمایہ داروں کو حاصل نہیں ہوگی۔ ان کی تجاویز میں مشرقی پاکستان کے عوام کو خود مشرقی پاکستان کے چند سرمایہ داروں کی لوٹ سے بچانے کا کوئی علاج نہیں ہے۔ ان کی مجوزہ اصلاح انتہائی مایوس کن ہے۔ اس کی بدولت مشرقی پاکستان میں معاشی ترقی کی رفتار کسی طور تیز نہیں ہو سکتی۔

اس کا صحیح علاج بالکل عیاں ہے۔ مشرقی پاکستان میں تمام صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا جائے۔ چند لوگوں کو امیر تر بننے کا موقع دینے کی بجائے اس طرح سرمائے کا حصول آسان ہوگا۔ مشرقی پاکستان پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کے کارخانوں کو مشرقی پاکستان کے چند ایسے گنے چنے لوگوں کو مختص کرنے کی سکیم مکمل طور پر غلط ہے جس سے یہ سرمایہ ان کی کمائی جانے والی دولت کی رفتار کے حساب سے واپس لیا جائے گا۔ اس تجویز کا مطلب یہ ہوگا کہ چند لوگ جن کی جیب میں ایک پائی تک نہ ہوگی، صنعتوں کے مالک بن بیٹھیں گے۔ ایک شخص کو دوسرے کے مقابلے میں کیوں ترجیح دی جائے۔ کچھ لوگوں کو دوسروں کے مقابلے میں کیوں چنا جائے اور پھر ان کا چناؤ کون کرے گا؟ غالباً صوبائی گورنر یا مقامی حکام جن کی نظر اس سودے سے حاصل ہونے والے فوائد پر ہوگی۔ چھ نکاتی فارمولے پر زیادہ اعتماد کیا جا سکتا تھا اگر اس امر کا یقین حاصل ہو سکتا کہ یہ تجاویز اس قسم کے نتائج پیدا نہیں کریں گی۔

(6)

نکتہ نمبر 4 ٹیکس لگانے کے وفاقی اختیارات کے متعلق ہے۔ آیا ٹیکس جمع کرنے کا کام وفاقی حکومت کو سرانجام دینا چاہیے یا صوبائی حکومت کو؟ اس امر کا تعلق عملی انتظامات

سے ہے۔ شیخ صاحب کے نکتہ نمبر 4 کے مطابق مرکز کو ٹیکس لگانے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ اگر نکات نمبر 2 اور 3 کے مندرجات کو قبول کر لیا جائے تو نکتہ نمبر 4 سے اختلاف کی گنجائش نہیں رہتی۔ لیکن بہتر ہوگا اگر مرکز کی آزاد حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے مالیہ کے کچھ ذرائع مرکز کو مختص کر دیئے جائیں۔ نکتہ نمبر 4 پر بحث لاحاصل ہے کیونکہ یہ ان اصولی اختلافات کے تابع ہے جو پہلے تین نکات میں موجود ہیں۔

نکتہ نمبر 5 یوں ہے:

(1) زرمبادلہ کا حساب رکھنے کے لئے دو علیحدہ اکاؤنٹ ہوں گے۔

(2) مشرقی پاکستان کی آمدنی مشرقی پاکستان کی حکومت کے ماتحت اور مغربی پاکستان کی آمدنی مغربی پاکستان کی حکومت کے ماتحت ہوگی۔

(3) مرکزی حکومت کے زرمبادلہ کے اخراجات پورے کرنے کے لئے دونوں صوبائی حکومتیں برابر کا حصہ دیں گی یا اُن کے حصوں کی ایک نسبت مقرر کی جائے گی۔

(4) خام اشیا بلا محصول دونوں صوبوں میں آجا سکیں گی۔

(5) آئین کی رو سے صوبائی حکومتیں بیرونی ممالک سے تجارتی تعلقات استوار کرنے اور وہاں پر اپنے تجارتی مراکز قائم کرنے کی مجاز ہوں گی۔

نکتہ نمبر 5: پر عملدرآمد تب ہی ممکن ہو سکتا ہے اگر دونوں صوبوں کی معیشت کو علیحدہ علیحدہ کرنے پر رضامندی ہو جائے اور اس کے ساتھ ہی یہ ناگزیر ہے کہ صوبوں کی مکمل خودمختاری کو عملاً تسلیم کر لیا جائے۔ اس نکتے کی پانچویں دفعہ بیرونی ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات کی طرف اشارہ کرتی ہے جو کہ خارجہ امور ہی کے ضمن میں آتے ہیں۔ اس لئے یہ دفعہ نکتہ نمبر 2 میں بیان کئے گئے موقف سے متصادم نظر آتی ہے جس کے تحت امور خارجہ وفاقی حکومت کا شعبہ تسلیم کئے گئے ہیں۔ جہاں تک پہلی اور تیسری دفعہ کا تعلق ہے یہ اور کئی صورتوں میں بھی ممکن ہو سکتی ہیں۔ حتیٰ کہ مضبوط مرکزی حکومت کے تحت بھی یہ اقدام ہو سکتے ہیں لیکن اس مقصد کے لئے چھ نکاتی پروگرام میں بیان کئے گئے اقدامات کے علاوہ

اور بھی تقاضے پورے کرنے ضروری ہیں۔

نکتہ نمبر 6 کے بارے میں مصنف کا بیان ہے۔ ''اس نکتے میں میں نے مشرقی پاکستان کے لئے ملیشیا یا پیرا ملیشیا فورس قائم کرنے کی سفارش کی ہے۔''

یہ ایک شاندار تجویز ہے جس سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس تجویز کو وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ صرف مشرقی پاکستان میں ہی نہیں بلکہ مغربی پاکستان کے تمام علاقوں میں بھی ملیشیا فورس قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ملیشیا پیشہ ور سپاہیوں سے تربیت حاصل کرے گی اور اُن کی کمانڈ میں رہے گی۔ یہ ہماری دفاعی افواج کا ایک حصہ ہوں گے لیکن اس پر اخراجات کچھ زیادہ نہیں ہوں گے۔

(7)

اختتامیہ: چھ نکاتی فارمولے میں معاشی اور معاشرتی اصلاح کے لئے کسی تجویز کو پیش نہیں کیا گیا۔ اس لئے مجموعی طور پر مشرقی پاکستان کے مغربی پاکستان اور مرکز سے تعلقات میں مضمر اصلی مسائل سے عملاً نبٹنے کے لئے بیکار ہے۔ مغربی پاکستان کے عوام اپنے مشرقی بھائیوں کی طرح ایک ہی قسم کے استحصال کا شکار ہیں۔ پاکستانی ایک قوم ہیں نہ کہ دو۔ معاشی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کے حل میں تمام پاکستان کو شامل کرنا چاہیے۔ ان مسائل کو صرف حسب حال سوشلسٹ پروگرام کے ذریعے ہی حل کیا جاسکتا ہے اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔

(دستاویز نمبر 10۔ تاسیسی اجلاس)

ہفت روزہ نصرت، لاہور، 16/مارچ 1969ء

ضمیمہ: 2

مشرقی پاکستان کے طلبا کا گیارہ نکاتی پروگرام

گیارہ نکاتی پروگرام

نمبر 1: (الف) مالی اعتبار سے مستحکم کالجوں کو صوبائی درجہ دینے کی پالیسی ترک کر دینی چاہیے۔ صوبائی درجہ دیئے ہوئے کالجوں کو بہ شمول جگناتھ کالج سابقہ حیثیت بھی دی جائے۔

(ب) تعلیم و تدریس کو عام کرنے کی غرض سے صوبے بھر میں کالج اور سکول کھولے جائیں اور خصوصیت کے ساتھ دیہاتی علاقوں میں پرائیویٹ اسکولوں اور کالجوں کو بغیر کسی تاخیر کے سرکاری منظوری دی جائے۔ اس کے علاوہ ٹیکنیکل تعلیم کو عام کرنے کے لئے ضروری پیمانے پر انجینئر نگ، پالی ٹیکنک، ٹیکنیکل اور کمرشل کالج کھولے جائیں۔

(ج) صوبے کے تمام کالجوں میں آئی۔ اے، آئی۔ ایس۔ سی اور آئی کام کی پڑھائی کے لئے نائٹ شفٹ کا انتظام کیا جائے اور مستحکم کالجوں میں رات کے وقت بی۔ اے، بی۔ ایس۔ سی اور بی۔ کام کی پڑھائی کا انتظام کیا جائے۔ صوبائی کالجوں میں رات کو دوسری شفٹ میں ایم۔ اے، ایم۔ کام اور ایم۔ ایس۔ سی کی تعلیم کا بھی بندوبست کیا جائے۔

(د) ٹیوشن فیس میں 50 فیصد کی تخفیف کی جائے۔ اسکالرشپ اور وظیفے میں اضافہ کیا جائے اور طلبا کو اپنی تحریک میں حصہ لینے کی بنا پر مراعات سے محروم نہ کیا جائے۔

(ہ) اقامتی ہوسٹلوں اور ہالوں کے کھانے اور کنٹینوں کے اخراجات کا50 فیصد حصہ حکومت ادا کرے۔

(و) اقامتی ہال اور ہوسٹل کے مسائل حل کئے جائیں۔

(ز) تعلیم کے تمام مراحل میں مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے اور بنگلہ زبان کو تمام دفتری، تجارتی اور سرکاری سطحوں پر رائج کیا جائے۔

(ح) تمام تعلیمی اداروں میں تجربہ کار اور تربیت یافتہ اساتذہ کافی تعداد میں مہیا کئے جائیں اور اظہار فکر وخیال کی آزادی کی ضمانت دی جائے۔

(ط) آٹھویں درجے تک مفت لازمی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور تعلیم نسواں کو توسیع وترقی دی جائے۔

(ی) میڈیکل یونیورسٹی قائم کی جائے۔ آٹومیشن کو منسوخ کیا جائے۔ نامزدگی کے ذریعے داخلہ بند کیا جائے۔ میڈیکل کونسل آرڈیننس واپس لیا جائے۔ ڈینٹل کالج کو ایک مکمل کالج کا درجہ دیا جائے اور میڈیکل طلبا کے تمام مطالبات کو تسلیم کیا جائے اور نرسنگ کی طالبات کے مسائل بھی حل کئے جائیں۔

(ک) انجینئرنگ یونیورسٹی کے طلبا کے مطالبات جن میں آٹومیشن کی منسوخی رینٹل لائبریری کا بہتر انتظام اور انجینئرنگ کے آخری سالوں میں کلاسوں کا انتظام شامل ہے، پورے کئے جائیں۔

(ل) پالی ٹیکنک کے طلبا کو کنڈنس کورس کی سہولت دی جائے۔ ڈپلوما سمسٹر امتحان کی بنیاد پر دیا جائے اور بورڈ کے فائنل امتحان کے موجودہ قاعدے کو منسوخ کیا جائے۔ ٹیکسٹائل ٹیکنالوجی، سرامک ٹیکنالوجی، لیدر ٹیکنالوجی اور آرٹس کالج کے طلبا کے مطالبات منظور کئے جائیں۔

(م) زرعی یونیورسٹی اور زرعی کالج کے طلبا کے جائز اور ضروری مطالبات تسلیم کئے جائیں، زرعی کالج کے طلبا کے مطالبات جن میں ڈپلوما کورس کے لئے کنڈنس کورس کا مطالبہ بھی شامل ہے، منظور کیا جائے۔

(ن) طلبا کو شناختی کارڈوں کی بنیاد پر ریل کے کرائے میں 50 فیصد تخفیف کی رعایت دی جائے اور یہی مراعات ریل کے ماہانہ ٹکٹوں کے لئے بھی برقرار رکھی جائیں۔ مغربی پاکستان کی طرح اس صوبے میں بھی طلبا کو بسوں کے کرائے کی مراعات دی جائیں۔ اندرونِ شہر ایک مقام سے دوسرے مقام تک کا کرایہ دس نئے پیسے ہو اور بیرون شہر کے کرائے میں پچاس فیصد کی رعایت ہو۔ طالبات کے لئے اسکولوں اور کالجوں تک آنے جانے کی غرض سے کافی بسوں کا انتظام کیا جائے۔ سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی طرف سے منعقد کئے جانے والے کھیلوں کے مقابلوں اور تفریحی و ثقافتی تقریبوں میں شرکت کے لئے طلبا کو ٹکٹوں میں 50 فیصد کی رعایت دی جائے۔

(س) طلبا کو ملازمت کی سہولت کی ضمانت دی جائے۔

(ع) معتوب شدہ یونیورسٹی آرڈی نینس کو باطل قرار دیا جائے اور تعلیمی اداروں کے لئے، جن میں یونیورسٹیاں بھی شامل ہیں، مکمل خودمختاری کی ضمانت دی جائے۔

(ف) تعلیمی پالیسی پر پابندی لگانے والے تمام قواعد وضوابط، قومی تعلیمی کمیشن رپورٹ اور حمودالرحمن رپورٹ کو باطل قرار دیا جائے۔ طلبا اور عوام کی بھلائی کے پیش نظر ایک ایسا تعلیمی نظام قائم کیا جائے جو سائنسی اور عوامی مفاد پر مبنی ہو۔

نمبر 2: حق بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ملک میں پارلیمانی جمہوری نظام قائم کیا جائے۔ اظہار کی آزادی، انفرادی آزادی اور اخبارات کی آزادی برقرار رکھی جائے اور روزنامہ ''اتفاق'' سے پابندی اُٹھائی جائے۔

نمبر 3: مشرقی پاکستان کو مندرجہ ذیل نکات کی بنیاد پر مکمل علاقائی خودمختاری دی جائے۔

(الف) ملکی انتظامیہ کی بنیاد فیڈریشن پر ہو اور قانون ساز اسمبلیاں خود مختار ہوں۔

(ب)　فیڈرل (مرکزی) حکومت کے ماتحت دفاع، امور خارجہ اور کرنسی ہوں اور دوسرے تمام معاملات میں صوبوں کو مکمل اختیارات حاصل ہوں۔

(ج)　ہر صوبے کے لئے ایک ہی کرنسی ہوگی لیکن کرنسی کا نظام فیڈرل حکومت کے تحت ہوگا۔ اس طرح کرنسی کی حیثیت مرکزی ہوگی، لیکن اس کے ساتھ ہی آئین میں واضح اور مکمل طور پر مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کو کرنسی کی منتقلی پر پابندی لگائی جائے۔ اس کے مطابق پاکستان میں ایک فیڈرل ریزرو بینک ہو، دونوں حصوں میں ایک ایک ریزرو بینک کام کرے گا اور مشرقی پاکستان کے لئے ایک الگ مالی پالیسی وضع کی جائے۔

(د)　مالگزاری، ٹیکس اور لگان عائد کرنے اور وصول کرنے کا اختیار صوبائی حکومتوں کو ہو۔ فیڈرل حکومت کو کوئی ٹیکس لگانے کا اختیار حاصل نہ رہے۔ صوبائی حکومتوں کے وصول کئے ہوئے ٹیکس اور لگان کی رقم سے ایک طے شدہ حصہ مرکزی خزانے میں جمع کیا جائے اور ریزرو بینک سے متعلق تمام نکات آئین میں درج ہوں۔

(ہ)　فیڈریشن کی ہر ریاست بیرونی تجارت اور اس کی آمدنی کا الگ الگ حساب کتاب رکھے گی اور بیرونی تجارت سے حاصل کیا ہوا زرمبادلہ ہر ریاست کی اپنی تحویل میں ہوگا۔ فیڈرل حکومت کے زرمبادلہ کی ضرورت ہر ریاست مساوی طور پر یا آئین میں درج نکات کے مطابق پوری کرے گی۔ ان سامانوں پر جو ملک کے ایک ریاست میں بنائے جائیں گے ان کا ایک ریاست سے دوسری ریاست کے درمیان لین دین ہوگا اور ان پر کسی قسم کی ڈیوٹی نہیں ہوگی۔ آئین میں اس بات کی بھی وضاحت ہو کہ دونوں حصے غیر ممالک سے تجارتی معاہدے اور درآمدی و برآمدی تجارت کر سکتے ہیں اور تجارتی وفد بھیج سکتے ہیں۔ آئینی طور پر ہر ریاست کو درآمد و برآمد کا حق دیا جائے۔

(و)　مشرقی پاکستان کو ملیشیا فوج یا پیرا ملٹری فوج قائم کرنے کا اختیار دیا

جائے۔ مشرقی پاکستان میں اسلحہ ساز کارخانہ قائم کیا جائے اور بحری فوج کا ہیڈ کوارٹر مشرقی پاکستان میں ہونا چاہیے۔

نمبر 4: مغربی پاکستان کے سابق صوبوں کو جن میں بلوچستان، سرحد اور صوبہ سندھ شامل ہیں صوبائی خودمختاری دے کر وہاں ایک ذیلی فیڈریشن قائم کی جائے۔

نمبر 5: بینک، انشورنش کمپنی اور جیوٹ کی تجارت سمیت تمام بڑی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا جائے۔

نمبر 6: کسانوں پر لگائی جانے والی مالگذاری اور لگان کی شرح میں کمی کی جائے۔ کسانوں کے بقایا جات اور مالگذاری اور قرضے معاف کر دیئے جائیں۔ سر ٹیفکیٹ سسٹم کو منسوخ کیا جائے۔ لگان وصول کرنے والے تحصیلداروں کی سختیاں روکی جائیں۔ جیوٹ کی قیمت کم ازکم چالیس روپے فی من مقرر کی جائے اور گنے کی معقول قیمت کی ضمانت دی جائے۔

نمبر 7: مزدوروں کو واجب اُجرت اور بونس دیئے جائیں۔ ان کو تعلیمی، طبی اور رہائشی سہولتیں دی جائیں۔ مزدور دشمن کالے قوانین منسوخ کئے جائیں۔ مزدوروں کو ہڑتال کا حق اور یونین بنانے کا حق دیا جائے۔

نمبر 8: مشرقی پاکستان میں سیلاب کی روک تھام اور تمام آبی ذرائع کے استعمال کا بہتر انتظام کیا جائے۔

نمبر 9: تمام ہنگامی قوانین سیکیورٹی ایکٹ اور دوسرے امتناعی احکامات اٹھا لئے جائیں۔

نمبر 10: پاکستان کو سیٹو اور سینٹو اور پاک امریکی فوجی جیسے گندے معاہدوں سے الگ ہونا چاہیے اور سیاسی بلاکوں سے نکل کر ایک آزاد خارجہ پالیسی مرتب کرنی چاہیے۔

نمبر 11: تمام گرفتار شدہ طلبا، کسان، سیاسی کارکن اور سیاسی رہنماؤں کو فوراً رہا کیا جائے اور تمام پروانہ ہائے گرفتاری، سیاسی مقدمے بشمول مقدمہ اگر تلہ سازش اُٹھا لئے جائیں۔

طفیل احمد نائب صدر: ڈھاکہ یونیورسٹی سنٹرل اسٹوڈنٹس یونین۔ ناظم کامران چودھری: معتمد عمومی ڈھاکہ یونیورسٹی سنٹرل اسٹوڈنٹس یونین۔ مصطفی جمال حیدر: صدر مشرقی پاکستان اسٹوڈنٹس یونین (مینن گروپ) محبوب اللہ: معتمد عمومی، مشرقی پاکستان اسٹوڈنٹس یونین (مینن گروپ) عبدالرؤف: صدر مشرقی پاکستان اسٹوڈنٹس لیگ۔ خالد محمد علی: معتمد عمومی، مشرقی پاکستان اسٹوڈنٹس لیگ۔ سیف الدین مانک: صدر، مشرقی پاکستان اسٹوڈنٹس یونین (موتیا گروپ) شمس الضحیٰ: معتمد عمومی، مشرقی پاکستان اسٹوڈنٹس یونین (موتیا گروپ) ابراہیم خلیل: نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن۔ فخر السلام: نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن

تحریکی طلبا برادری

ہفت روزہ نصرت لاہور 16 / مارچ 1969ء

ضمیمہ: 3

سرد جنگ میں پاکستان کے کردار کی ٹائم لائن

1947ء پاکستان اپنے قیام میں ہی دولت مشترکہ کا ممبر تھا۔یعنی سوویت یونین کے خلاف برطانیہ اور امریکہ کا اتحادی

1950ء لیاقت علی خان پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نے امریکہ جا کر یہ یقین دہانی کروادی کہ پاکستان سرد جنگ میں سوویت یونین اور سوشلزم کے پھیلاؤ کے خلاف امریکہ کے ساتھ ہے۔

1954ء پاکستان اور عراق نے ترکی (نیٹو کا ممبر) کے ساتھ مشترکہ تعاون کے سمجھوتے کئے جو سوویت یونین کے خلاف تھے۔

1954ء پاکستان نے امریکہ کے ساتھ مشترکہ دفاعی معاہدے کئے جو کہ سوویت یونین اور سوشلزم کے پھیلاؤ کے خلاف تھے۔

1955ء برطانیہ اور ایران کے درمیان سیکورٹی کے معاہدے ہوئے۔ مڈل ایسٹ ڈیفنس آرگنائزیشن (MEDO) جو معاہدۂ بغداد کے نام سے مشہور ہے، پاکستان اس میں شامل ہوا۔ یہ ادارہ نیٹو کی طرز پر قائم کیا گیا تھا۔ اگرچہ امریکہ اس کا ممبر نہیں تھا مگر مشرق وسطیٰ میں سوویت یونین اور سوشلزم کے خلاف یہ ایک طرح کا فوجی معاہدہ تھا۔ یہ معاہدہ بعد میں سینٹو کہلایا۔

1955ء فروری پاکستان جنوب مشرقی ایشیا میں سوویت یونین کے خلاف اور اینگلو امریکی مفادات کی نگہبان ساؤتھ ایسٹ ایشیا ٹریٹی آرگنائزیشن یعنی سیٹو (SEATO) کا ممبر بنا۔ یہ بھی ایک طرح کا فوجی معاہدہ تھا۔

1958ء جب عراق میں بادشاہت کا خاتمہ ہوا تو معاہدۂ بغداد کا نام تبدیل کر کے سنٹرل ٹریٹی آرگنائزیشن (سینٹو) رکھا گیا۔ اس معاہدے کے تحت پاکستان نے پشاور کے قرب بڈہ بیر کے مقام پر امریکہ کو ہوائی اڈہ مہیا کیا جہاں سے U-2 پروازوں کے ذریعے سوویت یونین کی جاسوسی کی جاتی تھی۔

1965ء پاکستان بھارت جنگ کے دوران، پاکستان کی خدمت گزاری اور وفاداری کے باوجود، سیٹو اور سینٹو جیسے معاہدوں کے باوجود، امریکہ نے پاکستان کو ہتھیاروں کی سپلائی پر پابندی عائد کردی۔ یہ پابندی 1971ء کی پاکستان بھارت جنگ میں بھی جاری رہی جو 1975ء میں ختم ہوئی۔

1971ء جولائی پاکستان نے امریکہ کے اثر ورسوخ کو بڑھانے، سوشلزم اور سوویت یونین کے پھیلاؤ کو روکنے کے لئے امریکی نیشنل سیکورٹی کونسل کے ایڈوائزر ہنری کسنجر کے خفیہ دورۂ چین کا اہتمام کیا اور کسنجر نے یہ دورہ کر کے سوویت یونین کے خلاف امریکہ چین تعلقات کی بنیاد ڈالی۔ بھٹو صاحب نے اس میں بنیادی کردار ادا کیا۔

1974ء پاکستان ٹوٹ گیا تھا۔ بنگلہ دیش کی علیحدگی کی تحریک کو امریکہ کی مکمل امداد و حمایت حاصل تھی۔ بھٹو صاحب نے امریکہ کے اس کردار کی روشنی میں سعودی عرب اور دیگر مسلم ممالک پر بھروسہ کرنے کی حکمت عملی کو اپنایا اور سرد جنگ میں غیر وابستہ اور غیر جانبدار خارجہ پالیسی اختیار کرنا چاہی۔ انہوں نے پاکستان کو سٹیو، سینٹو اور دولت مشترکہ سے باہر نکالا اور مغرب کے ساتھ تعلقات میں کمی آ گئی۔

1974ء بھارت نے نیوکلیئر ہتھیار حاصل کیا تو بھٹو صاحب نے بھی ایٹمی ہتھیار بنانے کی پالیسی کو اختیار کیا۔ جس پر مغرب، بالخصوص امریکہ نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا اور انہیں "عبرت بنانے" کی دھمکی دی۔ 1979ء میں جنرل ضیا الحق کے ذریعے ان کا عدالتی قتل کروا دیا گیا۔

1977ء سیٹو ختم ہوگئی اور 1979ء میں ایرانی انقلاب کے بعد سینٹو بھی ختم ہوگئی۔

1979ء سوویت یونین جب افغانستان میں آیا تو پاکستان اور امریکہ کے تعلقات میں گرم جوشی آ گئی۔ بھٹو صاحب کو پھانسی دی جا چکی تھی۔

1981ء رونلڈ ریگن نے پاکستان کو فوجی و اقتصادی امداد کے طور پر 3.2 بلین ڈالرز کی منظوری دی۔ یہ امداد سوویت یونین کے خلاف تھی۔

1985ء امریکی سینٹ نے پریسلر ترمیم کے ذریعے پاکستان کو دی جانے والی امداد کو ایٹمی ہتھیار نہ بنانے کے سرٹیفکیٹ کے ساتھ منسلک کر دیا۔ ریگن اور ایچ۔ ڈبلیو۔ بش امریکی سینٹ کو سرٹیفکیٹ مہیا کرتے رہے۔

1986ء امریکہ نے پاکستان کو مزید چار بلین ڈالرز کی فوجی اور اقتصادی امداد دی۔ پاکستان سوویت یونین کے خلاف افغانستان میں مذہب کے نام پر امریکہ کی جنگ لڑ رہا تھا۔

1989ء سوویت یونین افغانستان سے نکل گیا۔ بعد میں اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ سرد جنگ ختم ہوگئی تو امریکہ نے پاکستان کی امداد بند کر دی۔

1996ء دسمبر سوویت یونین ٹوٹا تو سامراج کو اپنے سرمایہ دارانہ نظام بچانے کے لئے سوشلزم کی جگہ ایک نیا دشمن چاہیے تھا۔ سیموئل ھنٹگٹن کے نظریۂ تہذیبی ٹکراؤ کی روشنی میں ''اسلام'' کو ایک دشمن کے طور پر کھڑا کیا۔ القاعدہ اور اسی قسم کی دہشت گرد تنظیمیں بوگی کے طور پر کھڑی کیں۔ سیموئل ھنٹگٹن کی کتاب شائع ہوئی جس کا عنوان تھا:

"The Clash of Civilization and the Remaking of World Order"

اس سے پہلے اسی موضوع پر اس کا مضمون 1993ء میں امریکی جریدہ Foreign Affairs میں بھی شائع ہو چکا تھا۔ 2000ء میں اس کا ایک اور مضمون اس عنوان سے بھی چھپا:

Culture Matters: How Values Shapes Human Progress.

2001ء نائن الیون کے بعد پاکستان امریکہ تعلقات میں ایک بار پھر گرم جوشی آئی اور واشنگٹن نے پاکستان کو ''اہم غیر نیٹو اتحادی'' ''Major Non-NATO Ally'' کا مقام دے کر پاکستان کی فوجی اور اقتصادی امداد شروع کر دی۔ پاکستان دنیا بھر میں دہشت گرد مہیا کرنے والی فیکٹری بن گیا۔ اب امریکہ نے جہاں کہیں نیٹو کی فوجیں اتارنا ہوں اور ان علاقوں اور ان کے وسائل پر قبضہ کرنا ہو، وہاں پر القاعدہ یا اسی قسم کی کسی دہشت گرد تنظیم کے ذریعے ''دہشت گردی'' کی کاروائیاں کروائی جاتی ہیں اور پھر ان ''دہشت گردوں'' کو ختم کرنے، وہاں کے عوام کو بچانے اور جمہوریت قائم کرنے کی آڑ میں عالمی استعمار وہاں پر جا بیٹھتا ہے۔ یہ کھیل ابھی جاری ہے۔ دہشت گردی کے اس کھیل میں اب سعودی عرب اور عرب ریاستوں کے شیوخ بھی شامل ہیں اور پاکستان کے حکمرانوں کی ایک بار پھر لاٹری نکلی ہوئی ہے۔

باہر جنگل اندر آگ

علی جعفر زیدی کی فکری، صحافتی و سیاسی عمارت، سائنسی، جدلیاتی مادیت کے نظریات کی بنیاد پر تعمیر ہوئی۔ پاکستان کی یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد وارسا، پولینڈ سے پوسٹ گریجوایشن کی۔ نومبر 1967ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام کے بعد اس کے نظریاتی جریدے ہفت روزہ نصرت لاہور کے 1973ء تک مدیر رہے۔ 1973ء سے 83ء تک قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں مختلف ذمہ داریوں کو نبھایا۔ ضیاالحق کے دور میں زیرِ عتاب آئے تو بیوی بچوں کے ساتھ جلاوطن ہو گئے اور آج تک لندن میں مقیم ہیں۔

2005ء میں جنگ مخالف، سوشلسٹ امیدوار کے طور پر برطانیہ کی پارلیمنٹ کا انتخاب لڑا۔ مختلف ٹی وی چینلز، اخبارات اور لیکچرز کے ذریعے دنیا پر مسلط کئے جانے والے لوٹ مار کے معاشی و سیاسی نظام اور جنگوں کے خلاف، عوامی حاکمیت کے قیام، قومی آزادی کی تحریکوں اور جدوجہد کے حق میں 1963ء سے شروع کی جانے والی اپنی جدوجہد کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ عالمی سامراج، مُلّائیت اور دہشت گردی کے خلاف ان کے نظریات عالمی سطح پر ان کی پہچان ہیں۔ سٹاپ دی وار کولیشن جیسی عالمی تنظیموں کے ساتھ وابستہ ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ پاکستان کے مظلوم و محکوم عوام سٹاک ہوم سنڈرم سے نکل کر ایک نہ ایک دن سر اٹھا کر چلنے اور عزتِ نفس کے ساتھ زندہ رہنے کا فیصلہ ضرور کریں گے۔

قیمت: 1000/- روپے

قیمت بیرونِ ملک: 30/- $

ISBN 978-969-9806-32-2